تعلیم
تعلیمی میلا نمبر
NEHRU TROPI

کھیل سنسار (سطوت رسول)
چھوٹے بچوں کے لیے مترنم بحروں والے گیتوں اور نظموں کا ایسا مجموعہ جسے بچے شوق سے پڑھیں گے۔
قیمت : ۴/۵۰
دھنک
بچوں کے لیے لکھی گئی دلکش نظموں کا مجموعہ جس میں بچوں کے من پسند موضوعات پر نظمیں شامل ہیں
اسلام کیسے شروع ہوا؟
عبدالواحد سندھی جامعی
قرآن پاک کیا ہے
اس کتاب میں بچوں کے لیے نہایت آسان اور عام فہم زبان میں قرآن پاک کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ قیمت ۲/۰۰
سرخ جوتے
(بیگم قدسیہ زیدی)
"موتی" کو سرخ جوتے کیا ہاتھ لگے کہ اس کی غریبی دور ہوگئی۔ ایک دلچسپ کہانی ہے۔
قیمت ۲/۵۰
جن دادا اور ننھا فرشتہ
مکتبہ پیام تعلیم جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

جنوری ۱۹۸۲ء جلد ۱۹ شمارہ ۱

نگراں : جناب خالد سیف اللہ

اڈیٹوریل بورڈ

صدر، بچوں کی حکومت	سعید احمد
وزیر اعظم " " "	محمد عاصم قاسمی
وزیر اطلاعات " "	شائستہ بیگم
وزیر تعلیم " "	صوفیہ خاتون
وزیر آرائش " "	جہاں آرا

صلاح کار

آفتاب احمد صدیقی عائشہ خاتون

مہمان اڈیٹر

شائستہ بیگم

اس شمارے کی قیمت 2/50

سالانہ : پندرہ روپے
غیر ممالک کے لیے پینتالیس روپے

چلتے ہیں تو جامعہ چلیے سنتے ہیں کہ بہار آئی ہے

بچوں کے رسالے کی حیثیت سے پیام تعلیم ملک میں اپنا ایک مقام بنا چکا ہے۔ مگر موجودہ شمارہ نہ صرف بچوں کا بلکہ بچوں ہی کے ذریعے ترتیب بھی دیا گیا ہے ہمارا یہ پیارا رسالہ بچوں کی کوششوں کے مستقل کالم کے ذریعے بچوں کی حوصلہ افزائی کرتا رہا ہے۔ مگر اس بار تو رسالے کو ترتیب دینے کی ساری ذمہ داری بچوں کی حکومت کو سونپ دی گئی ہے۔ ہوا یہ کہ اس سال جامعہ کے یوم تاسیس کے موقع پر تعلیمی میلا ہوا تھا جب بچوں کی حکومت کے عہدیداران اس میلے کی روداد چھاپنے کے سلسلے میں بات کرنے مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں کے پاس گئے تو انھوں نے رسالہ کا ایک پورا شمارہ ہی اس کے لیے وقف کر دیا۔

آج سے دس بارہ سال پہلے جامعہ میں سب کو تعلیمی میلے کا انتظار رہتا تھا۔ اس کی تیاری بہت پہلے سے شروع ہو جاتی تھی ۲۹ اکتوبر کو جامعہ کے یوم تاسیس کے موقع پر ہونے والے اس تعلیمی میلے میں صرف جامعہ کے لوگ ہی نہیں بلکہ دہلی شہر سے بھی کافی بڑی تعداد میں لوگ آتے تھے۔

اس سال اس روایت کو پھر زندہ کیا گیا ہے تین دن کے اس تعلیمی میلے کی ایک جھلک زیر نظر شمارے میں پیش کی جا رہی ہے' اس پرچے میں ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ جامعہ کی تاسیس پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈال سکیں اور جن لوگوں نے تعلیمی میلہ نہیں دیکھا ہے انھیں مضامین اور تصویروں کے ذریعے اس میلے کی ایک جھلک دکھا سکیں۔

ساتھیو! یہ کام بہت مشکل تھا اور نیا بھی لیکن ہمارے نگران مدرسہ جناب سید خالد سیف اللہ صاحب نے حوصلہ دلایا۔ ہمارے استاد جناب آفتاب احمد صاحب اور محترمہ عائشہ صاحبہ کے مشوروں کی وجہ سے یہ کام آسان ہو گیا امید ہے آپ سب ہماری کوششوں کو پسند فرمائیں گے۔

یہ تعلیمی میلا نمبر چونکہ جنوری کا شمارہ ہے۔ نئے سال کی رعایت سے اُس میں کچھ معلوماتی باتیں بھی شامل کی جا رہی ہیں۔ ہماری درخواست پر سطوت رسول صاحب اور شوکت پردیسی صاحب نے اپنی نظمیں اور جناب شکیل اختر فاروقی صاحب نے سرورق بنا کر اس نمبر کو چار چاند لگا دیے۔

پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برقی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

شوکت پردیسی

نئے سال کا پیغام

میں سورج ہوں نئے سال کا، مرا نیا پیغام ہے یہ
اپنی محنت، اپنی ہمت سے پورا ہر کام کرو
دنیا میں تم جہاں رہو، ماں باپ کا روشن نام کرو
علم کی عظمت کو پہچانو، پڑھو، لکھو، آرام کرو
میں سورج ہوں نئے سال کا، مرا نیا پیغام ہے یہ

پہلے کیا کیا بھول ہوئی اب اُس کو مت دُہراؤ تم
آگے کی منزل ہے روشن آگے قدم بڑھاؤ تم
وقت کی قدر و قیمت سمجھو اُس کو کام میں لاؤ تم
میں سورج ہوں نئے سال کا، مرا نیا پیغام ہے یہ
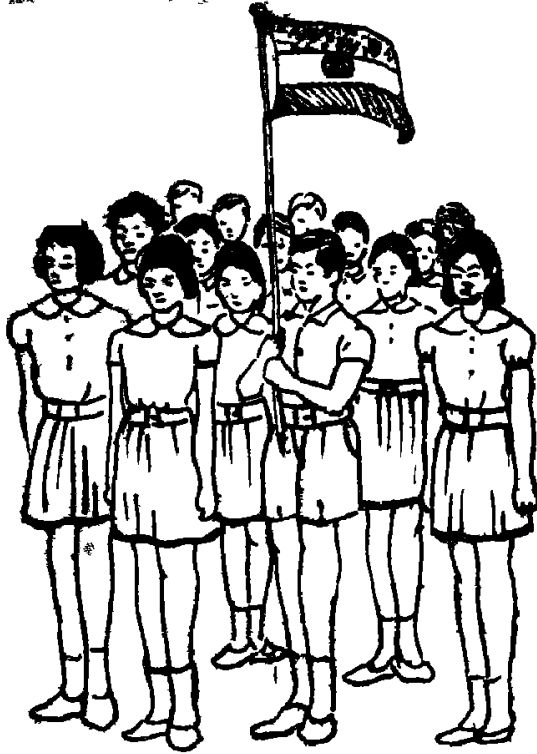
تبدیلی ہوتی رہتی ہے دنیا میں دن رات نئی
تم بھی بچو دل میں سوچو اپنے کوئی بات نئی
کام بھی سنبھلے، بات نہ بگڑے، کر ڈالیں حالت نئی
میں سورج ہوں نئے سال کا، مرا نیا پیغام ہے یہ

جن لوگوں نے کام کیا بھرپور لگن سے صبح و شام
ان لوگوں کی سچائی کا ساری دنیا میں ہے نام
اچھے کام کی عزت ہوگی، امن و سکون ملے گا انعام
میں سورج ہوں نئے سال کا، مرا نیا پیغام ہے یہ

ڈاکخانہ چندوان، جون پور (یوپی)

تعلیم و تربیت کا نقشہ جما رہا ہے — علم و عمل کا سیدھا رستہ دکھا رہا ہے
کچھ اس طرح فضا میں یہ لہلہا رہا ہے — خدمت کی سمت گویا ہم کو بلا رہا ہے

یہ جامعہ کا پرچم۔ یہ جامعہ کا پرچم

اس کی بلندیوں سے ظاہر ہے یہ اشارہ — شاید یہی ہے اپنی تقدیر کا ستارہ
ٹوٹے ہوئے دلوں کا اس دیس میں سہارا — آنکھوں میں بس رہا ہے، دل میں سما رہا ہے

یہ جامعہ کا پرچم۔ یہ جامعہ کا پرچم

ہم کو سکھا رہا ہے۔ رازِ عروجِ ملت — ہم کو جتا رہا ہے احساس کی ضرورت
لازم ہے یہ کہ سیکھیں ہم فرضِ آدمیت — دنیا کی یاوری کا مژدہ سنا رہا ہے

یہ جامعہ کا پرچم۔ یہ جامعہ کا پرچم

پھر ایک مرتبہ ہم میدان میں تو آئیں — پھر ایک مرتبہ کچھ دنیا میں کر دکھائیں
پھر ایک مرتبہ ہم تقدیر آزمائیں — لاتقنطوا کا نغمہ لہرا کے گا رہا ہے

یہ جامعہ کا پرچم۔ یہ جامعہ کا پرچم

(یہ ترانہ ۱۹۴۶ء میں جامعہ کی سلور جوبلی کے موقع پر پہلی بار پڑھا گیا)

جانتے ہو اس نشان کا مطلب کیا ہے؟ دیکھو اس میں سب سے اوپر ایک ستارہ ہے جس میں لکھا ہے "اللہ اکبر"۔ جب اندھیری رات میں غریب مسافر جنگل، بیابان میں سفر کرتے ہوئے راہ بھٹک جاتے ہیں، کوئی راہ بتانے والا نہیں ہوتا تو وہ ستاروں کو دیکھ کر راستہ نکالتے ہیں۔ جامعہ والوں کو راستہ بتانے والا ستارہ یہی "اللہ اکبر" کا ستارہ ہے۔ ان کی نظر اسی پر جمی ہے۔ یہی دنیا کی اندھیاری میں انھیں راہ بتاتا ہے اس لیے کہ یہ بتاتا ہے کہ اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔ جس نے اس کے آگے سر جھکایا اس نے سچی زندگی کا پتا پایا۔ اس کے سامنے جھک کر پھر یہ سر کسی کے سامنے کیسے جھک سکتا ہے۔ اس چمکتے ہوئے ہدایت کے تارے کے نیچے ایک کتاب ہے جس پر لکھا ہے "علّم الانسان مالم یعلم"

یہ کتاب قرآن پاک ہے اس سے خدا نے اپنے بندوں کو اپنی مرضی کا پتا دیا کہ وہ کیا چاہتا ہے کس طرح نیکی کرکے آپس میں ایک دوسرے کو بھائی بھائی جان کر، غریب و امیر کا فرق مٹا کر، رنگ روپ کی تمیز مٹا کر، آقا اور غلام کی تقسیمیں مٹا کر اس کے اچھے اور سچے بندے بن سکتے ہیں۔ اس کتاب نے آدمیوں کو تاریکی سے روشنی میں پہنچایا اور جو راہ بھٹک گئے تھے انھیں بھی سیدھی راہ بتائی۔ اور اس کے لانے والے نے اپنی پاک زندگی کی مثال سے، اپنی تاثیر اور دل کی گرمی سے ایک گروہ ایسے نیک آدمیوں کا تیار کر دیا جس نے دنیا سے طرح طرح کی برائیوں کو مٹا دیا اور اس میں خدا کی سچی برادری قائم کی۔

اس نشان کے دونوں طرف کھجور کے دو پیڑ ہیں۔ یہ کیا ہیں؟ یہ اس دیش کا نشان ہیں جہاں خدا کا آخری پیام لانے والا پیدا ہوا۔ اس بنجر وادی کا نشان جس میں اور تو کچھ اگتا نہ تھا۔ پر جہاں دینِ الٰہی کے پودے نے جڑ پکڑی۔ جو لوگ ناموافق حالات سے اپنے کاموں میں گھبرا جاتے ہیں۔ ان کے لیے یہ درخت ڈھارس کا سامان ہے کہ اس دیس سے جہاں ان کھجوروں کے سوا پھول بوٹا نام کو نہ تھا ہدایت کے چشمے ابل پڑے۔ جن سے دلوں کی بستیاں سیراب ہو گئیں پھر تم ظاہری حالات دیکھ کر کیوں تھڑ دلے ہو جاتے ہو۔

سب سے نیچے ایک پتلا سا ہلال ہے جس میں لکھا ہے "جامعہ ملیہ اسلامیہ"۔ یہ ہلال ابھی چھوٹا سا ہے لیکن جیسے ہلال بڑھ کر چودھویں رات کا چاند بن جاتا ہے اسی طرح یہ جامعہ جس کے کام کی ابھی ابتدا ہے۔ انشاء اللہ بڑھ کر روشن چاند بنے گی اور دیکھنے والوں کی آنکھوں کا سرور ہوگی۔

شیخ الجامعہ کا پیغام

پیارے بچو!

مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ اس بار 'پیامِ تعلیم' آپ لوگ نکال رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تجربہ آپ کے لیے بہت دلچسپ اور مفید ثابت ہوگا اور آپ اس سے بہت کچھ سیکھیں گے۔

میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ ہمارے اسکول، جامعہ کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ خاص طور پر جامعہ مڈل اسکول کی طرف بہت سی پُرامید نظریں لگی ہوئی ہیں جامعہ میں، علم اور تہذیب کے مشعل بردار جامعہ مڈل اسکول کے بچے ہیں اور جامعہ کا مستقبل آپ ہی کے ہاتھوں میں محفوظ رہ سکتا ہے۔ ذاکر صاحب کا کہنا تھا کہ جامعہ اینٹ اور چونے کی بنی ہوئی عمارتوں کا نام نہیں ہے۔ جامعہ نام ہے اُس کوشش کا جو بچے اور اساتذہ اپنے آپ کو بہتر بنانے کے لیے کرتے ہیں۔ تمام بچوں میں طرح طرح کی خوبیاں اور صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ ان خوبیوں اور صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کا نام "تعلیم" ہے۔

آیئے ہم سب مل کر اس کوشش کو تیز تر کردیں تاکہ ترقی کی منزلیں ہمارے لیے آسان ہوجائیں۔

پُرامید دعاؤں کے ساتھ

انور جمال قدوائی

۲۴ر دسمبر ۱۹۸۱ء

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ابتدائی تعلیم کو روز اوّل سے امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے اور جامعہ کا مڈل اسکول جو ۱۹۳۰ء سے پہلے مدرسہ ابتدائی کہلاتا تھا، ابتدائی تعلیم کے لیے سارے ملک میں مشہور ہے۔ یہ ایک اقامتی اسکول ہے۔ اس اسکول میں ۶ سے ۱۴ سال تک کے بچے پہلی سے آٹھویں کلاس تک تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ہم میں سے کچھ بچے اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں رہتے ہیں۔ بورڈنگ میں بھی پہلی سے آٹھویں کلاس تک کے بچے رہتے ہیں۔
ہمارے اسکول کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمد مجیب جیسے لوگوں نے پڑھایا ہے۔ عتیق صاحب، غفار مدھولی صاحب، سید عابد حسین صاحب اور آزاد دیول صاحب جیسے لوگوں نے یہاں دلچسپ اور مفید مشغلوں کے ذریعے تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کیا اور اس طرح بچوں کی شخصیت کے مختلف پہلو ... کو کامیاب کوشش کی۔

ہمارے اسکول میں بچوں کی حکومت ہے، بچوں کی دوکان ہے۔ بچوں کا خوانچہ ہے۔ بچوں کا بینک ہے، باغبانی ہے، چڑیا گھر ہے، اور میوزیم ہے۔ یہ ساری چیزیں مستقل پروجیکٹ کہلاتی ہیں۔ مدرسہ کی ہر کلاس کے پاس کوئی نہ کوئی مستقل پروجیکٹ رہتا ہے۔ اور اس کلاس کے لڑکے اور لڑکیاں اپنے پروجیکٹ پر سال بھر کام کرتے ہیں۔ پہلی سے پانچویں کلاس تک یہ پروجیکٹ ہمارے تعلیمی نصاب کا مرکز ہوتے ہیں۔ یعنی اگر ہم بینک میں کام کرتے ہیں تو اپنے کورس کا کافی بڑا حصہ بینک ہی کے کاموں کے ساتھ پورا کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر حساب کا بہت سا کام ہم بینک کے حسابات رکھتے رکھتے کر لیتے ہیں۔ دنیا کے مختلف ممالک کے سکّوں کے بارے میں معلومات ہمیں خود بخود حاصل ہو جاتی ہیں اور ہم یہ بھی جان جاتے ہیں کہ کسی دوسرے ملک کے سکّے کی ہندستانی سکّوں میں کیا قیمت ہوگی۔ اردو، ہندی اور انگریزی کا کافی کام بھی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر درخواستیں، خطوط اور رپورٹ لکھنے کا کام وغیرہ۔ اس طرح خوب سمجھ بوجھ کر کام کر لینے سے ہمارے کورس کا کافی حصہ پورا ہو جاتا ہے۔
بچوں کی حکومت کے وزیر مدرسہ کے بہت سے کاموں میں بڑی ذمّے داری سے حصہ لیتے ہیں۔ وزیر داخلہ نظم وضبط یعنی ڈسپلن کا انتظام سنبھالتا ہے۔ وزیر خوراک ڈائننگ ہال، خوانچہ اور کینٹین سے متعلق ساری چیزوں کی نگرانی کرتا ہے۔ وزیر آرائش، اسکول کی سجاوٹ و صفائی پر نظر رکھتا ہے۔ وزیر کھیل، کھیل کے انتظامات

صدر بچوں کی حکومت جامعہ مڈل اسکول

[?] ہے۔ وزیر صحت و صفائی، بچوں کی جسمانی صفائی اور [?] نظام پر کڑی نظر رکھتا ہے۔ وزیر اطلاعات دیواری اخبار [?]کالتا ہے اور بچوں سے متعلق اعلانات شائع کراتا ہے۔ وزیر تعلیم لائبریری میں آنے والے رسالوں اور کتابوں کی خبر گیری کرتا ہے۔ بچوں کو لائبریری کا سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ ادبی جلسے کراتا ہے۔ ریڈیو سے نشر ہونے والے بچوں کے پروگرام کا بچوں کے لیے انتظام کرتا ہے۔

یہ سارے وزیر، صدر اور وزیر اعظم کی نگرانی میں کام کرتے ہیں۔ بچوں کی حکومت کے مشیر جناب اخلاق [?]اسمی صاحب اور مدرسے کے تمام اساتذہ صاحبان ہم کو ضرورت پڑنے پر مفید مشورے دیتے رہتے ہیں۔

پڑھائی کے ساتھ ساتھ یہ سارے کام کرتے رہنے سے ہمیں تحریر، تقریر، تنظیم اور مسائل کو حل کرنے کا ڈھنگ آجاتا ہے۔ مل جل کر کام کرنے کی عادت پڑتی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے کام کی اہمیت معلوم ہو جاتی ہے اور بڑے سے بڑے کام کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔

تو جناب ایسا ہے ہمارا پیارا "جامعہ مڈل اسکول"

یہ بچوں کا میلا

بچو بچو تم نے دیکھا، انسانوں کا ریلا

یہ بچوں کا میلا

سجے سجائے کھیل کھلونے، دیکھیں تو مسکائیں
آپ کے ننھے منے دل کو، رہ رہ کر للچائیں
آپ کی جیب سے اُچھل پڑے گا، پیسا ہو یا دھیلا

یہ بچوں کا میلا

چلتے پھرتے رنگ برنگے، تصویروں کے البم
پیر میں گھنگرو باندھ کے ناچے، گڑیوں کی وہ چھم چھم
ننھے منے ہاتھ میں دیکھو! پھولوں کا اک ٹھیلا

یہ بچوں کا میلا

چاٹ کی ہر تھالی پر دیکھو، بھیڑ لگائے ننھے بچے
پھولوں کے گلدستے جیسے ہاتھ اٹھائے بچے
کھٹے میٹھے انگوروں کے ساتھ ہے رکھا کیلا

یہ بچوں کا میلا

اُڑتے مُڑتے دیکھو بچو، رنگوں کے غبارے
پلک جھپکتے سارے منظر، کھیلوں کے نظارے
برسوں بعد گرو چیلوں نے آج بجایا بیلا؟

یہ بچوں کا میلا

جامعہ نگر نئی دلی ۲۵

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تعلیمی میلا تو تین دن میں ختم ہوگیا۔ مگر اس کی تیاری میں ۔ جانے کتنے دن اور کتنی راتیں ایک ہوگئیں۔ جامعہ میں گیارہ سال سے تعلیمی میلا نہیں ہوا تھا۔ مگر اس میلے کے تعلیمی اور تفریحی ماحول کی یادیں لوگوں کے دلوں میں تھیں۔ یہ میلا پھر سے شروع کیا جائے یہ بات تو بہت سے لوگوں کے دلوں میں تھی مگر اس میں پہل کی جامعہ مڈل اسکول کی بچّوں کی حکومت نے، اور اس میں بچّوں کو نگران مدرسہ جناب خالد سیف اللہ صاحب کی پوری پوری تائید حاصل تھی۔

ستمبر ۱۹۸۱ء میں بچّوں کی حکومت کا اجلاس ہوا۔ جس میں اتفاقِ رائے سے یہ طے پایا کہ اس سال یومِ تاسیس کے موقع پر تعلیمی میلے کا اہتمام کیا جائے اور اس فیصلے کی توثیق انجمنِ اساتذہ کی میٹنگ میں ہوئی جو ستمبر کے آخر میں منعقد ہوئی۔ اکتوبر کے شروع میں مسلسل تعطیلات کی وجہ سے کاموں کی رفتار مدھم رہی۔ لیکن پندرہ اکتوبر کے بعد بچّوں کی حکومت اور مدرسہ کے تمام شعبے اپنے اپنے کاموں کی طرف توجہ دینے لگے۔

اس سال یومِ تاسیس کے جلسے کا اہتمام بھی بچّوں کی حکومت کے سپرد ہوا۔ لہٰذا ۲ اکتوبر ۸۱ء کو ایک دعوت نامہ بچّوں کی حکومت جامعہ مڈل اسکول کی وزیر اطلاعات شاہدہ خاتون کی طرف سے شائع ہوا جس کے ساتھ تعلیمی میلے کا پروگرام بھی منسلک تھا۔

بچّوں کی حکومت جامعہ مڈل اسکول
نئی دہلی ۲۵

محترمی!

اس سال بچّوں کی حکومت نے یومِ تاسیس کے موقع پر تعلیمی میلے کا اہتمام کیا ہے۔ یہ میلا ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو شروع ہوگا اور ۳۱ اکتوبر تک جاری رہے گا۔ ۲۹ اکتوبر کی شام چھ بجے بچّوں کی حکومت کی رسمِ مسند نشینی کا جلسہ ہوگا۔ جس کی صدارت شیخ الجامعہ صاحب فرمائیں گے۔

میلے اور مسند نشینی کے جلسے میں آپ کی شرکت ہمارے لیے باعثِ مسرت ہوگی۔

نیازمند
شاہدہ خاتون
(وزیر اطلاعات)

یوم تاسیس و تعلیمی میلا ۱۹۸۱ء کے پروگرام

تاریخ	پروگرام	ادارہ	وقت	جگہ
۲۹ر اکتوبر	رسم پرچم کشائی	این۔ سی۔ سی	۹½ بجے صبح	جامعہ اسکول
	جلسہ یوم تاسیس	جامعہ مڈل اسکول	۹¾ بجے صبح	اوپن ایر تھیٹر
	کہانیاں سنانے کا مقابلہ	"	۲½ بجے سہ پہر	" "
	کہانی لکھنے کا مقابلہ	"	۳ بجے سہ پہر	جامعہ مڈل اسکول
	بیت بازی کا مقابلہ	"	۴ بجے شام	اوپن ایر تھیٹر
	سیشن پارلیمنٹ بچوں کی حکومت	"	۹½ بجے شام	صدر دروازہ مڈل اسکول
۳۰ر اکتوبر	نہرو ٹرافی کا مقابلہ			
	اسپیننگ	"	۱۰ بجے صبح	جامعہ مڈل اسکول کے لان
	۲۔ کلچرل پروگرام	"	۲½ بجے سہ پہر	مرکزی اسٹیج
	تمثیلی مشاعرہ		۸ بجے شام	مرکزی اسٹیج
۳۱ر اکتوبر	گاندھی ٹرافی کا مقابلہ	ہائر سکنڈری اسکول		
	اسپیننگ	"	۱۰ بجے صبح	ہائر سکنڈری اسکول کے لان
	۲۔ ڈبیٹ	"	۱۰ بجے صبح	جامعہ ہائر سکنڈری اسکول
	۳۔ کلچرل پروگرام	"	۲½ بجے سہ پہر	مرکزی اسٹیج
	این۔ سی۔ سی کیڈٹس کے ساتھ ایک شام	این۔ سی۔ سی	۸ بجے شام	مرکزی اسٹیج
نمائش ۲۹-۳۱ر اکتوبر	ماضی کی ایک جھلک	جامعہ مڈل اسکول	۱۰ بجے صبح تا ۵ بجے شام	جامعہ مڈل اسکول
	پیپر کرافٹ			
	باغبانی پروجیکٹ			
	نہرو پروجیکٹ			

یہ دعوت نامہ جامعہ مڈل کے افسران شعبہ جات و رفقاء کار، جامعہ کے گرد پھیلی ہوئی بستیوں کے تمام نمائندہ باشندوں اور طلبہ کے سرپرستوں کو بھیجا گیا۔ دعوت ناموں کی تقسیم کا کام عبدالرحمٰن، محمد سعید خاں، صباحت علی اور ظفر علی بیگ وغیرہ نے انجام دیا۔ کچھ دعوت نامے خود صدر اور وزیر اعظم نے تقسیم کیے۔

۲۸ر اکتوبر تک میلے کی تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں، نگران مدرسہ نے تمام پروگراموں کی آخری ریہرسل دیکھی۔ ۲۸ر اکتوبر سے پنڈال بننا شروع ہوا۔ رات گئے تک صدر دروازے پر تصویریں لگتی رہیں۔ تعلیمی نمائش کے لیے گیٹ بنائے گئے، اور آخر کار ۲۹ر اکتوبر کی وہ خوبصورت صبح آ پہنچی، جس کا ہم سبھی بچوں کو بڑی شدت سے انتظار تھا۔

میلے کا آنکھوں دیکھا حال سنانے کی تیاری

اس سال میلے کے تمام پروگراموں کا حال لکھے

اور یہ آنکھوں دیکھا حال آپ سب کو سنانے کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ میلے کے پروگراموں کی جہاں اور تیاریاں چل رہی تھیں، وہیں میلے کے پروگراموں کی رپورٹیں تیار کرنے کے انتظامات بھی کیے جا رہے تھے۔ میں چونکہ سابق وزیر اطلاعات تھی۔ اس لیے مجھے چیف رپورٹر مقرر کیا گیا اور میلے کے پروگراموں کا حال لکھنے کے لیے رپورٹروں کی ایک ٹیم بنائی گئی۔ مختلف پروگراموں کے لیے ایک ایک، دو، دو رپورٹر مقرر کر دیے گیے۔ رپورٹروں کی رپورٹ کو آخری شکل میں مرتب کرنے کے لیے ایک ایڈیٹوریل بورڈ قائم کیا گیا۔ مقررہ رپورٹر اپنے پروگراموں کی رپورٹ چیف رپورٹر کو دیتے۔ چیف رپورٹر اس دن کی رپورٹ ایڈیٹوریل بورڈ کو دے دیتا۔

ایڈیٹوریل بورڈ اور رپورٹنگ یونٹ کی پہلی میٹنگ میلے سے ایک دن پہلے ہوئی، جس میں چیف رپورٹر نے رپورٹروں کو چند ضروری ہدایات دیں کہ "رپورٹ تیار کرتے ہوئے پوری احتیاط برتی جائے۔ کوئی ضروری بات چھوٹ نہ جائے اور غیر ضروری باتیں رپورٹ میں نہ آئیں۔ رپورٹ تیار کرنے میں پوری غیر جانب داری برتی جائے۔ اس میں تعلقات اور دوستی کا بالکل خیال نہ رکھا جائے۔ رپورٹ اس طرح تیار کی جائے کہ پروگرام کی دلچسپی قائم رہے"

میلے کے دوران روزانہ سویرے رپورٹروں کی میٹنگ کی جاتی اور یہ طے کر دیا جاتا کہ کس رپورٹر کو کس پروگرام کا حال لکھنا ہے۔ پھر یہ رپورٹر اپنی اپنی بیٹ (Beat) پر لگ جاتے۔ شام کو ان کی رپورٹ ایڈیٹوریل بورڈ کے حوالے کی جاتی۔

میلا ختم ہونے کے بعد چیف رپورٹر اور ایڈیٹوریل بورڈ نے تمام رپورٹوں کو ترتیب وار مرتب کیا۔ میلے کا یہ سارا آنکھوں دیکھا حال اب آپ کے سامنے ہے۔ آپ بتائیے ہم اس میں کہاں تک کامیاب رہے۔

رپورٹروں کی ٹیم اور ایڈیٹوریل بورڈ کے ممبران کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ شاہدہ خاتون چیف رپورٹر
۲۔ ریاض الدین رپورٹر — مسند نشینی
۳۔ کمال پاشا
۴۔ سرفراز احمد ″ — بچوں کی حکومت کا اجلاس
۵۔ مشیر زہرہ ″ — جلسہ یوم تاسیس
۶۔ قمر الحسن بیگ ″ — کہانیاں سنانے کا مقابلہ
۷۔ نجیب سلطان ″ — کہانیاں لکھنے کا مقابلہ
۸۔ یاسر جلال ″ — مقابلۂ مصوری
۹۔ راشد رفیق
۱۰۔ معین الحق ″ — نہرو ٹرافی کے مقابلے
۱۱۔ فاطمہ زہرا ″ — بیت بازی کا مقابلہ
۱۲۔ محمد عاصم قاسمی ″ — تمثیلی مشاعرہ
۱۳۔ صوفیہ خاتون ″ — بیت بازی ابنائے قدیم
۱۴۔ شاہدہ خاتون چیف رپورٹر — جامعہ مڈل اسکول کے تعلیمی مشن

ایڈیٹوریل بورڈ میں بچوں کی حکومت کے عہدار(ان) شامل تھے۔ یعنی:—

۱۔ سعید احمد — صدر بچوں کی حکومت
۲۔ محمد عاصم قاسمی — وزیر اعظم۔ بچوں کی حکومت
۳۔ صوفیہ خاتون — وزیر تعلیم۔ بچوں کی حکومت
۴۔ جہاں آرا — وزیر آرائش۔ بچوں کی حکومت
۵۔ شائستہ بیگم — وزیر اطلاعات بچوں کی حکومت
اور مہمان اڈیٹر

چیف رپورٹر
شاہدہ خاتون، جماعت ہشتم

مشیر زہرہ

جلسہ یوم تاسیس

آج ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۱ء ہے۔ بڑا اچھا موسم ہے۔ نہ زیادہ گرمی ہے نہ سردی۔ صبح سے ہی مدرسوں کی مرکزی عمارت کے درمیان چہل پہل شروع ہوگئی ہے۔ این سی سی کی ٹکڑیاں مختلف وردیوں میں کچھ اس طرح کھڑی ہیں جیسے سچ مچ کی فوج کھڑی ہو۔ ارے لیجیے۔ ساڑھے نو بج گئے۔ اور شیخ الجامعہ صاحب تشریف لے آئے اور این سی سی والوں نے دائیں بائیں سے انھیں لپک لیا۔ اور یہ بندوقوں کی کچھ کھٹ پٹ سی ہونے لگی۔ جیسے ڈرل ہو رہی ہو۔ پھر ذرا دیر میں سب سپاہی چپ سادھ کر کھڑے ہوگئے۔ شیخ الجامعہ صاحب این سی سی کے طالب علم افسروں کے ساتھ ساتھ دھیرے دھیرے قطاروں کے درمیان سے گذرنے لگے۔ اسے گارڈ آف آنر کہتے ہیں۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو پھر شیخ الجامعہ صاحب بچوں کی حکومت کے صدر اور وزیر اعظم کے سپرد کر دیے گئے۔ ان دونوں لیڈروں کے ساتھ جھنڈے کے قریب تشریف لائے اور شیخ الجامعہ صاحب نے پرچم کشائی کی رسم ادا کی۔ جامعہ کے جھنڈے کا ترانہ گایا گیا۔

اس کے بعد اوپن ایر تھیٹر میں تمام طلبہ و طالبات کے علاوہ جامعہ کے تمام کارکنان بھی جمع ہو گئے۔ مسندِ صدارت پر سعید احمد (صدر بچوں کی حکومت جامعہ مڈل اسکول) بیٹھے ان کے ساتھ شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی مہمان خصوصی کی حیثیت سے رہے۔ اب بچوں کی حکومت کے وزیر اعظم ہاشم قاسمی نے صدر کی اجازت سے جلسے کا آغاز کیا۔ امام صاحب مسجد [illegible] جناب سلیمان قاسمی نے تلاوت کلام پاک کی۔ اس کے بعد جامعہ مڈل اسکول کے طالب علم سید اعجاز حسین زیدی نے ایک مضمون "ڈاکٹر ذاکر حسین" کے نام سے پڑھ کر جامعہ کے معمار، معلم، شیخ الجامعہ یعنی ذاکر صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس کے بعد مڈل اسکول کی طالبات نے ایک نظم پڑھی۔

جامعہ رقص کناں ہو کہ تری عید ہے آج
تجھ کو با وصفِ سن و سال جواں ہونا ہے
جوئے خاموش تجھے بحرِ رواں ہونا ہے
ارتقا ساز ارادوں کی متاعِ تکمیل
تیرا اجمال ہے اوصافِ خرد کی تفصیل
وقت جب پردۂ گفتار ہٹا دیتا ہے
تیرے کردار کی عظمت کا پتا دیتا ہے
جامعہ رقص کناں ہو کہ تیری عید ہے آج

اس کے بعد مدرسۂ ثانوی کی طالبہ شگفتہ یاسمین نے ایک مضمون پڑھا اور پھر بی ایڈ کے ایک طالب علم احمد ندیم نے ایک مضمون پڑھا جس میں انھوں نے کہا "جامعہ کی پرانی قدروں اور روایات کی حفاظت کرنا چاہیے۔ جامعہ کے کردار کو باقی رکھنے ہی میں ہماری بقا ہے۔"

اب باری آئی مدرسۂ ثانوی کے طالب علم رضا حیدر کی جنھوں نے ایک نظم پیش کی۔

ایم اے سوشیالوجی کے ایک طالب علم ارشد علی صاحب نے ایک مضمون پڑھا۔ اس کے بعد بی ایڈ کے طالب علم مسعود جاوید قمر فرشوری نے ایک نظم پڑھی۔ اس کے بعد شعبۂ اردو کے طالب علم جناب بدر عالم شمسی نے ایک مضمون پڑھا۔ اس موقع پر انھوں نے ان عظیم ہستیوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا جنھوں نے جامعہ کی داغ بیل ڈالی اور خون پسینے سے اس کی آبیاری کی۔ انھوں نے کہا۔

"آج سے ۶۱ سال قبل یعنی ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو ترک موالات اور خلافت تحریک کے زیر اثر علی گڑھ میں جامعہ

[illegible] مشیر زہرہ درجہ ہشتم

کا قیام عمل میں آیا۔ گاندھی جی، شیخ الہند مولانا محمود حسن مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری وغیرہ وہ مقدس اور برگزیدہ ہستیاں تھیں جنھوں نے جامعہ کے حسین تصور کو حقیقت کا جامہ پہنایا۔

اس کے بعد نیاز فاطمہ صاحبہ نے ایک نظم اور الیاس قریشی صاحب نے ایک مضمون پڑھا۔ اور اب تشریف لائے جناب شیخ الجامعہ۔

آپ کی مختصر سی تقریر بہت بھرپور تھی۔ آپ نے فرمایا "ماضی کی تصور سے ہمیں جوش ملتا ہے اور مستقبل کے تصور سے حوصلہ ملتا ہے۔ اگر حوصلہ نہ ملے تو میں ہر وقت کیوں مشغول رہوں میں ہر وقت جامعہ کے مسائل میں اس درجہ الجھا رہتا ہوں کہ آسمان کے ستارے بھی نہیں دیکھ پاتا۔"

"میری تھوڑی مدت رہ گئی ہے۔ آپ لوگ میری مدد کیجیے تاکہ میں جامعہ کے لیے کچھ کام کر سکوں۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ یہ تاسیس کا جلسہ بچوں کی حکومت کے زیر اہتمام بہت عمدگی کے ساتھ ہوا۔ میں بچوں کی حکومت کے صدر اور وزیر اعظم کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ خدا کرے ان میں سے ایک ہمارے ملک کا صدر اور دوسرا وزیر اعظم بنے۔"

آخر میں صدر بچوں کی حکومت نے شیخ الجامعہ صاحب اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد جامعہ کا ترانہ ہوا۔

دیارِ شوق میرا شہرِ آرزو میرا

ہوئے تھے آ کے یہیں خیمہ زن وہ دیوانے
اٹھے تھے سن کے جو آواز رہبرانِ وطن
یہیں سے شوق کی بے ربطیوں کو ربط ملا
اسی نے ہوش کو بخشا جنوں کا پیراہن
یہیں سے لالۂ صحرا کو یہ سراغ ملا
کہ دل کے داغ کو کس طرح رکھتے ہیں روشن

دیارِ شوق مرا شہرِ آرزو میرا

یہ اہلِ شوق کی بستی یہ سر پھروں کا دیار
یہاں کی صبح نرالی یہاں کی شام نئی
یہاں کی رسم و رہِ مے کشی جدا سب سے
یہاں کے جام نئے طرحِ رقصِ جام نئی
یہاں یہ تشنہ لبی میکشی کا حاصل ہے
یہ بزمِ دل ہے یہاں کی صلائے عام نئی

دیارِ شوق مرا شہرِ آرزو میرا

یہاں پہ شمعِ ہدایت ہے صرف اپنا ضمیر
یہاں پہ قبلۂ ایمان کعبۂ دل ہے
سفر ہے دین یہاں کفر ہے قیام یہاں
یہاں پہ راہ روی خود حصولِ منزل ہے
شناوری کا تقاضہ ہے توبہ تو طوفاں
کنارِ موج میں آسودگیِ ساحل ہے

دیارِ شوق مرا شہرِ آرزو میرا

NEHRU TROPHY

مسند نشینی کا جلسہ بچوں کی حکومت کا سب سے اہم جلسہ ہوتا ہے ساتھیوں کی عید ہوتی ہے جلسہ کی تیاری کئی ہفتے پہلے سے جاری تھی نگراں صاحب اور اخلاق صاحب جلسے کی تیاری کرا رہے تھے۔ پھر آفتاب صاحب بھی اس میں شامل ہو گئے تھے۔ برابر ریہرسل ہوتی رہی۔

لیجیے آج وہ دن بھی آ گیا جس کا بڑا انتظار تھا ابھی کچھ دیر پہلے یوم تاسیس کا جلسہ ختم ہوا ہے۔ یہ صدر دروازہ ہے جہاں پر نزہت صاحبہ۔ فرحت صاحب۔ حسیب صاحب، رشید صاحب۔ عثمان صاحب۔ مشہود مفتی صاحب۔ نسیم صاحب۔ آفتاب صاحب۔ نگراں صاحب اور دیگر اساتذہ کی نگرانی میں N.S.S. کے والنٹیر اور چھوٹے چھوٹے بچے کرسیاں لگوا رہے ہیں، فرش بچھوا رہے ہیں۔ یعنی جلسہ گاہ کی ترتیب کا کام شروع کر دیا۔ انھیں لوگوں نے یوم تاسیس کے جلسے کے پنڈال کو بھی ترتیب دیا۔ میک اپ روم میں شکیل اختر فاروقی صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ آپ ہمارے ساتھیوں کا میک اپ کر کے ہمارے کام میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ نزہت صاحبہ بلقیس صاحبہ رضیہ صاحبہ بھی میک اپ میں مدد کر رہی ہیں۔

خورشید صاحب، عبدالرفیع اور سلیم کے ساتھ جا کر میک اپ کا سامان لائے ہیں۔ اخلاق صاحب ساتھیوں کو تیار کرا رہے ہیں لیجیے شام کے ساڑھے چھ بج چکے ہیں۔ بچوں کی حکومت کی مسند نشینی کی تقریب کی گہما گہمی اپنے عروج پر آ گئی ہے صدر دروازہ پر دونوں جانب ممبران پارلیمنٹ اور وزرا کے لیے نشست کا انتظام ہوا ہے۔ بالکل بیچ میں محراب کے نیچے ہوسٹل کے تخت ملا کر ایک اسٹیج بنایا گیا ہے، سامنے کی طرف فرش بچھا ہوا ہے۔ یہ بچوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے اس کے بعد مہمانوں کے لیے کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ مہمان آ چکے ہیں۔ بچوں نے اپنی جگہ سنبھال لی ہے۔ شیخ الجامعہ صاحب سابق صدر محمد اکبر خاں اور وزیر اعظم مظہر آصف انصاری کے ساتھ جلسہ گاہ میں داخل ہو چکے ہیں۔ تلاوت کلام پاک سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ سابق صدر نے اپنے کاموں کی رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد وزیر اعظم نے مائک سنبھالا اور ان کے اس شعر کے ساتھ ہی نئی کابینہ آہستہ آہستہ جلوس کی شکل میں جلسہ گاہ میں داخل

ہو رہی ہے۔

رقص میں تیز کر دے ساز کی لے تیز کر دے
سوئے میخانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں

آگے آگے چیف جسٹس امتیاز احمد، صدر سعید احمد، وزیراعظم عاصم قاسمی، وزیر داخلہ خالد سیف اللہ، وزیر تعلیم صوفیہ خاتون، وزیر مالیات انجم آصف انصاری، وزیر خوراک سلیم خاں، وزیر آرٹس جہاں آرا، وزیر صحت و صفائی مسعود احمد، وزیر [illegible] عبدالرحیم، وزیر اطلاعات شائستہ بیگم۔ یہ تمام عہدیداران اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ حلف اٹھانے کی رسم ادا کی گئی۔ چیف جسٹس نے صدر کو حلف دلوایا۔ پھر صدر نے وزیراعظم کو حلف دلوایا اور وزیراعظم نے اپنی کابینہ کو حلف دلوایا۔

حلف وفاداری "میں سچے دل سے خدا کو حاضر و ناظر جان کر حلف لیتا ہوں کہ بچوں کی حکومت کی جو ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی ہے میں حکومت کا صدر ہونے کی حیثیت سے وفاداری اور دیانت داری کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دوں گا اور تمام صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے بچوں کی حکومت کے آئین کے مطابق ہر طالب علم کے ساتھ بغیر کسی رعایت یا لاگ لگاؤ کے ٹھیک ٹھیک برتاؤ کروں گا اور ان کی خدمت اور فلاح و بہبود کے لیے پوری سنجیدگی سے کوشش کروں گا۔" مس زہرہ [illegible] فاروقی نے عہدیداران کو ہار پہنائے۔

اس کے بعد [illegible] سروری بانو، فاطمہ زہرہ، رضوانہ اسد، درخشاں آرا، مشیر زہرہ، [illegible] خاتون، نکہت جہاں، ناصر خورشید، ممتاز [illegible]، یاسمین جہاں، عابدہ بیگم، نجم السحر، [illegible] سمیع مشیر نے مبارکباد کی نظم پڑھی۔

مبارک ہو یہ رسم مسند نشینی

حکومت کی [illegible] ۔ [illegible] وزارت بھی اپنی بنالی
[illegible] کامیابی [illegible] ۔ [illegible] حکومت [illegible]
مبارک ہو یہ رسم مسند نشینی
حکومت کو [illegible] ۔ مقاصد کو اپنے نہ تم بھول جانا
[illegible] سمجھ کر قدم اپنا آگے بڑھانا

مبارک ہو یہ رسم مسند نشینی

منیران سے کہنا ہے سارا زمانا فرائض کو اپنے نہ تم بھول جانا
غرض یہ کہ کچھ ایسے جوہر دکھانا جو وعدے کیے ہیں انھیں تم نبھانا

مبارک ہو یہ رسم مسند نشینی

اس کے بعد سابق وزیراعظم مظہر آصف نے شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی کو دعوت دی کہ وہ مائک پر آئیں اور ہمیں اچھی اچھی باتیں بتائیں۔

تالیوں کی گونج میں شیخ الجامعہ صاحب مائک پر آئے اور انھوں نے فرمایا کہ آج ہی شعبہ انجینیرنگ کے ایک جلسے میں وزیر کامرس جناب خورشید عالم خاں نے کہا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم یوم تاسیس کے جلسے میں ایسے ہی شریک ہوتے رہے ہیں کہ بچوں کی حکومت کے عہدیداران ان کے راہبر ہیں وہ ایسے جلسوں میں شرکت کرکے بہت خوش ہوتے تھے۔

قدوائی صاحب نے فرمایا "میں فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج صبح تقریباً ۲ گھنٹے تک میں بچوں کے ساتھ رہا۔ بچوں کی حکومت کے صدر سعید احمد اور وزیراعظم عاصم قاسمی میرے راہبر رہے۔ آج یوم تاسیس کے جلسہ کی صدارت انھیں صدر صاحب نے کی اور نظامت کے فرائض وزیراعظم نے انجام دیے۔"

شیخ الجامعہ کے ان الفاظ کے ساتھ مسند نشینی کا جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

(رپورٹر۔ ریاض الدین۔ نوقمر عالم)

'بچوّں کی حکومت' کے عہدیداران کا تعارف

سعید احمد (صدر)

ان کا وطن بدایوں ہے۔ بدایوں شریف کے اثرات اور نام کی برکات کے سبب ان کا سراپا سعید ہی سعید ہے۔ نہایت شریف سیدھے اور بھلے ہیں۔ قد چھوٹا ہے لیکن سمجھداری میں اپنی عمر سے کافی بڑے معلوم ہوتے ہیں۔ اوّل کلاس سے ہی جامعہ مڈل اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ اس وقت ہشتم کے طالب علم ہیں۔ کھیلنے سے زیادہ کرکٹ کمینٹری سننے کا شوق ہے۔ ہر طرح کے مقابلوں میں حصہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی کوشش کے نتیجے میں صدارت کی کرسی تک پہنچے ہیں۔ انشاءاللہ عملی زندگی میں بھی ان کی یہ کوشش ضرور رنگ لائے گی۔

ان کے اساتذہ اور سب ساتھی ان کو پیار میں بھیا کہتے ہیں اس لیے یہ جگت بھیا ہو گئے ہیں۔

محمد عاصم قاسمی (وزیر اعظم)

آپ کا تعلق دیوبند سے ہے۔ ذہین اور ہونہار طالب علم ہیں۔ خود اعتمادی ہے۔ اسی لیے ایک سال میں دو کلاسیں پاس کریں پھر بھی پڑھنے میں پیچھے نہیں۔ حافظِ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ تجوید سے بھی واقف ہیں۔

شاید اسی وجہ سے نظم بھی خوب پڑھتے ہیں۔ اپنی انھی خوبیوں کی وجہ سے دو سال کی قلیل مدت میں امسال بچوں کی حکومت کے وزیر اعظم بنائے گئے۔

تنویر اکرام (اسپیکر)

وطن فرخ آباد ہے۔ کافی ذہین اور محنتی ہیں۔ امسال نہم سے ہفتم میں آئے ہیں۔ پھر بھی امتحان میں پوزیشن حاصل کی ہے۔ ابتدائی تعلیم سر سید نگر (علی گڑھ) کے ایک انگلش میڈیم اسکول میں ہوئی۔

اس میڈیم کے اثرات زبان پر ہیں۔ پارلیمنٹ سیشن میں اسپیکر کے فرائض انجام دیتے ہوئے بے تکلف انگریزی میں کارروائی چلانے لگنا اس کا ثبوت ہے۔ حرف 'ب' سے بڑا لگاؤ ہے۔ اسی لیے برش (ڈرائنگ) بیٹنگ اور باؤلنگ (کرکٹ) سے عشق ہے۔

اپنے کو اعظمی بتلاتے ہیں۔ گذشتہ سال ہفتم میں داخلہ لیا تھا۔ اب ہشتم کے طالب علم ہیں کم گو ہیں اور حاصے ذہین ہیں۔ اسی لیے چیف جسٹس کے اہم عہدہ پر براجمان ہیں۔ قد کسی قدر لمبا ہے سی لیے بغیر کوشش کے خود بخود فٹ بال کے اچھے کھلاڑی بن گئے ہیں۔

امتیاز احمد انصاری (چیف جسٹس)

تعلیم کا شوق ان کو کلکتہ سے کھینچ کر یہاں لایا ہے۔ تعلیم پر توجہ کم، کلاس ہوسٹل اور اسکول کے مسائل پر توجہ زیادہ دیتے ہیں۔ اسی لیے وزیر داخلہ بنائے گئے۔ دوسرے بنگالی حضرات کی طرح یہ بھی فٹ بال کے رسیا ہیں آپ آٹھویں کلاس کے طالب علم ہیں۔

خالد سیف اللہ (وزیر داخلہ)

ان کا وطن بھدوئی ہے۔ جو قالین کی ایکسپورٹ کے لیے مشہور صنعتی شہر ہے۔ صنعتی شہر کی پیداوار ہونے کے سبب یہ' روپے، کی قیمت اور اس کی اہمیت کو اس کم عمری میں خوب سمجھتے ہیں۔ اسی فہم کے سبب' روپیا، جوڑ کر رکھنا ان کو بہت عزیز ہے۔ شاید اسی وجہ سے وزیر اعظم نے ان کو' مالیات، کا قلمدان سپرد کیا ہے۔ وزیر موصوف کا خیال ہے کھیل میں پیسا اور وقت دونوں کی بربادی ہے۔ اسی لیے کھیل سے دلچسپی صفر کے درجے میں ہے۔

ظہیر آصف (وزیر مالیات)

صوفیہ خاتون (وزیر تعلیم)

یہ صحیح معنوں میں علم کی طالبہ ہیں۔ اس لیے ان کا محبوب مشغلہ صرف صحیح علم کی سچی طلب ہے۔ اسی سچی طلب نے ان کو ششم کلاس کی طالبہ ہوتے ہوئے گذشتہ سال 'ہبز وپرائز' سے نوازا۔ اپنی علمی صلاحیت کے سبب 'وزیر تعلیم' کے عہدہ پر مامور ہیں۔ مشہور افسانہ نگار پریم چند کا وطن ان کا وطن ہے۔ اسی لیے ادبی ذوق بلند ہے۔ اس شمارے میں ان کی ایک کہانی چھپ رہی ہے۔

ہزار ہا بلند پایہ اشعار یاد ہیں۔ ہر سال اسکول اور کلاس میں پوزیشن حاصل کرتی ہیں۔

شائستہ بیگم (وزیر اطلاعات ونشریات)
مہمان ایڈیٹر پیام تعلیم "تعلیمی میلہ نمبر"
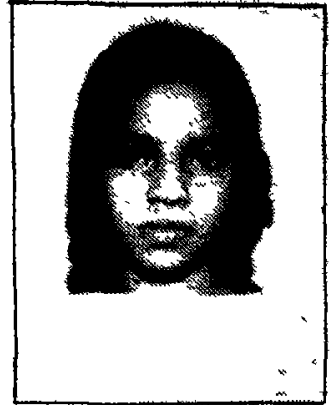
یہ نام کی ہی نہیں بلکہ کاموں میں بھی شائستہ ہیں۔ ہر کام کو سلیقے سے کرنا جانتی ہیں۔ اسی لیے اطلاعات جیسے اہم شعبے اور تعلیمی میلہ نمبر کی ادارت کی ذمےداری ان کے سپرد کی گئی۔

نہایت ذہین اور کافی محنتی ہیں۔ بہت سے معیاری اشعار یاد ہیں۔ تقریر سے زیادہ تحریر میں دلچسپی ہے۔ اسی لیے سیرت کے تحریری مقابلے میں اوّل انعام بھی حاصل کر چکی ہیں۔

جہاں آرا (وزیر آرائش)

جناب صدر اور وزیر اعظم صاحب نے شاید 'آرا' کی لفظی مناسبت کے سبب ان کو آرائش کا وزیر بنا دیا۔ وزیر بن جانے کے بعد انھوں نے اپنی ذمےداری کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

پڑھنے میں خوب دلچسپی لیتی ہیں۔ ان کا تعلق اعظم گڑھ کی زرخیز زمین سے ہے۔

مسعود احمد (وزیر صحت و صفائی)
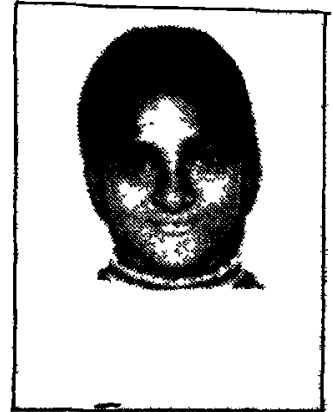
مشرقی یوپی کے ضلع بستی کے رہنے والے ہیں۔ آٹھ سال سے مڈل اسکول میں زیر تعلیم ہیں محنتی طالب علم ہیں۔ صفائی پسند بھی ہیں۔ اسی لیے یہ محکمہ ان کے سپرد کیا گیا۔ کرکٹ کے کھلاڑی ہیں۔ بیٹنگ سے کم اور باؤلنگ سے زیادہ دلچسپی ہے۔

سلیم خاں (وزیر خوراک)

بھارت کی راجدھانی 'دلی' ان کا وطن ہے۔ 'دلی والا' ہونے پر فخر کم اور اکڑ زیادہ دکھلاتے ہیں' خان' ان کے نام کا ہی جز نہیں۔ عادت کا بھی جز بن گیا ہے۔ اسی لیے ساتھیوں نے ان کو مطبخ سے جوڑ دیا ہے۔ جب سے اس عہدہ کی ذمے داری قبول کی ہے تب سے خاصے ذمے دار ہو گئے ہیں ورنہ ہفتہ میں دو تین بار گھر جانا ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ کرکٹ کے دلدادہ ہیں۔ امید ہے اس سال آٹھویں کلاس پاس کرلیں گے

محمد ابراہیم (وزیر کھیل)
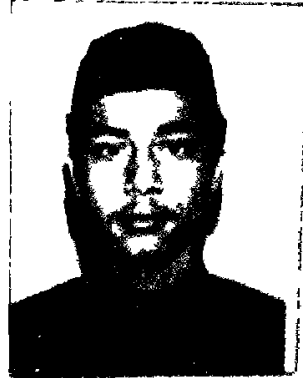
بچوں کی حکومت کی کابینہ میں آپ راجستھان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ آٹھویں کلاس کے طالب علم ہیں یہ طالب علم کم (اور) مکینک زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ ہر کام نہایت ذمے داری اور دلچسپی سے کرتے ہیں۔ ان کے اسی مزاج نے ان کو کھیل کا وزیر بنا دیا ہے۔

پارلیمنٹ کا اجلاس

کردار

۱۔ چیف جسٹس — امتیاز احمد انصاری
۲۔ صدر — سعید احمد
۳۔ اسپیکر — تنویر اکرام
۴۔ پرائیویٹ سیکریٹری — محمد نصرت
۵۔ ملٹری سیکرٹری — عاصم رشید

عہدیدارانِ پارلیمنٹ

۱۔ وزیرِ اعظم (پارٹی لیڈر) — محمد عاصم قاسمی
۲۔ وزیرِ داخلہ — خالد سیف اللہ
۳۔ وزیرِ خوراک — سلیم خاں
۴۔ وزیرِ تعلیم — صوفیہ خاتون
۵۔ وزیرِ صحت و صفائی — مسعود احمد
۶۔ وزیرِ آرائش — جہاں آرا
۷۔ وزیرِ کھیل — عبدالرحیم قریشی
۸۔ وزیرِ مالیات — اظہر آصف انصاری
۹۔ وزیر اطلاعات و نشریات — شائستہ بیگم

ممبرانِ بچوں کی حکومت

۱۔ یٰسین احمد لداخی — برق رفتار خاں
۲۔ شارق نذیر
۳۔ وسیم احمد انصاری
۴۔ ریاض الدین
۵۔ محمد اسمٰعیل
۶۔ شاہدہ خاتون
۷۔ ساجد اختر
۸۔ رئیس احمد

اپوزیشن ممبران

۱۔ مظہر آصف — اپوزیشن لیڈر
۲۔ مرزا قمر الحسن بیگ — ممبر
۳۔ ضیا حیدر — ″
۴۔ یاسر جلال — ″
۵۔ فرحانہ رحیم — ″
۶۔ شبینہ مجیب — ″
۷۔ نشاط پروین — ″
۸۔ لبنیٰ فرقان — ″
۹۔ محمد عابد — ″
۱۰۔ نجیب سلطان — ″
۱۱۔ مسیح الزماں — ″
۱۲۔ اعجاز حسین زیدی — ″
۱۳۔ شامہ خورشید — ″
۱۴۔ سروری بیگم — ″
۱۵۔ رضوانہ اسد

۱۶۔ روضۃ الآرا
۱۷۔ مصطفٰے احمد صدیقی
۱۸۔ مرزا اظفر بیگ

مارشل اور ایڈی کانگ

۱۔ سرفراز احمد انصاری
۲۔ محمد افضل غوری
۳۔ عرفان العزیز
۴۔ آفتاب عالم
۵۔ حسن ساجد اختر
۶۔ شکیل رزاق
۷۔ عبدالرفیع قریشی
۸۔ سطوت حسین تاسی

ڈرم بجانے والا

توقیر عالم

بگل بجانے والے

۱۔ مدبر احمد لداخی
۲۔ عارف لداخی
۳۔ شکیل احمد
۴۔ عامر جلال

گارڈ

۱۔ محمد طلال
۲۔ گلزار احمد
۳۔ گوہر تمیم

بچوں کی حکومت کی پارلیمنٹ کا اجلاس جامعہ مڈل اسکول کا ایک اہم پروگرام تھا۔ اس دلچسپ پروگرام کے ذریعے پارلیمنٹ سے متعلق بہت سی معلومات فراہم

کی گئی تھیں۔ یہ پروگرام نئی حکومت کی مسند نشینی سے شروع ہوا۔ سابق صدر محمد اکبر خاں اور سابق وزیر اعظم منظر آصف نے اپنی اپنی رپورٹیں پیش کیں اور اس کے بعد نئی کابینہ ایک جلوس کی شکل میں پنڈال میں داخل ہوئی۔ اور حکومت کے عہدے دار اپنی اپنی جگہوں پر جاکر بیٹھ گئے۔ چیف جسٹس نے صدر بچوں کی حکومت کو، صدر نے وزیر اعظم بچوں کی حکومت کو اور وزیر اعظم نے اپنی کابینہ کے وزرا کو حلف دلایا۔ اس کے بعد مسند نشینی کا ترانہ ہوا۔ یہ خوبصورت تقریب شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب کی تقریر پر ختم ہوئی۔ آپ نے اس مبارک موقع پر فرمایا۔ "مڈل اسکول کے بچوں سے مل کر اور ان کے پروگراموں میں شرکت کرکے مجھے ہمیشہ بڑی مسرت ہوتی ہے۔ میری دعا ہے کہ آپ بڑے ہوکر خوب ترقی کریں اور اپنے ادارے کا نام روشن کریں۔"

مسند نشینی کے دلچسپ اور رنگارنگ پروگرام کے بعد پارلیمنٹ کا باقاعدہ اجلاس شروع ہوا۔ یہ اجلاس چار حصوں میں بٹا تھا۔ سب سے پہلے صدر بچوں کی حکومت نے دونوں ایوانوں کے ممبران کو خطاب کیا۔ دوسرے سیشن میں صدر کے خطبہ پر شکریہ کی تجویز زیر بحث آئی۔ تیسرے سیشن میں پارلیمنٹ کی روزمرہ کی کارروائی اور چوتھے سیشن میں عدم تعاون کی تجویز پر بحث کی جھلکیاں پیش کی گئیں۔

پہلا سیشن

اسٹیج روشن ہوتا ہے۔ ہال میں پارلیمنٹ کے ممبران بیٹھے ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ ہال کے صدر دروازے کے دونوں جانب بگل بجانے والے زرق برق لباس میں کھڑے ہوئے ہیں۔ اچانک لوک سبھا کے اسپیکر اور راجیہ سبھا کے چیرمین صدر دروازے کی طرف بڑھتے ہیں۔ صدر بچوں کی حکومت کا جلوس صدر دروازے پر پہنچنے والا ہے۔ جلوس

ہیں جب سے آگے فوجی یونیفارم میں صدر کے دو ایڈی کانگ اجن سے دو قدم کے فاصلے پر جناب صدر' ان کے پیچھے صدر کے ملٹری سکریٹری اور پرائیویٹ سکریٹری ان کے پیچھے دو اور ایڈی کانگ قدم بہ قدم آگے بڑھ رہے ہیں۔ صدر دروازے کے قریب آکر یہ جلوس ٹھہر جاتا ہے۔ لوک سبھا کے اسپیکر اور راجیہ سبھا کے چیرمین جناب صدر کا خیر مقدم کرتے ہیں اور جلوس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ جلوس پھر حرکت میں آتا ہے۔ اور بچوں کی حکومت کی فوج کا ایک دستہ صدر کو گارڈ آف آنر پیش کرتا ہے۔ جلوس جیسے ہی ہال میں داخل ہوتا ہے۔ سب ممبران کھڑے ہو جاتے ہیں اور مارشل کے اس اعلان کے ساتھ "عزت مآب صدر بچوں کی حکومت" بگل بجانے والے خیر مقدم کی دُھن بجاتے ہیں۔ اس دُھن کے ساتھ نقارے کی دھمک بھی شامل ہے۔ جلوس ہال کے دوسرے کنارے پر پہنچتا ہے۔ اور صدر بچوں کی حکومت ڈائس تک پہنچتے ہیں۔ ان کی کرسی کے پیچھے ان کے دو ایڈی کانگ کھڑے ہوتے ہیں۔ بائیں طرف اسپیکر لوک سبھا اور داہنی طرف راجیہ سبھا کے چیرمین موجود ہیں۔ باقی لوگ اپنی اپنی کرسیوں تک پہنچ چکے ہیں۔ بچوں کی حکومت کا ترانہ شروع ہوتا ہے۔

حکومت کا ترانہ

زندہ باد زندہ باد زندہ باد
نونہالوں کی حکومت زندہ باد
ہم سے زندگی کا رنگ ہے
ہم سے زیست کی ترنگ ہے
ہم بنائیں گے نیا جہاں
ہم سجائیں گے نیا چمن
ہم چراغ علم کے جلائیں گے
ہم سجائیں گے نئی اک انجمن
آؤ آؤ ننھے ساتھیو
قہقہے زمین پر بکھیر دو!
دکھ کے اندھکار کو سمیٹ دو
ہم ہیں زندگی کے پاسباں
ہم بنائیں گے نیا جہاں
ہم بنائیں گے نیا جہاں
ہم بنائیں گے نیا جہاں

ترانہ ختم ہونے پر سب لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ جاتے ہیں اور صدر بچوں کی حکومت، اپنا خطبہ پڑھتے ہیں۔

معزز ممبران پارلیمنٹ اور اراکین کابینہ

یہ میرا خوشگوار فرض ہے کہ میں تمام ممبران پارلیمنٹ اور حکومت کے عہدیداران کو مبارک باد پیش کروں۔ یقیناً یہ آپ کی محنت اور لگن کا نتیجہ ہے' تمام طلبہ نے مل کر آپ کو حکومت کرنے کا اختیار دیا ہے۔ اور اس کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ میں شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں آپ کا بھی اور اسکول کے تمام ساتھیوں کا بھی کہ انھوں نے مجھے بچوں کی حکومت کی صدارت کے لیے منتخب کیا ہے یہ آپ سب کی ذرّہ نوازی ہے۔ آپ نے مجھے بچوں کی حکومت کا صدر بنا کر جو عزت بخشی ہے اس کے لیے میں آپ کا دل سے ممنون ہوں یہ ذمہ داری بڑی ہے خدا کرے میں اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر سکوں۔ اس سے بھی زیادہ فکر مجھے اس بات کی ہے کہ آپ کے اس اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچے جس کا اظہار آپ نے مجھے منتخب کر کے کیا ہے۔

ساتھیو! آج کا دن بڑا اہم ہے۔ یہ جامعہ کی سال گرہ کا دن ہے اس موقع پر میں تمام ساتھیوں کو جامعہ کی ۶۱ ویں سالگرہ کی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام غلامی کے خلاف بغاوت کا اعلان تھا۔ خاص طور پر اس ذہنی غلامی کے خلاف جو فرنگی دورِ حکومت میں اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم کے نام پر پیدا کی

جارہی تھی۔

جامعہ کے قائم کرنے والے لوگ آزادی کے پروانے تھے۔ مہاتما گاندھی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں اور علی برادران کے علاوہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب اور ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب یہ چاہتے تھے کہ جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے والے تمام لڑکے اور لڑکیاں ہر طرح کی غلامی سے آزاد ہوں۔ یہاں کے طالب علم آزادی کی اہمیت کو اچھی طرح جان لیں۔ اپنی آزادی کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھیوں کی آزادی کا احترام کرنا بھی سیکھیں۔ وہ خود غرضی کی زنجیروں سے آزاد ہوں۔ وہ نفس پرستی کے جال سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں وہ ذہنی اور جسمانی غلامی میں نہ پھنسیں کیونکہ غلامی ہمیشہ انھیں چور دروازوں سے انسانوں پر حملہ آور ہوتی ہے۔ اور انھیں ناکارا اور ناکام بناکر چھوڑتی ہے۔

اس لیے جامعہ نے تعلیم کے نئے نئے انداز اپنائے اور بچوں کو ایسے مواقع فراہم کیے کہ وہ اپنے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو تلاش کر سکیں، اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکیں اور اپنے آپ پر بھروسہ کرنا سیکھیں اور اپنے کاموں سے خود اپنے آپ کو فائدہ پہنچا سکیں۔ اپنے گھر، اپنے اسکول، اپنے گاؤں اپنے شہر اور اپنے ملک کو روز بروز بہتر بناتے چلے جائیں۔ آپ جس اسکول میں ہیں وہ بڑی عجیب جگہ ہے۔ یہاں آپ کو بہت کچھ کرنے، بہت کچھ سیکھنے کا موقع ہے۔ میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا۔ آپ سبھی جانتے ہیں کہ ایسی بہت سی چیزیں ہمارے اسکول میں ہیں جو عام طور پر اسکولوں میں نہیں ملیں گی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں آپ کی خود اپنی حکومت ہے۔ یہ حکومت اگر چاہے تو نہ صرف یہ کہ ہم ان تمام چیزوں سے بھرپور فائدہ حاصل کر سکتے ہیں بلکہ ایسی چیزیں بھی حاصل کر سکتے ہیں جو بدقسمتی سے ابھی ہمارے یہاں نہیں ہیں۔

ہماری حکومت کو سب سے پہلے تو اس بات پر زور دینا چاہیے کہ جو سہولیات ہمیں حاصل ہیں ان کا پورا پورا استعمال ہو تاکہ اسکول کے تمام بچے اس فائدہ کو حاصل کر سکیں۔ کام صرف خواہش کرنے اور چاہنے سے نہیں ہو جاتے۔ کام اس طرح بھی نہیں ہوتے کہ آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور دوسروں سے یہ توقع رکھیں کہ کام آپ کی خواہش کے مطابق ہو جائے گا۔ کام ہوتا ہے خود کرنے سے۔ بچوں کی حکومت کے سامنے بہت سے کام ہیں۔ تقریباً ہر طرح کا کام کرنے کے لیے وزرا موجود ہیں۔ ہر وزیر کو چاہیے کہ وہ اپنے کاموں کو اچھی طرح سمجھ لے، اپنے کاموں کے لیے ساتھیوں کی ایک ٹیم تیار کرے اور اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ ہماری حکومت صفائی، (نظم وضبط) ڈسپلن اور تعلیم کی طرف توجہ دے اور کوشش کرے کہ ان معاملات میں ہمارا اسکول نمونے کا اسکول بن جائے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے اسکول میں بعض ایسی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے ہماری تمام تر کوشش کے بعد بھی نتیجہ وہ نہیں نکلتا جو نکلنا چاہیے۔ مثلاً بورڈنگ ہاؤس میں طلبہ کے لیے نہ تو سامان رکھنے کی جگہ ہے نہ کپڑے بدلنے کی۔ غسل خانے بہت کم ہیں۔ لیٹرین (بیت الخلاء) ہیں لیکن نہایت بوسیدہ حالت میں۔ کچھ تو یہ خود ہی خراب ہیں اور کچھ ہمارے ساتھی ان کو خراب رکھتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہمارے سینئر ساتھی نئے آنے والے ساتھیوں کو (Latrines & Bathrooms) کے استعمال کے آداب سکھا سکیں۔

اسکول میں کلاسوں کی کمی کا اثر ہماری تعلیم پر پڑتا ہے۔ بھلا برآمدوں اور گھٹے ہوئے کمروں میں تعلیم کا کام کیوں کر بہتر طور پر انجام دیا جاسکتا ہے۔

اسکول کے ... لڑکے لڑکیوں کے لیے نہ تو کوئی Ground ہے اور نہ ہی کامن روم۔ مسند نشینی کے جلسوں میں بار بار ان باتوں کا ذکر ہوتا رہا ہے لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ہماری حکومت کو چاہیے کہ وہ اس سلسلے میں کوئی ٹھوس اور مثبت قدم اٹھائے۔

میں نے ان خامیوں کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا ہے۔ کہ عہدیداران حکومت جامعہ کے ذمہ داران سے اس سلسلے میں بات چیت کرے اور جلد از جلد ان سہولیات کی فراہمی کا انتظام کرے لیکن میں ایک بار مزید کہنا چاہوں گا کہ ان خامیوں کی وجہ سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

مشکلات میں رہ کر بھی زندگی کو خوشگوار بنایا جاسکتا ہے وسائل نہ ہوں تو کام کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہے جامعہ کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی جامعہ کے لوگوں نے ایسے ایسے کام کرکے دکھا دیے کہ دنیا حیران رہ گئی۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے اس کا صحیح استعمال اور جو نہیں ہے اسے حاصل کرنے کی مسلسل کوشش سے ترقی کی راہیں ہمارے لیے کھلتی چلی جائیں گی۔ اس کا مجھے یقین ہے بچوں کی حکومت اسکول کے تمام ساتھیوں کی راہ بر ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا حکومت کے عہدیداران کو دل و نظر کی وسعت اور بلندی کے ساتھ ساتھ یقین کی دولت اور سفر پیہم کے جوہر سے مالا مال کر دے۔

نظر بلند نگہہ جاں نواز دل پُر سوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

اور آخر میں اس شعر کے ساتھ آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

بچوں کی حکومت پائندہ باد۔

خطبہ ختم ہوتا ہے۔ بچوں کی حکومت کا ترانہ دوبارہ شروع ہوجاتا ہے۔ ترانے کے بعد صدر کا جلوس اسی شان و شوکت کے ساتھ واپس ہوتا ہے۔ روشنیاں مدھم ہونے لگتی ہیں اور اسٹیج اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے۔

دوسرا سیشن

اسٹیج روشن ہوتا ہے۔

مارشل بلند آواز سے کہتا ہے۔

محترم اسپیکر

(تمام لوگ کھڑے ہوجاتے ہیں) اسپیکر اپنے چیمبر سے ہال میں داخل ہوتا ہے اور ایوان کو تعظیم دے کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔

تمام لوگ بیٹھ جاتے ہیں..... کورم کی گھنٹی بجتی ہے اور اسٹیج پر ایک ہرا بلب روشن ہوتا ہے۔

اسپیکر: محترم ممبران۔ آج کے ایجنڈے کے مطابق صدر بچوں کی حکومت کا خطبہ بحث کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ میں محترم وزیر داخلہ سے گزارش کروں گا کہ وہ شکریہ کی تجویز پیش کریں۔

وزیر داخلہ: جناب بچوں کی حکومت کا خطبہ ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔

محترم صدر نے حکومت کے جن مسائل کی نشاندہی کی ہے اور ان کو حل کرنے کے لیے جو طریقے بتلائے ہیں، ہم اس کے لیے جناب صدر کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور ایوان کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ہم محترم صدر کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرتے رہیں گے۔ ان الفاظ کے ساتھ میں شکریہ کی تجویز ایوان کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

اسپیکر: محترمہ وزیر اطلاعات شائستہ بیگم صاحبہ۔

شائستہ بیگم: میں اس تجویز کی پُرزور الفاظ میں تائید کرتی ہوں۔

اسپیکر: محترم وزیر داخلہ کی شکریہ کی تحریک پر بحث کا آغاز حزب مخالف کے لیڈر مظہر آصف صاحب کریں گے۔

مظہر آصف (لیڈر حزب مخالف): پارلیمانی روایات کے مطابق صدر کے خطبہ کے بعد ممبرانِ پارلیمنٹ کا خوشگوار فرض ہے کہ وہ صدر کا شکریہ ادا کریں۔ کاش کہ میں بھی اس موقع پر دل کھول کر معزز وزیر داخلہ کی شکریہ کی تحریک کی موافقت کر سکتا مگر افسوس خطبۂ صدارت میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس کا شکریہ ادا کیا جائے۔ جناب صدر نے صرف اونچی اونچی باتیں کی ہیں۔ انھوں نے صاف صاف حکومت کی پالیسی کی وضاحت نہیں کی ہے اور اس طرح موجودہ حکومت کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ جو جی چاہے کرتی رہے۔

وزیر داخلہ: محترم اسپیکر! صدر کسی ایک پارٹی کا صدر نہیں ہوتا۔ اپوزیشن لیڈر نے صدر پر الزام لگا کر بچوں کی حکومت کی توہین کی ہے۔ معزز ممبر کو اپنے الفاظ واپس لینے چاہییں۔

اسپیکر: وزیر داخلہ از راہ کرم خاموش رہیں۔ معزز اپوزیشن لیڈر اپنی بات پوری کریں۔

اپوزیشن لیڈر: معزز وزیر داخلہ نے مجھ پر حکومت کی توہین کرنے کا غلط الزام لگایا ہے۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔

(ٹریژری بنچ سے آواز آتی ہے۔ کہی ہے۔ کہی ہے
۔۔۔ شور ۔۔۔)

اسپیکر (میز پر ہاتھ مارتا ہے)

مرزا ظفر بیگ: محترم اسپیکر! حکمراں پارٹی شور مچا کر نہ صرف جمہوری طریقۂ کار کا مذاق اڑا رہی ہے بلکہ حقائق اور اپنی کمزوریوں کو شور میں دبا دینا چاہتی ہے۔

اپوزیشن: شرم شرم کے نعرے اسپیکر میز پر ہاتھ مارتا ہے

اسپیکر: معزز ممبران سے درخواست ہے کہ وہ ایوان کے وقار کا لحاظ رکھیں اور معزز ممبر کی بات سنیں۔

مظہر آصف: جناب والا! ہمارے صدر نے ہمارے کئی اہم مسائل کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ مثلاً کھیل کے انتظام کے بارے میں۔ اطلاعات و نشریات کے شعبہ کی بے عملی کے بارے میں۔ صحت و صفائی کی طرف سے غفلت اور اسی طرح کے دوسرے مسائل کے بارے میں۔۔۔ اس لیے میں وزیر داخلہ کے شکریہ کی موجودہ تجویز کی سخت مخالفت کرتا ہوں اور ایوان سے درخواست کرتا ہوں کہ شکریہ کی تجویز میں خطبہ کی تمام خامیوں کا ذکر صاف الفاظ میں کیا جانا چاہیے۔

اسپیکر: محترم فوڈ منسٹر جناب سلیم خاں صاحب

فوڈ منسٹر: محترم اسپیکر میرے خیال میں جناب صدر کا خطبہ بہت جامع تھا۔ اس پر بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لیے میرا خیال ہے کہ وزیر داخلہ کی شکریہ کی تجویز پر ووٹنگ کرالی جائے۔

اپوزیشن ممبر ضیا حیدر: اسپیکر صاحب! میرا خیال تھا کہ ہوم منسٹر کی شکریہ کی تجویز پر ووٹنگ سے پہلے جناب صدر کے ایڈریس پر بحث ہو جاتی تو اس حکومت کے ارادوں کا کچھ پتا چل جاتا۔ فوڈ منسٹر صاحب جلد ہی ووٹنگ کرا کے ڈائننگ ہال کے رازوں کو راز ہی رکھنا چاہتے ہیں۔

(قہقہہ ۔۔۔۔۔۔)

اسپیکر: (میز پر ہاتھ مارتا ہے) معزز ممبران! بحث میں خاصا وقت نکل چکا ہے۔ میں محترم وزیر داخلہ کی تجویز ووٹنگ کے لیے پیش کرتا ہوں۔

اپوزیشن ممبر مسیح الزماں: جناب والا! میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

اسپیکر: آپ تشریف رکھیے۔

مسیح الزماں: لیکن جناب عالی آپ ہماری
ق تلفی.......

اسپیکر: آپ بیٹھ جائیے۔

مسیح الزماں: محترم اسپیکر! یہ زیادتی....

اسپیکر: آپ تشریف رکھیں.......

اپوزیشن بنچ سے کئی آوازیں۔ مگر......

مسیح الزماں: یہ سراسر زیادتی ہے
ں اس پر سخت احتجاج کرتا ہوں۔ نوٹ کیا جائے کہ
ں اسپیکر کے رویّہ کے خلاف واک آؤٹ کرتا ہوں۔

(ممبر باہر نکل جاتا ہے اس کے ساتھ چند اور
ں بھی باہر نکل جاتے ہیں)

اسپیکر: I put the resolution moved by Hon. Home Minister Mr. Khalid Sa Ullah and seconded by Hon. Minister Miss Shaista Begum to vote.

اسپیکر: جو حضرات اس تجویز کے حق میں ہیں
پنے ہاتھ اُٹھالیں۔

(۳۰ ممبران ہاتھ اٹھاتے ہیں)

جو حضرات اس تجویز کے مخالف ہیں اپنے ہاتھ اوپر
ٹھالیں۔

(۱۳ ممبران ہاتھ اٹھاتے ہیں)

جن حضرات نے اس تجویز پر ووٹنگ میں حصہ
نہیں لیا ہے وہ اپنے ہاتھ اٹھالیں

(۶ ممبران ہاتھ اٹھاتے ہیں)

اسپیکر: شکریہ۔

محترم وزیر داخلہ کی شکریہ کی پیش کردہ تجویز
منظور کی گئی۔ ایوان کی آج کی کارروائی ختم ہوتی ہے۔
(اسپیکر کرسی سے اٹھتا ہے۔ روشنیاں گل ہو جاتی ہیں)

تیسرا سیشن

تمام ممبران اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے ہیں

مارشل: محترم اسپیکر

(اسپیکر چیمبر سے داخل ہوتا ہے۔ تمام ممبران کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اسپیکر کے بیٹھنے کے بعد اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

(کورم بیل بجتی ہے)

اسپیکر: معزز اراکین! اس سے پہلے کہ ایوان کی باقاعدہ کارروائی شروع ہو... میں اراکین پارلیمنٹ کو بڑے افسوس کے ساتھ یہ اطلاع دیتا ہوں کہ پچھلے ماہ کھیل پور کے حلقۂ انتخاب کے جناب کبڈی باز خاں کا انتقال ہو گیا۔ کبڈی باز خاں اس ایوان کے پرانے رکن تھے۔ ان کے انتقال سے کھیل کی دنیا رنج و غم میں ڈوب گئی ہے۔ ایوان ان کی بے وقت موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور پسماندگان کے غم میں پوری طرح شریک ہے۔

آپ حضرات سے درخواست ہے کہ دو منٹ خاموش کھڑے ہو کر مرحوم کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں۔

(سب کھڑے ہو جاتے ہیں دو منٹ کی خاموشی کے بعد سب لوگ بیٹھ جاتے ہیں)

اسپیکر: اب میں جناب برق رفتار جی کا خیر مقدم کرتا ہوں جو کھیل پور کے حلقے سے بائی الکشن میں کامیاب ہوئے ہیں۔

(اس عرصہ میں برق رفتار خاں کھڑے رہتے ہیں)

برق رفتار خاں الکشن کا سرٹیفکٹ پیش کرتے ہیں اور حلف وفاداری اٹھاتے ہیں۔

اسپیکر برق رفتار خاں کو حلف دلاتا ہے اس کے بعد برق رفتار خاں رجسٹر پر انگوٹھا لگاتے ہیں اور اپنی جگہ جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اسپیکر۔ ایوان کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوتی ہے۔ ایجنڈے کے مطابق وقفۂ سوال و جواب شروع ہوتا ہے۔ آپ سبھی جانتے ہیں کہ اس ایک گھنٹے میں ممبران پارلیمنٹ حکومت کے عہدیداران سے ان کے کاموں کے بارے میں پوچھ سکتے ہیں۔ ان سوالات کی فہرست آپ کے سامنے بھی ہے اور میرے سامنے بھی۔ اسی کے مطابق سوال پوچھنے کی اجازت ہوگی... ضمنی سوالات پوچھنے کی اجازت ضرورت کے مطابق دی جا سکتی ہے۔

تعلیمی میلہ نمبر

سب سے پہلا سوال ضیاء صاحب کریں گے۔

ضیا حیدر: میں کریڑا منتری یعنی وزیر کھیل سے یہ جاننا چاہتا ہوں کھیل منترالیہ نے اب تک دھبن کھیلوں کی ٹیمیں کیوں نہیں بنائیں۔ آج ۹ ہر اکتوبر ہے۔ ارتھات آدھا سال بیت چکا ہے۔

اسپیکر:۔ معزز وزیر کھیل

وزیر کھیل:۔ کھیلوں کے سلسلے میں اس سال کئی نئی باتیں ہوئی ہیں مثال کے طور پر اسکول میں اب کھیل کے تین استاد ہیں اور ٹائم ٹیبل میں کھیل کے گھنٹوں کو شامل کیا گیا ہے اور----

اسپیکر:۔ محترم وزیر کھیل ٹیموں کے سلکشن کے بارے میں بتائیں۔

وزیر کھیل:۔ ٹیموں کے سلکشن میں کچھ دیر تو ضرور ہوئی ہے لیکن اس بارے میں سنجیدگی سے غور ہو رہا ہے اور بہت جلد ٹیموں کا اعلان کر دیا جائے گا۔

یاسر جلال: میں ایک ضمنی سوال پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں

اسپیکر:۔ آپ کو سوال پوچھنے کی اجازت ہے۔

یاسر جلال: کیا وزیر کھیل یہ بتائیں گے کہ کھیل کا بجٹ اب تک کیوں نہیں شائع ہوا۔

اسپیکر:۔ محترم وزیر کھیل

وزیر کھیل:۔ بجٹ پر ابھی کام ہو رہا ہے اسے جلد ہی شائع کر دیا جائے گا۔

سلطان:۔ May I ask a supplementary question:- Hon. Speaker

اسپیکر:۔ No Please

سلطان: But

اسپیکر:۔ Please sit down

۱۔ دوسرا سوال مس فرحانہ رحیم کریں گی۔

فرحانہ رحیم: میں وزیر اطلاعات و نشریات سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ ان کے محکمے پر اوس کیوں پڑی ہوئی ہے۔ ابھی تک دیواری اخبار کیوں نہیں نکلا۔ اسکول کے ساتھیوں کی جنرل نالج پر اس کا بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔

اسپیکر:۔ محترمہ وزیر اطلاعات و نشریات

وزیر اطلاعات:۔ محترم ممبر کو معلوم ہونا چاہیے کہ جنرل نالج بڑھانے کے خیال سے ہی کتب خانے میں اخبارات اور رسالے منگائے جاتے ہیں۔ اس لیے دیواری اخبار نہ نکلنے سے ساتھیوں کی جنرل نالج پر برا اثر پڑنے کا کوئی سوال نہیں۔ دیواری اخبار نہ نکل سکنے کی کئی وجوہات ہیں۔ دراصل پڑھائی کا کام اچانک اتنا بڑھ گیا ہے کہ دوسرے کاموں کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل ہے۔ پھر بھی ہماری کوشش ہے کہ آئندہ ماہ دیواری اخبار کے دو خاص نمبر نکالے جائیں۔

اسپیکر:۔ جناب عابد صاحب۔

مسٹر عابد:۔ یہاں میں وزیر خوراک سے ان کی صحت کا راز جاننا چاہتا ہوں۔

اسپیکر:۔ محترم وزیر خوراک اس راز سے پردہ اٹھائیں۔

وزیر خوراک: جناب عالی میری صحت کا راز وزارت میں نہیں ہاضمے میں پوشیدہ ہے۔

مسٹر عابد جناب والا! آپ کے ہاضمے کی تیزی کی وجہ سے ہم بھوکوں مر رہے ہیں۔

قہقہہ

اسپیکر۔ (میز پر ہتھوڑا بجاتا ہے)۔ آرڈر آرڈر

وقفہ سوال و جواب اب ختم ہوتا ہے۔

بچوں کی حکومت کے دستور کے مطابق اگر ممبران پارلیمنٹ میں کچھ ممبران حکومت کے کاموں سے مطمئن نہ ہوں تو انھیں حکومت کے خلاف ایوان میں عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کا حق ہے۔

مجھے عدم اعتماد یعنی NoConfidenceMotion کی تجویز پیش کرنے کے لیے محترم مسیح الزماں کا نوٹس ملا ہے۔ یہ نوٹس ہر اعتبار سے ٹھیک ہے اس لیے میں محترم مسیح الزماں کو اجازت دیتا ہوں کہ وہ ہاؤس سے عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کی اجازت حاصل کریں۔

مسٹر مسیح الزماں: معزز ممبران پارلیمنٹ

چونکہ موجودہ حکومت کے الکشن ۲ ماہ بعد بھی اپنے کیے گئے وعدوں کو پورا نہیں کر سکی ہے۔ آپ نے دیکھا نہ تو کھیلوں کی ٹیموں کا سلکشن ہوا ہے۔ نہ کھیل کا بجٹ بن سکا ہے۔ دیواری اخبارات

کا مسئلہ بالکل بند ہے۔ یہ ایسا ہے بہت سے مسائل ہیں جن کو ہماری موجودہ حکومت آج تک حل نہیں کر سکی ہے۔ اس لیے میں آپ حضرات سے گذارش کرتا ہوں کہ مجھے عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ حکومت کی کوتاہیوں پر جم کر بحث ہو سکے کیوں کہ موجودہ حکومت جس کے لیڈر محترم عاصم تاسی ہیں بھی اس پر اعتماد نہیں رہا۔ (اپوزیشن بنچ سے کچھ لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں)

اسپیکر: - چوں کہ دستور کے مطابق ۱۵ ممبران پارلیمنٹ نے جناب فصیح الزماں کی تجویز کی حمایت کی ہے اس لیے یہ تجویز کل زیر بحث آئے گی۔

اب ایجنڈے کے مطابق توجہ دلاؤ تحریک کا وقت شروع ہوتا ہے۔

پہلی تجویز محترم جناب اعجاز حسین زیدی صاحب پیش کریں گے۔

اعجاز حسین زیدی: محترم اسپیکر! وزارت داخلہ نے تفریح کے دوران اسکول سے باہر جانے پر پابندی لگا دی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم مسئلہ خود اسکول کے احاطے میں اسکول کے ساتھیوں اور ان کے سامان بلکہ اسکول کے سامانوں کی حفاظت کا ہے اسکول میں ہر طرح کے لوگوں کو آنے جانے کی کھلی چھوٹ ہے۔ کلاس ہو رہی ہے اچانک آواز آئی رس بھرے گنے۔ ۵ پیسے میں موٹر سائیکلوں اور کاروں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ سبزی فروش، دودھ والے اور نہ جانے کون کون یہاں تک کہ گائیں بھینسیں اور بکریاں اسکول کے احاطے اور یہاں کے لانوں اور پیڑ پودوں پر اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اکثر ترانے کے دوران ڈھیٹ قسم کے سائیکل سوار ہماری قطاروں کے درمیان سے گذرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ یہ صورت حال سخت تکلیف دہ ہے وزارت داخلہ کو فوراً اس طرف توجہ کرنی چاہیے اور اسکول کمپاؤنڈ کی حفاظت کا معقول انتظام کرنا چاہیے۔

اسپیکر۔ محترم وزیر داخلہ

وزیر داخلہ۔ ایسا نہیں کہ حکومت کی توجہ ان مسائل کی طرف نہ ہو معزز ممبر کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ معاملات بچوں کی حکومت کے حلقۂ اختیار سے باہر ہیں لیکن بچوں کی حکومت ہر سالی ذمہ داران کا معرکہ بھی ان مسائل کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ہم ایوان کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم جامعہ کے افسران سے پرزور الفاظ میں اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے کہیں گے۔

لبنیٰ فرقان: بچوں کی حکومت کے ذمہ داران کے ساتھ ساتھ ممبران کی توجہ ایک اہم مسئلہ کی طرف مبذول کرانا چاہتی ہوں۔ یہ مسئلہ ہماری تعلیمی زندگی کا بڑا اہم مسئلہ ہے۔ میرا اشارہ اسکول کے کمروں کی طرف ہے۔ معزز ممبران ہماری کلاسوں کی چھتیں بقول غالب ایسی شان دار ہیں کہ پانی اگر ایک گھنٹے برسے تو چھتیں چھ گھنٹے تک برستی ہیں۔ خدا خدا کر کے ساٹھ سال بعد تین نئی کلاسیں بنیں تو ان کا یہ حال ہے کہ بارش کا پانی ہر طرف سے انھیں کلاسوں کی طرف بہتا ہے اور ذرا سی دیر میں حالت یہ ہو جاتی ہے کہ بچے پڑھنا چھوڑ کر کاغذ کی کشتیاں تیراتے نظر آتے ہیں۔

اسپیکر: - محترمہ وزیر تعلیم اس کا جواب دیں۔

وزیر تعلیم: معزز ممبر نے جس اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلائی ہے حکومت اس سلسلے میں بہت دنوں سے کوشاں ہے۔ اب یہ معاملہ جناب شیخ الجامعہ کے سامنے ہے۔ انھوں نے نگراں حضرات سے ان کاموں کے اخراجات کا تخمینہ بنوا کر مجلس مالیات کے سامنے پیش کیا ہے پوری امید ہے کہ بہت جلد ہی نہ صرف چھتوں کی مرمت کا کام شروع ہو جائے گا بلکہ ہر کلاس میں روشنی کا معقول بندوبست ہو جائے گا۔

(تالیاں)

اسپیکر۔ معزز ممبران اب آج کی کارروائی ختم ہوتی ہے۔ کل ایجنڈے کے مطابق حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پر بحث ہوگی۔

(روشنیاں گل ہو جاتی ہیں اور پھر روشن ہو جاتی ہیں)

چوتھا سیشن

(ممبران پارلیمنٹ اور تمام دوسرے لوگ اپنی اپنی جگہوں پر موجود ہیں)

مارشل۔ محترم اسپیکر......

(اسپیکر اپنے چیمبر سے داخل ہوتا ہے۔ لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسپیکر کے ساتھ تمام لوگ بیٹھ جاتے ہیں۔ کورم کی گھنٹی بجتی ہے اور ہری بتی روشن ہو جاتی ہے۔

اسپیکر: - معزز ممبران پارلیمنٹ! ایجنڈے کے مطابق آج محترم

مسیح الزماں کی پیش کردہ عدم اعتماد کی تحریک پر بحث ہوتی ہے۔ محترم مسیح الزماں بحث کا آغاز فرمائیں گے۔

مسیح الزماں معزز ممبران پارلیمنٹ

کل عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کی اجازت چاہتے وقت میں نے وقفۂ سوال و جواب میں دیے گئے جوابات کا حوالہ دیا تھا آپ نے دیکھا کہ وزارت کھیل کی کارکردگی کس قدر ناقص ہے دیواری اخبارات نہ نکال کر وزارت اطلاعات و نشریات نے خود ہی اپنی ناکامی کا ثبوت پیش کر دیا ہے۔ وزیر خوراک کا ہاضمہ ماشاءاللہ اتنا تیز ہے کہ ایک طرف تو روٹیاں اور بوٹیاں ان کے پیٹ کا دوزخ بھرنے سے قاصر ہیں اور دوسری طرف مقیم طلبہ آدھا پیٹ کھا کر اپنی صحت برباد کر رہے ہیں جس حکومت کے کرتوت یہ ہوں اسے حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔

اسپیکر: ۔ محترم۔ سراج الدین صاحب۔

سراج الدین: معزز ممبران ہمارے ساتھی نے حکومت کی نکتہ چینی کرنے میں تکلف سے کام لیا جاتا ہے۔ اس حکومت کی نااہلی کا حال یہ ہے کہ اس سال اسکول کی آرائش کا کوئی کام سرے سے ہوا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ تصویروں کے فریموں کی نہ تو صفائی ہوتی ہے اور نہ ہی پرانی تصویریں بدلی گئی ہیں۔

اسپیکر۔ محترم وزیر آرائش

وزیر آرائش: عدم اعتماد تحریک کے حامی ہمارے معزز ساتھی اپنی چرب زبانی سے حکومت کو ناکارہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں لیکن ان کی نظریں غالباً صرف مسائل دیکھنے کی عادی ہیں ان وجوہات پر ان کی نظر نہیں جاتی جن سے یہ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہوسٹل کی بوسیدہ چھتوں کی مرمت اسی حکومت کا کارنامہ ہے جہاں ابھی تعمیر کا کام چل رہا ہو وہاں آرائش کی گنجائش کیسے نکل سکتی ہے۔ کام اب ختم ہو رہا ہے۔ آرائش پر توجہ دی جا رہی ہے۔

اسپیکر۔ ۔ سروری بیگم۔

سروری بیگم: جناب عالی جیسے آرائش کی طرف توجہ نہ ہونے کی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ لیکن وزارت صحت و صفائی کی کارکردگی بس ناخن میں لباس اور جوتوں کی چیکنگ تک محدود ہے۔ محترم صحت و صفائی کو اتنا بھی خیال نہیں کہ لباس اور جوتوں کی ذمہ داری والدین کی ہے بچوں کی نہیں اس کے علاوہ اسکول کے دوران وزیر داخلہ نے باہر جانے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ ادھر جامعہ کی ڈسپنسری دوپہر کے بعد بند ہو جاتی ہے۔ بیمار بچے ڈاکٹر سے کب ملیں؟ یہ مسئلہ بھی آج تک وزیر موصوف سے حل نہیں ہوا۔ ہوسٹل کے ٹوائیلیٹ کی گندگی اور باتھ روم کی کمی کے تو خیر ہم عادی ہی ہو چکے ہیں۔ ایسی حکومت ہمیں نہیں چاہیے۔

اسپیکر: ۔ محترم مصطفےٰ احمد صدیقی۔

مصطفےٰ احمد صدیقی: تمام وزارتوں کا ذکر خیر تو ہو ہی چکا ہے اب ذرا وزارتِ صحت و صفائی پر نظر ڈالیے۔ ہمیں تو آج تک پتا ہی نہ چل سکا کہ حکومت کو وزیر صحت و صفائی جیسے سفید ہاتھی پالنے کا شوق کیوں ہے۔

اسپیکر: محترم وزیر صحت صفائی

مسعود احمد وزیر صحت و صفائی: افسوس کہ ہمارے معزز ساتھیوں کو دوسرے کی آنکھوں کا تنکا شہتیر دکھائی دیتا ہے۔ میں ان کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ صحت و صفائی کا محکمہ اپنے کام تندہی سے انجام دے رہا ہے Toilet کی صفائی اب دن میں دو تین بار کی جاتی ہے۔ ہمارے کچھ ساتھی جو بستر پر پیشاب کر دینے کے عادی ہیں ان کے لیے میکنٹوش کا بندوبست ہے ان کے کپڑے اور بستر دھونے کے لیے ایک آدمی مقرر ہے۔ ناخنوں کی چیکنگ کا مقصد کسی کو پریشان کرنا نہیں بلکہ جسمانی صفائی پر زور دینا ہے۔ لباس اور جوتے کی چیکنگ کر کے ہم والدین کی توجہ آپ کی ضرورت کی طرف مبذول کراتے ہیں۔

فرسٹ ایڈ باکس ہوسٹل میں موجود ہے۔ ایمرجنسی میں بیمار ساتھیوں کو ہولی فیملی لے جایا جاتا ہے۔ دوپہر بعد ڈسپنسری کھلوانے کی ہم کوشش کر رہے ہیں

اسپیکر: محترم وزیر اعظم

وزیر اعظم: ۔ محترم اسپیکر۔ میں عدم اعتماد کی تحریک کی حمایت کرنے والوں کی باتیں بہت غور سے سنتا رہا ہوں۔ مختلف وزراء نے اپنے اپنے محکموں کے کاموں کے بارے میں آپ کو بتا دیا ہے۔ میں مجموعی طور پر حکومت کے کاموں پر تھوڑی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں اسکول میں ہم سب تعلیم حاصل کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس سال تعلیم کا کام بہت اچھا ہو رہا ہے۔ صبح

کی پی ٹی اور کھیلوں کا انتظام باقاعدہ اور بہتر طور پر کیا جا رہا ہے۔ باغبانی کے علاوہ کئی طرح کے حرفے شروع کیے گئے ہیں۔ کرافٹ کی کلاس میں ہم خود اپنے اسکول کے لیے ڈسٹر تیار کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ بہت جلد ڈسٹر اور چاک بنانے کا کام اور بڑھے گا اور صرف اسکول ہی نہیں جامعہ کی ضرورت بھی پوری کرے گا۔

بہت دنوں سے اجڑے ہوئے چڑیا گھر پر ایک بار پھر بہار آ گئی ہے۔ تعمیر کا کام بھی زور و شور سے چل رہا ہے۔ لیکن ان کاموں میں وقت لگتا ہے۔ بہت جلد ہماری ضروریات پوری ہو جائیں گی۔

ہم نے اسکول کے دوران میں اور شام کو ساتھیوں کو باہر جانے سے روکا ہے۔ اس لیے کہ سڑک پر ٹریفک بہت تیز ہے۔ آئے دن حادثے ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ وہاں بچے کھلی ہوئی گندی چیزیں کھائیں اور بیمار ہوں یا گندی باتیں ان کے کانوں میں پڑیں۔

آپ سب کو معلوم ہے کہ ہم نے اسی لیے بچوں کا خوانچہ شروع کر دیا ہے کہ ساتھیوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اس کے علاوہ بینک اور دکان جم کر اپنا کام کر رہے ہیں۔ دکان سے اس سال ...۱۴۰ سستی کاپیاں اسکول کے تمام ساتھیوں کو مہیا کی گئیں۔ مددگار بنک کا قیام عمل میں آیا جس کے ذریعے ضرورت مند ساتھیوں کی بہت سی ضروریات پوری کی گئیں۔ دو مہینے کے مختصر عرصے میں کاموں کی یہ رفتار سست نہیں کہی جا سکتی۔ ہمارے پاس جادو کا ڈنڈا یا علاء الدین کا چراغ نہیں ہے۔ ہم نے آپ کی خدمت کرنے کا وعدہ کیا تھا وہ ہم کر رہے ہیں اور آئندہ بھی ہمارے کچھ منصوبے ہیں یوجنائیں ہیں ہم نے ان کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا ہے اور ہم یقیناً یہ کام پورا کریں گے۔

مسیح الزماں:۔ جی ہاں آپ اور آپ کی یوجنائیں
رہ گئیں کاغذ کی پل دعاؤں کے
جھٹکے چند یوجناؤں کے

اسپیکر۔ معزز ممبر سے درخواست ہے کہ وہ بیٹھ جائیں۔

مسیح الزماں: محترم اسپیکر میں اپنی بات ضرور کہوں گا۔ اس سرکار نے وعدوں کے علاوہ کیا ہی کیا ہے۔

اسپیکر: محترم سے درخواست ہے کہ وہ خاموش رہیں۔ عدم اعتماد کی تحریک پر بحث ختم ہو چکی ہے۔

مسیح الزماں: محترم اسپیکر آپ مجھے اپنی بات کہنے سے نہیں روک سکتے۔ یہ میرا جمہوری حق ہے۔

اپوزیشن ممبران کی آوازیں:۔ یقیناً۔ یقیناً۔

اسپیکر:۔ آرڈر۔ آرڈر

مسیح الزماں: میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ موجودہ حکومت ایک ناکارہ حکومت ہے ــ (مارشل لپک کر آتے ہیں اور ممبر موصوف کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔)

مسیح الزماں: (اپنی بات جاری رکھتے ہیں) اس سرکار نے ہم پر کاموں کا بوجھ بڑھا دیا ہے۔ بچوں کی سرکار بچوں سے غداری کر رہی ہے۔ میں احتجاج کرتا ہوں۔

نشاط پروین: محترم اسپیکر ازراہ کرم اس تجویز پر ووٹنگ کرائی جائے۔

اسپیکر:۔ عدم اعتماد کی تحریک ووٹنگ کے لیے پیش کی جاتی ہے۔

شبیہ مجیب: پوائنٹ آرڈر... اس تحریک پر ووٹنگ سے پہلے وارننگ بیل بجائی جائے۔

اسپیکر:۔ وارننگ بیل
(گھنٹی بجتی ہے، لوگ اندر آتے ہیں۔)

اسپیکر:۔

Those who are in favour of the motion of no confidence may please raise their hands

20........ Thank you

Those who are against the motion may please raise their hands

32.......... Thank you

Those who abstained from voting may please raise their hands

3......... Thank you

The motion stands rejected

The business of the house is adjourned

اس ... سنانے اور کہانی لکھنے کے مقابلے کا حال بھی سنتے چلئے۔ ... مقابلہ ... جامعہ مڈل اسکول کے طلبہ کے درمیان تھا اور ایک ... اسکول کوئی مہینہ بھر پہلے ہی سے اس مقابلے میں لگا ہوا ...

کہانی ... سب سے زیادہ دلچسپی کہانی سننے میں ہوتی ہے جب ... کی تیاری کے لیے کہانی سنانے کی مشق شروع ہوئی تو ... کہانی سننے کے لیے جمع ہو جاتی مگر اس سے پڑھائی میں خلل نہ پڑے اس لیے یہ مشق خالی گھنٹوں، تفریح کے وقت اور پڑھائی کے بعد کی جاتی رہی۔ کہانی سنانے کے ساتھ بیت بازی کی مشق بھی جاری رہی۔ کیوں کہ یہ دونوں پروگرام میلے میں ایک ساتھ ہی ہونے والے تھے۔

کہانی کے مقابلے کے لیے طلبہ کو ان کی عمر کے لحاظ سے تین گروپوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔

پہلے گروپ میں اوّل اور دوم جماعت کے ننھے منّے بچے شامل تھے جنھیں تصویروں کی مدد سے کہانی سنانی تھی، دوسرے گروپ میں تیسری سے پانچویں جماعت کے بچے تھے جنھیں زبانی کہانی سنانی تھی۔ تیسرا گروپ چھٹی سے آٹھویں جماعت کا تھا جس کے لیے کہانیاں لکھنے کا مقابلہ رکھا گیا تھا۔

کہانی لکھنے کا مقابلہ

کہانی لکھنے کے مقابلے کے لیے کسی قسم کی مشق کی ضرورت نہیں تھی۔ میلے سے ایک ہفتے پہلے ترانے میں اس کا اعلان کر دیا گیا اور میلے سے ایک دن پہلے یہ کہانی لکھنے کا مقابلہ کیا گیا۔

اس میں مندرجہ ذیل ۱۳ طلبہ نے حصّہ لیا۔

ششم جماعت سے

۱۔ معین ضمیر خاں۔ ۲۔ توقیر اکرام ۳۔ زاہد علی صدیقی۔ ۴۔ فہیم احمد۔ ۵۔ حبیب الوحیدی۔

ہفتم جماعت سے

۶۔ ضیا حیدر ۷۔ اسجد مجید۔ ۸۔ صوفیہ خاتون ۹۔ زبیر ارشاد

ہشتم جماعت سے

۱۰۔ نغمہ خاتون۔ ۱۱۔ شاہدہ خاتون ۱۲۔ محمد عابد۔ ۱۳۔ رضیہ پروین

کہانی لکھنے کے لیے ڈیڑھ گھنٹے کا وقت دیا گیا تھا۔ ایسے طلبہ اور طالبات جو میلے کی تیاریوں کے کاموں میں مصروف ہونے کی وجہ سے تاخیر سے آئے انھیں بھی مقابلے میں شامل کر لیا گیا۔ یہ بالکل کھلا مقابلہ تھا شرکت کی عام اجازت تھی۔ کہانیاں بڑے جوش و خروش سے لکھی گئیں۔ طلبہ کا یہ ڈیڑھ گھنٹے کا انہماک قابلِ دید تھا۔

مقابلے کے اختتام پر کہانیاں فاضل جج کے پاس فیصلے کے لیے بھیج دی گئیں۔ فیصلہ دوسرے ہی دن موصول ہو گیا ...

کی صوفیہ خاتون نے پہلا انعام حاصل کیا تھا۔ ان کی کہانی عام کہانیوں سے ہٹ کر تھی۔ انھوں نے اپنے ایک تجربے کو کہانی کی شکل دی تھی۔ دوسرا انعام ہشتم (ب) کے حبیب الوحیدی نے حاصل کیا اور ہفتم (ب) کے زبیر ارشاد تیسرے انعام کے مستحق قرار دیے گئے۔ اس مقابلے میں ایک کنسولیشن انعام بھی تھا لیکن ایک کے بجائے دو (consolation) انعام دیے گئے کیوں کہ ہشتم (ب) کے فہیم احمد اور ہشتم (ب) کی رضیہ پروین دونوں کے نمبر برابر تھے۔

یہ تو تھا کہانیوں کا تحریری مقابلہ جو میلے سے ایک دن پہلے ہوگیا تھا آئیے اب ہم آپ کو پنڈال میں لیے چلتے ہیں جہاں زبانی کہانی سنانے کا مقابلہ ہونے والا ہے۔

تصویر کی مدد سے کہانی

۲۹ر اکتوبر ۱۹۸۱ء کو ڈھائی بجے جامعہ کے اوپن ایر تھیٹر میں زبانی کہانی سنانے کا مقابلہ شروع ہوا۔ پورا پنڈال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ سب سے پہلے ننھے منے بچوں کا تصویروں کی مدد سے کہانی کہنے کا پروگرام ہونا تھا اس لیے ان تمام طلبہ کو جو اس مقابلے میں حصہ لے رہے تھے، اسٹیج سے دور آرٹ انسٹی ٹیوٹ کے لان پر جناب مقصود صاحب کی نگرانی میں بٹھا دیا گیا اور انھیں بتا دیا گیا کہ جب آپ کے نام کا اعلان ہو تو آپ اسٹیج پر آکر تصویریں دیکھ کر کہانی سنائیں گے

"انگور کھٹے ہیں" اور "پیاسا کوا" دونوں کو ملا کر ایک کہانی بنا دیا گیا تھا جن کی تصویریں اسٹیج کے درمیان پنل بورڈ پر لگی ہوئی تھیں۔

ایک ایک بچے کو کہانی سنانے کی دعوت دی جاتی، وہ اسٹیج پر آتا۔ تصاویر کو غور سے دیکھتا۔ کچھ سوچتا اور پھر کہانی سنانا شروع کر دیتا ننھے منے بچوں کا اسٹیج پر آتے بہت سے لوگوں کے سامنے کہانی سنانے کا یہ پہلا اتفاق تھا مگر بچے بہت اعتماد اور اطمینان کے ساتھ کہانی بنا اور سنا رہے تھے۔ سامعین بھی بہت دلچسپی شوق اور خاموشی کے ساتھ کہانی سن رہے تھے۔ کہیں کہیں بچہ غور کرنے کے لیے ٹھہر جاتا سوچتا اور پھر اپنے تخیل اور فکر کے مطابق کہانی کو آگے بڑھاتا۔ بچے کی انوکھی سوچ اور انوکھے تخیل و تصور

کو سن کر سامعین کی طرف سے ہنسی اور داد کے فوارے چھوٹتے۔

اس مقابلے میں مندرجہ ذیل ۸ طلبہ نے حصہ لیا۔

۱۔ ثاقب اسرار (اول الف) ۲۔ آبگینہ عارف (اول الف) ۳۔ نوشین خانم (اول ب) ۴۔ کلیم الدین (دوم الف) ۵۔ حارث فاروقی (اول الف) ۶۔ محمد ناظم (دوم الف) ۷۔ عبدالمقتدر (دوم ب) ۸۔ محمد ذکراللہ (دوم ب)

جج صاحبان کے فیصلے کے مطابق

حارث فاروقی (اول ب)۔ اول

کلیم الدین (دوم الف)۔ دوم

آبگینہ عارف (اول الف)۔ سوم انعام کے مستحق قرار دیے گئے۔

بچوں کی ہمت افزائی کے لیے محمد ناظم (دوم الف) اور عبدالمقتدر (دوم ب) کو بھی انعامات دیے گئے۔

کہانی سنانے کا مقابلہ

کہانی کے اس مقابلے کے ختم ہوتے ہی زبانی کہانی سنانے کا مقابلہ شروع ہوا اس مقابلے میں شرکت کرنے والے طلبہ کو اسٹیج پر بٹھا دیا گیا۔ جناب مقصود حسین صاحب جس بچے کے نام کا اعلان کرتے وہ بچہ مائک پر آکر اپنی کہانی اس طرح شروع کرتا۔

"میں جو کہانی آپ کو سنانے والا ہوں اس کا عنوان ہے ......" بچوں نے جو کہانیاں سنائیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

کہانی کا نام	سنانے والے	جماعت
۱۔ آدمی	جمال عبدالناصر	سوم الف
۲۔ سونے کا بادشاہ	رخسانہ نقوی	سوم الف
۳۔ انگلیوں کی بحث	محمد عقیل	سوم ب
۴۔ احسان فراموش	شمس القمر	سوم ب
۵۔ عقل مند بوڑھا	نکہت جبیں	چہارم الف
۶۔ آئینہ	ثمر جہاں	چہارم الف
۷۔ اتنا طاقتور اتنا کمزور	ذوالفقار علی	چہارم ب
۸۔ لالچی بڑھیا	سمیرہ حیدر	چہارم ب

۹۔ اصلی نقلی	سلمیٰ خاتون	پنجم الف
۱۰۔ قسمت کا چکر	عالیہ خاتون	پنجم ب
۱۱۔ عیدگاہ	عابد حسین	پنجم ب
۱۲۔ جاپانی گڑیا	رخسانہ رحیم	پنجم ب
۱۳۔ جو کچھ ہوا اچھا ہوا	عرفان علی	پنجم ب
۱۴۔ [illegible] کا [illegible]	نوشابہ خانم	پنجم ب
۱۵۔ [illegible]	انور حسین خان	پنجم ب
۱۶۔ [illegible]	شبانہ نکہت	پنجم ب

بچوں نے [illegible] انداز میں کہانی سنانے کی کوشش کی۔ کہانیاں [illegible] کی آواز کے اتار چڑھاؤ، ایکشن اور چہرے کے تاثرات کی بدولت کہانی کے مطابق ماحول پیدا کر کے [illegible] سامعین کو [illegible] کر سکے۔ بچوں کی اس کوشش کو سامعین نے اتنا سراہا کہ لگاتار دو گھنٹے بڑے انہماک اور پوری توجہ، دلچسپی اور شوق کے ساتھ اپنی جگہ بیٹھے کہانی سنتے رہے۔

[illegible] بج کر [illegible] منٹ پر کہانی کا مقابلہ ختم ہوا۔ جج صاحبان کے فیصلے کے مطابق

ذوالفقار علی۔ چہارم الف۔ اوّل
محمد عقیل۔ سوم ب۔ دوم
عابدہ خاتون۔ پنجم الف۔ سوم۔ انعام کے مستحق قرار دیے گئے۔

انعام ننھے منے ہاتھوں سے

تقسیم انعامات کے سلسلے میں [illegible] کہ انعامات تقسیم کرنے کا کام اس ننھے [illegible] فاروقی نے انجام دیا جو تصویروں کی مدد سے کہانیاں سنانے کے مقابلے میں اوّل آیا تھا۔

یہ سب انعامات جناب شاہد علی خاں جنرل منیجر مکتبہ جامعہ کی طرف سے بہت ہی خوبصورت [illegible] کتابوں کی شکل میں دیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ہر اس طالب علم کو جس نے ان مقابلوں میں حصہ لیا۔ ایک ایک قلم مکتبہ جامعہ ہی کی طرف سے انعام کے طور پر دیا گیا۔

[illegible] کے [illegible] درجہ [illegible] کے مقابلے میں اوّل، دوم، سوم آنے والی کہانیاں اس شمارے میں پیش کی جا رہی ہیں

رپورٹر۔ نجیب سلطان۔ قمر الحسن بیگ

بیت بازی

لیجیے صاحب، کہانیاں سنانے کا مقابلہ تو ختم ہوا اب باری ہے بیت بازی کی۔ جس کا سبھی کو بڑی بے چینی سے انتظار ہے۔ یہ مقابلہ جامعہ مڈل اسکول اور جامعہ ہائر سکنڈری اسکول کے طلبہ اور طالبات کے درمیان ہوا۔ دونوں ٹیمیں اسٹیج پر آچکی ہیں اور مقابلہ کے لیے بالکل تیار ہیں۔ دونوں ٹیموں کے نام اس طرح ہیں۔

جامعہ مڈل اسکول	جامعہ ہائر سکنڈری اسکول
۱۔ ناعمہ عاصم قدوائی	۱۔ نائلہ عاصم قدوائی
۲۔ رخسانہ رحیم	۲۔ یوسف سعید
۳۔ عالیہ خاتون	۳۔ سیما ضمیر
۴۔ ریحانہ اسد	۴۔ تسنیمہ حیدر
۵۔ مشیر زہرہ	۵۔ شگفتہ یاسمین
۶۔ صوفیہ خاتون	۶۔ طلعت پروین
۷۔ شاہدہ خاتون	۷۔ سلمیٰ غیاث
۸۔ عاصم قاسمی	۸۔ غزالہ عاصم قدوائی
۹۔ آفتاب عالم	۹۔ نصرت ظہور
۱۰۔ ریاض الدین	۱۰۔ مرزا نشاط
۱۱۔ شاہینہ بیگم	۱۱۔ شاداب بانو

یہ مقابلہ اتنا شاندار تھا کہ کوئی ٹیم ہار ماننے کو تیار نہیں تھی۔ تابڑ توڑ حملے ہو رہے تھے۔ شعر کا جواب شعر سے دیا جا رہا تھا۔ مخالف ٹیم کے کسی بھی شعر میں ذرا سی بھی غلطی ہو جاتی تو دوسری فوراً الفاظ کر دیتی تھی۔ غرضیکہ آدھے گھنٹے کا یہ مقابلہ بغیر کسی فیصلے کے ختم ہو گیا اور جج صاحبان جو کہ شش و پنج میں تھے انھوں نے دوسرے دن اپنا فیصلہ سنایا۔ اس میں ناعمہ عاصم قدوائی ہفتم الف اوّل، سیما ضمیر ہائر سکنڈری اسکول دوم اور یوسف سعید ہائر سکنڈری اسکول سوم رہے۔

رپورٹر۔ فاطمہ زہرا۔ درجہ ششم

جناب! آپ نے جگ بیتی تو بہت سنی ہوگی آج ذرا میری آپ بیتی ہی سن لیجیے کہ میں نے کس طرح "اپنی مدد آپ کی۔"

رات ہم ٹی۔ وی دیکھتے رہ گئے اس لیے سونے میں دیر ہوگئی چوں کہ سونے میں دیر ہوگئی تھی اس لیے اٹھنے میں دیر ہوئی اور ہم بغیر ناشتہ کیے اسکول پہنچ گئے۔ اسکول میں سارے دن بھوک کے مارے پیٹ میں چوہے کودتے رہے۔ ڈیڑھ بجے ہم گھر واپس آئے تو دیکھتے کیا ہیں گھر میں امی کے بجائے ایک پرچہ رکھا ہوا ہے۔

"پیاری بیٹی صوفیہ!

میں ذرا تمھاری پھوپھی کے گھر جا رہی ہوں۔ ذرا گھر کا خیال رکھنا۔ کھانا یا تو تم ہوٹل میں کھا لینا یا پھر آنٹی کے یہاں۔ کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ تم خود سے کھانا نہیں پکا سکتیں۔"

ہمیں غصہ آگیا۔ امی ہمیں سمجھتی کیا ہیں؟ ہم آج خود کھانا بنا کر کھالیں گے (اب ہم نے اپنی مدد آپ کا اصول لاگو کیا۔)

ہم نے فوراً اپیرن باندھا۔ پھر سوچا کہ کیا ہم "باورچن" بوا نصیبن ہیں۔ یہ سوچتے ہی ہم نے اپیرن اتار پھینکا اور بغیر کپڑے بدلے باورچی خانے میں گھس گئے۔ سب سے پہلے ہم نے مینو بنایا۔

۱۔ دال ارہر کی
۲۔ چاول
۳۔ سبزی آلو کی
۴۔ روٹیاں

سب سے پہلے دال نکالی، دھوئی اور کوکر میں ڈال کر گیس پر چڑھا دی۔ واہ اتنا آسان کام ہے۔ دال بنانا۔ اب تو روز ہی ہم دال بنایا کریں گے۔ میرے خیال میں دال بنانے سے آسان کام دنیا میں ہے ہی نہیں۔

اب چاول نکالے، انھیں دھونے میں بہت ہی مشکل پیش آئی۔ پتا نہیں لال لال کیڑے کیوں نکل رہے تھے ہم نے سارے کیڑے واپس اسی میں ڈالے، پھر چاول دوسری گیس پر چڑھا دیے۔

اب مسئلہ تھا۔ پتلی پتلی روٹیاں بنانے کا۔ پھر ہم نے سوچا کوئی بات نہیں۔ پتلی نہ سہی موٹی روٹیاں ہی کھا لیں گے۔ پھر کون سی ملکہ الزبتھ یہ روٹیاں کھانے آرہی ہیں اور اگر آ بھی گئیں تو یہ روٹیاں چھپا دیں گے اور فریج میں سے ڈبل روٹی نکال کر کھلا دیں گے۔ غرض ہم مطمئن ہو کر روٹی بنانے میں مصروف ہو گئے۔ جلدی جلدی ایک جگ میں پانی لائے اس میں آٹا ڈالا اور انڈے کی طرح پھینٹ لیا۔ پھر توا چڑھا کر اس پر سارا آٹا ڈال دیا۔ پھر ہم نے اس روٹی کو پلیٹ میں ڈالا اور چکھا۔ آخ تھو۔ بالکل کچا آٹا۔ اگلی روٹی ہم نے بیلنے کی کوشش کی۔ مگر بیلن روٹی پر چلنے کے بجائے روٹی میں تیر رہا تھا۔ مگر ع

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں

ہم نے جیسے تیسے روٹی بنا ہی لی۔ مگر جیسے گلوب پر ایک طرف دن اور دوسری طرف رات ہوتی ہے۔ ایسے ہی ہماری روٹی ایک طرف سے بالکل سفید یعنی کچی اور دوسری طرف سے بالکل ہی کالی یعنی جلی ہوئی۔

پھر ہم نے سوچا کہ اب جلدی جلدی آلو کی سبزی بنا لینی چاہیے ورنہ امی واپس آجائیں گی اور ہم کھانا بھی نہیں بنا پائیں گے۔ پھر کل ہمارا ریاضی کا ٹیسٹ بھی ہے۔ جس کے لیے ہمیں کافی ریاض کرنا ہے۔ یہ سوچ کر ہم نے آلو اور چاقو لیا اور بالکل

نانی اماں کے سے یوز میں آلو کاٹنے بیٹھ گئے۔ مگر آلو کے بجائے دو انگلیاں چھل گئیں۔ بالکل جیسے قلم تراش سے پنسل چھلتی ہے چیخ نکل پڑی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ہم نے سبزی بنانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ پھر ہم نے پٹی باندھی اور تھوڑی دیر آرام کرنے کی خاطر لیٹ گئے۔

اور جناب ہماری آنکھ تب کھلی جب چاول جلنے کی سوندھی خوشبو ہماری ناک میں آئی۔ یہ خوشبو ہمیں بہت پسند ہے۔ غرض کھانا تیار ہے۔

ہم نے جلدی جلدی دستر خوان لگایا اور دال کا ڈھکن کھولا تو

"دال ارہر کی بے نمک پھیکی
مطلقاً جس میں بو نہ تھی گھی کی"

کیوں کہ ہم نے دال میں نمک مرچ تو ڈالا ہی نہیں تھا نہ ہی بگھارا تھا۔ کیوں کہ اس وقت ہم ایک کتاب "ایک لڑکی بگھارتی ہے دال" پڑھ رہے تھے۔

پھر چاول کھولا تو کنکروں سمیت بھنے ہوئے چاول حاضر ہو گئے۔ کیوں کہ چاول میں ہم نے پانی بہت ہی کم ڈالا تھا۔

اور روٹی کا حال تو آپ کو خود ہی معلوم ہے۔

ہم نے پکا فیصلہ کر لیا کہ اب اسکول میں ہم "ہوم سائنس" ہی لیں گے۔ ہم نے اپنے ڈریس پر نظر ڈالی تو اچھے بھلے ہوئے ڈریس کی جگہ ایک ملگجا مسلا ہوا کالا ڈریس نظر آیا۔ [illegible] ہمارا مذاق اڑا رہا تھا۔ ہم نے جلدی جلدی کپڑے بدلے کہ اب ہوٹل میں جا کر کھانا کھائیں کہ یکایک گھڑی پر نظر پڑی تو وہاں ۵ بج رہے تھے۔ یعنی امی کے آنے کا وقت ہو گیا تبھی دروازے پر دستک ہوئی اور ہماری نظروں میں وہ زیرو گھوم گیا جو ہمیں کل حساب میں ملنے والا تھا۔

(قول انعام)

حبیب الوحیدی
ہشتم (ب)

گلاب کا پھول

یہ کہانی ایسے سوداگر کی ہے جس کے اوپر بہت بڑی مصیبت آئی تھی بہت پہلے بغداد نام کے شہر میں ایک سوداگر رہا کرتا تھا۔ اس کے چار بیٹیاں تھیں۔

ایک بار سوداگر مال فروخت کرنے کہیں دور جانے لگا جانے سے پہلے سوداگر نے اپنی سب سے بڑی بیٹی سے پوچھا: "بیٹی تمہارے لیے کیا لاؤں" اس نے جواب دیا "نولکھا ہار" پھر دوسری بیٹی کے پاس گیا، اس سے بھی یہی پوچھا "بیٹی تمہارے لیے کیا لاؤں" بیٹی نے جواب دیا کہ بنارسی ساڑی۔ پھر سوداگر نے تیسری بیٹی سے پوچھا "تم کیا منگانا چاہتی ہو" اس نے کہا "ہیرے کی انگوٹھی" مطلب تینوں بیٹیاں اپنا ہی بھلا چاہتی تھیں لیکن سب سے چھوٹی بیٹی سوداگر کو بہت ہی چاہتی تھی اور سوداگر بھی اسے بہت ہی پیار کرتا تھا جگر کا ٹکڑا سمجھتا تھا۔ اس لیے تینوں بہنیں اس سے سخت نفرت کرتی تھیں۔ ہر وقت اسے ستاتی تھیں لیکن وہ اللہ کی بندی پانچوں وقت کی نماز پڑھتی تھی، سویرے صبح قرآن پاک کی تلاوت کرتی تھی۔

جب سوداگر اس کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہی ہے۔ جب اس نے سلام پھیر لیا تو اپنے باپ کو بیٹھے دیکھا اور پوچھا "کیا بات ہے، آپ کیوں بیٹھے ہیں" باپ نے جواب دیا "بیٹی میں بہت دور سامان فروخت کرنے جا رہا ہوں تمہاری اگر کوئی خواہش ہو تو بتاؤ" لڑکی نے جواب دیا "ابا جان میری سب سے بڑی خواہش ہے کہ آپ

خیریت سے واپس آجائیں۔ باپ کے بہت اصرار پر بیٹی نے جواب دیا ایک گلاب کا پھول۔

واپس آتے وقت سوداگر نے سب کی خواہش کے مطابق چیزیں لے لیں۔ لیکن گلاب کا پھول لینا بھول گیا۔ جب وہ واپس جا رہا تھا تو اس کی نظر ایک باغیچے پر پڑی وہاں ایک بہت بڑا اور خوشبودار گلاب کا پھول لگا تھا۔ گلاب کا پھول دیکھ کر اسے چھوٹی [illegible] کی فرمائش یاد آگئی۔ وہ اس پھول کے پاس گیا جیسے ہی پھول توڑا تو اچانک شیر کی گرج سنائی دی۔ سوداگر نے سوچا ایسی جگہ شیر کہاں؟ دیکھتے دیکھتے اس کے سامنے ایک شیر کھڑا ہو گیا اور گرجدار آواز میں پوچھا۔

"تم نے کس کی اجازت سے پھول توڑا اور کیوں؟"

سوداگر پسینے سے شرابور ہو رہا تھا اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"میری ایک چھوٹی سی بیٹی ہے اس کی فرمائش تھی۔"

شیر نے کہا "اس لڑکی کو کل اسی وقت میرے حوالے کر دینا ورنہ میں سب کو کھا جاؤں گا" سوداگر کو اتنا رنج ہوا کہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ رنج میں ڈوبا گھبرایا ہوا گھر پہنچا تو چھوٹی بیٹی نے پوچھا کہ ابا جان آپ کیوں افسردہ ہیں۔ اس نے سارا قصہ سنا دیا۔ قصہ سن کر اس نے کہا کہ آپ پریشان نہ ہوں۔ باپ کو تو کچھ اطمینان دلا دیا لیکن خود پریشان ہو گئی۔

دوسرے دن سوداگر اپنی بیٹی کو لے کر گیا۔ تینوں بہنیں بہت خوش ہوئیں کیونکہ سوداگر اس کو زیادہ چاہتا تھا۔ ادھر شیر نے سوداگر اور اس کی بیٹی کو دیکھا اور بہت خوش ہوا اور سوداگر کو گھر واپس کر دیا۔

شیر لڑکی کو اس کی خواہش کے مطابق ہر چیز دیا کرتا لیکن لڑکی کو باپ کی یاد بہت ستاتی تھی۔

شیر روز اس سے پوچھتا کہ تم مجھ سے شادی کرو گی لیکن [illegible] کر دیتی۔ بہت دن گزر گئے۔ اب اس کو شیر سے بہت پیار [illegible] تھا۔ ادھر باپ کی یہ حالت تھی کہ دن بدن کمزور ہو رہا تھا۔ ایک بار شہزادی نے پوچھا کہ مجھے اپنے باپ کی اور گھر کی یاد آ رہی ہے تو شیر نے کہا۔ چلی جاؤ لیکن کل بارہ بجے تک یہاں پہنچ جانا ورنہ میں مر جاؤں گا۔"

لڑکی بالکل شہزادیوں کی طرح اپنے گھر گئی دیکھا کہ باپ کو اتنا رنج و غم تھا کہ وہ آخری سانس لے رہا تھا جاتے ہی اس نے پکارا۔ "ابا جان" بیٹی کے اتنے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر تو سوداگر پھولا نہ سمایا۔ حال معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ میں جو چاہتی ہوں وہی ہوتا ہے۔ یہ دیکھ کر تینوں بہنیں بہت جل رہی تھیں۔ اس نے بتایا کہ مجھے بارہ بجے تک پہنچ جانا ہے ورنہ وہ مر جائے گا۔ ۱۲ بجنے میں دس پندرہ منٹ تھے۔ بہنوں نے جلن میں آکے اسے بند کر دیا مگر کسی بھی طرح وہ نکل کر بھاگی جا کر دیکھا تو شیر آخری سانس لے رہا تھا۔ وہ شیر کے پاس گئی تو شیر نے پوچھا "تم مجھ سے شادی کرو گی۔" اس نے جلدی میں کہہ دیا "ہاں"، یہ کہنا تھا کہ وہاں شیر کی جگہ ایک بہت خوبصورت شہزادہ کھڑا تھا۔ باپ کو اطلاع ملی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ وہ وہاں پہنچا اور اس سے سارا ماجرا پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی ملک کا شہزادہ تھا۔ اس کے ماموں نے اسے جادو کی مدد سے شیر بنا دیا تھا اور کہا تھا جب تک کوئی لڑکی تم سے شادی کرنے کے لیے نہیں کہے گی تم اچھے نہیں ہو گے۔

سوداگر نے شہزادے کے ساتھ اس کی شادی کر دی وہ لوگ مزے سے رہنے لگے۔ دیکھا بچو۔ جلن کتنی بری چیز ہے۔ کسی سے جلنا شیطانی کام ہے۔ آپ بھی کبھی کسی سے جلن مت کیجیے اپنی خوشی دوسرے کی خوشی اور دوسرے کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھنا چاہیے آپ سب بھی اس کہانی سے سبق سیکھیے۔

(دوسرا انعام)

گھمنڈی

زہرا ارشاد
ششم ب

ایک گھنے جنگل [illegible] شیرا نام کا ایک ہاتھی رہتا تھا۔ وہ [illegible] کسی چیز کی کمی نہیں [illegible] گھمنڈ بھرے، جب چاہے کسی [illegible] جنگل کے سب جانور اس [illegible] جنگل کا راجہ شیر ہی۔ جب شیرا [illegible] اس سے ڈرنے لگے ہیں [illegible] اب کوئی بھی جانور اس سے [illegible] کہ وہ جانور [illegible] جنگل کے بھی [illegible] کہ شیرا [illegible] کی بات ہے کہ کبھی [illegible] تھے کہ شیرا [illegible] ایک کونے میں بیٹھا جنو [illegible] طاقت ور سے کیوں [illegible] جو بھی ہار جائے [illegible] رستہ کشی کا مقابلہ [illegible] ہوگی۔ اب سب [illegible] پاس کیوں جائے۔ سب [illegible] بولی کہ جنو تو [illegible]

عقل مند اور چالاک ہے اس لیے جنو کو شیرا کے پاس جانا چاہیے یہ طے کر کے پنچایت ختم ہوئی اور جنو اپنے گھر واپس آ گیا۔ کھانا کھا کر جنو شیرا کے پاس گیا۔ شیرا اس وقت سو رہا تھا۔ جنو نے اس کو جگایا اور کہا کہ اے گھمنڈی شیرا تم اپنے اوپر گھمنڈ کرتے ہو نا۔ تمہارا مقابلہ آج سے تین دن بعد ندی کے کنارے ہوگا تم آ جانا مقابلہ تمہارا ریچھ سے رستا کشی کا ہے۔ یہ کہہ کر جنو اپنے گھر آ گیا۔ اب مقابلے کی تیاری شروع ہو گئی جس طرح جامعہ مڈل اسکول کے بچوں نے تعلیمی میلے کی تیاری شروع کی ہے غرض کہ جنگل کا ہر جانور تیاری میں لگا ہوا تھا۔ سب ریچھ کی ہمت افزائی کر رہے تھے۔ اس طرح وہ مقابلے کا دن بھی آ پہنچا۔ ریچھ اور شیرا میدان میں اترے شیرا کا سینہ فخر سے پھولا ہوا تھا کہ یہ اتنا سا بھالو مجھ سے کیا مقابلہ کرے گا۔ دونوں نے مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں رستا پکڑ لیا۔ مقابلہ شروع ہوا، دونوں کے بیچ میں ایک لکیر کھینچی گئی۔ کبھی شیرا ریچھ کو اپنی طرف کھینچ لیتا، کبھی ریچھ شیرا کو۔ سب جانور چاہتے تھے کہ ریچھ جیت جائے۔ آخر کار ریچھ نے خدا کا نام لے کر زور لگایا، اچانک شیرا کے ہاتھ سے رستا چھوٹ گیا اور شیرا پیچھے کی طرف گر گیا۔ سب جانور چلا اٹھے بھالو جیت گیا، بھالو جیت گیا، ادھر شیرا سر جھکائے جنگل سے باہر نکل گیا۔ اس طرح جنگل کے سب جانور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمیں کبھی بھی گھمنڈ نہیں کرنا چاہیے۔

(تیسرا انعام)

ذوالفقار علی - درجہ چہارم

زبانی کہانی سنانے کے مقابلے میں اوّل۔ دوم۔ سوم آنے والی کہانیاں

پہلا انعام پانے والی کہانی

اتنا طاقت ور اتنا کمزور

ایک بادشاہ تھا۔ وہ بہت گھمنڈی تھا۔ ایک دن وہ گھومنے نکلا تو راستے میں اسے ایک بہت خوبصورت محل دکھائی دیا۔ اس نے اپنے وزیر سے پوچھا۔ "یہ محل کس کا ہے" وزیر نے جواب دیا۔ بادشاہ سلامت آپ کے ہی شہر کے ایک بہت مال دار آدمی کا ہے۔ بادشاہ بولا۔ "ہم سے زیادہ مال دار بھلا کون ہو سکتا ہے۔ ہمارے لیے اس سے زیادہ خوب صورت محل بنواؤ" وزیر نے دوسرے ہی دن تمام مزدوروں اور مستریوں کو لگا کر ایک بہت خوبصورت محل بنوا دیا۔ بادشاہ نے دیکھا۔ اور بہت تعریف کی۔ دوسرے دن بادشاہ پھر سیر کے لیے نکلا۔ تو اسے ایک بہت خوبصورت باغ دکھائی دیا۔ اس نے وزیر سے پوچھا۔ "یہ باغ کس کا ہے" وزیر نے جواب دیا۔ حضور آپ ہی کے شہر کے ایک آدمی کا ہے"۔ بادشاہ نے کہا۔ "ہم سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے۔ ہمارے لیے اس سے بھی اچھا باغ بنوایا جائے۔" وزیر نے کہا "جو حکم"۔ اور دوسرے ہی دن تمام مالی کام پر لگ گئے۔ جب باغ تیار ہو گیا تو بادشاہ نے اسے دیکھا اور وزیر سے کہا "بھئی واہ۔ تم نے تو کمال کر دیا۔"

تیسرے دن بادشاہ جب سیر کر رہا تھا۔ تو اسے ایک مور دکھائی دیا۔ وہ مور بہت خوبصورت تھا۔ بادشاہ نے وزیر سے پھر پوچھا۔ "بھئی یہ اتنا خوبصورت مور کس کا ہے" وزیر نے جواب دیا۔ "حضور آپ کے ہی شہر کے ایک آدمی کا ہے" بادشاہ نے کہا۔ "ہم سے بڑا بھلا کون ہو سکتا ہے۔ ہم کو اس سے بھی اچھا اور خوبصورت مور چاہیے" وزیر نے کہا۔ "جو حکم" اور دوسرے دن اس نے اپنے سارے شکاری جنگل بھیج دیے۔ مگر جو مور وہ شکاری لائے۔ وہ بادشاہ کو پسند نہیں آئے اور غصہ کے مارے بادشاہ کی حالت خراب ہو گئی۔ بادشاہ نے چلا کر وزیر سے کہا۔ "ہمیں مور چاہیے۔ چاہے کہیں سے بھی لاؤ۔" وزیر کچھ دن تو سوچتا رہا۔ اس کے بعد اس نے کھلونے بنانے والے کو بلا کر کہا۔ بادشاہ سلامت کا حکم ہے کہ تم ان کے لیے ایک خوب صورت مور بنا کر لاؤ۔ کھلونے بنانے والا تیار ہو گیا۔ اور تین مہینے بعد ایک بہت خوبصورت مور بنا کر بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ مور دیکھ کر بہت خوش ہوا مگر کہنے لگا۔ "ارے۔ یہ کیسا مور ہے۔ نہ چلتا ہے۔ نہ ناچتا ہے۔ نہ بولتا ہے" وزیر نے کہا۔ "حضور اس میں جان کہاں ہے کہ یہ چل پھر سکے۔ یہ تو مٹی کا پتلا ہے" بادشاہ کو یہ سن کر بہت غصہ آیا۔ اس نے کہا۔ "ہمارے حکم سے اس میں جان ڈالو" اتنے میں ایک شہد کی مکھی کہیں سے اڑتی ہوئی آئی اور بادشاہ سلامت کی ناک پر کاٹ لیا۔ بادشاہ تکلیف اور غصہ سے بلبلا اٹھا اور کہا "پکڑو پکڑو۔ جانے نہ پائے۔" لیکن مکھی کیسے ہاتھ آتی۔ بادشاہ سلامت کی ناک سوج گئی اور دو تین دن بھی نہ گزرے ہوں گے کہ بادشاہ سلامت دنیا سے چل بسے۔

جامعہ مڈل اسکول۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دلی ۲۵

محمد عقیل درجہ سوم

دوسرا انعام پانے والی کہانی

انگلیوں کی بحث

ایک دن ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیوں میں بحث چھڑ گئی۔ انگوٹھا کہتا۔ میں سب سے بڑا ہوں، دوسری انگلی کہتی میں سب سے بڑی ہوں، تیسری، چوتھی اور پانچویں انگلی اپنی بڑائی کے راگ الاپ رہی تھیں، سب نے مل کر انگوٹھے سے پوچھا، "بھئی تم کیسے بڑے ہو۔" انگوٹھے نے کہا، "میں ایسے بڑا ہوں کہ بغیر پڑھے لکھے لوگوں کو پڑھا لکھا بنا دیتا ہوں۔ اور ان کے دستخط کی جگہ میں آجاتا ہوں۔" کلمے کی انگلی سے پوچھا گیا، "بھئی تم کیسے بڑی ہو؟" اس نے کہا، "میں بھولے بھٹکے مسافروں کو راستہ بتاتی ہوں، (انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) دیکھو وہ راہ۔" تیسری انگلی سے پوچھا گیا۔ اب تم بتاؤ، تم کیسے بڑی ہو۔ تیسری انگلی نے کہا۔ "ارے بھئی، اس میں بھی کوئی شک ہے۔ ناپ کر دیکھو۔ میں ہی سب سے بڑی ہوں۔" چوتھی انگلی سے پوچھا گیا۔ کہو بھئی تمھارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔ اس نے جواب دیا۔ "لوگ مجھ سے تلک لگاتے ہیں، جو ایسا پوتر کام کرے۔ اس سے بڑا کون ہوسکتا ہے۔" اور اب باری آئی سب سے چھوٹی انگلی کی۔ اس نے اکڑ کر جواب دیا۔ "تم لوگ کیا ہو۔ لوگ ہیرے موتیوں کی انگوٹھیاں مجھے ہی تو پہناتے ہیں۔"

ساری انگلیوں نے اپنی اپنی بڑائی بیان کر دی، مگر کوئی فیصلہ نہیں ہو پایا۔ لہٰذا سب نے مل کر طے کیا کہ عدالت میں چلنا چاہیے۔ پانچوں انگلیاں مل کر عدالت پہنچیں۔ مقدمہ جج صاحب کے سامنے رکھا گیا۔ جج

صاحب یہ عجیب مقدمہ سن کر کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گئے۔ پھر انھوں نے مسکراتے ہوئے حکم دیا۔ "ایک پلیٹ میں ایک رس گلا لایا جائے۔" رس گلا حاضر کیا گیا۔ جج صاحب نے سب سے پہلے انگوٹھے سے کہا۔ "تم اس رس گلے کو اٹھاؤ۔" انگوٹھا نہیں اٹھا پایا پھر دوسری انگلی سے کہا۔ "تم اٹھا۔" وہ بھی نہیں اٹھا پائی۔ اسی طرح ساری انگلیوں سے کہا۔ مگر اکیلے کوئی بھی انگلی رس گلا نہ اٹھا پائی۔ اب جج صاحب نے کہا۔ "اب پانچوں انگلیاں مل کر اس رس گلے کو اٹھائیں۔" پانچوں نے مل کر رس گلا اٹھا کر غیب سے منہ میں رکھ لیا۔

"اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اتحاد میں طاقت ہے۔"

عالیہ خاتون۔ درجہ پنجم

تیسرا انعام پانے والی کہانی

قسمت کا چکر

رامو ایک غریب آدمی تھا۔ اس کے پاس صرف سولہ روپے تھے۔ مگر وہ سمجھتا تھا کہ اس کے پاس دنیا جہان کی دولت ہے۔ وہ ہر ایک سے پوچھتا پھرتا۔ "بھائی میں ان سولہ روپوں کا کیا کروں؟" سب اس کی بات ایک کان سے سنتے اور دوسرے سے اڑا دیتے۔ جب اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے ان روپوں سے ایک گھوڑا خرید کیا اور اس کو پال پوس کر خوب بڑا کر لیا۔ لوگوں نے گھوڑے کو دیکھا تو اسے خریدنے کے لیے اس کی قیمت پانچ سو روپے لگائی۔ مگر رامو نے منع کر دیا۔ اس نے سوچا جب یہ خوب بڑا ہو جائے گا۔ تو اسے اور زیادہ پیسوں میں بیچوں گا۔ لیکن ہائے ری قسمت! دوسرے ہی دن اس کا

گھوڑا مرا ہوا پایا گیا۔ رامو بہت پچھتایا۔ لیکن اب کر ہی کیا سکتا تھا۔ اس نے گھوڑے کی کھال اُتاری اور شہر میں بیچنے چل دیا۔ اتفاق دیکھیے کہ وہ کھال بھی سولہ ہی روپے میں بکی۔ اب وہ پھر سولہ روپے لے کر سب سے پوچھتا پھرتا۔ ”بھائی۔ ان سولہ روپیوں کا کیا کروں“ مگر کوئی اس کی بات پر کان نہ دھرتا۔ آخر وہ ایک دن اپنے روپے لیے ہوئے ایک ندی پر پہنچا۔ وہاں بہت سے غوطہ خور بیٹھے ہوئے تھے۔ جو پیسے لے کر غوطہ لگاتے تھے۔ رامو نے سب غوطہ خوروں کو اپنے سولہ روپوں میں غوطہ لگانے کو کہا۔ مگر ہر ایک نے اسے دھتکار دیا کہ سولہ روپوں میں کہیں غوطہ لگتا ہے۔ اس کے لیے تو سو روپے لے کر آؤ۔ آخر ایک بوڑھے غوطہ خور کو اس پر رحم آ گیا اور وہ رامو کے لیے غوطہ لگانے کو تیار ہو گیا۔ مگر اس نے کہا کہ وہ کنارے ہی پر غوطہ لگائے گا۔ رامو اس بات پر تیار ہو گیا اور اپنے روپے اسے دے دیے۔ اب رامو کی قسمت دیکھیے۔ کہ غوطہ خور جب باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا چمک دار ہیرا تھا۔ رامو وہ ہیرا پا کر خوشی کے مارے ناچ اٹھا اور بھاگا بھاگا جوہری کے پاس پہنچا۔ جوہری نے ہیرا دیکھا تو کہا ”بھائی میرے پاس اتنی دولت کہاں۔ جو اس ہیرے کے بدلے میں تمھیں دے سکوں۔ اس ہیرے کی قیمت تو کوئی بادشاہ ہی ادا کر سکتا ہے“ یہ سنتے ہی رامو بادشاہ کے محل کی طرف بھاگا۔ اور بادشاہ کے سامنے جا پہنچا۔ اور اپنا ہیرا بادشاہ کے سامنے رکھ دیا۔ بادشاہ نے ہیرے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اور کہا ”رامو! اس ہیرے کی قیمت تو بہت ہے۔ تم ایسا کرو کہ ۲۴ گھنٹے میں میرے خزانے سے جتنی دولت لے جا سکتے ہو۔ لے جاؤ“ یہ سن کر رامو بہت خوش ہوا۔ اور دوسرے دن بہت سے گدھے جن پر بوریاں رکھی ہوئی تھیں لے کر بادشاہ کے خزانے میں پہنچ گیا۔ ایک سنتری باہر کھڑا تھا اس نے وقت دیکھا اور رامو کو اندر جانے کی اجازت دے دی۔ خزانے میں پہنچ کر رامو کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ پہلے اس نے اپنی بوریوں میں چاندی کے سکے بھرے۔ مگر پھر انھیں الٹ دیا۔ پھر اس نے سونے کے سکے بھرے۔ مگر پھر سوچا میں یہ سونے کے سکے کہاں بیچتا پھروں گا۔ یہ سوچ کر اپنی بوریاں پھر اُلٹ دیں۔ اور اب بوریوں میں ہیرے بھرنے لگا۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ ایک ہیرے نے تو اتنا دوڑایا۔ میں یہ اتنے سارے ہیرے لے کر کہاں کہاں بھاگتا پھروں گا۔ یہ سوچ کر اپنی بوریاں پھر اُلٹ دیں۔ اتنے میں سنتری اندر آ گیا۔ اور رامو کو باہر نکلنے کے لیے کہا۔ رامو بڑا پریشان ہوا کہ میری بوریاں تو خالی ہی رہ گئیں۔ میں نے چوبیس گھنٹے صرف سوچ میں گزار دیے۔ وہ مایوس سا گھر کی طرف چل دیا۔ اُدھر سنتری نے سارا قصہ بادشاہ کو جا سنایا کہ رامو بے چارہ کچھ بھی نہیں لے جا سکا۔ بادشاہ نے سنتری سے کہا ”رامو کو واپس بلایا جائے“ بادشاہ نے رامو سے کہا ”ہمیں افسوس ہے کہ اتنا وقت دینے پر بھی تم خالی ہاتھ واپس جا رہے ہو۔ ہم تمھیں ایک موقع اور دیتے ہیں۔ خزانے میں جاؤ اور اپنی دونوں مٹھیوں میں چاندی کے جتنے سکے اُٹھا سکتے ہو اٹھا لو“ رامو خزانے میں گیا اور دونوں مٹھیوں کو مضبوطی سے بند کیے باہر آ گیا۔ باہر آ کر جب اس نے اپنی مٹھیاں کھولیں تو اس کے ایک ہاتھ میں چاندی کے آٹھ سکے تھے اور دوسرے ہاتھ میں بھی چاندی کے آٹھ ہی سکے تھے۔

”اس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ لالچ بری بلا ہے۔ آدمی کو وہی ملتا ہے۔ جو اس کی تقدیر میں ہوتا ہے۔“

بچوں کی تعلیمی مصروفیتوں اور وقت کی تنگی کے باعث ہمیں اس نمبر کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑا ہے۔ اس نمبر کے باقی مضامین فروری کے شمارے میں ملاحظہ کیجیے۔

(مدیر)

جامعہ

اپنے معماروں قدردانوں اور ہمدردوں کی نظر میں

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے نظامِ تعلیم کو نئی بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی اور یہ حقیقت ہے کہ اس نے ہندستان کے تعلیمی اداروں کی اس راہ میں سب سے پہلے رہنمائی کی ہے

پنڈت جواہر لال نہرو

شاید تم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جامعہ کی سب سے پہلی عمارت کا سنگِ بنیاد ایک چھوٹے سے بچے نے رکھا تھا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ جامعہ کے بنانے والے دراصل بچے ہی ہیں۔ جامعہ صرف اینٹ اور چونے کی عمارت کا نام نہیں۔ جس کے اندر تم رہتے ہو۔ بلکہ صفائی سچائی اور خدمت کی روح بھی، جو تمہارے اندر بستی ہے۔ جامعہ ہے اور اس کے بنانے والے تم ہو خدا تم کو توفیق دے کہ تم باہر کی جامعہ اور اندر کی جامعہ دونوں کو ہمیشہ اسی طرح سجاتے اور سنوارتے رہو جیسے آج کے دن سجایا اور سنوارا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم

جامعہ کی یہ بستی بڑی مشکل سے بسائی گئی ہے۔ اس نے کئی انقلاب دیکھے ہیں، بہت سی موجوں کے تھپیڑے کھائے ہیں۔ اس کی جگہ بدلی ہے۔ یہ علی گڑھ سے دہلی آئی، دہلی سے اوکھلا آئی۔ مگر تعلیم کی دنیا میں اس نے اپنا مقام نہیں بدلا۔

پروفیسر محمد مجیب
سابق شیخ الجامعہ

جامعہ مسلمانوں کی تعلیمی اور ذہنی تنظیم کی ایک ایسی نشانی ہے جس سے آنے والی نسلیں کسبِ بصیرت کریں گی

قاضی عبدالغفار

ہندستان میں نئی تعلیم کے جتنے بھی ادارے ہیں۔ ان میں جامعہ کو اس کے بلند خیالات اور تعلیمی تجربات کے باعث ایک خاص امتیاز حاصل ہے

ڈاکٹر امرناتھ جھا

مجھے خوشی ہے کہ بچے قدرت کے عجوبوں کو دیکھنے کے لیے اپنی آنکھیں پوری طرح استعمال کرتے ہیں۔ ان کی سائنسی ترقی کا یہی سب سے بڑا راز ہے۔ اردگرد قدرت کے مشاہدات کرتے رہو۔ اسی طرح بڑے سائنٹسٹ بنو گے۔

انور جمال قدوائی
شیخ الجامعہ ۲۹ اکتوبر

2
تعلیمی میلا نمبر
پیام تعلیم
NEHRU TROPHY
NEHRU TROPHY
TROPHY

بچوں کی نئی کتابیں
اسلام کے مشہور امیر البحر
عبد الواحد سندھی جامعی
اس کتاب میں مسلمانوں کے جہاز سازی اور جہاز رانی کے کارنامے نیز ان سمندری سپہ سالاروں کے حالات بتائے گئے ہیں جنھوں نے تاریخ میں نام اونچا کیا۔
قیمت: =/۴
اسلام کے مشہور سپہ سالار حصہ اول دوم
عبد الواحد سندھی جامعی
بچوں کے لیے اسلام کے مشہور سپہ سالاروں کا تفصیلی تعارف نیز ان کی زیر قیادت لڑی گئی جنگوں کے حالات جن کے پڑھنے سے ایمان میں تازگی آتی ہے۔
حصہ اول =/۴
دوم =/۴
اللہ کا گھر
خلیل احمد جامعی
اللہ کے خلیل
خلیل احمد جامعی
مسلمانوں کے جد امجد حضرت ابراہیمؑ کی سیرت مبارک سے متعارف کرانے والی بچوں کے لیے ایک عمدہ کتاب۔
قیمت ۲/۵۰
دُم کٹا سانپ
محمد قاسم صدیقی
سچی عبادت، بے ایمان قاضی اور راجا اور پرجا۔ تین سبق آموز کہانیوں کا مجموعہ۔
قیمت، -/۱
چنبیلی
محمد حسین حسان
ابتدائی درجوں کے بچوں کے لیے چنبیلی نامی ایک بلی کی مزیدار کہانی
قیمت -/۵۰
چٹانوں کی کہانی
محمد امین
قدرتی حالات و واقعات نے زمین اور چٹانوں کی شکل و صورت کو کس طرح بدلا؟ اس کا جواب اس کتاب میں ملے گا۔ قیمت ۲/۵۰
میگھ نگر کا راجا
عباس احمد خان
ایک ظالم راجا کے دو نیک سیرت بچوں کی کہانی جنھیں ڈاکو پکڑ لے گئے تھے بہت ہی دل چسپ اور سبق آموز کہانی ہے۔
قیمت: ۱/۲۵
موم کا محل
پروفیسر محمد الیاس
شہد کی مکھیوں کی کہانی تو خود شہد کی طرح میٹھی اور دل پسند ہے بڑے بچوں کے لیے کہانی کی طرز پر لکھی گئی ایک عمدہ معلوماتی کتاب۔
قیمت =/۴
میر انیس
محمد حسین حسان
میر انیس کے حالات زندگی، اخلاق و عادات اور ان کی شاعری کی خصوصیات بتانے والی کتاب نمونہ کلام کے ساتھ بڑے بچوں کے لیے ایک بہترین معلوماتی کتاب۔
قیمت: ۲/۵۰
بچوں کے اقبال
اطہر پرویز
اس کتاب میں علامہ اقبال کے حالات بڑی اچھے انداز میں بتائے گئے ہیں۔ ساتھ ہی وہ نظمیں بھی شامل ہیں جو اقبال نے خاص طور پر بچوں کے لیے لکھی تھیں۔ قیمت: ۲/۵
مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی ۲۵

تعلیمی میلا نمبر (۲)

فروری ۱۹۸۲ء جلد ۱۹ شمارہ ۲

اس شمارے کی قیمت 2/50

سالانہ : پندرہ روپے
غیر ممالک کے لیے پینتالیس روپے

پیامی دوستو!

پیامِ تعلیم کا تعلیمی میلا نمبر آپ کو مل گیا ہوگا اور اس میں آپ نے جامعہ کے تعلیمی میلے کے بارے میں اور اس میں ہونے والے پروگراموں کے بارے میں تفصیل سے پڑھا ہوگا۔ پارلیمنٹ کا اجلاس پڑھ کر اور چیف رپورٹر کی رپورٹ سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ ہمارے اسکول کا طریقۂ کار کیا ہے۔ یعنی بچوں کی حکومت اپنے مسائل کو کس طرح حل کرتی ہے اور تعلیمی میلے کے پروگراموں کی ایک جھلک آپ کو دکھانے کے لیے کس طرح طلبہ نے رپورٹروں کی ایک ٹیم تیار کی اور کس طرح انھیں ذمے داریاں سونپی گئیں۔ پھر بچوں کی زبانی اور تحریری کہانیاں آپ نے ضرور پڑھی ہوں گی۔ امید ہے پسند آئی ہوں گی۔

ہم لوگوں کی تعلیمی مصروفیت اور موسم سرما کی تعطیلات کی وجہ سے جنوری ۱۹۸۲ء کا شمارہ آپ کو تھوڑی تاخیر سے ملا۔ اسی وجہ سے تعلیمی میلے سے متعلق سارے مضامین اس میں نہیں شامل ہو سکے۔ اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ ساتھ ہی آپ کی رائے کا ہمیں شدت سے انتظار ہے کہ ہماری یہ کوشش آپ کی نظر میں کس حد تک کامیاب رہی۔

اور اب تعلیمی میلا نمبر کا دوسرا شمارہ حاضر خدمت ہے۔ اس میں آپ جامعہ مڈل اسکول کی بقیہ سرگرمیوں کے بارے میں پڑھیں گے۔ اور تصاویر کے ذریعے میلے کی جھلکیاں دیکھیں گے۔ اس شمارے میں نہرو ٹرافی کے تحت کرائے گئے مختلف مقابلوں کے بارے میں پڑھیں گے اس کے ساتھ ہی مختلف پروجیکٹس اور تعلیمی نمائش کی رپورٹ۔ تمثیلی مشاعرے کا تفصیلی حال، ابنائے قدیم کی دلچسپ بیت بازی کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ہم آپ کو نیشنل سروس اسکیم سے بھی متعارف کرا رہے ہیں کہ یہ اسکیم کیا ہے۔ ہمارے اسکول کے کتنے بچے اس میں حصہ لے رہے ہیں اور تعلیمی میلے میں اس اسکیم نے کیا رول ادا کیا۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

تعلیمی میلے کی جھلکیاں

NEHRU TROPHY

ہوا۔ پینٹنگ کے لیے دو گھنٹے کا وقت دیا گیا۔ ڈرائنگ شیٹ
تقسیم کی گئیں اور سب [illegible]
بے نیاز ہو کر اپنے اپنے کام [illegible]
دو گھنٹے کی اس محنت کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

۱۔ [illegible]
۲۔ [illegible]
۳۔ [illegible]

انعام [illegible]

انعامات [illegible]

[illegible]

کو اسکول [illegible]

مرکزی پنڈال [illegible]

فرما رہے تھے [illegible]

[illegible]

ڈالنے کی [illegible]
کہ جامعہ [illegible]
[illegible]
مقبول [illegible]
[illegible]
تنہائی [illegible]
ان مقصدوں [illegible]
[illegible]
افزائی [illegible]
ہونے کا [illegible]
[illegible]
صاحب نے [illegible] سے
مقابلے کا اعلان کیا۔

نظم خوانی کا مقابلہ سب سے پہلے نظم خوانی کا مقابلہ ہوا۔ سارے اسکولوں کے طلبہ نے اپنے مخصوص انداز میں اردو۔ ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں نظمیں سنائیں۔ جو بہت پسند کی گئیں۔

جج صاحبان کے فیصلے کے مطابق۔
جامعہ مڈل اسکول۔ اوّل۔
دیو سماج ماڈرن اسکول۔ دوم
منظر الاسلام اسکول۔ سوم انعام کے مستحق قرار دیے گئے۔ جامعہ مڈل اسکول سے عاصم قاسمی درجہ ہشتم نے جو نظم پیش کی۔ وہ پیش خدمت ہے

جاں نثار اختر

ہماری تاریخ

(۱) اے وطن! اے مری گنگا کی، ہمالہ کی زمیں
سیکڑوں سال فروزاں ہیں تری یاد کے ساتھ
تجھ میں [illegible] حسیں ہوں تیرے
تہذیب بھی ہے حسنِ خداداد کے ساتھ

(۲) کتنے سورج ترے ماتھے سے اُگے کیا کہیے
اب بھی ذرّوں میں نہاں جن کی چمک لگتی ہے
کتنی تہذیبوں کے گلزار کھلے ہیں تجھ میں
تیری دھرتی کوئی سترنگ دھنک لگتی ہے

(۳) تیری تاریخ ہے قرآں کا گیتا کا ورق
آشتی، امن، اہنسا کے اصولوں کا سبق
رہے اپنا مقابل کوئی اب تک نہ اٹھا
کوئی گوتم، کوئی چشتی، کوئی نانک نہ اٹھا

(۴) تیری تاریخ صداقت کی، حسین قدروں کی
دل کے رشتے کی، مروّت میں بسی نظروں کی
تیری تاریخ ہے بھگتی کے امر نغموں کی
تیری تاریخ ہے خود روح کے آدرشوں کی

(۵) تفرقہ باز سیاست نے بہت کھیل رچے

اپنا آدرش تھا پر جان سے پیارا ہم کو
تو نے دیکھا ہے کہ ہم مل کے اُٹھے مل کے بڑھے
تو نے جب چونک کے ایک بار پکارا ہم کو

(۶) اجنبی ہاتھوں نے لکھی تھی جو تاریخ تری
اس کو کیا نام دیں سوچی ہوئی تہمت کے سوا
اپنے ہر پیار کو نفرت میں بدلنا چاہا
کیا پکاریں اسے چالاک سیاست کے سوا

(۷) اے وطن! ہم تری تاریخ لکھیں گے پھر سے
تیری تاریخ ہے دل جوئی و دلداری کی
تیری تاریخ ہے محنت کی، وفا کی تاریخ
تیری تاریخ اخوت کی، رواداری کی

(۸) کچھ اندھیروں کے پرستار اگر ہیں بھی تو کیا
روشنی ہو تو اندھیروں کی کہاں چلتی ہے
سیکڑوں سال کے ماتھے پہ دمک ہے جس کی
اپنے سینوں میں وہی شمع حسیں جلتی ہے

(۹) ایک ہے اپنا وطن، ایک زمیں، ایک ہیں ہم
ایک ہے فکر و عمل، ایک یقیں، ایک ہیں ہم
کون کہتا ہے کہ ہم ایک نہیں، ایک ہیں ہم

گروپ سانگ

اب گروپ سانگ کے مقابلوں کی باری ہے۔ مختلف اسکولوں کے بچے بچیوں نے باری باری اپنے پروگرام پیش کیے اور حاضرین سے داد حاصل کی۔ پہلی صف میں بیٹھے ہوئے جج صاحبان ہر گروپ سانگ کو ان کے موضوع اور مناسبت کے اعتبار سے نمبر دے رہے ہیں اب نتیجہ کا اعلان ہو رہا ہے۔ جامعہ مڈل اسکول کے بچوں کے پیش کیے ہوئے گروپ سانگ نے پہلا انعام حاصل کیا دوسرے نمبر پر وہی پبلک اسکول کے بچے اور تیسرے نمبر پر فادر اگنیل اسکول کے بچوں نے انعام حاصل کیے۔

جامعہ مڈل اسکول کی طرف سے پروگرام طالبات نے پیش کیا۔ جو سفید کپڑوں میں بہت پیاری معلوم ہو رہی تھیں باقی اسکولوں کے بچوں نے پروگرام اپنے اپنے انداز میں پیش کیے۔

جامعہ کے بچوں کے گروپ سانگ "سورج کا تیر لیے چاند کی لیے کماں" گیت کی دھن اور طرز جناب [illegible] صاحب نے بنائی تھی۔ اور انھوں نے ہی اس دن میوزک بھی [illegible] اس میں مندرجہ ذیل طالبات نے حصہ لیا۔

۱۔ رضوانہ اسعد
۲۔ فرحانہ رحیم
۳۔ سروری بانو
۴۔ نشاط پروین
۵۔ شاہدہ خاتون
۶۔ صوفیہ خاتون
۷۔ نکہت جہاں
۸۔ جہاں آرا
۹۔ فاطمہ [illegible]
۱۰۔ روحتہ [illegible]
۱۱۔ شائستہ بیگم
۱۲۔ [illegible] مشیر
۱۳۔ [illegible]
۱۴۔ شاہدہ خورشید
۱۵۔ عابدہ بیگم
۱۶۔ نجمہ [illegible]

آئیے آپ کو گیت بھی سناتے چلیں۔ بغیر ساز کے [illegible]

سورج کا تیر لیے چاند کی لیے کماں
آنکھوں میں سپنے لیے نکلے ہم نونہال
ہم چلے ہوا چلی، ہزار پھول کھل اٹھے
جس جگہ بڑھے قدم نئے چراغ جل اٹھے
نئے چراغ جل اٹھے

دھوم سے چلا امنگ مستیوں کا کارواں
آنکھوں میں سپنے لیے نکلے ہم نونہال
نکلے ہم نونہال

لاکھ تن سہرا اٹھے لاکھ من مچل اٹھے
مٹی بھی جھوم اٹھی گونج اٹھا آسماں

بڑھتے جاتے آگے آگے ساودھان ساودھان
آنکھوں میں سپنے لیے نکلے ہم نونہال

کا کیا ردعمل ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک پنڈت جی کا ردعمل اس نے
اپنی آواز میں پوجا کی گھنٹی کی آواز نکال کر اور پنڈت جی کے
مخصوص لہجے میں "میرا کرشن بجائے بانسریا" گا کر پیش کیا۔
اسی طرح ایک سردار جی۔ ایک شوہر۔ ایک کلرک کا ردعمل اس
نے بکمال فن سے پیش کیا۔ اسی گانے کو مغربی طرز کے آرکسٹرا
کی دھن پر بھی اس نے بہت اچھی طرح پیش کیا۔

منظہرالاسلام اسکول کے ایک بچے نے بستر مرگ پر پڑے
ہوئے باپ کی حالت اور بیٹے کی باپ کی جائیداد پر نظر کے منظر
کی نقل کی۔ بوڑھا باپ ڈاکٹر کو بلانے کی نقاہت بھری
آواز نکالتا ہے اور بیٹا ان سے جائیداد کی وصیت کی بات
کرتا ہے۔

اور اب باری ہے۔ جامعہ مڈل اسکول کے بچے وحید خاں
کی۔ جس نے اسٹیج پر جامع مسجد سے لے کر فتح پوری تک کی سیر
تانگے میں بٹھا کر کرائی۔ لیجیے ان کی پوری مونو ایکٹنگ ہی ہم
آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

"ایک خلیفہ کبوتر بازی کر رہا ہے اس کا دوست سابو
آتا ہے (کبوتر کو بلانے اور اڑانے کا ایکشن)

سابو:۔ ماں خلیفہ ماں خلیفہ ماں کبوتر بازی ہی کرتے رہو گے
کہ کہیں چلو گے بھی۔ آؤ جامع مسجد چلتے ہیں۔

جامع مسجد پر۔

حلیم والا: آئیے حلیم والا گرما گرم حلیم آئیے تازہ تازہ گرما گرم حلیم۔

سابو:۔ ماں خلیفہ آؤ حلیم کھائیں گے بھائی صاحب ایک روپے
کی حلیم دینا۔

ایک لڑکی:۔ چار آنے کی حلیم مجھے دو (لڑکی کی آواز میں)

ایک لڑکا:۔ آٹھ آنے کی مجھے بھی۔

حلیم والا:۔ لو بھائی صاحب ایک روپے کی حلیم۔

سابو:۔ ارے یار اس میں تھوڑی سی ہری مرچیں تو ڈال دے۔

حلیم والا غصے میں:۔ ارے میاں ایک روپے میں۔ میں ساری
ہری مرچیں تم کو ہی دے دوں گا میرے اور گاہک نہیں ہیں کیا۔

سابو:۔ اچھا یار تھوڑی سی تو ڈال دے۔

حلیم والا:۔ لے پکڑ

خلیفہ:۔ اماں یار سابو تماشا ہو رہا ہے چل تماشہ دیکھتے ہیں۔

تماشے والا:۔ مہربان قدردان آئیے میرے جھمورے کا تماشا دیکھیے
مہربان قدردان ایک آپ سے بنتی ہے کہ آپ لوگ سب
اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہنا۔ میرے جھمورے کی جان خطرے
میں ہے۔ جھمورے۔

جھمورا:۔ ہاں استاد

تماشے والا:۔ ادھر آ

جھمورا:۔ آگیا

تماشے والا:۔ اُدھر جا

جھمورا:۔ چلا گیا۔

تماشے والا:۔ ان صاحب کی جیب میں گھوس جا

جھمورا:۔ گھوس گیا

تماشے والا:۔ بتا تو جھمورے ان کی جیب میں کیا ہے۔

جھمورا:۔ استاد پین

تماشے والا:۔ ٹھیک ہے ادھر آ

جھمورا:۔ آگیا

تماشے والا:۔ اُدھر جا

جھمورا:۔ چلا گیا

تماشے والا:۔ ان صاحب کے پاس پہنچ جا

جھمورا:۔ پہنچ گیا

تماشے والا:۔ پہچان لے

جھمورا:۔ پہچان گیا

تماشے والا:۔ یہ کون ہے

جھمورا:۔ لڑکا ہے

تماشے والا:۔ نہیں لڑکی ہے

جھمورا:۔ لڑکا ہے

تماشے والا:۔ نہیں لڑکی ہے۔

جھمورا:۔ نہیں لڑکا ہے

تماشے والا:۔ ٹھیک ہے ادھر آ

جھمورا:۔ آگیا

تماشے والا:۔ اُدھر جا

اور ہر ایک کی ضرورت کے مطابق سامان فراہم کرنا عبدالحمید صاحب اور سلیمان قاسمی صاحب کا کام تھا۔ تمام ریکارڈ تیار کرنے میں ذکرالرحمٰن صاحب، پریم پرکاش صاحب، شاہد صاحب، عثمان صاحب اور اخلاق صاحب نے مدد کی۔ مڈل اسکول کے بچوں نے اساتذہ صاحبان، صدیقی صاحب اور نعمت صاحب کی نگرانی میں پنڈال میں نشست کا انتظام کیا۔ صدیقی صاحب اور نعمت صاحب نے NSS کے والنٹیرس کے ذریعے ہماری کافی مدد کی۔ جس کے لیے ہم ان کے شکرگذار ہیں۔

بڑی ناانصافی ہوگی۔ اگر ہم اپنے اسکول کے ان ساتھیوں کا شکریہ ادا نہ کریں جو میلے کے تمام پروگراموں میں ایک طرح سے ہمارے ہاتھ پاؤں بنے ہوئے تھے۔ جناب اسرار الحق صاحب مشتاق صاحب۔ ذی شان صاحب۔ حافظ ابوالحسن صاحب انعام صاحب۔ حمید صاحب۔ احسان الحق صاحب۔ علاءالحق صاحب

(رپورٹر۔ یاسر جلال۔ راشد رفیق۔ معین الحق)

سنہ ۱۹۷۳ء سے سنہ ۱۹۸۲ء تک جامعہ مڈل اسکول کے صدر اور وزیر اعظم

صدر	وزیر اعظم	سن
محمد اشفاق	مجیب الرحمٰن	۷۳،۷۴
جاوید اکرام	سید احمد علی	۷۴،۷۵
محمد فیضان بیگ	مجیب الرحمٰن	۷۵-۷۶
کاظم علی	شہاب الدین	۷۶،۷۷
نظام الدین	اسداللہ خاں	۷۷-۷۸
ظہیر انور	سہیل احمد	۷۸-۷۹
محمد عرفان	مظہر جمیل	۷۹،۸۰
محمد اکبر خاں	مظہر آصف انصاری	۸۰-۸۱
سعید احمد	محمد عاصم قاسمی	۸۱-۸۲

محمد اکبر خاں
سابق صدر، بچوں کی حکومت

ڈاکٹر قنبر رضوی

سردی آئی

سردی آئی سردی آئی
اوڑھو کمبل اور رضائی
جیت گئی گرمی سے سردی
سورج کے منہ پر ہے زردی
سردی سے سورج شرمایا
کہرے میں منہ اس نے چھپایا
پانی پانی ہوکر رویا
اوس نے سورج کا منہ دھویا
ہوا چلی میداں میں سسکتی
برف آئی، وادی میں کھسکتی
بہی ہوا جو سر سر سر سر
بچے بوڑھے کانپے تھر تھر
نزلہ۔ زکام اور کھانسی۔ بلغم
لایا کیا سردی کا موسم
سب نے دی جاڑے کی دہائی
کمبل اوڑھے۔ اوڑھی رضائی
آیا طوفاں برسے اولے
کوئی نہ اب دروازہ کھولے
کھلا جو دروازہ پائے گا
جاڑا گھر میں گھس آئے گا
بچو مانو بڑوں کا کہنا
سردی سے تم بچ کر رہنا

ہیرڈ گری کالج، شکوہ آباد

محمد عاصم قاسمی ۔ درجہ ہشتم

تمثیلی مشاعرہ

۳۰ نومبر ۱۹۸۱ء کی خوب صورت اور خنک رات کا وقت ہے، میلے کی آرائیش۔ ہما ہمی اور رنگ برنگے قمقموں نے رات کے حسن کو کچھ اور دوبالا کر دیا ہے۔ بعینہ آج سے گیارہ سال پہلے والا سماں ہے جامعہ اسکول کی عمارت رنگ برنگے جھنڈوں۔ جھنڈیوں اور شاہ کار تصویروں سے دلہن کی طرح سجی ہوئی ہے۔ بچے خوب صورت کپڑوں میں رات کے وقت ایسے اچھل کود رہے ہیں۔ گو کوئی تہوار ہے۔ بڑے بھی ہشاش بشاش سے مرکزی عمارت کے بڑے پنڈال میں مشاعرہ سننے کے لیے جوق در جوق چلے آ رہے ہیں پنڈال بھرا گیا ہے اور باہر بھی کافی لوگ جنھیں بیٹھنے کی جگہ نہیں ملی بیٹھے ہیں۔ اسٹیج پر شعرا ایک ایک کر کے آ رہے ہیں۔

اب یہ کیا اعلان ہوا، حضرت جگر مراد آبادی تشریف لا رہے ہیں! بھئی یہ کیسا مشاعرہ ہے۔ جس میں عالم ارواح سے شعرا بلائے گئے ہیں۔ کسی نے ٹوکا۔ "بھائی یہ تمثیلی مشاعرہ ہے!" اب جو اسٹیج کو غور سے دیکھا تو وہاں فراق صاحب بھی موجود ہیں۔ مگر آج کے نہیں۔ کوئی پچیس تیس سال پہلے کے فراق صاحب۔ شاعر صاحب بھی اپنی مخصوص ادا سے پہچانے جا رہے ہیں۔ آج سے تیس سال پہلے کے کنور مہندر سنگھ بیدی بھی نظر آ رہے ہیں۔ رگھو پتی سہائے فراق اور یہ مجاز بھی اپنی وضع قطع سے نمایاں نظر آ رہے ہیں۔ حفیظ جالندھری بھی اپنے مخصوص انداز میں آداب قبول کر رہے ہیں۔ اور یہ! کیفی اعظمی بھی ہاتھ میں چھڑی لیے کرسی پر براجمان ہیں۔

مشاعرہ شروع ہونے کا اعلان ہوتا ہے۔ مشاعرے کی نظامت ۔۔ فاضلی کے نام پر ندیم احمد متعلم بی ایڈ کر رہے ہیں۔ اور مسند صدارت حضرت جگر مراد آبادی کے نام پر اسد اللہ صاحب نے سنبھال رکھی ہے۔ جگر صاحب خاموش بیٹھے مشاعرے کی کارروائی دیکھ رہے ہیں۔ اور بیچ بیچ میں آنکھوں کی مخصوص چمک اور زیر لب

مسکراہٹ سے داد بھی دیتے جا رہے ہیں۔ پان کا ڈبہ اور بٹوا ان کی اہمیت میں اور بھی اضافہ کر رہا ہے۔

جب بیکل اتساہی کی باری آئی تو لوگوں کو نقل پر اصل ہونے کا ایسا دھوکا ہوا کہ کچھ لوگ بے اختیار کہہ اٹھے کہ تمثیلی مشاعرے میں کہیں اصلی شاعر کو تو نہیں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ مگر نہیں جناب! یہ ظہور محمد صاحب تھے۔ جن کا میک اپ ہی نہیں، چال ڈھال اور ترنم کا انداز سب بیکل اتساہی ہی جیسا تھا۔

سلیم کھتولوی جیسے ہی مائک کے قریب پہنچے۔ انھوں نے مائک پر زوردار ہاتھ مار کر گویا اصلی سلیم کھتولوی ہونے کا اعلان کیا۔ پھر ان کا کھنکارنا اور کلام سنانے کے درمیان ٹھہر کے ساتھ جلد بازی۔ آداب کرنے کا انداز۔ چہرے کا اتار چڑھاؤ، سب کچھ رضی کمال صاحب نے اس کمال کے ساتھ پیش کیا کہ سلیم کھتولوی بھی اگر محفل میں یہ سب دیکھ رہے ہوتے تو خود کو نقلی اور نقلی کو اصلی تصور کر کے محفل سے اٹھ گئے ہوتے۔

اس تمثیلی مشاعرے میں حفظ مراتب کا خیال رکھتے ہوئے یوں تو اساتذہ کے کلام کی باری آخر میں رکھی گئی تھی۔ مگر حفیظ جالندھری صاحب عجلت میں تھے۔ اس لیے ان کے نام کا اعلان پہلے ہی کر دیا گیا۔ جناب اشفاق محمد خاں نے حفیظ جالندھری کے صرف کلام سنانے کے انداز کی ہی نہیں بلکہ ان کے مائک تک آنے، جانے اور آداب و اختزام سب ہی چیزوں کی نقل کچھ اتنی ہوشیاری سے کی کہ کسی کو یہ پتا ہی نہیں چل سکا کہ یہ جلد بازی "حاجت تبدیلئ لباس" کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ یہ عقدہ تو بعد میں اس وقت کھلا جب وہی اشفاق محمد خاں صاحب ساغر نظامی کا روپ دھار کر سوٹ بوٹ میں اسٹیج پر نظر آئے۔ اور ساغر نظامی کے مترنم انداز میں غزل سنا کر داد تحسین وصول کی۔

اب فراق صاحب کا نام پکارا جاتا ہے۔ مسعود احمد صاحب جواب فراق صاحب کے روپ میں اسٹیج پر بیٹھے ہیں۔ عالم کیف میں جھومتے ہیں۔ مگر مائک تک آتے نہیں، لائے جاتے ہیں۔ فراق صاحب کے انداز میں کچھ رباعیاں اور غزل کے کچھ شعر سناتے ہیں اور مائک سے لے جائے جاتے ہیں۔

کیفی اعظمی کا نام پکارے جانے پر سامعین کی نظر اسٹیج پر پیچھے کی قطار میں کرسی پر براجمان جناب خالد سیف اللہ پر جاتی ہے۔ کیفی صاحب چھڑی کا سہارا لے کر مائک تک آتے ہیں۔ پیچھے پیچھے کرسی لائی جاتی ہے اور وہ کرسی پر بیٹھ کر جمہوریت کے دیے جلاتے ہیں۔

روشن صدیقی کا نام آتے ہی وضاحت حسین روشن صاحب مرحوم کی چلت پھرت کے انداز میں تقریباً اچھلتے ہوئے مائک تک پہنچتے ہیں۔ اور ہمیشہ کی طرح نئی غزل کہنے کا وقت نہ ہونے کا عذر پیش کر کے جلدی جلدی پرانی نظم "شبنم" سنا کر جلد ہی واپس اپنی جگہ چلے جاتے ہیں۔

مزاحیہ کلام میں ہمیشہ کی طرح دلاور فگار اس تمثیلی مشاعرے کو بھی لوٹ لے گئے۔ دلاور فگار سے کچھ زیادہ بھاری جثے کے آفتاب احمد صاحب بٹن سے بے نیاز شیروانی جس کی جیب ہم باہر نکلی ہوتی ہے۔ پہنے ہوئے مائک تک پہنچے۔ کھڑے ہو کر بدل بدل کر داد وصول کرتے رہے۔ سامعین کی زبردست فرمائش پر انھیں دوسری غزل بھی سنانی پڑی۔

سکندر علی وجد کی سنجیدگی کا بھرم رکھنے کا بار آصف علی پر تھا۔ سنجیدگی اور متانت کی مورتی نے ایک ہی غزل سنا کر سامعین کو بھی سنجیدہ کر گئے۔

جب ترقی پسند ادب کی آبرو کی بات چلی تو لوگ سمجھ گئے یہ فیض احمد فیض کا ذکر ہے۔ شکیل اللہ صاحب گھر پھونک مستی اور بے پروائی کے انداز میں مائک تک پہنچے اور نیاز مندانہ بے نیازی کے ساتھ اپنی مشہور غزل "چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے" کے پرزے پرزے بکھیر کر واپس چلے گئے۔

سردار ادب کنور مہندر سنگھ بیدی سے ہوئے تھے اکرام الحق صاحب۔ کالی مونچھ داڑھی پر سفید بڑی سی پگڑی باندھے قطعہ اور غزل سب کچھ سنا گئے اور اپنے اس شعر پر سامعین کی بھرپور داد حاصل کی ؎

عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں
صرف مسلم کا محمدؐ پہ اجارہ تو نہیں

خواتین کی نمائندگی، پاکستان کی مشہور شاعرہ زہرہ نگاہ نے کی۔ کالج کی طالبہ نیاز فاطمہ نے زہرہ نگاہ کے مقبول انداز ترنم

اس دلچسپ تمثیلی مشاعرے کا افتتاح جناب ساغر اعظمی کی غزل سے

کیوں قتل ہمیں کیجیے مر جائیں گے ہم خود ہی
بس ہم پہ محبت کا الزام لگا دیجیے

سے ہوا اور اختتام میر مشاعرہ حضرت جگر مرادآبادی کے کلام پر ہوا۔

تخت صدارت پر جلوہ افروز حضرت جگر مرادآبادی کے پاس مائک لے جایا گیا۔ اسد اللہ صاحب نے جگر صاحب کے انداز میں ہلکی سی گنگناہٹ کے بعد یہ غزل بہت مترنم اور جاذب انداز میں سنائی ؎

جہل خرد نے دن یہ دکھائے گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

اور سامعین کی زبردست فرمائش پر جگر صاحب نے دوسری غزل سے صدآرزوئے خوشگوار و سرگراں لیے ہوئے

پھر اگرے گی زندگی کہاں کہاں لیے ہوئے

بھی سنائی اور تقریباً چار گھنٹے تک رنگ و نور میں ڈوبا یہ تمثیلی مشاعرہ ہنگامہ برپا کرتا رہا۔ مشاعرہ تمثیلی ضرور تھا مگر سننے والوں نے اصلی مشاعرے سے بھی زیادہ ذوق و شوق کے ساتھ داد دے کر اپنے ستھرے ذوق کا پتا دیا۔

بیت بازی طلبائے قدیم

صوفیہ خاتون۔ درجہ ہفتم

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں نرسری سے لے کر کالج تک تعلیم اردو زبان میں دی جاتی ہے۔ اسکولوں میں بچوں کو اردو زبان اور ادب سکھانے کا بے حد دلچسپ اور مفید ذریعہ "بیت بازی" ہے۔ بچے چوتھی پانچویں جماعت سے ہی شعر پڑھنے کا سلیقہ سیکھ جاتے ہیں۔ جوں جوں وہ تعلیم کی اونچی منزلوں کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ اچھے اشعار پڑھنے، سننے اور انھیں یاد کرنے کا ذوق نکھرتا جاتا ہے۔

اس سال میلے کے موقع پر بیت بازی کے ایک انوکھے مقابلے کا اہتمام کیا گیا۔ اس مقابلے کا اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن سرگوشیوں میں اس کی خبر پوری جامعہ برادری میں گشت کر رہی تھی۔ آخرکار ۱۳ر اکتوبر ۸۱ء کی شام کو ۵ بجے اس مقابلے کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔

بیت بازی کے مقابلے یوں تو آئے دن ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ رات کے آٹھ بجے تک اس مقابلے کو دیکھنے اور سننے والوں کا مجمع بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ بچے حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ بیت بازی کا ایسا کون سا مقابلہ ہے جسے ہر شخص دیکھنا چاہتا ہے۔

لیجیے میں آپ کو بتاؤں۔ یہ مقابلہ تھا "ماضی بعید" کے طلبائے قدیم اور "ماضی قریب" کے طلبائے قدیم کے درمیان۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ میلے کے دوران کئی بوڑھے ابنائے قدیم کو زیر لب اشعار یاد کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

آٹھ بج کر غالباً پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ جناب تدبیر الدین مینائی صاحب اسٹیج پر نمودار ہوئے اور بے حد سنجیدہ اور بھاری بھرکم آواز میں اعلان فرمایا۔

"خواتین و حضرات!

"ماضی قریب کے جواں سال طلبائے قدیم کی ٹیم تیار ہے اور اسٹیج پر آیا ہی چاہتی ہے لیکن "ماضی بعید" کے طلبائے قدیم کو یہاں تک پہنچنے میں کچھ نہ کچھ وقت تو ضرور لگے گا۔ عمر کا تقاضہ جو ٹھہرا (مجمع سے بے اختیار قہقہہ بلند ہوتا ہے) میں اس مقابلے کی صدارت کے لیے جناب ضیاء الحسن فاروقی کا نام پیش کرتا ہوں" ضیاء الحسن فاروقی صاحب اسٹیج پر تشریف لاتے ہیں۔ ان کے ساتھ جناب شاہد علی خاں صاحب، انور صدیقی صاحب، مسعود الحق صاحب اور شمیم حنفی صاحب بھی ہیں۔ تمام حضرات اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں اور دائیں جانب سے ماضی قریب کے طلبائے قدیم کی ٹیم اسٹیج پر آتی ہے اور بائیں طرف کی کرسیوں پر بیٹھ جاتی ہے۔ آئیے ان سے آپ کا تعارف بھی کراتی چلوں۔

۱۔ شاہدہ پروین
۲۔ انجم ظہور
۳۔ گیتی رحمان
۴۔ شیما رحمان

۵۔ نسیم جہاں
۶۔ نشاط لطیف
۷۔ نزہت مہدی
۸۔ صبیحہ بیگم
۹۔ مدحت فاطمہ
۱۰۔ سیما احمد
۱۱۔ نیاز فاطمہ
۱۲۔ ناہید ظہور

یک بیک تالیوں کا ہلکا سا شور سنائی دیتا ہے۔ جس کی گونج لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہے۔ لیجیے وہ آگئے۔ کون؟؟ ”ماضی بعید“ کے طلبائے قدیم کی سست رفتار ٹیم۔

گو کہ ان حضرات میں کوئی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں تھی پھر بھی مینائی صاحب نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ہر ایک کا تعارف کرایا اور ہر ایک کی کسی نہ کسی کج پر چند جملے ضرور چپکا دیے اراکین ٹیم کے نام اس طرح ہیں۔

۱۔ سید جمال الدین۔ لکچرار شعبہ تاریخ
۲۔ عبادالحسن آزاد۔ ریڈر شعبہ عرب ایرانین اسٹڈیز
۳۔ خالد سیف اللہ۔ ہیڈ ماسٹر، جامعہ مڈل اسکول
۴۔ آصف نقوی ۔ گائیڈ نیچرل ہسٹری میوزیم
۵۔ رشید الوحیدی ۔ لکچرار، شعبہ عرب ایرانین اسٹڈیز
۶۔ صغرا مہدی ۔ لکچرار شعبہ اردو
۷۔ عذرا مجیب ۔ سوویت انفارمیشن سنٹر
۸۔ رانعہ خاتون ۔ ٹیچر۔ جامعہ ہائر سکنڈری اسکول
۹۔ عائشہ خاتون ۔ ٹیچر۔ جامعہ مڈل اسکول
۱۰۔ آصف علی ۔ انجینیر۔ سنٹرل واٹر اینڈ پاور کمیشن
۱۱۔ اعجاز احمد ۔ ٹیچر۔ این ڈی۔ ایم۔ سی
۱۲۔ رضی احمد کمال ۔ ٹیچر۔ جامعہ ہائر سکنڈری اسکول
۱۳۔ مسعود احمد ۔ ٹیچر۔ دہلی کارپوریشن

جناب ضیاء الحسن فاروقی نے ایک گھنٹے کے اس مقابلے کا افتتاح ان الفاظ کے ساتھ فرمایا۔

”خواتین و حضرات!

بیت بازی کے اس مقابلے کا جامعہ میں بہت چرچا ہے مجھے بھی اس مقابلے سے بڑی دلچسپی ہے مجھے حیرت ہے کہ ”ماضی بعید“ کے طلبائے قدیم عمر اور ملازمت کے بکھیڑوں کے ساتھ اس مقابلے کی جرأت کیوں کر کر سکے۔ انھیں شاید اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ عمر کی اس منزل میں حافظہ عام طور پر ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ بہر کیف میں ان کی ہمت کی داد دیتا ہوں اور ساتھ ہی ساتھ ان سے اظہار ہمدردی بھی کرتا ہوں۔ میری نیک خواہشات کے باوجود ان کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ کہا نہیں کہا جا سکتا۔ اب میں ایک شعر پڑھتا ہوں جس کا جواب ماضی قریب کے طلبہ دیں گے اور اس طرح بیت بازی شروع ہو جائے گی۔ آپ حضرات سماعت فرمائیں“

ادبی اور شعری کشمکش کا ایک دلچسپ سلسلہ شروع ہوگیا۔ نوجوان ٹیم۔ قدیم طلبہ کا جوش و خروش دیکھ کر قدرے نروس دکھائی دے رہی تھی۔ کیوں کہ اس ٹیم میں سے بیشتر ان کے اساتذہ اور بزرگ تھے۔

بوڑھی ٹیم کی صفوں میں شروع سے ہی انتشار کی کیفیت پیدا ہو چلی تھی۔ جوابی اشعار پڑھنے کے لیے ایک ساتھ کئی کئی بزرگ حملہ آور ہوتے تھے۔ بعض اوقات چھینا جھپٹی اور ایک دوسرے کو دھکا دینے سے بھی باز نہیں آتے تھے اور مجمع ان کے دیے گئے اشعار اور ان کی حرکتوں سے خوب خوب لطف لے رہا تھا۔

ایک گھنٹے کا وقت ختم ہونے کے قریب آیا۔ جناب صدر نے مقابلہ ختم ہونے کا اعلان کرنا چاہا۔ لیکن مجمع کے اصرار پر وقت آدھے گھنٹے کے لیے اور بڑھا دیا گیا۔ بوڑھے بیت بازوں کی صف میں اس اعلان کے بعد بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ اور بعض حضرات نے اس فیصلے کی دبے الفاظ میں مخالفت بھی کی لیکن صاحب صدر کے فیصلے کا احترام بھی لازم تھا۔

چنانچہ مقابلہ پھر شروع ہوگیا۔ بوڑھوں نے زور لگا کر یہ وقت بھی گزار ہی لیا۔ آخری لمحات میں کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے یادداشت کے خشک سوتے ایک بار پھر ابل پڑے ہوں۔ نوجوانوں کی ٹیم کے حوصلے پست ہوتے نظر آرہے تھے۔ ممکن ہے کہ میدان شعر و ادب ”ماضی بعید“ کے طلبائے قدیم کے ہاتھ رہتا لیکن صاحب صدر نے مقابلہ ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔

شمیم حنفی صاحب نے آخر میں اس مقابلے پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بوڑھے بیت بازوں کی صف میں جو انتشار شروع سے ہی نظر آرہا تھا۔ اس کی وجہ یہ خوف تھا کہ جو اشعار ان [illegible] کو یاد ہیں۔ انھیں کوئی دوسرا نہ پڑھ دے“۔ اشعار کے معیار [illegible]

(باقی صفحہ [illegible] پر)

اس کے بعد "منزل ایک راہیں بہت" پروجیکٹ جو مختلف عقائد اور مذاہب کی عکاسی کرتا تھا دیوار پر آویزاں تھا۔ نیچے میز پر جامعہ کے بارے میں۔ جامعہ کے بانیوں کے بارے میں اور "منزل ایک راہیں بہت" پروجیکٹ کے پمفلٹ خوب صورت سرورق کے ساتھ رکھے ہوئے تھے تاکہ دیکھنے والے چارٹوں کے علاوہ پمفلٹ سے مزید معلومات حاصل کر سکیں۔

باغبانی پروجیکٹ

دوسرے کمرے میں باغبانی پروجیکٹ کی نمایش کی گئی تھی اور دیواروں پر چارٹس اور میزوں پر پمفلٹ سجائے گئے تھے۔ ساتھ ہی جمع شدہ پھلوں پھولوں، اور سبزیوں اناجوں وغیرہ کے بیج بھی شیشیوں میں رکھے گئے تھے۔ کچھ بیج شوکیس میں تھے۔ اس کے علاوہ مختلف قسم کی کھاد (دیسی۔ ولایتی) مختلف قسم کی مٹیاں (Soils) شیشیوں میں بھری رکھی تھیں۔ کچھ بیج اُگنے کے تجربات تھے۔ نیز مختلف قسم کی جڑیں اور تنے بھی شوکیس میں رکھے ہوئے تھے۔ جو بچوں نے جمع کیے تھے۔"

یہ باغبانی پروجیکٹ اسی سال چلایا گیا جو کسی ایک جماعت نے نہیں بلکہ سبھی جماعتوں کے بچوں نے مل کر چلایا تھا محبوب صاحب کی زبانی اس پروجیکٹ کی تیاری کا حال بھی سنتے چلیے۔

"بچوں کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے باغبانی پروجیکٹ کا فیصلہ ستمبر میں کیا گیا۔ لیکن چوں کہ ستمبر کے آخر میں پہلی جانچ ہونے والی تھی اس لیے طلبہ کو زیادہ Disturb نہیں کیا گیا۔ اور نہ ان کی توجہ میلے کے کاموں کی طرف کرائی گئی۔ بس کام چلتا رہا۔ اور جانچوں کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ یکم اکتوبر سے ۱۱ر اکتوبر تک تقریبًا چھٹیاں ہی رہیں۔ چنانچہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طلبہ کو باغبانی پروجیکٹ سے متعلق مختلف کیڑے مکوڑوں۔ پھولوں پھلوں۔ سبزیوں کی تصویریں جمع کرنے کے لیے کام بتا دیے گئے۔ جس کو بعض بچوں نے بڑی دلچسپی اور لگن کے ساتھ کیا۔ چھٹیوں کے بعد جب بچے لوٹ کر آئے تو پھر پروجیکٹ کا کام باقاعدہ اور بہت تیزی کے ساتھ شروع ہوا۔

"بعض بچوں نے صبیحہ صاحبہ کی نگرانی میں پتیوں کا اور بچوں کا Collection کیا۔ پتیوں کا ایک البم تیار کیا۔ کچھ طلبہ نے مختلف قسم کی جڑیں اور تنے جمع کیے۔ بعض بچوں کو پھولوں۔ سبزیوں کے بیج جمع کرنے کے لیے مقرر کیا۔ ایک گروپ نے لکھائی کا کام کیا۔ کچھ بچے ڈرائنگ کا کام بڑے زور و شور سے کر رہے تھے۔ کچھ بچوں کو حرفے سے متعلق کاموں مثلاً Paper Cutting اور Clay Modelling وغیرہ کی ان کی دلچسپی کے مطابق کام کرنے کا موقع ملا۔ اور انھوں نے استاد درجہ کی نگرانی میں سبزیوں اور پھلوں وغیرہ کی تصویریں کاٹیں۔

جہاں باغبانی کا عملی کام چل رہا تھا وہاں بچے مختلف قسم کی مٹیاں۔ بیج کھاد دیسی و ولایتی بھی حسب ضرورت شیشیوں میں جمع کرتے رہے اور باغبانی کے ساتھ ساتھ ان کے بارے میں بھی ضروری معلومات حاصل کرتے رہے۔ ان کی کیاریوں میں جب پودے اُگے تو سب بچے حیرت سے انگشت بدنداں رہ گئے چنانچہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بچوں کو Germination پر کئی تجربات کرائے گئے جن میں بچوں نے بہت دلچسپی لی۔ غرض سلسلہ چلتا رہا۔ کام بڑھتا رہا پھیلتا رہا۔"

سائنس کی دونوں استانیوں صبیحہ صاحبہ اور رخشندہ صاحبہ اور محبوب صاحب سے میوزیم کی تیاری میں کافی مدد ملی۔ مدرسے کے ایک پرانے طالب علم عابد صاحب جو اب کالج میں زیر تعلیم ہیں نمائش کی ترتیب میں ہاتھ بٹاتے رہے۔"

نہرو پروجیکٹ

اس نمایش کے موقع پر بچوں کی حکومت کی وزیر تعلیم صوفیہ خاتون صاحبہ سابق وزیر اطلاعات شاہدہ خاتون صاحبہ اور ان کے چند دوستوں نے مل کر "نہرو پروجیکٹ" چلایا تھا۔ نمایش میں یہ پروجیکٹ کافی مقبول ہوا۔ صوفیہ اور شاہدہ کی ننھی بہن عالیہ خاتون اور ان کی سہیلی نشاط پروین کے علاوہ انتخاب عالم۔ سرفراز احمد انصاری اور ظفر اعظم نے اس پروجیکٹ کا سارا کام مل جل کر پورا کیا۔ استاد محترم جناب فاروق احمد فاروقی صاحب کی رہنمائی میں ان ساتوں بچوں کے ملے جلے کام کو شیخ الجامعہ صاحب نے بہت پسند فرمایا

اس پروجیکٹ میں "نہرو جی کی زندگی۔ تصویروں کی زبانی" نام سے ایک البم چارٹس۔ پمفلٹ اور ان کی زندگی کے تمام واقعات اور اس زمانے میں پوری دنیا میں ہونے والے واقعات پر مشتمل پوری ایک تاریخ تیار کی گئی تھی جو لوگوں نے بہت پسند کی۔

گاہے گاہے باز خواں

ان کے علاوہ مدرسے میں چلائے گئے تین پرانے پروجیکٹ پیش کیے گئے تھے۔ ان پروجیکٹس کی اس زمانے میں اتنی شہرت ہوئی تھی کہ حکومت ہند نے ۱۹۶۲ء میں انھیں نمایش کے لیے جاپان بھیجا تھا اور پھر وہاں سے یورپ کے سات دیگر ملکوں میں ہو کر واپس آئے۔ جن میں چہارم جماعت کا "تہوار پروجیکٹ" جس کو مدرسہ کے ایک سابق استاد جناب امتیاز صاحب نے چلایا تھا۔ پنجم جماعت کا "آدمی پروجیکٹ" جس کو مدرسہ کے موجودہ استاد محبوب الرحمٰن صاحب نے چلایا تھا۔ اور ششم کا "ہمالیہ کی مہم" پروجیکٹ جو مرحوم استاد سید احمد علی آزاد نے چلایا تھا شامل تھے اس کے بعد قومی اتحاد کے پیش نظر چلائے گئے "اتحاد پروجیکٹ" اور بین الاقوامی Understanding پیدا کرنے کے لیے چلائے گئے "دنیا کے بچے پروجیکٹ" Display کیے گئے تھے۔ ساتھ ہی میزوں پر مختلف عنوانات کے تحت لکھے گئے مضامین کے پمفلٹ ترتیب سے رکھے گئے تھے اور دوسری Material Aids کی بھی نمایش کی گئی تھی جو ان پروجیکٹوں سے متعلق تھی اس طرح دو کمروں میں ماضی کی جھلکیاں باغبانی پروجیکٹ اور نہرو پروجیکٹ کے عنوان سے نمایش کا اہتمام کیا گیا تھا۔

نمایش کا افتتاح ۲۹ر اکتوبر ۱۹۸۱ء کو صبح گیارہ بجے محترم شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی کے دست مبارک سے ہوا۔ انھوں نے پہلے میوزیم اور پھر نمایش دیکھی میوزیم کی ہر ہر چیز کو بغور دیکھا اور خوشی کا اظہار کیا نیز بچوں کے COLLECTION پر داد دی۔ پھر نمایش دیکھی۔ جامعہ کی تاریخ نیز مدرسہ کی سرگرمیاں وغیرہ جس طرح ترتیب دی گئی تھیں وہاں "منزل ایک راہیں بہت"، پروجیکٹ موقع کے مطابق بالکل مناسب رہا۔ اور محترم شیخ الجامعہ صاحب نے بے حد پسند فرمایا اور خوشی کا اظہار کیا۔ دوسرے کمرے میں جو باغبانی پروجیکٹ لگایا گیا تھا وہ بھی بہت پسند کیا اور دوسرے پروجیکٹ کی تعریف کی یہاں تک کہ کچھ ہی دیر بعد پریس رپورٹر کو ہمراہ لے کر شیخ الجامعہ صاحب دوبارہ تشریف لائے اور خود تمام حالات بیان فرمائے شیخ الجامعہ صاحب نے فرمایا "یہ ہمارا کام ہے، یہ ہے اصل جامعہ کی تصویر۔ ہمارے بچوں نے قومی یک جہتی پر اور دوسرے موضوعات پر جو کام کیا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے"

میوزیم، نمایش گاہ کے دونوں کمرے، باغبانی پروجیکٹ اور نہرو پروجیکٹ وغیرہ وغیرہ کے مددگار طلبہ کے نام۔

پروجیکٹ میوزم PROJECT MUSEUM

۱۔ توقیر اکرام
۲۔ تنویر اکرام
۳۔ زبیر ارشاد
۴۔ ضیا حیدر
۵۔ مظفر علی بیگ
۶۔ تبسم زیدی
۷۔ نشاط پروین
۸۔ اعجاز حسین زیدی

پمفلٹ لکھنا

۹۔ جہاں آرا
۱۰۔ انتخاب عالم
۱۱۔ شاہدہ خاتون
۱۲۔ امتیاز احمد
۱۳۔ فرزانہ خاتون
۱۴۔ سرفراز احمد
۱۵۔ معین الحق
۱۶۔ جاوید نثار
۱۷۔ صوفیہ خاتون

ترتیب۔ سجاوٹ اور آرائش

۱۸۔ نکہت پروین
۱۹۔ عرفان احمد صدیقی
۲۰۔ ادریس احمد
۲۱۔ ضیاء الرحمٰن شمسی
۲۲۔ محمد تقی
۲۳۔ سعید خان

ڈیوٹی Duties

۲۴۔ شرافت احمد
۲۵۔ عادل نذیر زبیری
۲۵۔ شہزاد احمد خان
۲۶۔ محمد [illegible]

۲۸۔ عبدالعلیم
۲۹۔ محمد عثمان
۳۰۔ عفی معظم
۳۱۔ کلیم الدین
۳۲۔ سمیرہ حیدر
۳۳۔ محمد سلیمان اختر
۳۴۔ احمد ایوب
۳۵۔ عابدہ بیگم
۳۶۔ شرف الدین
۳۷۔ انور حسین خاں

سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا Transportation

۳۸۔ مرتضیٰ علی گوہر
۳۹۔ عبدالرحیم
۴۰۔ محمد گلزار
۴۱۔ صابر علی
۴۲۔ محمد کامل

چیف رپورٹر۔ شاہدہ خاتون درجہ ہشتم

بچوں کا اخبار

جامعہ مڈل اسکول میں بچے اپنا ایک اخبار بھی نکالتے ہیں جس کا نام "بچوں کا اخبار" ہے یہ قلمی اخبار ہے جو دو بڑے بڑے بورڈوں پر لگایا جاتا ہے۔ بچوں کے مضامین انھیں کے قلم سے خوشخط لکھوائے جاتے ہیں۔ یہ اخبار یوں تو کئی شمارے نکالتا ہے مگر اس اخبار کے کچھ خاص نمبر بھی نکالے جاتے ہیں۔

اس اخبار کا خاص تعلیمی پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعے بچوں میں مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ انھیں کوئی موضوع دے دیا جاتا ہے۔ بچے ان پر اساتذہ کی نگرانی میں مضامین لکھتے ہیں۔ پھر ان مضامین کی اصلاح کی جاتی ہے۔ چنے ہوئے مضامین خوشخط لکھوائے جاتے ہیں اور بورڈ پر آویزاں کیے جاتے ہیں۔

جن بچوں کے مضمون شائع ہوتے ہیں۔ ان میں نئے نئے مضمون لکھنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور جن بچوں کے مضامین نہیں شائع ہوتے۔ ان میں دوسرے بچوں کے مضامین پڑھ کر بہتر طریقے سے لکھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ اس اخبار میں بچوں سے متعلق روزانہ کی خبریں، اچھی باتیں، اور جنرل نالج پر مضامین بھی لگائے جاتے ہیں تاکہ بچے اچھی باتیں سیکھ سکیں، ان کی جنرل نالج میں اضافہ ہو۔ اور اپنے آس پاس ہونے والے واقعات سے باخبر رہ سکیں۔

یہ سارا کام "بچوں کی حکومت" کی نگرانی میں ہوتا ہے اور وزیر اطلاعات کی "یہ خاص" ذمے داری ہوتی ہے۔

اس سال میلے کے موقع پر بچوں کی ایک [illegible] "پارلیمنٹ کا اجلاس" ہونے والا تھا۔ [illegible] موقع پر بچوں کے اخبار کا ایک خاص نمبر [illegible] جائے۔ تاکہ بچوں کو کچھ پارلیمنٹ کے اجلاس [illegible] اس اخبار کے ذریعے پارلیمنٹ کے بارے میں [illegible] ہو جائے۔

اس کے لیے پارلیمنٹ ہاؤس سے مختلف [illegible] منگائے گئے اور ان کی بنیاد پر بچوں سے مضامین لکھوائے [illegible] جب سب مضامین وزیر اطلاعات شائستہ [illegible] تو ان سب کو پڑھا گیا اور مناسب اصلاح کی گئی [illegible] مضامین کو اخبار میں شامل کیا گیا۔ یہ [illegible] سیشن کے اجلاس (یعنی اسکول کے صدر [illegible]) لگایا گیا۔ میلے میں آنے والے بچوں اور بڑوں نے [illegible] دیکھا اور بہت ذوق و شوق اور دلچسپی کے ساتھ [illegible] پسند کیا۔ تعلیمی میلے کے تین دن کی نمائش میں اس اخبار کو دیکھنے اور پڑھنے کے لیے لوگ جوق در جوق آتے رہے۔

اس اخبار میں پارلیمنٹ کے بارے میں [illegible] معلومات آسان اردو زبان میں ایک جگہ [illegible] موقع کی مناسبت سے کچھ تصویریں بھی [illegible] جن کی وجہ سے یہ اخبار کچھ اور پرکشش ہو گیا تھا۔ [illegible] اخبار کے کچھ خاص عنوانات اس طرح تھے۔

۱۔ پارلیمنٹ کی عمارت کیسی ہے۔
۲۔ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں ممبروں کی تعداد کتنی [illegible]۔
۳۔ ان ممبروں کا انتخاب کس طرح ہوتا ہے۔
۴۔ سال بھر میں پارلیمنٹ کے کتنے [illegible] اور کیا کہلاتے ہیں۔
۵۔ پارلیمنٹ کی روزانہ کارروائی کس طرح چلتی ہے۔
۶۔ صدر اور نائب صدر کا انتخاب کیسے ہوتا ہے۔
۷۔ وزیر اعظم کس طرح چنا جاتا ہے۔

کو سجایا گیا اور ایک وقت میں تقریباً ۲۵ طلبہ نے فروخت کا کام انجام دیا۔ مینو میں چھولے بھٹورے۔ گرم گرم جلیبی۔ میرٹھ کی ریوڑھیاں فروٹ چاٹ۔ کباب۔ آلو کی ٹکیہ۔ اچھے قسم کے بسکٹ۔ ٹافیاں تازے پھل اور بہت ساری دوسری چیزیں بہت صفائی ستھرائی کے ساتھ لگائی گئی تھیں۔

میلے کے دوران بچوں کے خوانچہ پر بڑی بھیڑ رہی۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی لوگوں نے بہت ہمت افزائی کی اور خاص طور سے اس بات کی بہت تعریف کی گئی کہ سارے کام نہایت صاف ستھرائی کے ساتھ ننھے منے بچے کر رہے تھے۔

بچوں نے رات دن انتھک محنت کر کے ۳ دن میں ۴ ہزار کی شاندار بزنس کی۔ کیش کو کنٹرول کرنے کے لیے ٹوکن سسٹم رکھا۔ جو بہت کامیاب رہا۔ اور بہت سراہا گیا۔

اس خوانچہ میں جن بچوں نے دن رات کام کیا ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ ثمر فراز احمد
۲۔ نصرت عرفان
۳۔ رضا زیدی
۴۔ انعام خورشید
۵۔ نجیب اختر
۶۔ احسن رشید
۷۔ فخر عالم
۸۔ محمد اسمٰعیل
۹۔ ذکی وقار احمد
۱۰۔ محسن الدین
۱۱۔ محمد کوثر
۱۲۔ عادل احمد
۱۳۔ سعدری بیگم

انچارج خوانچہ:۔ حبیب الرحمٰن ہفتم الف

بچوں کا چڑیا گھر

ننھے منے بچوں کی دلچسپی جانوروں اور پرندوں میں بہت ہوتی ہے وہ انھیں دانہ کھلا کے۔ انھیں گود میں لے کر ان کے ساتھ کھیل کر بہت خوش ہوتے ہیں بچوں کی اسی دلچسپی اور شوق کو مدنظر رکھ کر جامعہ مڈل اسکول میں ایک چھوٹا سا چڑیا گھر قائم کیا گیا ہے جس کا ایک تعلیمی پہلو بھی ہے کہ انھیں جانوروں اور پرندوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے بچے مختلف پرندوں کے بارے میں بہت ساری معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔ مثلاً کون سی چڑیا کی چونچ کیسی ہوتی ہے۔ پنجے کیسے ہوتے ہیں۔ کون سے پرندے پانی میں تیرتے ہیں۔ کون سے جانور گھاس کھاتے ہیں۔ کون سے جانور گوشت کھاتے ہیں۔ پھر گھاس کھانے والے اور گوشت کھانے والے جانوروں کے دانتوں میں کیا فرق ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ

یوں تو یہ چڑیا گھر اول اور دوم جماعت کے بچوں کے لیے سال بھر ہی تفریح کا ذریعہ بنا رہتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ اس سے مختلف باتیں بھی سیکھتے جاتے ہیں مگر اس سال تعلیمی میلے کے موقع پر ہمارا یہ چڑیا گھر ننھے منے بچوں کی دلچسپی کا مرکز بن گیا۔ مائیں کوئی اور پروگرام دیکھنا چاہتی ہیں لیکن بچے ہیں کہ چڑیا گھر سے آگے کھسک ہی نہیں رہے ہیں۔ مستقل بھیڑ لگی ہوئی ہے حد تو یہ ہے کہ خرگوش اور چوہے اس بھیڑ سے گھبرا کر اندر اپنے بلوں اور بھٹ میں گھسے بیٹھے ہیں مگر بچے انتظار میں کھڑے ہیں کہ کبھی تو اپنے بھٹ سے باہر آئیں گے۔

ہمارے چڑیا گھر میں اس وقت خرگوش۔ ولایتی چوہے کبوتر۔ بطخ۔ چینیا بطخ۔ توتے اور ایک عجیب سا جانور لق لق ہیں۔ آئیے ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ یہ سب جانور کیا کیا چیزیں کھاتے ہیں۔

۱۔ خرگوش۔ بھیگا ہوا چنا۔ سبزیاں۔ گاجر۔ روٹی
۲۔ کبوتر۔ باجرہ
۳۔ بطخ۔ بھیگی ہوئی روٹی۔ پکا ہوا چاول
۴۔ چینی مرغی۔ گیہوں چاول کی کنک۔ باجرہ
۵۔ توتے۔ امرود۔ ہری مرچ۔ کیلا۔ بھیگی ہوئی چنے کی دال۔
۶۔ ولایتی چوہے۔ بھیگا ہوا چنا۔ روٹی۔ پھل۔ خصوصاً سیب
۷۔ لق لق۔ گیہوں۔ روٹی۔ چاول۔

جانوروں کے لیے غذا فراہم کرنے میں مطبخ کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے اور ہاں ایک دلچسپ بات آپ کو اور بتاتے چلیں کہ جب ہمارے خرگوش نے بچے دیے تو ہمارے ننھے منے ساتھیوں نے اپنے سیب جو انھیں کھانا کھانے کے بعد ملتے تھے۔ لا لا کر ان بچوں کو کھلا دیے۔

یوں تو یہ مستقل پروجیکٹ اول اور دوم جماعت کا ہے

[illegible] جن ساتھیوں نے نہایت [illegible] کے ساتھ [illegible] کے نام اس طرح ہیں۔

۹۔ محمد مسلم
۹۔ [illegible]
۱۰۔ [illegible]
۱۱۔ محمد وسیم
۲۔ [illegible] بانو
۳۔ [illegible] بیگم
۴۔ سائرہ بانو
[illegible]

[illegible] گار میلہ

[illegible]

[illegible]

مدد گار بینک

ایک تعارف

مدرسہ ابتدائی میں "بچوں کی دکان" "بچوں کا بینک" "بچوں کا خوانچہ" "بچوں کا کینٹین"، یہ سب دلچسپ مشغلے طلبہ کی عملی تعلیم و تربیت کا بہترین ذریعہ ہیں۔ بچوں کی حکومت نے ایک نئے مشغلہ "مددگار بینک" کا اور اضافہ کیا ہے۔

مددگار بینک ضرورت مند طلبہ کو کتابیں، اسٹیشنری اور لباس فراہم کرتا ہے۔

پچھلے سال ماہ مئی میں رخصت ہونے والے ہمارے آٹھویں کے طلبہ نے اپنی کتابیں، اپنے لباس "مددگار بینک" میں جمع کیے ایک دو صاحب خیر حضرات نے نقد روپیہ بھی دیا۔ جس سے امسال ماہ جولائی میں متعدد طلبہ کو مدد دی گئی۔

توقع ہے کہ اس مددگار بینک کے قیام سے بچوں میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگا اور وہ اپنی غیر ضروری چیزوں کو ضائع نہ کر کے اس سے دوسروں کی مدد کرنا سیکھیں گے۔

••• اظہر آصف •••

سابق وزیر مالیات

امتیاز احمد انصاری چیف جسٹس بچوں کی حکومت متعلم ہشتم

"غیر مقیم ساتھی چھٹی ہونے کے بعد اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ وہ اگر گھر دیر سے پہنچیں تو ان کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ ماں، باپ بھائی، بہن، سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ گھر پر ان کا انتظار ہوتا رہتا ہے۔"

"لیکن ہم مقیم ساتھیوں کا معاملہ بالکل دوسرا ہے بظاہر ہے انتظار کرنے والا کوئی نہیں۔ ہمارے لیے بے چین ہونے والا کوئی نہیں۔ شاید ہماری ضرورت کسی کو نہیں ہے۔ اس لیے ہم ماں باپ اور بھائی بہنوں کے پیار و محبت سے جدا کرکے ایک الگ دنیا میں بھیج دیے گئے ہیں۔"

میرے یہ تاثرات اس وقت کے تھے جب میں نے پہلی بار ہوسٹل کی زندگی میں قدم رکھا۔ یہاں میں نے اپنے آپ کو بالکل اجنبی سمجھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ہوسٹل کی مختلف مصروفیات اور رنگارنگ پروگراموں نے میری زندگی کے دھارے کو ایک ایسی سمت میں موڑ دیا، جہاں میں نے اتالیق کی ڈانٹ ڈپٹ میں اپنے ماں باپ کے پیار کو محسوس کیا۔ ان کی تنبیہہ میں اپنائیت کا ایک خاص قسم کے لگاؤ کا جذبہ پایا۔ ہم سب ساتھیوں نے محسوس کیا کہ ایک شخص ہمارے درمیان ایسا بھی ہے۔ جو ہر وقت ہمارے لیے فکر مند رہتا ہے۔ ہمیں ہر ممکن آرام پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اور ہماری ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتا ہے۔ گھر پر بہت کم ایسا ہوا ہے کہ ہمیں ہمارے جسم اور کپڑوں کی صفائی، بالوں کی تراش خراش یا جوتوں کی پالش کی طرف توجہ دلائی گئی ہو۔ ہمیں صاف ستھرے کپڑے پہننے کا شعور اور گفتگو کا سلیقہ سکھاتا ہو۔ یہاں یہ روزانہ کا سبق ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ "صفائی" اب سبھی ساتھیوں کی عادت بن چکی ہے۔ سلیقہ اور تہذیب سبھی ساتھیوں کی زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔

ہماری ہر بھول، لغزش اور غلطی پر وہ بار بار ٹوکتے ہیں۔ کبھی خفگی کے انداز میں اور کبھی پیار کے انداز میں۔ غرضیکہ اتالیق (اخلاق قاسمی صاحب) ہوسٹل میں بھی اپنے ماں باپ کا سچا پیار، بے لوث محبت اور شفقت دیتے ہیں۔ اس طرح وہ ان کا نعم البدل بن جاتے ہیں۔

ہم سب ساتھی جو مختلف شہروں اور الگ الگ علاقوں سے آتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ اس انداز سے رہتے ہیں جیسے ہم حقیقی بھائی ہیں۔ ہر ساتھی ایک دوسرے کا خیال رکھتا ہے ایک کی تکلیف ہم سب کی تکلیف بن جاتی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے اور نہ جدا رہ سکتے ہیں۔ گھر پر ہمارے بھائیوں کی تعداد دو، تین تھی۔ لیکن یہاں ہم چالیس ساتھی گویا چالیس بھائی ہیں جو ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں، پڑھتے لکھتے ہیں اور کھیلتے کودتے ہیں۔ کسی بھائی کی طبیعت خراب ہو تو دوسرا اس کی مدد کے لیے ہر وقت اور ہر طرح تیار رہتا ہے۔ اگر اتفاق سے ہمارا کوئی بھائی مالی اعتبار سے پریشان ہو تو تمام ساتھی اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور مدد کرنے کے بعد ایک خاص قسم کی خوشی محسوس کرتے ہیں۔

لہٰذا ہوسٹل میں آنے کے بعد ہمارے اندر ایک دوسرے کی محبت، خدمت اور مدد کرنے کا جذبہ پیدا ہوا ہے۔ ہوسٹل کے ملازم علاء الحق بھائی اپنے آرام کو قربان کر کے ہمیں آرام پہنچانے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ہمیں دوسروں کی خدمت کرنے کا سبق بھی دیتے ہیں۔ عبدالحمید صاحب (ملازم) اپنے بڑھاپے کے باوجود ہماری ہر خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ ڈائننگ ہال میں شبراتی صاحب، ذی شان بھائی، احسان بھائی اور انعام بھائی بڑے پیار سے کھانا کھلاتے ہیں۔ ان سب لوگوں کی خدمات۔ اچھے سلوک اور خلوص کی وجہ سے ہوسٹل کی زندگی ہمارے لیے گھر جیسی بن گئی ہے۔ ہم نے ہوسٹل میں آکر نظم و ضبط سیکھا ہے۔ تہذیب و شرافت، محبت، ہمدردی اور خدمت خلق کے جذبے کو اپنایا ہے۔ خدا کرے جامعہ کی یہ اچھی قدریں ہم سب ساتھیوں میں قائم رہیں (آمین)

مسعود احمد، درجہ ہشتم۔ جامعہ مڈل اسکول

جامعہ مڈل اسکول کے ممتاز طلبہ

جامعہ مڈل اسکول میں ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ بچوں میں [illegible] یری اور تقریری صلاحیت پیدا ہو۔ ان صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے اکثر و بیشتر خود اپنے اسکول میں بحث و مباحثے کرائے جاتے ہیں مختلف عنوانات دے کر بچوں کے خیالات کو بنایا اور سنوارا جاتا [illegible] سال کے دوران دلی کے اسکولوں کو بھی اپنے اسکول میں دعوت [illegible] جاتی ہے۔ [illegible] بھی ہوتا ہے کہ باہر کے اسکولوں کی دعوت پر ہم اپنے اسکول سے [illegible] باہر بھیجتے ہیں۔ سال ۱۹۸۱ء کے دوران [illegible] سکنڈری اسکول فتح پوری اور مدرسہ [illegible] کے مقابلوں کے دعوت نامے آئے [illegible] مقابلوں میں ہمارے اسکول کی نمائندگی مندرجہ [illegible] طلبہ و طالبات نے کی

[illegible] سکنڈری اسکول میں قرأت، تحریری اور [illegible] مقابلوں میں [illegible] منظر آصف انصاری اور [illegible] تحریری مقابلے میں محمد اکبر خاں متعلم درجہ [illegible] حاصل کیا جب کہ شائستہ بیگم طالبہ درجہ ہفتم [illegible] مقابلے میں اول انعام حاصل کیا۔

[illegible] موقع پر ہمارے اسکول سے جامعہ [illegible] تقریری مقابلے میں سعید احمد اور ریاض الدین [illegible] تقریری مقابلہ میں انعام حاصل کیا۔

[illegible] بچوں کی حوصلہ افزائی کی غرض [illegible] مضامین میں سب سے زیادہ نمبر [illegible] جاتے ہیں۔ گذشتہ تعلیمی [illegible] نے اسکول بھر میں پوزیشن [illegible] میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے

[illegible] گروپ میں پورے اسکول میں پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ

نام	درجہ	پوزیشن
[illegible] الدین	درجہ چہارم	اول
۲۔ صوفیہ خاتون	پنجم	دوم
۳۔ تنویر اکرام	چہارم	سوم

دوسرے گروپ میں پورے اسکول میں پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ

نام	درجہ	پوزیشن
۱۔ شاہدہ خاتون	ششم	اول
۲۔ شائستہ بیگم	ششم	دوم
۳۔ فرزانہ خاتون	ششم	سوم

پہلے گروپ میں مضامین سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے طلبہ

نام طالب علم۔ جماعت۔	مضمون۔	پوزیشن	سیشن
۱۔ جاوید احمد ۔ اول	ریاضی	اول	۸۰-۷۹ء
۲۔ ذوالفقار علی ۔ دوم	اردو	اوّل	
۳۔ ریحانہ اسد ۔ سوم	سماجی علوم	اول	
۴۔ سید ضیاء حیدر ۔ پنجم	عام سائنس	اول	
۵۔ سرفراز احمد ۔ پنجم	انگریزی	اول	
۶۔ ریاض الدین ۔ پنجم	ہندی	اول	
۷۔ صوفیہ خاتون ۔ پنجم	اسلامیات	اوّل	
۸۔ صوفیہ خاتون ۔ پنجم	انگریزی	اول	

پہلے گروپ میں پورے اسکول میں پوزیشن حاصل کرنے والے طلبا

نام	درجہ	پوزیشن
۱۔ ریاض الدین	درجہ چہارم	اول
۲۔ صوفیہ خاتون	پنجم	دوم
۳۔ تنویر اکرام	چہارم	سوم

دوسرے گروپ میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے طلبہ

نام	درجہ	مضمون
۱۔ شاہدہ خاتون	ششم	اردو
۲۔ مسعود احمد	ششم	اسلامیات
۳۔ شاہدہ خاتون	ششم	ریاضی
۴۔ شاہدہ خاتون	ششم	ہندی
۵۔ شاہدہ خاتون	ششم	عام سائنس
۶۔ شاہدہ خاتون	ششم	سماجی علوم
۷۔ محمد اکبر خاں	ہفتم	انگریزی
۸۔ منظر آصف	ہفتم	انگریزی

باغبانی پروجیکٹ بہت ہی دلچسپ ہے۔ ہم سبھی دھرتی کے بچے ہیں۔ اور ہم اس سے سبزیاں اور پھل وغیرہ اگانا سیکھتے ہیں۔ ہندستان کھیتی باڑی کا ملک ہے۔ اس لیے ہر بچے کو کھیتی باڑی کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور سیکھنا چاہیے۔ تاکہ ہم اپنی بنیادی خصوصیت کو کبھی فراموش نہ کرسکیں۔

● انور جمال قدوائی
شیخ الجامعہ۔ ۲۹ر اکتوبر ۸۱ء

میں نے ساری نمایش دیکھی اور جانوروں کے ڈھانچوں کو خاص طور پر بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ اساتذہ نے اس خوبی سے بچوں کی رہنمائی کی ہے کہ میرے لیے فی الحال تعریفی کلمات کے علاوہ کچھ کہنا مشکل ہے۔ شاید بہت غور وفکر کے بعد میں کوئی مشورہ دے سکوں۔

● ارشاد احمد وائس پرنسپل
فیض عام کالج۔ میرٹھ

وزیر تعلیم صوفیہ خاتون صاحبہ مذاہب سے متعلق پروجیکٹ (منزل ایک راہیں الگ الگ) کی تیاری کے لیے مبارک باد کی مستحق ہیں۔ یہ پروجیکٹ جامعہ کی روایات کے عین مطابق ہے جہاں تعلیم تمام مذہبوں اور انسانی برادری کی بنیادی ایکتا کا سبق دیتی ہے۔

● انور جمال قدوائی
شیخ الجامعہ۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۸۱ء

وزیر تعلیم صوفیہ خاتون کو تعلیمی نمایش کے لیے مبارک

● منوج رگھوونشی
پریس رپورٹر نیشنل ہیرالڈ

تعلیمی نمایش سے بچوں کی محنت اور دلچسپی کا اندازہ ہے۔ ننھے والنٹیر بہت ہی باتمیز اور خوش اخلاق ہیں۔

● ایس خاں
۳۰ر اکتوبر ۸۱ء۔ کریسنٹ اسکول

میں نے مدرسہ جامعہ کی یہ نمایش از اول تا آخر د
مجھے اس بات سے تو خوشی ہوئی کہ اس طرح کی نمایش کے کام کو نہایت خوبی اور ترتیب سے رکھا گیا ہے جس سے
جامعہ کی ایک جھلک نظر آجاتی ہے۔

لیکن اس سے زیادہ خوشی اس بات سے ہوئی کہ
کا سلسلہ ٹوٹ نہیں جاتا ہے۔ بلکہ آگے بھی جاری ہے۔ یعنی اس کمرے میں دو عدد وہ پروجیکٹ رکھے ہوئے ہیں۔ جو
میں بچوں نے چلائے ہیں۔ مثلاً باغبانی پروجیکٹ نہرو پر
وغیرہ۔

اس میں بچوں کے وہ سب کام نہایت خوش خط
اور چارٹ کی شکل میں محفوظ کر لیے گئے ہیں۔

امید ہے کہ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ جامعہ
اسلامیہ مثل اس دریا کے ہے جس میں وقتاً فوقتاً نئی
لہریں اٹھتی رہتی ہیں۔ اور یہ دریا کبھی ساکت اور خام
نہیں ہوا ہے۔

اللّٰھم زِد فَزِد

● سعید انصاری
جامعہ کے حیاتی رکن اور رکن مجلس

گیارہ سال بعد میلے نے جامعہ میں زندگی کی لہر پیدا
برسوں کے جمود اور تعطل کو ختم کیا۔ یہ تعلیمی میلہ بہت اچھا
بچوں نے بہت کچھ سیکھا۔ جامعہ کے دوسرے اداروں میں

شوق پیدا ہوا۔ سوشیولوجی ڈیپارٹمنٹ نے بہت سرگرمی دکھائی اور تعلیمی و ثقافتی پروگرام پیش کیے۔ انجینئرنگ کے بچوں [illegible]

● مرزا جلال الدین
پرنسپل۔ [illegible]

جامعہ مڈل اسکول اور ہائر سیکنڈری اسکول کے بچوں نے تعلیمی میلے کا سلسلہ ایک بار پھر شروع کیا ہے۔ بچوں نے اپنے اساتذہ کی مدد سے جو نمائش لگائی تھی۔ [illegible] پروجیکٹ کا [illegible] سائنس کے [illegible] ماڈل [illegible] کرافٹ کی نمائش خاص [illegible]

[illegible]

● [illegible]
[illegible] جامعہ ملیہ اسلامیہ

[illegible]

●
[illegible]

[illegible]

●
[illegible]

میلہ دیکھا۔ بہت سے پروجیکٹ ہیں جو نہایت عمدہ طریقے سے تیار کیے ہیں۔ نہرو پروجیکٹ میں جو فائل تیار کی گئی ہے اس پر بہت محنت کی گئی ہے۔ سبھی پروجیکٹ پر بچوں نے بہت محنت کی ہے۔

● ایس انجم۔ ملت گرلز پبلک اسکول
جامعہ نگر۔ اوکھلا

دنیا کا عظیم ادارہ جامعہ مڈل اسکول۔ ماضی میں بھی حال میں بھی اور انشاء اللہ مستقبل میں بھی۔

● رشید الوحیدی
لکچرر۔ جامعہ کالج

جامعہ کے تعلیمی میلے کا دوبارہ شروع ہونا ایک فال نیک ہے اور مختلف پروگراموں نے نہ صرف بچوں کے اندر ایک نیا جوش و خروش پیدا کیا ہے بلکہ قرب و جوار اور جامعہ سے واقفیت رکھنے والوں کے اندر بھی ایک خاص قسم کی دلچسپی پیدا کر دی ہے۔

متعدد تعلیمی سرگرمیوں میں تعلیمی پروجیکٹ، سائنس میوزیم اور کرافٹ کے شعبوں کی طرف لوگوں کی توجہ زیادہ رہی۔ پروجیکٹوں کی تیاری میں اساتذہ کی رہنمائی اور طلبہ کی نمائندگی کا پتہ چلتا تھا لیکن پرانے چارٹ اور تصویریں نہ صرف تماشائیوں اور ملاقات کرنے والوں کی توجہ کا مرکز تھے بلکہ نئی چیزوں کا منہ چڑا رہے تھے۔ "جامعہ ایک نظر میں" اچھی نمائش تھی۔ کرافٹ کا کام بھی نمایاں تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس میدان میں تھوڑی محنت اور لگن بچوں کو بنیادی طور پر دست کاری کے اندر اچھا تجربہ فراہم کر سکتی ہے۔

کلچرل پروگرام میں غزل خوانی کا مقابلہ دلچسپ اور لوگوں کی کشش کا باعث تھا اور خود جامعہ کے طلبہ نے بھی اس شوق میں اچھی اور معیاری غزل خوانی کا مظاہرہ کر کے طلبہ کے اندر ادبی ذوق اور شعر و شاعری کا جذبہ جگایا ہے۔

بچوں کی پارلیمنٹ بدنظمی اور غالباً جگہ کی کمی کا شکار تھی۔ والنٹیرس اور اساتذہ کی بے بسی کی وجہ سے بیشتر مہمانوں

کو جگہ ملنا تو در کنار کھڑے ہو کر بھی سیشن دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ یہ خیال رکھا جانا چاہیے کہ جتنی گنجایش ہو اتنے ہی مہمان بلائے جائیں، صرف اہم شخصیات ہی اعزاز اور مہمان نوازی کا مرکز نہ بنیں۔

بچوں کا بازار کامیاب ترین پروگرام تھا۔ اگر خسارہ نہ ہوا ہو تو اس کی سرگرمی بچوں کے اندر تجارت اور کاروبار کا بہترین رجحان پیدا کرے گی۔

● شعیب اعظمی۔ لکچر فارسی
جامعہ ملیہ اسلامیہ

گیارہ سال بعد بچوں کی حکومت نے میلا کرنے کا فیصلہ کیا اور وسائل کی کمی کے باوجود اپنے فیصلے پر عمل کر کے دکھایا۔ اس حوصلے کے لیے جامعہ مڈل اسکول کے بچے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ میلا اچھا تھا۔ میلے کے پروگرام دلچسپ تھے لیکن چند باتوں کی طرف ہم سب کو توجہ کرنی چاہیے تاکہ آئندہ سال کوئی کمی محسوس نہ ہو۔

سب سے پہلی بات وقت کی پابندی سے متعلق ہے۔ اس سال میلے کے پروگرام تاخیر سے شروع ہوئے۔

کافی دن ہوئے جب ذاکر صاحب شیخ الجامعہ تھے۔ مدرسہ ابتدائی (موجودہ جامعہ مڈل اسکول) میں ایک جلسہ تھا۔ ذاکر صاحب اس جلسے میں شریک ہونے والے تھے۔ کسی وجہ سے ذاکر صاحب وقت پر تشریف نہیں لا سکے۔ مگر غفار مدھولی صاحب، (جو وقت کے بے حد پابند تھے۔) نے ٹھیک وقت پر جلسہ شروع کرا دیا۔ اس موقع پر ذاکر صاحب نے اپنی تقریر میں کہا۔

"بدقسمتی سے میں وقت پر نہیں پہنچ سکا۔ بچوں نے مجھے آج وہ سبق دیا ہے۔ جو میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ اور اب کبھی (کسی پروگرام میں) دیر سے نہیں پہنچوں گا۔"

دوسری بات نشست کے بارے میں ہے۔ پروگراموں میں نشست کا انتظام ٹھیک نہیں تھا۔ جگہ کی کمی تھی۔ ایسی صورت میں جامعہ کے بچوں کو مہمانوں کے لیے جگہ خالی کر دینی چاہیے تھی۔ جامعہ کی یہی روایت رہی ہے۔

تعلیمی نمایش بہت اچھی تھی۔ لیکن اس میں لوگوں کا مجمع بہت ہو جاتا تھا۔ اب اگر نمایش لگائی جائے تو انتظام اس طرح ہونا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ تین یا چار لوگ ایک ساتھ گزر سکیں۔ مجمع بھیڑ کی شکل نہ اختیار کرلے۔

● مجتبیٰ حسین زیدی
جامعہ کے حیاتی رکن اور رکن مجلس منتظمہ

آج اپنے پرانے ساتھیوں کے نام اور ان کے کام دیکھنے کا سنہری موقع ملا۔ میں اپنی خوشی کا اظہار الفاظ میں نہیں کر سکتا۔ اگر اس طرح کی نمایشیں جامعہ میں ہوتی رہیں تو بہت اچھا ہے۔ قابلِ مبارک باد ہیں۔ وہ اساتذہ جنھوں نے اتنے پرانے کام (ماضی کی جھلک) کو سنبھال کر رکھا۔

● پرویز علی خاں
مظہر الاسلام ہائر سیکنڈری اسکول
۳۰ر اکتوبر ۱۹۸۱ء

مدرسہ ابتدائی (موجودہ جامعہ مڈل اسکول) کے چند پرانے طلبہ کے تاثرات:-

ننھے منے بچوں کی نمایش دیکھ کر اپنا بچپن یاد آیا۔

● اظہر حسن تقی۔

بچوں کی نمایش دیکھی۔ بہت پسند آئی اور پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ کاش یہ قدیم روایت جس کو آپ سب نے دوبارہ زندہ کیا ہے قائم رہے۔

● شامہ بلال

ماضی کی جھلک دیکھ کر پرانا زمانہ یاد آگیا۔ واقعی بہت اچھی اور کامیاب کوشش ہے۔ خدا ترقی دے (آمین)

● صفیہ صبوحی۔

بچوں کی محنت واقعی قابلِ تعریف ہے ماضی وحال کی یکساں ڈگر جس پر جامعہ کے بچے گامزن رہے اور ہیں۔ بالکل نمایاں ہے۔ مستقبل کا خدا حافظ ہے

● محمد فیضان بیگ

میں درجہ ششم میں پڑھتا ہوں۔ اس سال جب مدرسہ کھلا تو شروع ہی سے مدرسہ میں جامعہ کے تعلیمی میلے کے بارے میں سُنا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ جس طرح عید، بقرعید، دیوالی، دسہرہ کا میلا لگتا ہے اسی طرح یہ میلا بھی کسی طرح کم نہ ہوگا میں نے اپنے گھر آکر ممی پاپا سے ذکر کیا تو انھوں نے بتایا کہ اب سے دس سال پہلے جامعہ میں ہر سال ایک تعلیمی میلا ہوا کرتا تھا لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے یہ میلا بند کر دیا گیا تھا اس کو بچوں کی عید بھی کہتے تھے۔

کیونکہ میں نے اپنے اسکول کی زندگی میں پہلی بار یہ تعلیمی میلا کا چرچا سنا تھا اس لیے میلا کا انتظار شدت سے شروع ہوا۔ ترانے میں زور میلے سے متعلق اعلانات ہونے لگے۔ میلے کی تیاریوں کا زور و شور شروع ہوا اور ایک دن تو ہمارے نگراں صاحب نے اوّل سے ہشتم تک کے بچوں کو ذمّے داریاں سونپ دیں اور بچوں کی حکومت کے زیر اہتمام میلا کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

اسکول کی صفائی ستھرائی کے انتظامات وزیر آرائش نے شروع کیے اور دیکھتے ہی دیکھتے مدرسہ میں تعلیمی نمائش کے لیے مختلف چارٹس بنانے کا کام شروع ہوا۔ پروجیکٹس مثلاً نہرو پروجیکٹ، باغبانی پروجیکٹ کے پمفلٹ تیار ہونے شروع ہو گئے۔ مدرسہ میں ہر جانب ہمارے چھوٹے بڑے ساتھی مختلف پروگراموں میں مصروف ہو گئے۔ کوئی گروہ جامعہ کے ترانے کی تیاری میں مصروف ہے تو کہیں ایکشن سانگ اور مونو ایکٹنگ کی ریہرسل کا زور و شور تو کہیں ہمارے ننھے منے ساتھی تصاویر کے ذریعہ کہانی کہنے اور کہانی سنانے کے مقابلے کی تیاری میں سرگرداں دکھائی دیے تو کوئی ٹولی بیت بازی کے مقابلہ کی تیاری کر رہی ہے تو کہیں سے بچوں کی حکومت کے مسند نشینی کے جلسہ کی تیاری کی آوازیں کان میں گونج رہی ہیں۔ بچوں کے خوانچے میں خرید و فروخت کے کام کی مشق ہو رہی ہے اور دوسری طرف بچوں کے کتب خانے اور بچوں کے بنک کے حساب کتاب سامنے ہیں غرض رات دن مصروفیت میں گزرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ۲۹ ر اکتوبر آ گئی اور ہم نے بڑی مشکل سے اپنا سر اٹھایا تو دیکھا کہ ہمارے شیخ الجامعہ صاحب تشریف لا رہے ہیں اور N.C.C کے نوجوان ان کا استقبال کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے جامعہ کا پرچم لہرایا اور جامعہ کا ترانہ فضا میں گونجا اس کے بعد یومِ تاسیس کا جلسہ ہوا جس میں بڑے اچھے اچھے مضامین پڑھے گئے اور نظمیں سنائی گئیں۔ جلسہ کے بعد جناب شیخ الجامعہ صاحب نے میلے کا افتتاح کیا۔

لیجیے صاحب جامعہ کے تمام مقابلے شروع ہوئے۔ نہرو ٹرافی کا مقابلہ شروع ہوا۔ باہر سے آنے والے مہمان آئے اور دہلی کے مختلف اسکولوں کے علاوہ باہر کے اسکولوں نے بھی حصہ لیا۔ نظم سرائی کا مقابلہ، بیت بازی کے مقابلے، مونو ایکٹنگ، ایکشن سانگ۔ گروپ سانگ میں دِلّی کے اسکول مظہر الاسلام ہائر سیکنڈری اسکول، فتح پوری، دیو سماج، دلی پبلک اور دہلی سے باہر کے اسکول مثلاً آئی۔ ایم۔ انٹر کالج امروہہ، میرٹھ کے اسکولوں نے حصہ لیا اکثر انعامات جامعہ مڈل اسکول کو ملے۔ لیکن روایت کے مطابق یہ انعامات میزبانی کی وضع داری کو قائم رکھتے ہوئے باہر کے اداروں کو دیے گئے۔

ہمارے مہمانوں نے تعلیمی نمائش دیکھی اور ان پروگراموں کے ساتھ ساتھ جھولا جھولنے لگے تو کچھ مہمانوں نے بچوں کے خوانچہ سے خرید و فروخت شروع کر دی۔ کوئی چھولے کھا رہا ہے تو کوئی دہی بڑے کچھ پھلوں کے بھاؤ تاؤ میں مصروف ہیں اور ہمارے ننھے ساتھیوں سے مزے لے رہے ہیں اور پھر ان کی باتوں

میں محو ہو گئے غرض عجب عالم تھا جس کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔
یہ تعلیمی میلا ۱۳؍۱ کتوبر تک رہا۔ رات کو ایک تمثیلی مشاعرہ بھی ہوا جس میں ہمارے نگراں مدرسے کیفی اعظمی۔ اور جناب آفتاب احمد صدیقی صاحب نے دلاور فگار کے انداز میں کلام سنایا۔ میرے یہ تین دن زندگی کے بہترین دن تھے جو ہر اعتبار سے خاص اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ ان دنوں میں ہم نے اس میلے سے ہی کافی سیکھا جس کی فہرست دینا بڑی کٹھن ہے اگر صرف اتنا ہی کہہ دیا جائے تو کافی ہے کہ ہم نے بہت کچھ سیکھا اور ہمارا میلا بہترین تعلیمی میلا ہوا۔

● سیّد جمال حسین نقوی
جماعت ششم

ایک بچے کا تاثر امتحان کی کاپی سے

درجہ پنجم کے ششماہی امتحان کے اُردو کے پرچے میں ایک سوال دیا گیا تھا۔ "تعلیمی میلے پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے" اس سوال کے جواب میں ایک بچی کہکشاں شمسی جس کا رول نمبر ۲۶۹ تھا، نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

ہمارا تعلیمی میلا اچھا تو ہوا۔ لیکن اس پر پیسے بہت خرچ ہوئے۔ ہم سمجھتے تھے کہ اس میلے میں جو کھانے پینے کی چیزیں ملیں گی ان کے پیسے نہیں لیے جائیں گے۔ مگر پتا چلا کہ ہر چیز کے پیسے ہمیں ہی دینے ہیں۔ یہ میلا گیارہ سال پہلے کبھی ہوا کرتا تھا۔ پھر کسی وجہ سے ختم ہو گیا تھا۔ لیکن اب یہ پھر ہمارے نگراں جناب خالد سیف اللہ صاحب نے شروع کرایا۔ اللہ تعالیٰ ان کو سلامت رکھے (آمین)
اس میلے میں بچوں کی دلچسپی کے لیے جھولے اور خوانچہ بھی لگایا گیا تھا۔ ہم جھولوں پر خوب مزے سے جھولتے تھے۔ پروگرام دیکھتے تھے۔ خوب کھاتے پیتے تھے اور رات کے نو۔ دس بجے گھر جاتے تھے۔ اس میلے میں بہت اچھے پروگرام ہوئے اور انعامات حاصل کیے۔ ہم نے بھی ڈراموں میں حصّہ لینا چاہا۔ مگر ہمیں کسی استاد نے لیا ہی نہیں۔ پتا نہیں سب لوگ ہمیں کیا سمجھتے ہیں۔ ہم بچے تو ہیں مگر اب اتنے بڑے نہیں نہیں جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔ خیر انشاء اللہ تعالیٰ اگلے سال پھر کوشش کریں گے۔

● کہکشاں شمسی رول نمبر ۲۶۹
درجہ ۔ پنجم (ب)

● ● ● ● ● ● ●

میں اپنے لکھنے پڑھنے کے کام میں مصروف تھا کہ ایک دن کسی نے یہ خبر سنائی کہ جامعہ کی ایک اچھی روایت جو ایک عرصے سے سوئی ہوئی تھی، انگڑائیاں لے کر بیدار ہو رہی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ امسال جامعہ کے یوم تاسیس کے جشن کے موقع پر تعلیمی میلا بھی ہوگا۔ کیا بتاؤں کیسی خوشی محسوس ہوئی اس خبر پر، پھر تفصیلات معلوم ہوئیں، تو پتہ چلا کہ جامعہ مڈل اسکول کے نگراں جناب خالد سیف اللہ صاحب جو ایک "مردِ قلندر" ہیں، اُن کی ایک پھونے مردہ دِلوں میں جان ڈالی ہے۔
میں چپکے چپکے معلوم کرتا رہا کہ کیا کیا منصوبے ہیں، پھر دیکھا کہ اسکول کے استاد طلبہ اور طالبات بے حد مصروف نظر آر ہے ہیں، اور ہر طرف زندگی ہی زندگی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ شیخ الجامعہ انور جمال قدوائی صاحب اس میلے کی تیاری میں پوری طرح دلچسپی لے رہے ہیں اور درحقیقت یہ انھیں کی ہمت افزائی کا کرشمہ ہے، آخر کار، میلے کی تاریخیں آ گئیں اور ان آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اُس سے برسوں پہلے ہر سال منعقد ہونے والے بچوں کے میلے کی بہاریں نگاہوں میں پھر گئیں۔
میلے کی تیاری کے دوران بچے جو کچھ سیکھتے ہیں وہ تعلیم و تربیت کا وہ پہلو ہے جسے تعلیم کے ماہرین تعلیم کا جوہر کہتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارا یہ کھویا ہوا "جوہر" ہمیں واپس مل گیا ہے، دعا ہے کہ اس کی آب و تاب میں دن دونی رات چوگنی ترقی

ہوتی رہے۔ یوم تاسیس کا جلسہ، کہانیاں لکھنے اور سنانے
کے مقابلے، بیت بازی کا مقابلہ، بچوں کی حکومت کی مسند
نشینی اور پارلیمنٹ کے سیشن کی ایک جھلک، مصوری، تقریری
مقابلہ ــــ یہ سب پروگرام میں نے دیکھے اور بچوں کے کام
اور محنت سے متاثر ہوا، اندازہ ہوا کہ کیسی کیسی صلاحیت
کے بچے ہمارے اسکول میں ہیں، یہ صلاحیتیں چمک اٹھیں، تو
سمجھیے کہ تعلیم کا کام اور تربیت کا مقصد پورا ہوگیا۔

بچوں کے تعلیمی میلے کی امتیازی خصوصیت تعلیمی نمائش
ہے۔ امسال نمائش میں جو پروجیکٹ دیکھنے میں آئے، وہ
خاصے اچھے تھے، ان سے دیکھنے والوں کی معلومات میں یقیناً
اضافہ ہوا ہوگا۔ نئے پروجیکٹ بھی اچھے اور معلومات افزا تھے،
ان میں حسن بھی تھا، سلیقہ بھی تھا اور معنی بھی۔ ان سب
کاموں کو دیکھ کر محسوس ہوا کہ جامعہ کا ماڈل اسکول ایک بار
پھر اپنی اصل ڈگر پر آگیا ہے، لیکن اب دنیا بھی بہت آگے بڑھ
گئی ہے اور علم بھی ترقی کر گیا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ استاد
اور طالب علم سب، نئے جوش، نئے ولولے، شوق اور محنت کے
بھرے ہوئے جذبے، کھلے دل، کھلی آنکھوں، اور بیدار قلب و دماغ
کے ساتھ باہم مل کر، ایک دوسرے کی صلاحیتوں کا احترام اور اعتراف
کرتے ہوئے اور یہ شعر گنگناتے ہوئے کہ

سفر ہے دین یہاں، کفر ہے قیام یہاں
یہاں پہ راہروی خود حصولِ منزل ہے

اس ڈگر پر آگے بڑھیں اور بڑھتے رہیں کہ سفر ہی اس سفر
کی منزل ہے۔

ضیاء الحسن فاروقی۔ ڈائریکٹر۔ ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف
اسلامک اسٹڈیز۔ نئی دہلی ۲۵

●●●●●●●●●

تعلیم محض لکھنے پڑھنے کی صلاحیت کو حاصل
کر لینے کا نام نہیں ہے۔ تعلیم کا اصل مقصد ذہنِ انسانی
کی ایسی تربیت ہے جس کی بدولت فرد سماج میں
رہ کر اپنے ارد گرد کے افراد اور اپنی زندگی میں پیش
آنے والے حالات سے دوچار ہونے کی صلاحیت پیدا
کر سکے۔ قدرت نے احساسات کی جو قوت ہمیں عطا
کی ہے اور جس کی بدولت ہم چاروں طرف پھیلی ہوئی
دنیا کو دیکھ رہے ہیں، صالح خطوط پر ان کی تربیت
کی بدولت ہی ہم ان سے صحیح استفادہ کر سکتے
ہیں اور اپنی شخصیت کی تکمیل کر سکتے ہیں۔

تعلیم کے اس مفہوم کو موجودہ دور میں ملک
میں سب سے پہلے اکابرینِ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے
پہچانا اور اسی کے پیش نظر یہاں کا تعلیمی نصاب وضع
کیا گیا۔ تعلیم کے اس مفہوم کے تحت ابتدائی اور
ثانوی درجات کی تعلیم کا منصب اور انداز بڑی اہمیت
اختیار کر لیتا ہے۔ اسی لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنے
گذشتہ دور میں ابتدائی اور ثانوی سطح کی تعلیم
کے لیے ممتاز رہی ہے۔ یہاں سائنس کی کوئی
بڑی تحقیق نہیں ہوئی۔ فلسفہ کے کسی اصول یا مکتب
خیال نے جنم نہیں لیا۔ سماجی علوم کے کسی پہلو پر
یہاں پر کوئی ایسی تصنیف نہیں مرتب ہوئی جسے
اس موضوع پر سنگِ میل کی حیثیت سے پہچانا جا سکے
لیکن یہاں ایسے چراغ ضرور جلے ہیں جو روایتی بوڑھی
عورت کے سرِ راہ رکھے ہوئے دیے کی طرح اپنی
مدھم روشنی سے اپنے طالب علموں کو ایک ذمہ دار
شہری اور ایک دردمند انسان بننے کا راستہ
دکھاتے رہے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طریقۂ
تعلیم کی اسی ندرت نے اپنی جانب مہاتما گاندھی کی
توجہ کھینچنے میں بنیادی رول ادا کیا اور اس کا نتیجہ
مشہور زمانہ ذاکر حسین کمیٹی رپورٹ یا وردھا تعلیمی
طریقہ ہے یہاں تدریس کے کام کو کتابوں کے
ذریعے انجام دینے کے طریقہ تک محدود کرنے کے
بجائے عملی تجربہ پر زور اور کلاس روم کے بجائے
قدرت کی گود میں تعلیم کے تصور نے جنم لیا۔

تعلیمی میلے کا تصور بھی طریقۂ تعلیم کی اسی نئے پن

کا ایک منظر ہے۔ یہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو عملی
طور پر پیش کر کے طالب علموں کے اندر آئندہ زندگی
کے مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنے کا ایک
انوکھا ڈھنگ ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ چند اہم لیکن
بے لطف پہلوؤں کو قابل قبول بنانے کی غرض سے
تعلیمی میلے میں ادبی اور کلچرل پہلوؤں پر نسبتاً زیادہ
زور دینا پڑتا ہے۔

مجھے نہیں معلوم تعلیمی میلے کی روایت جامعہ
میں کب پڑی۔ کتب خانہ میں ماضی میں ہونے والے
تعلیمی میلے کے غیر فروخت شدہ ٹکٹوں کے بنڈل، سینے
پر سجائے جانے والے بلے اور تصاویر کی موجودگی
سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ میلا بڑے
اہتمام سے کیا جاتا تھا۔ اس سال جب میلا منعقد
کرنے کا اعلان کیا گیا تو بہت سے قدیم جامعی حضرات
کی زبانی بیتے ہوئے دنوں میں ہونے والے میلوں
کی شان دار روایت کا ذکر سننے میں آیا۔

یہ میری بدنصیبی تھی کہ میں میلے کے جملہ پروگراموں
کو نہ دیکھ سکا لیکن جن پروگراموں میں مجھے شریک
ہونے کا اتفاق ہوا ان میں سے تین نے مجھے بے حد
متاثر کیا "تمثیلی مشاعرہ، تمثیلی پارلیمنٹ اور تقریروں
کا مقابلہ"

بچوں کو ایک طالب علم کی حیثیت سے
شاعروں کا کلام پڑھنا ہی پڑتا ہے۔ انھیں اس کا
مفہوم بھی سمجھایا جاتا ہے لیکن کسی نظم یا غزل کو خود
اس کے خالق کی زبانی سننے کا لطف ہی کچھ اور ہے
شاعر کا لباس، اس کی چال ڈھال، نشست و برخاست
کا ڈھنگ اور پڑھنے کا انداز یہ تمام چیزیں سامعین
پر اپنا گہرا نقش چھوڑتی ہیں اور انھیں شاعر کے
کلام کے مفہوم کی نئی جہتوں سے آشنا کراتی ہیں۔
مثال کے طور پر بچوں کے لیے آزاد نظم کا پڑھنا اور
اور اس سے لطف اندوز ہونا غالباً آسان نہیں
ہے لیکن اسی آزاد نظم کو جب وہ کیفی اعظمی کی زبان سے
سنتے ہیں تو بھی اس سے کم و بیش اس طرح لطف اندوز ہوتے
ہیں جس طرح بڑی عمر کے لوگ۔ دلاور فگار جب اپنے
مزاحیہ کلام کو خود اپنی زبان سے سناتے ہیں تو اس کے
اندر روپوش ظرافت کی چاشنی تیز تر محسوس ہونے لگتی ہے۔
مشاعرے جس طرح کا تاثر اپنے سامعین پر چھوڑتے ہیں، اس لحاظ سے
یہ تمثیلی مشاعرہ ایک نہایت کامیاب کوشش تھی۔

پارلیمنٹ کے تمثیلی اجلاس کا بھی سامعین
پر گہرا اثر رہا۔ الیکشن کے بعد ممبرانِ پارلیمنٹ حلفِ
وفاداری اٹھاتے ہیں، وزرا سے پارلیمنٹ میں
کس طرح سوالات پوچھے جاتے ہیں اور سوالات کے
سہارے کس طرح پارلیمنٹ کے اندر ہنگامے کھڑے
کیے جاتے ہیں۔ یہ اور اسی طرح کی پارلیمنٹ کی
دوسری کارروائیوں کو اپنی نظروں سے دیکھنے
کے بعد نہ صرف یہ کہ کتاب میں دی ہوئی تفصیل کو
سمجھنا بچوں کے لیے آسان ہو گیا بلکہ ان کے ذہن پر
نقش کالحجر بن گیا۔

تقریروں کے مقابلے کے لیے جو موضوع منتخب
کیا گیا تھا اس کے پیش نظر مڈل اسکول کے بچوں
کے لیے اس میں شریک ہونا نہایت مشکل کام تھا
لیکن اساتذہ نے جس صبر اور جاں سوزی کے ساتھ
اس مشکل کام کے لیے اپنے طلبہ کو تیار کیا۔ اس سے
ان کی اپنے فرائض کو خوش اسلوبی اور لگن کے
ساتھ انجام دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنے
کے راز کا پتا چلتا ہے۔ تعلیمی میلے نے اپنے مختلف
پروگراموں کے ذریعہ نہ صرف طلبہ کے ذہن کی
تربیت کی بلکہ چند روز کے لیے اسکول کے احاطے
میں ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ جو بچوں کے اندر
ادبی ذوق، فنی صلاحیت، اور تحصیل علم کی آبیاری
کے لیے نہایت ضروری ہے۔ تقریباً ایک دہائی کے
وقفے کے بعد پہلی بار یہ میلا منعقد ہوا تھا۔ اگر آئندہ

برسوں میں اسے پابندی کے ساتھ منعقد کیا گیا تو یہ جامعہ کے اس طریقۂ تعلیم کو دوبارہ زندہ کرنے میں ضرور معاون ہوگا جس کی بدولت جامعہ پر اس صدی کے عظیم انسان مہاتما گاندھی کی نظر انتخاب پڑی تھی۔

شہاب الدین انصاری

ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری۔ نئی دہلی ۲۵

آزاد رسول میڈل

یہ میڈل اس طالب علم کو ملتا ہے۔ جو اسکول اور ہوسٹل کی زندگی میں امتیازی حیثیت رکھتا ہو۔ خوش قسمتی سے آزاد رسول میڈل اعجاز احمد متعلم درجہ ہشتم کو ملا چونکہ یہ طالب علم اقامتی زندگی میں کامیاب رہے اور معمولات کو وقت پر ادا کرتے رہے۔ (مدیر)

پیامِ تعلیم کہاں کہاں ملتا ہے

سعیدی کتب خانہ، ناکہ بھنڈی بازار، بمبئی ۳
ناز بکڈپو بھنڈی بازار، بمبئی ۳
بچوں کا کتب خانہ، ناکہ جے جے ہسپتال، بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۱
یشنل بکڈپو، ہمتیا روڈ، گیا
زینت اردو نیوز ایجنسی، پرانا محلہ ایلیال (کرناٹک)
مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ، تھانہ منڈی (کشمیر)
ہلال نیوز ایجنسی، شیواجی پول، پوسد (مہاراشٹر)
محمد بدر الدین، بیڑ (مہاراشٹر)
ایم۔ کے نداف، ناگیواڑی (کرناٹک)
اردو بکس ایجنسی، چترا درگ (کرناٹک)
ایم عزیز احمد نیوز ایجنٹ۔ نواب پورہ ۴-۸۴-۷-۴۔ اورنگ آباد
محمد الیاس ۹۱ کولوٹولہ اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳
بک امپوریم سبزی باغ۔ پٹنہ ۴
مکتبہ اطفال۔ مالیگاؤں (ناسک)
سنٹرل اسٹور، رام دیو اسٹریٹ، بیلگام
غیاث الدین تاج، بٹیانہ، کلٹی (مغربی بنگال)
شیخ بک سٹال، چوک گھنٹہ گھر سبزی منڈی، الہ آباد ۳
مدینہ بکڈپو، اسلام پورہ، جلگانو
تنویر بک ڈپو، جی۔ ٹی روڈ، آسنسول
محمد عبد القدیر بک اسٹال۔ مین روڈ، موتی ہاری (بہار)
مکتبہ معارف الاسلام، قاضی باڑہ، نظام پورہ۔ بھیونڈی (تھانہ)
سراج الحسین خاں، گنج دوم، بتیا (چمپارن)
نائج سنٹر، مقابل بی۔ یو لائبریری۔ پٹنہ ۶
مسٹر جنید عالم، کریم گنج، گیا (بہار)
شیخ بک ایجنٹ نارتھ قصبہ شولاپور
ہمارا بک ڈپو، ترکی واڑ، سورت
طارق نیوز ایجنسی، مومن پورہ۔ ناگپور
ریڈرز ویو، بھولی موڑ، دھنباد
مسلم اقبال، بٹیانہ۔ کلٹی (مغربی بنگال)
کتاب گھر، ستی چوک، اورنگ آباد
جنرل بک اسٹال، کشن گنج (بہار)
بھوپال بک ہاؤس۔ بدھوارہ، بھوپال
عظیم آباد کتاب گھر، گردنی باغ، پٹنہ
نکہت بک ڈپو، اے، بی روڈ آسنسول

ڈاکٹر حلیم کوثر چاند پوری

ٹیٹنس

(TETANUS)

پیارے بچو!

آپ سب ہمارے پاس آنے سے اکثر گھبراتے ہیں اور ڈرتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ اکثر آپ کے بزرگ بھی ہم سے گھبراتے ہیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ میں ہی آپ کے پاس چلوں۔ میرے پاس اتنا وقت تو نہیں مگر جامعہ مڈل اسکول کے بچوں کی درخواست پر آپ سے بات کرنے کو اس لیے تیار ہو گیا کہ شاید اسی طرح آپ چھوٹی چھوٹی بیماریوں کے بارے میں ابھی سے کچھ جان لیں اور ڈاکٹر سے آپ کا ڈر بھی ختم ہو جائے۔

آپ ہمارے پاس آنے سے تہ اسی لیے تو گھبراتے ہیں تاکہ آپ کو انجکشن یا کڑوی دوائیں بری لگتی ہیں! مگر میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اکثر تکلیف ہی راحت کا سبب ہوتی ہے۔ بچے سب کو پیارے لگتے ہیں، سب اُن سے محبت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کے سینے میں بھی ایک دردمند دل ہوتا ہے۔ وہ آپ کو کبھی کوئی غیر ضروری تکلیف نہیں دینا چاہتا۔

ماں باپ اپنے بچوں سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ وہ انھیں کبھی تکلیف میں دیکھ بھی نہیں سکتے، لیکن جب آپ کوئی غلطی کرتے ہیں تو اس کے لیے آپکے امی پاپا آپ کو ڈانٹتے بھی ہیں۔ کبھی صرف کان ہی کھینچ کر بخش دیے جاتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی ایک آدھ چپت بھی پڑ جاتی ہے۔ اکثر بچے اس سزا کے بعد رو بھی دیتے ہیں۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد سب کچھ بھول بھال پھر امی کی گود میں سر چھپا کر ہنس رہے ہوتے ہیں۔ ذرا سوچیے آپ کے امی پاپا، جو آپ سے اتنی محبت کرتے ہیں، آپ کو سزا کیوں دیتے ہیں؟ اسی لیے نا! کہ آپ وہ غلط بات پھر نہ دُہرائیں، اور ہر خراب عادت سے بچے رہیں۔

بالکل اسی طرح ڈاکٹر کے بارے میں سوچیے۔ کڑوی دوا یا انجکشن کی تکلیف دینے سے ہمارا مقصد آپ کو بیماری سے بچانا ہوتا ہے!! تاکہ آپ تندرست رہیں۔ خوب کھائیں، کھیلیں اور پڑھیں اور ترقی کریں، اور آپ کے ماں باپ آپ کی طرف سے خوش اور مطمئن رہیں۔

آئیے، آج میں آپ کو ایک خطرناک مگر روکی جاسکنے والی بیماری کے بارے میں کچھ بتاؤں جس سے بچنے کے لیے اکثر آپ کو انجکشن لگوانے کی تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ اس بیماری کا نام آپ میں سے اکثر جانتے ہوں گے۔ اس کا نام ہے ٹیٹنس (Tetanus) اس بیماری کے جراثیم گندگی میں پلتے ہیں۔ دھول، گوبر یا زنگ لگی لوہے کی چیزوں میں یہ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی بھی زخم جو پرانا یا خراب ہو اور اس میں پیپ آتی ہو، وہاں یہ جراثیم پیدا ہو سکتے ہیں۔ سڑک پر ہوئے حادثات، زنگ لگی کیل یا چھری سے ہوئے زخم میں اس بیماری کے جراثیم پیدا ہونے کے بہت امکانات ہوتے ہیں۔

ٹیٹنس کی علامات چوٹ لگنے یا جراثیم کے جسم میں داخلے کے دو دن سے لے کر پندرہ دن یا کئی مہینوں کے بعد بھی سامنے آ سکتی ہیں۔ گردن میں درد اور پھر اکڑ جانا، جبڑوں میں درد اور اکڑن جس کی وجہ سے کھانے یا نگلنے میں تکلیف، چہرے کے تمام عضلات کا اکڑنا جس

کی وجہ سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مریض کے چہرے پر مستقل مسکراہٹ" طاری ہے۔ سانس میں دشواری۔ اس بیماری کی خاص نشانیاں ہیں۔ مریض کے عضلات میں سختی آجانے کی وجہ سے اس کا جسم پتھر کی طرح سخت ہوجاتا ہے اور اس طرح اکڑ جاتا ہے کہ مریض ہل بھی نہیں سکتا۔ اس سختی کی وجہ سے سانس لینے میں دشواری بڑھتی جاتی ہے اور یہی دشواری مریض کی موت کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ بیماری ہوجانے کے بعد بہت کم مریض اس سے بچتے ہیں۔ اس لیے ڈاکٹر اس مرض کے روک تھام پر بہت زور دیتے ہیں

کھیل کے میدان میں گر جانے پر، لوہے کی چیز سے زخم آجانے پر، جل جانے پر یا کان بہنے میں اگر ڈاکٹر آپ کو اس مرض کے خلاف انجکشن لگاکر تکلیف دیتا ہے تو اب آپ ہی سوچیے کہ اس تکلیف میں آپ کی کتنی بھلائی پوشیدہ ہے۔

اس بیماری کے بارے میں اتنا کچھ جان لینے کے بعد اب مجھ کو یقین ہے کہ ایسے موقعوں پر آپ بہادری سے خود جاکر انجکشن لگوائیں گے اور اس خطرناک بیماری کی روک تھام میں اہم رول ادا کریں گے۔

x x x x x x x x x x x x x x x x x x x

(بقیہ نئی پرانی آوازیں صفحہ ۲۲)

پڑھنے کے انداز کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

"نوجوانوں کو بوڑھے بیت بازوں سے بہت کچھ سیکھنا ہے"

نوجوان ٹیم کی ہمت افزائی کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔

"آپ لوگوں کو مطالعے اور تجربے کی بڑی ضرورت ہے۔"

اس طرح بیت بازی کا مقابلہ تو ختم ہوگیا۔ لیکن سامعین کی پیاس شاید ابھی بجھی نہیں تھی۔ ان کے شدید اصرار پر خالد سیف اللہ صاحب نے ایک نظم "بحر طویل" اور نیاز فاطمہ صاحبہ نے ایک غزل سنائی۔

اور شعر صاحب کا یہ دلچسپ پروگرام نہایت خوش گوار ماحول میں ختم ہوا۔

محترمہ مہمان اڈیٹر صاحبہ

تسلیم

یوں تو آپ ایک چھوٹی سی بچی ہیں لیکن کام آپ نے بڑوں کا سا کیا ہے اور بڑا کیا ہے۔ اس کارنامے پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

'پیام تعلیم' پڑھنے والے جانتے ہیں کہ جیسا اُس کا نام ہے ویسا ہی کام۔ اُس میں جامعہ کی زندگی جھلکتی ہے اور اس کے ذریعے وہاں کی علمی، تہذیبی اور تفریحی سرگرمیوں کا پتا چلتا رہتا ہے۔ اُس نے جامعہ کے تعلیمی میلوں کے بارے میں موقعے موقعے پر بہت کچھ پیش کیا ہے۔ لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ یہ ذمّے داری خود بچّوں نے نبھائی ہے۔ بعض حالات کی بنا پر کئی سال سے ہمارا تعلیمی میلا نہیں منایا جا سکا تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے شیخ الجامعہ صاحب کی حوصلہ افزائی اور ہمارے ساتھیوں کی رہنمائی سے آپ سب نے اِس خوشگوار روایت کو پھر جیتی جاگتی حقیقت بنا ڈالا اور قسمت سے سونے پر سہاگے والی بات یہ بھی ہوگئی کہ مکتبہ جامعہ کی عنایت سے اس کی چلتی پھرتی تصویر دوسرے بچوں کو گھر بیٹھے دکھانے کا موقع بھی مل گیا۔

اِس 'تعلیمی میلا نمبر' کے ذریعے آپ نے نہ صرف اپنی کارروائی سنائی ہے بلکہ دوسرے بچّوں کے سامنے ایک نمونہ بھی رکھ دیا ہے جس سے کام اور کام کرنے کے ڈھنگ دونوں کا بھرپور طریقہ پر پتا چل جاتا ہے۔ ابھی یہ میلا اگلے مہینے کے 'پیام تعلیم' تک چلے گا۔ اس لیے یہ بات وقت سے پہلے ہوجائے گی، اگر میں کہوں کہ کیا کچھ آپ اور شامل کرتیں۔ اِس وقت تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ آپ نے پیش کیا ہے، وہ سب موزوں ہے اور اُسے سلیقے سے ترتیب بھی دیا گیا ہے۔ ہاں، مجھے بچوں کی حکومت کے عہدیداران کا تعارف کمزور اور پھیکا نظر آیا۔ مسند نشینی کی تقاریب میں یہ تعارف ہمیشہ ایک مزیدار اور چٹ پٹی چیز رہا ہے کیوں کہ یہ تعارف کرانے والے بے تکلف ساتھی ہی ہوتے ہیں۔ اگرچہ لکھنے والے کا نام درج نہیں ہے لیکن اس تعارف میں لہجے کی خشکی اور الفاظ کی بلندی سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے اسے بڑے ہاتھوں میں پہنچا دیا۔ اس لیے ممکن ہے بات بڑی ہوگئی ہو لیکن بنی نہیں۔

اب ایک بات اور 'پیام تعلیم' اپنی زبان اور املا کا ایک معیار رکھتا ہے۔ غالباً عجلت میں آپ کی توجہ اس طرف اتنی نہیں رہی جتنی ہونی چاہیے تھی۔ یہی دیکھیے کہ 'میلا' اور 'میلہ' دونوں ہی کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ لہٰذا اگلے رسالے کے مضامین پر ذرا کڑی نظر پڑنی چاہیے۔ اچھا، ایک بار پھر مبارک باد

دعاؤں کے ساتھ

عبداللطیف ولی بخش قادری

شعبۂ اساسی تعلیم و نیکلٹی تعلیم، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

دھنک
قرآن پاک کیا ہے
اس کتاب میں بچوں کے لیے نہایت آسان اور عام فہم زبان میں
قرآن پاک کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ قیمت ۲/-

Regd No D(SE)-043 February. 1982

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

برنٹ آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج۔ دلی ۲

پیامِ تعلیم

بچوں سے باتیں

دو مہینوں کے بعد آج پھر آپ سے باتیں کرنے کا موقع ملا
جیسا کہ آپ جانتے ہیں، پچھلے دو شماروں کی ترتیب کا انتظام
جامعہ مڈل اسکول کے طلبہ نے انجام دیا۔ ان بیچاروں کے لیے یہ کام
بالکل نیا اور انوکھا تھا پھر بھی ہماری رائے میں انھوں نے یہ کام
اچھی طرح انجام دینے کی کامیاب کوشش کی۔ آپ کو دونوں شمارے
کیسے لگے۔ اس کا ہمیں بھی اتنا ہی انتظار ہے جتنا ان بچوں اور بچیوں کو
جنھوں نے ان شماروں میں اپنی طرح طرح کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا
آپ کی رائے کچھ بھی ہو مگر اتنا تو آپ کو تسلیم کرنا چاہیے کہ ان
طلبہ نے جامعہ ملیہ کی ان تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں سے روشناس کرایا
جن سے آپ میں سے بہت سے ناواقف تھے۔ ساتھ ہی ان سرگرمیوں
کے ذریعے آپ کو اور آپ کے اساتذہ کو نئی راہ بھی دکھائی ہے۔
لیجیے اب آپ کی سابق دلچسپیاں پھر پیش ہیں۔

۷ فروری ۱۹۸۲ کو پیام تعلیم کے دیرینہ اور مخلص رفیق
عتیق صدیقی کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم پیام تعلیم میں بھی لکھتے رہے ہیں
بڑے ملنسار اور مخلص دوست تھے۔ دفتر میں آتے تو رونق آجاتی
فرداً فرداً سب سے خیریت دریافت کرتے۔ کسی پر مصنوعی غصہ
کسی کی کارکردگی پر خوشی کا اظہار کرتے۔ ۲ فروری کو طبیعت خراب
ہوئی تو اعزہ واحباب بہ اصرار انھیں ہسپتال لے گئے جہاں سے
افسوس کہ واپس نہ آسکے۔ خدا مغفرت فرمائے۔

یہ کاپیاں پریس جا رہی تھیں کہ جامعہ کے پرانے طالب علم اور
استاد جناب عبدالغفار مدھولی کے انتقال کی خبر موصول ہوئی۔ جس سے
مکتبہ جامعہ اور جامعہ ملیہ میں تاسف اور سوگ کی لہر دوڑ گئی۔ جامعہ سے
تعلیم مکمل کرنے کے بعد مدرسہ ابتدائی میں مدرس ہوگئے۔ استادوں کے مدرسہ
میں درس دیا۔ ۱۹۷۵ء میں مستعفی ہو کر وطن کو واپس گئے اور وہاں ۱۸
۱۳ فروری کو جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ مرحوم اپنی وضع داری
اوقات، خلوص اور ہمدردی کی وجہ سے شاگردوں اور ہم عصروں میں
بہت مقبول تھے۔ خدا مغفرت فرمائے۔ آمین

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی

مارچ ۱۹۸۲ء — جلد ۱۹ — شمارہ ۳

ایڈیٹر: ولی شاہجہانپوری

فی پرچہ ڈیڑھ روپیہ — سالانہ پندرہ روپے
غیر ممالک کے لیے پینتالیس روپے

پرنٹر پبلشر [illegible] نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کی

پروفیسر غلام دستگیر

شہری بچہ

میرا مکاں ہے شہر میں

جس راستے پر ہے مکاں — کیسے کریں اس کا بیاں
چلتی ہیں ہر دم گاڑیاں — موٹر، بسیں اور لاریاں
وہ شور ہوتا ہے یہاں — چلتی ہوں جیسے آندھیاں
جی چاہتا ہے اب یہی — اس شہر سے جائیں وہاں
ہیں کھیت اور میداں جہاں — چرتی ہوں بھیڑ اور بکریاں

اس راہ پر جو ہیں مکاں

اُن میں سکونِ دل کہاں — حاصل نہیں آرامِ جاں
تازہ ہوا اور روشنی — ان کا نہیں نام و نشاں
مل، کارخانے اور مکاں — ہر جا دھواں ہر جا دھواں
جی چاہتا ہے اب یہی — اس شہر سے جائیں وہاں
ہیں باغ اور جنگل جہاں — جنگل میں ہو منگل جہاں

اک شے ہے مجھ کو پیار ہے

جس شے سے مجھ کو پیار ہے — وہ شے ہے نیلا آسماں
پھیلا ہوا ہے کس قدر — یہ چاند تاروں کا جہاں
بادل کے بھی رنگیں محل — دن رات بنتے ہیں یہاں
جی چاہتا ہے بس یہی — اُڑ جائیں سوئے آسماں
اور جگمگاتے چاند پر — اپنا بنائیں اک مکاں

پتہ: ۲۲۲، سبحان مینشن، لڑکٹ واڑی، پونے

ہے، نہ چیتی ہے نہ اُنتی ہے؟"

"آؤ اسے یہاں طاق پر بٹھا دیں!" رشیدہ نے کہا۔ "جاؤ تم اندر سے ذرا اسٹول اٹھا لاؤ — شاید یہ اپنا گھر بھول گئی ہے۔"

نسیم ابھی اندر جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ ان کی بلی میاؤں میاؤں کرتی باہر نکل آئی اور رشیدہ کے پیروں سے اپنا جسم رگڑنے لگی۔

"نسیم۔ اے نسیم!" رشیدہ گھبرا کر چیخی۔ "ارے پہلے تم اس بلی کو اندر بند کر دو، نہیں تو ابھی اسے چٹ کر جائے گی۔"

نسیم بلی کو گود میں دبوچ کر اندر چلی تو بلی نے کچھ ناراضگی کے انداز میں اُسے دیکھا۔ نسیم باہر آئی تو دونوں بہنوں نے طاق پر ایک پلیٹ رکھ کر اس میں کھانا چن دیا اور اسی کے ایک کنارے پر چڑیا کو بٹھا دیا۔ چڑیا رشیدہ کے ہاتھ سے نکل کر کچھ خوش دکھائی دینے لگی۔

"تم نے پوسی کو کمرے میں بند کر دیا ہے نا؟" رشیدہ نے پوچھا۔

"ہاں تل تو دیا ہے!" — تھوڑی دیر بعد نسیم نے خود ہی پوچھا۔ "باجی اب یہ چلیا یہیں رہا کرے گی نا؟ ہم اچھے اپنے ناپھتے، کھانے میں سے کچھ کھلا دیا کریں گے! ہے نا باجی — کیسا اچھا لگے گا!"

"واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ چڑیا تو اپنے گھونسلے میں رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے ماں باپ ابھی اسے ڈھونڈتے ہوئے آ جائیں!" رشیدہ نے بہن کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"او دیکھیں باجی، چلیا نے ابھی کچھ کھایا یا نہیں!" اور وہ جواب کا انتظار کیے بغیر طاق کی طرف بڑھ گئی۔

اُدھر ایک چڑیا سامنے کی دیوار سے اُڑ کر، چوں، چوں، کرتی شور مچاتی نسیم کے سر پر منڈلانے لگی۔

"نسیم، فوراً نیچے آ جاؤ!" رشیدہ خوشی سے چیخی۔ "شاید اس کی ماں آ گئی ہے!"

اِدھر ان کا سب سے چھوٹا بھائی گڈو بلی کو گود میں دبائے ان کی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ اندر سے ہی چلایا — "باجی، باجی!... پوسی کمرے میں بند..." اور بلی گڈو کی گود سے کود کر سیدھی اسی طاق کے نیچے پہنچ گئی جس پر چڑیا منڈلا رہی تھی۔

اس وقت یہاں کچھ عجیب گڑبڑ سی نظر آ رہی تھی۔ چڑیا کا بچہ اپنے پر پھڑپھڑا کر چیں چیں چیں چیں کر رہا تھا — چڑیا شور مچاتی طاق پر منڈلا رہی تھی — نیچے بلی گردن اٹھائے للچائی نظروں سے چڑیا کو دیکھ رہی تھی — رشیدہ اور نسیم اُسے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑ رہی تھیں، اور گڈو حیران تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

آخر رشیدہ نے بلی کو پکڑ ہی لیا اور اسے اندر لے کر بھاگی۔ چڑیا سامنے دیوار پر جا بیٹھی اور بچے نے اور زور زور سے چیں چیں، چیں چیں کرنا شروع کر دیا۔

"تیوں باجی، ہم اِچھے اٹھا تل! اچھ تی ماں تے پاچ ہی تیوں نہ لتھ دیں؟"

"یہ ٹھیک ہے!" رشیدہ نے کہا۔ لیکن جیسے ہی اس نے بچے کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا وہ تو ایک دم سہم کر چپ ہو گیا مگر چڑیا ان کے سروں پر کچھ اتنی تیزی سے چکر لگانے لگی جیسے وہ اپنی چھوٹی سی چونچ سے ان پر حملہ ہی کر دے گی۔

"پتا نہیں یہ تیچھی چلیا ہے!" نسیم کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

"شاید یہ ہم سے ڈر رہی ہے!" رشیدہ نے کہا۔ "چلو اندر چلیں، وہیں سے دیکھیں گے۔"

اب آنگن میں بالکل سناٹا تھا — کچھ دیر بعد چڑیا اڑی، طاق کے پاس آ کر آہستہ سے چوں چوں کیا اور بچہ ماں کی آواز سنتے ہی خوشی سے چہک پڑا۔ اس نے اپنے پر پھیلا دیے اور زور زور سے چیں چیں کرنے لگا۔ اس کی لال لال چونچ کھلی پڑ رہی تھی — لیکن [illegible]

پھر دیوار پر جا بیٹھی۔ اس نے گردن گھما گھما کر چاروں طرف دیکھا۔

"دیکھو باجی دیکھو" نسیم کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے بولی۔

چڑیا ایک بار پھر طاق تک اڑ کر آئی، ڈرتے ڈرتے نیچے اتری اور پلیٹ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ بچہ ماں کی طرف کچھ اتنی بے چینی سے لپکا کہ جیسے گر ہی پڑے گا۔

چڑیا نے اپنے پروں سے اُسے پیچھے کیا۔

"باجی دیکھو تو، کتنا خوش ہو رہا ہے، ماں تو دیکھ لی!" نسیم نے خود بھی خوشی سے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

بچہ اپنی لال لال چونچ پھاڑے، گردن اٹھائے پاگلوں کی طرح چیں چیں کیے جا رہا تھا۔ چڑیا نے ڈرتے ڈرتے پلیٹ کو دیکھا، پھر چونچ میں تھوڑے سے چاول بھر کر بچے کی چونچ میں بھر دیے۔

نسیم خوشی سے ناچ ناچ کر گا رہی تھی: "چلیا نے کھانا کھا لیا — چلیا نے کھانا کھا لیا!"

تھوڑی دیر بعد چڑیا اُڑ کر دیوار پر جا بیٹھی اور نسیم ایسی اداس سی ہو گئی جیسے اس کے سامنے سے کھانا اٹھا لیا گیا ہو —

چڑیا بار بار اُڑ کر طاق کے پاس آتی اور پھر پلٹ جاتی۔ بچہ چیں چیں چیں چیں کرتے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اس کے پر ہوا میں پھیلے ہوئے تھے اور وہ آگے بڑھتے بڑھتے طاق کے بالکل کنارے تک پہنچ گیا تھا۔

اور پھر ذرا سی دیر تو ان بچیوں کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ ایک دم یہ سب کیا ہو گیا — چڑیا طاق کے پاس آئی — بچے نے جیسے اس پر چھلانگ لگا دی ہو — وہ ڈگمگایا اور زمین پر گرنے والا ہی تھا کہ گھبرا کر اس نے خود ہی اپنے پر چلانے شروع کر دیے اور ڈگمگاتا ہوا ہوا میں اڑنے لگا — پھر جلد ہی وہ بھی اپنی ماں کے سامنے دیوار پر اتر گیا۔

ادھر نسیم اور رشیدہ خوشی سے ناچتی کودتی باہر نکل آئیں — چڑیا اڑ گئی — چلیا اُل دَتی —
چلیا اُل دَتی؟

آج اس بھاگ دوڑ میں انھیں ایک سکنڈ کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اسکول سے آکر انھوں نے ابھی تک کپڑے بھی نہیں بدلے تھے اور نہ منہ ہاتھ دھویا تھا بلکہ دن بھر کا سب سے پیارا کام — یعنی اسکول سے آکر ناشتہ کرنا بھی انھیں یاد نہیں آیا تھا۔

نورالعین علی

نہیں بوجھ پائے!

سویرے جو دیکھو تو نیلا لگے
جو ہو دوپہر تو وہ پیلا لگے
کبھی لال ہے اور کبھی سرمئی
سفیدی کبھی ہر طرف چھا گئی

یہ کس طرح اتنے بدلتا ہے رنگ
سکھائے ہیں کس نے اسے ایسے ڈھنگ
کبھی ایک تھالی ہے ہیروں بھری
کہ جیسے ہو دنیا پہ الٹی دھری

مگر ایک ہیرا بھی گرتا نہیں
یہ کیا بھید ہے میں تو سمجھا نہیں
چمکتی دمکتی ہیں قندیلیں دو
کہ ہم دیکھیں دنیا کی ہر چیز کو

سنہلی جو ہے اس میں قندیل ایک
دکھاتی ہے وہ رات کو راہ نیک
سنہری جو قندیل دن میں جلے
اٹھا کر نظر کوئی گر دیکھ لے

تو چندھیائیں آنکھیں نظر کچھ نہ آئے
بہت دیر تک وہ نہ سر بھی اٹھائے
بتاؤ تو کیا شے ہوئی ہے بیاں
نہیں بوجھ پائے؟ یہ ہے آسماں!

پیٹ رے پیٹ تو سب کا دشمن!

ایک یونانی کہانی

شمیم حنفی

ایک رات ایک بڑے میاں نے خواب دیکھا۔ عجیب خواب تھا۔ دیکھتے ہیں کہ ان کے دونوں ہاتھ، دونوں پیر، منھ اور سارے ت بری طرح پیٹ کو ڈانٹ پھٹکار رہے ہیں۔

پیروں نے کہا "پیٹ رے پیٹ، تو موٹا بھی ہے اور عقل کا بھی۔ کام کا نہ کاج کا، ڈیڑھ سیر اناج کا۔ ہم دن بھر چلتے ہیں۔ ٹہلتے ہیں۔ کھانے پینے کا سامان لاتے ہیں۔ تو بس کھاتا ہے چین کی بنسی بجاتا ہے۔ لالچی کہیں کا!"

یہ سن کر دونوں ہاتھ بولے "ہاں ہاں! پیروں نے ب ٹھیک تو کہا۔ اب ہم ہی کو دیکھو۔ ہم کتنی محنت کرتے ہیں۔ باغ لگانا، گیہوں کی پسائی، پھر آگ جلانا، کھانا پکانا، یہ سب ے ذمے۔ اور تو! سب کچھ چٹ کر جاتا ہے۔ مفت خور ہے۔ ہے!"

منھ اور زبان اور دانتوں نے ایک ساتھ مل کر پیٹ کی ہنسی ی۔ خوب کھری کھری سنائی۔ کہنے لگے "ہم نہ ہوتے تو کیا تو بازار سے کیا قسم قسم کے پکوان اڑاتا۔ ہاتھ پاؤں اپنا کام کر چکتے ہیں تو ہم چباتے ہیں۔ اس کا مزا ہم بتاتے ہیں۔ اسے معدے تک ہم پہنچاتے ہیں۔ پیٹ رے پیٹ! تو ہو ملیا میٹ!"

یہ جھگڑا بہت دیر تک چلتا رہا۔ سبھی نے جھاڑ کر پیٹ [illegible] پڑ گئے تھے۔ آخر کو پیروں نے ایک تجویز پیش کی۔ تجویز یہ تھی کہ ہاتھ، پیر، منھ، زبان، دانت، سب کے سب پیٹ کے لیے کچھ کرنا دھرنا چھوڑ دیں۔

"واہ! کیا لاجواب بات سوچی ہے!" ہاتھ، منھ، زبان، دانت ایک ساتھ بولے۔

"میاں پیٹ! اب تمھیں پتا چلے گا کہ کاہلی کی سزا کیا ہوتی ہے۔ اپنی کرنی بھرو گے۔ اب بھوکے مرو گے۔"

پیٹ بے چارا چپ چاپ سب کی سنتا رہا۔ غصے میں گھٹتا رہا۔ لیکن کسی کو کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ سچ مچ بہت موٹا تھا اور دیکھنے میں آرام پسند نظر آتا تھا۔

اب پیروں نے بازار جانا چھوڑ دیا۔ ہاتھوں نے سامان اٹھانا اور کھانا پکانا چھوڑ دیا۔ منھ نے ہونٹ ہلانا چھوڑ دیا۔ دانتوں نے کھانا چبانا چھوڑ دیا۔ جب یہ سب چھوٹ گیا تو زبان نے بھی چیزوں کا ذائقہ بتانا چھوڑ دیا۔

اب بڑے میاں خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ [illegible]

پروفیسر قنبر احمد رضوی

ملکوں ملکوں کی سیر

آئیے ملکوں ملکوں شہروں شہروں کی سیر کریں۔
دنیا بہت وسیع ہے۔ کرۂ زمین کے استوائی خطے میں اس کی لمبائی تقریباً پچیس ہزار میل یا چالیس ہزار کلومیٹر ہے۔ کرۂ ارض پر پانچ بحر اعظم اور سات برّاعظم دکھائی دیتے ہیں۔ بحر اعظموں کے نام ہیں: بحر آرکٹک، بحر اٹلانٹک یا بحر الکاہل۔ بحر پیفک یا بحر اوقیانوس، بحر ہند اور بحر جنوبی۔ برّاعظموں کے نام ہیں: ایشیا، یورپ، آسٹریلیا، افریقہ، شمالی امریکہ، جنوبی امریکہ، اور برّاعظم انٹارکٹکا۔ ان برّاعظموں کو دیکھیے تو ایسا لگتا ہے جیسے ۔۔۔ کرے کے تین برّاعظم ایک دوسرے سے بحر روم کے ساحل پر گلے مل رہے ہوں۔ یہ ہیں افریقہ، ایشیا اور یورپ۔

اگر ہم سیر کرتے ہوئے یورپ سے خشکی کے راستے سے ایشیا میں داخل ہونا چاہیں تو سب سے پہلا ایشیائی ملک جو ہمارے راستے میں پڑے گا وہ ہے ترکی۔ لوگ ترکی کو ایشیا کا دروازہ یا مشرقِ وسطیٰ کا پُل کہتے ہیں۔ ترکی ہی ایشیا کا واحد ملک ہے جو دو برّاعظموں پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ ملک عہد وسطیٰ سے آج تک یورپ کے کچھ حصے پر قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے یورپ کا ملک روس اور افریقہ کا ملک مصر برّاعظم ایشیا میں پھیلا ہوا ہے۔

ترکی کے جغرافیائی محلِ وقوع کو مغربی ایشیا میں ایک خصوصیت حاصل رہی ہے۔ بحر روم کے مشرقی ساحلی خطے میں واقع آبنائے باسفورس دو اہم جزیرہ نماؤں، مشرق میں ایشیائے کوچک یا اناطولیہ اور مغرب میں بلقان کو ایک دوسرے سے علاحدہ کیے ہوئے ہے۔ یہی آبنائے باسفورس بحر اسود اور بحر روم کے درمیان ایک بحری راستے کی شکل بھی اختیار کیے ہوئے ہے۔ اس آبنائے کو پار کرنے والا ایک قدیم خشکی کا راستہ بھی ہے جو یورپ کے جزیرہ نمائے بلقان کو ایشیا کے ملک ترکی یا ایشیائے کوچک سے ملا دیتا ہے۔ اس طرح بحری اور برّی راستے کا ایک چوراہا سا بن گیا ہے۔ ایک طرف بحر اسود سے بحر روم کا بحری راستہ آتا ہے تو دوسری طرف برّاعظم یورپ سے برّاعظم ایشیا کا خشکی کا راستہ آتا ہے۔

"استنبول۔ ایک شہر دو برّاعظم"

یورپ اور ایشیا کے درمیان واقع بحری برّی چوراہے پر دنیا کا عجیب ترین شہرت یافتہ شہر "استنبول" آباد ہے جس کے وسیع ۔۔۔

صدر شعبۂ جغرافیہ، اے کے کالج شکوہ آباد۔ ۲۰۵۱۳۵

اور یورپ دو براعظموں نے منہ چھپا رکھا ہے۔ استنبول نے دونوں براعظموں کی تہذیب کو پناہ دے رکھی ہے۔ یہ شہر آج دنیا کے قدیم ترین اور مصروف ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ ترکی میں یہ شہر زمانۂ قدیم ہی سے ایک بڑا تجارتی اور اہم سیاسی مرکز رہ چکا ہے۔ پرانے زمانے میں اس کا نام قسطنطنیہ تھا۔ عہد وسطیٰ میں یہ ترکی کی راجدھانی رہ چکا ہے۔

یہ شہر زمانۂ قدیم سے ہی اَن گنت تاریخی انقلابات اور سیاسی تغیرات دیکھ چکا ہے۔ اب یہاں دو تہذیبیں، مغربی اور مشرقی۔ ایک دوسرے میں سما گئی ہیں۔ دو رنگ ایشیائی اور یوروپین۔ ایک حسین امتزاج میں ظاہر ہوتے ہیں۔ دو سمتیں، مشرق و مغرب ایک دوسرے سے گلے مل رہی ہیں۔ دو معاشرے۔ جدید و قدیم۔ ایک دوسرے سے گھل مل گئے ہیں۔ استنبول دنیا میں ایک اور صرف ایک ہی اتنا عظیم شہر ہے جو دو براعظموں کے کچھ حصوں پر پھیلا ہوا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ گیارہویں صدی عیسوی میں جب ملک ترکی یونانیوں کے قبضے میں تھا تو یونانی شہنشاہ کے نام پر اس شہر قسطنطنیہ کی بنیاد رکھی گئی۔

مغربی مورخین کچھ اور کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ استنبول نویں صدی قبل مسیح میں "سرائے برونو" کے قریب آباد ہوا تھا۔ ۵۱۳ قبل مسیح میں فارس کے بادشاہ "دارا" نے آبنائے باسفورس کو پار کر کے اس شہر پر قبضہ جمایا۔ حضرت عیسیٰؑ سے ۳۴۰ سال قبل اس شہر کا محاصرہ مقدونیہ کے بادشاہ فلپ نے کیا اور ان کے بیٹے سکندر اعظم نے قبضہ کر لیا۔ سکندر کے بعد یونانیوں کے کمزور پڑنے پر رومیوں نے شہر کو فتح کر لیا۔ تیسری صدی عیسوی تک یہاں بہت سے انقلابات آ گئے۔ [illegible] بادشاہ قسطنطین نے شہر قسطنطنیہ کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ چوتھی صدی عیسوی تک اس [illegible] مغربی و ایشیائی قومیں حملہ کرتی رہیں۔

اسی لیے شہر کی حفاظت کے لیے حصار یا شہر پناہ کی تعمیر کی گئی۔ کہتے ہیں کہ ۶۷۴ء میں مسلمانوں نے جب اس شہر کا محاصرہ کر رکھا تھا تو اسی شہر پناہ کے پاس حضرت ابو ایوب انصاریؓ صحابیِ رسولؐ شہید ہوئے۔ آج بھی ان کی یادگار ہیں۔ اس علاقے کو "ایوبی" کہا جاتا ہے۔ جہاں ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے بعد حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا شاندار مقبرہ تعمیر کیا تھا۔

تیرہویں صدی میں وسط ایشیا سے آنے والے طغرل بے کے ساتھیوں نے سلجوقیوں کو شکست دے کر ترکی پر اپنا اقتدار جمایا۔ طغرل بے کے فرزند عثمان نے اپنی حکومت کو وسیع کر کے "دولت عثمانیہ" کی بنیاد رکھی اور ۱۴۵۳ء میں عثمانی سربراہ سلطان محمد دوم فاتح قسطنطنیہ نے اس شہر کو یونانیوں سے پھر چھین لیا۔ اب شہر قسطنطنیہ جس کا نام ترکوں نے استنبول رکھا۔ اس عظیم حکومت "دولت عثمانیہ" کا دارالحکومت بن گیا جو عراق و عرب سے روس اور شمالی افریقہ تک پھیل گئی تھی۔

شہر استنبول اب ترکی کا دارالسلطنت نہ سہی مگر ترکی ہی نہیں بلکہ دنیا کے عظیم شہروں میں سے ایک ہے۔

قدیم استنبول ایک جزیرہ نما پر آباد ہے جس کا مشرقی ساحل آبنائے باسفورس کی حد بناتا ہے۔ اس کے جنوبی ساحل پر خلیج مارمرا اور شمالی حصے پر گولڈن ہارن کی خلیج واقع ہے۔ یہ تنگ خلیج ایک فیورڈ کی شکل میں یورپی استنبول کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے جس کا شمالی حصہ "غراطہ" اور "پیرا" کے نام سے موسوم ہے۔ جنوبی حصہ قدیم استنبول کہلاتا ہے۔

گولڈن ہارن کی ابتدا آبنائے باسفورس کے ساحل پر واقع سرائے پوائنٹ سے ہوتی ہے جہاں سے اندرونی حصے تک صرف آٹھ کلومیٹر کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ یہ حصہ ایک قدرتی بندرگاہ کی شکل میں جہازوں

کے قیام کے لیے پُرسکون پناہ گاہ بن گیا ہے۔ یہاں سنہری مچھلیوں کا قیمتی شکار بھی ہوتا ہے اس وجہ سے بھی لوگ اس کو گولڈن ہارن کا نام دیتے ہیں۔ یہاں خلیج کی چوڑائی "قاسم پاشا" اور "جبالی" مقامات کے درمیان کم ہوکر صرف ۷۹۳ میٹر رہ جاتی ہے۔

یورپی استنبول اور ایشیائی استنبول کے درمیان آبنائے باسفورس کی وسعت ستائیس کلو میٹر ہے جو ایک مقام پر صرف دو کلو میٹر رہ جاتی ہے اور آبنائے کے دونوں کناروں پر واقع عہدِ وسطیٰ کے ان قلعوں کی فصیلیں تک نظر آتی ہیں جن کو حصار رومی (یورپی قلعہ) اور حصار اناطولیہ (ایشیائی قلعہ) کہا جاتا ہے۔ کشتی یا اسٹیمر سے ایشیائی اور یورپی استنبول کے درمیان صرف بیس منٹ کا راستہ ہے۔ یہیں استنبول کا وہ ضلع واقع ہے جس کو اسقوطری یا اسقودر کہتے ہیں۔ استنبول کے پاس ہی بحر مارمرا میں موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے نو جزائر ہیں جن میں کنالی برگازہ حا تبلی۔ بویوقدا خاص جزیرے ہیں۔ (بقیہ آئندہ)

مختلف ملکوں کے قومی گیت

ممالک	قومی گیت
بھارت	جن گن مَن ادھی نائک
پاکستان	پاک سرزمین شاد باد
روس	ہائس آف دی سوویٹ یونین
فرانس	لا رما رسلیس
انگلستان	گارڈ سیو دی کنگ
امریکہ	دی اسٹار اسپینگلڈ بینر
بلجیم	لا برین میکان
چین	سن میں چو آئی

احمد کمال حشمی۔ معرفت، مولوی شمس الحق (مرحوم) بی۔ ایل ۲۱ نیا بازار کانکی نارہ ۷۴۳۱۲۶

پیام تعلیم کہاں کہاں ملتا ہے

سعیدی کتب خانہ، ناکہ بھنڈی بازار، بمبئی ۳
ناز بکڈپو بھنڈی بازار، بمبئی ۳
بچوں کا کتب خانہ، ناکہ جے جے ہسپتال، بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۱
نیشنل بکڈپو، بگتیا روڈ، گیا
زینت اُردو نیوز ایجنسی، پُرانا محلہ الیال (کرناٹک)
مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ، تھانہ منڈی (کشمیر)
ہلال نیوز ایجنسی، شیواجی پول، پوسد (مہاراشٹر)
محمد بدر الدین، بیڑ (مہاراشٹر)
ایم۔ کے نداف، باگیواڑی (کرناٹک)
اُردو مجلس ایجنسی، چترادرگ (کرناٹک)
ایم عزیز احمد نیوز ایجنٹ۔ نواب پورہ ۴۔۸۔۷۔۴۔ اورنگ آباد
محمد الیاس ۹۱ کولوٹولہ اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳
بک امپوریم سبزی باغ، پٹنہ ۴
مکتبہ اطفال، مالیگاؤں (ناسک)
سنٹرل اسٹور، رام دیوا اسٹریٹ، بیلگام
غیاث الدین تاج، ٹیٹیانہ، کاٹی (مغربی بنگال)
شمع بک اسٹال، چوک گھنٹہ گھر، سبزی منڈی، الہ آباد ۳
مدینہ بکڈپو، اسلام پورہ، جلگاؤں
تنویر بک ڈپو، جی۔ ٹی روڈ، آسنسول
محمد عبد القدیر بک اسٹال۔ مین روڈ، موتی ہاری (بہار)
مکتبہ معارف الاسلام، قاضی باڑہ، نظام پورہ۔ بھیونڈی (تھانہ)
سراج الحسین خاں، گنج دوم، بتیا (چمپارن)
تاج سنٹر، مقابل پی۔ یو لائبریری، پٹنہ ۴
مسٹر جنید عالم، کریم گنج، گیا (بہار)
شیخ بک ایجنٹ نارتھ قصبہ شولاپور
ہمارا بک ڈپو، ترکی واڑ، سورت
طارق نیوز ایجنسی، مومن پورہ۔ ناگپور
ریڈرز ویو، بھولی مور، دھنباد
مسلم اقبال، ٹیٹیانہ۔ کاٹی (مغربی بنگال)
کتاب گھر، سٹی چوک، اورنگ آباد
جنرل بک اسٹال، کشن گنج (بہار)
بھوپال بک ہاؤس، بدھوارہ، بھوپال
عظیم آباد کتاب گھر، گردنی باغ، پٹنہ
نکہت بک ڈپو، اے، بی روڈ، آسنسول

سیمیں کی چڑیوں کی میز

بیگم ہدایت الرحمٰن محسنی

سردیوں کے موسم میں سیمیں کی نینی باہر جانے کے وقت اس کو سوئٹر، اُونی جرابیں اور کوٹ پہنا کر اور سر پر اسکارف لپیٹ کر باہر جانے کی اجازت دیا کرتی تھیں۔

سیمیں کو بہت سارے کپڑے پہننے کی وجہ سے سردی کا موسم بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ سیمیں ہی کی طرح جنگلی چڑیوں کو بھی سردیوں کا موسم اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ بھی اپنی بولی میں اس موسم کی بہت بُرائی کیا کرتی تھیں۔

کوئی چڑیا کہتی ہے "چوں چوں، کیا کھائیں؟"

کھٹ بڑھیا کہتا ہے "ٹرررر زمین سخت ہو گئی ہے۔ اس میں سے کیڑے نکالنا کتنا مشکل ہو گیا ہے۔"

سیمیں ہر صبح کو ناشتہ کے بعد اپنی ڈبل روٹی کے بھورے کھڑکی کی چوکھٹ پر ڈال آیا کرتی تھی۔ چڑیاں آ کر بیٹھیں اور اپنی چونچ سے کھٹ کھٹ کرنے لگیں۔ اس کی نینی نے کہا۔ "سیمیں دیکھو! وہ چڑیا کہہ رہی ہے "مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ جلد ہی کچھ کھانے کو دو۔" سیمیں بھاگی ہوئی باورچی خانہ میں گئی اور کچھ بھورے لا کر کھڑکی کے سامنے ڈال دیے۔ چڑیا نے فوراً کھانا شروع کر دیا۔

پھر سیمیں نے سامنے کے درخت پر دیکھا تو اسے ایسا لگا کہ سب ہی چڑیاں بھوکی ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ اُداس ہو گئی اور نینی سے کہنے لگی: "میرے پاس تو روٹی کے بھورے بہت تھوڑے سے ہوتے ہیں اور درخت پر اتنی بہت ساری چڑیاں بھوکی بیٹھی ہیں۔ یہ بھی کھانا مانگ رہی ہیں۔ ہم ان کے لیے کیا کریں؟ ان کا بھوکا رہنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"ہاں سیمیں میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔" اس کی نینی نے جواب دیا۔ "ایک بات میری سمجھ میں آئی ہے۔"

"کیا نینی؟" سیمیں نے خوش ہو کر پوچھا۔

نینی نے کہا۔ "اگر ہمارے یہاں چڑیوں کے کھانے کی ایک میز ہو تو کیا مزا آئے!"

"یہ تو نینی بہت اچھی بات بتائی آپ نے۔" سیمیں نے کہا۔

"تو پھر چلو مالی سے پوچھیں کہ وہ تمہارے لیے ایک چڑیوں کی میز بنا سکتا ہے یا نہیں۔" نینی نے کہا۔ "اگر مالی نے میز بنا دی تو ہم باورچی خانے سے چاول، روٹی کے بھورے اور دوسری بچی ہوئی چیزیں اس پر رکھ دیا کریں گے۔ اس طرح روز چڑیوں کی بہت اچھی دعوت ہو جایا کرے گی۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں ہاں! بالکل ٹھیک" سیمیں نے تالی بجا کر خوش ہو کر کہا۔ "چلیے پوچھیں۔" دونوں سیمیں اور اس کی نینی مالی سے میز بنانے کی بات پوچھنے گئیں۔ مالی نے کہا "سیمیں بی بی۔ میں تمہاری چڑیوں کی میز ضرور بنا دوں گا۔ بس تھوڑی دیر میں میز تیار ہو جائے گی۔"

سیمیں مالی کو میز بناتے ہوئے بہت شوق سے دیکھ رہی تھی۔ مالی نے سب سے پہلے ایک بانس کا ٹکڑا لیا۔ پھر کہیں سے ایک تختہ ڈھونڈ کر لایا۔ اس تختے کو

مسکن، سرسید نگر، دودھ پور، علی گڑھ

بانس پر ٹھونک دیا۔ جب اس طرح میز تیار ہوگئی تو وہ اس میز کو سیمیں کی کھڑکی کے سامنے لے گیا اور خوب مضبوطی سے گاڑ دیا۔ سیمیں نے جب میز کو اپنی کھڑکی کے سامنے گڑا دیکھا تو بہت خوش ہوئی۔ مالی کا شکریہ ادا کیا۔ "مالی مجھے یہ میز بہت اچھی لگی ہے۔ چڑیوں کو بھی اپنی میز اچھی لگے گی اور وہ اس کو دیکھ کر ضرور خوش ہوں گی۔"

"ممی! نینی! یہاں آئیے!" سیمیں نے خوش ہوکر اپنی بہنی کو آواز دی۔ "دیکھیے تو مالی نے چڑیوں کی کیسی اچھی میز بنا کر دی ہے۔"

نینی اور امی میز دیکھنے آئیں۔ وہ بھی اس میز کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ امی کو کہیں سے ایک پرانا کٹورا بھی مل گیا۔ انھوں نے اس میں پانی بھر کر میز کے ایک کونے پر رکھ دیا۔ کہنے لگیں "جب چڑیوں کو پیاس لگے گی تو اس میں سے پانی بھی پی لیا کریں گی۔ میں نے پڑوس میں جو پیڑ ہے اس کے پانی کے برتن میں چڑیوں کو نہاتے دیکھا تھا۔"

میز بننے کے بعد سیمیں ہر روز اپنے پاس کے بھورے اور باورچی خانے کے روٹی کے بھورے، بچے ہوئے چاول جمع کر کے میز پر ڈال آیا کرتی تھی۔

ایک دن کھانا پکانے والی بڑی بی نے ایک بڑا سا بے چھلا ابلا ہوا آلو بھی سیمیں کو دے دیا۔ سیمیں نے وہ آلو بھی میز پر رکھ دیا۔ چڑیاں اس موٹے سے آلو کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور چونچیں مار مار کر خوب مزے لے کر کھایا۔ اس کی نینی نے کہا۔ "جب ہم باغ میں سیر کے لیے جائیں گے تو وہاں سے گرے ہوئے بیر اور امرود چن لایا کریں گے۔ بہت سی چڑیاں ایسی چیزیں بڑے شوق سے کھاتی ہیں۔"

"جب وہ ایسی چیزیں کھائیں گی تو اور بھی مزہ آئے گا۔"

اب تو ہر روز جب سیمیں اور نینی باغ میں جاتیں تو چڑیوں کے لیے کھانے کی چیزیں چننا انھیں ضرور یاد رہتا۔

ایک دن باغ میں بہت سے کچے امرود گرے پڑے تھے۔ سیمیں نے اٹھا لیے اور چڑیوں کی میز پر رکھ دیے۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ایک خود بھی کھا لے مگر پھر اس کو یاد آگیا کہ خراب کچے امرود اسے نہیں کھانے چاہئیں۔ اپنی نینی سے کہنے لگی۔ "نینی! مجھے یہ امرود کھانے نہیں چاہئیں نا! کیوں کہ ان کے کھانے سے پیٹ میں درد ہو جاتا ہے اور چڑیاں توتے کھاتے ہیں تو ان کے پیٹ میں درد نہیں ہوتا۔" "ہاں سیمیں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" نینی نے کہا "تم پکے تازے امرود کھا سکتی ہو۔ کچے خراب امرود کھانے سے طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔"

"دیکھو! وہ سامنے بیج ہے نا! اس پر پھلیاں آرہی ہیں۔ میں نے دیکھا تھا کہ کئی طرح کی چڑیاں ان پھلیوں کو کھاتی ہیں۔ جب وہ بڑی ہو جائے گی تو ان پھلیوں کو بھی ہم چڑیوں کی میز پر رکھا کریں گے۔" اس طرح سیمیں کو چڑیوں کے کھانے کے لیے بہت سی چیزیں مل جاتی تھیں اور چڑیاں ان سب کو خوب مزے سے کھایا کرتی تھیں اور کہتی تھیں۔

"چوں! چوں! ہمیں سیمیں کے دیے ہوئے چاول اور روٹی کے بھورے بہت اچھے لگتے ہیں۔" چھوٹی چھوٹی چڑیاں کہتیں۔

"ٹیں ٹیں! ہمیں بھی کچے امرود اور بیر اچھے لگتے ہیں۔" توتوں نے خوش ہو کر کہا۔

"چھ! چھ ہم کیا کھائیں! ہمارے کھانے کے لیے کیا ہے؟" لال اور بلبل نے کہا۔ "نینی، لال اور بلبل کے کھانے کے لیے کیا ہونا چاہیے۔" سیمیں نے پوچھا۔

"اگر تم ان کے لیے کچا کھوپرا خرید لو تو یہ بہت خوش ہو کر کھائیں گے۔" نینی نے جواب دیا۔

دوسرے روز سیمیں نینی کے ساتھ بازار گئی اور اپنے پیسوں سے ایک کچا کھوپرا خرید لائی۔ مالی نے اس کے دو ٹکڑے کر دیے اور دونوں ٹکڑوں میں ایک ایک سوراخ کر کے ان میں ڈورا ڈال دیا اور میز کے سروں پر لٹکا دیا۔ سیمیں جب لال اور بلبل کو سارا دن ٹکڑوں پر جھولتے اور چونچیں مارتے دیکھتی تو اس کو یہ تماشا دیکھ [illegible] بڑا مزا آتا۔ کبھی کبھی جب چڑیاں اپنے پینے کے پانی میں نہانے لگتیں [illegible] پردوں سے چھپ چھپ کر کے [illegible]

علی ناصر زیدی

ہمدرد انسائیکلوپیڈیا

ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کی طرف سے بچوں کے لیے ایک نہایت خوب صورت رسالہ شائع ہوتا ہے، "نونہال" اس کے صدر مجلس ہیں حکیم محمد سعید صاحب جو حکیم عبدالحمید صاحب (متولی ہمدرد دواخانہ) کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اس کے مدیرِ اعلا ہیں جناب مسعود احمد برکاتی۔ برکاتی صاحب آپ کے "پیامِ تعلیم" کو اتنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ایک ہی خط پر انھوں نے "نونہال" کی ہر چیز شائع کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ ہم تو ان کے شکر گذار ہیں ہی، آپ کو بھی ہونا چاہیے۔

ذیل کا "انسائیکلوپیڈیا" "نونہال" کے اکتوبر ۱۹۸۱ کے شمارے سے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

س: کوئلے سے چلنے والا انجن کس نے ایجاد کیا؟ مہربانی فرما کر تفصیل سے بتائیے۔

قرۃ العین

ج: عام طور پر جیمز واٹ کو اس کا موجد سمجھا جاتا ہے جس کے متعلق وہ روایت مشہور ہے کہ اُس نے ابلتے پانی کی کیتلی کو دیکھا کہ بھاپ کے زور سے اس کا ڈھکنا بار بار اوپر اٹھتا ہے اور اس نے سوچا کہ کیوں نہ اس طاقت کو گاڑی چلانے کے لیے استعمال کیا جائے۔ شروع میں یہ انجن کانوں سے پانی نکالنے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے، پھر جارج اسٹیفنسن کی کوششوں سے انھیں ریلوے گاڑیاں کھینچنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ ریلوے لائن بچھانے کے سلسلے میں بھی اسٹیفنسن نے قابلِ قدر کام کیا۔

س: اٹومک انرجی کس طرح پیدا ہوتی ہے؟

ایس انور خاں

ج: اٹومک انرجی یا جوہری توانائی اس عظیم طاقت کو کہتے ہیں جو ایٹم یا جوہر کو توڑ کر حاصل کی جاتی ہے۔ آپ جانتے ہوں گے کہ ایٹم نہایت مختصر ہونے کے باوجود کئی مختلف ذرات کا ایک مجموعہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس کا ایک مرکز یا قلب ہوتا ہے، جب اسے توڑا جاتا ہے تو اس سے نہایت عظیم توانائی خارج ہوتی ہے جسے جوہری توانائی کہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے نہایت پیچیدہ مشینری استعمال کی جاتی ہے۔

س: کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ موسم کس طرح بدلتے ہیں اور ان کا ہماری زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے؟

مقصود احمد معین اختر

ج: ہماری زمین سورج کے چاروں طرف گھومتی ہے، اور جتنی مدت میں وہ زمین کا ایک چکر لگا لیتی ہے اسے ہم ایک سال کہتے ہیں۔ اس عرصے میں سورج سے زمین کا فاصلہ کم زیادہ ہوتا ہے، لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ جب زمین سورج سے قریب ہو جاتی ہے تو وہاں گرمیوں کا موسم آ جاتا ہے اور جب دُور ہو جاتی ہے تو جاڑے آ جاتے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ موسموں کی تبدیلی کا تعلق زمین کے سورج کی طرف جھکاؤ سے ہے۔ کبھی زمین کا شمالی سرا سورج کی طرف جُھک جاتا ہے تو اُن دنوں شمالی نصف کُرے میں گرمیوں کا موسم ہوتا ہے اور چوں کہ اُن دنوں جنوبی قطب سورج سے دور ہو جاتا ہے اس لیے شمالی نصف کُرے میں جاڑے کا موسم آ جاتا ہے اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا ہے۔ بیچ بیچ میں نرم موسم آتے رہتے ہیں جنھیں ہم بہار اور خزاں کا موسم کہتے ہیں۔

جہاں تک ہماری زندگی پر موسموں کے اچھے بُرے اثر کا تعلق ہے تو آپ آسانی سے اس کا اندازہ لگا لیتے ہیں کہ نہ ہم زیادہ گرمی میں اچھی طرح کام کر سکتے ہیں اور نہ زیادہ سردی میں۔ ہماری زندگی اور ہمارا کام کاج بہت کچھ موسمی حالات پر منحصر ہے۔

س: جب دودھ اُبلتا ہے تو گر جاتا ہے جب کہ پانی اُبلتا ہے تو نہیں گرتا۔ اس کی کیا وجہ ہے، جب کہ دونوں مائع ہیں؟

عظمیٰ تبسم

ج: بلاشبہ دونوں مائع ہیں اور مائع گرم ہو کر پھیلتے ہیں۔ مائع سالمات سے مل کر بنتے ہیں۔ گرمی پا کر یہ سالمات ایک دوسرے سے دور بھاگتے ہیں، لیکن درمیان کا یہ فاصلہ کتنا ہوگا، اس کا انحصار اس مائع کی بناوٹ اور دوسری چیزوں پر ہے۔ پانی ہائیڈروجن اور آکسیجن سے مل کر بنتا ہے جب کہ دودھ میں

پروٹین، چکنائی، پانی اور طرح طرح کے سالمات ہوتے ہیں۔ حرارت
لنے پر دودھ کے اندر جو تبدیلی ہوتی ہے وہ پانی سے مختلف ہے۔
اس کے سالمات کے درمیان جو فاصلہ پیدا ہوتا ہے وہ پانی کے
سالمات کے درمیان فاصلے سے زیادہ ہوتا ہے، لہٰذا دودھ اُبل
کر باہر نکل آتا ہے۔ پانی ایسا نہیں کرتا۔

س: دل اور جگر میں کیا فرق ہے؟ تفصیل سے بتائیے۔
شیخ آفتاب احمد

ج: دل اور جگر میں خاص فرق یہ ہے کہ دل ایک پمپ کا کام
کرتا ہے اور ہمارے سارے جسم میں خون دوڑاتا ہے، جب کہ جگر
ایک غدود ہے بلکہ ہمارے جسم کا سب سے بڑا غدود ہے۔ اس سے
ایک طرح کی رطوبت خارج ہوتی ہے جو غذا کے ہضم ہونے میں
ہماری مدد کرتی ہے۔ اس کے اور بھی کئی فائدے ہیں

س: ایٹم کو اردو میں کیا کہتے ہیں اور ایٹمی توانائی سے کیا مراد ہے۔
اس کے کون کون سے فائدے اور نقصان ہیں؟
طارق جاوید مہدی

ج: اب تو ایٹم کو اردو میں بھی ایٹم ہی کہنے لگے ہیں، لیکن اس کا
اصل اردو ترجمہ "جوہر" ہے۔ اسی سے جوہری توانائی نکلا ہے یعنی
جوہر یا ایٹم کو توڑ کر جو قدرتی زبردست توانائی خارج ہوتی ہے
اسے اٹومک انرجی، ایٹمی توانائی یا جوہری توانائی کہتے ہیں۔ اُسے
سب سے پہلے ایٹم بم میں تباہی پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس
کے بعد بہت سے خطرناک ایٹمی ہتھیار بھی بنا لیے گئے ہیں۔ لیکن
جوہری توانائی کو صنعت و حرفت، زراعت اور طب و جراحی میں
بہت سے اچھے کاموں کے لیے بھی استعمال کیا جا رہا ہے، اور اس
سے بے شمار خدمات لی جا رہی ہیں۔

س: بلی کو رات میں کیسے نظر آتا ہے؟
محمد ظہیر خاں

ج: بلی اور دوسرے گوشت خور جانوروں کو رات کی تاریکی میں
شکار کرنے کے لیے قدرت نے یہ صفت عطا کی ہے کہ ان کی آنکھوں
کی پتلیاں اندھیرے میں خوب پھیل جاتی ہیں اور وہ تاروں کی
روشنی میں بھی وہ چیزیں دیکھ لیتے ہیں جو ہم انسان نہیں دیکھ
سکتے۔

س: تارپیڈو کیا ہوتا ہے اور کیسے کام کرتا ہے
سید سمیع انور نقوی

ج: تارپیڈو وہ لمبا بم ہوتا ہے جو آب دوز کشتی کی مدد سے دشمن
کے بحری جہاز کے نچلے حصے میں مارا جاتا ہے۔ اس کے لگنے سے
جہاز کے پیندے میں بہت بڑا سوراخ ہو جاتا ہے اور وہ غرق
ہو جاتا ہے۔

س: میں نے بعض اخبارات میں تصاویر کے نیچے "ریڈیو فوٹو"
لکھا دیکھا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟

ج: جس طرح ٹیلی وژن کے ذریعے سے آپ اسٹوڈیو میں ہونے
والا ڈراما دیکھ لیتے ہیں، اسی طرح ریڈیائی لہروں کے ذریعے سے
جب کسی منظر کی تصویر اخباروں کے دفتر تک پہنچا دی جاتی ہے
ایسی تصویر "ریڈیو فوٹو" کہلاتی ہے ٹیلی وژن کیمرہ تصویر کو وائرلیس
کے ذریعے سے دوسرے شہروں تک پہنچا دیتا ہے۔ اس طرح اُن کی
اُن میں وہ تصویر دور دراز مقامات تک پہنچ جاتی ہے۔

س: برقی رَو پیدا کرنے والی مچھلی ایل (E E L) کس طرح
برقی رو پیدا کرتی ہے اور اس کی شکل کیسی ہوتی ہے؟
زاہد علی زاہد

ج: ایل کی شکل عام مچھلی جیسی ہوتی ہے، لیکن اس کے جسم میں
قدرتی سیل ہوتے ہیں۔ وہی سیل جنھیں آپس میں جوڑ کر ہم بیٹری
بناتے ہیں اور قوی برقی رو حاصل کرتے ہیں۔ ایل مچھلی بڑے زور
کا جھٹکا دیتی ہے۔ اس کے جسم میں اتنی برقی رَو موجود ہوتی ہے کہ
جب اس کے دُم اور منہ پر برقی تار لگائے گئے اور درمیان میں
بجلی کا بلب رکھا گیا تو وہ بلب روشن ہو گیا۔

س: اگر کوئی تیز آواز پیدا کی جائے تو اس سے ہماری
آنکھیں کیوں جھپکتی ہیں؟

ج: ہماری آنکھیں ہر اس موقع پر جھپکتی ہیں جب کسی قسم
کا خوف غالب ہو، چونکہ تیز آواز سے یکایک گھبراہٹ ہوتی
ہے، اس لیے ہم آنکھیں بھی جھپکتے ہیں اور منہ بھی بناتے ہیں۔

ڈاکٹر عارفہ عرشی

شیراز کا مرد فقیر

کہتے ہیں کسی زمانے میں ایران کے مشہور شہر شیراز میں فردوسی نام کا ایک فقیر رہتا تھا۔ جو اپنا پیٹ پالنے کے لیے لکڑیاں کاٹ کر شہر جا کر بیچ آتا تھا اور اپنی گزر اوقات کرتا تھا۔ بچو، فقیر اس کو نہیں کہتے جو بھیک مانگ کر پیٹ پالیں بلکہ فقیر وہ ہوتے ہیں جو صرف اللہ کے لیے جیتے ہیں اور اس کی رضا پر ہمیشہ راضی رہتے ہیں۔ ہاں، تو بات تھی اصل میں فرخ کی۔ فقیر کے ایک لڑکا تھا جس کو فرخ کہتے تھے اور اسی فرخ کے لیے وہ کچھ نہ کچھ محنت کرتا رہتا۔ فرخ بہت اچھا لڑکا تھا۔ سب پیار سے اس کو شہزادہ فرخ کہتے تھے۔ فرخ تھا تو بہت غریب مگر اپنے ابا کے لیے وہ شہزادہ سے کم نہیں تھا۔ فردوسی اپنی مختصر سی کمائی میں اس کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیے ہوئے تھا۔ محلے کی مسجد میں فرخ پڑھنے جاتا، پھر مکتب چلا جاتا، اور شام کو شہ سواری سپہ گری اور شمشیر زنی سیکھتا۔ غرض کہ فردوسی اپنے فرخ کو غریبی کے دلدل سے نکالنے کی پوری کوشش میں تھا۔ دونوں باپ بیٹے زمانے کے نشیب فراز سے بے نیاز اپنے راستے پر چلے جا رہے تھے کہ اچانک فردوسی پر پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

بادشاہ کی بیٹی اِرَم بہت ناز و نعم میں پلی بڑھی لڑکی تھی۔ بہت دعاؤں کے بعد شہنشاہ نے یہ بیٹی پائی تھی۔ اِرَم بہت خوب صورت اور بہت ذہین تھی مگر اپنی ضد کے سامنے کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ ایک شام وہ اداس سی بیٹھی تالاب کی ہلکی لہروں سے کھیل رہی تھی مگر دل کہیں اور تھا۔ اچانک بادشاہ بیٹی ارم کو ڈھونڈتا ہوا باغ میں نکل آیا اور پوچھا کیا بات ہے تم کیوں اداس بیٹھی ہو؟ ارم خاموش ہو گئی تو بادشاہ اور بے تاب ہو گیا۔ کہنے لگا بتاؤ ارم کیا بات ہے تم کیوں خاموش ہو؟ دیکھو تم خاموش ہو تو لگتا ہے سارا عالم افسردہ ہے۔ جلدی بتاؤ کیا بات ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ تم مطمئن ہو سکو۔ ارم نے کہا بابا! مولوی صاحب کہتے ہیں کہ قیامت میں ہر چیز خاکستر ہو جائے گی، چاند تارے، پہاڑ سب راکھ کے ڈھیر میں بدل جائیں گے، تو ابا برف کا کیا ہوگا؟ برف کیسے جل کر راکھ ہو سکتی ہے؟ بادشاہ اس عجیب و غریب سوال پر دم بخود رہ گیا۔ بچے بھی بعض اوقات کیسے کیسے سوال کر بیٹھتے ہیں جو تجربہ کار بادشاہوں کو بھی لاجواب کر دیتے ہیں! مگر بادشاہ نے کہا، ارم! "تو اب خاموش ہو جاؤ" میں کل صبح تک اس کا جواب ضرور دوں گا۔ تم اپنے چہرے سے فکر و ملال دور کر لو، میں ہر قیمت پر اس کا جواب دوں گا۔ ارم خوش ہو گئی۔ اس کی سوچ کسی حد تک دور ہو گئی۔

بادشاہ نے اپنے خاص مشیروں کو بلا کر اس سوال کا جواب مانگا، مگر سبھی حیران تھے کہ یا الٰہی! یہ برف جل کر کیسے راکھ بن سکتی ہے۔ سبھی کی متفقہ رائے سے بادشاہ ارم کے پاس گیا اور ارم سے کہا "بھئی، مالک حقیقی کی قدرت اس وقت برف کو راکھ کیسے کر دے گی یہ تو وہی بہتر جانتا ہے۔ مگر ارم نے فوراً جواب دیا: ابا جان، آپ غور فرمائیے تو ہر چیز کا انجام سامنے ہے۔ یہاں تک آسمان کے تارے ٹوٹ کر زمین پر گرتے ہیں تو راکھ کے سوا کچھ نہیں ہوتے، تو پھر زمین پر برف کے جلنے میں اور راکھ بننے میں کیا مشکل ہے۔ مگر یہ راکھ کیسی ہو گی؟ میں یہ جاننا چاہتی ہوں۔ بادشاہ لاجواب ہو کر لوٹ آیا مگر اب وہ بھی فکر میں پڑ گیا کہ کیسے اس سوال کا جواب دے

کار مشیروں نے فردوسی کا پتا بتایا اور کہا کہ وہ فقیر ضرور
اس کا جواب بتا سکتا ہے۔ بادشاہ نے اس کو فوراً طلب
کیا۔ فردوسی گھبرا گیا۔ اس نے کہا کہ کیا بات ہے، ایک فقیر
سے بادشاہ کو کیا کام ہو سکتا ہے۔ مجھ کو بے کار پریشان نہ
کرو، مگر سوار زبردستی فردوسی کو لے گئے۔ وہ پہنچا تو دربار
میں بہت اہم لوگ بیٹھے تھے۔ فردوسی سے بتایا گیا تو فردوسی
بھی حیران رہ گیا۔ اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ بادشاہ
نے کہا کہ تم دنیا کے واحد شخص ہو جو میرے اس سوال کا
جواب دے سکتے ہو۔ اگر صبح تک تم نے جواب نہ دیا تو تمھارا
زندہ رہنا بے کار ہے۔

غریب فردوسی سردیوں کی یخ بستہ رات میں محل سے
نکلا۔ اپنے فرخ کی بدنصیبی پر روتا رہا۔ فرخ اپنے ابا کے یوں
رات گئے چلے جانے سے پریشان تھا اور نماز پڑھ کر دعا
مانگ رہا تھا۔ ابا کو آتے دیکھ کر لپٹ گیا۔ ابا! تم کہاں چلے
گئے تھے؟ فردوسی بھی بیٹے سے لپٹ کر خوب رویا۔ دونوں کے
آنسو تھمے تو فردوسی نے فرخ سے سارا قصہ سنایا۔ فرخ نے
کہا "ابا! تم نہ پریشان ہو، میں اس کا جواب دوں گا۔ تم دیکھنا
تو ذرا۔ اب تم آرام سے سو جاؤ۔ مگر فردوسی نا امید تھا۔ وہ
دل ہی دل میں ہنسا۔ فرخ نے کہا کہ ابا جاؤ بادشاہ سے کہو کہ
اگر تمھاری شہزادی کو اس کا جواب چاہیے تو اس کو محل کے
عیش و آرام میں مخملی گدوں اور قیمتی قالینوں پر اس کا جواب نہ
مل سکے گا۔ اس کے لیے اس کو ویرانوں میں آنا ہوگا، فطرت
کے بہت نزدیک، فطرت کے حسن میں انسان کے ہر سوال کا جواب
ہے۔ فردوسی کے اندر اب واپس جانے کی ہمت نہیں تھی
مگر بیٹے کی ضد۔ وہ محل میں گیا اور بادشاہ سے کہا، بادشاہ
مان گیا اور ارم کے سفر کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ارم نے سنا کہ
اس کو محل سے باہر جانا ہوگا تو دل ہی دل میں خوش ہوئی۔

غرض کہ سحر ہونے سے پہلے بڑے بڑے امرا اور دانشمندوں
کا ایک ہجوم، ایک شاندار ہجوم، ارم کو لے کر فردوسی کے گھر
کی جانب چلا۔ فردوسی اور فرخ نے نماز فجر ادا کی اور باہر
نکل آئے۔ بادشاہ اپنی ارم کو لیے ہوئے خود موجود تھا۔ فردوسی
سہم کر پیچھے ہٹ گیا، مگر دبی آواز سے کہا۔ حضور! ایک بچے کو
ایک بچہ ہی مطمئن کر سکتا ہے۔ میرا نو عمر بیٹا ہے، فرخ، وہ
ارم کے سوال کا جواب دے گا مگر اگر ارم مطمئن ہو گئی تو آپ
کو میرے بیٹے کو منہ مانگا انعام دینا ہوگا۔ بادشاہ نے
کہا بتاؤ کیا شرط ہے۔ فردوسی نے کہا کہ آدھی سلطنت فرخ
کو دے دی جائے تو عنایت ہوگی۔ بادشاہ نے کہا "پہلے
سوال کا جواب لاؤ پھر سوچوں گا" بہر حال وہ اپنی بیٹی پر ہر
چیز قربان کر سکتا تھا۔

اتنے میں فرخ سامنے آ گیا۔ اس کی بے پناہ خوبصورتی
دیکھ کر بادشاہ مرعوب ہو گیا۔ فرخ کی کشادہ پیشانی بے شک
تاجدار بننے کے لائق تھی۔

فرخ نے ارم سے کہا کہ شہزادی تم نے سوال کیا ہے تو
تم کو زمین پر آنا ہوگا اور میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر آنکھیں
رکھتی ہو تو یہی فطرت تمھارے سوال کا جواب دے گی،
ایسا جواب جس کے بعد شک کی کوئی گنجایش نہیں۔ ارم آہستہ
آہستہ اونٹ سے اتری۔ فرخ نے بادشاہ، ارم اور سبھی لوگوں
کو مخاطب کر کے کہا کہ پھولوں پتیوں اور گھاس پر کیا چیز ہے۔
لوگوں نے کہا یہ شبنم ہے۔ سفید سفید لباس پہنے سارا جنگل
شبنم سے ڈھکا تھا اور سفید براق سی اوس واقعی برف
کی راکھ لگتی تھی۔ ارم نے اتنا صاف اور سیدھا جواب دیکھ
کر خدا کا شکر ادا کیا۔ ارم بے اختیار سجدہ میں گر گئی۔
اور پھر فرخ نے ارم کو یہ بھی سمجھایا کہ ابھی سورج کی کرنیں
آ کر اس اوس کو بھی غائب کر دیں گی، بے شک دنیا کی ہر چیز
فانی ہے خواہ وہ بظاہر کتنی ہی مضبوط اور خوبصورت کیوں نہ ہو۔
پیاری ارم خدا کو انسانوں کے دل اور عمل میں تلاش کرو تو تم کو
زیادہ خوشی اور اطمینان ہوگا۔

فرخ کی ذہانت دیکھ کر سبھی لوگ دم بخود رہ گئے اور بہت
خوش ہوئے، بادشاہ کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس نے فیصلہ
سنایا کہ ارم کی شادی فرخ سے ہوگی۔ فردوسی کا خواب پورا ہوا۔
اس نے اپنے بیٹے کے سر پر ایران کی بادشاہت کا تاج
دیکھا۔

مولانا حسرت موہانی

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

آج ہمارا ملک ہندستان آزاد ہے۔ لیکن یہ آزادی آسانی سے نہیں ملی۔ اس کے لیے ہمارے بزرگوں نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جنھوں نے وطن کی آزادی کے لیے عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر محنت و مشقت کی ہے، جیل کی سختیاں جھیلی ہیں اور انگریزی حکومت کے مظالم برداشت کیے ہیں۔ انھیں مجاہدینِ آزادی میں سے ایک مولانا حسرت موہانی بھی ہیں جنھوں نے ہندستان کو آزاد کرانے میں تن من دھن سے حصہ لیا ہے۔ حسرت موہانی کو عام طور پر لوگ ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن وہ ایک عظیم مجاہد آزادی بھی تھے جنھوں نے وطن کو آزاد کرانے کے لیے بڑی قربانیاں دیں۔ مولانا حسرت ۱۸۸۱ء میں اترپردیش کے ایک چھوٹے سے قصبے موہان (ضلع اناؤ) میں پیدا ہوئے تھے۔ اسی نسبت سے پچھلے دنوں یعنی ۱۹۸۱ء میں ان کی ولادت کا سو سالہ جشن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔

مولانا حسرت موہانی جن کا اصل نام سید فضل الحسن تھا، بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے میں بڑے تیز تھے۔ میٹرک کا امتحان انھوں نے امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور پورے صوبے میں اوّل آئے۔ اس کے بعد سرسید کے قائم کیے ہوئے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (موجودہ علی گڑھ یونی ورسٹی) میں داخلہ لیا۔ کالج کا ماحول اس وقت انگریزی تہذیب و تمدن سے کافی متاثر تھا۔ طالب علم نہ صرف انگریزی تعلیم حاصل کرتے بلکہ انگریزی وضع قطع اختیار کرنے کی بھی کوشش کرتے تھے۔ حسرت کا طرزِ زندگی ان سب سے الگ تھا۔ وہ نہ صرف لمبی داڑھی رکھتے تھے بلکہ پرانی وضع کا انگرکھا اور پاجامہ بھی پہنتے تھے۔ کالج میں داخلے کے بعد بھی اگرچہ ان کے ساتھیوں نے ان کا بہت مذاق اڑایا اور اکثر چڑھانے کی غرض سے انھیں "خالہ جان" کہہ کر بھی پکارا، مگر حسرت نے اپنا انداز نہیں بدلا۔ وہ ساری عمر اسی وضع قطع پر قائم رہے جو انھوں نے ابتدا میں اختیار کی تھی۔

اپنی لگاتار محنت اور کوشش کے سبب حسرت طالب علمی کے دنوں میں ہی کافی مشہور ہو گئے۔ انگریزوں کے خلاف لڑنے کا جذبہ ان کے دل میں شروع سے ہی موجود تھا۔ حالانکہ اینگلو اورینٹل کالج کا ماحول ایسا تھا جس میں انگریزدانی

جنگ آزادی کے مجاہد اور مشہور شاعر حسرت موہانی

سوچنے کی کوئی گنجایش نہیں تھی لیکن حسرت کے
وطن کی محبت کی شمع ہمیشہ روشن رہی۔ بی۔اے
کرنے سے پہلے ہی وہ ہندستان کے سیاسی معاملات
میں دلچسپی لینے لگے اور آزادی کا نعرہ بلند کرنے کے
انھیں تین بار کالج ہوسٹل سے نکال بھی دیا گیا۔
ان کے عزم میں کمی نہ آئی۔ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے
مخالفت کے باوجود بی۔اے پاس کیا لیکن جب
پرنسپل ماریسن نے انھیں کالج میں دوبارہ داخلہ لینے
اجازت نہ دی تو انھیں پڑھائی کا سلسلہ ختم
کرنا پڑا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب علی گڑھ کالج سے بی۔اے
پاس کرنے والے نوجوانوں کو انگریز حکومت سے تھوڑی سی
[illegible]داری ظاہر کرتے ہی فوراً اعلا سرکاری نوکری مل
جاتی تھی۔ لیکن حسرت کو تو انگریز سرکار کے خلاف
لڑائی کرنی تھی۔ وہ سرکاری نوکری کیوں اور کیسے
[illegible] کرتے؟ اس لیے انھوں نے انگریزوں کے خلاف اپنے
[illegible]ت کا اظہار کرنے کے لیے یکم جولائی ۱۹۰۳ء سے
[illegible] ماہنامہ رسالہ "اردوے معلّیٰ" جاری کیا۔ اس میں
[illegible]زی حکومت کے خلاف مضمون شائع کرنے کے سبب
حسرت کو جیل بھی جانا پڑا اور مئی ۱۹۰۸ء سے ستمبر
[illegible] تک پرچہ بند رہا۔ پھر وہ کچھ مہینوں یا برسوں
[illegible] وقفے سے مارچ ۱۹۴۲ء تک کسی نہ کسی طرح نکلتا رہا
[illegible] آخرکار مالی دشواریوں کے سبب بند ہو گیا۔ لیکن
[illegible] ہندستان کی آزادی کی لڑائی میں جس طرح
[illegible] وہ تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جسے بھلایا نہیں
جا سکتا۔

حسرت نے شاعری اپنی ابتدائی زندگی میں ہی
[illegible] کی تھی لیکن ابتدائی غزلوں کا جو رنگ تھا وہ رفتہ
[illegible] گیا۔ اور جب وہ وطن کی محبت دل میں بسائے
[illegible] کے خلاف میدان عمل میں آئے تو شاعری میں
[illegible] سیاسی حالات اور وطن پرستی کے جذبات کو نمایاں

طور پر پیش کرنے لگے۔

حسرت بڑے مضبوط ارادے کے مالک تھے۔ وہ ہر
معاملے میں اپنی ایک مستحکم رائے رکھتے تھے جس کو بدلنا
آسان نہ ہوتا تھا۔ خواہ کوئی بھی موقع ہو، بڑے سے بڑے
حاکم کا دربار ہو، یا عزیز ترین دوست کا گھر، وہ ہمیشہ سچی
اور کھری بات کہا کرتے تھے۔ اکثر لوگوں کو ان کی باتیں بری بھی
لگتی تھیں اور وہ ان کی مخالفت پر آمادہ ہو جاتے تھے
لیکن حسرت کے مزاج پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ اس
سلسلے میں چند واقعات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔
تحریکِ خلافت کے باضابطہ آغاز سے پہلے کچھ اہم مسلمانوں
کا ایک وفد وائسرائے سے ملنے دہلی گیا۔ اس وفد میں
حسرت کے علاوہ مولانا محمد علی اور شوکت علی، حکیم
اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور مولانا سید سلیمان ندوی
وغیرہ شامل تھے۔ جب ایڈریس پیش ہو چکا اور وائسرائے
اس کا جواب دے چکے تو وہ وفد کے تمام ممبروں سے
باری باری ہاتھ ملا کر رخصت ہونے لگے۔ تمام لوگوں
نے ان سے ہاتھ ملایا لیکن جب حسرت کی باری آئی تو
وہ وائسرائے سے ہاتھ ملائے بغیر کمرے سے باہر نکل
آئے۔ اسی طرح کان پور کے مچھلی بازار کی مسجد کا ایک
حصہ جب انگریزوں نے شہید کر دیا تو مسلمانوں نے
شدید احتجاج کیا۔ انگریز حکومت نے اس احتجاج کے
سبب اُس حصے کی نئے سرے سے تعمیر کا ارادہ کیا تو
مسلم لیگ نے ایک ریزولیوشن کے ذریعے وائسرائے
کا شکریہ ادا کیا۔ مختلف جماعتوں کے لوگوں نے ریزولیوشن
کی تائید کی لیکن مولانا ان چند لوگوں میں تھے جنھوں نے اس
کے خلاف رائے دی تھی۔ حصولِ آزادی کے بعد بھی
مولانا نے حق گوئی کا یہ انداز باقی رکھا۔ چنانچہ آزاد
ہندستان کی اسمبلی کے [illegible] جنھوں نے
نئے دستور کی خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
اس پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ مولانا
وہ پہلے قومی رہنما تھے جنھوں نے اپنے دستور کی مخالفت

کے باوجود "مکمل آزادی" کا ایک ایسے وقت میں مطالبہ کیا جب کہ اس کا تصور بھی محال نظر آتا تھا۔

حسرت موہانی میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو ایک سچے اور پکے مسلمان میں پائی جاتی ہیں۔ وہ ایک مردِ قلندر تھے، آزاد اور بے پروا۔ انھوں نے دنیاوی مال ودولت اور عیش وآرام کی کبھی پرواہ نہ کی۔ ان کی زندگی سادگی اور حق گوئی کا نمونہ تھی۔ خدا کے بھیجے ہوئے احکامات پر وہ ہمیشہ عمل کرتے رہے۔ ساتھ ہی خدا کی مخلوق سے محبت بھی ان کی عادت رہی۔ دوسرے بہت سے صوفیوں کی طرح وہ ہر مذہب کے ماننے والوں سے پیار کرتے اور ان کے بزرگوں کی عزت کیا کرتے تھے۔ مولانا نے فریضۂ حج بھی ادا کیا اور کئی بار انگلستان بھی گئے لیکن وہ عام طور پر سفر کے دوران کم سے کم خرچ کرتے تھے اور فضول خرچی سے دور رہا کرتے۔

۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو حسرت کا انتقال ہوگیا۔ انھوں نے ایک غلام ہندستان میں آنکھیں کھولی تھیں مگر جب ان کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوئیں تو ہندستان آزاد ہو چکا تھا اور اسے آزاد کرانے میں خود ان کا بھی ہاتھ تھا۔ یہ بات صرف ان کے لیے ہی نہیں بلکہ ہمارے لیے بھی باعثِ فخر رہی ہے۔

علم

جس طالب علم میں ادب نہیں وہ ایسا پھول ہے جس میں بُو نہ ہو۔
علم ایک بے بہا خزانہ ہے۔ (حضرت علیؓ)
علم لازوال دولت ہے۔ (سر سید احمد خاں)
علم کے لیے مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کنول کے لیے پانی۔ (تلسی)
علم ایسا [illegible] (سری)
[illegible] (حضرت علیؓ)
[illegible]
علم ایک ایسا [illegible] نہیں جاتا۔

[illegible] تاج آباد، ناگپور ۹

(بقیہ صفحہ ۱۲)

سیمیں خوب ہنستی۔ کبھی وہ دیکھتی کہ چڑیاں نہاتے یا کھانا کھاتے وقت لڑ پڑتیں، خوب ایک دوسرے کے چونچیں مارتیں، دتیں اور لڑتے لڑتے گر بھی پڑتیں تب سیمیں تالیاں بجاتی اور خوب زور زور سے ہنستی۔ وہ کہتی تھی کہ مجھے اپنا چڑیوں کی میز بہت اچھی لگتی ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ بھی میرا ایک کھلونا ہے۔ امّی سے پوچھتی۔ "امی! کیا چڑیاں بھی اپنی میز سے خوش ہوتی ہیں؟"

"ہاں سیمیں کیوں نہیں! وہ تو بہت خوش ہوتی ہیں۔" اس کی امی جواب دیتیں "اور دیکھنا جب پھولوں کا موسم آئے گا تو یہ چڑیاں خوش ہو کر تم کو گانا بھی سنایا کریں گی۔

اور بچّو! اگر تم بھی سیمیں کی جیسی چڑیوں کی میز صحن کے ایک کونے میں لگا دو اور اس پر بچا ہوا کھانا رکھ دو اور کسی برتن میں پانی بھر کر رکھ دو تو تم کو بھی ان کا تماشا دیکھنے میں بڑا مزا آئے گا اور پھر موسم بہار میں جب پھول کھلیں گے تو شاید وہ تم کو گانا بھی سنا [illegible]

فارم IV حسب قاعدہ
بابت پیامِ تعلیم، نئی دہلی ۲۵

(۱) مقام اشاعت: جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵ ۱۱
(۲) وقفہ اشاعت: ماہنامہ
(۳) پرنٹر کا نام: سید احمد وکلی ہندستانی۔ پتہ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵-۱۱
(۴) پبلشر کا نام: " " "
(۵) اڈیٹر کا نام: " " "
مالکان کے نام اور پتے۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
چیرمین: پروفیسر محمد مجیب، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵-۱۱
۱۔ ڈائرکٹر: سید مجتبیٰ حسین زیدی " "
۲۔ " معین الدین حارث پاشن والا محل، کناٹ روڈ بمبئی ۲
۳۔ " نواب اقبال محمد خاں، کف پریڈ کولابہ بمبئی ۵
۴۔ " کرنل بشیر حسین زیدی جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ [illegible] بلڈنگ، سی پی ٹینک بمبئی ۴
میں سید احمد [illegible] تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

عبد الملک فاروقی

شہزادہ رُمّان

(سلسلے کے لیے دسمبر کا شمارہ دیکھیے)

مصر کا شہزادہ بھی ان سب باتوں سے لاعلم اپنے میزبان شاہ کا منہ تک رہا تھا۔ عقل مند وزیر زادہ حارث یہ سب باتیں جانتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ محفل ٹھنڈی ہوتی جا رہی ہے تو فوراً اپنی جگہ پر کھڑا ہوا اور بولا "معزز حاضرین ہم بے حد شکر گزار ہیں کہ آپ سب نے ہمارے شہزادے کی رسمِ تاجپوشی میں شرکت کی۔ میں مصر کے شہزادے معاذ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ یہ مچھلی کس سمندر سے لائے ہیں اور اس میں کیا خصوصیت ہے؟" وزیر زادہ یہ کہہ کر بیٹھ گیا محفل میں موجود سبھی لوگوں نے دوبارہ دلچسپی لینا شروع کر دی۔ مصر کا شہزادہ معاذ اپنی جگہ پر کھڑا ہوا اور بولا۔ "میرے عزیز دوست شہزادہ رمّان اور وزیر زادے حارث یہ کہانی جب کی ہے جب میری تاجپوشی کی رسم ادا کی جانے والی تھی۔ پورے ملک میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں کہ اچانک میرے والد بیمار پڑ گئے اور ان کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ ملک کے سبھی بڑے بڑے حکیموں نے دیکھا اور دوائیں دیں مگر بے فائدہ، آہستہ آہستہ ان کی آنکھوں کی بینائی بالکل چلی گئی۔

ان ہی دنوں کی بات ہے کہ قاہرہ میں ایک بہت بڑے حکیم عراق سے آئے ہوئے تھے وہ یہاں صرف سو دن کے لیے سیر و تفریح پر آئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ وہ ابا جان کی آنکھوں کی روشنی واپس لا سکتے ہیں، مگر دوستو! انھوں نے جو شرط رکھی تھی وہ بڑی سخت تھی، ان کی شرط یہ تھی کہ اگر کوئی انھیں عربی سمندر میں

انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ ہمدرد نگر نئی دہلی ۶۲

پائی جانے والی سرخ مچھلی لادے تو وہ اس مچھلی کے خون سے ایک کاجل تیار کریں گے جو بادشاہ سلامت کے لگایا جائے گا اس کاجل سے ان کی بصارت ضرور لوٹ آئے گی' میں نے پوچھا کہ اگر پھر بھی بینائی واپس نہ آئی تو۔ "میرا سر قلم کر دیا جائے" اس عراقی حکیم نے فوراً جواب دیا۔ میں اسی روز ماہر تیرنے والوں اور کشتی چلانے والوں کو لے کر عربی سمندر کی طرف روانہ ہو گیا۔ تین مہینے تک ہم نے دن رات سرخ مچھلی کی تلاش جاری رکھی۔ ہم نے سیکڑوں مچھلیاں پکڑیں۔ مگر ان میں وہ مچھلی نہ تھی۔ آخر کار سو دن بھی پورے ہو گئے۔ ہم نے سوچا کہ اب مچھلی کی تلاش بیکار ہے، اب اگر مچھلی مل بھی جائے تو وہ بیکار ہے، کیوں کہ اسے مصر تک لے جانے میں بہت وقت لگ جائے گا اِس عرصہ میں عراقی حکیم جا چکا ہو گا۔ پھر بھی ہمیں جانے سے پہلے ایک آخری کوشش اور کر لینی چاہیے۔ یہ سوچ کر میں نے آخری بار سمندر میں جال ڈالا۔ اِس مرتبہ وہ سرخ مچھلی ہمارے جال میں پھنس گئی۔ میں نے کہا کہ قسمت نے ہمارا ساتھ بھی دیا تو کب! جب سارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ خیر میں اسے مرتبان میں بند کر کے ابا حضور کی خدمت میں لے جاؤں گا تاکہ انھیں معلوم ہو کہ ہم نے اپنی پوری کوشش کی، جب میں اس مچھلی کو مرتبان میں رکھنے لگا تو مچھلی میری طرف ایسے دیکھ رہی تھی جیسے وہ اپنی جاں بخشی کے لیے التجا کر رہی ہو۔ میرا دل پسیج گیا۔ میں نے سوچا کہ اب مچھلی کو لے جانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ عراقی حکیم جا چکا ہو گا۔ بے چاری مچھلی کی جان مفت میں جائے گی۔ یہ سوچ کر میں نے وہ سرخ مچھلی واپس سمندر میں پھینک دی۔

جب میں مصر پہنچا تو میں نے ابا جان کو اپنی سرگذشت سنائی۔ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ میں نے مچھلی پکڑ لی تھی پھر واپس سمندر میں ڈال دی تو انھیں بے حد غصہ آیا اور انھوں نے جلّاد کو حکم دیا کہ وہ میری گردن اڑا دے۔ جب اس بات کی خبر میری ماں تک پہنچی تو انھوں نے بہت راز داری سے جلّاد کو بلایا اور اس سے کہا کہ اگر تم شہزادے کو چھوڑ دو اور اسے دور چلا جانے دو تو میں اس کے لیے تم کو بے حد انعام دوں گی۔ جلّاد راضی ہو گیا۔ اس نے مجھ کو شہر چھوڑنے میں مدد دی۔ میں ایک جہاز میں سوار ہو گیا میری ماں ملکۂ عالیہ نے بہت سی دعاؤں کے ساتھ مجھ کو رخصت

کیا اور ایک نصیحت خاص طور پر کی: "بیٹیا لالچی اور خود غرض لوگوں سے دور رہنا۔ تم ایسے لوگوں کو ملازم رکھنا جو مہینے کے آخر میں پیسے طلب کریں۔ ایسے لوگوں کو ہرگز ملازم نہ رکھنا جو روز کے روز یا ہفتے کے آخر میں پیسوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔"

امی جان کی یہ نصیحت مجھے بہت عجیب معلوم ہوئی۔ مگر مجھ کو بہت دفعہ تجربہ ہو چکا تھا کہ وہ بہت عقلمند ہیں ان کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں ہوتی۔ آخر کار میں روانہ ہو گیا اور کئی دن تک سفر کرتا رہا، چلتے چلتے میں اس جگہ پہنچ گیا جس جگہ کی نشان دہی میری ماں نے کی تھیں۔ یہ ایک خوب صورت جزیرہ تھا۔ مجھ کو یہ جگہ بے حد پسند آئی اور میں نے اس جزیرے میں ایک حویلی خرید لی۔ بہت سے لوگ میرے پاس ملازمت کے لیے آئے۔ ہر آدمی یہی چاہتا تھا کہ اسے روز کے روز یا ہفتے کے آخر میں پیسے چاہییں۔ میں نے ان میں سے کسی کو بھی نوکری نہیں دی۔ آخر نوکری کی تلاش میں میرے پاس ایک دیہاتی آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ تم تنخواہ کب چاہتے ہو تو اس نے جواب دیا" سرکار! مجھے روپے پیسے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ اگر آپ مجھے ایک پیسہ بھی نہ دیں تو بھی مجھے کوئی شکایت نہیں ہو گی، دیہاتی کا یہ جواب سن کر میں بہت خوش ہوا اور میں نے اس کو نوکر رکھ لیا۔

جزیرے کے جس حصّے پر میں رہتا تھا وہ بہت آباد اور پر رونق تھا لیکن جزیرے کا دوسرا حصہ بالکل ویران اور سنسان تھا۔ وہاں ایک بلا رہتی تھی جس نے بہت سے انسانوں، حیوانوں کو ہڑپ کر لیا تھا۔ جزیرے کے حاکم نے کئی مرتبہ بلا کو مارنے کے لیے سپاہی بھیجے، مگر وہ رات کو سو جاتے اور بلا انھیں کھا جاتی۔ آخر کار جزیرے کے حاکم نے یہ اعلان کرا دیا کہ جو آدمی اس سمندری بلا کو ہلاک کرے گا اسے بے حد انعام دیا جائے گا، میرا دیہاتی ملازم جو عربی تھا اس نے جب یہ اعلان سنا تو وہ جزیرے کے حاکم کے پاس گیا اور اس سے کہا:" اگر میرا آقا اس سمندری بلا کو ہلاک کر دے تو اسے آپ کیا انعام دیں گے؟" حاکم نے کہا" میں اسے منھ مانگا انعام دوں گا۔"

اس رات دیہاتی نے اپنے جسم پر ایسا تیل ملا جس کی بو سے نیند نہیں آتی ہے۔ تیل لگا کر وہ ایک بڑے پتھر کے پیچھے چھپ گیا اور سمندری بلا کا انتظار کرنے لگا۔ آدھی رات کے وقت سمندر میں ہلچل ہوئی۔ کچھ دیر بعد ایک زبردست بلا سمندر سے باہر نکلی اس کا سر پرندے کا تھا۔ جسم ہاتھی کی طرح بھاری بھرکم، دم سانپ جیسی۔ وہ بلا بہت آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میدان کی طرف بڑھنے لگی۔ دیہاتی اس سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ جوں ہی بلا اس کے پاس سے گزری۔ دیہاتی نے بڑی پھرتی سے اپنا خنجر بلا کے سینے میں گھونپ دیا۔ بلا نے ایک زبردست چیخ ماری اور وہیں تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ دیہاتی کو جب یقین ہو گیا کہ اس نے بلا کو ہلاک کر دیا ہے تو وہ اس کے قریب پہنچا اور اس نے بلا کے کان کاٹ لیے اور میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ" آپ جا کر جزیرے کے حاکم سے کہہ دیجیے کہ آپ نے سمندری بلا ہلاک کر دی ہے۔" میں نے اس سے کہا،" واہ میں یہ جھوٹ کیوں بولوں؟ سمندری بلا تم نے ہلاک کی ہے میں نے نہیں!" عرض دیہاتی میری منت سماجت کرنے لگا وہ بولا" آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے؟ جیسے میں کہتا ہوں آپ ویسے ہی کیجیے اس میں ہم دونوں کا فائدہ ہے،" آخر میں اس کی بات مان گیا۔ اور میں نے حاکم کے سامنے جا کر کہا کہ اس بلا کو میں نے ہلاک کر دیا ہے۔ حاکم اس خبر کو سن کر بہت خوش ہوا اس نے میرے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کی خواہش کی مگر میں نے بہت صفائی سے انکار کر دیا۔ میں نے کہا کہ میں ایک مسافر ہوں مجھے ابھی بہت دور جانا ہے اگر آپ مجھے ایک صرف تیز رفتار جہاز مہیا کر دیں تو یہی آپ کی عنایت ہو گی۔ حاکم نے میرے لیے ایک جہاز کا بندوبست کر دیا۔ جب میں اور دیہاتی جہاز پر سوار ہوئے تو اس کی سجاوٹ اور اس میں لدے ہوئے قیمتی سامان، ہیرے جواہرات، کے ڈھیر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ جب ہمارا جہاز وہاں سے روانہ ہوا تو بے شمار لوگ ہمیں الوداع کہنے کے لیے بندرگاہ پر موجود تھے۔ حاکم کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمارا جہاز جزیرہ چھوڑ کر سمندر کی موجوں کے رحم و کرم پر تھا۔ ہمارا جہاز کئی روز تک چلتا رہا آخر وہ ملکِ روم کی بندرگاہ میں جا پہنچا۔ میں تو جہاز ہی پر رہا۔ عرب دیہاتی اس جگہ کی معلومات حاصل کرنے کے لیے بندرگاہ پر اترا۔ کافی دیر تک ادھر ادھر گھومنے پھرنے کے بعد وہ واپس لوٹا۔ اس نے کہا

یہاں کے بادشاہ کی بیٹی بہت خوبصورت ہے اور حسن و جمال میں اپنا ثانی نہیں رکھتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ کی شادی اسی شاہزادی سے ہو جائے۔" میں نے بدو کی بات بہت غور سے سنی۔ کچھ زیورات اور ہیرے جواہرات لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

یہ سب تحفے روم کے بادشاہ کے قدموں میں رکھ دیے۔ روم کا بادشاہ بہت خوش ہوا اور مجھ سے بولا، "مانگو کیا مانگتے ہو، میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "عالیجاہ! غلام کی صرف یہ خواہش ہے کہ باقی زندگی آپ کے قدموں میں بسر کروں۔ سرکار مجھے اپنی فرزندی میں لے لیجیے!" یہ سن کر دربار میں سناٹا چھا گیا۔ بادشاہ بولا "تم یہاں اجنبی ہو تم کو نہیں معلوم کہ میری بیٹی کے ساتھ کیا بدقسمتی ہے۔ اس سے پہلے اس کی شادی ایک سو ننانوے بار ہو چکی ہے۔ اس کے شوہروں میں کوئی بھی دس گیارہ گھنٹے سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ ابھی موقع ہے کہ تم ایک بار پھر غور کر لو۔" یہ سن کر مجھے جھرجھری آ گئی میں نے سوچا شادی کا خیال چھوڑ دینا چاہیے۔ لیکن عرب دیہاتی میرے پیچھے ہی بیٹھا ہوا تھا میرے کان میں بولا "سرکار! انکار مت کیجیے اور بادشاہ کی باتوں سے مت ڈریے"، میں نے روم کے بادشاہ سے کہا "عالی جاہ! قسمت ایک نہ ایک دن ضرور بدلتی ہے۔ ایسی خوب صورت اور عالی قدر شہزادی کے لیے اگر میری جان بھی جاتی رہی تو کوئی پرواہ نہیں"، روم کا بادشاہ مجبور ہو گیا اور بولا۔ "ٹھیک ہے جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔ میں آج ہی شام کو تمہاری شادی شہزادی سے کر دوں گا۔"

اور ہوا بھی ایسا ہی کہ شادی کی رسم پوری ہونے کے بعد جب میں اپنی بیوی کے کمرے میں گیا تو اس رات چودھویں کا چاند پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ میں کھڑکی کھول کر باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ میرے کمرے کی دیوار کے باہر گڑھا کھودنے میں مصروف ہیں۔ میں حیران ہو کر سوچنے لگا کہ آخر یہ گڑھا کھودنے کا کون سا وقت ہے؟ اچانک بجلی کی طرح یہ خیال میرے ذہن میں کوندا کہ یہ لوگ میری قبر کھود رہے ہیں، یہ خیال آتے ہی میرے حواس جاتے رہے۔ عین اسی وقت شہزادی یعنی میری بیوی کی منھ سے ایک سانپ اچھل کر نکلا، اور لہراتا بل کھاتا میری طرف لپکا، عرب دیہاتی ایک جگہ چھپا بیٹھا تھا اور یہ سب دیکھ رہا تھا، جوں ہی سانپ اس کے پاس سے گزرا اس نے تلوار مار کر سانپ کے دو ٹکڑے کر دیے۔

اگلی صبح بادشاہ میری لاش لینے کے لیے پہنچا جب اس نے دیکھا کہ میں زندہ سلامت ہوں تو وہ ہکا بکا رہ گیا، اس نے پوچھا، "کیا میری نظر دھوکا تو نہیں کھا رہی ہے؟؟" میں نے کہا "عالی جاہ! آپ کا یہ خادم خدا کے فضل و کرم سے زندہ اور صحیح و سلامت ہے۔ اب آپ گورکن کو حکم دیں کہ وہ قبر میں اس سانپ کو دبا دے" بادشاہ خوش ہو کر بولا "میرے عزیز! جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا"، اس دن کے بعد شہزادی ہنسی خوشی میرے ساتھ رہنے لگی۔

دن ہوا کے مانند اڑتے چلے جا رہے تھے، کبھی میں سمندر کی سیر کو نکل جاتا، کبھی شکار کھیلنے جنگل چلا جاتا، رات کے وقت موسیقی کی محفل جمتی میری بیوی شہزادی بربط بجاتی اور میں اپنی زندگی کے واقعات سناتا، ان سب جلسوں اور محفلوں میں عرب بدو ہمارے ساتھ رہتا۔ ہماری محفل میں وہ بھانت بھانت کے قصے سناتا، کبھی سمندر میں بسنے والے جانوروں کے بارے میں کبھی سمندر کے نیچے رہنے والی دنیا کے بارے میں۔

ایک روز مصر سے ایک قاصد آیا وہ میری والدہ کا پیغام لایا تھا جس میں لکھا تھا "شہزادے! تم فوراً مصر واپس چلے آؤ، تمہارے والد تم سے راضی ہو گئے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے وطن واپس آؤ اور حکومت سنبھالو"، میں نے اپنے خسر شاہ روم سے وطن جانے کی اجازت مانگی، جب بادشاہ روم کو یہ معلوم ہوا کہ اس کا داماد کوئی معمولی آدمی نہیں بلکہ مصر کا شہزادہ ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے ایک شاندار جہاز تیار کرایا۔ جب سفر کا سارا انتظام مکمل ہو گیا تو اس نے بہت دھوم دھام سے ہم چاروں کو رخصت کیا یعنی میں، میری بیوی، عرب بدو، اور قاصد، جب ہم سب مصر پہنچے تو ہمارا بہت شاندار استقبال ہوا، مصر پہنچ کر میں نے والد کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ ملک پھر سے خوشحال ہو گیا، عرب بدو حکومت کے کاموں میں بہت مشورے دیتا۔"

(اس کے بعد کیا ہوا، یہ جاننے کے لیے اگلا شمارہ پڑھنا نہ بھولیے)

دسمبر ۱۹۸۱ء کا پیام تعلیم میرے سامنے ہے۔ اور میں ان تصویروں کو دیکھ رہا ہوں جو پیام تعلیم کے سرورق پر چھپی ہیں۔ میرے خیال میں اُس جگہ جو بھی تصویر چھاپی جائے وہ پاسپورٹ سائز میں ہونی چاہیے دوسرے وہ تصویر نہیں چھپنی چاہیے جس میں ایک سے زیادہ ہوں اب آپ ہی دسمبر کے پرچے کو دیکھ لیں اس میں ایک تصویر ایسی ہے جس میں پندرہ بچے ہیں اور نام صرف ایک بچے کا دیا ہے وہ بچہ کون سا ہے۔ تیسری بات ان بچوں کی تصویر چھپنی چاہیے جن کی عمر بارہ سے زیادہ کی نہ ہو۔ سلسلہ ننھے فنکار اچھا ہے اگر فنکار ننھے ہی ہوں۔

آپ نے ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس میں مسلمان مجاہدین کے حالات ہوتے تھے کیا وہ بند کر دیا اُسے جاری رکھیے دوسرے آج کا زمانہ سائنس کا ہے ہندستان میں جو مسلمان سائنس داں ہیں ان کے حالات سے پیام تعلیم کے پڑھنے والے بچوں کو ضرور واقف کرائیں۔

احمد مصطفٰے خاں
مالیر کوٹلہ

آج ہی میں پیام تعلیم کا تازہ شمارہ اپنے استاد جناب رضوان انصاری (کلٹی) کے پاس دیکھا۔ پڑھنے کو دل مچل گیا۔ مجھے بڑی حیرت ہے میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اتنے اچھے رسالے [illegible] کر دکھایا جنھوں نے بے حد پسند کیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے مبارک باد دوں خوشی سے ہاتھ کانپ رہے ہیں اسی لیے اب قلم روک رہا ہوں۔ سبھی پیامی بھائی بہنوں کو مبارک باد

شہنواز انجم
بی۔ این۔ آر دسیمل گرام، کلٹی۔

میں "پیام تعلیم" ہر ماہ پابندی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہوں جو ماسٹر محمد غیاث الدین تاج صاحب کے ذریعے مل جاتا ہے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے ماہ نومبر ۸۱ء سے چار صفحہ کا اضافہ کیا ہے ماہ دسمبر ۱۹۸۱ء کا رسالہ نظر نواز ہوا اس رسالے میں اے۔ کے گھوش صاحب کی کہانی "بٹوارہ" اور محترمہ آصفہ مجیب صاحبہ کی کہانی "نیکی کا بدلہ" محمد غیاث الدین تاج صاحب کی کہانی "پرانی قبر" بہت پسند آئی۔

محمد ظہیر الدین شوخ، کیراف محمد امام الدین
محلہ۔ پتیانہ۔ پوسٹ کلٹی ضلع بردوان، بنگال

"پیام تعلیم" مجھے بے حد پسند ہے۔ جب میں لوگوں کی کہانیاں پیام تعلیم میں پڑھتا ہوں تو میرے دل میں بھی خواہش ہوتی ہے کہ آپ کے رسالہ میں ایک کہانی بھیجوں۔ بہت سوچ سمجھ کر ایک کہانی "عقلمندی" "بچوں کی کوششیں" میں شائع کرنے کے لیے بھیج رہا ہوں۔

امید ہے آپ اسے پیام تعلیم میں ضرور جگہ دیں گے۔ مجھے انتظار رہے گا۔

معراج الدین
مولانا آزاد ہائی اسکول اورنگ آباد

پیام تعلیم کا ہر مہینے باقاعدہ مطالعہ کرتا ہوں۔ پیام تعلیم بچوں کا ہی نہیں۔ بڑوں کا بھی محبوب رسالہ ہے۔ میری دعا ہے کہ پیام تعلیم دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین۔

شہباز
بمبئی

پیام تعلیم کے ذریعے آپ سے متعارف ہوں۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ میں نے پھول سے پڑھنا سیکھا اور پیام تعلیم

سے لکھنا سیکھا۔ اُس وقت پیام تعلیم کے چھوٹے چھوٹے مقابلوں میں بھی حصہ لیا اور جامعہ کی کتابیں خاص کر تعلیمی کتابیں جیسے باغ بانی پروجکٹ سے بہت کچھ سیکھا۔

آپ جس تہذیبی اور مذہبی پس منظر میں پیام تعلیم کو آگے بڑھا رہے ہیں وہ قابلِ تعریف ہے۔ ابھی تعلیمی میلا نمبر ملا۔ ایسی ہی چیزیں اس کو ممتاز کرتی ہیں۔

اے، ڈبلو، شاکرہ

اسسٹنٹ لائبریرین، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

ویسے پیام تعلیم کے چرچے تو بہت سن رکھے تھے لیکن جب سے غلام رسول صاحب اشرف جویرے استاد ہیں اور ہر وقت مجھے نصیحتوں سے نوازتے رہتے ہیں جب انھوں نے پہلی بار رسالہ پیام تعلیم مجھے دیا تو میں خوشی کے مارے جھوم گیا۔ دسمبر کا پیام تعلیم شروع سے آخر تک ایک ہی بیٹھک میں پڑھ ڈالا، بڑا مزہ آیا۔ واقعی اردو میں ایسے رسالے بہت کم ملتے ہیں جس میں سبق آموز باتیں اور اچھا مواد ہو۔

جب سے غلام رسول صاحب نے پیام تعلیم کے خریدار بنانے کی ذمے داری اپنے سر لی ہے ناگپور میں پیام تعلیم کے خریداروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ہر کسی کے ہاتھ میں پیام تعلیم نظر آ رہا ہے۔ یہ غلام رسول صاحب کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ میں بھی غلام رسول صاحب کی پیام تعلیم کے خریدار بنانے میں پوری پوری کوشش کروں گا۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ پیام تعلیم کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دے۔ (آمین)

اشفاق احمد

سوت گرنی کوارٹر تاج آباد ناگ پور

نومبر کا پیام تعلیم ملا۔ بس ہم تمام لڑکیاں دیکھتے ہی رہ گئیں۔ کارٹونی کہانی جاوید بھائی جان نے اچھے انداز میں لکھی۔ جناب محبوب راہی صاحب کی (نظم) اور باقی سب ہی کہانیاں بے حد پسند آئیں۔ خدا کرے یہ خوب صورت پیام تعلیم دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔

نصرت خانم بنت محمد خان ماسٹر اردو گرلس اسکول جماعت چہارم الف شیگاؤں (بلڈانہ)

"بچوں کی کوششیں" میں فہیم اختر نقوی کی کہانی بہت زیادہ پسند آئی اور ننھے فنکار میں عبد الناصر فاروقی کی تصویر اچھی لگی۔ اگر ممکن ہو تو سوال و جواب کا کالم اور قلم کاروں کی تصویر شائع کریں۔

مسرور حسن

ڈاکخانہ لکھمینیا۔ ضلع بیگوسرائے (بہار)

مندرجہ بالا خطوط کے علاوہ مندرجہ ذیل پیامیوں کے خطوط بھی ہمیں ملے۔ جگہ کی کمی کے وجہ سے صرف ان کے نام شائع کیے جا رہے ہیں۔

(۱) ایم، شمس الدین فردوس۔ کلکتہ ۴۲ (۲) جاوید نہال حشمی۔ کانکی نارہ (۳) قاضی شہاب ظہیر۔ آسنسول (۴) عبد الملک فاروقی۔ ہمدرد نگر نئی دہلی ۶۲ (۵) عبد المنان منصوری۔ بمبئی (۶) سید محمد احسن۔ بردوان (۷) شاہ نواز قطب الدین نداف۔ یمکن مرڈی (۸) شیخ متین۔ بھوکردن (۹) عبد القدیر۔ اورنگ آباد (۱۰) محمد شاہد ادیب۔ بہار شریف (۱۱) سمیع الدین اظہر۔ بھوکردن (۱۲) مسعود حیدر آسنسول (۱۳) عبد المجید ٹانیکل۔ (۱۴) سید ابراہیم۔ بمبئی ۹ (۱۵) ظہیر اعجاز غوری بانکی (۱۶) محمد مہتاب عالم۔ گورا۔ آسنسول (۱۷) نازنین نور الدین خطیب۔ مروڈ۔ قلابہ (۱۸) سید عمیر حسنی۔ رائے بریلی (۱۹) انیس احمد جانی۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ (۲۰) غفران الحق نور شینی نوی۔ بہار شریف (۲۱) محمد عمر قریشی۔ حیدرآباد ۲۸ (۲۲) محمد علی ظفر۔ کلٹی (۲۳) جاوید اختر کلٹی (۲۴) اقبال احمد نیازی۔ بلڈانہ (۲۵) احمد کمال حشمی، کانکی نارہ (۲۶) خورشید حیات۔ گیا (۲۷) جاوید احمد خاں پٹنہ ۷ (۲۸) حبیب الرحمان۔ محبوب نگر (۲۹) محمد زبیر آفاق۔ وانمباڑی (۳۰) آفتاب منہاس۔ سرنکوٹ ضلع پونچھ۔ (۳۱) ماسٹر غیاث الدین تاج کلٹی (۳۲) ایم شکیل احمد قریشی کمرا ضلع تھانہ (۳۳) اسحاق احمد خالد۔ نرمل۔ (۳۴) انجم فاطمہ نسرین تلنگنڈہ (۳۵) محمد فیروز احمد۔ کلٹی (۳۶) سید شمس العارفین رضوی۔ سیپورہ

کالستہ اُردو گرل اسکول کی شاندار کامیابی

مورخہ ۱۶ جنوری ۸۲ء کو بزم اُردو چپلون کے زیر اہتمام غزل خوانی کے مقابلے ماپاری محلہ اردو اسکول چپلون میں رکھے گئے تھے۔ گروپ نمبر ۲ (جماعت اوّل تا چہارم) کا شیلڈ اسکول ہٰذا کی دو طالبات نے حاصل کر کے اسکول کی ترقی میں چار چاند لگائے ہیں۔ جن طالبات نے پہلا اور تیسرا انعام حاصل کیا ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) پہلا انعام:- نسرین عبدالرشید شیخ طالبہ جماعت چہارم
(۲) تیسرا انعام:- صادقہ عبدالرحمٰن پرکار طالبہ جماعت چہارم

مذکورہ بالا طالبات کی تیاری اسکول ہٰذا کی معلمہ محترمہ نجم النساء عبدالرشید شیخ ارنڈولی نے کروائی تھی۔ موسیقی کے لیے تعاون حاجی داؤد امین ہائی اسکول کے صدر مدرس جناب یوسف احمد پرکار اور اسٹاف نے دیا تھا جو ہماری کامیابی میں برابر کے شریک ہیں۔

طیبہ سیکنڈری اسکول، اودے پور میں یوم اطفال

امسال ہمارے اسکول میں ۱۴ نومبر کو یوم اطفال بڑے دھوم دھام سے منایا گیا ہمارے اسکول کی روایت کے مطابق اس روز بچوں نے اسکول چلایا یعنی بچوں نے ہیڈ ماسٹر اور ٹیچرس کے فرائض انجام دیے۔ پڑھائی کے اختتام پر ایک کلچرل پروگرام جناب شکلا صاحب پرنسپل ودھیا بھون ٹیچرس ٹریننگ کالج کی صدارت میں ہوا۔ پروگرام کی ابتدا تلاوت قرآن مجید سے کی گئی اس کے بعد بچوں نے قومی ایکتا اور نہرو جی

مرسلہ:- سکریٹری جامعہ طیبہ بمبئی

کی زندگی پر تقریریں کیں۔ اس موقع پر قومی ترانہ، موٹیویٹنگ گیت، غزلیں وغیرہ مختلف قسم کے پروگرام پیش کیے گئے ... صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں بچوں کے ذریعے پیش کیے جانے والے پروگرام کی بہت تعریف کی۔ جلسہ کے اختتام پر اسکول کے ہیڈ ماسٹر جناب منصور علی صاحب نعمانی نے جناب صدر و دیگر مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

اینگلو عربک اسکول میں شیروانی فٹ بال ٹورنامنٹ

نئی دہلی ۸/دسمبر۔ ۵/دسمبر ۱۹۸۱ء کو صبح دس بجے اینگلو عربک سینئر سیکنڈری اسکول کے وسیع میدان پر شیروانی فٹ بال ٹورنامنٹ کا فائنل میچ اینگلو عربک اسکول اور ماڈرن اسکول بارہ کھمبا روڈ کے درمیان کھیلا گیا۔

یہ ٹورنامنٹ جناب نثار احمد خاں صاحب شیروانی مشہور مجاہد آزادی کی یاد میں ہر سال منعقد ہوتا ہے۔

اس دلچسپ فائنل میچ میں دونوں ٹیموں نے ایک دوسرے پر ایک ایک گول کیا کھیل کے آخر تک فیصلہ نہ ہو سکا۔ دونوں ٹیموں کی رضامندی سے ٹاس ہوا۔ اور ڈپٹی ڈائرکٹر آف ایجوکیشن شری کالی چرن جی نے جو اس فنکشن کے معزز مہمان تھے ٹاس کیا، ٹاس اینگلو عربک اسکول نے جیتا اور پہلے چھ ماہ کے لیے ٹرافی رکھنے کا حق اسے دیا گیا۔

رابعہ گرلز اسکول کی سالانہ تقریب بیگم عزیزہ امام ایم پی نے انعامات تقسیم کیے

نئی دہلی، ۳۰/نومبر۔ ہمدرد فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام رابعہ گرلز اسکول کی آج سالانہ تقریب ہوئی اس کی صدارت ہمدرد وقف کے حکیم عبدالحمید صاحب نے کی اور مہمان خصوصی بیگم عزیزہ امام ممبر پارلیمنٹ تھیں۔ اسکول کی بچیوں نے پی۔ ٹی اور ہنسی مذاق کے ڈراموں کے دلچسپ پروگرام پیش کیے۔ مختلف کلاسوں میں اول دوم آنے والی لڑکیوں کو انعامات دیے گئے۔

بیگم عزیزہ امام نے اپنی تقریر میں ہمدرد فاؤنڈیشن کی

تعریف کی کہ وہ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے دہلی میں بہت اچھا کام انجام دے رہا ہے تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ملک وملت کی ترقی کے لیے لڑکیوں کی تعلیم بہت ضروری ہے۔

احمد سیلر ہائی اسکول۔ بمبئی

بمبئی احمد سیلر ہائی اسکول نے بمبئی ہائی اسکولس اسپورٹس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام انٹر اسکول باسکٹ بال ٹورنامنٹ میں شاندار کھیل کا مظاہرہ کرتے ہوئے دائرٹائیٹل پر اپنا تصرف قائم کر لیا ہے۔ اس شاندار کامیابی پر میں کپتان حسین بیگ، کوچ محمد اسلم، اسپورٹس انچارج جناب جاوید اختر عثمانی صاحب اور پرنسپل اسکول ہٰذا کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

امامین اردو گرلس اسکول رانچی

رانچی (ڈاک سے) جناب اقبال خلیل، سکریٹری اسکول ہٰذا مطلع کرتے ہیں کہ امامین اردو گرلس ہائی اسکول رانچی کی ۱۹۸۱ء کے میٹرک کے سالانہ امتحان میں ۲۲ لڑکیاں امتحان میں شریک ہوئیں جس میں ۲۰ پاس ہوئیں ایک فرسٹ ڈویژن، ۱۶ سکنڈ ڈویژن اور تین تھرڈ ڈویژن۔

اس کامیاب ریزلٹ کے لیے اسکول کی ہیڈ معلمہ اور سبھی معلمات مبارکباد کی مستحق ہیں جنھوں نے چھٹیوں میں بھی اپنا قیمتی وقت دے کر لڑکیوں کو کامیاب بنایا۔

انجمن معین الطلبہ، گولڈن اور مالیگاؤں ہائی اسکول سلور جوبلی

مالیگاؤں یکم دسمبر ۱۹۳۰ء میں انجمن معین الطلبہ کا قیام عمل میں آیا ۱۹۵۶ء میں اراکین انجمن نے مالیگاؤں ہائی اسکول قائم کرکے تعلیمی شاہراہ پر ایک سنگ میل نصب کر دیا۔

آج اس کے سائے میں "کے۔جی" پری پرائمر سکنڈری اور جونیر کالج کی مختلف جماعتوں میں تقریباً ۱۷۰۰ (سترہ سو) طلبہ و طالبات تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

انجمن معین الطلبہ کو قائم ہوئے نصف اور مالیگاؤں ہائی اسکول کو ربع صدی کا عرصہ ہو رہا ہے اس لیے سال رواں کے اختتام پر دونوں اداروں کی گولڈن جوبلی اور سلور جوبلی ایک ساتھ منعقد کی جا رہی ہے۔

فتح پوری اسکول میں بچوں کی پارلیمنٹ

دلی ۱۵/نومبر فتح پوری مسلم سنیر سکنڈری اسکول میں بچوں کی پارلیمنٹ کا قیام عمل میں آیا۔ اس پارلیمنٹ کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ جو ہندستان جیسے عظیم جمہوری ملک کے مستقبل کے ذمہ دار شہری ہوں گے انھیں اپنی ذمے داریوں اور جمہوری اصولوں کا بخوبی احساس ہو جنھیں وہ اپنی زندگی میں رچا بسا سکیں۔

مندرجہ ذیل عہدہ داران کا انتخاب عمل میں آیا۔

(۱) صدر جناب زین العابدین صاحب پرنسپل فتح پوری مسلم سنیر سیکنڈری اسکول

(۲) نائب صدر جناب شاہ فیصل صاحب درجہ دوازدہم

(۳) وزیر اعظم جناب طاہر اسلم قادری صاحب۔ درجہ دہم سی

یہ انتخابات جناب فاروق بخش کی قیادت میں بحسن و خوبی عمل میں آئے۔

مندرجہ ذیل طلبہ ممبر پارلیمنٹ چنے گئے

(۱) مجیب الرحمن (۲) راشد شہاب (۳) اخلاص جاوید (۴) انظر نظیری (۵) ارشاد عالم (۶) رضوان الٰہی (۷) نسیم احمد (۸) ظہیر الدین (۹) سلطان احمد (۱۰) شکیل عثمانی

ہائر سکنڈری اسکول بلبلی خانہ، یوم اطفال پر اسٹال لگائے گئے

دہلی ۱۴/نومبر جواہر لال نہرو کے یوم پیدائش کے موقع پر ہائر سکنڈری اسکول بلبلی خانہ کے طالبات نے مختلف اسٹال لگائے اور ان میں پکوان، دہی بڑے اور دوسری کھانے کی چیزیں خود تیار کیں۔ اس موقع پر طالبات کے والدین کو مدعو کیا گیا تھا۔ پرنسپل صاحب نے جواہر لال نہرو کی تصویر کو پھولوں کی مالا پہنائی اور چائے سے مہمانوں کی تواضع کی۔ اسکول کی ٹیچرز نے طالبات کی رہنمائی کی جس سے یہ تقریب بہتر طریقے پر انجام پائی۔

محمد اقبال — عمر ۲۲ سال
مشغلہ: کرکٹ کھیلنا۔ ادبی و دینی رسائل کا مطالعہ کرنا۔
پتا: مکان نمبر ۱۳-۷-۵۔ کہنہ پالمور۔ محبوب نگر۔ ۵۰۹۰۰۱

اقبال انور — عمر ۱۸ سال ۸ مہینے
مشغلے: ہوائی جہاز کے ٹکٹ جمع کرنا۔ پیام تعلیم و دیگر پرچوں کا مطالعہ کرنا۔
پتا: مجلہ تپیانہ ڈاکخانہ کلٹی۔ ضلع بردوان۔ مغربی بنگال

اسماعیل احمد نظامی — عمر ۱۰ سال
شوق و مشغلہ: نماز پڑھنا۔ بڑوں کا ادب کرنا۔ پیام تعلیم پڑھنا۔
پتا: اسماعیل احمد نظامی خاں سائیکل اسٹور شیرگاؤں (بلڈانہ)

اسحاق احمد خالد — عمر ۱۴ سال
شوق: بیرونی ممالک کے سکے جمع کرنا۔ پیام تعلیم کا مطالعہ کرنا۔
پتا: معرفت تاج احمد تاج نرمل ۱۰۶-۴-۵

جناب حبیب الرحمٰن
شوق و مشغلہ: بڑوں کا کہنا ماننا۔ پیام تعلیم کا مطالعہ کرنا۔
پتا: مکان نمبر ۵-۲-۳۹ نزد پولس اسٹیشن۔ محبوب نگر۔ (آندھرا پردیش)

شاہین سلطانہ — عمر ۱۳ سال
مشغلے: دور دراز کی بہنوں کے خطوط کا جواب دینا۔ ناٹک دیکھنا۔
پتا: بالیکا ودھیالہ پوسٹ کلٹی ضلع بردوان

سلمہ جہاں — عمر ۱۲ سال
مشغلہ: پیام تعلیم خوب جی لگا کر پڑھنا۔ مٹھائی خوب شوق سے کھانا۔

جاوید میاں داد — عمر ۶ سال
مشغلہ: پیام تعلیم کی تصویریں دیکھنا۔ سلیٹ پر پنسل سے ایک سے لے کر پچاس تک گنتی لکھنا۔

مُنی — عمر ۱۰ سال
مشغلہ: پیام تعلیم کے بھائی بہنوں سے دوستی کرنا۔ ا[illegible] کی کتابوں میں الجھے رہنا۔
پتا: معرفت۔ جی ۳/۲، ۲ رام نگر لین (منگرا تالاب) گارڈن ایچ کلکتہ ۲۴ ۷۰۰۰
(سلمہ جہاں۔ جاوید داد۔ منی۔ تینوں کے پتے ایک ہی ہیں۔)

محمد صابر حسین — عمر ۱۸ سال
مشغلہ: بیڈمنٹن کھیلنا۔ دل لگا کر پڑھنا
پتا: سری پور ۳

محمد شاہد خاں — عمر ۱۵ سال
مشغلہ و شوق: کرکٹ کھیلنا، پیام تعلیم کا مطالعہ کرنا۔
پتا: درجہ نہم اے۔ ہائی اسکول جیسورہ۔ اورنگ آباد۔ بو

کشور عائشہ — عمر ۱۲ سال
شوق و مشغلہ: نماز پڑھنا۔ چھوٹوں سے پیار کرنا۔
پتا: کشور عائشہ معرفت ڈاکٹر انیس الرحمٰن مچھلی بازار بجنور

بچوں کی کوشش

فرض اور انتقام

جون کی ایک سہ پہر تھی۔ باہر تیز اور گرم ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ ڈاکٹر رشید کی ڈسپنسری میں صرف دو تین مریض بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر رشید ایک مریض کا معائنہ کر رہے تھے اچانک باہر ایک کار آکر رکی۔ اس کے اندر سے سیٹھ ہیرالال کا ڈرائیور باہر نکلا اور ڈاکٹر رشید کے قریب پہنچ کر کہنے لگا،

"ڈاکٹر صاحب! جلدی چلیے۔ مالک کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے۔ انھوں نے آپ کو یاد کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، باہر کی کمرے میں کچھ دیر انتظار کرو۔" ڈاکٹر رشید نے کہا "میں ان مریضوں کو دیکھ کر چلتا ہوں۔"

"ڈاکٹر صاحب! تب تو بہت دیر ہو جائے گی۔" سیٹھ ہیرالال کے ڈرائیور نے کہا "آپ ابھی چلیے۔ آپ کو فیس پچاس روپے کے بدلے ایک سو ملیں گے۔"

"مجھے روپے سے زیادہ اپنے فرض سے محبت ہے۔ یہ مریض تم سے پہلے آئے ہیں۔ اس لیے میں ان لوگوں کو پہلے دیکھوں گا۔" ڈاکٹر رشید نے کہا اور ایک مریض کو دیکھنے لگے۔ مجبوراً سیٹھ ہیرالال کے ڈرائیور کو انتظار کرنا پڑا۔

کچھ دیر بعد جب سبھی مریض چلے گئے تو ڈاکٹر رشید کو سیٹھ ہیرالال کے ڈرائیور کا خیال آیا اور ان کے دل میں انتقام کی وہ آگ بھڑکنے لگی جو برسوں سے ان کے دل میں دبی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر رشید ایک غریب مزدور کے لڑکے تھے۔ جب ان کی عمر چار سال کی تھی تو قسمت نے ان کے والد کو ہمیشہ کے لیے ان سے جدا کر دیا۔ ان کی ماں نے کسی نہ کسی طرح محنت مزدوری کر کے ان کی پرورش کی اور تعلیم دلوائی۔ مگر جب ان کی عمر ۱۵ سال کی ہوئی تو ان کی ماں بیمار پڑ گئیں۔ اور حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی ماں کی حالت بگڑتی ہی جا رہی ہے تو وہ ڈاکٹر شرما کو بلا لائے۔ تھوڑی دیر تک معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر شرما نے دواؤں کی ایک فہرست لکھ دی اور چلے گئے۔

اب رشید صاحب کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ اپنی ماں کے لیے دوا لا سکیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ آخر میں کچھ سوچ کر وہ سیٹھ ہیرالال کی کوٹھی کی طرف چل پڑے تاکہ ان سے کچھ روپے قرض لے سکیں۔ مگر سیٹھ ہیرالال نے قرض دینے سے انکار کر دیا۔ رشید صاحب نے ہاتھ جوڑ کر بڑی منت سماجت کی۔ مگر پھر بھی سیٹھ ہیرالال راضی نہ ہوئے اور ان کو جھڑک کر نکال دیا۔

جب وہ ناکام گھر واپس آئے ان کی ماں کی حالت بالکل خراب ہو چکی تھی۔ سانس رک رک کر چل رہی تھی۔ جب انھوں نے اپنی ماں کو سب باتیں بتائیں تو ان کی ماں نے مرے ہوئے لہجے میں کہا،

"جانے دے بیٹا! ہماری قسمت ہی خراب ہے۔"

"نہیں ماں! میں سیٹھ ہیرالال کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔" انھوں نے کہا "میں ایک دن اس کا بدلہ ضرور لوں گا۔"

"ہاں بیٹا! بدلہ ضرور لینا۔ مگر بھلائی سے [illegible]

نے رک رک کر کہا اور روح جسم کی قید سے آزاد ہوگئی۔

آج اسی سیٹھ ہیرا لال کی طبیعت خراب ہوگئی تھی اور اس کا ڈرائیور ڈاکٹر رشید کو بلانے آیا تھا۔ انھوں نے سوچا سیٹھ ہیرالال سے انتقام لینے کا یہ بہت ہی اچھا موقع ہے۔ میں اس ظالم انسان کو زہر کی سوئی دے کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دونگا۔"

مگر ان کا ضمیر ملامت کرنے لگا!

"نہیں مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ میں ڈاکٹر ہوں اور ڈاکٹر سماج کا دوست ہوتا ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے مریض کو بچالے۔"

مگر دل نے کہا،

"نہیں بے وقوفی مت کر۔ کبھی سیٹھ ہیرالال نے تم پر رحم نہیں کیا تھا۔ آج تو بھی اس پر رحم نہ کر!"

ڈاکٹر رشید کش مکش میں پڑ گئے۔ مگر ان کے کانوں میں ان کی ماں کی کہی ہوئی بات گونجنے لگی،" ہاں بیٹا بدلہ ضرور لینا۔ مگر بھلائی سے!" اور وہ انتقام کے جذبے کو دل میں دبا کر اپنا فرض پورا کرنے کی تیاری کرنے لگے۔

● احمد کمال حشمی

معرفت چشم الرحمٰن ایم اے (ڈبل) بی ایل ۲ نیا بازار کانکی نارہ ۱۳۱ ۷۴۳

تو کون ہے، کہاں رہتی ہے؟

کہتے ہیں کہ عقل جب حکیم لقمان کے پاس آئی تو انھوں نے پوچھا، تو کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟

اس نے جواب دیا۔ میں عقل ہوں انسان کے سر میں رہتی ہوں۔ پھر شرم آئی۔ اس سے بھی پوچھا۔ تو کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ اس نے کہا۔ میں شرم ہوں، زیرِ چشم رہتی ہوں۔ اسی طرح محبت آئی۔ اس سے بھی پوچھا۔ تو کون ہے؟ اور کہاں رہتی ہے؟ اس نے جواب دیا۔ میں محبت ہوں، اور انسان کا دل میرا گھر ہے۔ اب تقدیر آئی۔ اس سے پوچھا۔ تو کون ہے؟ اور کہاں رہتی ہے؟ اس نے جواب دیا۔ میں تقدیر ہوں، سر میں رہتی ہوں۔ لقمان نے کہا۔ وہاں تو عقل رہتی ہے۔ عقل بولی" جب تقدیر آتی ہے تو میں چلی جاتی ہوں۔"

اب عشق آیا۔ اس سے پوچھا۔ تو کون ہے؟ کہاں رہتا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ میں عشق ہوں، آنکھوں میں رہتا ہوں۔ لقمان نے کہا۔ وہاں تو شرم رہتی ہے۔ اس نے جواب دیا جب عشق آتا ہے تو شرم اٹھ جاتی ہے۔ بالکل آخر میں طمع (لالچ) آئی۔ اس سے پوچھا۔ تو کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ کہا میں لالچ ہوں، دل میں رہتی ہوں۔ لقمان نے کہا اس جگہ تو محبت رہتی ہے۔ اس نے جواب دیا۔

جب لالچ آتی ہے تو محبت اٹھ جاتی ہے۔"

● عبدالخالق ناگپوری

بورگاؤ۔ جی ٹی روڈ۔ ناگپور

"منحوس کون"

ایک بار ایک راجا نے اپنی حکومت کے ایک آدمی کو پھانسی کی سزا دی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کے منتری لوگوں کا کہنا تھا اس آدمی کا چہرہ بڑا منحوس ہے جو بھی اسے صبح دیکھ لیتا ہے دن بھر بھوکا ہی رہتا ہے۔ اتفاق کی بات کہ ایک صبح راجا نے سب سے پہلے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس دن راجا کئی ضروری کاموں میں ایسا لگا کہ کھانا کھانے ہی کی فرصت نہیں ملی۔ اب راجا کو منتریوں کی بات کا یقین ہوگیا۔ اس نے اس منحوس آدمی کو دربار میں بلایا اور پھانسی کی سزا سنا دی۔ جب پھانسی دی جانے لگی تو راجا نے اس سے پوچھا، کیا تمھیں کچھ کہنا ہے۔ منحوس آدمی ہاتھ جوڑ کر بولا،" مہاراج صبح صبح میرا منہ دیکھ لینے سے تو آپ کو کل کھانا نہیں ملا، پر آپ کا منہ دیکھ لینے سے تو مجھے پھانسی کی سزا مل رہی ہے۔" راجا اس کی بات سے بہت شرمندہ ہوا اور اس نے فوراً اسے چھوڑ دیا۔

● فوزیہ افضال صدیقی

ڈاکٹر فضیل انجم گیگرد، ضلع مظفر نگر۔ یوپی

بڑوں کا ادب

کسی گاؤں میں ایک مدرسہ تھا۔ اس میں غریب کسانوں کے بچے پڑھتے تھے۔ وہ جب ایک جماعت پاس کر لیتے تو دوسری جماعت میں چلے جاتے۔ اور اس طرح اسکول میں جتنی جماعتیں تھیں وہاں تک پڑھ کر اپنے کھیتی کے کاموں میں لگ جاتے تھے۔

ایک دفعہ کی بات ہے کہ اسکول کی ایک جماعت میں ایک استاد نے بچوں سے کہا کہ "بڑوں کا ادب کرو" اس جملے کو زبانی یاد کر کے سنائیے۔ اُس جماعت کے تمام بچوں نے یہ جملہ یاد کر کے زبانی استاد کو سنا دیا۔ لیکن اس درجہ میں ایک لڑکا ایسا تھا جس نے وہ جملہ یاد نہیں کیا۔ استاد نے یاد نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ میں اتنے کم وقت میں اتنا بڑا جملہ یاد نہیں کر سکتا مجھے اور وقت چاہیے استاد سمجھ گئے۔ استاد نے اس سے خود کہا میاں تم ہی کہو کہ تمھیں اس جملے کو یاد کرنے کے لیے کتنا وقت لگے گا اس نے تین ماہ کا وقت مانگا اور اس کے استاد نے کہا "ٹھیک ہے"

تین ماہ کے بعد لڑکے نے نہایت ادب سے اپنے استاد سے کہا کہ جناب میں نے اب وہ جملہ اچھی طرح یاد کر لیا ہے اور عہد بھی کر لیا ہے کہ میں ہمیشہ بڑوں کا ادب کروں گا۔

یاد رکھیے "علم حاصل کرنا اور اس پر عمل نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کئی کتابیں ایک گدھے پر لاد دی گئی ہوں۔ علم بغیر عمل کے کچھ نہیں ہے اس لیے ہمیشہ علم کے ساتھ عمل بھی کرنا چاہیے۔"

● اشفاق احمد

سوت گرنی کوارٹر۔ تاج آباد۔ ناگپور

پیارا نیولا

ننھا اکرم کا نیولا بھی خوب ہے کسی طرح کا خوف نہیں۔ گھر اور باغیچہ میں جدھر دل چاہتا ہے ادھر دم پھیلا کر دوڑتا پھرتا ہے۔

گزشتہ سال ایک دن بہت زور کی بارش ہو رہی تھی۔ ایک نیولا بہتا ہوا آیا اور اکرم کے گھر کے قریب ایک گڑھے میں جا گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ وہ اسے مردہ سمجھ کر اٹھا کر پھینکنے ہی والا تھا۔ کہ اس کے چھوٹے بھائی افضل نے کہا "شاید ابھی یہ زندہ ہے۔ کیوں نہ اسے گھر لے جا کر روئی میں لپیٹ دیا جائے۔"

روئی کی گرمی پا کر نیولے نے آنکھیں کھول دیں۔ اور پھر اپنی عادت کے مطابق وہاں رکھی ہوئی ہر چیز کو سونگھنے لگا اور سارے کمرے کا چکر لگا کر ٹیبل پر چڑھ گیا۔ اور وہاں سے اچھل کر اکرم کے کندھوں پر جا پہنچا۔ اکرم ڈر گیا۔

گھبراؤ نہیں! چھوٹے بھائی افضل نے کہا" یہ تم سے دوستی کرنا چاہتا ہے۔ شاید یہ بھوکا بھی ہو"

افضل دوڑ کر باورچی خانہ سے ایک روٹی لے آیا۔ نیولا نے روٹی کو سونگھا پھر اسے مزے سے کھانے لگا۔ رات کے وقت دونوں بھائیوں کے بستر پر ہی سویا کرتا تھا۔ ذرا سی آہٹ ملتے ہی وہ اٹھ جاتا تھا۔

ایک دن نیولا صبح کے وقت باغ میں گھومنے گیا تو اس نے ایک درخت کے قریب دو چڑیوں کو دیکھا جیسے ہی وہ اس کے قریب پہنچا گھاس میں سے دھیمی سی پھنکار سنائی دی نیولا نے چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا تو وہ حیران رہ گیا زبان لپلپاتے ہوئے تقریباً دو میٹر لمبا ایک کالا ناگ گھاس میں پھن اٹھائے کھڑا تھا۔ ادھر نیولے کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور بدن پھلا کر حملہ کرنے کو تیار ہو گیا۔ اُدھر ناگ بھی حملے کی تاک میں لگا تھا اس کا پھن ہوا میں لہرا رہا تھا۔ لیکن لال لال آنکھیں کیے نیولے کو حملے کے واسطے تیار دیکھ کر ناگ ڈر گیا وہ جانتا تھا کہ نیولے سے لڑنے کا انجام اس کی موت ہے۔

اور ہوا بھی ایسا ہی، نیولے نے جھپٹ کر ناگ کی گردن دبا دی اور پٹخ پٹخ کر مار ڈالا۔ دونوں چڑیاں اڑ کر پیڑ کی شاخ پر بیٹھ گئیں اور چیں چیں کرنے لگیں جیسے وہ اکرم کے نیولے کا شکریہ ادا

کر رہی ہوں۔

● ا محمد اقبال حسین
محلہ چپانہ کلنی بردوان۔ ویسٹ بنگال

دو باتونی

جاپان کے ایک گاؤں میں دو باتونی رہتے تھے۔ دونوں کی آنکھیں کمزور تھیں۔ وہ دور کی چیز کو صاف صاف نہیں دیکھ پاتے تھے مگر پھر بھی وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ ان کی آنکھیں کمزور ہیں۔ ایک دن وہ دونوں کہیں جا رہے تھے کہ ان دونوں نے سنا۔ گاؤں کے خاص چوراہے پر جو مجسمہ لگایا جانے والا ہے، بن کر تیار ہو گیا ہے، وہ دوسرے دن چوراہے کے اونچے چبوترے پر لگایا جائے گا۔ دونوں باتونیوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ اس موقع پر وہ اپنی اپنی نگاہوں کا امتحان کر لیں گے۔ طے یہ ہوا کہ مجسمہ رکھے جانے کے بعد چوراہے سے دور ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ کر مجسمے کو دھیان سے دیکھیں گے۔ جو زیادہ باریکیاں دیکھ پائے گا اس کی آنکھ اچھی مانی جائے گی۔

شرط طے ہو گئی۔ مگر دونوں اس سچائی کو جانتے تھے کہ دور کا انھیں صاف دکھائی نہیں دیتا۔ اس لیے دونوں کے دماغ میں ایک ہی ترکیب آئی۔ وہ الگ الگ ایک دوسرے سے چھپ کر سنگ تراش سے ملے۔ سنگ تراش بھی کافی چالاک تھا۔ اس نے دونوں کو الگ الگ باتیں بتائیں۔ دونوں نے مجسمے کے بارے میں پوری معلومات حاصل کر لیں۔ دوسرے دن دونوں چوراہے سے دور پیڑ کے نیچے بیٹھ گئے۔

ایک نے کہا: "مجسمے کے گلے میں مالا ہے۔" دوسرے نے کہا "مالا نہیں مفلر ہے" بس اسی بات پر دونوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ اس وقت ایک راہ گیر وہاں سے گزرا۔ اس نے ان دونوں سے پوچھا "دونوں میں سے صحیح کون کہہ رہا ہے؟"

راہ گیر نے حیرت سے دونوں کو دیکھا اور جواب دیا۔ مگر مجسمہ کہاں ہے؟ مجسمہ تو ابھی لگا ہی نہیں! یہ سن کر دونوں باتونی شرم سے پانی پانی ہو گئے۔

● ا معراج احمد صدیقی
۲۰۰۲ بازار چتلی قبر جامع مسجد دہلی ۶

دوڑ میرے کدو ٹھمک ٹھمک

ایک تھی بڑھیا ایک دن وہ اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے نکلی اس کی لڑکی کا گاؤں دور تھا راستہ جنگل سے جاتا تھا بڑھیا جنگل سے جا رہی تھی کہ راستے میں اس کو ایک بھیڑیا ملا۔ بھیڑیا بولا۔ اے بڑھیا میں تجھ کو کھانا چاہتا ہوں۔

بڑھیا ہوشیار تھی وہ ڈری نہیں اس نے کہا اگر کھانا ہے تو کھا لیکن مجھ میں ہے کیا، ہڈیاں، اور پسلیاں ہی تو ہیں تو چار دن ٹھہر میں بیٹی کے گھر جا رہی ہوں۔ وہاں چار دن رہوں گی۔ گھی روٹی کھاؤں گی، موٹی تازی ہو کر آؤں گی پھر تو مجھ کو کھانا۔ بھیڑیا بولا تو سچ کہتی ہے مگر چار دن بعد آنا ضرور۔

بڑھیا آگے بڑھی وہاں اس کو شیر ملا۔ شیر غرایا اے بڑھیا میں تجھ کو کھانا چاہتا ہوں

بڑھیا نے جواب دیا اگر کھانا ہے تو کھا مگر تیرا پیٹ نہیں بھرے گا۔ مجھ میں رکھا ہی کیا ہے تو چار دن رک میں بیٹی کے گھر جا رہی ہوں وہاں دو، چار دن رہوں گی۔ گھی دودھ کھاؤں گی موٹی تازی ہو کر آؤں گی پھر تم مجھے کھانا۔

شیر بولا اچھی بات ہے مگر چار دن میں ضرور آنا اس طرح بڑھیا بہانہ کرتی ہوئی اپنی بیٹی کے گھر پہنچی۔

وہاں چار دن رہی گھی روٹی کھائی اور واقعی خوب موٹی تازی ہو گئی۔ اب وہ واپس گھر جانے کے لیے تیار ہوئی۔ بیٹی نے کہا "ماں تو چار دن کے لیے اور رک جا" ماں نے جواب دیا:۔ جنگل میں بھیڑیا اور شیر میری راہ تکتے ہوں گے

لڑکی بولی۔ "ماں ماں یہ بڑا کدو لے اور اس میں بیٹھ جا۔ پھر تجھ کو نہ بھیڑیا دیکھ سکے گا اور نہ شیر۔"

بڑھیا کدو میں بیٹھی اور بولی" چل میرے کدو ٹھمک ٹھمک" اور کدو ٹھمک ٹھمک دوڑنے لگا۔

شیر راستے میں بیٹھا تھا بڑھیا کی راہ تک رہا تھا اس نے کدو کو دوڑتے ہوئے دیکھا تو پوچھا:۔ کدو تو نے بڑھیا کو دیکھا ہے کیا؟ بڑھیا نے کدو کے اندر سے

جواب دیا۔ "کون سی بڑھیا۔ میں کسی بڑھیا کو نہیں جانتا" دوڑ میرے کدو ٹھمک ٹھمک، کدو تیز تیز دوڑنے لگا۔ شیر کو شک ہوا اس نے کدو کا پیچھا کیا۔

بھیڑیا بھی بڑھیا کی راہ تک رہا تھا اس نے دیکھا کہ کدو تیز تیز دوڑ رہا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے شیر دوڑ رہا ہے اس نے آگے بڑھ کر کدو کا راستہ روک لیا۔ اور بڑھیا کو اس میں سے باہر نکالا اور بولا بڑھیا تو مجھ کو دھوکا دے رہی تھی اب تو بچ کر کہاں جائے گی اب میں تجھ کو کھاؤں گا۔

اتنے میں وہاں شیر آ پہنچا اس نے آتے ہی کہا "بڑھیا کو میں کھاؤں گا" بڑھیا بولی کھاؤ بابا مگر پہلے یہ بتاؤ کہ میرا سر کون کھائے گا شیر بولا "میں کھاؤں گا" بھیڑیا بولا "میں کھاؤں گا" دونوں آپس میں لڑ پڑے بڑھیا چپکے سے کدو میں بیٹھ گئی اور بولی "دوڑ میرے کدو ٹھمک ٹھمک" شیر اور بھیڑیا لڑتے رہے کدو ٹھمک ٹھمک" دوڑتا رہا اور بڑھیا دل ہی دل میں گنگناتی رہی۔

جان بچی تو لاکھوں پائے
لوٹ کے بدھو گھر کو آئے

● روشن آرا
کرنل باغ، ناگپور

"شہرت کی بھوک"

یوں تو بھوک کسے نہیں ہوتی ہے لیکن ہنری کو شہرت کی بھوک تھی اس کے لیے وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھا ہنری کے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ وہ پیشوائے اعظم پوپ کو تھوڑا زخمی کر دے۔ دوسرے دن اس کا فوٹو دنیا بھر کے تمام اخبار کی زینت بنے گا اور پیشوا ایک مذہبی انسان ہیں اس لیے وہ اسے آخر کار معاف ہی کر دیں گے اور اس طرح اس کا خواب ایک حقیقت میں تبدیل ہو جائے گا۔

ہنری کو دوست کی تجویز پسند آئی اور اس نے پلان مرتب کرنا شروع کیا۔ ہنری اب موقع کی تاک میں رہنے لگا ایک دن اسے ایک سنہری موقع مل گیا۔ ہنری کو معلوم ہوا کہ پیشوا ایک ہسپتال کے افتتاح کے سلسلے میں آنے والے ہیں ہنری نے یہ موقع غنیمت جانا اور اس دن کا انتظار کرنے لگا آخر کار وہ دن بھی آگیا ہنری شام ہونے سے پہلے ہسپتال کا چکر لگانے لگا پیشوا کے لیے کافی تیاریاں کی گئی تھیں ہر طرف لال، پیلی، نیلی، جھنڈیاں نظر آرہی تھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بادشاہ آنے والا ہو۔

ٹھیک ۵ بجے پیشوا ہزاروں لوگوں کے مجمع کے ساتھ داخل ہوا۔ ہنری نے اپنے آپ کو پیڑ کی آڑ میں مکمل طور سے چھپالیا اور اسٹین گن سے پیشوا کے دائیں ہاتھ کا نشانہ لینے لگا .... جیسے ہی پیشوا نے افتتاح کے لیے لال ڈوری کاٹنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہنری نے گولی چلادی .... ہجوم میں افراتفری مچ گئی اور لوگوں نے ایک نوجوان کو اسٹین گن کے ساتھ بھاگتے ہوئے پکڑ لیا دوسرے دن ہنری کا فوٹو واقعی دنیا بھر کے تمام اخبارات میں چھپا مضمون یوں تھا "(نامہ نگار کے ذریعے) کل شام ۵ بجے مذہبی پیشوا پر ایک پاگل شخص ہنری نے گولی چلادی گولی سیدھی پیشوا کے دل کے مقام پر لگی اور وہ اسی وقت ختم ہوگئے" ہنری پر بھری عدالت میں مقدمہ چلا اور اسے پھانسی کی سزا سنا دی گئی ایک ہفتے ہی بعد ہنری کو پھانسی دے دی گئی "شہرت کی بھوک" مٹی بھی تو کس بھیانک طریقے سے۔

● شاہد سعید
محمدیہ ہائی اسکول بمبئی۔ ۳

"ماں کی دعا"

ایک نوجوان تھا۔ اس کی ماں بوڑھی اور کمزور ہوگئی تھی۔ نوجوان اس کی تن من دھن سے خدمت کرتا۔ جو بھی حکم دیتی بجالاتا۔ اسے اچھے سے اچھا کھلاتا۔ اچھے سے اچھے کپڑے پہناتا۔ اس کو آرام پہنچاتا۔ اپنے سے زیادہ اس کا خیال رکھتا۔ اس کی گندگی دھوتا۔ کہیں جاتا تو اسے کندھوں پر بٹھالیتا۔ جدھر وہ کہتی ادھر لے جاتا۔ ایک دن ماں کے

لیے کپڑا خریدنے ایک دکان پر گیا اسے ایک جگہ آرام سے بٹھا دیا۔ پھر کپڑے دکھانے لگا "ماں یہ پسند ہے۔ ماں، وہ پسند ہے" کہتا جاتا اور اس کی ناک اس کے منہ کی رال پونچھتا وہاں کھڑے ہوئے لوگوں نے یہ دیکھا تو بول اٹھے کہ اس نوجوان نے ماں کے احسانات کا حق ادا کردیا۔ یہ سن کر نوجوان نے کہا۔ ہرگز نہیں۔ "ماں کا حق کوئی بھی ادا نہیں کرسکتا" لوگوں نے پوچھا کیوں نہیں۔ اس نے جواب دیا "میرے بچپن میں جب میں بیمار ہوتا تھا تو میری یہ ماں مجھے آرام پہنچانے کے لیے اپنا آرام تج دیتی تھی اور میرے لیے دعا کرتی تھی۔ اے اللہ! اس پر رحم فرما۔ یعنی مجھے زندہ رہنے کے لیے اللہ سے درخواست کرتی تھی۔ لیکن اب میں اس کو تکلیف میں دیکھتا ہوں تو میں بھی زبان سے کہتا ہوں کہ اے اللہ اس پر رحم فرما۔ اس کے دکھوں کو دور کر دے۔ تو تم سمجھتے ہو کہ میرے اس کہنے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ مر جائے۔ تبھی تو دکھوں سے نجات پائے گی۔ کتنا فرق ہے اس کی دعا اور میری دعا میں۔

افروز انور
پٹنہ مسلم ہائی اسکول پٹنہ۔ ۶

کنجوس آدمی

ایک گاؤں میں ایک دولت مند آدمی رہتا تھا جو بہت کنجوس تھا۔ اس کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ گاؤں کے سب لوگ جانتے تھے کہ وہ کتنا کنجوس ہے پھر بھی ایک مرتبہ کچھ لوگ اس کے گھر پر گئے تھے کہ اس سے غریبوں کی مدد کے لیے کچھ روپیہ حاصل کریں۔ لیکن اس کنجوس آدمی نے ان سب لوگوں کو بری طرح جھڑک دیا اور کہا کہ میرے پاس ایسے بے کار کاموں کے لیے پیسا نہیں ہے۔

ایک دفعہ کی بات ہے اسی گاؤں میں ایک سادھو آیا اور مندر میں ٹھہرا، وہ کچھ بھی کھاتا پیتا نہیں تھا۔ صرف بھگوان کی پوجا میں دن رات لگا رہتا تھا۔ گاؤں والے اس کی خدمت میں تحفے پیش کرتے تو وہ سادھو تحفہ لینے کے بعد بہت خوش ہوتا انھیں دعائیں دیتا، اور تحفے فوراً واپس کر دیتا۔ یہ خبر آس پاس کے گاؤں میں بھی پہنچی تو اناج گاڑیوں میں بھر بھر کے سادھو کی خدمت میں لانے لگے۔ اور کہنے لگے کہ ہمارا تحفہ قبول فرمائیں۔

سادھو خوش ہوتا اور ہزاروں دعاؤں کے ساتھ اناج انھیں کو لوٹا دیتا۔ یہ بات کنجوس آدمی تک بھی پہنچی اس نے سوچا کہ یہ موقع بہت اچھا ہے۔ میں گاڑیوں میں اناج بھر کر سادھو کے سامنے لے جاؤں گا۔ اور سادھو تو سب کے مال کی طرح اپنا اناج بھی واپس تو کر ہی دے گا مال واپس مل جائے گا۔ اور وہ لوگ جو مجھے کنجوس سمجھتے ہیں ان کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ میں کنجوس نہیں ہوں۔

دوسرے دن اس نے ایسا ہی کیا گھر کا سارا اناج گاڑیوں میں لاد کر سادھو کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اور کہنے لگا۔ مہاراج میرا تحفہ قبول کیجیے۔

سادھو نے وہاں کھڑے ہوئے لوگوں کے ذریعے سارا مال اتروا لیا۔ اور وہی اناج غریبوں میں تقسیم کر دیا۔ کنجوس آدمی سادھو کا منہ تکتا ہی رہ گیا۔ سادھو نے کہا۔ یہاں جو لوگ کھڑے ہیں وہ زیادہ غریب ہیں لیکن دل کے سخی، تم زیادہ دولت مند ہو لیکن دل کے خراب۔ میں نے تمھارے فائدے کے لیے ایسا کیا ہے شاید تم سمجھ سکو۔

طفیل احمد
سوت گرنی کوارٹر تاج آباد ناگپور

"مقدر کا کھیل"

ایک ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا اس کی رعایا بہت خوش حال تھی۔ بادشاہ کے دو بیٹے تھے ایک مرتبہ وہ لوگ (بادشاہ ملکہ اور اس کے بیٹے) سیر کو نکلے انھیں دریا کے دوسرے کنارے پہنچنا تھا وہ کشتی میں سوار ہوئے لیکن ابھی وہ دریا کے بیچ میں ہی ہوں گے کہ اچانک طوفان آگیا اور سب ایک دوسرے سے بچھڑ گئے اور بہتے بہتے بہت دور، بہت دور نکل گئے۔ دونوں شہزادے اس جگہ پہنچے جہاں پر ایک دھوبی کپڑے دھو رہا تھا اس نے جب دو لڑکوں کو دریا کے کنارے بے ہوش دیکھا تو وہ

ان دونوں کو گھر لے آیا اور ان کی پرورش شروع کر دی۔ اسی طرح بادشاہ بھی بہتے بہتے کسی دوسری جگہ پہنچ گیا وہاں کا بادشاہ مر چکا تھا۔ وہاں کے لوگوں کا رواج تھا کہ کوئی بھی آدمی کسی بھی حالت میں ہو لیکن اجنبی ہو تو اسے اپنے ملک کا بادشاہ بنا لیتے تھے جب انھوں نے اس آدمی (بادشاہ) کو کنارے پایا تو اُسے اپنا بادشاہ بنا لیا۔ اس کی ملکہ بہتی چلی جا رہی تھی کہ اسے ایک سوداگر نے دریا سے نکالا اور اپنے گھر لے گیا پھر ملکہ سے شادی کرنا چاہا لیکن ملکہ نے سختی سے انکار کر دیا تو سوداگر نے غصہ میں آکر اسے ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ وقت کی بات کہ ایک مرتبہ دھوبی کے بیٹے (بادشاہ کے لڑکے) نوکری کی تلاش میں نکلے اور اسی سوداگر کے یہاں نوکری کر لی. چند دنوں کے بعد سوداگر کے گھر چوری ہو گئی تو اس نے ان دونوں لڑکوں پہ الزام لگا دیا۔ شہزادے اپنی فریاد لے کر بادشاہ (خود اُن کے والد) کے پاس گئے تو بادشاہ نے پوچھا بیٹے تم دکھی معلوم ہوتے ہو کیا بات ہے۔ انھوں نے بادشاہ کو اپنی کہانی سنا دی بادشاہ یہ سن کر بہت خوش ہوا کہ یہ دونوں لڑکے خود اس کے بیٹے (شہزادے) ہیں۔ بادشاہ نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ سوداگر کو حاضر کیا جائے۔ سوداگر لایا گیا اس کے ساتھ ایک عورت (ملکہ) بھی آئی. سپاہیوں نے بتایا کہ حضور اس نے ایک عورت کو بند کر رکھا تھا۔ بادشاہ اس عورت (ملکہ) کو دیکھتے ہی پہچان گیا سوداگر کو قید کر دیا۔

اور بادشاہ، ملکہ اور شہزادے ہنسی خوشی رہنے لگے۔

● زبیدہ خاتون

بی، آئی، ٹی بلاک نمبر ۴/۴۳ آئی، آر روڈ بمبئی ۳

ایک فقیر اور سونے کی دیوی

ایک دن ایک فقیر ایک امیر آدمی کے دروازے کے نزدیک اپنا خالی برتن رکھ کر آواز لگا رہا تھا" خدا کے نام پہ کوئی ایک پیسا اس بوڑھے فقیر کو دے دے" اس بوڑھے فقیر کے سامنے سے بہت سے آدمی گزر رہے تھے لیکن کسی نے بھی اسے کچھ نہیں دیا۔ کچھ دیر کے بعد ایک امیر آدمی اپنے دوست کے ساتھ اسی راستے سے گزرتے وقت کچھ لمحہ کے لیے فقیر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ دونوں دوست بہت اداس تھے امیر آدمی نے فقیر کی طرف دیکھا اور چلّا کر کہنے لگا" تو دوبارہ پھر آگیا" میرے دروازے کے سامنے سے فوراً جاؤ اور کبھی یہاں مت بیٹھنا۔ میں اپنے دروازے پر کبھی بھی فقیر کو دیکھنا نہیں چاہتا ۔ کل میں نے تمھارا منحوس چہرہ دیکھا تھا اسی دن میرا دس ہزار روپے کا نقصان ہوا یہ سن کر فقیر اٹھ کر چلا گیا اور دوسرے دروازے پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ یہ سب امیر لوگ اتنا کافی روپیا رکھتے ہوئے بھی کبھی خوش نہیں رہتے ۔ بلکہ اور زیادہ روپیا جمع کرنا چاہتے ہیں: وہ لوگ لالچی ہوتے ہیں اس لیے ہر وقت اپنی جائداد کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ میرے پاس روپیا نہیں ہے پھر بھی میں لالچی نہیں ہوں۔ اور میں ہمیشہ خوش رہتا ہوں۔

اتنے میں ایک خوب صورت عورت" سونے کی دیوی" فقیر کے سامنے آئی اور کھڑی ہو گئی۔ فقیر اسے دیکھ کر کہنے لگا" خدا کے نام پہ کوئی ایک پیسا اس بوڑھے فقیر کو دے دے"۔ یہ سن کر سونے کی دیوی کہنے لگی میں تمھیں ایک پیسا کے بجائے بہت سارے پیسے دوں گی۔ تم کتنے چاہتے ہو؟ لیکن ہاں تانبا اور چاندی مجھ سے نہیں مانگنا۔ میرے پاس صرف سونا ہے۔

یہ سن کر فقیر بہت خوش ہوا اور کہنے لگا آپ کتنی رحم دل ہیں۔ یہ سب امرا بڑے جھگڑالو اور لالچی ہیں۔ وہ لوگ غریبوں کو کبھی کچھ نہیں دیتے۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن آپ ایک رحم دل عورت ہیں۔

سونے کی دیوی کہنے لگی" تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں دیوی ہوں۔ سونے کی دیوی۔ میں تمھیں اتنا سونے کا سکّہ دوں گی جتنا کہ تم چاہتے ہو۔ کہو تم کتنے سکّے چاہتے ہو؟

فقیر کہنے لگا "مہربانی کر کے میرے اس خالی برتن کو سونے کے سکّے سے بھر دیجیے۔ میں زیادہ نہیں چاہتا ہوں"

"شاباش" سونے کی دیوی نے کہا " یہ لو میرے سونے سے بھری ہوئی تھیلی اور بھرلو اپنا خالی برتن لیکن ہاں اس سے زیادہ نہیں مانگنا" فقیر نے اپنے برتن کو سونے کے سکّے سے بھرلیا۔ اور اسے دیکھنے لگا۔ برتن سکّہ سے بھرا تھا۔ لیکن وہ کافی خوش نہیں تھا۔ وہ اپنے دل میں کہنے لگا" میں بہت بڑا بے وقوف ہوں مجھے اپنا دوسرا برتن بھی لانا چاہیے تھا"

سونے کی دیوی فقیر سے کہنے لگی "کیا اب میں جا سکتی ہوں؟ فقیر اس کی طرف دیکھنے لگا اور بولا" آپ بہت مہربان دیوی ہیں مہربانی کر کے ایک سو سکّے اور دے دیں۔ میں ایک چھوٹا سا مکان خریدوں گا اپنے لیے"

سونے کی دیوی ہنسی اور غائب ہو گئی۔ فقیر ہاتھ ملتا رہ گیا۔ اور جب اس نے اپنے برتن پر نگاہ ڈالی تو برتن سے سونے کے سکّے غائب ہو چکے تھے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

● عمران آرزو

پرانا سیتا رام پور

بردوان

● بچوں کی خوبصورت کتابیں ●

ہماری زبان میں بچوں کی ایسی کتابیں بہت کم چھپی ہیں جو دلچسپ ہونے کے ساتھ مفید اور معلوماتی ہوں۔ مجلس اشاعت ادب دہلی نے ایک مفید سلسلہ شروع کیا ہے اور پانچ کتابوں کا پہلا سیٹ تیار ہو گیا ہے۔ اس میں یہ کتابیں شامل ہیں۔

۱۔ تاریخ عالم کی کہانیاں	حفیظ عباسی	۵/=
۲۔ دنیا کی بہترین کہانیاں	ڈاکٹر شہریار	۵/=
۳۔ چارلس ڈارون	ڈاکٹر اطہر پرویز	۵/=
۴۔ سورج کا انوکھا روپ	ڈاکٹر مسز شہناز خاں	۵/=
۵۔ سرسید کا خواب	ڈاکٹر نورالحسن نقوی	۵/=

یہ تمام کتابیں دلچسپ بھی ہیں اور ان سے بچوں کی معلومات میں بہت اضافہ ہوتا ہے۔ حفیظ عباسی نے دنیا کی تاریخ سے اہم واقعات چُن کے اس طرح بیان کیے ہیں کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں جوش پیدا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شہریار نے دنیا کے نامور افسانہ نگاروں کے بہترین افسانے بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیے ہیں۔ ڈاکٹر اطہر پرویز نے ڈارون کی کہانی سناتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ سائنس کس طرح آگے بڑھتی ہے۔ سولر انرجی کیا ہے اور اس سے کیا کیا کام لیے جا سکتے ہیں، یہ بات ڈاکٹر مسز خان نے بڑے دل نشیں انداز میں سمجھائی ہے ڈاکٹر نقوی نے کہانی کی شکل میں سرسید کے کارنامے خود سرسید کی زبان سے بیان کرا دیے ہیں۔ یہ کتابیں ہمارے بچوں کی ذہنی نشوونما میں بے حد مفید ثابت ہوں گی۔ اگر پروگرام کے مطابق یہ سیٹ مکمل ہو گیا تو یہ اُردو کی بڑی خدمت ہو گی۔ ان باتصویر دیدہ زیب کتابوں کا مطالعہ بچوں اور بڑوں سبھی کے لیے مفید ہے۔

ڈاکٹر سید محمد امین، استاد شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

یہ کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵ سے مل سکتی ہیں۔

لکھیے:- کون سی تصویر پہلے انعام کی مستحق ہے
صراحی
اقبال احمد سبازی
یاسمین خاتون
جامعہ مڈل اسکول نئی دہلی ۲۵
ننھے فنکار

تعلیمی میلے کی جھلکیاں

NEHRU TROPHY

اسلام کے مشہور امیر البحر
اسلام کے مشہور سپہ سالار حصہ اول دوم
عمدہ معلوماتی کتاب
مکتبہ پیام تعلیم جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

Regd No. D(SE)-043

March, 1982

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

[illegible] آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دلی ۶

یامِ تعلیم

بچوں کے اقبال
مکتبہ پیام تعلیم

زبیر ارشاد۔ درجہ ہفتم

نیشنل سروس اسکیم

ایک تعارف

"نیشنل سروس اسکیم" بستی کی سماجی خدمت کا ایک منظم پروگرام ہے جسے حکومتِ ہند کی وزارت تعلیم و سماجی بہبود کی سرپرستی حاصل ہے۔

مقاصد نیشنل سروس اسکیم کے مقاصد میں طلبہ اور طالبات میں سماجی شعور پیدا کرنا اور مندرجہ ذیل کاموں کے مواقع فراہم کرنا شامل ہے۔

۱۔ عوام کے مسائل کو سمجھنا اور ان کے ساتھ کام کرنا
۲۔ سماج کے تعمیری و تخلیقی کاموں میں شرکت
۳۔ اپنی اور بستی کی معلومات میں اضافہ
۴۔ اپنی صلاحیتوں کو مسائل کے حل کے لیے عملی طور پر استعمال کرنا اور انھیں بروئے کار لانا
۵۔ جمہوری رہنمائی کی صلاحیت پیدا کرنا۔
۶۔ ناخواندہ اور تعلیم یافتہ عوام کی خلیج کے درمیان ایک پل کی حیثیت اختیار کر کے سماج کے کمزور طبقے کی خدمت کی لگن پیدا کرنا

مندرجہ بالا مقاصد کی روشنی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نیشنل سروس اسکیم، یونٹ نے جامعہ کی آس پاس کی بستیوں میں گذشتہ دس سال میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ بستیوں میں کام کے دوران ہمیشہ اس بات پر مخصوص توجہ دی گئی کہ طلبہ اور طالبات ایک طرف تو اپنے کام سے کچھ نہ کچھ سیکھیں اور اپنی تعلیم کو مزید بامعنی بنا سکیں اور دوسری طرف بستی کے کمزور طبقوں کی ان کے مسائل کو سمجھ کر خدمت انجام دے سکیں۔

N.S.S. کیا ہے؟

صوفیہ خاتون
وزیر تعلیم بچوں کی حکومت

این ایس ایس (نیشنل سوشل سروس) ایک سماجی خدمت کی اسکیم کا نام ہے۔ این ایس ایس کے کارکنان نے جب ہمارے اسکول میں اس کا ذکر کیا تو بچوں کے دل میں بھی سماجی خدمت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور ہم نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس میں حصہ لیا۔ این ایس ایس سے متعارف کرانے کے لیے اکتوبر کی گلابی سردیوں میں ۳ دن کا ایک کیمپ لگایا گیا۔ اس طرح ہمیں پتا چلا کہ بچے کس طرح سماجی خدمت کر سکتے ہیں۔ ہم بچے ۳ طریقوں سے سماجی خدمت کر سکتے ہیں۔

۱۔ غریب طلبہ کے لیے پڑھائی کا انتظام کرنا۔
۲۔ ان کے لیے اچھے قسم کے گروپ والے کھیل کرانا
۳۔ ان کے لیے کلچرل پروگرام کرنا۔

یہ طریقے کافی آسان بھی تھے اور دلچسپ بھی۔ اس کے بعد جب کیمپ ختم ہوا تو ہم نے دوسرے بچوں کو اس کا مقصد بتایا۔ اس طرح اور بچوں نے بھی اس اسکیم میں حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی۔ پھر ایک بڑے کیمپ کا انتظام کیا گیا اور تقریباً سو بچوں نے اس میں حصہ لیا۔ اس کیمپ میں بچوں کی مختلف صلاحیتوں کو ابھارا گیا۔ کیمپ فائر کے ذریعے ہم کو کلچرل پروگرام کرنے کا طریقہ اچھی طرح سے معلوم ہو گیا۔ شام کو ہم مختلف گروپ گیمس کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہمیں پیپر کرافٹ وغیرہ بھی سکھایا گیا۔ اسی دوران میں ہمیں مختلف ڈاکومینٹری فلم دکھائی گئیں جن سے ہمیں سائیکل چلانے کے اصول اور سڑک پر چلنے کے اصول وغیرہ کے بارے میں ضروری معلومات دی گئیں اس کے علاوہ ہم نے بستی میں جا کر بچوں کے ساتھ کلچرل پروگرام کیے۔

کا پروگرام ہوا۔

پھر ہم بچوں کو تین گروپس میں بانٹ دیا گیا اور ہر گروپ کے کام بتا دیے گئے۔ ایک گروپ پڑھائی کا انتظام کرتا ہے دوسرا گروپ بچوں کے لیے کلچرل پروگرام کرتا ہے اور تیسرا گروپ

تکمیل کرواتا ہے۔ این ایس ایس کے والنٹیر ان کاموں میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ وقت پڑنے پر رئیس صاحب ہماری مدد کرتے ہیں۔ ہر مہینے کاموں کا تبادلہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہم لوگ آج کل ایک اچھے کام پر لگے ہوئے ہیں اور ان کو باقاعدہ ذمے داری سے پورا کر رہے ہیں اور انشاء اللہ مستقبل میں بھی اس کام کو کرتے رہیں گے۔

تعلیمی میلے میں این ایس ایس کا کام

پچھلے دنوں تعلیمی میلے میں این ایس ایس نے بہت اچھا رول ادا کیا۔ اتنے بڑے ہنگامے میں این ایس ایس کے والنٹیرس نے نہرو ٹرانی اور گاندھی ٹرانی کے مقابلوں کے لیے نشست کا انتظام بہت اچھی طرح کیا۔ اس کے علاوہ پروگرام کے دوران بھی این ایس ایس کے والنٹیر اپنا کام کرتے رہے۔ بیچ بیچ میں لوگوں کے لیے پانی کا انتظام تھا۔

بچوں کا خوانچہ، اسکول کا ایک اہم پروجیکٹ تھا اس میں بھی این ایس ایس کے لوگوں نے مدد کی۔ اس مجمع میں اگر کوئی بچہ اپنے ساتھی سے بچھڑ جاتا تو وہ فوراً این ایس ایس کے [illegible] پر اطلاع کر دیتا۔ اس کے علاوہ بہت اچھی قسم کی موسیقی [کا ا]نتظام تھا۔

نہرو ٹرانی اور گاندھی ٹرانی کے مقابلوں کے لیے شامیانے [کا انت]ظام بھی ان ہی کی طرف سے تھا۔ تعلیمی میلے کے دوران ۳ دن [لگاتار] برابر۔ این۔ ایس ایس کے والنٹیرس نے اسکول کے احاطے [کو] صاف ستھرا رکھا۔ غرضیکہ این ایس ایس کا کام اس میلے میں بہت اہم تھا اور ہم لوگوں نے اس کام کو اچھی طرح پورا کیا۔

این۔ ایس۔ ایس میں جامعہ مڈل اسکول کے ۱۰۰ سے زائد طلبہ اور طالبات بھرپور حصہ لے رہے ہیں۔ ہر دن تین گروپ مختلف کام کرتے ہیں۔ اس طرح اٹھارہ گروپ اپنے اپنے کاموں (۱) ان پڑھ بچوں اور کمزور طلبہ کو تعلیم دینا (۲) انھیں اجتماعی کھیل کھلانا (۳) ان کے لیے کلچرل پروگرام تیار کرنا اور بستی کے بچوں کو اس میں شامل کرنا) میں بڑی تن دہی سے لگے ہوئے ہیں۔ ہر دن اور ہر گروپ کے الگ الگ طلبہ کے نام اس طرح ہیں۔

پیر

I

۱۔ محمد اسمٰعیل مانیٹر
۲۔ تو قیر اکرام
۳۔ مسرور احمد
۴۔ لیٰسین احمد
۵۔ خورشید بیگم
۶۔ محمد خالد
۷۔ محمد تقی
۸۔ مرزا ظفر بیگ

II

۱۔ صوفیہ خاتون مانیٹر
۲۔ امجد نصیر
۳۔ پرویز
۴۔ صالحہ
۵۔ زاہد علی صدیقی
۶۔ ارشد نصیر
۷۔ جاوید حسین

III

۱۔ مرتضیٰ علی گوہر مانیٹر
۲۔ مظفر علی
۳۔ گلزار علی
۴۔ ریحان
۵۔ عابد علی
۶۔ رخسانہ شریف
۷۔ شرف الدین

منگل

I

۱۔ تنویر اکرام مانیٹر
۲۔ ساجد علی
۳۔ محمد عادل
۴۔ محمد ایوب
۵۔ ذکیہ بیگم
۶۔ جمشید نثار
۷۔ عبدالرؤف
۸۔ الماس

II

۱۔ عابدہ بیگم مانیٹر
۲۔ سائرہ بانو
۳۔ مرزا قمر الحسن
۴۔ خالد نثار
۵۔ افتخار احمد
۶۔ اسجد مجید
۷۔ فرحانہ رحیم
۸۔ فریدہ احمد خاں

III

۱۔ منظور الحق مانیٹر ۲۔ عذرا خاتون
۳۔ ناصر جلال ۴۔ محمد ابراہیم
۵۔ احتشام ۶۔ نفیسہ بانو
۷۔ ناہید جہاں ۸۔ محمد ہارون

بدھ

I

۱۔ راشد رفیق مانیٹر ۲۔ انعام خورشید
۳۔ شمامہ خورشید ۴۔ محمد نصرت
۵۔ فیروز

II

۱۔ محمد نوید مانیٹر ۲۔ سروری بانو
۳۔ انتخاب عالم خاں ۴۔ خواجہ حبیب الرحمن
۵۔ گوہر شمیم ۶۔ فخر عالم خاں
۷۔ روست الآرا

III

۱۔ حسنہ بانو مانیٹر ۲۔ عرفان العزیز
۳۔ یاسمین خاں ۴۔ عرفان علی صدیقی
۵۔ شیمی مشیر ۶۔ محمد عمران
۷۔ نکہت پروین ۸۔ رضوانہ اسعد

جمعرات

I

۱۔ شاہدہ خاتون مانیٹر ۲۔ عالیہ خاتون
۳۔ انیسہ بیگم ۴۔ طلعت النساء
۵۔ ارشد الاسلام ۶۔ عبد العلیم

II

۱۔ ضیاء حیدر مانیٹر ۲۔ رضاء اختر فاروقی
۳۔ سراج الدین ۴۔ آصف خاں
۵۔ محمد ادریس

III

۱۔ اعجاز حسین زیدی مانیٹر ۲۔ طارق اختر
۳۔ نجم السحر ۴۔ احتشام
۵۔ جہاں آرا ۶۔ شہناز پروین
۷۔ تشکیل احمد

جمعہ

I

۱۔ نشاط پروین مانیٹر ۲۔ ارشد جمال
۳۔ تنویر بانو ۴۔ محمد افضل
۵۔ فرحانہ ناز ۶۔ شائستہ نسیم

II

۱۔ فرید حسین مانیٹر ۲۔ عبد الرحیم
۳۔ ضیاء الرحمن ۴۔ عبد الرحمن قریشی
۵۔ محمد صابر ۶۔ تبسم طاہرہ زیدی

III

۱۔ محمد سعید خاں مانیٹر ۲۔ قیام الدین
۳۔ شبینہ مجیب ۴۔ شرافت اللہ
۵۔ یوسف تشکیل ۶۔ ماریہ جمال
۷۔ رضوانہ نقوی

سنیچر

I

۱۔ کامل حسن مانیٹر ۲۔ شہزاد احمد
۳۔ محمد حنیف ۴۔ شاہین پروین
۵۔ عاصم رشید ۶۔ ریاض الدین

II

۱۔ زبیر ارشاد مانیٹر ۲۔ امینہ اختری
۳۔ اسلم رشید ۴۔ محمد عثمان
۵۔ تاجدار فاطمہ ۶۔ امتیاز احمد انصاری

III

۱۔ محمد طالب مانیٹر ۲۔ شبانہ ذکری
۳۔ مختار علی انصاری ۴۔ صالحہ بیگم

مختلف پروجیکٹ اور تعلیمی نمائش

تعلیمی میلے کے موقع پر پہلے اسکول میں جو تعلیمی کام ہوتے تھے ان کی خاص طور سے نمائش کی جاتی تھی جیسے پروجیکٹ۔ کاغذ کا کام۔ سائنس کے تجربے، بچوں کی ڈرائنگ کے شاہ کار اور دیواری اخبار وغیرہ وغیرہ۔

اس سال کی تعلیمی نمائش میں صرف موجودہ تعلیمی کاموں ہی پیش نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ گذشتہ چند برسوں میں چلائے جانے ہوئے تعلیمی پروجیکٹس کی نمائش بھی لگائی گئی تھی۔

پروجیکٹ کی تیاری

"پروجیکٹ میتھڈ" دراصل تعلیم کا ایک ایسا طریقہ ہے جس میں کسی ایک موضوع پر بچے اس کے متعلق مضامین لکھتے ہیں۔ تصویریں بناتے۔ تصویریں جمع کرتے ہیں۔ چارٹ بناتے ہیں۔ پمفلٹ بناتے ہیں۔ غرض یہ کہ اس موضوع سے مربوط کر کے کو سارے مضامین میں مختلف معلومات دی جاتی ہیں اور پھر اس کے وہ سارے تجربے جو وہ عملی طور پر کرتے ہیں۔ ایک پمفلٹ کی شکل میں یکجا کر لیے جاتے ہیں۔"

اس سال اسکول میں دو پروجیکٹ "باغبانی پروجیکٹ" "شہر دہلی پروجیکٹ" چلائے گئے۔ تعلیمی میلے کی نمائش میں دونوں پروجیکٹ اور ان کے علاوہ گذشتہ چند سالوں میں چلائے گئے چیدہ چیدہ پروجیکٹ پیش کیے گئے تھے جو دیکھنے والوں نے بہت پسند کیے

میوزیم

اس کے علاوہ سائنس روم کو میوزیم کی شکل دی گئی جس میں بچوں کے بنائے ہوئے بہت سے ماڈل۔ بچوں کے جمع کیے ہوئے پھول پتیاں۔ ان کے بنائے چارٹس اور بچوں کی جمع کی ہوئی بہت ساری چیزیں رکھی گئی تھیں۔

پیپر کرافٹ

پیپر کرافٹ کا ایک الگ کمرہ تھا یوں تو کاغذ کے کام میں بہت ساری چیزیں جیسے گتے کا کام، تھوڑا سا مٹی کا کام اور لکڑی کا کام بھی شامل ہے لیکن پیپر کرافٹ کی اس سال کی نمایش میں خاص بات یہ تھی کہ صرف کاغذ کو پھاڑ کر کتنی طرح کی چیزیں بنائی جاسکتی ہیں اس کی نمایش کی گئی تھی اور واقعی بچوں کے ان کاموں کو دیکھ کر ہر ایک عش عش کر اٹھا اور سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ہمارے نزدیک جو چیزیں بیکار محض ہیں اور ہم انھیں کوڑے میں پھینک دیتے ہیں بچوں نے انھیں کس خوبی سے استعمال کیا ہے یہ سارا کام استاد محترم جناب تصدق صاحب کی نگرانی میں انجام پایا تھا جو اپنے فن کے استاد ہیں۔

ماضی کی ایک جھلک

باغبانی پروجیکٹ اور نمایش کا کام استاد محترم جناب محبوب الرحمٰن صاحب کی نگرانی میں انجام پایا۔ ان کاموں کے سلسلے میں ان کی رپورٹ کا ایک حصّہ ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔

"تعلیمی نمایش کا اہتمام دو کمروں میں کیا گیا تھا۔ پہلے کمرے میں جامعہ کی ابتدائی زندگی۔ اس کے ادوار، پرانے جامعی جیسے کیلاٹ صاحب۔ حکیم اجمل خاں۔ ذاکر صاحب۔ ڈاکٹر عابد حسین صاحب۔ جرمن آپا جان۔ شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور فقیرا ماما اور دوسرے اکابرین جامعہ۔ پھر مدرسہ ابتدائی اور ثانوی کا قیام خصوصاً مدرسہ ابتدائی کے مشاغل بچوں کی حکومت اور اس کے زیر اہتمام جملہ مشاغل۔ مستقل منصوبوں کا جال۔ پھر بچوں کی حکومت اور بچوں کی اس معصوم دنیا پر ایک شعر ؂

یہ بچوں کی دنیا یہ دنیا ہماری
فرشتوں کی دنیا سے ہے کتنی پیاری

اور آخر میں مدرسہ کی جملہ سرگرمیوں سے متعلق چارٹس کا ایک سلسلہ پیش کیا گیا تھا جس کا عنوان تھا "ہمارا کام، ہمارا ایمان"

اپریل ۱۹۸۲ء | جلد ۱۹ | شمارہ ۴

اڈیٹر: ولی شاہجہانپوری

فی پرچہ ڈیڑھ روپے — سالانہ پندرہ روپے
غیر ممالک کے لیے 55 روپے

بچوں سے باتیں

جامعہ مڈل اسکول کے طلبہ اور اساتذہ کو مبارک ہو کہ ان کے مرتب کیے ہوئے تعلیمی میلا نمبروں کو پیامیوں نے بہت پسند کیا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ اسکولی طلبہ نے اور اُن کے اساتذہ نے بھی اس قسم کی تقریبات میں دلچسپی لینے پر غور کیا ہوگا۔ ضروری نہیں کہ جامعہ مڈل اسکول کی تمام سرگرمیاں اپنائی جائیں لیکن کچھ تو ضرور ایسی ہیں جیسے تقریری مقابلہ، کہانیاں سنانا، بیت بازی وغیرہ جنھیں طلبہ بغیر استاد کی مدد کے شروع کر سکتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر آپ لوگ اسے شروع کریں تو آپ کے اساتذہ ضرور ہمت افزائی کریں گے۔ اِس قسم کی خبروں کے لیے پیامِ تعلیم کے صفحات حاضر ہیں۔

بعض ننھے فنکار پنسل سے تصویریں بنا کر بھیجتے ہیں۔ یہ طریقہ غلط ہے۔ تصویریں سیاہ روشنائی سے ہی بنانی چاہییں۔ پنسل یا کسی اور رنگ کی بنی ہوئی تصویریں شائع نہ ہو سکیں گی۔ "بچوں کی کوششیں" میں لکھنے والے اپنی عمر یا مدرسے کی جماعت ضرور لکھا کریں۔ اس شمارے میں جناب مسعود احمد برکاتی کی عنایت سے ان کے رسالے "نونہال" کراچی کے شکریے کے ساتھ دو مفید اور دلچسپ مضمون پیش کر رہے ہیں۔ ایک ہے حکیم محمد سعید صاحب کا "طب کی روشنی میں" اور دوسرا ہے "سبزیوں کا مشاعرہ" جسے جناب ناصر زیدی نے لکھا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہ سکے گا۔

اس درمیان میں دو عظیم شاعروں جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری صاحبان کے انتقال کی خبریں آپ نے پڑھی یا سُنی ہوں گی۔ یہ اُردو ادب کی عمارتوں کے اہم ستون تھے۔ ان کے کارنامے آپ اونچی جماعتوں میں پڑھیں گے۔

میری علالت نے یکم مارچ تک ۹ ماہانہ منزلیں طے کر لی ہیں اور ابھی تک اس کی اجازت دینے کو تیار نہیں ہے کہ میں اپنے پیروں چل کر دفتر آ جا سکوں جو زیادہ دور نہیں ہے۔ احباب و اعزا کے بہت سے خطوط عیادت کے سلسلے میں آئے اور آ رہے ہیں۔ میرے لیے فرداً فرداً جواب دینا ناممکن سا ہے۔ بہرحال جس ذریعے سے علالت کی خبر دی گئی تھی اسی ذریعے سے تمام بہی خواہوں کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ اسے قبول کر کے مزید شکریے کا موقع عنایت کریں گے اور دعا کرتے رہیں گے۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

کرکٹ
کہانی اور تصاویر :- جاوید نہال حشمی

آئینہ

پروفیسر غلام دستگیر

مجھ سے کیا پوچھتے ہو کیا ہوں میں حق نگر ہوں میں حق نما ہوں میں
یوں تو ظاہر کو دیکھتا ہوں میں راز دل کے بھی جانتا ہوں میں
دوست سب کا ہوں بے ریا ہوں میں
صاف باطن ہوں آئینا ہوں میں

طفل ہو، نوجواں ہو، بوڑھا ہو کوئی دوشیزہ ہو کہ بڑھیا ہو
کوئی پنڈت ہو، کوئی مُلّا ہو کوئی خادم ہو کوئی آقا ہو
سب ہی میرے حضور آتے ہیں
اپنی قسمت سنوار جاتے ہیں

زُلف پُر خم سنوار دیتا ہوں شکل و صورت نکھار دیتا ہوں
سب کو حُسنِ بہار دیتا ہوں دولت بے شمار دیتا ہوں
اہلِ دُنیا سے پیار کرتا ہوں
اپنی ہستی نثار کرتا ہوں

سامنے جب بھی میرے آتے ہیں اپنے چہرے مجھے دکھاتے ہیں
اپنے عیب و ہُنر بتاتے ہیں اپنی رُودادِ دل سناتے ہیں
حوصلے سب کے میں بڑھاتا ہوں
سب کو جینے کا گُر سکھاتا ہوں

سامنے جو بھی میرے آتا ہے آپ اپنے کو بھُول جاتا ہے
شان اپنی کوئی دکھاتا ہے کوئی اپنا ہی مُنھ چِڑاتا ہے
لاکھ عاقل ہوں لاکھ فرزانے
رُوبرو میرے سب ہیں دیوانے

طفل جب اشکِ غم بہاتا ہے اور پدر آئینہ دکھاتا ہے
اپنا غم طفل بھُول جاتا ہے پھُول کی طرح مُسکراتا ہے
دِل کے آئینے آؤ چمکائیں
اور خوشیوں کے باغ مہکائیں

۲۴۷ سبحان مینشن لڈکٹ واڑی۔ پونے

پروفیسر قنبر احمد رضوی

(دوسری قسط)

۲۹ رمئی ۱۴۵۳ء کی فتح کے بعد سے قسطنطنیہ کو دولت عثمانیہ کی راجدھانی بنا دیا گیا اور شہر کا نام استنبول رکھ دیا گیا۔ یہ شہر علم کی آماجگاہ اور مشرقی و مغربی تہذیب کا سنگم بن گیا۔ ایک نئی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ ایک نئی روشنی جگمگائی۔ مسلم تہذیب صناعی اور آرٹ۔ لائبریری۔ ترکی فن تعمیر۔ مدرسوں اور ترکی محلوں و قصروں سے استنبول کا وسیع دامن بھر گیا۔ اگرچہ یونانی علما و فنکار ترکی کو چھوڑ کر جا چکے تھے پھر بھی ترکوں نے ان کے تہذیبی نقوش کو استنبول میں محفوظ رکھا۔ جو ترکوں کی وسیع القلبی کا مظہر ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد جب ۱۹۲۳ء میں اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی میں جمہوری نظام قائم کیا تو شہر استنبول کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ البتہ راجدھانی منتقل کر کے انقرہ یا انگورا، میں اناطولیہ پٹھار پر قائم کر دی گئی۔ شہر استنبول جو ۴۶۰ سال تک دولت عثمانیہ کا دارالسلطنت رہا تھا، آج صرف ایک ولایت یا صوبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج بھی اس شہر کا تاریخی سرمایہ اور اس کی تجارت و صنعت، عمارتیں اور تہذیبی نقوش سیاحوں کے لیے دلکشی کا سبب بنے ہوئے ہیں۔

اس شہر کا سب سے بڑا حسن یہی ہے کہ قدم قدم پر نئی اور پرانی تہذیب، تاریخ اور جغرافیہ کا شاندار مگر متضاد سنگم نظر آتا ہے۔ ایک طرف بایزید میدان کے ایک سرے پر استنبول یونیورسٹی کی شاندار عمارت ایک خوبصورت چوک اور فواروں کے ساتھ شہر کے قدیم حصے کی عظمت کو ظاہر کرتی

شہر استنبول
ISTANBUL

صدر شعبۂ جغرافیہ، اے، کے کالج شکوہ آباد ۲۰۵۱۳۵

ہے تو دوسری طرف مسجد بایزید کے صحن میں جو قدیم حصے میں واقع ہے۔ شاندار آتشی مینار آج بھی نمایاں ہے یہ مسجد جس کی تعمیر ۱۵۰۶ء میں ہوئی استنبول کی سب سے قدیم مسجد ہے۔ یورپی حصے میں خلیج باسفورس کے سب سے تنگ حصے کے سرے پر حصار رومیلی (رومی قلعہ) اور ایشیائی حصے کی طرف حصار اناطولیہ (اناطولیہ کا قلعہ) تعمیر ہے۔ قدیم یونانی فن تعمیر کا بہترین نمونہ "ہیگیا صوفیہ" یا "ایا صوفیہ" بھی ایک نادر تاریخی عمارت ہے۔ استنبول میں ایک طرف کئی زمین دوز وسیع حوض اور خوبصورت فوارے جا بجا دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف متعدد قبرستان و مقبرے بھی سارے شہر میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔

سترھویں صدی کی صناعی کا حسین نمونہ "مسجد سلطان احمد" یا "نیلی مسجد" ہے۔ یہ مسجد صدف کار محمد آغا کی نگرانی میں آٹھ سال کی محنت کے بعد ۱۶۱۷ء میں مکمل ہوئی۔ اس کی لمبائی ۲۳۵ فٹ (تقریباً ۷۲ میٹر) چوڑائی ۲۸ فٹ (تقریباً ۹ میٹر) اور وسطی گنبد کا قطر ۱۱۰ فٹ (تقریباً ۳۴ میٹر) ہے یہ دنیا کی واحد مسجد ہے جس میں چھ مینار ہیں۔ مسجد سے ملحق ایک مدرسہ، مطبخ اور دوسری عمارتیں ہیں۔

جن سات پہاڑیوں پر شہر استنبول بسا ہوا ہے ان میں سے تیسری پہاڑی پر سب سے عظیم ترکی معمار "سنان" کے ہاتھوں بنی ہوئی "مسجد سلیمانی" واقع ہے جو ۱۵۵۷ء میں مکمل ہوئی تھی۔ مسجد کا اندرونی حصہ ۲۲۶ فٹ (۶۸ میٹر) لمبا اور ۲۰۷ فیٹ (۶۲ میٹر) چوڑا ہے اور وسطی گنبد کی اونچائی ۱۷۴ فیٹ (۵۲ میٹر) ہے۔ مسجد میں ہوا اور روشنی کے لیے ۱۳۸ کھڑکیاں بنائی گئی ہیں اور صحن میں خوبصورت سنگ مرمر کا کام کیا گیا ہے۔ بیرونی اور اندرونی تعمیر میں بھی یکسانیت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ غراطہ کے پل کے پاس قدیمی حصے میں ایک نئی مسجد بھی بنی ہے جو جدید فنکاری کا بہترین نمونہ ہے۔

موجودہ دور کی سب سے عجیب تعمیر استنبول کا لمبا چوڑا چھایا ہوا بازار ہے۔ یہ مشرقی دنیا کا ایک انوکھا بازار ہے جس میں ایک ہی چھت کے نیچے ہزاروں دکانیں بنائی گئی ہیں۔ باہر سے لوگ تیرہ دروازوں میں ہوکر گھومتی ہوئی گلیوں میں ہوتے ہوئے اندر جاتے ہیں۔ اس بند بازار میں سب سے زیادہ خطرہ ایک وقت ہوتا ہے۔ جب اچانک آگ لگ جائے یا زلزلہ آجائے۔ ۱۰ جولائی ۱۸۹۴ء اور ۲۴ نومبر ۱۹۵۴ء کی بھیانک آگ میں ہزاروں دکانیں جل کر خاک ہوگئیں مگر جلد ہی ان کی مرمت کر کے صورت بحال کر دی گئی۔

"توپ کاپو" میں واقع عثمانی حکمرانوں کا محل جو نہایت وسیع اور شاندار تھا آج ایک میوزیم یا عجائب گھر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ یہاں قدیم و جدید نوادرات محفوظ کر دیے گئے ہیں اس میں صرف ترکی نوادرات ہی نہیں بلکہ یونانی، رومی اور بازنطانی آرٹ کے نمونے۔ مصری، سامری، بابلی اور اسیریائی قدیم تہذیب کے نقوش موجود ہیں اس میوزیم کو "اوقات" کہتے ہیں۔ یہاں عہد اسلامی کے فن اور ترکی صنعت کے بیش قیمت نمونے بھی رکھے گئے ہیں جس میں پندرھویں صدی کے غالیچے و قالین سلطانوں اور شاہزادوں کے نادر ملبوسات، زردوزی۔ موتی اور سیپ کے جڑاؤ کام دار کپڑے اور نایاب برتن ہی نہیں بلکہ قیمتی دستاویزات اور مخطوطات بھی بحفاظت تمام موجود ہیں۔

شہر استنبول قدیم و جدید شان و شوکت کے درمیان ایک عجیب بین اقوامی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ جدید استنبول حسین ہوٹلوں، خوبصورت ریستوراں، کشادہ شاہراہوں، فلیٹوں اور [illegible] کے مرکزوں، کلبوں، تھیٹروں، اسٹیڈیم اور جدید قسم کے بازاروں اور دکانوں سے مزین ہے۔ سب سے زیادہ حسن تو اس شہر کو مناظر قدرت

(باقی صفحہ ۱۶ پر)

سبزیوں کا مشاعرہ

ناصر زیدی

بھنڈی: محترم سامعین، بھنڈی آپ کی خدمت میں حاضر ہے اور سلام عرض کرتی ہے آج ہم اپنے ننھے منّے دوستوں کے لیے سبزیوں کا مشاعرہ پیش کر رہے ہیں۔ اس مشاعرہ محفلِ شعر و سخن منعقد ہے۔ اس کی صدارت کے فرائض محترم بینگن انجام دے رہے ہیں۔ مشاعرے میں جو مشہور شعرا اور شاعرات اپنے کلام پیش کریں گے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

جناب ٹماٹر، محترمہ گوبھی، جناب آلو، محترمہ گاجر، جناب بیلا، جناب بینگن اور یہ ناچیز بھنڈی۔

میں محترم بینگن سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہوں۔

سب مل کر: ہم تائید کرتے ہیں۔

بھنڈی: جناب صدر کی اجازت سے مشاعرے کا آغاز کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے میں خود میزبان کی حیثیت سے اپنا کلام پیش کرتی ہوں۔

سب مل کر: "جی ارشاد!"

بھنڈی: "حضرات! مطلع عرض کرتی ہوں۔"

میں ہوں بھنڈی بہت لذیذ و حسیں
کوئی سبزی بھی میری طرح نہیں
سبزیوں میں ہے شمار مرا
ذکر کرتے ہیں شہریار مرا

سب سبزیاں: واہ واہ، کیا خوب شعر ہے، مکرر ارشاد ہو۔

(بھنڈی دوبارہ شعر پڑھتی ہے)

بھنڈی: شعر عرض کیا ہے۔

حاضرین۔ ارشاد فرمائیے۔

بھنڈی: ذائقہ میرا لطف کا ساماں
سبزیوں میں ہے میرا سکّہ رواں
نازنین بھی مجھ کو کہتے ہیں
"لیڈی فنگر" بھی مجھ کو کہتے ہیں

اور آخری شعر عرض ہے۔

شاہزادی ہوں سبزیوں کی ہوں ہے بجا جس قدر بھی ناز کروں

ت ماہنامہ نونہال کراچی ۸۳

سب مل کر: واہ واہ! سبحان اللہ، کیا خوب نظم سنائی ہے۔
بھنڈی: بہت بہت شکریہ، مہربانی آپ کی۔
بھنڈی: اور اب میں دعوتِ کلام دیتی ہوں جناب ٹماٹر کو، آئیے، ٹماٹر صاحب!
ٹماٹر: جی، عرض کیا ہے۔

میں ٹماٹر ہوں سُرخ صورت ہوں
سب گھروں کی بڑی ضرورت ہوں

ایک سامع: واہ واہ کیا خوب شعر کہا ہے "سب گھروں کی بڑی ضرورت ہوں۔" پھر ارشاد کیجیے۔
(ٹماٹر مطلع دُہراتا ہے۔)
ٹماٹر: شعر سماعت فرمائیے!

مجھ سے سالن میں ذائقہ آئے
میری لذّت ہر ایک کو بھائے

سب مل کر: واہ واہ! کیسا لذیذ شعر ہے۔ منھ میں پانی بھر آیا ہے۔
ٹماٹر: نوازش، کرم، عرض کرتا ہوں۔

یوں تو مجھ کو پکا کے کھاتے ہیں
لوگ کچّا چبا بھی جاتے ہیں
یوں بھی لذّت بڑھائی جاتی ہے
میری چٹنی بنائی جاتی ہے

سب سبزیاں: واہ واہ، کیا خوب شعر ہے۔
ٹماٹر: بہت بہت شکریہ۔ آپ کا حُسنِ سماعت ہے ورنہ میں کیا ہوں۔
"جی! تو شعر عرض کیا ہے۔"

ہے ہر اک شخص میرا گرویدہ
سارے عالم کا ہوں پسندیدہ

سب مل کر: واہ واہ، کیا خوب صورت کلام ہے۔ بہت عمدہ نظم سنائی آپ نے ٹماٹر صاحب!
ٹماٹر: شکریہ، کرم، عنایت۔
بھنڈی: یہ تھے جناب ٹماٹر، جو اپنا کلام سُنا رہے تھے اور اب درخواست کرتی ہوں، محترمہ گوبھی سے۔ گوبھی صاحبہ تشریف لائیے۔ ہمیں اپنے کلام سے نوازیے۔"
سب حاضرین: آئیے گوبھی صاحبہ!
گوبھی: حضرات! نظم پیش کرتی ہوں۔ سماعت فرمائیے!

میں ہوں گوبھی حسین و خوش گل ہوں
سبزیوں کی میں جان ہوں، دل ہوں

سب مل کر: واہ واہ! سبحان اللہ، کیسا اچھا تعارف کرایا ہے اپنا، مکرر فرمائیے۔
(گوبھی مطلع دہراتی ہے)
گوبھی: شعر سنیے۔

گوشت میں بھی مجھے پکاتے ہیں
گوبھی آلو بھی لوگ کھاتے ہیں

حاضرین: واہ واہ سبحان اللہ، کیا خوب آلو کے ساتھ میل ملایا ہے۔
گوبھی: شکریہ، شعر عرض کرتی ہوں۔

پھول جتنے بھی ہیں زمانے میں
صرف واحد ہوں میں پکانے میں

سب حاضرین: بے شک! حقیقت بیان کردی ہے آپ نے۔
گوبھی: یہ شعر دیکھیے۔

آب ہے میری مرتبے کی آب
میں ہمیشہ ہوں تازہ و شاداب
کس کو دعوا ہے برتری کا یہاں
مجھ سے بڑھ کر ہے کس کا نام و نشاں
نونہالوں میں ہوں بہت مقبول
وہ بھی سب پھول میں بھی ہوں اک پھول
سبزیوں میں، میں سب سے اعلا ہوں
گویا سب سبزیوں کی خالا ہوں

سب مل کر: واہ واہ! خالہ صاحبہ کیا نظم سنائی ہے آپ نے خوب، بہت خوب!
بھنڈی: خواتین و حضرات! ابھی آپ محترمہ گوبھی سے اُن کا کلام سُن رہے تھے۔ اور اب تشریف لاتے ہیں حضرت کریلا۔ آئیے کریلا صاحب!"

کریلا: جی، عرض کرتا ہوں۔

ایک سامع: آپ کے اشعار تو یقیناً بڑے کڑوے کسیلے ہوں گے۔

بھنڈی: حضرات! ایسی باتیں آدابِ محفل کے خلاف ہیں۔ آپ خاموشی سے کلام سنیے۔

کریلا: سنیے، مطلع عرض کرتا ہوں۔

جامہ بھی سرسبز ہے میرا اور کریلا نام
کڑوا کسیلا لوگ پکاریں، میٹھا میرا کام

سب حاضرین: واہ واہ! سبحان اللہ، مطلع میں ہی بہت بڑی غلط فہمی دور کر دی آپ نے۔

کریلا: شعر سماعت فرمائیے:

گوشت اور پیاز ملا کر مجھ کو لوگ مزے سے کھائیں
کڑوا سمجھ کر جو نہ کھائیں، دیکھیں اور للچائیں

حاضرین: بہت خوب، ماشاء اللہ۔

کریلا: شعر دیکھیے:

بیج ہیں میرے موتی جیسے شکل بھی میری پیاری
دور ہو میرے کھانے سے سب گھر گھر کی بیماری

سب حاضرین: واہ کیا حقیقت بیان کی ہے۔ بیماری دور کرنے کی اچھی تدبیر ہے۔

"شکریہ! عرض کیا ہے:

جو بھی سبزی ہے وہ مجھ سے رتبے میں ہے کم تر
سامنے آئے جو بھی سمجھے خود کو مجھ سے بہتر

حاضرین: واہ واہ! بہت خوب۔ کیا دعوا ہے بڑائی کا۔

بھنڈی: ابھی آپ حضرات کریلا کے نیم چڑھے اشعار سن رہے تھے۔ اب درخواست کرتی ہوں محترمہ گاجر سے کہ مائیک پر آئیں اور اپنا کلام عطا فرمائیں۔

گاجر: تعمیلِ ارشاد میں حاضر ہوں۔ ایک نظم پیش کرتی ہوں۔

نام میرا اگرچہ گاجر ہے
ذائقہ سیب سے بھی بڑھ کر ہے

حاضرین: واہ واہ! سبحان اللہ، پھر ارشاد فرمائیے۔ کیا خوب مطلع کہا ہے۔

(یہ مطلع گاجر مکرر پیش کر دیتی ہے۔)

گاجر: رنگ میرا گلاب جیسا ہے
مرتبہ میرا سب سے اونچا ہے
میرا دم عام لوگ بھرتے ہیں
بڑے چھوٹے پسند کرتے ہیں
میں ہوں رس اور حلاوتوں سے بھری
کوئی موسم ہو رہتی ہوں میں ہری
حلوہ کھا کر کوئی بتائے ذرا
سبزیوں میں شمار کیوں ہو مرا

سب حاضرین: واہ واہ، بے شک خوب کہا ہے آپ نے جس کا حلوہ اور مربا بنتا ہو، وہ بھلا سبزی کیسے ہو سکتی ہے؟

بھنڈی: ابھی آپ نے گاجر صاحبہ سے رس بھرا کلام سنا، اب میں زحمتِ سخن دے رہی ہوں مسٹر آلو کو، آلو صاحب تشریف لائیں اور اپنا کلام عطا فرمائیں۔

آلو: جی، حاضر ہوتا ہوں، چند اشعار سماعت فرمائیے اگر کسی قابل ہوں۔

دوستو! میرا نام ہے آلو
اور سب سبزیوں کا ہوں خالو
میں اگرچہ ذرا ہوں گول مٹول
خوبیوں کا مری پہ راز نہ کھول
ہر کسی کے میں کام آتا ہوں
بات بگڑی ہوئی بناتا ہوں

حاضرین: واہ واہ، بہت خوب۔

آلو: عرض کیا ہے۔

گوشت سے میری خوب یاری ہے
شوربا میرے دم سے بھاری ہے
بھرتا بن کر حیات دیتا ہوں
کوئی سبزی ہو، مات دیتا ہوں

حاضرین: واہ واہ! سبحان اللہ، کیا مات دی ہے سب کو، جواب نہیں۔

"بھرتا بن کر حیات دیتا ہوں" کیا خوب! پھر ارشاد ہو۔
(آلو، یہ شعر دہراتا ہے)

بھنڈی: خواتین و حضرات! ابھی آپ نے مسٹر آلو کے کچالو جیسے اشعار سنے۔ آج کے اس مشاعرے میں آپ ابھی تک اس ناچیز بھنڈی کے علاوہ محترم ٹماٹر، محترمہ گوبھی، جناب کریلا، محترمہ گاجر اور جناب آلو کا کلام سُن چکے ہیں۔ اب سب سے آخر میں اِس محفل کے صدر حضرت بینگن سے گزارش کرتی ہوں کہ وہ اپنے کلام سے ہم سب کو اور سامعین کو نوازیں۔

بینگن: عرض کرتا ہوں۔

نام میرا ہے دوستو! بینگن
سبز پگڑی مری ہے، اُودا بدن
میں نے ہر ایک کا کلام سُنا
اور آخر میں اپنا نام سُنا
سب کے شعروں کی داد دیتا ہوں
اور اجازت میں سب سے لیتا ہوں
گوبھی، گاجر کی کیا حقیقت ہے
کیا مرے آگے ان کی وقعت ہے
آلو، بھنڈی، کریلا چیز ہیں کیا؟
ہاں! ٹماٹر میں خوبیاں ہیں ذرا
اسی خاطر یہ مجھ کو پیارا ہے
ورنہ ہر سبزی بس گوارا ہے
میرا ان سبزیوں میں نام کہاں
میں کہاں، اور مرا مقام کہاں

سب حاضرین: واہ واہ! سبحان اللہ، کیا تعلّی ہے کیا خودستائی ہے۔ جائے استاد خالی ہے۔ یہ تو آپ ہی کا مقام ہے۔ خوب، واقعی آپ تھالی کے بینگن ہیں۔

بینگن: شکریہ شکریہ! عزّت افزائی ہے، ورنہ کس قابل ہوں۔

بھنڈی: خواتین، حضرات! صدرِ مشاعرہ حضرت بینگن کا نہایت عمدہ اور خوب صورت کلام آپ نے سُنا۔ ان کے کلام کے ساتھ ہی "نونہال کلب" کی جانب سے ننّھے دوستوں کے لیے یہ منعقد مشاعرہ ختم کیا جاتا ہے۔

●●●

(بشکریہ "نونہال" کراچی)

علم کی مال پر فوقیت

ایک بار حضرت علیؓ کے ایک مخالف فرقے (خوارج) کے دس عالم اُن کے پاس آئے اور آپ سے ایک سوال کیا۔ لیکن جواب کے لیے شرط یہ تھی کہ ایک ہی سوال کا ہر عالم کو الگ جواب دیا جائے۔ آپ نے شرط منظور فرمالی۔ سوال کیا گیا: "علم بہتر ہے یا مال" علم کو مال سے بہتر ثابت کرنے کے لیے آپ نے فوراً جو جواب دیے، وہ یہ ہیں:-

علم بہتر ہے، اِس لیے کہ:

۱۔ علم کو بڑے نبیوں اور بزرگوں نے اپنے پیچھے چھوڑا۔ اور مال کو فرعون نے اپنے پیچھے چھوڑا۔

۲۔ علم تمھاری حفاظت کرتا ہے اور مال کی تم حفاظت کرتے ہو۔

۳۔ علم دوسروں کو دینے سے بڑھتا ہے اور مال خرچ کرنے سے کم ہوتا ہے۔

۴۔ عالم سے سب محبت اور ہمدردی رکھتے ہیں اور مال دار کے بہت سے دشمن ہوتے ہیں۔

۵۔ عالم نیک اور کریم مانا جاتا ہے اور مال دار کو لوگ کنجوس اور بخیل کہتے ہیں۔

۶۔ علم ہر آفت سے محفوظ ہے اور مال کے لیے چور، گرہ کٹ غرض سَو آفتیں ہیں۔

۷۔ علم کا کوئی حساب نہیں رکھنا پڑتا اور مال کی کوڑی کوڑی کا حساب رکھنا پڑتا ہے۔

۸۔ علم کو وقت گزرنے سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور مال رکھنے سے پُرانا اور خراب ہوتا ہے۔

۹۔ علم سے دل و دماغ روشن ہوتے ہیں اور مال سے دل سیاہ ہوتے ہیں۔

۱۰۔ علم کے ذریعے لوگوں نے خدا کو پہچانا اور مال کی زیادتی سے فرعون اور نمرود نے خدائی کا دعوا کیا۔

(ماخوذ از سراج المبین حصّہ دوم سیّد اولاد حیدر فوق بلگرامی)

اور یقیناً یہ سب باتیں حضرت علیؓ کے ذہن میں ہوں گی جب اُنھوں نے یہ شعر کہا تھا

(ترجمہ شعر: "ہم اُس خدا کی اِس تقسیم پر راضی اور خوش ہیں جس نے ہمارے لیے علم اور جاہلوں کے لیے مال مقرر کر دیا۔")

بہرنگی (ایران)
ترجمہ: ڈاکٹر شعیب اعظمی

ستمبر کی اشاعت میں اس کہانی کی پہلی قسط شائع ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے اُس کا مسودہ دوسرے کاغذات میں مخلوط ہو گیا تھا جو اب مل گیا ہے اور شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کے لیے ہم ڈاکٹر شعیب اعظمی اور قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔
(ادارہ)

ڑا بولا۔ "تم کیوں اتنی بدگمان اور ڈرپوک ہو چھوٹی مچھلی ؟"
مچھلی بولی: "میں نہ تو بُری ہوں اور نہ بزدل۔ میں ہر وہ چیز جو
آنکھ دیکھتی اور میری عقل بتاتی ہے، اُسے زبان پر لاتی ہوں"
کیکڑا بولا: "اچھا بتائیے، ہم بھی تو سنیں کہ آپ کی آنکھوں نے
کیا دیکھا اور عقل نے کیا سمجھا جس سے آپ نے یہ جان لیا کہ ہم آپ کو
شکار کرنا چاہتے ہیں ؟"
مچھلی نے جواب دیا: "دیکھیے آپ بھی وہی راستہ اختیار کیجیے
.... جو
ڑا کہنے لگا: کیا تیرا مطلب مینڈکی سے ہے ؟ تو بھی عجیب نادان
ڑکی ہے! میں مینڈکوں پر جان دیتا ہوں اور اسی وجہ سے اُن کا
شکار کرتا ہوں۔ جانتی ہو، سب سوچتے ہیں کہ دنیا میں صرف
وہی اکیلے ہیں اور خوش قسمت بھی ہیں اور میں چاہتا ہوں اُن کو
یہ بتاؤں کہ دراصل دُنیا کس کی ہے۔ بس اب نہ ڈرو میری عزیزہ
آگے آؤ۔"

کیکڑے نے یہ باتیں کہیں اور دھیرے دھیرے کھسکنا شروع کیا۔ چھوٹی مچھلی کی طرف بڑھا۔ وہ مسکراتا ہوا راستہ طے کر رہا تھا کہ مچھلی کو بے اختیار ہنسی آئی اور بے اختیار بولی۔
"ارے، تم تو ابھی راستہ چلنا بھی نہیں جانتے، کہاں سے یہ جان بیٹھے کہ دُنیا کیسی ہے ؟"
چھوٹی مچھلی کیکڑے سے دور کھسک گئی۔ ایک سایہ پانی پر پڑا اور اچانک ایک زوردار ٹھوکر نے کیکڑے کو ریت میں گھسا دیا۔ پتھر پر لیٹی چھپکلی کو کیکڑے کی بگڑی شکل پر ایسی ہنسی آئی کہ خود پھسل پڑی اور پانی میں گرتے گرتے رہ گئی۔ کیکڑا اب دوبارہ باہر نہیں آ سکتا تھا۔ چھوٹی مچھلی نے دیکھا کہ ایک گڈریے کا لڑکا پانی کے کنارے کھڑا اُسے اور کیکڑے کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ بکریوں اور بھیڑوں کا ایک ریوڑ پانی کے قریب آیا اور اپنے تھوتھنے پانی میں ڈال دیے۔ "میں میں اور بھیں بھیں" کی آوازوں نے درّے میں اپنا راج کر رکھا تھا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

اے ڈبلو شاکرہ

خواہش کیسے پوری ہوئی؟

رمضانی اور شعبانی کا کوئی اور نہ تھا، اس لیے وہ اپنی خالہ کے گھر ایک گانو میں رہا کرتے تھے۔ خالہ جی کا ایک کھیت گھر کے پاس ہی تھا۔ ایک گائے تھی، کچھ مرغیاں تھیں۔ خالہ جی بڑی محنتی تھیں۔ یہ گھڑی کام میں جٹی رہتیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ یہ دونوں بچّے بھی انھیں کی طرح محنتی بنیں۔ رمضانی شعبانی کام سے جی چُراتے۔ کھیل کود اور سیر گشت میں رہتے۔

ایک دن جب کہ سویرے ان دونوں کو پچھواڑے کے آنگن کی صفائی کرنا تھی۔ ڈربے کی صفائی کرنا تھی۔ گائے کے لیے چارا کاٹنا تھا تو وہ چُپکے سے نکل بھاگے اور ندی کے کنارے جا پہنچے۔ دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ندی جنگل میں دُور تک گھس آئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی چٹانیں اُبھری تھیں۔ وہ ایک کھاڑی جیسی لگ رہی تھی۔ ہری ہری گھاس میدان میں اُگی ہوئی تھی۔ وہ دونوں ٹھنڈے پانی میں پانو لٹکا کر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔

رمضانی بولا: "کیا ہی اچھا ہوتا۔ ہمیں کوئی پری مل جاتی ہم لوگوں کی ہر خواہش پوری کر دیتی یا کہیں پڑی پڑائی جوتی ہی مل جاتی۔"

شعبانی نے کہا: "یہ سب جانے دو، مجھے تو بس کھانے کی کوئی چیز مل جائے، مزے دار گرما گرم۔ صبح ہلکا سا ناشتہ کر کے کام کے ڈر سے نکل بھاگے تھے۔ پتا نہیں کچھ لوگوں کے پاس ڈھیر ساری چیزیں کیوں ہوتی ہیں اور کسی کے پاس کچھ بھی نہیں۔ خالہ جی کے پاس بھی تو بہت کچھ ہے لیکن وہ صرف کام چاہتی ہیں۔"

وہ ایسی ہی باتیں کرتے کرتے گھاس پر لیٹ گئے لیکن اُن کے پانو پانی ہی میں پڑے رہے۔ وہ کہنے لگے۔

"کیا ہی اچھا ہوتا جو خوش قسمتی کہیں پڑی مل جاتی۔"

اُسی وقت اُس جگہ سے کچھ دُور اسی ندی کے کنارے اس گانو کے بڑے زمین دار صاحب ایک چھوٹی سی کشتی میں پہنچے تھے۔ اُنھوں نے آج مچھلی کے شکار کی تیاری کر رکھی تھی۔ ایک سایہ دار جگہ تجویز کر کے سوچا تھا کہ وہیں مچھلی پکڑیں گے اور کچھ پڑھیں گے بھی۔ دَم کا مرغ، شاہی کباب، تر بہ تر پراٹھے، شاہی ٹکڑے اور بڑے سے تھرماس میں گرما گرم چائے۔ بیٹھنے کے لیے خوب صورت سی چٹائی۔ مچھلی پکڑنے کا مکمّل سامان۔ کشتی کو کنارے پر روک کر ایک لمبی رسّی ایک درخت کے ٹوٹے تنے پر پھینکی اور خود اُتر پڑے۔ مچھلی پکڑنے کی چھڑیاں نکالیں اور سوچا انھیں دُرست کر لوں پھر

۲-۸/۵۵۸-۲-۱۱، آغا پورہ حیدر آباد ۱

کشتی سے سامان اُتاروں گا۔ اتنے میں اُن کے قریب ہی چند گائیں چرتی پھرتی آنکلیں۔ بڑے میاں ڈر گئے کہ کہیں یہ گائیں اُن کو زخمی نہ کر دیں۔ اُن کے ڈکرانے کی آواز سے ندی میں مچھلیوں کے تتر بتر ہونے کا بھی ڈر تھا۔ اُنھوں نے چند پتھر گایوں کی طرف پھینکے لیکن اُن پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اِدھر سے ہٹ کر اُدھر کھڑی ہو جاتیں۔ بڑے میاں سے صبر نہ ہو سکا۔ خود ہی اُٹھ کر گایوں کے پیچھے دوڑ پڑے اور اُنھیں بھگاتے ہوئے اتنی دُور جا پڑے کہ گائیں وہاں سے اِدھر لوٹ کر نہ آسکیں۔ پھر وہاں سے ندی کی طرف واپس ہوئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اُن کی کشتی مع سامان کے غائب تھی۔

رمضانی، شعبانی ندی کنارے گھاس پر پڑے اُداسی کے ساتھ باتوں میں لگے ہوئے تھے۔ دونوں ہی بھوکے تھے۔ شعبانی نے پھر کہا۔ "کیا ہی اچھا ہو، جو کہیں خوش قسمتی پڑی مل جائے۔" رمضانی نے کہا۔ "خالہ جی تو کہتی ہیں کہ خوش قسمتی اُنھیں کو ملتی ہے جو کڑی محنت کرتے ہیں۔ ہمیں بھلا کیسے ملے گی؟ میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ آج دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ اچھا سا سامان مل جائے۔"

ٹھیک اُسی وقت بڑے میاں کی کشتی بہتی ہوئی وہاں آپڑی۔ بات یہ تھی کہ انھوں نے جلدی میں کشتی کو اچھی طرح باندھا نہ تھا۔ اٹکا دیا تھا اِس لیے ہوا کے جھونکوں سے جب کشتی آگے پیچھے ہونے لگی تو رسّی کھونٹے سے نکل گئی اور بے سہارا کشتی بہہ نکلی اور بہہ کر وہاں پہنچ گئی جہاں رمضانی شعبانی پانی میں پاؤں ڈبوئے دھوپ کھا رہے تھے۔ اُنھوں نے کشتی کو دیکھا تک نہیں۔ اور کشتی ہولے سے شعبانی کے پاؤں سے ٹکرائی۔ اُس نے سوچا رمضانی پاؤں مار رہا ہے۔ اُس نے کہا: "بھئی رمضانی! ایسا نہ کرو!" رمضانی نے بھی کشتی کو دیکھا نہ تھا۔ اُس نے حیرت سے پوچھا "کیا نہ کروں؟"

"ارے میرے پاؤں میں نہ مار" شعبانی جواب دیا۔

"میں کہاں مار رہا ہوں۔" رمضانی نے ذرا زور سے کہا۔

اُسی دم کشتی دونوں ہی کے پاؤں سے ٹکرائی۔ ابھی تک دونوں نے کشتی کو دیکھا نہ تھا۔ دونوں ہی چیخ پڑے۔ "اے کیوں مار رہا ہے؟" پھر شعبانی غصّے میں اُٹھ بیٹھا تو دیکھا سامنے کشتی تھی۔ رمضانی بھی اُٹھ بیٹھا۔ پہلے تو دونوں کچھ سوچتے رہے پھر چیخے۔ "خوش قسمتی مل گئی۔ دیکھیں تو سہی، کشتی میں ہے کیا؟" یہ کہہ کر دونوں نے کشتی کو پکڑ لیا اور اُس کی رسّی ایک ٹوٹے تنے سے مضبوط باندھ دی۔ سامان نکال لائے۔ "واہ کیا اچھی چیزیں ہیں۔ دو موٹی موٹی کتابیں، بیٹھنے کو چٹائی، دھوپ سے بچنے کے لیے چھتری۔" "سچ یہاں تو گیلا گیلا سا لگ رہا تھا۔" ایک بڑا سا تھرماس اور ایک بڑا سا بھرا ہوا ناشتہ دان۔ شعبانی بولا: "یہ سب میرا ہے۔ میں اس میں سے تمھیں بھی دوں گا۔" رمضانی نے کہا: "تمھارا تنہا کیسے ہو گیا۔ یوں کہو "ہم دونوں کا۔" بھوک لگ رہی تھی اس لیے لڑائی کو ٹھیک نہ سمجھتے ہوئے دونوں خاموش ہو گئے۔ دونوں نے مل کر ناشتہ دان کھولا، خوشی سے اُچھل پڑے۔ ڈٹ کر نعمتیں کھائیں، اُس کے بعد گرما گرم چائے۔ ایک کتّا بھی وہاں پہنچا تھا۔ اُس کی دخل اندازی اِن دونوں کو نہ بھائی تھی۔ اُس کو بھگانے کے لیے دوڑ پڑے۔ وہ تو نہ جانے کہاں نکل گیا۔ البتّہ سامنے سے ایک بڑے میاں ہانپتے کانپتے ان کے قریب آئے۔ رمضانی اور شعبانی رفو چکر ہو جانا چاہتے تھے۔ لیکن بڑے میاں نے دوڑ کر اِن کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور ذرا ڈانٹ کر پوچھا۔ "کیوں جی! تم نے ادھر کوئی کشتی بہتی ہوئی دیکھی ہے؟" دونوں کے ہوش اُڑ گئے۔ مگر رمضانی نے ذرا ڈھٹائی سے کہا۔ "ہاں! ہمارے پاس ایک کشتی ہے۔ چاہیے تو تمھیں کرائے پر دیں۔"

"کرایہ ورایہ کی بات نہ کرو۔" بڑے میاں نے ڈانٹ کر کہا۔ "وہ تو میری ہی کشتی ہے۔ اُس میں میرا ناشتہ دان، تھرماس، چھتری، چٹائی اور کتابیں رکھی ہیں۔" انھوں نے دونوں بچّوں کو گردن سے پکڑ کر آگے ڈھکیلتے ہوئے کہا۔

رمضانی اور شعبانی نے ڈرتے ڈرتے ساری باتیں بتا دیں۔ اور یہ بھی کہا۔ "انھوں نے سمجھا تھا کہ یہ کشتی اُن کی خوش قسمتی نے بھیجی ہے۔"

بڑے میاں بگڑ کر بولے: "خوش قسمتی کیسی؟ وہ بھی کہیں پڑی ہوئی ملتی ہے، اُس کے لیے تو کڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔

تمھیں تو چاہیے تھا کہ کشتی کو دیکھ کر اس کے مالک کو تلاش کرتے اور اُس کے ساتھ کھانے میں شریک ہوتے۔ اب چلو تم دونوں اس کشتی میں بیٹھو اور گانو کے مکھیا کے پاس چلو۔ دونوں اس کشتی میں بیٹھے اور بڑے میاں کے ساتھ گانو میں گئے۔ مکھیا نے انھیں خوب ڈانٹ پلائی۔ پھر اُن کی خالہ کو بلا بھیجا۔ خالہ تو آپ ہی ان دونوں سے بے زار تھیں۔ بڑے میاں سے کہا:
"آپ جو مناسب سمجھیں، ان بچوں کو سزا دیں۔ طے پایا کہ اس چوری کی سزا میں ان کو ایک ہفتے تک بڑے میاں کے یہاں کام کرنا پڑے گا۔

یہ سات دن کس مصیبت سے گزرے۔ اس کو تو رمضانی اور شعبانی ہی جانتے ہیں۔ صبح سے شام تک کھیتوں میں کام کرنا اور رات کے کھانے میں رُوکھی سُوکھی۔

ہفتہ بھر کے بعد جب خالہ بی کے ہاں واپس آئے تو اُن کی سمجھ میں آیا کہ خالہ بی کے گھر میں تو بڑا ہلکا پھلکا کام کرنا پڑتا ہے۔ ذرا سی صفائی کر دی، مرغیوں کے دڑبے صاف کر دیے۔ گائے کا چارا تیار کر دیا اور بس! پھر تازہ دودھ اور گرم گرم روٹیاں، گھی اور انڈے۔

بس آئندہ کے لیے دونوں نے کام چوری چھوڑ دی اور گھر کا کام جی لگا کر کرنے لگے اور خالہ جی کی دُعائیں بٹورنے لگے۔

• • •

بقیہ ص ٥ کا

نے خود عطا کر رکھا ہے۔ جو صرف اونچی نیچی زمین پارکوں اور وسیع باغات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ چاروں طرف سے احاطہ کیے ہوئے بحری مناظر اور موجیں مارتے ہوئے نیلے سمندر کی بدولت ہے جس میں ماہی گیروں کی چھوٹی کشتی سے لے کر اسٹیمر اور بڑے دخانی جہاز تک ہر وقت اِدھر اُدھر گھومتے رہتے ہیں اور ترکی کے دو ملکی حصے ہی نہیں بلکہ دو برّاعظموں میں اتصال پیدا کرتے ہیں جہاں ۲۲½ لاکھ افراد آباد ہیں۔

مسعودہ حیات

پیغامِ اخوّت

رنگ اور نسل کا ہر فرق مٹاؤ لوگو
سب کو اب راہِ محبّت پہ چلاؤ لوگو

خونِ ناحق سے تو ہل جاتے ہیں پتھر کے جگر
اب کسی شخص پہ خنجر نہ اٹھاؤ لوگو

کر کے روشن رہِ انساں میں محبّت کے چراغ
راستہ گھور اندھیرے میں دکھاؤ لوگو

ذرّے ذرّے سے نمایاں ہے اہنسا کی دمک
ہند کی خاک کو ماتھے سے لگاؤ لوگو

گلشنِ ہند میں کھلتے ہیں ہر اک رنگ کے پھول
ان کی خوشبو سے دل و جاں کو بساؤ لوگو

ہم اگر ایک ہی مٹّی سے ہوئے ہیں پیدا
پھر یہ مت بھید کی باتیں نہ اٹھاؤ لوگو

تم کو پیغامِ اخوّت جو ملا مذہب سے
آج گھر گھر وہی پیغام سناؤ لوگو

٩٩٣ - بازار چتلی قبر دہلی

عبدالملک فاروقی

(قسط ۳)

ایک دن رات کے وقت عرب دیہاتی میرے پاس آیا اور اپنے وطن جانے کی اجازت مانگی، مجھے بہت رنج اور افسوس ہوا، میں نے کہا "کیا تم میرا ساتھ چھوڑ دینا چاہتے ہو؟" اُس نے سر ہلا کر بہت غمگین لہجہ میں کہا "نہیں عالی جاہ! میں ہرگز آپ کا ساتھ نہیں چھوڑتا، مگر مجھے بار بار واپس چلے آنے کا بلاوا آرہا ہے۔" میں نے کہا "اگر تمھاری یہی مرضی ہے تو میں تم کو نہیں روک سکتا، تم نے میرے اوپر بہت احسان کیے ہیں، اگر تم نہ ہوتے تو میں کبھی کا مر گیا ہوتا۔" عرب بدّو نے کہا "سرکار، اگر آپ کو واقعی میری ضرورت ہے اور آپ ہمیشہ اپنے ملک میں خوش حالی دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو چاہیے اُس سُرخ عربی مچھلی کا جوڑا مکمل کریں، جو آپ نے عربی سمندر میں پکڑ کر چھوڑ دی تھی وہی سُرخ مچھلی آپ کے راج محل کی حوض کے اندر ہے، اُس مچھلی کی مادہ کسی ملک کے شہزادے سے تلاش کروائیے، جب مل جائے تو ایک مچھلی اس شہزادے کو دے دیں اور ایک آپ لے لیں، یہ کام بڑی جان جوکھم کا ہے کوئی شہزادہ اس کام کے لیے مشکل ہی سے تیار ہوگا، مگر کوئی بدقسمت شہزادہ فوراً تیار ہو جائے گا اور ہاں عالی جاہ! آپ نے بھی ایک مرتبہ میری جان بچائی تھی، حضور میں وہی سُرخ عربی مچھلی ہوں" یہ کہہ کر وہ بدّو غائب ہو گیا۔ میں حیران و پریشان اس کی باتوں پر غور کر رہا تھا، جب میرے حواس دُرست ہوئے تو میں فوراً حوض کے پاس آیا، یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ حوض میں وہی سُرخ عربی مچھلی تیر رہی تھی۔ اور شہزادے رُمّان! یہ وہی سرخ عربی مچھلی ہے جو میں نے آپ کو تحفہ میں دی ہے، شہزادے! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس مچھلی کی مادہ تلاش کریں، جوڑا ہو جانے پر ایک مچھلی آپ کے پاس رہے گی اور ایک میرے پاس، جس سے ہمارے ملک میں ہمیشہ خوش حالی رہے گی۔ سفر کے سارے اخراجات میں برداشت کروں گا، بولیے آپ کو منظور ہے؟" بادشاہ فیروز بخت، ملکہ بلقیس، شہزادہ رمّان، وزیر زادہ حارث، مصری شہزادے کی اس عجیب و غریب داستان اور اَن دیکھے سفر پر جانے کی پیشکش کو سن کر حیران رہ گئے۔ شہزادہ رمّان چونکہ اپنی پیدائش اور اُس سے پہلے کے حالات سے بے خبر تھا، اِس لیے وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اُس کا جاں نثار دوست حارث کیوں غمزدہ ہو گیا؟ بادشاہ اور ملکہ کیوں مغموم ہو گئے؟ سارے درباریوں کے چہرے کیوں لٹک گئے؟!! وہ تو اس سفر کو محض ایک سفر سمجھ رہا تھا، کچھ دن سیر و تفریح کر کے واپس آجائے گا۔ سُرخ عربی مچھلی

چھوٹی کالی مچھلی نے اُس وقت تک انتظار کیا جب تک
بھیڑوں اور بکریوں نے پانی پی لیا اور چلی گئیں۔ اُس وقت
مچھلی نے چھپکلی کو پکارا اور کہا :
"پیاری چھپکلی ! میں ایک کالی چھوٹی مچھلی ہوں اور
اس نہر کے آخری کنارے کا پتا لگانے جا رہی ہوں۔ میں
سمجھتی ہوں کہ تم ایک عقل مند اور سمجھ دار جانور ہو۔ یہی وجہ ہے
کہ میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔"
چھپکلی بولی : "جو چاہتی ہو پوچھ لو!"
مچھلی بولی : "راستے میں مجھے لوگوں نے مُرغ سقّا
(pelican) گھڑیال اور مچھلی خور پرندوں سے بہت ڈرایا ہے
اگر تم ان سب کے بارے میں کچھ جانتی ہو تو مجھے بتاؤ۔"
چھپکلی بولی "گھڑیال اور مچھلی کھانے والے پرندے تو اس
طرف ملتے نہیں اور خاص طور سے گھڑیال جو سمندر میں رہتا ہے
لیکن ایک بڑی چونچ والا مُرغ سقّا یہیں نیچے ہو سکتا ہے۔ کہیں ایسا
نہ ہو تو اس کے دھوکے میں آجائے اور اُس کی تھیلی میں چلی جائے۔"
مچھلی نے پوچھا : "تھیلی کیسی ؟"
چھپکلی کہنے لگی۔ "سقّا چڑیا اپنی گردن کے نیچے ایک تھیلی رکھتی
ہے جس میں کافی پانی جمع ہو سکتا ہے۔ وہ پانی میں تیرتی ہے اور
کبھی کبھی مچھلیاں انجانے میں اُس کی تھیلی میں داخل ہو جاتی ہیں
اور سیدھی اُس کے پیٹ میں چلی جاتی ہیں۔ البتّہ اگر سقّا چڑیا
بھوکی نہ ہو تو مچھلیوں کو اُسی تھیلی میں جمع کرتی چلی جاتی ہے
تاکہ بعد میں کھائے۔"
مچھلی نے پوچھا : "اچھا اگر میں مچھلی کی تھیلی میں آگئی تو پھر باہر
آنے کا کوئی راستہ نہیں ہے ؟"
چھپکلی بولی : "کوئی اور راستہ نہیں، سوائے اس کے کہ
تھیلی کو پھاڑ ڈالے۔ میں تمھیں ایک خنجر دوں گی۔ اگر کبھی تم سقّا
چڑیا کے جال میں پھنس جاؤ تو یہ کام کر سکو۔"
اتنا کہہ کر چھپکلی پتھّر کے ایک سوراخ میں غائب ہو گئی اور
ایک چھوٹا خنجر لے کر لوٹی۔ چھوٹی مچھلی نے خنجر لے لیا اور بولی۔
"عزیز چھپکلی ! تم بہت مہربان ہو۔ میں نہیں جانتی کہ تمھارا
شکریہ کس طرح ادا کروں۔"

چھپکلی نے کہا "شکریہ ضروری نہیں پیاری۔ میں اس طرح
کے بہت سے خنجر رکھتی ہوں۔ جب بے کار رہتی ہوں، بیٹھ جاتی
ہوں اور گھانس کے تنکوں سے خنجر بناتی ہوں اور تم جیسی
ہوشیار مچھلیوں کو بانٹ دیتی ہوں۔"
مچھلی نے کہا : "مجھ سے پہلے بھی مچھلیاں یہاں سے گزری ہیں ؟"
چھپکلی نے کہا : "بہت سی گزری ہیں اور اب انھوں نے اپنا ایک
گروہ بنا لیا ہے اور مچھیرے کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔"
کالی مچھلی بولی : "مجھے تفصیل سے بتاؤ تاکہ میں جان جاؤں
کہ انھوں نے مچھیرے کا ناک میں دم کس طرح کر رکھا ہے ؟"
چھپکلی بولی : "وہ اکٹھا رہتی ہیں اور جیسے ہی مچھیرا جال
ڈالتا ہے وہ جال میں داخل ہو جاتی ہیں اور اُسے سب مل کر کھینچ
لیتی ہیں اور سمندر کی تہوں میں لے جاتی ہیں۔"
چھپکلی نے اپنا سر پتھّر کے سوراخ میں کیا اور اپنا کان اُس
میں داخل کرتے ہوئے بولی : "میں اب جا رہی ہوں میرے
بچّے جاگ گئے ہیں۔"
چھپکلی پتھّر کی دراز میں چلی گئی اور چھوٹی مچھلی مجبوراً وہاں سے
چل پڑی۔ لیکن اُس کے دل میں سوال پر سوال اُبھر رہے تھے
جو وہ اپنے آپ سے برابر پوچھے جا رہی تھی مثلاً "چلوں دیکھوں
کیا یہ نہر سمندر میں مل جاتی ہے ؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ سقّا چڑیا
حملہ مجھ پر ہو جائے ؟ کہیں گھڑیال کے دل میں اتنی کھوٹ ہو کہ
وہ اپنے ساتھ ہی رہنے والوں کو مار ڈالے اور کھا جائے ؟ مچھلی
خور پرندہ ہم سے کیوں دشمنی رکھتا ہے ؟"
چھوٹی مچھلی تیرتی ہوئی چلی جا رہی تھی اور فکر میں بھی تھی۔
وہ ہر قدم پر کوئی نہ کوئی چیز دیکھتی تھی اور یاد کرتی جاتی تھی
اُسے یہ اچھا لگ رہا تھا کہ اُچھلتی کودتی جھرنوں سے نیچے
گر پڑے اور پھر تیرے۔ وہ سورج کی گرمی کو اپنی پیٹھ پر
محسوس کر کے قوّت حاصل کر رہی تھی۔ ایک جگہ ایک
ہرن جلدی جلدی پانی پی رہا تھا۔ چھوٹی مچھلی نے سلام
کیا اور پوچھا :
"اچھے پیارے ہرن ! کیا جلدی ہے ؟"
ہرن بولا : "شکاری میرا پیچھا کر رہا ہے۔ ایک گولی

تیرے لگ چکی ہے، یہ دیکھو!"

چھوٹی مچھلی نے زخم کو نہیں دیکھا، لیکن ہرن کو لنگڑاتے دوڑتے دیکھ کر سمجھ گئی کہ بات سچ ہے۔ ایک جگہ کچھوے میں کیلو لرکر رہے تھے۔ اور دوسری طرف درختوں میں کبوتروں کی غٹرغوں گونج رہی تھی۔ پہاڑی گھاس کی خوشبو ہوا میں پھیلی ہوئی تھی اور پانی میں مہک شامل ہو رہی تھی۔

ظہر کے بعد ایسی جگہ پہنچی جہاں درّہ چوڑا ہو گیا تھا اور پانی جنگل کے بیچ سے گزر رہا تھا۔ پانی اتنا زیادہ تھا کہ کالی مچھلی مزے مزے میں سیدھی چلی جا رہی تھی۔ پھر بھی بہت سی مچھلیوں کا سامنا ہو گیا۔ اپنی ماں سے جدا ہونے کے بعد اُس نے مچھلی نہیں دیکھی تھی کئی چھوٹی مچھلیوں نے اُسے گھیر لیا اور بولیں:

"اجنبی ہو کیا؟"

کالی مچھلی بولی: "ہاں مسافر ہوں اور دُور سے آ رہی ہوں۔"

چھوٹی مچھلیوں نے کہا: "کہاں جانا چاہتی ہو؟"

کالی بولی: "میں نہر کے آخری سرے کو معلوم کرنا چاہتی ہوں۔"

مچھلیاں بولیں: "کون سی نہر؟"

کالی بولی: "یہی نہر جس میں ہم تیرتے ہیں۔"

چھوٹی مچھلیوں نے کہا: "ہم تو اسے ندی کہتے ہیں۔"

کالی مچھلی خاموش رہی، مگر ایک چھوٹی مچھلی بولی۔

"جانتی ہو سقا چڑیا راستے میں بیٹھی ہوئی ہے۔"

کالی مچھلی بولی: "ہاں ہاں، میں جانتی ہوں۔"

ایک دوسری بولی: "یہ بھی جانتی ہو کہ سقا چڑیا کی گردن کے نیچے تھیلی کیسی چھوٹی اور پھیلی ہوتی ہے؟"

چھوٹی مچھلی نے کہا: "اس کے باوجود جانا چاہتی ہو؟"

کالی مچھلی بولی: "ہاں جس طرح بھی ہو مجھے جانا چاہیے۔"

جلد ہی مچھلیوں میں یہ خبر پھیل گئی کہ ایک کالی چھوٹی مچھلی بڑی دُور سے آئی ہے اور وہ نہر کا آخری سرا معلوم کرنا چاہتی ہے۔ سقا چڑیا سے بھی نہیں ڈرتی۔ چند چھوٹی مچھلیاں سوچنے لگیں کہ کالی مچھلی کے ساتھ جائیں لیکن بڑوں کے ڈر سے چپ رہیں۔ کچھ مچھلیوں نے کہا بھی: "اگر سقا چڑیا نہ ہوتی تو ہم تمھارے ساتھ چلتے۔ ہم اس کی تھیلی سے بہت ڈرتے ہیں۔"

ندی کے کنارے ایک گاؤں تھا۔ عورتیں اور لڑکیاں ندی میں برتن اور کپڑے دھو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر تک کالی چھوٹی مچھلی اُن کے شور کو سنتی رہی اور بچّوں کا نہانا دیکھتی رہی، پھر وہ آگے بڑھتی چلی گئی، چلتی گئی، چلتی گئی۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ وہ ایک پتھر کے نیچے سو گئی۔ آدھی رات کو جاگی اور دیکھا کہ چاند پانی میں نہا رہا ہے۔ اور تمام جگہوں کو روشن کر رکھا ہے۔

چھوٹی کالی مچھلی چاند پر فریفتہ تھی۔ رات کو جب چاند پانی میں اُتر آتا تھا تو اُس کا جی چاہتا تھا کہ مونگوں کے دروازوں سے باہر نکل پڑے اور اُس چاند سے بات چیت کرے۔ لیکن ہر بار اُس کی ماں جاگ جاتی، اُسے دروازے کے اندر کھینچ لیتی اور دوبارہ سُلا دیتی تھی۔

چاند بولا: "سلام چھوٹی کالی مچھلی، تو یہاں کہاں؟"

مچھلی بولی: "سیاحت کر رہی ہوں۔"

چاند نے کہا: "دُنیا بہت بڑی ہے، تو ساری جگہوں میں نہیں گھوم سکتی ہے۔"

مچھلی بولی: "میں جہاں جانا چاہتی ہوں وہاں مجھے جانا چاہیے۔"

چاند بولا: "میرا جی چاہتا تھا کہ صبح تک تیرے پاس رہوں، لیکن بڑا کالا بادل آیا ہی چاہتا ہے تاکہ میری روشنی چھپا لے۔"

مچھلی بولی: "خوب صورت چاند! میں تیرے نور کو بہت چاہتی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تیری چاندنی میں ہمیشہ نہاتی رہوں۔"

چاند بولا: "پیاری مچھلی! یہ چمک میری اپنی نہیں ہے سورج مجھے روشنی دیتا ہے اور میں اُسے زمین پر بکھیر دیتا ہوں۔ کیا تو نے نہیں سُنا، انسان کی تمنّا ہے کہ چند برسوں میں پرواز کر کے میری دُنیا میں پہنچ جائے۔"

مچھلی بولی: "یہ ناممکن ہے۔"

چاند بولا: "کام مشکل ہے لیکن انسان کا دل۔۔۔۔۔
چاند اپنی بات پوری نہیں کر پایا تھا کہ کالا بادل چھا گیا، اُس کا چہرہ ڈھانپ لیا اور رات اندھیری ہو گئی۔ کالی مچھلی اکیلی اور تنہا رہ گئی۔ حیران و پریشان وہ اندھیرے کو تاکتی رہی۔ پھر ایک پتھر کے نیچے سما گئی اور سو گئی۔

صبح جاگی تو اپنے سر پر چند چھوٹی مچھلیوں کو دیکھا جو ایک دوسرے کے منھ سے منھ ملا رہی تھیں اور ایک ساتھ بولیں:
"صبح نیل گوں مبارک!"
جواب میں کہا: "سلام و رحمت۔"
چھوٹی مچھلیوں میں سے ایک بولی: "ابھی ہمارا خوف دور نہیں ہوا۔"
ایک اور بولی: سقا چڑیا کا ڈر ہم کو اطمینان سے نہیں رہنے دے گا۔"
چھوٹی مچھلی نے کہا: "تم لوگ کچھ زیادہ فکرمند ہو رہی ہو۔ اُس کے بارے میں ہر وقت نہیں سوچنا چاہیے۔ جیسے ہی ہم قدم بڑھائیں گے ڈر ختم ہو جائے گا۔"

لیکن جب چلنے کا ارادہ کیا تو دیکھا کہ اُن کے ارد گرد اور اوپر نیچے چاروں طرف پانی آ گیا اور اُن کے سر پر ایک سرپوش ڈھک گیا، ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ بھاگنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ چھوٹی کالی مچھلی سمجھ گئی کہ وہ سب سقا چڑیا کی تھیلی میں گرفتار ہو گئی ہیں۔
چھوٹی مچھلیوں نے رونا دھونا شروع کر دیا اور اُن میں سے ایک بولی۔
اب بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں۔ یہ تیرا قصور ہے کہ ہم لوگوں کے پیچھے پڑ گئی اور ہمیں پھنسا دیا۔"
دوسری بولی: اب ہم لوگوں کو ہڑپ کر لیا جائے گا۔ ہم لوگوں کا خاتمہ یقینی ہے۔" اچانک پانی میں ایک ڈراؤنی سی ہنسی گونجی۔ سقا چڑیا ہنس رہی تھی اور یہ کہہ رہی تھی۔
"مچھلیاں شکار ہو گئی ہیں۔ ہا ہا، ہاہا۔۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے تم لوگوں پر ترس آ رہا ہے۔ میرا جی نہیں چاہتا کہ تم لوگوں کو نگل جاؤں۔ ہا۔ ہا۔ ہا!"

چھوٹی مچھلیوں نے عاجزی کے ساتھ کہا: "حضور سقا چڑیا! ہم نے آپ کی تعریف بہت پہلے سے سن رکھی ہے۔ مہربانی فرما کر اپنی مبارک چونچ کو ذرا سا کھول دیجیے تاکہ ہم باہر چلی جائیں۔ ہم ہمیشہ آپ کی سلامتی کی دعا کریں گے۔"
سقا چڑیا بولی۔ "میں فی الحال تم لوگوں کو کھانا نہیں چاہتی۔ میرے پاس ابھی مچھلیوں کا ذخیرہ ہے۔ ذرا اپنی نگاہیں نیچے دوڑاؤ۔"
کئی عدد موٹی اور چھوٹی مچھلیاں تھیلی کی تہہ میں موجود تھیں۔ چھوٹی مچھلیاں بولیں۔
"حضور سقا چڑیا! ہم نے تو کچھ نہیں کیا، ہم بے گناہ ہیں۔ یہ چھوٹی کالی مچھلی ہم لوگوں کو بہلا پھسلا کر لائی تھی۔"
چھوٹی کالی مچھلی بولی: "بزدلو! تم سمجھتی ہو، یہ حیلہ ساز سقا چڑیا درگزر اور بخشائش کی دیوی ہے جو اس طرح درخواست کر رہی ہو؟"
چھوٹی مچھلیاں بولیں: "تمھیں تو یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ تم کیا کہہ رہی ہو! ابھی دیکھنا کہ حضور سقا چڑیا کس طرح ہم کو معاف کر کے تمھیں چٹ کر جائیں گی۔"
سقا چڑیا بولی: "ہاں! میں تم کو ایک شرط پر بخش سکتی ہوں۔"
چھوٹی مچھلیاں بولیں: "ہم آپ کے قربان! شرط بیان فرمائیں۔"
سقا چڑیا بولی۔ "اس بے ہودہ مچھلی کو ڈبو دو، اس کا گلا گھونٹ دو تاکہ تم اپنی آزادی حاصل کر سکو۔"
چھوٹی کالی مچھلی نے اپنے آپ کو ایک طرف کر لیا اور چھوٹی مچھلیوں سے کہا: "یہ بات ہرگز نہ مانو۔ یہ حیلہ باز چڑیا ہم کو لڑانا چاہتی ہے۔ میرا ایک پلان ہے۔۔۔۔
لیکن چھوٹی مچھلیاں اپنی رہائی کی فکر میں اس قدر پریشان تھیں کہ انھوں نے کسی اور چیز کے بارے میں کچھ نہ سوچا۔ چھوٹی کالی مچھلی پر ٹوٹ پڑیں۔ تو چھوٹی کالی مچھلی تھیلی ہی میں کچھ پیچھے ہٹ کر بیٹھ جاتی اور کہتی: "بزدلو! تم تو گرفتار ہو، فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ تمھارا بس مجھ پر نہیں چلے گا۔"
چھوٹی مچھلیوں نے کہا۔ "ہمیں اس کا دم گھونٹ دینا چاہیے ہم رہائی چاہتی ہیں۔"

(باقی آئندہ)

طب کی روشنی میں

حکیم محمد سعید
صدر مجلسِ "نونہال" کراچی

بڑا پیٹ:-

س:- میرے چھوٹے بھائی کی عمر ۱۲ سال ہے۔ اُس کا پیٹ بہت بڑا ہے۔ مہربانی فرما کر کوئی علاج بتائیں۔ ● نثار احمد

ج:- اندازہ یہ ہے کہ اُن کا ہاضمہ خراب ہے۔ ممکن ہے تلّی اور جگر بھی بڑھ گئے ہوں۔ ایسے بچّے عموماً وہ ہوتے ہیں جو بچپن میں مٹّی یا کوئلہ کھانے لگتے ہیں، اور وہ بچّے جن کے پیٹ میں کیڑے ہوتے ہیں، اُن کا پیٹ بھی بڑھ جایا کرتا ہے۔

کالے مسوڑھے

س:- میں دہم کی طالبہ ہوں۔ کچھ دنوں سے میرے ہونٹ اور مسوڑھے بہت کالے ہوگئے ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ آپ توجہ فرمائیں۔ ا۔ س۔ ح

ج:- بظاہر یہ کیفیت جسم کو صحیح غذائی اجزا نہ ملنے کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے۔ شاید حیاتین ج کی کمی کا اس میں زیادہ دخل ہے۔ آپ ایسی غذائیں زیادہ کھائیے جو سبزیوں اور پھلوں پر مشتمل ہوں اور گوشت کا استعمال کم سے کم کرنا چاہیے۔ لیموں کا پانی، تازہ مالٹے، سنگترے آپ کے لیے مناسب رہیں گے۔ آم میں بھی حیاتین ج بہ کثرت ہوتی ہے۔ اس لیے اس سے نہ صرف حیاتین ج میسّر آئے گی۔ بلکہ آپ کی صحت کی بہتری کا بھی سامان ہوجائے گا۔

سر میں خشکی (روسی)

س:- میری عمر ۱۳ سال ہے۔ میرے سر میں خشکی بہت زیادہ ہے۔ بالوں کے دو منہ ہوگئے ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ مہربانی فرما کر کوئی علاج بتائیے۔ ● شمیم نورین

ج:- آپ غذا میں مرچوں کا استعمال کم کیجیے۔ سوئے کا ساگ زیادہ کھائیے۔ سر کی صفائی کا خیال رکھیے اور "ہمدرد" سے دوائے حارش سفید ۳ گرام اور روغن کمیلا ۶ گرام لے لیجیے۔ دونوں کو ملا کر کچھ دنوں تک سوتے وقت یہ تیل سر میں لگائیں اور صبح کو غسل کرلیں۔ خشکی دور ہوجائے گی۔

پسینہ:-

س:- میری عمر ۱۴ سال کی ہے۔ ہاتھوں اور بازوؤں پسینا آنے کی شکایت ہے۔ جس کی وجہ سے میں بہت پریشان رہتا ہوں۔ علاج تجویز فرمائیں، کرم ہوگا۔ ● محمد عارف

ج:- بعض جلدیں تازہ ہوا کرتی ہیں۔ اُن میں پسینے کا رساؤ زیادہ ہوتا ہے۔ بعض کا مزاج عصبی ہوتا ہے پریشان زیادہ رہتے ہیں اُن لوگوں کو بھی پسینا آنے کی تکلیف ہوسکتی ہے۔ اصل سبب کو دور کرنا چاہیے۔ اگر زیادہ پریشانی ہے تو منگن کا پانی نکال کر ہاتھوں میں لگانا مفید ہوسکتا ہے۔

پیٹ کا درد:-

س:- کچّی سبزیاں کھانے سے پیٹ میں درد کیوں ہوتا ہے ● عفراء ضوی

ج:- ہر انسان کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ ایک چیز ایک انسان کو موافق آتی ہے، وہی چیز دوسرے کو نہیں بھاتی۔ کچّی سبزی ایک انسان کے پیٹ میں درد کردیتی ہے اور دوسرے کو فائدہ دیتی ہے۔ ہر انسان کو خود یہ فیصلہ اور اندازہ کرنا چاہیے کہ اُس کو کیا چیز موافق آتی ہے اور کیا چیز ناموافق۔

(بشکریہ ماہنامہ نونہال کراچی)

(تھوڑی سی آسان اور ضروری تلخیص کے ساتھ)

ملے، نہ ملے، خرچ اپنی گانٹھ سے ہوگا نہیں، وہ مصری شہزادہ برداشت کرے گا، پورے دربار میں سناٹا چھایا ہوا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُنکے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں، مصری شہزادہ معاذ، اپنی بات کا جواب چاہتا تھا، عربی مچھلی مرتبان میں بے چین تھی، قطمیر بے کلی سے شہزادہ رمان کے پاس بیٹھا پہلو بدل رہا تھا، عاقل وزیرزادہ حارث نے جب دربار کا یہ عالم دیکھا کہ بادشاہ اور ملکہ غم سے نڈھال ہوگئے تو فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور بلند آواز میں بولا:

"میرے عزیز دوست ولیعہد مصر، معاذ! آپ کا تحفہ نہایت انمول اور غیر معمولی ہے، لیکن اس عجیب تحفہ سے ملی وہ داستان جو آپ نے سنائی سب سے زیادہ حیران کن ہے، آپ نے ہمارے شہزادے کو جن الفاظ میں بدقسمت کہا ہے، معاف کیجیے گا شہزادۂ مصر! ہمارے شہزادہ رمان سے بڑا تو دنیا میں خوش نصیب ہونا مشکل ہے، ان کے سرپر ملک معظم بادشاہ گیتی پناہ، فیروز بخت کا سایا ہے، تمام روحانی اور ابدی خوشیاں نچھاور کرنے والی ملکۂ عالیہ، مادر وطن بلقیس جیسی ماں ہے، اور جان و تن کی بازی لگا دینے والا یہ حقیر غلام حارث اور بے زبان قطمیر ہے۔ شہزادہ ہمارا بدقسمت نہیں بلکہ امتحان الٰہی میں ہے۔ میں اس بھرے دربار میں اعلان کرتا ہوں کہ جب تک ہمارا شہزادہ اس مصیبت سے چھٹکارا نہیں پا جاتا، ملک میں کوئی خوشی نہیں منائی جائے گی، کہیں چراغاں نہ ہوگا، کوئی جی بھر کر ہنسے گا نہیں، اور ہم اپنے سر دھڑ کی بازی لگا کر اپنے شہزادے کو اس عذاب سے نجات دلائیں گے ورنہ ہماری زندگی پر لعنت ہے۔

"مصری شہزادے! آپ اپنا یہ جملہ واپس لیجیے، آپ کی بات کا مکمل جواب کل ہمارے سرتاج [illegible]الملک فیروز بخت اسی وقت بھرے دربار میں دیں [illegible] وزیرزادہ حارث کی اس جذباتی اور جوشیلی تقریر [illegible] کر شہزادے رمان کی آنکھوں میں آنسو آگئے، ملکہ [illegible]شاہ بھی آبدیدہ ہو گئے، اور تو اور بے چارہ قطمیر بھی شہزادہ رمان کے پیروں پر سر رکھے آنسو بہا رہا تھا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے خراسانی شہزادے کی شان میں گستاخانہ جملہ بولا، میں شہزادہ رمان ملکۂ عالیہ شا[illegible] وقت اور وزیرزادہ حارث سے معافی چاہتا ہوں؛ دراصل یہ الفاظ میرے نہیں تھے، بلکہ عرب بدو کے [illegible] میری خطا صرف اتنی ہے کہ میں نے ان کو نقل کیا ہے، قسم ہے اہرام مصر اور مقدس نیل کی، میرا مقصد ہرگز شہزادہ کی اہانت نہیں تھا۔" مصری شہزادے نے تمام درباریوں سے معذرت طلب کی، دربار برخواست ہوگیا، تمام ملکوں سے آئے بادشاہ، شہزادے، شہزادیاں رخصت ہوئے، نہ جانے کتنے بادشاہ اپنی شہزادیوں کا پیغام لے کر اس موقعہ پر آئے تھے، مگر دربار کی صورت حال کو دیکھ کر زبان نہ کھول سکے۔

مصری شاہزادے معاذ کو خاص شاہی مہمان خانہ میں ٹھہرایا گیا، آرام و آسائش کی ہر چیز مہیا کی گئی، عربی مچھلی محل خاص کے حوض شیریں میں چھوڑ دی گئی۔

دوسرے دن بادشاہ فیروز بخت نے اپنے چند خاص آدمیوں کو بلا کر مشورہ کیا، جس میں وزیراعظم ابوذر اور وزیرزادہ حارث بھی شریک ہوئے، غریب بادشاہ اور ملکہ نے کل سے کچھ نہ کھایا تھا، وہ اپنے کیے پر پچھتا رہا تھا کہ کاش جشن سے پہلے اگر یہ اعلان بھی کرا دیتے کہ کوئی اپنے ساتھ سرخ عربی مچھلی یا اُس کا ذکر نہ لائے۔ بزرگ فقیر کی آخری پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت آگیا تھا۔ شہزادہ رمان اٹھارہ سال کا ہو چکا تھا، اور یہ سفر ایک دو دن یا مہینے کا تو تھا نہیں، یہ مصیبت پورے دس سال کی تھی، بادشاہ نے مجلس میں فیصلہ کیا کہ "شہزادے کو اس سفر پر چلا جانا چاہیے کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ آگے چل کر کوئی ناگہانی مصیبت ہمارے بیٹے پر آئے، میرے اپنے بیٹے کے برابر عزیز، وزیراعظم ابوذر کے بیٹے حارث کی خواہش ہے کہ وہ اس سفر میں ہمارے بیٹے کے ساتھ رہے،...

ہم بیٹے حارث کو پوری پوری اجازت دیتے ہیں۔ اپنے بیٹے کے بارے میں ابوذر کی کیا رائے ہے؟" "دل چھوٹا نہ کیجیے جہاں پناہ! اس ناچیز نے پوری عمر آپ کی خدمت میں گزاری ہے، حارث کی یہ خوش قسمتی ہوگی کہ وہ صاحب عالم شہزادہ رُمان کی غلامی میں اپنی زندگی پوری کرے، آپ کی طرح میرا بھی ایک ہی جگر کا ٹکڑا ہے، میں نے بڑی ہوشمندی سے اس کی پرورش کی ہے، حارث کے ہوتے ہوئے ہمارے شہزادے پر کوئی آنچ نہیں آسکتی، رب کعبہ کی قسم حارث اپنی جان دے دے گا، میں پوری خوشی کے ساتھ اپنے بیٹے حارث کو شہزادے کے ساتھ جانے کی اجازت دیتا ہوں۔" ابوذر کا یہ فیصلہ سن کر بادشاہ اور ملکہ کے مغموم چہرے تھوڑی دیر کے لیے مسکرا اٹھے۔

کل سے آج تک کے عرصہ میں وزیر زادہ حارث نے شہزادے رُمان کو اُس کی زندگی کے بارے میں تمام پیشین گوئیاں بہت تفصیل کے ساتھ سنا ڈالیں۔ وہ تمام باتیں جو اب تک شہزادے پر پوشیدہ تھیں سب اس کے دوست نے بتلا دیں، معصوم، نیک دل شہزادہ کچھ خوف زدہ سا ہوگیا کہ وہ دس سال کا طویل عرصہ اپنے پیارے ماں باپ سے علاحدہ کیسے گزارے گا اور جانے کیسے کیسے خیالات اس کے ذہن میں آنے لگے، مگر شاباشی ہے اُس کے دوست حارث پر، جس نے شہزادے کا سارا ڈر اور خوف نکال کر اُس میں سفر کے تجربے، سفر کی دلچسپیاں، ملکوں، ملکوں، سمندروں، سمندروں کی سیر اور عجیب و غریب لوگوں سے ملاقات کا شوق بڑے بڑے سیاحوں کے واقعات سنا کر بھر دیا، شہزادہ رُمان بھی اس سفر کے لیے تیار ہوگیا۔

اگلے روز وعدہ کے مطابق دربار عام لگا، پورا ملک بادشاہ کا فیصلہ سننے کے لیے اُمڈ آیا تھا، مصری شہزادہ معاذ زرق برق لباس پہنے اپنے سوال کا جواب سننے کا منتظر تھا، بادشاہ فیروز بخت کو اگر کسی کا انتظار تھا تو شہزادہ رُمان اور وزیر زادہ حارث کا تھا۔ یہ دونوں ابھی تک دربار میں نہ آئے تھے، تھوڑی دیر میں صدر دروازہ سے شہزادہ اور وزیر زادہ آتے نظر آئے، اُن کے ساتھ ان کا دوست قطمیر بھی تھا۔ تمام درباریوں نے اُن پر پھول برسائے اور درازیِ عمر کی دعا دی، شہزادہ اور وزیر زادہ، دربار میں اونچے اور ممتاز مقام پر جلوہ افروز ہوئے، ہمیشہ کی طرح قطمیر صاحب ان دونوں کے درمیان پھسکڑا مار کر بیٹھ گئے، بادشاہ نے ان تینوں کی جوڑی کو تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھا اور پھر درباریوں سے مخاطب ہوا۔ "تمام خوبیاں اس پاک پروردگار کی ہیں جس نے یہ ساری کائنات پیدا کی، اور مجھے حکمراں بنا کر انسانوں کی خدمت کے لیے پیدا کیا" اس حمد کے بعد اس نے اپنا فیصلہ ان الفاظ میں سنایا "میرے عزیز، شہزادۂ مصر! مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں تم نے جس چیز کی ہمارے شہزادے کو ترغیب دی وہ تو ہمارے لختِ جگر کی زندگی کا اہم جز ہے، تم تفصیلات سے بے خبر ہو اس لیے حیران ہو رہے ہوگے، جلد ہی تم کو معلوم ہو جائے گا کہ اتنا اہم فیصلہ ہم نے اتنی جلدی کیوں کر لیا، خیر ہمیں تمھاری پیش کش منظور ہے، میرا بیٹا اس سرخ مچھلی کی تلاش میں جائے گا، اور مچھلی کا جوڑا مکمل کرے گا، اس سفر میں ہمارے شہزادے کا جان سے زیادہ عزیز دوست، وزیر اعظم ابوذر کا لاڈلا، اکلوتا بیٹا، نوجوان حارث ہوگا، اور ان دونوں کی حفاظت کے لیے کوئی لاؤ لشکر نہیں، بلکہ ایک بے زبان، معصوم کتا، قطمیر ہوگا" یہ کہہ کر بادشاہ بیٹھ گیا، اس کے بعد مصری شہزادہ معاذ کھڑا ہوا اور کہا "سراپا سپاس ہوں جہاں پناہ، آپ نے میری لاج رکھ لی، اب میں وطن جاؤں گا تاکہ شہزادے کے سفر کے تمام انتظامات مکمل کروں، اور ایک ماہر جغرافیہ داں کو بھیجوں گا وہ ان کو تمام دنیا کی خشکی اور تری کے احوال بتائے گا، خدا حافظ۔" (باقی آئندہ)

طلحہ بن ابوسلمہ ندوی

بادشاہ کا انصاف

بہت عرصہ گزرا، بغداد میں ایک لکڑہارا روزانہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا اور اُن کو بیچ کر اپنا گزارا کرتا۔

ایک شام جب وہ حسبِ معمول اپنے گدھے پر لکڑیاں لادے ہوئے "لکڑیاں لے لو" کی آواز لگاتا ہوا بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک حجّام نے اُسے اپنی دُکان سے آواز دی اور جب لکڑہارا وہاں پہنچا تو حجّام نے تمام لکڑیوں کی قیمت چاندی کے دو سکّے منظور کر لیے۔

لکڑہارا جب تمام لکڑیاں اپنے گدھے سے اُتار چکا تو حجّام نے گدھے کی پیٹھ پر لدی ہوئی کاٹھی بھی اُتار لی۔ جب پر لکڑہارے نے اعتراض کیا تو حجّام نے اُس سے کہا۔ "میں نے تمام لکڑیوں کی قیمت ادا کی ہے تو لکڑی کی یہ کاٹھی بھی کیوں نہ لے لوں۔ میں نے تم سے ساری لکڑیوں کا سودا کیا ہے اور اب تم اس سودے سے انکار نہیں کر سکتے۔" حجّام نے لکڑہارے کی ایک نہ سُنی۔ اُس نے بہت خوشامد کی، بہت گڑگڑایا لیکن اپنی بات پر حجّام اڑا رہا اور ذرا دھمکا کر لکڑہارے کو بھگا دیا۔ غریب لکڑہارا روتا دھوتا بغداد کے بادشاہ (ہارون رشید) کی طرف روانہ ہوا تاکہ وہ انصاف کرے۔

لکڑہارے نے بادشاہ کی خدمت میں پہنچ کر تمام واقعہ بیان کیا۔ واقعہ سُن کر بادشاہ نے اس حجّام کو بلوا بھیجا۔ حجّام نے بادشاہ کے سامنے بھی وہی الفاظ دُہرائے۔ "میں نے اس لکڑہارے سے اُس کی تمام لکڑیوں کا سودا کیا تھا۔ اب آپ ہی انصاف کیجیے کہ اس سودے کے حساب سے گدھے کی کاٹھی بھی میری ہوئی یا نہیں جو لکڑی کی بنی ہوئی ہے۔"

بادشاہ نے کہا۔ "تم ٹھیک ہی کہتے ہو، تم نے سودا کیا ہے اور سودا تو سودا ہے۔ وہ کاٹھی بھی تمھاری ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔" حجّام چلا گیا۔

بادشاہ نے لکڑہارے کے کان میں کچھ کہا۔ حجّام کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی اور وہ بھی بادشاہ کو سلام کر کے دربار سے رخصت ہو گیا۔

دو چار روز کے بعد لکڑہارا اپنے گدھے کے ساتھ حجّام کی دُکان پر پہنچا۔ گدھے کو دیوار کے سہارے کھڑا کر کے دُکان میں داخل ہوا۔ اور حجّام سے طے کیا کہ میری اور ایک میرے ساتھی کی جو باہر کھڑا ہے

جامت بنا دو، کیا لوگے ؟"

حجّام نے دونوں کی مزدوری بتا دی۔ لکڑہارے نے اُجرت پیشگی دا کر دی اور بیٹھ گیا۔ جب اُس کی حجامت بن چکی تو وہ اُٹھا اور باہر سے گدھے کو لا کر حجّام کے سامنے کھڑا کر دیا اور کہا: "میرے ساتھی کی بھی حجامت بنا چکو!"

حجّام کو بڑا غصّہ آیا اور اُس نے لکڑہارے کو گالیاں دے کر دکان سے باہر نکال دیا۔ غریب لکڑہارا چُپ چاپ چلا گیا۔ آج پھر اُس کا رُخ شاہی دربار کی طرف تھا۔

تھوڑی دیر میں طلبی آئی۔ حجّام کو اپنے اوزار کے ساتھ دربار میں پہنچنا تھا۔ جب حجّام پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ لکڑہارا وہاں پہلے سے موجود ہے۔ اور گدھا بھی اُس کے ساتھ ہے۔

مقدمہ پیش ہوا۔ دونوں کا بیان لیا گیا۔ بادشاہ نے کہا۔

"جب لکڑہارے نے تم سے سودا کیا۔ تم نے اُس کے ساتھی کی حجامت بنانا منظور کی اور نقد اُجرت پیشگی وصول کر لی تو اب اس بارے میں کیوں عذر ہے؟ سودا تو سودا ہے، تمھیں اب اس گدھے کی حجامت بنانا ہی پڑے گی۔"

آخر کار حجّام کو بھرے دربار میں صابن لگا لگا کر گدھے کی حجامت بنانا پڑی۔ تمام درباری بادشاہ سمیت قہقہے لگا رہے تھے اور حجّام ندامت سے پسینے پسینے ہو رہا تھا۔

بادشاہ نے لکڑہارے کو بہت کچھ انعام و اکرام دے کر رخصت کیا۔

نسیم منّان

یہ دُنیا کتنی سُندر ہے

یہ دُنیا کتنی سُندر ہے

یہ اُونچے پربت، یہ دھارے
یہ سورج، یہ چاند، ستارے
نیچے سبزے کی چادر ہے
اُوپر کیا پیارا امبر ہے
یہ دُنیا کتنی سُندر ہے

نکھرا ستھرا سا آنگن ہے
پیارا پیارا گلشن ہے
رنگوں کی اٹھلاتی نہر ہے
گیتوں کا امرت ساگر ہے
یہ دُنیا کتنی سُندر ہے

سردی، گرمی اور برساتیں
دن اچھے، بہتر ہیں راتیں
ہر منظر پیارا منظر ہے
شام حسیں، رنگیں سحر ہے
یہ دُنیا کتنی سُندر ہے

جو بھی بُرائی ہے دفنا دو
نفرت، بدامنی کو مٹا دو
پیار محبت کا یہ گھر ہے
امن و سکوں، خوشیوں کا نگر ہے
یہ دُنیا کتنی سُندر ہے

۲۳۵۔ سکھاریتھ، ستولا پور ۴۱۳۰۰۲

شفیق احمد صدیقی

حسد کا انجام

پرانے زمانے میں ایک بادشاہ ایک ملک پر حکومت کرتا تھا۔ یہ بادشاہ انصاف پسند تھا۔ ظالم کو سزا دیتا اور مظلوم کی مدد کرتا تھا۔ بڑا رحم دل اور مہربان تھا۔

رات کو بھیس بدل کر گشت کرتا۔ وزیر بھی ہمراہ ہوتا۔ ایک دن بادشاہ اور وزیر گشت کرتے ہوئے ایک مکان کے قریب سے گزر رہے تھے تو بات چیت اور ہنسی مذاق کی آوازیں سن کر رک گئے۔ اندازہ ہوا کہ دو تین عورتیں ہیں۔ ان میں کوئی مرد نہیں۔ بادشاہ نے جھانک کر دیکھا تو یہ تینوں چرخے کاتتی نظر آئیں۔ اُن میں سے ایک جو سب سے بڑی تھی بولی: "کاش میرا بیاہ شاہی نان بائی سے ہو جاتا اور میں اس مشقت سے نجات پا جاتی۔" منجھلی بہن بولی: "کاش! میرا نکاح شاہی باورچی سے ہو جائے تاکہ مجھے روز تازہ تازہ کھانے کو ملے۔" چھوٹی بہن نے کہا: "کاش! میری شادی بادشاہ سلامت سے ہو جائے اور میں ملکہ کہلانے لگوں۔"

بادشاہ یہ سن کر وہاں سے ہٹ گیا اور وزیر سے کہا: "اس گھر

مالیگاؤں (مہاراشٹر)

کو پہچان لو اور تینوں بہنوں کو صبح دربار میں حاضر کرو۔"

بادشاہ کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ تینوں بہنیں دربار میں پہنچا دی گئیں۔ تینوں بہت خوف زدہ تھیں۔ بادشاہ نے دربار برخاست کر کے تخلیہ میں ان سے رات والی باتیں دہرانے کا حکم دیا۔ وہ سخت گھبرائیں لیکن بیان کیے بغیر چارہ کیا تھا۔

بادشاہ نے ایک کی شادی نان بائی سے، دوسری کی باورچی سے کر دی اور تیسری سے اپنی شادی کر لی۔

لیکن اب دونوں بہنیں چھوٹی سے جلنے لگیں اور انتقام کا موقع تلاش کرتی رہتیں۔ بالآخر وہ موقع ہاتھ آ گیا۔ چھوٹی بہن (ملکہ) ماں بننے والی تھی۔ پیدائش کے موقع پر حقیقی بہنیں ہونے کے ناتے قریب رہنے اور دیکھ بھال کا موقع ملا۔ وہ ملکہ کی دل جوئی میں لگ گئیں۔

ملکہ نے ایک خوب صورت بچے کو جنم دیا۔ دونوں بہنوں نے بچے کو ایک ٹوکری میں رکھ کر دریا میں بہا دیا اور ایک بلّی کا بچہ بے ہوش ملکہ کے پہلو میں لٹا دیا۔ پھر ملکہ اور بادشاہ کو یہی باور کرا دیا گیا کہ بلّی کا بچہ ہوا ہے۔ یقین کرنا پڑا۔ دوسری اور تیسری مرتبہ بھی

بچے کی پیدائش کے موقع پر یہی ڈرامہ کھیلا گیا، دوسرا بھی بچہ تھا اور تیسری بچی۔ ان کی جگہ پر جانوروں کے بچے دکھائے گئے اور ان کو ٹوکریوں میں رکھ کر بہا دیا گیا۔

اتفاق سے ان تینوں بچوں کو شاہی مالی نے پایا، اُس کی کوئی اولاد نہ تھی اور وہ خوش حال تھا۔ اُس نے اُن کو اپنی اولاد کی طرح پال لیا۔

بادشاہ دونوں بہنوں کے بھروسہ کا شکار ہوگیا۔ آنکھوں دیکھی بات کا یقین کیسے نہ کرتا۔ بادشاہ نے ملکہ کو ایک پنجرے میں ڈال کر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر لٹکوا دیا اور حکم جاری کر دیا کہ لوگ اُس کے منحوس منھ پر تھوکا کریں۔

مالن نے بڑے لڑکے کا نام پرویز، دوسرے کا شاہین اور لڑکی کا نام نسیم رکھ چھوڑا تھا اور اُن کی تربیت و تعلیم کا معقول انتظام کر دیا تھا، گھوڑ سواری اور اسلحہ بازی کی بھی تعلیم ملتی رہی۔ یہ بچے مالی اور مالن ہی کو اپنا ماں باپ سمجھتے رہے۔ جب یہ سیانے ہو گئے تو اتفاق سے ایک ہیضے کی وبا میں دونوں میاں بیوی چل بسے۔ صبر کر کے یہ بچے رہا سہا اثاثہ لے کر ایک پُر فضا وادی میں ایک باغ اور گھر بنوا کر جا بسے۔

ایک مرتبہ بادشاہ شکار کی غرض سے اس وادی میں آیا اور مکان اور خوب صورت مکینوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اُن کے اخلاق سے بہت خوش ہوا اور خود بہ خود ان کی محبت کا غلبہ ہوا۔ بادشاہ رخصت ہونے لگا تو بولا: "میں تم لوگوں کو یاد رکھوں گا۔" اور دُعائیں دے کر رخصت ہو گیا۔ بادشاہ نے محل میں آکر دونوں بہنوں سے ان بچوں کا ذکر کیا تو وہ ان کو دیکھنے وادی میں گئیں اور دیکھتے ہی سمجھ گئیں کہ یہ وہی بچے ہیں۔ خوف ہوا کہ اگر راز ظاہر ہوا تو جان کا خطرہ ہے۔ اچانک بڑی کو اپنی دادی کی کہی بات یاد آئی کہ دکھن جانب ایک پہاڑ ہے جس پر ایک جادوگر رہتا ہے۔ وہ جادوگر اس پہاڑ پر آنے والے کو جادو سے پتھر بنا دیتا ہے اس لیے کوئی اُس پہاڑ پر جانے کی جرأت نہیں کرتا۔ "اُس پہاڑ پر تین عجوبۂ روزگار چیزیں ہیں۔ اُن کا دُنیا میں جواب نہیں، ایک بولتی چڑیا۔ دوسرا گاتا درخت اور تیسری چیز سنہری چشمہ ہے۔" یہ خیال آتے ہی بڑی بہن کو ایک ترکیب سوجھی جس میں اپنا بچاؤ تھا۔ ان دونوں نے پرویز، شاہین اور نسیم کو پڑھایا کہ ان چیزوں کے بغیر تمھارے مکان اور باغ کی رونق ادھوری ہے۔ نسیم کا شوق تیز تر ہو گیا اور وہ مچل گئی کہ ہمارے یہاں یہ سب چیزیں ہونا چاہئیں۔ پرویز بہن کا شوق پورا کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اُس نے اپنے بھائی بہن کو اپنا ایک خنجر دیتے ہوئے کہا۔ "کہ اگر مجھ پر کوئی مصیبت آئی تو یہ خنجر میلا ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ روانہ ہو گیا اور سرحد کے قریب پہنچا تو ایک جھونپڑی میں ایک فقیر کو دیکھا۔ سلام دُعا کے بعد فقیر سے اپنی غرض بیان کی۔ فقیر نے اوّل تو منع کیا۔ پرویز نے جب جانے پر اصرار کیا تو فقیر نے کہا: "اچھا جاؤ، میں ایک چڑیا ساتھ کرتا ہوں وہ تمھاری رہ نمائی کرے گی جب تم اُس پہاڑ پر جاؤ گے تو طرح طرح کی آوازیں تمھارے کانوں میں آئیں گی لیکن گھوم کر تم پیچھے نہ دیکھنا ورنہ پتھر کے ہو جاؤ گے۔" پرویز چڑیا کے ہمراہ پہاڑ تک آگیا۔ چڑیا رخصت ہو گئی۔ پرویز پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ طرح طرح کی خوف ناک آوازیں اور گالیاں سنائی دینے لگیں، پہلے تو پرویز نے کچھ دھیان نہ دیا لیکن جب گالیاں ناقابلِ برداشت ہو گئیں تو اچانک وہ غصّے میں تلوار لے کر پلٹا تو پتھر ہو گیا۔

خنجر یکایک میلا ہو گیا تو شاہین اور نسیم اُس کی مصیبت سے واقف ہو گئے۔ اب شاہین نسیم سے رخصت ہو کر بھائی کی تلاش میں فقیر تک آیا اور اُسی چڑیا کے پیچھے پیچھے اُس جادوگر کے پہاڑ تک آیا۔ چڑیا تو رخصت ہو گئی۔ آگے جا کر شاہین کا بھی وہی حال ہو گیا۔ نسیم کو شاہین کے دیے ہوئے موتیوں سے یہ حال معلوم ہو گیا کیوں کہ اس کے دیے ہوئے بکھرے موتی آپس میں جُڑ گئے تھے۔

تب نسیم مردانہ بھیس بدل کر فقیر کے پاس پہنچی۔ فقیر پہچان گیا کہ یہ لڑکی ہے۔ اس کی ہمّت کی داد دی اور نصیحت کی کہ ہرگز ہرگز طیش میں آکر پیچھے گھوم کر نہ دیکھنا اور چڑیے کے ساتھ اُسے رخصت کر دیا۔ نسیم پہاڑ پر پہنچی۔ کسی قسم کی آواز پر اُس نے کوئی توجہ نہ کی شور و غل ہوتا رہا۔ گالیوں کی بوچھار بھی ہوتی رہی۔ نسیم نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ اس لیے نہ اُس نے کوئی آواز سنی اور نہ گھوم کر دیکھا نہ ہی کوئی جواب دیا۔ جب اوپر پہنچ گئی تو اُس نے اپنے کانوں سے روئی نکال لی۔ دیکھا ایک درخت میں ایک پنجرہ لٹکا ہوا ہے۔ اُس میں ایک چڑیا بیٹھی ہوئی "چور چور" کی صدا لگا رہی ہے۔ نسیم نے پنجرہ نیچے اُتار لیا اور چڑیے سے اپنے ارد گرد بکھرے ہوئے پتھر کے بہت سارے بتوں کے بارے میں پوچھا۔ چڑیے نے بتایا کہ یہ سب انسان ہیں۔ یہاں آکر جادو سے پتھر کے بت ہو کر رہ گئے ہیں

نسیم نے "گاتا درخت" بھی دیکھا جس سے موسیقی کی لہریں بکھر رہی تھیں۔ نسیم نے چڑیے سے اِن بُتوں کا علاج پوچھا تو چڑیا نے کہا: سامنے جو سنہری چشمہ ہے اُس کا پانی ان بتوں پر چھڑکا جائے تو پھر یہ زندہ ہو جائیں گے۔ نسیم نے ایسا ہی کیا۔ اُس کے بھائی سمیت سب کے سب زندہ ہو گئے۔ اور "نسیم زندہ باد!" کے نعرے لگائے۔ شکریہ ادا کیا اور اجازت لے کر اپنے اپنے وطن کو روانہ ہو گئے۔

نسیم نے ایک گھڑے میں سنہری چشمے کا پانی لیا اور درخت کی ایک ٹہنی کاٹ لی اور پنجرا بھی ساتھ میں رکھ لیا۔ بھائیوں سے گلے مل کر خوب روئی اور اُن کو ساتھ لے کر سرحد پر پہنچی تو فقیر کو جھونپڑی میں نہ پایا۔ لیکن ایک تحریر ملی "کامیابی مبارک ہو۔"

تینوں اپنے گھر آ گئے۔ ٹہنی لگا دی گئی۔ وہ جلد ہی ایک درخت بن کر موسیقی اُگلنے لگی۔ سنہری چشمہ لہلہانے لگا اور چڑیا چہچہانے لگی۔

ایک دن چڑیے نے بادشاہ کی دعوت کا مشورہ دیا اور بتایا کہ درخت کے پاس موتیوں سے بھری ایک صندوقچی دفن ہے اس کو نکال کر موتیوں کی کھیر تیار کر کے بادشاہ کے سامنے رکھو۔ میں آج ایک راز افشا کروں گی۔"

بادشاہ کی دعوت کی گئی۔ بعد طعام موتیوں کی کھیر بھی پیش کی گئی۔ بادشاہ نے حیرت سے کہا کہ یہ تو مجھ سے نہ کھائی جائے گی۔ کیا تم لوگ یہ کھاتے ہو؟"

چڑیے نے جواب دیا "حضور! ہم لوگ تو وہی عام غذائیں استعمال کرتے ہیں جو انسان کے کھانے کی ہیں۔ لیکن جب آپ یہ کھیر دیکھ کر یقین نہ کر سکے کہ یہ کھانے کی چیز ہو سکتی ہے تو اس کا یقین کیسے ہو گیا کہ ایک انسان کے بطن سے حیوان کے بچے پیدا ہوئے۔ آپ اور آپ کی ملکہ کے ساتھ اس کی بہنوں نے آپ کی نظروں میں اپنی بہن کی عزت گھٹانے کے لیے سازش اور غداری کی تھی۔ یہ کہہ کر اُس نے سارے واقعات بتا دیے اور یہ بھی بتا دیا کہ یہ تینوں وہی آپ کی اولادیں ہیں۔

بادشاہ حیرت زدہ رہ گیا، خوش ہو گیا۔ بچوں کو گلے لگایا اور بہت جلد جا کر اُس نے اپنی ملکہ کو پنجرے سے آزاد کیا، اُس سے معافی مانگی۔ ملکہ نے بھی یہ خوش خبری سُن کر تہہ دل سے معاف کر دیا۔ نہ صرف بادشاہ کو بلکہ اپنی بہنوں کو بھی معاف کر دیا اور بادشاہ سے درخواست کی کہ اِس خوشی کے موقع پر اُن کو بھی معاف کر دیا جائے۔

بادشاہ نے بھی مصلحت اسی میں سمجھی۔

بادشاہ نے تمام ملک میں جشنِ عام اور "چراغاں" کا حکم دیا۔ اِس کی تعمیل ہوئی۔ ہر طرف مسرت کی لہریں دوڑ گئیں۔ پھر ان تینوں کی شادیوں کا اہتمام ہوا اور بڑی دھوم دھام سے یہ کام انجام پایا۔ کچھ دنوں کے بعد بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔ لڑکوں نے اپنے اپنے حصّے کے ملک میں عدل و انصاف سے حکومت کی۔ رعایا بہت خوش حال رہی اور دُعائیں دیتی رہی۔

● ● ●

ڈاکٹر حلیم کوثر چاندپوری

"پولیو"

"POLIO"

آپ میں سے جو بچے کرکٹ سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ "چندرشیکھر" کے نام سے بخوبی واقف ہوں گے۔ ہندستان کا وہ مایۂ ناز اسپنر جس کی گیندیں دنیا کے نامی بلّے باز کبھی نہ سمجھ سکے۔ لیکن کیا آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ چندرا کی گیندیں اس قدر خطرناک کیوں ہوتی ہیں اور اس کا راز کیا ہے؟ اگر نہیں معلوم تو میں بتاتا ہوں۔ چندرا کو بچپن میں ایک بیماری ہوئی تھی جس سے ان کا سیدھا ہاتھ پتلا اور کمزور ہوگیا اور تھوڑا سا مڑ گیا۔ اس عیب نے ان کی گیندوں میں وہ خطرناک گھماو پیدا کر دیا جس نے ان کو دنیا کا عظیم بالر بنا دیا۔ اور اس طرح ایک بیماری ان کے لیے رحمت بن گئی۔ لیکن ہر آدمی چندرشیکھر نہیں ہوتا۔ آپ نے بہت سے بچوں کو دیکھا ہوگا جن کے پیر پتلے ہیں، وہ بیساکھیوں کے سہارے چلتے ہیں، ٹرائی سائیکل پر بھی بہت سے آدمیوں کو معذوری کی حالت میں دیکھا ہوگا۔ یہ سب عموماً اسی بیماری کے شکار ہوتے ہیں جس کے چندرا تھے، لیکن یہی عیب ان کے لیے رحمت بن گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ بیماری کا کمال نہیں کہ چندرشیکھر اتنے مشہور ہوئے بلکہ اس میں ان کا حوصلہ اور ہمت شامل تھی کہ ایک عیب اور کمی کے باوجود وہ اس مقام تک پہنچے، ہر آدمی میں یہ حوصلہ اور ہمت نہیں ہوسکتی۔

اس بیماری کا نام ہے "پولیو" اردو میں اکثر اس کو "ادھرنگ" بھی کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں اس کا پورا نام (Poliomyelitis) ہے۔ اس بیماری کا کیڑا جس کو "پولیو وائرس" (Polio Virus) کہتے ہیں ناک، یا کھانے پینے کی چیزوں کے ذریعے جسم میں داخل ہوتا ہے اور صرف بچوں کو اپنا شکار بناتا ہے۔ عام طور سے پانچ سال تک کے بچے اس کا شکار ہوتے ہیں اور اس کے بعد اس کا اثر جسم پر نہیں ہوتا۔

جسم میں داخلے کے ہفتہ یا پندرہ دن بعد یہ جراثیم اپنا اثر دکھاتے ہیں، سر اور بدن میں درد کے ساتھ تیز بخار آتا ہے اور پیٹ کی خرابی کی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ بیمار دو تین روز بعد بہتر محسوس کرتا ہے مگر چھ سات دن کے بعد دوبارہ سر، کمر اور بدن میں نہایت شدید درد ہوتا ہے، قے اور دست بھی آسکتے ہیں، بے چینی بڑھ کر سرسام کی سی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ بخار ایک دو روز بعد کم ہوتا ہے لیکن عضلات کا درد شدید ہوجاتا ہے اور اس کے بعد جسم کے کسی بھی حصّے پر خاص طور سے پیروں، ہاتھوں یا چہرے پر فالج کا اثر ہوجاتا ہے۔ اور ان حصوں کے عضلات بے حرکت ہوجاتے ہیں۔ عام طور سے پیروں پر یہ زیادہ ہوتا ہے۔ فالج ہونے کے تقریباً ہفتہ بھر کے بعد فالج زدہ حصہ میں معمولی حرکت پیدا ہوتی ہے اور اگر باقاعدہ ہلکی قسم کی ورزشیں کرائی جائیں تو یہ بالکل ٹھیک بھی ہوجاتا ہے۔ اکثریت ایسی ہوتی ہے جن میں فالج زدہ حصہ پتلا، اور کمزور پڑ جاتا ہے اور سخت ہونے کے ساتھ ساتھ مڑ کر بدشکل ہوجاتا ہے، اور یہی اس بیماری کی آخری شکل ہے جس کی وجہ سے بیمار زندگی بھر معذوری کی زندگی بسر کرتا ہے۔

اس بیماری کا کوئی علاج نہیں۔ ڈاکٹر ضروری دواؤں اور ورزشوں سے صرف مدد کر سکتے ہیں علاج نہیں۔ لیکن سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اس کو پوری طرح روکا جاسکتا ہے۔ اگر کسی کو یہ بیماری ہوجائے تو اس کو کم از کم چھ ہفتے کے لیے بالکل الگ کمرے میں رکھنا چاہیے۔ جب تک جسم میں درد اور بخار رہو انجکشن یا کسی بھی قسم

ا/۳۴۳ کینال روڈ، اوکھلا ہی دہلی ۲۵

کے آپریشن سے بچنا چاہیے ورنہ فالج جلدی اور شدید ہو سکتا ہے۔

روک تھام کے لیے، پولیو کا ٹیکہ ہندستان میں بھی ملتا ہے۔ جس سے سو فی صدی اس بیماری سے بچا جا سکتا ہے۔ آپ کے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ نام تو اس کا ٹیکہ ہے۔ مگر یہ انجکشن کی شکل میں نہیں بلکہ بوندوں کی شکل میں ہوتا ہے جو پلائی جاتی ہیں۔ پہلی بار یہ قطرے بچے کو تین مہینے کی عمر میں پلائے جاتے ہیں اور پھر چوتھے مہینے اور پانچویں مہینے کی عمر میں بھی دیے جاتے ہیں۔ چوتھی خوراک تیسرے قطروں کے ڈیڑھ سال بعد، اور پانچویں اور آخری خوراک بچے کی اسکول جانے کی عمر یعنی تقریباً پانچ سال کی عمر میں دی جاتی ہے۔ اس طرح لگا تار پانچ خوراک دینے کے بعد اس بیماری کے حملے سے مستقل طور پر بچایا جا سکتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ یہ بوندیں ہر مہینہ یعنی شروع میں بالکل وقت پر دی جائیں ورنہ بے اثر ہو جاتی ہیں۔ اتنی خراب بیماری سے بچنے کا یہ نہایت آسان طریقہ ہمارے لیے قدرت کا کرم ہے اور ہم سب کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

مجھے یقین ہے کہ آپ میں سے کوئی بھی بچہ کسی اپاہج بچہ یا فرد کو دیکھ کر کبھی اس کا مذاق نہیں اڑائے گا، بلکہ اس کو چندر شیکھر کی مثال دے کر اس میں حوصلہ اور ہمت پیدا کرے گا کہ اپنی معذوری سے جدوجہد اور کامیاب زندگی گزارنے کے لیے ہمت اور استقلال سے کام لے۔

مکتبہ پیام تعلیم کی دو نئی کتابیں

اسلام کے مشہور سپہ سالار

عبدالواحد سندھی جامعی

بچوں کے لیے اسلام کے مشہور سپہ سالاروں کا تفصیلی تعارف نیز ان کی زیر قیادت لڑی گئی جنگوں کے حالات جن کے پڑھنے سے ایمان میں تازگی آتی ہے۔

حصہ اول ۔/۴ حصہ دوم ۔/۴

اسلام کے مشہور امیر البحر

عبدالواحد سندھی جامعی

اس کتاب میں مسلمانوں کے جہاز سازی اور جہاز رانی کے کارنامے نیز ان سمندری سپہ سالاروں کے حالات بتائے گئے ہیں جنھوں نے تاریخ میں نام اونچا کیا۔ قیمت: ۴/۵۰

پیام تعلیم کہاں کہاں ملتا ہے

سعیدی کتب خانہ، ناکہ بھنڈی بازار، بمبئی ۳
ناز بکڈپو بھنڈی بازار، بمبئی ۳
بچوں کا کتب خانہ، ناکہ جے جے ہسپتال، بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ا
نیشنل بکڈپو، نگتیا روڈ، گیا
زینت اردو نیوز ایجنسی، پرانا محلہ البیال (کرناٹک)
مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ، تھانہ منڈی (کشمیر)
ہلال نیوز ایجنسی، شیواجی پول، یوسد (مہاراشٹر)
محمد بدرالدین، بیڑ (مہاراشٹر)
ایم۔ کے نداف، باگیواڑی (کرناٹک)
اردو بکس ایجنسی، چترا درگ (کرناٹک)
ایم عزیز احمد نیوز ایجنٹ۔ نواب پورہ ۴-۸-۷-۴۔ اورنگ آباد
محمد الیاس ۹۱ کولوٹولہ اسٹریٹ، کلکتہ ۳،
بک امپوریم سبزی باغ۔ پٹنہ ۴
مکتبہ اطفال۔ مالیگاؤں (ناسک)
سنٹرل اسٹور، رام دیوا سٹریٹ، بیلگام
غیاث الدین تاج، ٹیٹیانہ، کلٹی (مغربی بنگال)
شمع بک اسٹال، چوک گھنٹہ گھر سبزی منڈی، الہ آباد ۳
مدینہ بکڈپو، اسلام پورہ، جلگاؤں
تنویر بک ڈپو، جی۔ ٹی روڈ، آسنسول
محمد عبدالقدیر بک اسٹال۔ مین روڈ، موتی ہاری (بہار)
مکتبہ معارف الاسلام، قاضی باڑہ، نظام پورہ۔ بھیونڈی (تھانہ)
سراج الحسین خاں، گنج دوم، بتیا (چمپارن)
نالج سنٹر، مقابل پی، یو لائبریری۔ پٹنہ ۶
مسٹر جنید عالم، کریم گنج، گیا (بہار)
شیخ بک ایجنٹ نارتھ قصبہ شولاپور
ہمارا بک ڈپو، ترکی واڑ، سورت
طارق نیوز ایجنسی، مومن پورہ۔ ناگپور
ریڈرز ویو، بھولی مور، دھنباد
مسلم اقبال، ٹیٹیانہ۔ کلٹی (مغربی بنگال)
کتاب گھر، سٹی چوک، اورنگ آباد
جنرل بک اسٹال، کشن گنج (بہار)
بھوپال بک ہاؤس۔ بدھوارہ، بھوپال
عظیم آباد کتاب گھر، گردنی باغ، پٹنہ
نکہت بک ڈپو، اے، بی روڈ آسنسول

محمد غیاث الدین تاج

ٹوٹی ہوئی تلوار

بڑی گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ سپاہیوں کے وحشیلے نعرے، چیخیں، کراہیں اور تلواروں کی جھنکار سے ساری فضا گونج رہی تھی۔

شہزادہ انور ایک نازک محاذ پر دشمن کا مقابلہ کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی فوجی قوت گھٹتی جا رہی تھی اور دشمنوں کے حوصلے بلند ہوتے جا رہے تھے۔ جہاں شہزادہ بڑی بہادری اور جواں مردی سے دشمن کے حملوں کا جواب دے رہا تھا وہاں فوج کا ایک سپاہی یہ سوچ رہا تھا کہ اگر میرے پاس بھی شہزادے کی تلوار جیسی چمک دار اور اعلا قسم کے فولاد کی تلوار ہوتی تو میں بھی اسی کی طرح دشمن کی فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا اور خون کی ندیاں بہا دیتا۔ مگر میری تلوار تو پرانی اور کمزور ہے۔ اس ٹوٹی پھوٹی تلوار سے بھلا دشمن کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہوں۔

اس نے یہ بات بار بار سوچی اور جھلا کر تلوار کے دو ٹکڑے کر دیے اور جنگ کے میدان سے فرار ہو گیا۔ ادھر شہزادہ انور بری طرح دشمنوں کے نرغے میں آ گیا۔ دشمن کے بہادر سرداروں نے اسے چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا تھا مگر شہزادہ انور اسی جوش اور ولولے کے ساتھ ان کا مقابلہ کیے جا رہا تھا۔ تقدیر کی بات ــ ٹھیک اسی وقت ایک سردار سے لڑتے ہوئے شہزادے کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی اور دور جا گری۔ اب شہزادہ بالکل نہتا ہو کر رہ گیا تھا اور دشمن تھے کہ چڑھے آ رہے تھے۔ شہزادے نے پھر بھی حوصلہ نہیں ہارا۔ اور اپنے بچاؤ کی برابر کوشش کرتا رہا۔ بچتے بچتے آخر وہ اس جگہ پر آ گیا جہاں ریت پر اس بزدل سپاہی کی ٹوٹی ہوئی تلوار پڑی تھی۔ شہزادے نے تیزی سے جھپٹ کر وہ تلوار اٹھا لی اور پھر ایک بار پوری جرات کے ساتھ دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ اور پھر شام ہوتے ہوتے جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ شہزادے کی جواں مردی اور دلیری دیکھ کر وہ سارے سردار جو اسے گھیرے ہوئے تھے خوف زدہ اور مایوس سے ہو گئے۔ اور آخر شہزادے نے یہ جنگ جیت لی۔

اس طرح جس تلوار کو ایک بزدل سپاہی نے بے کار جان کر توڑ دیا تھا، وہی فتح کا پرچم بن گئی۔

(مرکزی خیال انگریزی سے)

اقبال میموریل اردو اسکول چتیانہ کلٹی بردوان

شاہ نواز قطب الدین نداف

جانوروں پر رحم

قدیم زمانے کی بات ہے غزنی میں ایک بادشاہ تھا، رعایا پرور اور رحم دل۔ اس بادشاہ کے دربار میں سبکتگین نامی ایک غلام تھا۔ بادشاہ سبکتگین کی بہادری، رحم دلی اور نیک نیتی پر بہت خوش تھا۔ سبکتگین بھی بادشاہ کی بڑی عزت اور قدر کرتا تھا۔

ایک دن سبکتگین بادشاہ کے حکم پر شکار کے لیے جنگل کی طرف روانہ ہوا۔ صبح کا سہانا وقت تھا۔ سورج مشرق سے طلوع ہو رہا تھا۔ آسمان میں پرندے اُڑ رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔ اونچے اونچے درختوں کی چوٹیاں نیلگوں آسمان کے مقابل بڑی دلکش نظر آرہی تھیں۔ سبکتگین اس نظارے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جنگل میں داخل ہو گیا۔ شکار کی تلاش میں جب وہ جنگل میں ادھر ادھر گھومتے گھومتے تھک گیا تو آرام کرنے کے لیے ایک گھنے اور سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

اچانک سبکتگین کی نظر اُس وقت ایک خوبصورت ہرنی کے بچے پر پڑی جو اس سے تھوڑے فاصلے پر ایک درخت کے نیچے ایک چھوٹی سی جھاڑی کی آڑ میں لیٹا ہوا تھا۔ سبکتگین فوراً اٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا اس درخت کے قریب پہنچ گیا اور جھپٹا مار کر بچے کو پکڑ لیا۔ اس دن سبکتگین کو کوئی اور شکار نہیں ملا تھا اس لیے جب وہ اس بچے کو اپنے گھوڑے پر ڈال کر واپس روانہ ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کی ماں غم زدہ انداز میں منہ اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے چلی آرہی ہے۔

سبکتگین کو معلوم تھا کہ ہر ماں کی طرح ہرنی کو بھی اپنے بچے سے بے حد محبت ہوتی ہے۔ اس نے سوچا کہ میں کیوں ہرنی کو اپنے بچے کی جدائی کے دکھ میں ڈالوں۔ ہو سکتا ہے اپنے بچے کی جدائی کی تاب نہ لا کر وہ خود بھی بے موت مر جائے۔ اس طرح میری وجہ سے دو جانیں ضائع ہو جائیں گی۔ یہ خیال آتے ہی اس کا دل رحم دلی اور ہمدردی کے جذبے سے بھر گیا اور اس نے فوراً ہرنی کا بچہ چھوڑ دیا۔

بچہ آزاد ہوتے ہی اچھلتا ہوا اپنی ماں کے پاس پہنچ گیا ہرنی اپنے بچے کو پا کر بہت خوش ہوئی اور بار بار مڑ مڑ کر سبکتگین کو دیکھنے لگی۔ اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ سبکتگین کو دعائیں دے رہی ہے کہ اے سبکتگین! خدا تیرا بھلا کرے اور تیری عزت اور تیرے نیک افعال میں ترقی دے۔

سبکتگین جنگل سے خوش خوش اپنے گھر آیا۔ اُسے اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے کسی کے ساتھ بھلائی کی ہے اسی روز سبکتگین نے رات میں ایک خواب دیکھا: ایک بزرگ اس سے کہہ رہے ہیں۔ "اے سبکتگین! تم نے مجبور ہرنی پر رحم کر کے اس کے بچے کو اس کے حوالے کر دیا۔ تمھارا یہ نیک کام خدا کو بے حد پسند آیا اور اس نے تمھاری نیک نیتی اور رحم دلی پر خوش ہو کر تمھارا نام بادشاہوں کی فہرست میں لکھ دیا ہے۔ اب تم جلد ہی بادشاہ بن جاؤ گے۔ لیکن یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا! تم نے جس طرح ہرنی پر رحم کیا، اسی طرح اپنی رعایا پر بھی رحم کرنا۔"

اس واقعے کے چند ہی دنوں بعد بادشاہ نے سبکتگین کی بہادری، سچائی، ایمان داری اور رحم دلی پر خوش ہو کر اس سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ بادشاہ کے انتقال کے بعد حکومت سبکتگین کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے آخر وقت تک اپنے رعایا کے ساتھ رحم کا سلوک کیا۔ یاد رکھیے! جو شخص اللہ کی مخلوق پر رحم کرتا ہے اللہ اس کا درجہ بلند کرتا ہے۔

جہاج چوک، ٹیکنیکل اردو ٹیکنیکل مرڈی (بلگام) کرناٹک ۵۹۱۲۰۵

ننھے فنکار: مارچ ۸۲ء کے پیام تعلیم میں بہترین تصویر بنانے کا انعام اسماء خاں۔ بمبئی ۳ کو دیا گیا۔ اسماء خاں اپنا پورا پتا اور تصویر فوراً بھیجیں۔

محمد اسمٰعیل
پتا: معرفت محمد منصور علی۔ پوسٹ بکس ۱۲، مکہ مکرمہ، سعودیہ عربیہ

محمد اطہر فردوسی
شوق و مشغلہ: نماز پڑھنا۔ کرکٹ اور فٹ بال کھیلنا۔
پتا: معرفت۔ افتخار الحسن فردوسی، ایلہار جہاں گیر محلہ آسنول (بردوان)

یوسف جمیل قادری عمر ۱۵ سال
مشغلہ: تقریری مقابلوں میں حصہ لینا کرکٹ اور ہاکی کھیلنا۔
پتا: یوسف جمیل قادری اسلامیہ ہائی اسکول کیمپ۔ بلگام

مزمل خاں:
شوق: اُردو کی کتابیں پڑھنا۔ قلمی دوستی کرنا۔
پتا: معرفت عباس خاں۔ پاور ہاؤس۔ بانس جوڑا۔ دھنباد ۸۲۸۱۰۱

ذاکر حسین عمر ۱۸ سال
شوق و مشغلہ: فٹ بال کھیلنا ڈاک ٹکٹ جمع کرنا۔
پتا: رضوی روڈ، ہسیورہ۔ اورنگ آباد (بہار) ۸۲۴۱۲۵

ڈی۔ الطاف احمد عمر ۱۸ سال
شوق: خطوط کا جواب دینا۔ درسی کتابیں پڑھنا۔
پتا: ۶ مسلم اسٹریٹ۔ میٹو پالیم۔ وانمباڑی ۶۳۵۷۵۴

بے بی صالحین عمر ۱۵ سال
شوق و مشغلہ: والدین کی عزت کرنا اچھی کتابیں پڑھنا۔
پتا: محمد عظیم محمد یٰسین مرحوم۔ فروٹ مرچینٹس۔ سبزی منڈی چگو والی مسجد۔ اصالت پورہ۔ مرادآباد ۲۴۴۰۰۱

محمد یوسف خورشید عمر ۱۷ سال
مشغلہ: نماز پڑھنا، کالج جانا، افسانہ لکھنا، وغیرہ،
پتا: سلمیٰ فینسی اسٹور، شاہی محلہ کلٹی۔ مغربی بنگال۔ بردوان

اسعد ضیاء عمر ۱۹ سال
شوق: قلمی دوستی کرنا، جنرل نالج بڑھانا، پڑھنا۔
پتا: ۵۰۔ ایس۔ ایس ہال (ساؤتھ) اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ناز افسانہ شہناز عمر ۱۵ سال
شوق: دستکاری کرنا، قلمی دوستی کرنا، نماز پڑھنا۔
پتا: معرفت محمد رضوان انصاری، محلہ آزاد نگر پوسٹ کلٹی ۷۱۳۳۴۳

شکیل احمد عمر ۱۴ سال
شوق: نماز پڑھنا۔ والی بال کھیلنا۔
پتا: ناگوری محلہ، مہدپور، اُجین ۴۵۶۴۴۳

عمران خاں تاریخ پیدائش ۱ر جنوری ۱۹۷۶ء
پتا: معرفت۔ مختار احمد فردیں۔ جی ۲/۳/۲۷۲ رام نگر لین منگرا تالاب، گارڈن ریچ کلکتہ ۷۰۰۰۲۴، (مغربی بنگال)

سرفراز نواز تاریخ پیدائش ۱۵ر جنوری ۱۹۷۸ء
پتا: مختار احمد فردیں۔ جی ۲/۳/۲۷۲ رام نگر لین (منگرا تالاب)، گارڈن ریچ کلکتہ ۷۰۰۰۲۴۔

عمران آرزو
مشغلہ: تعلیم حاصل کرنا۔ اچھے طلبہ سے دوستی کرنا۔
پتا: پُرانا ستیارام پور (بردوان)

شاہ شکیل الرحمٰن عمر ۱۸ سال
شوق: قلمی دوستی کرنا۔ شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنا۔
پتا: پوسٹ۔ لکھمنیاں۔ ضلع بیگوسرائے۔ بہار

وسیمہ فاروقی عمر ۲۲ سال
شوق: کتابیں پڑھنا، پھول پتے جمع کرنا وغیرہ
پتا: وسیمہ فاروقی ۲۴/۲ جونا رسالہ اندور ۲

محمد اسلم زبیری
مشغلہ: نماز پڑھنا۔ بڑوں کا کہنا ماننا۔
پتا: محمد اسلم۔ مکان نمبر ۲ محلہ انار دانہ سرہندی گیٹ مالیرکوٹلہ

معراج احمد صدیقی۔ گڈو عمر ۱۴ سال
مشغلہ: دل لگا کر پڑھنا۔ کرکٹ کھیلنا۔ ڈرائنگ بنانا۔
پتا: حویلی کلو خواص مکان ۲۰۴۲۔ بازار چتلی قبر جامع مسجد دہلی ۶

وہ شدت سے انتظار کے بعد جنوری۔فروری ۱۹۸۲ء
کا تعلیمی میلا نمبر" ملا۔ بچوں کے ذریعے ترتیب دیا ہوا پرچہ
دیکھ کر فرطِ مسرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ان
ہونہار بچوں کی جتنی تعریف کی جائے، کم ہے "پارلیمنٹ
کا اجلاس" میں تو واقعی بچوں نے کمال کر دیا خدا کرے بڑے
ہو کر یہ سارے بچے ملک کی باگ ڈور سنبھالیں اور
دنیا میں اپنا نام روشن کریں۔ میری طرف سے ان
بچوں اور ان کے نگراں کو مبارک باد پہنچا دیں۔

مسرور حسن ۔ لکھمنیاں (بہار)

جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے"
سی طرح "جامعہ مڈل اسکول" کی برتری اس کے تعلیمی
یلے" سے ظاہر ہے۔ اس میلے کے چشم دید حالات
پیام تعلیم" کے جنوری اور فروری کے شمارے سے
اضح ہیں۔ یہ میلا ایک روشنی کا مینار" ہے اس کی
ملیدے دوسرے اردو اسکول بھی اپنے ادارے
ں ایک نئی روح پھونک سکتے ہیں۔ آپ کے اسکول
ے تمام طلبہ، طالبات، اساتذہ اور معاونین قابلِ
ہ مبارک باد ہیں۔

خلیل الرحمٰن
ویلور ۶۳۲۰۱۲

ہم میلے میں شریک تو نہ ہو سکے مگر پیام تعلیم کے
ذریعے یہ کمی پوری ہو گئی۔ مجھے تو ایسا لگا جیسے میں خود چُھونا
تعلیمی میلے میں شریک ہو کر سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔
جن بچوں نے اس رسالہ کو سنوارنے اور ہے اور
ہم تک تعلیمی میلے کا آنکھوں دیکھا حال پہنچانے کا کام
کیا ہے اُن کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے بلکہ ان
کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہوگا راس

سید ابراہیم ۔ بمبئی۔ اِنے کوجا

اس بار تمام نظمیں اور مضامین معلوماتی اور لیے
دل چسپ ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد اور پروفیسر
قنبر احمد رضوی کے مضامین سے معلومات میں اضافہ اس سے
ہوا۔ شہزادہ زرمان، شیراز کا مردِ فقیر اور پیٹ رے پیٹ تو یا اور
سب کا دشمن وغیرہ کافی پسند آئے۔ پاکستان کے رسالے نوں
"نونہال" کے ہمدرد انسائیکلو پیڈیا شائع کرنے پر ہم بھی
آپ کو اور نونہال کے مدیر اعلا جناب مسعود احمد برکاتی
صاحب کو پرخلوص مبارک باد پیش کرتا ہوں جنھوں نے
آپ کے ایک ہی خط پر نونہال کی ہر چیز شائع کرنے
کی اجازت دے دی۔ واقعی ہم سب پیامیوں کو ان کا بار خط
شکر گزار ہونا چاہیے۔

ایم شکیل احمد قریشی کا ایک
ماترو آشش بلڈنگ روم ۹ ممبرا ضلع تھانہ ۴۰۰۶۱۲ ب کی
لوگوں

مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں پیام تعلیم کا اپنے بچپن سے دعوت
مطالعہ کر رہا ہوں اور میرے بچوں نے بھی اس کا اُن کو
مطالعہ کیا اور کرتے ہیں اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے صاحب
کہ اب میرے نواسے نواسی بھی اس کا مطالعہ کرتے دکھائی دیتے
ہیں۔

محمد عبید اللہ شریف
عثمانیہ یونیورسٹی۔ حیدر آباد

مارچ ۱۹۸۲ء کا پیام تعلیم ملا۔ سبھی کہانیاں و اگر یہ بھی
مضامین پسند آئے "شہزادہ زرمان" کی دوسری قسط
اچھی لگی۔ "بچوں کی کوششیں" میں "تو کون ہے کہاں جب ل
رہتی ہے" بڑی اچھی لگی۔

جاوید نہال حشمی
کانکر ۱۰

ذاکر حسین میموریل اسکول میں تقریب

نئی دہلی ۸، فروری۔ کل ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل اسکول جعفر آباد میں "یوم ڈاکٹر ذاکر حسین" نہایت دھوم دھام سے منایا گیا۔ جس میں سرکردہ شعرا، اسکول کے طلبہ اور علاقہ کے معززین کے علاوہ وزیر آب پاشی مسٹر کیدار پانڈے، مسٹر خورشید عالم خاں، مسٹر ایچ کے ایل بھگت، مسٹر انور دہلوی نے مرحوم صدر کی زندگی پر روشنی ڈالی اور خراج عقیدت پیش کیا۔ عبدالرؤف خاں صاحب نے اسکول کے حالات پر روشنی ڈالی، اور مقالہ پیش کیا۔ مسٹر انور دہلوی نے ایک لڑکے کی تقریر سے متاثر ہو کر اُسے ۵۰ روپے انعام دیے۔

امینیہ اسکول نے شہید فیصل ٹرافی جیت لی

دلی ۱۶ فروری۔ مدرسۃ البنات اسلامیہ جامعہ نگر کے زیر اہتمام ۱۴ فروری کو منعقدہ تحریری و تقریری مقابلہ امینیہ مسلم گرلز اسکول قاسم جان کی طالبات نے شہید فیصل رننگ ٹرافی ۱۹۸۲ء جیت لی۔ قرأت میں ردینہ تاج نے، حمد میں غزالہ نسرین نے اور تحریری مقابلہ میں شمع زرین نے اوّل انعام (شاہ فیصل رننگ ٹرافی) حاصل کیا جب کہ تقریری مقابلہ میں عمرانہ سلیم و قمر سلطانہ دوئم آئیں حمد میں گوہر بیگم اور تحریری مقابلہ میں شبانہ فضل دوم رہیں۔ مقابلہ میں امینیہ ہائی اسکول کے علاوہ مدرستہ البنات جامعہ نگر، رابعہ گرلز پبلک اسکول قاسم جان حویلی اعظم خاں مڈل اسکول حکیم اجمل خاں اسکول، کبلبلی خانہ گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول و مڈل اسکول مالک ماتا سینٹر مٹیا محل اور مصباح العلوم نے شرکت کی۔

تعلیمی سماجی مرکز کے بچّوں کو عصرانہ

نئی دہلی ۲۱ فروری۔ ملیشیا کے ہائی کمشنر کی بیگم مسز عائشہ جمال الدین نے تعلیمی سماجی مرکز بلی ماران کے بچّوں کو آج چائے پر مدعو کیا۔ اس تقریب میں ملیشیا کے بچّوں نے ایک رقص پیش کیا اور ملیشیا کی ایک معلوماتی اور ایک کارٹون فلم بھی بچّوں کو دکھائی گئی۔ مرکز کے بچّوں نے بھی ثقافتی پروگرام پیش کیا۔

رحمانیہ ہائی اسکول اچل پور کو عطیہ

۲۳ جنوری بروز سنیچر رحمانیہ ہائی اسکول و جونیئر کالج اچل پور شہر میں ایک کمرے کا افتتاح بدست فخر الدّین صاحب فروٹ مرچنٹ تائی کلہ بمبئی عمل میں آیا۔ کمرے کی تعمیر کے لیے آپ نے ایک خطیر رقم (۱۰۰۰۱) دس ہزار ایک روپے بطور عطیہ عنایت فرمائے۔ اس موقع پر تعمیر شدہ کمرے پر سنگ مرمر کی تختی آپ کی فرم فخر الدّین اینڈ کمپنی بمبئی کے نام سے کندہ کر کے نصب کی گئی جس کی آپ نے نقاب کشائی کی۔ صدر مدرس جناب عبدالغفار، اراکین سوسائٹی اور اساتذہ و طلبہ نے آپ کی گل پوشی کی۔ ساتھ ہی آپ کے ساتھی شفیع چاند صاحب فروٹ مرچنٹ اور محمد جعفر کی بھی گل پوشی کی۔

(قاضی سیّد معین الدّین اچل پور)

مالیگاؤں ہائی اسکول میں تعلیمی مباحثہ

مالیگاؤں۔ ۵۰ برسوں قبل مالیگاؤں میں صرف دو ہائی اسکول اور ایک کالج تھا۔ مگر آج ۵۰ برسوں بعد شہر میں کل ۱۵ گرلز ہائی اسکول، پانچ کالج اور دیگر تکنیکی ادارے قائم

ہو چکے ہیں۔ اس ۵۰ سالہ دور کا جائزہ لینے کے لیے ایک دلچسپ تعلیمی مباحثہ کا انعقاد مالیگاؤں ہائی اسکول کے جگنہ جوبلی جشن کے موقع پر کیا گیا۔ شہر کے ثانوی مدارس کے درمیان منعقدہ اس مباحثہ میں ہر اسکول کے طلبہ و طالبات نے موافقت و مخالفت کی صورت میں حصّہ لیا۔ صدارت مسٹر ہارون بی اے نے کی۔ جب کہ مہمان خصوصی کے طور پر بمبئی ہائی کورٹ کے بیرسٹر سالک ابن عشرت حسین مُوال، محمد ڈانگے اور شری متی حامد برکتی حاضر تھے۔ جمہور ہائی اسکول کی طالبہ اور ہفت روزہ سہیلؔ کے ایڈیٹر جناب لطیف عزیزی کی دختر شبانہ لطیف کا مباحثہ کافی پسند کیا گیا۔

مہاراشٹر ہائی اسکول چپلون

چپلون مورخہ ۲۹ر جنوری۔ مہاراشٹر ہائی اسکول چپلون میں مورخہ ۲۷، ۲۸ر اور ۲۹ر جنوری کو سالانہ کھیلوں کے مقابلے ہوئے۔ اس مقابلہ کی تقسیم انعامات کی تقریب زیر صدارت جناب دیسائی صاحب منعقد ہوئی۔ اس میں محترمی جناب عبدالرحمان نانا سنگے، جناب شمس الدّین علی کھڑس اور جناب احمد علی بیبل بہ طور مہمان خصوصی جلوہ افروز تھے۔ اس موقع پر طلبہ اور طالبات انعامات سے نوازے گیے۔

اُردو اسکول کا طالب علم اوّل

۲۴ر جنوری کو کلیان کے ایم۔ کے گاندھی اسکول پرجینٹس گروپ کے زیر اہتمام تقریری مقابلہ منعقد ہوا۔ قومی یک جہتی کے موضوع پر ہندی، مراٹھی، گجراتی اور انگریزی زبانوں میں مقرّر طلبہ و طالبات نے تقریریں کیں۔ ہندی کی تقاریر میں اوّل انعام کا مستحق جس طالب علم کو قرار دیا گیا (مجاہد شیخ گلاب) وہ طالب علم نیشنل اُردو ہائی اسکول کلیان کا جماعت آٹھویں "ب" کا ہے۔ اس انعام کے علاوہ تمام زبانوں میں سب سے اچھی تقریر کا انعام (کامن پرائز) بھی مجاہد نے حاصل کیا۔ اس کامیابی پر مجاہد کو اور اُن کے ٹیچر جناب اقبال مومن کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ (ندیم اختر امیر الحق۔ کلیان)

ڈرائنگ مقابلہ

نئی دہلی ۳ر مارچ۔ دہلی بال بھون نے ٹریفک پولیس اور محکمۂ تعلیم کے اشتراک سے ٹریفک ایجوکیشن پر ڈرائنگ کے مقابلے کا اہتمام کیا جس میں ۱۲۰ اسکولی بچّوں نے حصّہ لیا۔ پہلا انعام مس دندنا بختی نے حاصل کیا۔ اور خصوصی رأس انعام چراغ دہلی کے سینئر سکنڈری اسکول کو دیا گیا۔

آئیڈیل ہائی اسکول کی کامیابی

انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ تھانے کی جانب سے عید میلاد النبی کے مبارک موقع پر بیت المقدس تقریری مقابلے کا اہتمام کیا گیا۔ اسکول ہٰذا نے ثانوی مدارس میں دوسرا اور تیسرا انعام بالترتیب بلقیس غلام حسین (نہم جماعت) اور رحمت غلام محی الدّین برکار (نہم جماعت) نے حاصل کیا۔ اس طرح ابتدائی مدارس میں پہلا انعام فوزیہ حفیظ احمد انعام دار (ہفتم جماعت) نے حاصل کیا اور اسکول ہٰذا ہی گشتی شیلڈ کی حق دار رہی
سیّد موسیٰ ہیڈ ماسٹر آئیڈیل ہائی اسکول راجوری تھانے مہاراشٹر

انیگلو اُردو ہائی اسکول دھن گاؤں

امسال بھی انیگلو اُردو ہائی اسکول دھن گاؤں میں عید میلاد النبی کے سلسلے میں تقریری مقابلے کا انعقاد کیا گیا۔

تقریب کے لیے صدر اسکول جناب حاجی کیکا بھائی سیٹھ صاحب کو بہ حیثیت صدر اور جج نامزد کیا گیا۔ دیگر دو ججوں کے فرائض قاضی مبنا نگری اور عبدالرحیم سیٹھ نے ادا کیے۔

چالیس گاؤں میں ہونے والے تقریری مقابلے میں اسکول ہٰذا کے طلبہ نے نعت اور تقاریر میں اول اور سوم انعام حاصل کیا تھا ان کی تقاریر کو سامعین کے لیے دوبارہ پیش کیا گیا۔ اس جلسہ کے لیے انعامات کی اشیا سیّد نظر علی صاحب نے دیں اور آپ کی جانب سے ایک خصوصی اعلان بھی کیا گیا جس میں ایس۔ ایس سی میں اردو مضمون میں اوّل آنے والے طالب علم کو ۱۵ روپے بطور انعام دیے جائیں گے۔ سامعین میں دیگر حضرات نے بھی اس قسم کے اعلانات کیے۔ (محمد ارشد سکریٹری برائے نشر و اشاعت)

بچوں کی کوشش

بہادر شہزادہ

کسی شہر میں ایک بادشاہ رہتا تھا۔ اُس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک دن اُس نے ایک نجومی کو بُلا کر اُس سے پوچھا کہ آخر اُس کی تمنا پوری کیوں نہیں ہوتی؟ نجومی نے اپنے تھیلے میں سے ایک کتاب نکالی، پھر کچھ حساب جوڑنے کے بعد بتایا کہ تمھارے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا جب وہ چھ مہینے کا ہو جائے تو اُس کی شادی ایک بارہ سال کی لڑکی سے کر دینا۔ نہیں تو وہ مر جائے گا۔ تھوڑے دنوں کے بعد بادشاہ کی مُراد پوری ہوگئی، اور اُس کے یہاں ایک پیارا سا لڑکا پیدا ہوا بادشاہ نے اُس کا نام شہزادہ فاروق رکھا۔ جب وہ تین ماہ کا ہوا تو نجومی کی ہدایت کے مطابق بارہ سال کی لڑکی کی تلاش میں بادشاہ نے اپنے وزیر کو دوسرے ملک بھیج دیا۔ وہاں اس وزیر کی ایک اور وزیر سے ملاقات ہوئی۔ اُس نے دریافت کیا کہ "بھائی! تم کس کی تلاش میں بھٹک رہے ہو؟" وزیر نے بتایا کہ میں بادشاہ کے لڑکے کے لیے لڑکی تلاش کر رہا ہوں، لیکن تم کیوں گھوم رہے ہو؟ دوسرے وزیر نے بتایا کہ "بھئی! میں بھی بادشاہ کی لڑکی کے لیے لڑکا تلاش کرنے نکلا ہوں۔" چنانچہ دونوں نے آپس میں کچھ مشورے کیے اور اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو گئے۔

چھ ماہ کی عمر میں شہزادہ فاروق کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہو گئی۔ رات میں جب دلہن شہزادی اپنے کمرے میں سو گئی تو شہزادے کی ماں نے شہزادہ فاروق کو لا کر اُس کے پاس لٹا دیا اور ایک خط بھی اُس کے پاس رکھ دیا۔

جب شہزادی کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے پاس ایک اتنے خوبصورت بچے کو دیکھ کر بہت حیران اور پریشان ہوئی۔ یکایک اُس کی نظر شہزادے کے سرہانے پڑے ہوئے ایک خط پر پڑی، اُس نے اُسے کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

کچھ دنوں بعد بادشاہ نے جگ ہنسائی کے ڈر سے شہزادہ فاروق اور اُس کی دُلہن کو ایک دوسرے ملک میں بھیج دیا۔ وہاں شہزادی اور شہزادہ ایک مالی کے پاس رہنے لگے۔ مالن نے شہزادہ اور شہزادی کو تعلیم دلائی وہ ان کا بہت خیال رکھتی۔ شہزادہ فاروق کا ایک دوست تھا سلیم، دونوں بڑے پکے دوست تھے۔ شہزادہ فاروق نے سلیم کو اپنے گھر کئی بار بُلایا تھا۔ ایک دن سلیم شہزادے کے گھر آیا۔ اتفاق سے اُس نے شہزادی کو دیکھ لیا۔ اتنی خوب صورت اور موہنی سی لڑکی سلیم نے پہلی بار دیکھی تھی۔ سلیم کو شہزادی بہت پسند آئی، اُس نے دل میں عہد کر لیا کہ میں شہزادی کو حاصل کر کے رہوں گا۔ سلیم ایک نواب کا لڑکا تھا۔ اُس نے اپنے ابو کو منا کر اِس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اُس کی شادی شہزادی سے کر دیں۔ اور ادھر سلیم نے یہ پروگرام بھی بنایا کہ وہ شہزادہ فاروق کو قتل کر دے۔ اور پھر ایک دن پروگرام کے مطابق فاروق کو قتل کرنے کے خیال سے اپنے دوستوں کے ساتھ ایک جنگل میں سلیم نے شہزادے کو گھیر لیا اور اپنے دوستوں کے ساتھ تلوار نکال کر فاروق پر حملہ کر دیا۔ شہزادہ فاروق نے بہادری سے مقابلہ کر کے سب کی گردنیں اُڑا دیں اور خود صحیح سلامت رہا۔ سلیم کے والد کی بڑی جاگیر فاروق نے خرید لی اور شہزادی کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگا۔

نعیم اختر امام نقوی

(بی ۲۱ آئی، ٹی بلاک ۲ روڈ نمبر ۲ گراؤنڈ فلور۔ ابراہیم [illegible] ممبئی)

سزا

کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا۔ اُس کے دربار میں ایک مسخرا تھا، وہ بہت ہوشیار اور چالاک تھا۔ ہمیشہ اپنی باتوں سے وہ بادشاہ کو خوش کیا کرتا تھا۔ ایک دن بادشاہ اُس کی کسی بات پر ناراض ہو گیا اور اُسے اپنے دربار سے نکال دیا۔

اتفاق سے اُسی دن بادشاہ نے اپنے ایک نوکر کو دیوار کا گرا ہوا چونا اُٹھا کر پھینک دینے کا حکم دیا۔ کام زیادہ ہونے کی وجہ سے نوکر کو بادشاہ کے اِس حکم کا خیال نہ رہا۔

کچھ دیر بعد بادشاہ نے جب چونے کو اُسی طرح پڑا ہوا دیکھا تو اُس کے غصّے کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ بادشاہ کسی سبب سے پہلے ہی سے بہت غصّے میں تھا۔ اُس نے اُس نوکر کو بُلا کر کہا:

"ابھی جا، اور بازار سے ایک سیر چونا لا!"

بادشاہ کی بات سُن کر نوکر کو اپنی بھُول کا احساس ہوا، لیکن اُس نے کوتاہی نہیں کی اور دوڑتا ہوا بازار گیا تو راستے میں وہی مسخرا آتا ہوا دکھائی دیا۔ اُس نے نوکر سے بدحواسی کی وجہ پوچھی، نوکر نے قاسم (مسخرے) کو پوری بات بتا دی۔ قاسم (مسخرے) نے سوچا کہ ایک سیر چونا منگوا کر بادشاہ کریں گے کیا؟ ہونا ہو، آج اِس نوکر کی شامت ہے، یہ چونا بادشاہ اسی کو کھلائیں گے۔

قاسم نے بہت سوچ بچار کے بعد کہا: دیکھو سیر بھر چونے کی جگہ پاؤ بھر چونا لینا اور تین پاؤ مکھن۔ چونے اور مکھن کا رنگ اکثر ایک سا ہی ہوتا ہے، اُن میں کوئی خاص فرق نہیں ہوا کرتا۔ اگر بادشاہ نے تمھیں چونا کھانے کو کہا۔ تو تین حصّے مکھن اور ایک حصّہ چونا مِلا کر کھانے سے کچھ بھی نہ ہوگا۔ مسخرے کا حکم مان کر نوکر نے ایسا ہی کیا۔ مکھن اور چونا خرید کر بادشاہ کے رُوبرُو حاضر ہوا۔ اُنھوں نے نوکر کو چونا کھانے کا حکم دیا۔

نوکر کے بہت خوشامد پر بھی بادشاہ نے اپنا حکم نہیں ٹالا تو مجبوراً مکھن والی ہانڈی میں سے کھانے لگا۔ اِس خیال سے کہ بادشاہ شاید اپنا حکم واپس لے لیں۔

جب مکھن کا آدھا حصّہ نوکر ختم کر چکا تو بادشاہ کو اُس کے بُرے اثرات کا خیال ہوا۔ دل میں سوچا چونا بدن کے اندر سے پھُوٹ نکلے گا اور تب اُسے بہت تکلیف ہوگی۔ بادشاہ نے نوکر کو باقی چونا پھینک دینے کا حکم دیا۔ نوکر تو اسی تاک میں تھا، سارا چونا پھینک دیا۔ اور خوشی خوشی اپنے کاموں میں لگ گیا۔

بادشاہ کو بڑا تعجب ہوا کہ نوکر چونا کھا کر بھی تندرست ہے اور اپنا کام انجام دے رہا ہے۔

بادشاہ نے نوکر کو بلا کر اُس کو سچ بولنے کی تنبیہ کی اور اُس سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہوا؟

نوکر نے سچی بات بتا دی اور کہا کہ جب وہ بازار چونا لینے کو جا رہا تھا تو قاسم (مسخرے) نے اُس کو یہ ترکیب بتا دی تھی۔ اِس لیے چونے سے اُس کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔

بادشاہ نوکر کی اس بات سنتے بہت خوش ہوئے اور اُس سے آیندہ غلطی نہ کرنے کا عہد لے کر اُسے معاف کر دیا اور قاسم کی اس بے مثال عقل مندی سے بے حد متاثر ہو کر اُنھوں نے دوبارہ قاسم کو اپنے دربار میں بُلا لیا۔ اِس طرح قاسم بھی خوش ہو گیا اور نوکر بھی۔

محمد شمس الحسن

◆ برہانی نیشنل ہائی اسکول اورنگ آباد مہاراشٹر

خلال

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی گانو میں "قیام" نام کا ایک کسان رہتا تھا۔ ایک دن اُس نے نئے داروغہ صاحب کی جو شہر سے نئے نئے آئے تھے، دعوت کرنا چاہی۔ گانو کے لوگوں نے اُسے سمجھایا کہ دیکھو، وہ شہر کے رہنے والے ہیں، اُن کی دعوت نہ کرو۔ ہو سکتا ہے کہ تم سے کوئی بات ایسی ہو جائے جو اُن کو ناگوار گزرے۔ لیکن "قیام" نے کسی کی نہ سُنی اور داروغہ صاحب کو دعوت دے دی اور بیوی کو ہدایت کی کہ اچھے اچھے کھانے تیار کرے۔

داروغہ صاحب وقت پر آ گئے۔ جب کھانا کھا چکے تو اُنھوں نے میزبان سے ایک "خلال" مانگا۔ "قیام" نے سمجھا کہ یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔ گھر میں گیا اور بیوی سے کہا:

"تم نے خلال پکایا ہے؟ جلدی دو۔ داروغہ صاحب خلال

مانگ رہے ہیں۔" قیام کی بیوی نے کہا: "خلال بھی کوئی پکانے کی چیز ہے جو پکاتی۔"

یہ سنتے ہی "قیام" بیوی پر آگ بگولا ہو گیا اور گرج کر باہر آیا اور بڑی عاجزی کے ساتھ داروغہ صاحب سے کہا:

"ہمارے یہاں خلال نہیں پکا ہے۔"

یہ سنتے ہی داروغہ صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولے: "بھائی قیام! خلال کوئی کھانے کی چیز نہیں، وہ تو دانت کریدنے کے تنکے ہوتے ہیں۔"

یہ سن کر "قیام" بہت شرمندہ ہوا اور اسی دن سے وہ اپنی بیوی کو شعور والی سمجھنے لگا۔ داروغہ صاحب مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

عذرا عرفان درجہ نہم

★ ملت اردو گرلس ہائی اسکول پھلواری شریف پٹنہ (بہار)

"بے وقوف کھلائی"

کسی گھر میں ایک کھلائی تھی۔ وہ اپنی مالکن کی سب سے چھوٹی بچی نصرت کو کھلایا کرتی تھی۔ ایک دن وہ نصرت کو گود میں لیے دو منزلہ کی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ سردی کا موسم تھا۔ اس لیے نصرت کو کمبل میں لپیٹے ہوئے تھی۔ کھیلتے کھیلتے کھلائی کی لاپرواہی سے بچی لڑھک کر کھڑکی سے نیچے گر گئی۔ کھلائی چلا اٹھی۔ "ارے ہے، جس کمبل میں نصرت سو رہی تھی وہ کمبل کھڑکی سے باہر گر پڑا۔" نصرت کی ماں بولی۔

"ارے نگوڑی! جلدی جا کر اٹھا لا۔ نصرت کو سردی لگ جائے گی۔"

کھلائی نے فوراً جواب دیا، "مالکن! میں اتنی لاپرواہ نہیں ہوں آپ سردی کی فکر نہ کریں۔ نصرت کمبل میں اچھی طرح سو رہی ہے میں اسے صرف سردی ہی سے بچانے کا ہمیشہ خیال رکھتی ہوں۔ نصرت اور کمبل ساتھ ہیں۔" نصرت کی امی اور آپا بے تحاشہ چلا اٹھیں۔ "ہائے ہائے.. غضب ہو گیا! دوڑو.. دوڑو" اور کھلائی نے مسکرا کر مالکن سے کہا "میرے کمبل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔"

عمران غنی درجہ ہشتم
★ پٹنہ ہائی اسکول پٹنہ

چور کون؟

آج جیسے ہی میں اپنے ہاسٹل پہنچا تو کافی ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ ہاسٹل کے جتنے بھی لڑکے تھے، سبھی کی زبان پر تھا۔ "چور کون! چور کون؟"

میں نے اپنے روم پارٹنر سے پوچھا: "آخر کیا بات ہے کہ سبھی کی زبانوں پر "چور کون" کا نعرہ ہے؟"

اس نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ آج شام ۵ بجے کلّو ایک کاہی رنگ کا نیا کوٹ سلوا کر لایا تھا۔ اور اسے اپنے بکس میں رکھ دیا تھا۔ ارے یار پرویز! میں نے بھی وہ کوٹ دیکھا تھا۔ اس کوٹ کی قیمت ۳۵۰ روپے سے کم نہ ہوگی۔"

یہ بات سن کر میں بھی گھبرا گیا کہ آخر کوٹ چرانے والا کون ہے؟ جسے دیکھو، سب کوٹ ہی کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ خیر، لڑکوں نے ہمت نہیں ہاری۔ اور چور کی تلاش جاری رکھی۔

کلّو اور سب لڑکوں نے مل کر اپنے ہاسٹل کے وارڈن صاحب کو یہ واقعہ بتایا۔ اب تو وارڈن صاحب بھی سوچ میں پڑ گئے کہ آخر کوٹ چرانے والا کون ہو سکتا ہے؟

تین چار دن گزر گئے لیکن چور کا پتا نہ چل سکا، تب لڑکے ایک دوسرے پر شک کرنے لگے۔

کلّو کا تو برا حال تھا۔ وہ ہمیشہ لڑکوں سے کہتا: "میرے والد مجھ سے پوچھیں گے کہ کوٹ کہاں ہے؟ تو میں کیا جواب دوں گا۔"

آخر کار کلّو نے لڑکوں کو دھمکی دی کہ میں نام نکلوانے جا رہا ہوں۔ جس کا بھی نام نکلے گا وہی شخص چور ہوگا۔" کلّو کے دوست راجو نے کہا کہ "تم انڈا کٹوا دو، جو بھی چور ہوگا وہ سامنے آ جائے گا۔ اب تو سارے لڑکے گھبرا گئے۔ کہ نہ جانے کس کا نام نکلے گا۔ اور آخر چور کون ہے۔

چنانچہ جو واقعی چور تھا وہ بھی ڈر گیا کہ میں پکڑا جاؤں گا۔ اور اگر کہیں انڈا ہی کٹوا دیا تو مارا جاؤں گا۔ اس سے اچھا ہے کہ اپنا جرم قبول کر لوں۔ چپ چاپ اس کا کوٹ دے دوں اور بچ جاؤں۔

ہاسٹل میں ایک لڑکا تھا، اس کا نام معصوم تھا جو دیکھنے میں تو بڑا سیدھا تھا، لیکن چور وہی نکلا۔ بھولا بھالا سا چہرہ مگر بے ایمان۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے اپنے جرم کا

اقرار کرلیا ہے۔ اور آج دوپہر کے کھانے کے بعد کوٹ دے دینے
کا وعدہ بھی کر لیا ہے۔ اُس نے کلّو سے یہ بھی کہا کہ وہ کسی کو میرے
بارے میں یہ نہ بتائے کہ میں چور ہوں۔ تاہم کلّو نے سب لڑکوں
کو آہستہ سے چور کا نام بتا ہی دیا۔

"ارے یہ کیا؟ معصوم نے ابھی تک کوٹ نہیں دیا" کلّو نے درد
بھرے دل سے کہا۔ اب لڑکوں نے کہا کہ رات کے دس بج رہے
ہیں اور ابھی تک معصوم کا پتا نہیں۔ اب سب لڑکے معصوم
کی تلاش میں نکلے۔ لیکن معصوم کا کوئی پتا نہ لگا۔

یکایک ایک لڑکے کی نظر معصوم کے سامان پر پڑی۔
جہاں اُس کا سامان رہا کرتا تھا وہاں اب کچھ بھی تو نہ تھا۔ کلّو نے
جاکر یہ ساری باتیں وارڈن صاحب کو بتا دیں۔ وارڈن صاحب
نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا، بھلا چور بھی کہیں
ٹھہرتا ہے؟"

میں نیا نیا ہاسٹل میں آیا تھا، اس لیے ابھی میرے کسی لڑکے
سے زیادہ تعلقات نہ تھے۔ میں چپ چاپ لڑکوں کی آپس کی
باتیں سنتا رہا۔ نہ جانے مجھے نیند آگئی۔ جب میری آنکھ کھلی تو
سویرا ہو چکا تھا اور سارے لڑکے ہنگامہ کر رہے تھے۔

"اصلی چور معصوم ہے، اُسے اسکول سے نکال دیا جائے!!"

انیس احمد جانی

جامعہ ہائر سکنڈری اسکول (ڈسٹا ہیر) جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

"مولانا آزاد"

مولانا آزاد کے علم و فضل کی شہرت اُن کی جوانی کے آغاز
سے ہی پورے ہندستان میں پھیل چکی تھی۔ آزاد ایک
عالم، ایک ادیب، ایک سیاست داں ہونے کے ساتھ ساتھ
خوش فکر شاعر بھی تھے۔ بچپن میں انھوں نے شاعری کی ہے
مگر آگے چل کر شاعری کو انھوں نے ترک کر دیا۔ انھیں کے بچپن کا
ایک واقعہ ہے کہ آزاد ایک محفل میں شریک تھے کہ انھیں پیاس
لگی۔ پانی مانگا۔ ایک سفید ریش بزرگ نے پانی کا گلاس
آگے بڑھایا تو آزاد نے برجستہ کہا۔ ع

لے کے اک پیر مغاں ہاتھ میں مینا آیا۔

مولانا ظفر علی خاں مرحوم بھی اِس محفل میں شریک تھے۔
انھوں نے آزاد پر طنز کیا ع

مے کشو! شرم کہ اس پر بھی نہ پینا آیا

مولانا آزاد کی شاعری کی عظمت کا اندازہ اس سے لگایا
جا سکتا ہے کہ اگر وہ اس مشغلے کو جاری رکھتے تو آج شاعری
میں اُن کا وہی مقام ہوتا جو غالب اور اقبال کا ہے۔ انھوں
نے برجستہ فرمایا:

تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی
اب زندہ دلی کہاں ہے باقی ساقی
مے خانۂ عالم نے رُخ ایسا بدلا
مے کش، مے کش رہا نہ ساقی ساقی

محمد سیف اللہ

درجہ چہارم اقبال میموریل اُردو اسکول۔ کلٹی (مغربی بنگال)

"ایک تھا راجا"

بہت دنوں کی بات ہے کہ نیپال میں ایک راجا رہتا تھا
اُس کے دو بیٹے تھے۔ چھوٹے کا نام ناصر تھا اور بڑے بیٹے کا
نام شکیل تھا۔ دیکھنے میں ناصر بہت خوب صورت تھا۔ لیکن راجا
شکیل کو بہت چاہتا تھا اور ناصر سے سخت محنت کا کام لیا کرتا تھا
اسی طرح کئی سال گزر گئے۔ ایک دن ناصر جنگل سے گزر رہا تھا کہ
اُسے ایک خوب صورت پری آتی نظر آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پری
ناصر کے قریب آگئی اور اُس سے پوچھا: "کہاں جا رہے ہو بیٹے!"
ناصر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پری نے ناصر سے پوچھا:
"بیٹے! روتے کیوں ہو؟" ناصر نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
"میں راجا کا لڑکا ہوں، راجا نے مجھے محل سے نکال دیا ہے۔"
پری نے اس سے کہا۔ "میرے ساتھ چلو!"
پری اُسے ایک بہت بڑے گانو میں لے گئی، اُس گانو
کا نام بنگلور تھا۔ ناصر جیسے ہی اُس گانو میں پہنچا، پری
وہاں سے غائب ہوگئی۔ ناصر بہت بے چین ہوا اور زور زور
سے رونے لگا۔ پھر اُس نے سوچا "رونے دھونے" سے کوئی
فائدہ نہیں۔ فوراً اُسے ایک ترکیب سوجھی۔ وہ کلھاڑی لے کر

جنگل کی طرف روانہ ہوا۔ ناصر جنگل سے لکڑیاں کاٹ لاتا اور اُسے فروخت کرکے اپنی زندگی گزارتا۔ ایک دن وہ جنگل کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک بنگلور کا بادشاہ اپنے بیٹے کے ساتھ ٹہلتا ہوا ادھر آنکلا۔ بادشاہ ناصر کے قریب آیا اور پوچھا "تم ادھر کیسے آپڑے؟" ناصر نے سارا حال سنایا۔ بادشاہ اسے اپنے محل میں لے گیا اور بادشاہ کی مرضی کے مطابق اس کے محل میں رہنے لگا۔ دن گزرتے رہے۔ ناصر بڑا سمجھدار اور خوب صورت تھا۔ اس لیے بادشاہ نے اپنی شہزادی کی شادی ناصر کے ساتھ کردی۔ جب کچھ مدت گزر گئی تو ناصر کو اپنے باپ کا خیال آیا۔ وہ اپنے ملک کی طرف آیا۔ جب وہ اپنے محل میں پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ اُس کا باپ بہت بیمار ہے۔ ناصر رات دن اُس کی تیمار داری کرنے لگا اور بادشاہ اچھا ہوگیا۔ لیکن ناصر رات دن کی تیمار داری سے بیمار پڑ گیا۔ چند دنوں کے بعد جب ناصر ٹھیک ہوا تو اُس کے باپ نے خوشی سے اس کو گلے لگالیا۔ اور خدمت کے صلے میں ناصر اپنے باپ کا چہیتا بن گیا۔ اب سب ہنسی خوشی رہنے سہنے لگے۔

طفیل احمد ناگ پور

شرمندگی کا بوجھ

میں فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں بڑے آرام سے سفر کر رہا تھا۔ میری سیٹ کھڑکی کے قریب تھی۔ اس لیے میں کھڑکی سے اپنا سر ٹیک کر باہر کے حسین مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میرے علاوہ اس کمپارٹمنٹ میں سات مسافر اور تھے۔ یعنی ہم لوگ کل آٹھ آدمی سفر کر رہے تھے جس کے لیے کمپارٹمنٹ میں جگہ کافی تھی۔ جب میں کھڑکی سے باہر دیکھتے دیکھتے اُکتا گیا تو وہیں سیٹ پر ہاتھ پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ جب ٹرین سردوان اسٹیشن پر رُکی تو میرے ڈبے میں ایک بوڑھا آدمی سوار ہوا۔ وہ لباس سے بہت غریب معلوم ہوتا تھا۔ وہ زیادہ بوڑھا تو نہیں تھا، مگر پھر بھی بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو چکا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میری بھنویں سکڑ گئیں۔ میں نے کہا۔

"او بڈھے! اس ڈبے میں کیوں سوار ہو گیا؟ جانتا نہیں یہ فرسٹ کلاس ہے۔"

"بابو! ہم دونوں انسان ہیں۔ ایک ساتھ بیٹھنے میں کیا ہرج ہے؟" اُس نے کہا۔ "ذرا پاؤں موڑ لیجیے تاکہ مجھے بھی جگہ مل جائے۔"

"چپ رہ بڈھے! مجھے نصیحت کرتا ہے؟" میں نے کہا۔ "اُترتا ہے کہ بلاؤں ٹکٹ چیکر کو؟"

مگر اُس نے میری ایک نہ سُنی اور وہیں نیچے بیٹھ گیا۔ اب تو میرا غصّہ اور بڑھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ میری ہی طرح دوسرے مسافر بھی اس بوڑھے کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اگلے اسٹیشن پر ٹرین رُکی تو میں کھڑکی سے سر نکال کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کہ کوئی ٹکٹ چیکر نظر آئے تو اس بڈھے کو مزہ چکھاؤں۔ مگر بدقسمتی سے کوئی ٹکٹ چیکر نظر نہ آیا۔ میں بہت دیر تک من ہی من میں اُس کو بُرا بھلا کہتا رہا۔

جب ٹرین گُرگاپور اسٹیشن پر رُکی تو میں نے اپنا مختصر سامان سمیٹا اور اُتر گیا۔ جب میں پلیٹ فارم کے گیٹ پر پہنچا تو ٹی ٹی نے کہا "ٹکٹ پلیز"۔

میں نے ٹکٹ نکالنے کے لیے جیسے ہی جیب میں ہاتھ ڈالا تو میرے پسینے چھوٹ گئے، کیوں کہ میرا پرس غائب تھا جس میں ٹکٹ اور پانچ سو روپے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ بڑی بے عزتی ہوگی لوگ سوچیں گے کہ میں اتنا قیمتی سوٹ پہنے ہوا ہوں اور بے ٹکٹ سفر کر رہا ہوں۔

"جناب! ٹکٹ دکھائیے۔" ٹی ٹی نے دوبارہ کہا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، پلیٹ فارم کے آخری سرے پر "ہائے بے چارا چلتی ٹرین سے گر گیا" کا شور سُنائی دیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک آدمی دوڑتا ہوا میری ہی طرف آرہا ہے۔ اُس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے اُس کے کپڑے سرخ ہو رہے تھے۔ جب وہ ذرا قریب آیا تو میں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہی بوڑھا آدمی تھا جسے میں اپنے ڈبے میں بُرا بھلا کہا تھا۔ میرے پاس پہنچ کر اُس نے کہا۔

"لیجیے صاحب! آپ کا یہ پرس ڈبے میں آپ کی جگہ پر گرا ہوا تھا۔ میں نے کھول کر دیکھا تو اس میں آپ کے روپیے اور ٹکٹ تھے۔ آپ کی چیز آپ تک پہنچانے کے لیے میں چلتی ٹرین سے

کو دے پڑا۔" یہ کہہ کر اُس نے میرا پرس میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور ٹکٹ نکال کر ٹی ٹی کو دکھایا۔ اس کے بعد میں نے اُس بوڑھے کو کچھ روپے دینے چاہے مگر اُس نے روپے لینے سے انکار کر دیا اور کہا:

"یہ تو میرا فرض تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کی چیز آپ تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔"

یہ سُن کر میرا سر شرمندگی کے بوجھ سے جھک گیا۔ میں نے جس شخص کو ہیچ اور کم تر سمجھا۔ وہ اتنا عظیم ثابت ہوا۔

احمد کمال حشمی

معرفت حشم الرحمان حشم۔ ایم۔ اے (ڈبل)

۲۸۔ بی۔ ایل ۱۰ اپنا بازار کانکی نارا ۷۴۳۱۲۶ ۲۴ پرگنہ (مغربی بنگال)

سچائی

"کھڑے ہو جاؤ!" ماسٹر صاحب کی کڑکتی ہوئی آواز عامر کے کانوں میں پڑی۔ عامر بے چارہ کانپتے ہوئے اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ کیوں کہ اُس کی ڈیسک سے موہن کا پن برآمد ہو گیا تھا۔

"تم نے موہن کا پن کیوں چرایا؟"، ماسٹر صاحب گرج پڑے۔

"ہمیں تم سے یہ اُمید نہیں تھی۔ اب ہم تمھارے پاپا سے شکایت کریں گے۔ ورنہ تمھاری ڈیسک سے موہن کا پن کیسے نکلا؟ اگر تم جیسے ایمان دار اور نیک لڑکوں کا یہ حال ہے تو خراب لڑکے کیسے سنبھلیں گے۔"

عامر کو سارے دن کھڑے رہنے کی سزا دے کر ماسٹر صاحب چلے گئے۔ عامر بے چارہ سوچتا ہی رہ گیا۔

تیسرا گھنٹہ شروع ہونے سے پہلے وہ موہن کی ڈیسک پر تھا، مگر پن اُٹھانا تو در کنار اُس نے دیکھا تک نہیں تھا۔ جب تیسرے گھنٹے میں موہن نے ماسٹر صاحب سے پن کھو جانے کی شکایت کی تو ماسٹر صاحب نے اُسے کلاس کی تلاشی کا مشورہ دیا۔

عامر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پن اُس کی ڈیسک سے برآمد ہو گا۔ پن برآمد ہونے پر ماسٹر نے جو سزا دی وہ تو رہی الگ، ساتھ ہی اُسے سارے کلاس کے سامنے ذلیل ہونا پڑا۔

چھٹی ہو جانے پر جب سر جھکائے عامر گھر پہنچا تو پاپا ڈنڈا لے کر

دروازے پر اُس کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔

اگلے دن عامر اسکول پہنچا تو موہن اُس کی طرف دوڑا آ رہا تھا۔ آتے ہی عامر سے لپٹ گیا۔ اُس نے بتایا کہ اصل چور پکڑا گیا ہے۔ اُس نے ببّو کی طرف اشارہ کیا جسے ماسٹر صاحب نے مرغا بنا دیا تھا۔

موہن نے یہ بھی بتایا کہ اُس نے پن چرا کر تمھاری ڈیسک میں ڈال دیا تھا، کیوں کہ وہ تم کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے پن تمھاری ڈیسک میں رکھنے کی یہ بات اپنے ایک خاص دوست کو بتا دی تھی، جس سے ماسٹر صاحب کو اصلیت کا پتا چل گیا۔

حمید عثمان

۳۱۵۔ شریف بلڈنگ ڈاکیا رڈ روڈ بمبئی ۱۰

سچی خوشی

بہت پہلے کی بات ہے کہ کسی گاؤں میں دو دوست رہا کرتے تھے۔ جن کا نام جاوید اور سلیم تھا۔ دونوں میں گہری دوستی تھی۔ جاوید بہت ہی محنتی تھا۔ سلیم بالکل محنت نہیں کیا کرتا تھا۔ سلیم ہمیشہ اپنے دُکھڑے لے کر جاوید کے پاس جاتا تھا۔ جاوید سلیم کی باتیں سُن کر پریشان رہا کرتا تھا۔ ایک دن جاوید کو ایک ترکیب سوجھی۔ شام میں سہانا منظر تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ ہر طرف کھیت لہلہا رہے تھے۔ سلیم بھی موسم کا لطف اُٹھاتا ہوا جاوید کے گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ جب جاوید کے گھر پہنچا تو جاوید باہر ہی بیٹھا تھا۔ اپنے دوست کی خوب خاطر مدارات کی۔ تھوڑی دیر بعد جاوید نے سلیم سے کہا۔ دیکھو، تمھارے کھیت میں ہیرے جواہرات، سونا، چاندی ہیں۔ یہ سُن کر سلیم بھاگا بھاگا اپنے گھر آیا، پھاوڑا اُٹھایا اور کھیت میں پہنچ کر کھیت کا کافی حصّہ کھود ڈالا۔ بالآخر سلیم کو ایک ڈبّہ ملا۔ سلیم بہت ہی خوش ہوا۔ جب اُس نے ڈبّہ کھولا تو اُس میں سے ایک چٹھی نکلی۔ چٹھی پڑھ کر اُسے بڑی خوشی ہوئی۔ سلیم نے کھدائی جاری رکھی۔ پورا کھیت کھود ڈالا لیکن اُسے اور کچھ نہ ملا۔ تنگ آ کر اُس نے اپنا کام بند کر دیا اور جاوید کے پاس گیا اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ جاوید نے سلیم سے کہا کہ اب تم اس میں بیج بو دو۔ سلیم نے جاوید کی بات مان لی اور اُس کھیت میں بیج بو دیے۔ کچھ دنوں بعد اُس کا کھیت ہرے بھرے پھل، پھول، اور سبزی ترکاری سے بھرپور تھا، اُس

دن سلیم بہت ہی خوش تھا۔ سلیم جاوید کے پاس گیا اور جاوید کا شکریہ ادا کیا۔ جاوید نے کہا کہ میں نے میرے جواہرات والی جھوٹی بات صرف اس لیے کہی تھی تاکہ تم محنت اور کام کرنے کے عادی ہو جاؤ۔ سچی بات یہ ہے کہ محنت ہی میں سچی خوشی ہوتی ہے۔

تزئین خان

★ بی، آئی، ٹی بلاک، ملک بلا، وام نمبر ۲۳ ابراہیم رحمت اللہ روڈ ممبئی ۳

"پھول شہزادی"

بہت دنوں پہلے کی بات ہے کہ کسی ملک میں ایک بہت ہی خوب صورت شہر آباد تھا۔ مگر اُس زمانے میں آج کل کی طرح رنگینیاں موجود نہیں تھیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ شہر اپنی طرز کا ایک واحد شہر تھا۔ اس شہر میں ایک قاضی رہتا تھا۔ جو اب بڑھاپے میں قدم رکھ رہا تھا۔ اُس کی ایک لڑکی کے سوا اور کوئی اپنا نہ تھا۔

اُس کی لڑکی کا نام "پھول بانو" تھا۔ لیکن چوں کہ وہ بے حد خوب صورت تھی اور اس کے طور طریقے بھی شاہانہ تھے۔ اس لیے لوگ اُسے "پھول بانو" نہیں کہتے تھے بلکہ اُس کو "پھول شہزادی" کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ شہر کے تقریباً سبھی لوگ "پھول شہزادی" سے واقف تھے اور سبھی اُس کے طور طریقے پر عش عش کرتے تھے۔

ایک دن قاضی کو نہ جانے کیا دھن سمائی کہ "پھول شہزادی" سے کہنے لگا۔ "بیٹی! آج تمہاری ماں زندہ ہوتیں تو یہ تم سے خود یہ بات نہ پوچھتا۔ اب مجھے ہی یہ فرض ادا کرنا ہے۔ میں تم سے کہنا یہ چاہتا ہوں کہ میں اب تمہاری شادی کسی اچھے گھرانے میں کر دینا چاہتا ہوں۔ بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟"

پھول شہزادی نے کہا "بابا! میں اُسی کے ساتھ شادی کروں گی جو میری جھوٹی بات کو سچ کر دکھائے گا۔ آپ جا کر سارے شہر میں منادی کر دیں۔"

منادی کے بعد ہی دوسرے دن لوگ پھول شہزادی سے شادی کی آرزو دلوں میں لیے ہوئے شہزادی کے پاس پہنچنے لگے اور دم کے دم میں قاضی جی کا بہت بڑا ہال لوگوں سے بھر گیا۔ کچھ دیر کے بعد پھول شہزادی لوگوں کے سامنے آئی اور کہنے لگی۔

"میں سامنے کے کمرے میں جا رہی ہوں۔ آپ لوگ ایک ایک کر کے اس کمرے میں آئیں اور میری بات کا جواب دیں۔ ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لیں کہ ناکامیاب اُمیدواروں کو جلا وطن کر دیا جائے گا۔"
یہ کہہ کر شہزادی کمرے میں چلی گئی۔

بہت سے لوگ تو جلا وطنی کا نام سُن کر اُداس ہو گئے۔ لیکن کچھ اُمیدواروں نے ہمّت سے کام لیا۔ اور باری باری شہزادی کے کمرے میں جانے لگے۔ لیکن کچھ دیر میں وہ سب کے سب ناکام واپس ہوئے اور وہ جلاوطنی کے مستحق قرار پائے۔ اس طرح ایک مہینہ گزر گیا لیکن کوئی بھی شہزادی کے امتحان میں کامیاب نہ اُترا۔ شہزادی اُداس رہنے لگی۔ قاضی بھی بجھا بجھا سا نظر آنے لگا۔

کچھ دنوں کے بعد ایک مسافر بہت خوب صورت جو ظاہر میں غریب سا معلوم ہو رہا تھا۔ قاضی کے دربار میں حاضر ہوا اور شہزادی سے شادی کی درخواست کی۔ شہزادی راضی تو ہو گئی، مگر اُس نے یہ بھی سوچا کہ اگر اُس نے میری جھوٹی بات کو سچ کر دکھلایا تو اُس سے مجھ کو شادی کرنا ہی پڑے گی۔ اور یہ غریب ہے۔ نہ تو اس کے بدن پر دُرست کپڑے ہیں اور نہ اس کے رہنے کا کوئی ٹھکانا ہے۔ تاہم شہزادی کو اپنا سوال دُہرانا ہی پڑا۔ اِدھر مسافر بھی تُلا بیٹھا تھا، یا تو جلا وطن ہی ہو جاؤں گا۔ یا میری قسمت یہاں بن جائے گی۔ اس لیے اُس نے شہزادی کا سوال سُنا۔

شہزادی نے کہا: "ایک اونٹ ایک جنگل سے اپنے مالک کے ساتھ گزر رہا تھا۔ دفعتاً بارش شروع ہوئی اور اونٹ جل کر مر گیا۔"

یہ سُن کر مسافر بڑی حیرت میں پڑ گیا۔ اُس نے سوچا، یہ بظاہر ایک جھوٹی بات ہے، لیکن اس کو صحیح ثابت کرنا ہے کچھ دیر تو وہ سوچتا رہا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

"آپ نے دُرست فرمایا۔ شہزادی صاحبہ! اُونٹ کی پیٹھ پر چُونا لدا ہوا تھا۔ چُونے کی خاصیت ہے کہ پانی پا کر پکنے لگتا ہے اس لیے دفعتاً جو بارش شروع ہو گئی تو چُونا پک اُٹھا۔ وہ چُونا اونٹ کی پیٹھ پر تھا، اس لیے چُونے کے پکنے سے اونٹ کو آتشی سوزش پہنچی کہ وہ جل کر مر گیا۔"

شہزادی یہ سُن کر بہت ہی خوش ہوئی اور دل میں سوچنے

لگی کہ ایسا ضرور ہو سکتا ہے۔ مسافر کامیاب ہو گیا۔ کچھ دنوں کے بعد اِن دونوں کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہو گئی۔ اور وہ ہنسی خوشی رہنے سہنے لگے۔ تمھیں معلوم ہے؟ یہ مسافر بلوچستان کے ایک گھرانے کا لڑکا تھا۔

عبد الخالق
★ بورگاؤں مسجد کے پاس، بورگاؤں تہ جی۔ بی اُرڈ ناگپور (M.S.)

"عقل مند شہزادہ"

کسی زمانے میں ایک بادشاہ حکومت کیا کرتا تھا۔ وہ بادشاہ بڑا انصاف پسند تھا۔ وہ رعایا کو ہمیشہ خوش رکھتا تھا لیکن وہ اب کافی بوڑھا ہو چکا تھا اور اِس قابل نہیں رہ گیا تھا کہ رعایا کی اچھی طرح دیکھ بھال کر سکے۔ اُس کے تین شہزادے تھے۔ اُس نے سوچا کہ اب وہ کسی ایک شہزادے کو تخت پر بٹھا دے اور حکومت کا سارا کاروبار اُس کے سپرد کر دیا جائے۔ لیکن ایک مسئلہ اُس کے سامنے یہ آ کھڑا ہوا کہ اِن تینوں میں سے کسے تخت سپرد کر کے حکومت کا سہرا اُس کے سر باندھا جائے۔ اِن تینوں میں سے زیادہ عقل مند کون ہے؟

یہ مسئلہ بڑا سنگین تھا۔ اُس نے وزیر کو بلایا اور اُس سے کہا کہ اِس مسئلے کا حل بتاؤ! ایسی کوئی ترکیب نکالو جس سے عقل مندی کا ثبوت ملے۔

وزیر کی سمجھ میں ایک ترکیب آئی، اُس نے بادشاہ سے کہا کہ حضور! دس دس روپیے دیے جائیں اور اُنھیں ایک ہی ناپ کے تین کمرے دے دیے جائیں اور اُن سے کہا جائے کہ اِن دس روپیے میں اپنے کمروں کو وہ کسی بھی چیز سے بھر دیں۔ وزیر کی رائے بادشاہ کی نظر میں ٹھیک رہی۔ اُس نے ویسا ہی کیا اور تینوں شہزادوں کو دس دس روپیے دے دیے اور اُنھیں تاریخ بتا کر واپس کر دیا۔

اب تینوں شہزادے اپنی اپنی جگہ پر حیران و پریشان تھے اِن دس روپیوں میں اپنا کمرہ کس طرح پُر کیا جائے؟ بڑے شہزادے نے سوچا کہ کیوں نہ دس روپیوں سے جوا کھیلا جائے اور جوئے میں جو پیسے جیتے جائیں اُن پیسوں سے آسانی کے ساتھ کمرہ بھر لیا جائے۔ اُس نے ایسا ہی کیا، لیکن وہ جوئے میں اپنے دس روپیے بھی ہار گیا۔ اب وہ مجبور ہو چکا تھا۔

اُس سے چھوٹے یعنی منجھلے شہزادے نے اپنا گھر کوڑے کرکٹ سے بھرا، لیکن پھر بھی پورا کمرہ نہ بھر سکا، اور اُس کمرے میں بدبو پھیل گئی۔

سب سے چھوٹے شہزادے نے دس روپیوں میں سے کچھ کا عطر خریدا اور اپنے کمرے کی دیواروں پر عطر کا چھڑکاؤ کر دیا، جس سے سارا کمرہ مہک اُٹھا۔ کمرے میں ہر طرف خوش بو ہی خوش بو پھیل پڑی، باقی پیسوں کے پان اور سپاری خریدے اور جب بادشاہ اور وزیر تاریخ مقررہ پر اِن تینوں کی عقل مندیوں کا جائزہ لینے کے لیے آئے تو سب سے پہلے بڑے شہزادے کے کمرے میں گئے، وہ ایک کونے میں سر پکڑے ہوئے بیٹھا تھا۔ پھر وزیر اور بادشاہ دوسرے کمرے میں گئے، تو بدبو کے مارے فوراً باہر نکل بھاگے۔

تیسرا کمرہ جو سب سے چھوٹے شہزادے کا تھا۔ وہاں جانے پر چھوٹے شہزادے نے اُن کی بڑی آؤ بھگت کی۔ کمرہ خوش بو سے مہک رہا تھا۔ پان سپاری سے اُن کی تواضع کی گئی۔ وزیر اور بادشاہ دونوں ہی خوش ہوئے۔

چھوٹا شہزادہ عقل مند ثابت ہوا، اِس لیے اُسے ہی تخت پر بٹھا دیا گیا۔

اشفاق احمد
★ سوت گرنی کوارٹر تاج آباد ناگ پور

"اپریل فول"

آج نسیم کچھ اُداس تھا۔ وہ اپنے ڈرائنگ روم میں ایک کرسی پر بیٹھا خیالات میں گم تھا۔ اپریل فول کے ابھی دس دن باقی تھے اور اُس دن وہ اپنے دوستوں کو بے وقوف بنانا چاہتا تھا مگر اُسے اب تک کوئی مناسب طریقہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پریشان نظر آ رہا تھا۔

اُس کے دائیں طرف ایک خوب صورت الماری پڑی ہوئی تھی۔ جس میں اسکول کے علاوہ اور دوسری کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

کمرے میں اُس کے دو چھوٹے بھائی عامر اور اصغر ایک چھوٹی سی گیند سے کھیل رہے تھے۔ وہ اِدھر سے اُدھر دوڑتے، گرتے پھر اُٹھتے اور قہقہے لگاتے۔

اچانک دائیں طرف کے دروازے سے عارف دوڑتا اور ہانپتا ہوا آیا۔ اُس کے ہاتھوں میں "پیام تعلیم" کا تازہ شمارہ تھا۔

"بھائی جان! بھائی جان! یہ دیکھیے "پیام تعلیم"" اُس نے اپنی پھولتی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "ابھی ابھی ڈاکیا دے کر گیا ہے۔"

لیکن نسیم نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ یہ ایک اَن ہونی سی بات تھی۔ ورنہ جہاں "پیام تعلیم" کے نئے شمارے پر اُس کی نظر پڑتی، وہ اپنا کھیل وغیرہ سب بند کر کے "پیام تعلیم" پڑھنے میں مشغول ہو جاتا۔ عارف کا خیال تھا کہ بڑے بھائی جان جب "پیام تعلیم" دیکھیں گے تو جھپٹ پڑیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ پھر وہ کچھ سوچ کر خود ہی "پیام تعلیم" پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

اچانک نسیم کے لبوں پر ایک مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ خوشی سے جھوم اُٹھا۔ اُس نے اپنے دوستوں کو بے وقوف بنانے کے لیے ایک خوب صورت سی ترکیب سوچ لی تھی۔

اُس نے اپنا لیٹر پیڈ نکالا اور لکھا۔

سوئیٹ انور!

خوش رہو!!

تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ پہلی اپریل کو میری سال گرہ ہے۔ اور اس جشن میں تمھاری شرکت ضروری ہے۔ لہٰذا تم وقت مقررہ پر یہاں پہنچ جانا۔ شاہد اور اسلم بھی یہاں آرہے ہیں۔

فقط تمھارا

اکرم حسن۔

پھر اُس نے دوسرے صفحے پر لکھا۔

سوئیٹ اکرم!

خوش رہو!!

تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ پہلی اپریل کو میری سال گرہ ہے۔ اور اس جشن میں تمھاری شرکت ضروری ہے۔ لہٰذا تم وقت مقررہ پر یہاں پہنچ جانا۔ شاہد اور اسلم بھی یہاں آرہے ہیں۔

فقط تمھارا

انور حسین۔

خط لکھنے کے بعد اُس نے اُس پر ایک سرسری نظر دوڑائی اور اُنھیں الگ الگ لفافے میں رکھ کر پتا لکھنے لگا۔ اُس وقت اُس کا دل خوشی سے بڑی تیزی کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہا تھا کہ مزہ آجائے گا۔ جب دونوں ایک دوسرے کے گھر جائیں گے تو ایک دوسرے کو نہ پا کر حیرت زدہ ہو جائیں گے۔ پھر اُنھیں خیال آئے گا کہ آج اپریل فول ہے، تو وہ شرمندہ ہو جائیں گے۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اُس نے لفافے لیٹر بکس میں ڈالے اور گھر چلا آیا۔

اپریل کی پہلی تاریخ تھی، وہ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ وہ بہت مسرور نظر آرہا تھا۔ اچانک کال بیل بجی۔ وہ جلدی سے دروازے کی جانب لپکا اور جیسے ہی دروازہ کھولا۔ "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" کہتے ہوئے اکرم، انور، شاہد اور اسلم کمرے میں داخل ہوگئے۔ "تم لوگ؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔ "ہاں یار! ہم لوگ۔" اکرم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن تمھیں کیسے معلوم ہوا؟" وہ بہت حیرت زدہ تھا۔ "یار بتاتا ہوں، بتاتا ہوں! پہلے ناشتہ تو کراؤ۔" اکرم نے سامنے کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

اس کے بیٹھتے ہی انور، شاہد اور اسلم بھی ایک ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ نسیم اب تک محو حیرت تھا۔

"ہاں تو سنو!" اکرم نے کہنا شروع کیا۔ "کچھ دنوں پہلے مجھے ایک بیرنگ خط ملا۔ جو انور نے مجھے بھیجا تھا۔ میں نے اُسے لیا نہیں لوٹا دیا۔ لیکن دوسرے ہی دن ڈاکیا نے مجھے ایک دوسرا خط دیا اور کہا کہ آپ نے جسے یہ بیرنگ خط بھیجا تھا اُس نے اسے وصول نہیں کیا اور لوٹا دیا۔ لائیے ستر پیسے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے ڈاکیا سے کہا۔ "جی! یہ خط میں نے تو نہیں بھیجا تھا۔"

ڈاکیا بولا: "بہت زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کیجیے۔ لفافے پر آپ کا نام موجود ہے۔"

"خیر میں نے ستر پیسے ڈاکیا کو دے دیے اور لفافہ لے کر جھنجھلایا ہوا کمرے میں چلا آیا۔ جب خط پڑھا تو اُس میں انور کا

نام تھا۔ مجھے کچھ شک ہوا۔ میں نے انور سے رابطہ قائم کیا تو سارا راز معلوم کر لیا۔ یہاں آنے سے پہلے ہم نے اسلم اور شاہد کو بھی ساتھ لے لینا زیادہ مناسب سمجھا۔"
اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔
اب نسیم بہت شرمندہ ہوا۔ کیوں کہ خط لکھتے وقت وہ خوشی کی زیادتی میں ٹکٹ لگانا بھول گیا۔ نتیجے میں دونوں ہی خطوط بیرنگ ہو گئے۔ اُسے بڑا افسوس ہوا کہ وہ اپریل فول نہ منا سکا اور اب اُسے اس کے لیے ایک سال اور انتظار کرنا پڑے گا۔ اور پھر دوستوں کو کھلانے پلانے میں جو پیسے خرچ ہوئے وہ خسارہ الگ رہا۔

جاوید نہال حشمی

درجہ دہم سیکشن اے رول ۱۵ ہدایت الغربا ہائی اسکول
نیا بازار۔ کانکی نارہ ۔ ۲۹ ۱۳ ۴۳ ۷

(بقیہ صد ۳۱ کا)

تعلیمی میلا نمبر میں " پارلیمنٹ سیشن کا مطالعہ کرنے کے بعد میری دلی خواہش ہوئی کہ کاش ہم بھی کیبنٹ منسٹر یا اپوزیشن میں شامل ہوتے۔

مختار احمد فردیں

جی ۲/۳، ۲/۷، ۲۲ درام نگر لین (منگرا تالاب)
کلکتہ ۷۰۰۰۲۴

تعلیمی میلا نمبر" پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ منی آرڈر تو بہت جلد روانہ کر رہی ہوں رسالہ جاری رکھیں۔ اتنا پیارا رسالہ بھلا کیوں بند کر دیں۔ خدا اور ترقی دے۔

نور العین صدیقی

مسجد بل دار حافظ کے پاس
کاغذی پورہ۔ پوسٹ بلاپور (مہاراشٹر)

تعلیمی میلا نمبر ۲ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی اس کے بعد مارچ کا پیام تعلیم ملا۔ ہم سب ہی بھائی بہن اس رسالہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ہم نے یہ پیام تعلیم اپنے سب ہی دوستوں کو دکھایا۔

رفعت عائشہ

بنت حاجی انوار الحق قریشی مراد آباد

فروری کی آج ۱۳ تاریخ ہو گئی ہیں۔ فروری کے مہینے میں تعلیمی میلے نمبر کی دوسری قسط پڑھنے کے لیے دل بہت مچل رہا ہے۔

عبد القدیر

معرفت عبد الرحمٰن ٹیلر رام نت پورہ۔ اورنگ آباد

فروری کے "پیام تعلیم" میں "سردی آئی" ڈاکٹر قمبر رضوی کی نظم مجھ کو بہت اچھی لگی اور ڈاکٹر قمبر رضوی نے کہا ہے کہ "بچو! مانو بڑوں کا کہنا۔ سردی سے تم بچ کر رہنا" یہ آخری بند بہت پسند آیا۔
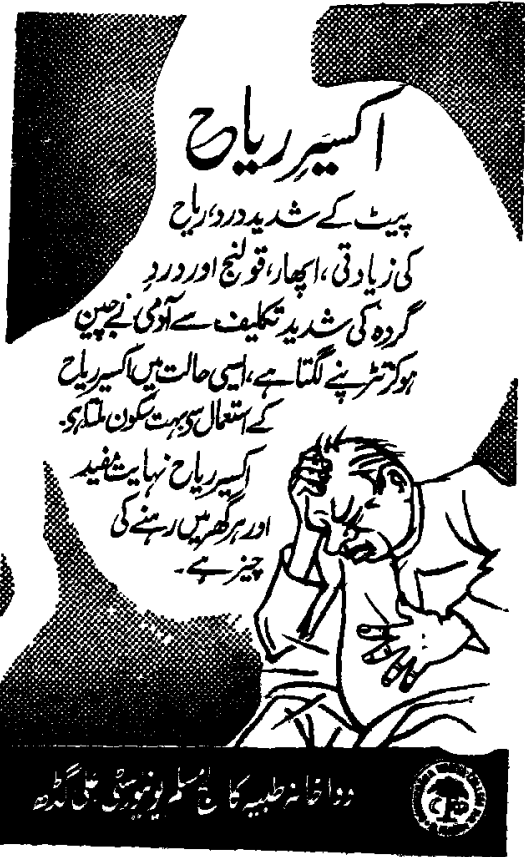
رستم راہی

ضلع بردوان (ویسٹ بنگال)

آدھی ملاقات اور بچوں کی کوششیں لکھنے والے پیامی قلم کار، اپنے خط اور مضامین صاف خوش خط اور لائن چھوڑ کر لکھیں۔ (ڈائریکٹر)

لکھیے:
کون سی تصویر پہلے انعام کی مستحق ہے
ننھے فن کار
ریاض احمد، نیا بازار، کانکی نارہ
مچھلی

یام تعلیم

کھیل سنسار (سطوت رسول)
چھوٹے بچوں کے لیے مترنم بحروں والے گیتوں اور نظموں کا ایسا مجموعہ جسے بچے شوق سے پڑھیں گے۔
قیمت : ۲/۵۰
دھنک
بچوں کے لیے لکھی گئی دلکش نظموں کا مجموعہ جس میں بچوں کے من پسند موضوعات پر نظمیں شامل ہیں
قیمت : ۳/-
اسلام کیسے شروع ہوا
(عبدالواحد سندھی جامعی)
یہ کتاب ان مسلمان بچوں بچیوں کے لیے لکھی گئی ہے جو اپنے پیغمبر اور اپنے دین کے ابتدائی حالات جاننا چاہتے ہیں۔
قیمت : ۲/۵۰
عبدالواحد سندھی جامعی
قرآن پاک کیا ہے
اس کتاب میں بچوں کے لیے نہایت آسان اور عام فہم زبان میں قرآن پاک کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ قیمت : ۳/۰۰ (نیا ایڈیشن)
سرخ جوتے
(بیگم قدسیہ زیدی)
"موتی" کو سرخ جوتے کیا ہاتھ لگے کہ اس کی غریبی دور ہوگئی۔ ایک دلچسپ کہانی ہے۔
پھولوں کی دیوی
دھنک کے بارے میں فلپائن کی ایک دلچسپ لوک کہانی۔
قیمت ۰/۸۰
جی دارا اور ننھا فرشتہ
(ریاض احمد خاں)
یہ اس دس بارہ سال کے ایک بہادر لڑکے کی کہانی جس نے ایک ننھے بچے کو پریوں بھوتوں کی گرفت سے بچایا۔ قیمت ۰/۸۰
مکتبہ پیام تعلیم جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

مئی ۱۹۸۲ء جلد ۱۹ شمارہ ۵

ایڈیٹر: ولی شاہجہانپوری
فی پرچہ: ڈیڑھ روپے سالانہ پندرہ روپے
غیر ممالک کے لیے 65 روپے

بچوں سے باتیں

اپریل کے شمارے کے متعلق ہمیں پیامیوں کے بہت کم خطوط موصول ہوئے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ آپ لوگ سالانہ امتحانوں کی تیاری میں منہمک ہوں گے۔ اس شمارے کے آپ تک پہنچتے پہنچتے بیشتر امتحان ختم ہو چکے ہوں گے۔ ہماری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا آپ کو آپ کی محنت کا بہترین ثمرہ دے۔

ظاہر ہے کہ اس مہینے کے بعد بڑی چھٹیاں شروع ہو جائیں گی۔ آپ لوگ سیر سیاحت اور کھیل کود میں مصروف ہو جائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ چھٹیاں ختم ہونے کے بعد طلبہ ہمیں مضمون کی صورت میں بتائیں کہ انھوں نے یہ زمانہ کیسے گزارا۔ مضمون پر مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر کی تصدیق ضروری ہوگی۔ یہ مضامین ہم پیام تعلیم میں شائع کریں گے۔

جو خطوط آئے ہیں ان میں پروفیسر غلام دستگیر اور مسعود حیات صاحب کی نظمیں اور ناصر زیدی صاحب کا سبزیوں کا مشاعرہ، حکیم محمد سعید صاحب کا "مطب کی روشنی میں" اور ڈاکٹر حلیم کوثر کا "پولیو" کو خاص طور پر دلچسپ اور معلوماتی ہونے کے سبب زیادہ پسند کیا گیا۔ اس پسندیدگی کا شکریہ لیکن شکوہ یہ ہے کہ رسالہ کے خریدار بڑھانے کی طرف آپ لوگ توجہ نہیں دے رہے۔ ادھر بھی دھیان دیجیے تاکہ ہم آپ کی دلچسپی کے مزید سامان فراہم کریں۔ کاغذ اور دیگر سامان طباعت کی گرانی کے باوجود ہم نے اس کے صفحات میں اضافہ کر دیا ہے کہ آپ کو زیادہ سے زیادہ چیزیں پڑھنے کو مل سکیں۔ اب آپ بھی اپنا اخلاقی فرض پورا کریں کیا ہمارا مطالبہ غیر واجبی ہے؟

پیام تعلیم کے ایک نوجوان مضمون نگار ہیں عبدالملک فاروقی ماشاء اللہ بڑے شریف اور دین دار خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ انھوں نے بعض اچھی چیزیں آپ کو بھی دی ہیں۔ نوجوانی کے جوش میں بلا اطلاع گھر سے غائب ہو گئے اور اب لاپتا ہیں۔ اس درمیان میں ایک مضمون نگار سے قلمی دوستی کی اور بنفسِ نفیس ان کے مہمان بھی بنے۔ اپنے میزبان کو آخری خط بمبئی سے لکھا جس میں بعض فرضی رشتہ داروں کا تعارف کرایا۔ ادھر ان کے والدین پریشان اور نالاں ہیں کہ صاحبزادے کو تعلیم دلانے کی ساری مساعی ناکام ہو گئیں۔ اگر والد پریشان ہیں کہ اس لاابالی پن میں عبدالملک کوئی غلط کام نہ کر بیٹھیں۔ اللہ انھیں نیک راہ پر چلائے۔

پرنٹر پبلشر سید احمد دہلوی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

کہانی اور
تصاویر
جاوید نہال
حشمی
"آج بارش ضرور ہوگی۔"
"اوہ! بارش آ ہی گئی..."
"اتنی تیز بارش! ذرا ٹھہر جائیں۔"
"بارش تو تھم گئی مگر سڑک پر پانی جمع ہوگیا!"
"ہاں یہ ترکیب اچھی ہے۔"

کتنا اچھا بھارت ہے

پروفیسر غلام دستگیر

کتنے اچھے بادل ہیں
جو گھر گھر کر آتے ہیں
اور پانی برساتے ہیں
سوکھی ندی، سوکھے کھیت
سب کی پیاس بجھاتے ہیں
کتنے اچھے بادل ہیں

کھیت بھی کتنے اچھے ہیں
جو بارش کے پانی سے
گیہوں، دھان اُگاتے ہیں
جن کو ہم سب کھاتے ہیں
پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں
کھیت بھی کتنے اچھے ہیں

کتنے اچھے دریا ہیں
باغ، بغیچوں، کھیتوں کو
جو پانی پہنچاتے ہیں
لوگ کناروں پر جن کے
اپنے گاؤں بساتے ہیں
کتنے اچھے دریا ہیں

باغ بھی کتنے اچھے ہیں
جو پیڑوں کی شاخوں پر
رنگیں پھول کھلاتے ہیں
اور خوش بو پھیلاتے ہیں
سب کا دل بہلاتے ہیں
باغ بھی کتنے اچھے ہیں

کتنا اچھا بھارت ہے
جس کے بادل، دریا، کھیت
ہم سب کے کام آتے ہیں
جس میں ہم سب رہتے ہیں
گیت خوشی کے گاتے ہیں
کتنا اچھا بھارت ہے

سلطانہ فیضی

انگریزی میں ایک کہاوت ہے :-

"ایک بوڑھی عورت تھی جو جوتے کے اندر رہتی تھی۔ جس کے بے حساب بچے تھے۔ وہ ان کو مارپیٹ کر روز سلا دیا کرتی تھی۔"

بس اُسی بوڑھی عورت کا جوتا آپ کو کملا نہرو پارک میں اینٹ اور چونے کا بنا ہوا نظر آئے گا۔ یہ پارک پنڈت جواہر لال نہرو کی بیوی کے نام سے بمبئی میں بنایا گیا ہے۔ چوپاٹی کے ساحل سے گزرنے کے بعد اس چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھ جائیے، جس کو ملبار ہل کہتے ہیں۔ وہاں فیروز شاہ مہتا باغ کے سامنے کملا نہرو پارک ہے۔

دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ پر ایک گلابی جوتا نظر آئے گا۔ وہ اتنا بڑا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی دیو کا جوتا ہے یہ ایک موٹا اور اونچا بوٹ ہے۔ جس کے پنجے میں چھ پھندے ہوئے ہیں۔ اس میں دو سرخ کھڑکیاں بھی ہیں۔ ایک چھوٹے دروازے سے آپ جوتے کے اندر پہنچ جاتے ہیں، جہاں ایک سیڑھی ملتی ہے اس سے اوپر چڑھ جائیے اور سرخ کھڑکی سے باغ کا نظارہ کیجیے۔ دور پہاڑ کے نیچے چوپاٹی کا سمندر بھی ایسا دکھائی دے گا جیسے بڑے تھال میں کھیر بھری ہو۔

ہر سال ۲۶ر جنوری کو یوم آزادی کی خوشی میں اس جوتے پر خوب روشنی کی جاتی ہے۔ جوتے کے سامنے ایک بناوٹی غار ہے۔ آپ ایک طرف سے اس غار کے اندر چلے جائیں تو دیکھیں گے کہ شیشے کے ڈبوں میں مچھلیاں بند ہیں۔ جو ہر دم پانی میں چکر لگاتی رہتی ہیں —— چھوٹی چھوٹی گلابی اور چمکدار، سنہری مچھلیاں۔ اب آپ دوسری طرف سے باہر نکل آئیں تو سامنے ایک لوہے کا بڑا سا پنجرہ ملے گا۔ اس میں رنگ برنگے توتے اور پرندے بند ہیں۔ بچے ان کو دانا ڈالتے ہیں اور وہ خوش ہو کر کھاتے ہیں۔

اب ذرا حوض کے کنارے پھولوں کو دیکھیے۔ باغ میں دوڑیے۔ ہری ہری گھاس پر لوٹیے اور کھیلیے۔ لیکن گھر جانے سے پہلے ٹیلے پر چڑھنا نہ بھول جائیے گا۔ سرخ سرخ روش پر گھومتے ہوئے آپ ذرا آگے بڑھیں گے تو ایک اچھا سا ٹیلا ملے گا۔ تھک جائیں تو بڑے بڑے درختوں کے سائے میں لیٹ کر آرام کیجیے۔

★ ★ ★

پیڑوں نے اپنا راجا چنا!

[ایک فلسطینی کہانی]

کہا جاتا ہے کہ بہت بہت دن ہوئے، جب پیڑ آپس میں باتیں کیا کرتے تھے۔ اور جب لوگ باتیں کرتے ہیں تو لڑتے بھی ہیں۔

ایک دن جنگل کے پیڑوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ باتیں کرتے کرتے وہ آپس میں اُلجھ گئے۔ بحث طول کھینچا تو وہ لڑنے لگے۔

جھگڑا اس بات پر تھا کہ اُن میں کون کس سے بہتر ہے! خوب لڑے، خوب لڑے مگر کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا تھک ہار کر اُنھوں نے یہ طے کیا کہ تمام پیڑوں میں سے کوئی ایک پیڑ اُن کا راجا بن جائے۔ پھر اُس کا حکم سب پر چلے۔ سب آنکھ بند کر کے راجا کی بات مانیں۔

اب ہر پیڑ نے سوچنا شروع کیا —— "اگر میں ہی راجا بنا دیا جاؤں تو مزے اُڑاؤں۔ سب پر حکم چلاؤں۔ سب پر رُعب جماؤں۔ واؤں، واؤں، واؤں!"

ہر پیڑ بڑھ چڑھ کر ڈینگیں مارنے لگا۔ "مجھے راجا بنا دو، پھر دیکھو! مجھے راجا بنا دو، پھر دیکھو!! مجھے راجا بنا دو، پھر دیکھو!!!"

جنگل کا جنگل بس اسی شور میں ڈوب گیا۔ سارے پیڑ ایک ساتھ چلّا رہے تھے۔

اُن میں ایک پُرانا بوڑھا، تجربہ کار پیڑ جو دوسرے پیڑوں سے زیادہ [illegible] دار تھا۔ ڈپٹ کر بولا —— "یہ چیخ [illegible] بند کرو۔ میری باتوں پر کان دھرو! آپس میں یوں لڑ لڑ کر نہ مرو! سنو!"

سارے پیڑ چپ ہو گئے۔

بوڑھے پیڑ نے کہا —— "سوچو اور غور کرو! یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تم راجا بنا دیے جاؤ، اور وہی سب کرتے رہو جو ابھی تک کرتے آئے ہو۔ راجا بننے کے بعد تمھیں اپنے آپ کو بدلنا ہوگا۔ زندگی کا نیا راستہ اپنانا ہوگا۔ اگر تمھاری ٹہنیوں پر پھل آ گئے ہیں تو تمھیں پھل پیدا کرنے سے دُور رہنا پڑے گا۔ پھل پیدا کرنے میں تم جو طاقت خرچ کرتے ہو، خون پسینہ جلاتے ہو، اُس کا دوسرا مصرف ڈھونڈنا ہوگا۔ تمھیں اپنی ساری طاقت اِس بات پر لگانی ہوگی کہ تم اُونچے اور اونچے اور اونچے ہوتے جاؤ۔ تمھاری ڈالیں اور ٹہنیاں لمبی ہوتی جائیں۔ تمھارا تنا اور موٹا اور موٹا ہوتا جائے۔ ایسا ہی اونچا، گھنا، مضبوط پیڑ راجا بن سکتا ہے، سمجھے؟"

سارے پیڑوں کو یہ سن کر سانپ سونگھ گیا۔ شیخی بازی ہوا ہو گئی۔ اب کیا کریں؟ وہ سب سر جھکا کر سوچنے لگے —— ایک نے دوسرے سے، دوسرے نے تیسرے سے، تیسرے نے چوتھے سے کہا،

کہ کون سا پیڑ راجا بن سکتا ہے؟"

سب سے پہلے پیڑوں نے زیتون کے پیڑ سے پوچھا ——— "تم ہمارے راجا بنو گے؟"

"نا بھئی نا"! زیتون کا پیڑ ناک سکوڑ کر بولا ——— میں اپنے پھل پیدا کرنا نہیں چھوڑوں گا۔ اتنے میٹھے میٹھے ہوتے ہیں، ہونہہ! بس لمبے اور گھنے ہونے سے کیا مل جائے گا؟"

اب سارے پیڑوں نے انجیر کے پیڑ کا رُخ کیا پوچھا ——— "تم ہمارے راجا بنو گے؟"

انجیر کے پیڑ نے جواب دیا ——— "میں پاگل تو نہیں ہوں! میرے انجیر کتنے میٹھے ہوتے ہیں؟ میں راجا بننے کے لیے انجیر پیدا کرنا چھوڑ دوں، اپنی رسم توڑ دوں، یہ کہاں کی سمجھ داری ہوگی! نا بابا نا! مجھے راجا نہیں بننا۔" یہ کہتے ہوئے انجیر کا پیڑ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

سارے پیڑ پریشان تھے۔ عجیب بات ہے! اب کیا کیا جائے؟ سب نے کان جوڑ کر مشورہ کیا۔ سوچا، انگور کی بیل ذرا سیدھی سادی دکھائی دیتی ہے۔ پیڑ کا پیڑ، بیل کی بیل۔ شاید ہماری بات مان لے۔

اب پیڑوں نے انگور کے ایک پیڑ سے سوال کیا ——— "اے بھائی! دیکھو ہم کتنے اچھے ہیں! تمھیں اپنا راجا بنانا چاہتے ہیں ——— بولو! تیار ہو! شاباش۔"

پیڑوں نے اپنے پتوں سے تالیاں بجائیں۔

انگور کا پیڑ جس کی نازک نازک بیلیں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں، کچھ دیر چپ رہا، پھر کہا!

"بھائیو! یہ آپ کا احسان ہے جو آپ کی نظروں میں میرا اتنا مان ہے! مگر میرے میٹھے رسیلے انگور سبھی پسند کرتے ہیں۔ مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔ مجھے دوسروں کو خیال ہے۔ یہی خیال میری جان کا جنجال ہے۔ یہ جنجال کیسے چھوڑوں؟ لوگوں کا دل کیسے توڑوں؟"

سارے پیڑ سمجھ گئے کہ کوئی پھل دار پیڑ اس چکر میں آنے کا نہیں۔ سب کے سب جیسے ہیں ویسے ہی رہنا چاہتے ہیں۔ تبدیلی کے نام سے ڈرتے ہیں۔ راجا بنانا چاہو تو نا نا کرتے ہیں۔ اپنے پھلوں پر مرتے ہیں اور بس اُنہی کا دم بھرتے ہیں۔

ایک ایک کرکے سارے پھل دار پیڑوں نے راجا بننے سے انکار کر دیا۔ اتنے میں ایک کیکر کا پیڑ دکھائی دیا۔ وہ بہت دیر سے اِن پیڑوں کی باتیں سُن رہا تھا۔ غصّے میں بھُن رہا تھا کہ اُس سے کوئی راجا بننے کے لیے کیوں نہیں کہتا! کیا اِس لیے کہ میری ٹہنیوں پر پھل نہیں اُگتے، کانٹے ہوتے ہیں؟ کیا اِس لیے کہ میں دوسرے پیڑوں کی طرح اُونچا، گھنا، سایہ دار نہیں؟ کیا اِس لیے کہ میری حیثیت معمولی ہے؟ خیر! تھک ہار کر یہ سب میری ہی خوشامد کریں گے۔ دوستی کا دم بھریں گے۔

اور سچ مچ یہی ہوا۔ جنگل کے سارے پیڑوں میں بس ایک کیکر کا پیڑ بچ رہا تھا۔ باقی سب نے راجا بننے سے انکار کر دیا تھا۔ تمام پیڑ ایک ساتھ چلّائے ——— "کیکر رے کیکر! ہمارا راجا بن جا۔ رُوٹھا ہے تو مَن جا۔ شان سے تَن جا!"

کیکر کے پیڑ کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ کہیں یہ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟ مگر جب بار بار پیڑوں نے چکنی چپڑی باتیں کیں تو کیکر تیار ہو گیا۔ راجا بننے کا دھیان آتے ہی سینہ تان کر بولا ——— "اچھا تو ہم تمھاری بات مانے لیتے ہیں۔ تم سب کے سب میری اطاعت قبول کرو! میری بڑائی کا دم بھرو! میرے قہر سے ڈرو۔ جو کہوں وہی کرو!"

"کریں گے۔ کریں گے!" سارے پیڑ ایک ساتھ بولے۔

کیکر کے بدن پر جتنے کانٹے تھے، سب کے سب اور نوکیلے ہو گئے۔ اپنی ڈالوں کو سمیٹ کر کیکر کا پیڑ دھیرے دھیرے آسمان کی سمت دیکھنے لگا اور اُونچا ہونے لگا۔ اُونچا، اور اُونچا، اور اُونچا۔

اب اُس نے کانٹوں کی زبان میں، زہر میں بُجھی ہوئی آواز میں، پاٹ دار لہجے میں کہنا شروع کیا ——— اے جنگل کے پیڑو! تم میری بات سُنو اور غور کرو! تم میں سے کوئی اپنے آپ کو نہیں بدلنا چاہتا۔ تم سب کے سب اپنے رُوپ پر مرتے ہو، مگر میرا کیا؟ میں نے اپنے آپ کو بدل بھی لیا تو میرا کون سا گھاٹا ہو جائے گا۔ اس لیے میں تمھارا راجا بننا قبول کرتا ہوں!"

"کیکر راجا کی جے ہو!" سارے پیڑ ایک زبان ہو کر چلائے۔

کیکر کی ایک ٹہنی نے جُھک کر سلام کیا، پھر کیکر کے پیڑ نے کہا ——— "تو لوگو! آج سے میں تمھارا راجا، تم میری پرجا۔ تم میرا حکم مانو گے۔ میری ہر بات کو اپنا فرض جانو گے۔ میرے مرتبے کو پہچانو گے۔"

"ہاں، ہاں، ہاں!" سارے پیڑوں نے صدا لگائی۔

کیکر بولا ——— اچھا! تو ٹھیک ہے! اب اگر تم نے کسی بات پر آپس میں جھگڑا کیا تو سمجھ لو! میں جنگل کے اُس پار بستی سے کسی انسان کو بلواؤں گا۔ انسان جو طاقت ور بھی ہے چالاک بھی۔ ہم سب سے زیادہ چالاک۔ اگر تم نے لڑائی جھگڑا کیا تو میں اُس انسان سے کہوں گا کہ میرا جھاڑ جھنکاڑ جو میرے پیچھے بکھرا ہوا ہے، سب جمع کرے، پھر اُس میں آگ لگا دے! یہ آگ سارے جنگل میں پھیل جائے گی۔ تم سب کو بھسم کر دے گی ـــ سمجھے!

پیڑوں کی گھگھی بندھ گئی۔ ڈرے ڈرے لہجے میں بولے۔ "سمجھ گئے، سمجھ گئے!"

کہتے ہیں کہ وہ دن اور آج کا دن۔ پھر کبھی جنگل کے پیڑوں میں کوئی جھگڑا نہ ہوا۔

اسطوت رسول

میری

سائیکل میری ٹن ٹن ٹن
بن جائے گی جب یہ رتھ
دوڑ لگائے اک اک پتھ
گھنگرو کرتے ہیں
چھن چھن
دوڑے گا، میرا گھوڑا
کھائے گا، جب یہ کوڑا
ہوا کے ساتھ چلے
سن سن
کچھ بچّے آگے پیچھے
کچھ نے ہینڈل ہیں پکڑے
کھٹ پٹ کرتی ہے
اَن بن
بھرتی ہے کتنے بہروپ
اپنے پیروں چلتی دھوپ
طارق، گڈّی
اور سمن
سائیکل میری
ٹن ٹن ٹن

ہمدرد انسائیکلو پیڈیا

علی ناصر زیدی

س: سر اسحاق نیوٹن کے متعلق کچھ بتائیے؟
(سیّد نور اللہ)

ج: ہم برطانیہ کے اس مشہور سائنس داں کے مفصل حالات شائع کر چکے ہیں۔ مختصر طور پر یہ سمجھیے کہ اگرچہ اس سائنس داں نے بہت سے موضوعات پر کام کیا، لیکن اُس کے متعلق سیب والا وہ قصہ زیادہ مشہور ہے کہ وہ اپنے باغ میں بیٹھا ہوا تھا کہ یکایک درخت سے ایک سیب گرا۔ اُس نے سوچا سیب نیچے ہی کیوں آتا ہے، اوپر کیوں نہیں جاتا؟ گویا اُس نے کشش یا تجاذب کا نظریہ دریافت کیا۔ اگرچہ یہ بات سائنس دانوں کو پہلے بھی معلوم تھی لیکن اس قابل ریاضی داں نے اُسے ایک قانون کی شکل دی جو اُس کے نام سے ابھی تک مشہور چلا آتا ہے۔

س: ڈارون کے نظریۂ ارتقا سے کیا مراد ہے؟
(سجاد علی حسینی)

ج: ڈارون ایک ماہر حیاتیات تھا جس نے انسان کی پرانی تاریخ پر بہت تحقیقات کیں۔ اُس نے ایک نظریہ دریافت کیا اور اُس کی تائید میں کئی کتابیں لکھیں جو نظریۂ ارتقا کہلاتا ہے۔ اس کے مطابق انسان شروع سے ایسا نہیں تھا بلکہ حیات یا زندگی کی ابتدا پانی سے ہوئی اور پھر وہ نہایت مختصر جان دار ترقی کی بے شمار منزلیں طے کرتا گیا۔ لاکھوں کروڑوں سال بعد کہیں انسان کی شکل نظر آئی۔ ارتقا کے معنی ہیں ترقی۔ اس ترقی کو ڈارون کے نظریۂ ارتقا میں بیان کیا گیا ہے۔

بشکریہ "نونہال" ۔ کراچی

س: کیمروں میں استعمال ہونے والی عام فلموں اور انفراریڈ فلموں میں کیا فرق ہے؟ انفراریڈ فلموں کے بارے میں تفصیل سے بتائیں؟
(حبیب اللہ)

ج: آپ جانتے ہوں گے کہ کیمرے کے عدسے میں روشنی داخل ہو کر فلم پر اثر ڈالتی ہے اور یوں اُس پر سامنے کی چیز کا ایک عکس بن جاتا ہے جو فلم دھونے پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ عام روشنی ہوتی ہے۔ لیکن اس عام روشنی کے علاوہ کچھ شعاعیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتیں۔ انفراریڈ شعاعیں اسی ذیل میں آتی ہیں۔ وہ ہمیں نظر تو نہیں آتیں۔ لیکن خاص قسم کی فلموں پر اثر ڈالتی ہیں جنھیں انفراریڈ فلم کہتے ہیں۔ دھند اور تاریکی میں تصویریں لینے کے لیے انفراریڈ فلمیں اور خاص طرز کے کیمرے استعمال کیے جاتے ہیں۔

س: حجم، کمیت اور کثافت کیا ہیں؟
(عظمیٰ متین)

ج: کسی بھی جسم کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی کے حاصل ضرب کو حجم کہتے ہیں۔ کمیت مادّے کی وہ مقدار ہے جو کسی جسم میں موجود ہے اور کثافت مادّے کی وہ مقدار ہے جو کسی جسم کے ایک مکعب سینٹی میٹر میں موجود ہو یعنی اگر اُس جسم کا ایک مکعب لیں جس کی لمبائی ایک سینٹی میٹر اور اونچائی بھی ایک سینٹی میٹر ہو تو اس میں موجود مادّے کی مقدار اس مادّے کی کثافت کہلائے گی۔

س: کیا چیونٹی اندھی ہوتی ہے؟ اگر نہیں تو یہ اپنے قریب پڑی ہوئی چیز پر جھپٹتی کیوں نہیں؟
(صلاح الدین)

ج: چیونٹی اندھی تو نہیں ہوتی، لیکن لپٹنا اور جھپٹنا اُس کی فطرت میں نہیں ہے۔ کوئی چیز اگر اُس کے کھانے کی ہے تو وہ ضرور اُس کی طرف جاتی ہے اور اپنے وزن سے زیادہ وزنی چیز گھسیٹ لاتی ہے۔ چیونٹیوں کا باہمی اتفاق ہم انسانوں کے لیے لائقِ تقلید ہے۔

س: کیا ہر آدمی ہپناٹزم کی مشق کر کے ایک ماہر ہپناٹسٹ بن سکتا ہے۔
آج کل کی ہپناٹزم سکھانے والی کتابیں صحیح ہیں یا غلط؟ (معراج یاسمین اعظمی)

ج: ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ یقیناً مشق کرنے سے انسان سب کچھ سیکھ سکتا ہے۔ لیکن اس سائنسی دور میں اب اس قسم کی چیزیں اپنی مقبولیت کھو رہی ہیں۔ بعض ترقی یافتہ ملکوں میں ہپناٹزم (عمل تنویم) کو بازی گری اور کھیل تماشے کے لیے نہیں بلکہ سرجری کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ مریض کی توجہ اپنی طرف کر کے آپریشن کر دیا جاتا ہے۔ جہاں تک اس علم کی کتابوں کا تعلق ہے، اچھی بری کتابیں ہر موضوع پر آتی ہیں۔ معلوم نہیں آپ کن کتب کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

س: کیا سورج کی روشنی بھی مختلف رنگوں کا مجموعہ ہوتی ہے؟ (کاشف محبوب)

ج: جی ہاں، سورج کی روشنی سات رنگوں کا مجموعہ ہوتی ہے جو آپ قوس قزح میں دیکھتے ہیں یا جب روشنی شیشے کے منشور میں سے گزرتی ہے تو اس کا عکس شعاعی بنتا ہے۔ جس میں یہ سات رنگ اسی ترتیب سے نظر آتے ہیں بنفشئی، اودا، نیلا، سبز، زرد، نارنجی، اور سرخ۔

س: مادّے کی تمام حالتوں کے سالمے ہر وقت حرکت کرتے رہتے ہیں۔ تو پھر وہ چیزیں خود کیوں حرکت نہیں کرتیں؟ (رفیق عثمان)

ج: صرف مائع اور گیس کے سالمات حرکت کرتے ہیں، لیکن یہ چیزیں بھی کسی چیز میں بھری ہوتی ہیں۔ مثلاً پانی کسی برتن میں ہوتا ہے، گیس کسی سلنڈر میں ہوتی ہے، اندر اندر یہ سالمے حرکت کرتے رہتے ہیں، مگر یہ حرکت اتنی قوی نہیں ہوتی کہ پانی کا برتن یا گیس کا سلنڈر ایک جگہ سے دوسری جگہ چلا جائے۔

س: جب ہم سوتے ہیں تو ہماری آنکھیں بند کیوں ہو جاتی ہیں؟ (محمد حسین عبدالمجید)

ج: سونے پر ہی کیا منحصر ہے۔ جب ہم آنکھیں بند کرتے ہیں تو انھیں آرام ملتا ہے۔ کیوں کہ ایک تو روشنی بند ہو جاتی ہے، دوسرے کسی طرف دھیان نہیں جاتا۔ یہ قدرتی نظام ہے کہ جب ہم سونے لگتے ہیں تو آنکھیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ہمیں سکون ملتا ہے۔

س: ملکوں کے نقشے کس طرح بنائے جاتے ہیں اور نقشوں میں ملکوں کی حدود کس طریقے سے بنائی جاتی ہیں؟ ذرا تفصیل سے بتائیں۔ (محمد ظفر ایوب)

ج: نقشے پہلے تو ہاتھ سے ہی بنائے جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ایک موزوں پیمانہ منتخب کیا جاتا ہے کہ ایک انچ اتنے میل کو ظاہر کرے گا۔ پھر نہایت احتیاط سے مختلف پیمانوں اور آلات کی مدد سے مختلف ملکوں کی حدود اُن کے اصل رقبے کے مطابق نقشے پر ظاہر کی جاتی ہیں۔ ان میں مختلف رنگ بھرے جاتے ہیں۔ دریا، جھیلیں، ریلوے لائن، شہر، جنگلات غرض تمام تفصیل رنگوں کی مدد سے ظاہر کی جاتی ہے۔ جب نقشہ مکمل ہو جاتا ہے تو اُس کی تصویر لے کر اُس جیسے بہت سے نقشے چھاپ لیے جاتے ہیں۔

س: کہا جاتا ہے کہ چاند زمین کے گرد گھومتا ہے، لیکن چاند اور زمین کے درمیان تو بہت بڑا خلا ہے جہاں چاند اور زمین کی کشش اثر نہیں کرتی۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ چاند زمین کے گرد گھومتا ہے۔ (فاروق جاوید)

ج: اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ چاند زمین کے چاروں طرف گھومتا ہے۔ اس کا ثبوت اُس کا ہر ماہ کا نکلنا، گھٹنا، بڑھنا اور پھر غائب ہو جانا وغیرہ ہے۔ شاید آپ کشش اور خلا کو آپس میں ملا رہے ہیں

ان کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ زمین کی کشش خلا میں بھی اسی طرح اثر کرتی ہے جس طرح ہوا میں کرتی ہے۔ ہم سے چاند کا اوسط فاصلہ تقریباً ڈھائی لاکھ میل ہے۔ جس میں سے بیشتر خلا ہے لیکن زمین اتنے عظیم فاصلے پر بھی چاند کو اپنی کشش کے زیر اثر اپنے چاروں طرف گھماتی رہتی ہے۔

س: دُم دار ستارے کیا ہوتے ہیں؟ (آنسہ فوزیہ حمید)

ج: دُم دار تارہ اصل میں کوئی ستارہ نہیں ہوتا بلکہ زمین کا ایک سیارہ ہوتا ہے جیسے چاند ہماری زمین کا سیارہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دُم دار تارے کا مدار یا راستہ بہت لمبا ہوتا ہے اور وہ ہر چند سال کے بعد زمین سے نظر آتا ہے۔ اُس کا ایک موٹا سر بھی ہوتا ہے جس میں گیس بھری ہوتی ہے۔ اور پھر اُس کی ایک بہت بڑی دُم ہوتی ہے جسے گیس کی ایک دھار کہا جا سکتا ہے۔ سورج کی روشنی اُس کے سر اور دُم پر پڑتی ہے تو دونوں چمکتے نظر آتے ہیں۔ اسی دُم کی وجہ سے یہ سیارہ دُم دار تارہ کہلاتا ہے۔ لیکن وہ تارہ نہیں ہوتا۔

واہ رے میرا پیارا چھاتا

نادک حمزہ پوری

جب موسم گرمی کا آتا
لو کا جھونکا سہا نہ جاتا
جب سورج تن بدن جلاتا
سایہ کرنے کو تن جاتا ——— واہ رے میرا پیارا چھاتا

جب رُت آئی ہے رِم جھم کی
ہوتی ہے جب بوندا بوندی
یا جب ہو بارش زوروں کی
پانی سے ہے مجھ کو بچاتا ——— واہ رے میرا پیارا چھاتا

جاڑوں میں کچھ کام نہ اس کا
لب پہ کسی کے نام نہ اس کا
نام مگر بدنام نہ اس کا
جاڑوں میں ہے یہ سستاتا ——— واہ رے میرا پیارا چھاتا

کالا بھی ہے اُجلا بھی ہے
چھاتا رنگ برنگا بھی ہے
چھوٹا بڑا منجھولا بھی ہے
سب کے من کو ہے بھاتا ——— واہ رے میرا پیارا چھاتا

چیز بڑے مزے کی ہے یہ
کیسی پیاری چھتری ہے یہ
وقت پڑے تو لاٹھی ہے یہ
واہ رے میرا پیارا چھاتا

پتا: ایچ-ای-اسکول-سونڈا، ہزاری باغ

پروفیسر قنبر احمد رضوی

ملکوں ملکوں کی سیر

ایشیا کی دہلیز

ترکی کا ملک جو دو جزیرہ نماؤں۔ بلقان اور ایشیائے کوچک کے وسیع دامنوں میں مشرقی بحر روم کے کنارے دور تک پھیلا ہوا ہے اسے "ایشیا کی دہلیز" کہا جاتا ہے کیوں کہ یورپ کی سمت سے آنے پر یہ براعظم ایشیا کے دروازے پر اناطولیہ کے پٹھار پر واقع ہے۔ یہ ملک ۴۲ اور ۳۶ ڈگری شمالی عرض البلاد ۲۶ اور ۴۴ ڈگری مشرقی طول البلاد کے درمیان پھیلا ہے۔ ملک کا کل رقبہ ۷۸۰۵۷۶ مربع کلومیٹر ہے جس میں سے ۲۳۷۲۱ مربع کلومیٹر یورپ میں ہے۔ شمال میں پونٹیک اور جنوب میں طارس وخلاف طارس کی پہاڑیاں احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ دونوں کوہستانی سلسلوں کے درمیان اناطولیہ کا پٹھار اوسطاً ۷۶۰ میٹر اونچا ہے جو مشرق کی طرف بڑھ کر ۱۸۰۰ میٹر بلند ہوگیا ہے۔ اس سطح مرتفع یا پٹھار کے بیچوں بیچ نمکین پانی کی جھیل تزگول نام سے موسوم ہے۔ یورپ کی جانب آرمینیا کے سطح مرتفع پر کوہ آتش فشاں بھی واقع ہے۔ اناطولیہ کے پٹھار کے شمال میں تنگ ساحلی میدان ہے جو مغرب میں لفرہ اور مشرق میں چہار شنبہ کے نام سے مشہور ہے۔ اناطولیہ کے مغربی ساحل پر کیکس، اسمرنا اور برسا کے میدان ہیں۔ جنوب میں بحر روم کے ساحل پر انطولیہ، عدنان اور سلیشیا کے میدان واقع ہیں۔

ترکی کی آب و ہوا شدید قسم کی ہے۔ گرمیوں میں کافی گرمی ہوتی ہے اور درجہ حرارت ۲۴ سنٹی گریڈ سے ۲۸ سنٹی گریڈ تک ہوتا ہے اور سردیوں میں یہ اتنا کم ہوجاتا ہے کہ نقطہ انجماد سے بھی نیچے ۱ - ۳ تک پہنچ جاتا ہے ملک کی اوسط سالانہ بارش ۵۵ سے ۸۰ سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ مغربی اور جنوبی حصے میں بحر رومی آب و ہوا اور وسط میں خشک برّی آب و ہوا ملتی ہے۔ شمالی ترکی کی آب و ہوا سرد و معتدل ہوتی ہے جس میں بحر اسود کے ساحل پر مشرقی حصے میں بارش کی مقدار ۲۵۰ سینٹی میٹر ہو جاتی ہے۔

اس ملک کا ۳۵٪ حصہ چراگاہوں اور ۱۵٪ حصہ جنگلوں سے گھرا ہوا ہے۔ صرف ۳۰٪ زمین پر کھیتی ہوتی ہے۔ لیکن کاشتکاری یہاں کی دو تہائی آبادی کا خصوصی پیشہ ہے۔ ملک میں مختلف حصوں میں گیہوں، جو، مکا، رائی، تمباکو، کپاس۔ زیتون۔ انجیر، چقندر اور تلہن کی کھیتی کی جاتی ہے۔ یہاں ریشم بھی پیدا کیا جاتا ہے۔ خاص معدنیات میں کرومائٹ۔ مینگنیز۔ لوہا۔ کوئلہ۔ تانبا اور مٹی کا تیل شامل ہیں۔ یہاں گندھک بھی دستیاب ہوتی ہے۔

ترکی میں مویشیوں کے پالنے کا کام بھی ہوتا ہے جن

سے گوشت، دودھ اور اون حاصل کیا جاتا ہے۔ یہاں ایک خاص قسم کی بکری جسے "انگورا" کہتے ہیں پائی جاتی ہے جس کے اون کو "انگورا مہر" کہتے ہیں۔ یہ نہایت اعلا قسم کا اون ہوتا ہے اور ملک سے ۷۵٪ باہر بھیج دیا جاتا ہے۔ ملک میں ریشمی، اونی اور سوتی کپڑوں کی بنائی اور قالین کی صنعت بھی دن بدن ترقی کر رہی ہے۔

ترکی میں کپڑے اور چمڑے کے علاوہ کاغذ، چینی، فولاد اور پھلوں سے متعلق صنعت بھی روز افزوں ترقی کر رہی ہے ملک کے صنعتی حصے زیادہ تر شمالی مغربی اور وسطی حصے میں واقع ہیں۔

زمین اونچی نیچی ہونے کی بنا پر ذرائع آمد و رفت اور صنعت میں خاطر خواہ ترقی نہ ہو سکی پھر بھی ۸۶۰۰۰ کلو میٹر سڑکیں اور ۳۸۱۵ کلو میٹر لمبی ریلوے لائن ہے۔ انقرہ اور استنبول خاص بین اقوامی ہوائی اڈے ہیں۔ ازمر، استنبول اور اسکندرون مشہور بندرگاہ ہیں۔

ملک کی کل آبادی چار کروڑ سے زیادہ ہے۔ مغربی ساحلی علاقے میں آبادی کا تناسب نسبتاً زیادہ ہے۔ یہاں ۲۷ شہر ایسے ہیں جن کی آبادی پچاس ہزار سے زائد ہے۔ جمہوریہ ترکی کا دارالسلطنت انقرہ ہے جو ملک کے ہر حصے سے ریلوں، سڑکوں اور ہوائی راستوں سے ملا دیا گیا ہے۔ شہر کی آبادی ۲۲ لاکھ ہے۔ یہاں سیمنٹ و لوہے کے کارخانے ترقی پذیر ہیں۔ مغربی ساحلی میدان پر واقع ازمر اور عدنان شہروں کی آبادی بھی بالترتیب ۸½ لاکھ اور ۸ لاکھ ہے اور دونوں بہت تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔

احمد نثار جنگیری

لاحول ولاقوۃ

ہر وقت یہ شرارت لاحول ولا قوۃ
یہ بھی ہے کوئی عادت لاحول ولا قوۃ
بچوں میں بھی عداوت لاحول ولا قوۃ
آپس میں بغض و نفرت لاحول ولا قوۃ
پڑھنے کا وقت تم کو ملتا نہیں عزیزو
ہے کھیلنے کی فرصت لاحول ولا قوۃ
یہ جھوٹ بولنا کچھ اچھا نہیں ہے بچو!
اچھی نہیں یہ خصلت لاحول ولا قوۃ
بکری جو کھو گئی ہے مکتب میں ڈھونڈتے ہو
اللہ رے حماقت لاحول ولا قوۃ
ماں باپ سے تم اپنے کرتے ہو جا کے بچو
استاد کی شکایت لاحول ولا قوۃ
اپنے کیے پہ نادم ہوتا نہیں تھا الوزر
اچھی بنی حجامت لاحول ولا قوۃ
بھائی سے آج بھائی آپس میں لڑ رہا ہے
یہ دوری محبت لاحول ولا قوۃ
دیکھو نثار دنیا کس سمت جا رہی ہے
یہ اور بھی ہے آفت لاحول ولا قوۃ

بسیرا چندن پور کھوریا بازار نوتنوا گورکھپور

صمد بہرنگی (ایران)
ترجمہ: ڈاکٹر شعیب اعظمی

آخری قسط

کالی مچھلی بولی: "تم لوگوں کی عقل ماری گئی ہے۔ میرا گلا گھونٹ دو، پھر بھی بھاگنے کا راستہ نہیں پاؤ گی، اس کے دھوکے میں نہ آؤ۔"

چھوٹی مچھلیوں نے کہا: "تم یہ بات اس لیے کہہ رہی ہو کہ اپنی جان بچالو، در اصل تمھیں ہماری فکر نہیں ہے۔"

چھوٹی کالی مچھلی بولی: "ذرا غور سے سنو، میں تمھیں ایک ترکیب بتاتی ہوں۔ میں تھیلی میں پڑی ہوئی مچھلیوں کے بیچ مُردہ بن کر پڑ جاتی ہوں۔ معلوم ہو جائے گا کہ سقا چڑیا تم لوگوں کو چھوڑتی ہے یا نہیں، میری بات نہ مانی تو میں اس خنجر سے تم سب کو قتل کر ڈالوں گی یا تھیلی کو چیر پھاڑ کے خود باہر نکل جاؤں گی اور تم سبھوں کو......"

ایک مچھلی بیچ میں چلّا کر بول پڑی۔ "بس کرو، بس! میں ان باتوں کو برداشت کرنے کی تاب نہیں رکھتی۔" اوہو، اوہو کر کے رونے لگی۔

چھوٹی کالی مچھلی نے اُس کو روتا دیکھ کر کہا: "اس ننھے لاڈلے کو تم لوگ اپنے ساتھ کیوں لائے؟" پھر اُس نے اپنا خنجر نکالا اور چھوٹی مچھلیوں کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ اب انھوں نے کالی مچھلی کے پلان کو قبول کر لیا۔ جھوٹ موٹ آپس میں مار پیٹ کرنے لگیں۔ کالی مچھلی مُردہ بن گئی۔ مچھلیاں اوپر آئیں اور بولیں۔

"بیگم صاحبہ! ہم نے کالی بکواسن کا گلا گھونٹ دیا۔"

سقا چڑیا ہنسی اور بولی۔ "تم نے خوب کام کیا۔ اس کی سزا میں، میں تم سب کو زندہ نگل جاؤں گی، تاکہ میرے پیٹ میں آسانی سے سما جاؤ۔"

چھوٹی مچھلیوں کی ہمت ٹوٹ گئی۔ سقا چڑیا آسانی سے انھیں نگل گئی۔ اُن کا کام تمام ہو گیا۔

لیکن کالی نے اپنا خنجر نکالا اور ایک ہی وار میں تھیلی کا پردہ چاک کر دیا۔ پھر نکل گئی۔ سقا چڑیا درد کی تکلیف سے کراہنے لگی اپنا سر پٹکتی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ چھوٹی کالی مچھلی کا پیچھا نہ کر سکی۔

کالی مچھلی چلی گئی، چلتی ہی رہی یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی۔ پہاڑ اور درے کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ دریا ایک میدان سے گزر رہا تھا۔ دائیں بائیں سے کچھ دوسری نہریں اور نالے آکر ہموار ہو گئے تھے اور پانی کی سطح برابر ہو گئی تھی۔ کالی مچھلی بھرپور پانی کا مزہ لے رہی تھی۔ اچانک اُس نے دیکھا کہ پانی گہرا ہو گیا ہے۔ اِدھر گئی اُدھر گئی مگر کسی جگہ ٹھہر نہ سکی۔ پانی اتنا تھا کہ چھوٹی مچھلی اُس میں گم ہو کر رہ گئی۔ خوب خوب تیرتی رہی، پھر بھی اُس کو کنارا نہ ملا۔ اچانک اُس نے دیکھا کہ ایک لمبا اور بڑا جانور

بجلی کی طرح اُس پر حملہ آور ہے۔ ایک بڑے سے جبڑے والا گھڑیال اُس کے منہ پر تھا۔ چھوٹی مچھلی نے سوچا بس ابھی گھڑیال اُس کی بوٹی بوٹی کر ڈالے گا۔ اُس نے فوراً اپنے آپ کو ایک جھٹکا دیا اور جگہ سے ہٹ کر پانی کی تہہ میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد سمندر کی تہہ کا پتا لگانے چل دی۔ راستے میں مچھلیوں کے ایک جھنڈ کو دیکھا۔ ہزار ہا ہزار مچھلیاں تھیں اُن میں سے ایک سے پوچھا۔

"دوست! میں مسافر ہوں۔ دُور سے چلی آ رہی ہوں، یہ کون سی جگہ ہے؟"

مچھلی نے اپنی ساتھیوں کو آواز دی، دیکھو ایک اور..."

پھر کالی مچھلی سے بولی۔ "دوست! سمندر میں آنا مبارک ہو۔"

مچھلیوں میں سے دوسری نے کہا۔ "ساری ندیاں اور نہریں یہیں آکر ملتی ہیں۔ البتہ اُن میں سے کچھ دلدل میں بھی ملتی ہیں۔"

ایک اور بولی۔ "تمہارا دل چاہے تو تم ہمارے گروہ میں شامل ہو سکتی ہو۔"

چھوٹی مچھلی خوش تھی کہ سمندر میں پہنچ گئی ہے۔ بولی۔ "اچھا، پہلے میں ایک چکر لگا لوں۔ بعد میں آکر تم لوگوں کے گروہ میں شامل ہو جاؤں گی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تم لوگ مچھیرے کا جال لے کر بھاگو تو میں بھی تم لوگوں کے ہمراہ رہوں۔"

مچھلیوں میں سے ایک بولی۔ "تمھاری آرزو جلد پوری ہو گی، ابھی تو جاؤ اور گھوم پھر آؤ۔ پانی کے اوپر مچھلی خور پرندے سے ہوشیار رہنا۔ وہ آج کل کسی کو خاطر میں نہیں لاتا ہے۔ دن میں چار پانچ مچھلیوں کا شکار کر لیتا ہے۔ یہاں سے ٹلتا نہیں ہے"

کالی مچھلی، مچھلیوں کے جھنڈ سے جدا ہو کر تیرنے میں مشغول ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے لیے سمندر کی سطح پر آئی۔ سورج تپ رہا تھا۔ وہ اپنی پیٹھ پر جھلسا دینے والی گرمی محسوس کر رہی تھی۔ اور لطف لے رہی تھی۔ مطمئن اور خوش سمندر میں تیر رہی تھی اور اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

"اس وقت موت بڑی آسانی سے میری تلاش میں آ سکتی ہے لیکن جہاں تک مجھ سے ہو سکتا ہے زندہ رہوں اور موت کا سامنا نہ کروں۔ کبھی مجبوراً موت سے میرا سامنا ہو جائے تو کوئی بات نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ میری زندگی یا موت دوسروں کی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔"

چھوٹی کالی مچھلی کے خیال کا سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکا۔ مچھلی خور پرندہ آیا اور اُسے اُٹھا کر چلتا بنا۔ چھوٹی مچھلی پرندے کی لمبی چونچ کے درمیان ہاتھ پاؤں مارتی رہی، لیکن اپنے آپ کو چھڑا نہ سکی۔ مچھلی خور پرندے نے اُس کی کمر کو اتنی سختی سے پکڑ رکھا تھا کہ اُس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ آخر ایک چھوٹی مچھلی کب تک پانی کے باہر زندہ رہ سکتی تھی۔ چھوٹی مچھلی نے سوچا۔ کاش یہ پرندہ اسی وقت مجھے نگل جائے تاکہ میرے پیٹ کی تھوڑی سی غذا اور پانی چند منٹ کے لیے موت کو ٹال دے۔ اسی خیال کے تحت مچھلی خور پرندے سے بولی:

"کیوں مجھے زندہ نگل نہیں جاتے؟ میں اُن مچھلیوں میں ہوں جن کا بدن مرنے کے بعد زہریلا ہو جاتا ہے۔"

پرندہ کچھ نہ بولا اور سوچنے لگا۔ "اری بہانہ باز، تیری بہانہ بازی میں کچھ ترکیب ضرور ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھے بہکا کر بھاگ جانا چاہتی ہے۔"

دور سے خشکی نظر آنے لگی تھی اور نزدیک سے نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔ چھوٹی کالی مچھلی نے سوچا۔ اگر ہم خشکی پر پہنچ گئے تو پھر کام تمام ہے، اس لیے وہ جلدی سے بولی:

"میں جانتی ہوں کہ تم مجھے اپنے بچوں کے لیے لے جانا چاہتے ہو، لیکن جب تک ہم خشکی پر پہنچیں گے میں تو مر جاؤں گی اور میرا بدن زہریلا بن جائے گا، تم کیا اپنے بچوں پر رحم نہیں کرتے؟"

مچھلی خور نے سوچا۔ "احتیاط اچھی چیز ہے۔ تجھے میں خود کھاؤں گا اپنے بچوں کے لیے دوسری مچھلیاں پکڑ لوں گا لیکن دیکھتا ہوں تیری چال بازی کیسے کارگر ہوتی ہے، تو کچھ نہیں کر سکتی۔"

مچھلی خور پرندہ انھیں خیالوں میں تھا کہ کالی مچھلی سست اور بے حرکت ہو گئی۔ اُس نے یہ کیفیت دیکھی تو سوچنے لگا۔

"کیا مر گئی؟ اب تو میں بھی اسے نہیں کھا سکتا۔ مچھلی اور ایسی نرم و نازک مچھلی کو میں نے حرام کر لیا۔"

اُس نے مچھلی کو پکارا تاکہ اُس سے یہ کہہ سکے: "آہا ہا چھوٹی

مچھلی تو ابھی تھوڑی بہت زندہ ہے کہ میں تجھے کھا سکوں۔"

لیکن وہ اپنی بات پوری نہیں کر سکا۔ جیسے ہی اُس نے اپنی چونچ کھولی، کالی مچھلی نے چھلانگ لگائی اور نیچے گر پڑی۔ مچھلی خور نے یہ دیکھا تو فوراً اُس کے پیچھے اُڑا۔ مچھلی سمندر کے پانی اور نم ہوا سے اپنے سوکھے ہونٹوں کو تر کر رہی تھی اور تازہ سانس لے رہی تھی کہ مچھلی خور بجلی کی طرح اُس پر ٹوٹا اور اس بار اُسے اس طرح پکڑا کہ مچھلی تھوڑی دیر تک یہ نہ سمجھ سکی کہ اُس کے سر پر کون سی آفت آ پڑی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر طرف اندھیرا ہے کوئی راستہ نہیں ہے اور رونے کی آواز آ رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں اُس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں تو ایک ننھی سی مچھلی کو دیکھا جو ایک کونے میں بیٹھی رو رہی تھی اور اپنی ماں کو بلا رہی تھی۔ چھوٹی مچھلی قریب گئی اور بولی۔

چھوٹی مچھلی: "کھڑی ہو جا، کوئی ترکیب کر، رو رہی ہے، اپنی اماں کو چاہتی ہے یا پھر اور کچھ؟"

مچھلی بولی: تم کون ہو؟ . . دیکھتی نہیں، میرا خاتمہ ہو رہا ہے اوہو، اوہو، اوہو . . . اماں . . . اماں . میں اب تیرے ساتھ سمندر میں نہیں آ سکتی کہ مچھیرے کے جال کو سمندر میں لے جاؤں۔ اوہو اوہوں . . . !

چھوٹی کالی نے کہا۔ "بس کرو بی بی، بس! تم نے تو مچھلیوں کی رہی سہی عزت خاک میں ملا دی۔ میں چاہتی ہوں مچھلی خور پرندے کو مار ڈالوں اور مچھلیوں کو نجات دلاؤں۔ لیکن تجھے پہلے باہر نکالنا ضرور ہے کہ بے عزتی نہ ہو۔"

چھوٹی سی مرتی ہوئی مچھلی نے کہا: "تم تو خود مر رہی ہو مچھلی خور کو کیسے مارو گی؟" چھوٹی کالی نے اپنا خنجر نکالا اور بولی:

"اِس سے اُس کا پیٹ پھاڑ ڈالوں گی۔ اب کان کھول کر سُن میں کیا کہہ رہی ہوں۔ میں اِس طرف اُس طرف اُلٹنا پلٹنا شروع کروں گی تاکہ مچھلی خور پرندہ پریشان ہو اور جیسے ہی اُس کا منھ کھلے وہ زور زور سے ہنسنے لگے تو باہر نکل جانا۔"

چھوٹی مچھلی نے کہا: لیکن تیری بات! اور تو کس جگہ؟

چھوٹی کالی نے کہا: میری فکر نہ کر میں جب تک اس بدذات کو مار نہ ڈالوں گی تب تک باہر نہیں آؤں گی۔"

چھوٹی کالی نے اِدھر اُدھر کروٹیں بدلنا شروع کر دیا اور مچھلی خور پرندے کے پیٹ میں ہلچل مچا دی۔ مچھلی خور کے معدے کے سرے پر پہنچ کر کھڑی ہو گئی۔ مچھلی خور نے اپنا منھ کھولا اور زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ چھوٹی مچھلی اُس کے منھ سے باہر کود گئی۔ تھوڑی دیر تک وہ پانی میں پہنچ کر انتظار کرتی رہی مگر کالی مچھلی کا کہیں پتا نہ چلا، اچانک دیکھا کہ مچھلی خور تڑپ رہا تھا اور تڑپ تڑپ کر فریاد کر رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں مارنے لگا، اس کے بعد پانی پر چت گر پڑا۔ پھر پھڑپھڑایا اور پھر بے حرکت ہو گیا، لیکن پھر کبھی کالی مچھلی کا کچھ اتا پتا نہ تھا۔ دیر تک اُس کی کوئی خبر نہ ملی۔

بوڑھی مچھلی نے اپنا قصّہ ختم کیا اور اپنے بارہ ہزار بچوں اور نواسوں سے کہا۔

"اب سونے کا وقت ہو گیا ہے، بچو! جاؤ سو جاؤ۔"

بچوں اور نواسوں نے کہا۔ "دادی اماں! آپ نے یہ تو بتایا کہ وہ دوسری چھوٹی مچھلی کیا ہوئی؟"

بوڑھی مچھلی نے کہا: "بھئی! اب اُس کا قصّہ کل رات کو۔ شب بخیر۔"

گیارہ ہزار نو سو ننانوے چھوٹی مچھلیوں نے شب بخیر کہا اور سو گئیں۔ بڑی اماں کو بھی نیند آ گئی۔ چھوٹی لال مچھلی نے بہت کوشش کی مگر نیند نہیں آئی۔ وہ ساری رات سمندر کے بارے میں سوچتی رہی۔ (ختم)

رفیق عابد (زاہدی)

(کلیلہ دمنہ)

بچو! آج ایک دل چسپ کہانی سُنیے۔

ہمارے پیارے ملک ہندستان میں نہ کھیت اور باغوں کی کمی ہے، نہ ندی نالوں کی، ہر طرف نہروں کا جال سا پھیلا ہوا ہے۔ بڑے بڑے دریاؤں کی ہر طرف چادریں بچھی ہوئی ہیں۔ سمندروں کی نیلی قالینیں، سبز جھالروں سے بھی سجائی، ناریلوں کے جھنڈ سے آراستہ ہمارے ملک کی خوب صورتی میں قدم قدم پر اضافہ کر رہی ہیں۔ پہاڑوں کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ ہے جو سلسلہ در سلسلہ الجھی ہوئی زنجیروں کی طرح۔ جنگلوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے جن میں چھوٹے بڑے ضرر جانوروں سے لے کر، ہاتھی، گینڈے، تیندوے، چیتے، بھالو، شیر ببر، اُجلے گالے شیر وغیرہ وغیرہ کیا نہیں ہیں۔ پرندوں کی سب قسمیں پائی جاتی ہیں۔ چرندوں میں گائے، بیل، بھینس، بکری، بھیڑ اور دُنبے، ہرن، سانبھر سبھی کچھ ہیں۔

ایسے ہی ایک بڑے جنگل میں جس میں ہر قسم کے جانور بھرے پڑے تھے۔ سب جانوروں نے ووٹ دے کر گیدڑ کو اپنا راجا اس لیے مان لیا تھا کہ وہ جانوروں میں سب سے زیادہ چالاک تھا۔ ہاتھی، شیر اور گینڈے سے قد و قامت اور طاقت میں تو بہت کچھ تھے۔ لیکن عقل اور چالاکی کے معاملے میں گیدڑ سب سے بڑھا چڑھا تھا۔ اس لیے وہ راجا مان لیا گیا۔

گیدڑ نے لومڑی کو اپنا وزیر بنا لیا۔ کیوں کہ لومڑی مکاری اور چالاکی میں گیدڑ کے کان کاٹتی ہے۔

اور جانوروں نے اس پر اعتراض بھی کیا اور مانگ بھی کی کہ ہر قسم کے جانوروں کا الگ الگ وزیر ہونا ہی چاہیے تاکہ وہ ہمارے حقوق کی دیکھ ریکھ کرتا رہے اور ہمارا نمائندہ بھی الگ ہونا چاہیے تاکہ ہمیں ایسے نمائندوں پر اختیار رہے کہ اگر وہ راج دربار میں پہنچ کر ہمارے فائدے کی بات نہیں کرتے تو ہم اُن کا بائیکاٹ کر دیں، اس کو دربار سے واپس بلائیں اور دوسرا کام کا نمائندہ بھیج دیں، جس پر ہمیں اطمینان ہو۔

گیدڑ نے جواب دیا۔

"سنو! یہ انسانوں کا من گھڑت دستور ہے اور اس دستور سے آج سارے انسان سر پکڑے ہوئے رو رہے ہیں۔ ہم جانور ضرور ہیں مگر اتنی عقل تو رکھتے ہیں کہ ایک ریاست میں جب ۲۵ وزیر ہوں گے تو ہر وزیر ملک اور قوم کا فائدہ سوچنے سے زیادہ صرف اپنی کرسی کی سوچے گا اور وزیر اعظم بننے کے پھیر میں رہے گا اور وزیر اعظم راجا بننے کی کوشش کرے گا اور اس فکر میں رہے گا کہ وہ یا اُس کا خاندان ہمیشہ ملک کا سربراہ رہے۔

نمائندوں کی کثرت اور الگ الگ نمائندگی کے معنے یہ ہیں کہ ہر نمائندہ محض اپنی برادری کا گیت گائے گا۔ دودھ والا دہی والوں سے ترش رُو رہے گا اور دہی والا گھی والوں کا منہ کبھی چکنا نہ دیکھ سکے گا۔

یاد رکھو! اگر ہم نے تمہاری مانگ پوری کر دی تو کل ہی جنگل کی برادری میں پھوٹ پڑ جائے گی اور کچھ دنوں کے بعد ہر چوہا خود کو شیر اور ہر گلہری خود کو ہاتھی سمجھنے پر مجبور ہو گی۔

میں جنگل کا راجا اس لیے نہیں ہوں کہ میں ہاتھی سے بڑا
یا شیر سے زیادہ طاقت ور ہوں۔ میں ان کے مجبوروں یا بڑوں
پر حکومت کروں گا۔ نہیں بلکہ ہاتھیوں سے چیونٹیوں کی
حفاظت کا کام لوں گا۔ شیر بکری کو ایک گھاٹ پر پانی پلائے
گا۔ بچے خواہ کسی نسل کے ہوں وہ ہمارا قومی سرمایہ ہیں۔
شیر ان کو شیری سکھائے گا۔ ہاتھی ان کو عزم و استقلال اور
خودداری، خودمختاری اور خودکفالتی کی تعلیم دیں گے۔
اور اپنی خوبو سکھائیں گے۔

ہم انسان نہیں جانور ہیں۔ انسان نے مکاری کا نام سیاست
رکھ چھوڑا ہے۔ خودغرضی کا نام اُن کے نصاب کی کتاب میں
عقل مندی ہے۔ انسان فطرتاً لالچی ہے۔

ابھی گیدڑ کی باتیں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ اُس کا بڑا
بیٹا "کلیلہ" کھسک کے اور اُس کے قریب آ گیا۔

یہ دیکھ کر "دمنہ" لومڑی کا منجھلا بیٹا بھی اپنی چھوٹی
سی موٹی دُم کو کچھ اور پھُلائے ہوئے اپنے دوست "کلیلہ"
کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور غور سے بزرگوں کی باتیں سُننے لگا

یکایک لومڑی بولی۔

"ہم لوگ اپنے راجا کا بھاشن پھر سُنیں گے اور اطمینان
سے سُنیں گے۔ اپنے پیارے راجا کے اشارے پر میں
اپنی وزارت کے بارے میں کچھ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں۔

شریمان مہاراج کا چناؤ اس لیے عمل میں آیا ہے
کہ یہ دن بھر جنگل میں امن و امان بحال رکھنے کی تدبیریں سوچتے
ہیں اور رات بھر اپنی رعایا کی حفاظت کے لیے پہرہ دیتے
ہیں اور خطرے کی بُو پاکر "ہواں ہواں" کا سائرن اس
طرح بجاتے ہیں کہ ان کے بہت سے اہالی، موالی اور
ندیم و مصاحب بھی شور قیامت برپا کر دیتے ہیں۔ جنگل
کی فضا گونج اُٹھتی ہے اور خواب خرگوش میں مبتلا
جانور اپنی حفاظت کا بندوبست کر لیتے ہیں۔

اب رہی میں، تو راجا نے خصوصیت سے مجھے اس
لیے وزیر چُنا ہے کہ میں بھی رات کو جاگتی ہوں۔ اپنا
جواب نہیں رکھتی۔ دن بھر میں اپنے بھٹ میں پڑی
سوتی ضرور نظر آتی ہوں لیکن میرا دل و دماغ جاگتا رہتا ہے
اور میں ہمیشہ چوکنا رہتی ہوں۔

میں اپنے جاگتے ذہن سے بارہا یہ سوچ کر حیران رہ
گئی ہوں کہ آخر انسان اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کیوں
سمجھتا ہے؟

"دمنہ:" کیا انسان آج بھی اپنے کو اشرف المخلوقات
سمجھتا ہے؟"

لومڑی: "ہاں! اُس کی یہی غلط فہمی اُس کی سب سے
بڑی بدنصیبی ہے!"

کلیلہ: "انسان کیا ہے؟ کیسا ہوتا ہے؟ میں نے
تو آج تک اُسے دیکھا نہیں ہے!"

"میں کسی دن دُور سے تم دونوں کو اُس کی صورت
دکھا دوں گی۔ لیکن تم کبھی اُس کے قریب نہ جانا۔ وہ لاکھ
دوستی کا دم بھرے لیکن وہ کسی کا دوست نہیں۔ پہلے اُس کے
بارے میں میری باتیں دھیان دے کر سنو!

یہ ابتدائی زمانے میں اِس لیے اشرف المخلوقات تھا کہ
اس کی قوّت حیوانیہ (یعنی حیثیت) تمام جانوروں کے مقابلے
میں زیادہ تھی لیکن جوں جوں وہ فطرت اور جبلّت سے
دور ہوتا گیا اور اصلی انسان کی جگہ پر نقلی اور مصنوعی انسان
بنتا گیا اُس کی قوّت حیوانیہ اُس سے چھنتی گئی۔ اب ہماری
جس خصوصیت اور طاقت کی بنا پر وہ اشرف المخلوقات بنا
پھرتا تھا وہ بات جب اُس میں باقی نہ رہی، تو وہ خوف،
لالچ، خودغرضی اور حرص و حسد کا شکار ہو گیا۔ اُس کی اپنی
جسمانی قوّت جب گھٹ گئی تو اس نے تیر، تلوار، بھالا، خنجر، جال
اور توپ تفنگ کا سہارا لیا۔ ورنہ اُس کی کمزوری اور
بُزدلی کا یہ حال ہے کہ معمولی سی شہد کی مکھی، چیونٹی اور
سانپ بچھو سے ڈرتا ہے۔ ایک مچھر سے بدحال رہتا ہے
ایک کھٹمل کی تاب نہیں لا سکتا۔ ایک پسّو سے اپنی
جان چُرائے پھرتا ہے۔

اُس میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ جانوروں کی طرح
جنگل، پہاڑ یا کسی سرزمین میں اپنی روزی اپنی قوتِ بازو

سے حاصل کرے۔ اس لیے عیاری، مکاری اور دغابازی سے کام لیتا ہے۔ حرام خوری کی بنا پر خدا اور خدا کے رازق ہونے پر سے اُس کا ایمان اور عقیدہ اُٹھ گیا اور وہ مادّہ پرست ہو گیا۔ مادّہ پرستی نے اُس میں سونا چاندی زر و جواہرات کی حرص بڑھا دی۔ اب وہ صرف انھیں چیزوں کو پوجتا ہے۔ وہ اس کو چبا نہیں سکتا۔ اس لیے کھاتا نہیں ہے۔ پھر بھی اُس کا پیٹ قارون کا وہ گھڑ کا خزانہ ہے جو روپوں پیسوں سے کبھی نہیں بھرتا۔ اب یہ مال مسالہ کاغذی ہنڈیوں کی شکل میں اُس کے ہاتھ آتا ہے جس کو وہ گاڑ کر اُس پر روزانہ گھی کے چراغ نہیں جلا سکتا۔ اس لیے انسانوں کی حکومتوں نے کچھ نیچے بھوکے حریص انسانوں کو بنک کھولنے کا پروانہ دیا۔ کمائی کا بڑا حصہ بنک یا لاکان اور حکومت کے خزانے میں جاتا ہے۔ بھاگے بھوت کی لنگوٹی بھلی کے مصداق تھوڑا منافع بچی بچی لوگوں کے ہاتھ بھی آجاتا ہے

اس رنگا رنگ کے جانور (انسان) کے دماغ سے اب تک اشرف المخلوقات کا بھوت نہیں اُترا۔ حالانکہ وہ اتنا گر چکا ہے کہ حکومت، زر، زمین، زن، اقتدار اور مال و دولت کے لیے باپ بیٹے کا، دادا پوتے کا، بھائی بھائی کا بہن بہن کا، بہن بھائی کا، بیٹا، باپ اور دادا کا خون بہاتا رہا پھر بھی وہ خود کو انصاف پسند اور خدا کا سایہ کہلانے کے خبط میں مبتلا رہا۔

یہ انسان دولت کا اتنا بڑا بھوکا ہے کہ اس نے بڑے بڑے کارخانے، ملیں، کمپنیاں اور کوٹھیاں قائم کر رکھی ہیں۔ یہ کھانے پینے کی چیزوں میں زہر ملا کر بھی روپے حاصل کرتا ہے۔ یہ دواؤں کی شیشیوں میں پانی اور تیزاب ملا کر اور کھانے کے تیل، گھی میں تو اڑا کر کراسن آئیل اور موبل ملا کر پیسہ کماتا ہے۔ ایک طرف یہ الکشن لڑنے کے لیے کچھ روپے دیتا ہے اور دوسری طرف اسمگلنگ اور کالے دھندے سے تجوری بھرتا ہے۔ نہ یہ ملک کا وفادار ہے اور نہ قوم کا اور نہ ملک کے وقار کا اس کو ذرہ برابر

خیال ہے۔ یہ آبادی میں انسانوں کا شکار کھیلتا ہے اور اُن کے چمڑوں سے نہیں مگر خون سے ضرور روپے کماتا ہے۔ فساد کرا کے دکانیں اور مکانات لوٹے جاتے ہیں۔ یہ کسی کے کام بھی آتے ہیں تو رشوت میں روپے لے کر۔ حکومت سے کام چوری کے باوجود اُجرت لیتے ہیں اور کام عوام سے رشوت لے کر کرتے ہیں۔

کبھی یہ نیتا بن کر لوٹتے اور فساد کی آگ بھڑکاتے ہیں کبھی یہ کرسی سے اُس کرسی پر اُچکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دعوا ملک و قوم کی نمائندگی کا کرتے ہیں لیکن سب کچھ اپنے پیٹ اور جیب کے لیے کرتے ہیں۔

یہ جب انسان کہلا کر انسانوں کے نہیں تو ان سے ہم جانور کسی نیکی کی اُمید کیوں رکھیں۔

کلیلہ اور دمنہ: پھر ہم لوگوں کو کیا کرنا چاہیے؟

گیدڑ (راجا): میرے بچو! (تم سب کے سب) جو اس وقت یہاں موجود ہو۔ اُنی باتیں ہمیشہ یاد رکھو!

"تم جانور ہو اور خالص جانوروں کی اولاد ہو۔ اگرچہ تم میں کوئی پیغمبر نہیں ہوا۔ لیکن تم میں کوئی شیطان بھی نہیں آیا۔ اور جب شیطان نے دیکھا کہ انسان اب اپنے آپے میں نہیں اور شیطان کا مقصد پورا ہو چکا ہے تو اُس نے اطمینان سے خودکشی کر لی۔ اُس کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی اور شیطان غیرت کے مارے بھی مر گیا جب کہ خود اس کا سکھایا پڑھایا انسان شیطان سے بہت اونچا ہو چکا تھا۔

تو پیارے بچو! ہم ازل سے توحید پرست ہیں اور اپنے خالق اور رازق پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ نہ زمین کے لیے جھگڑا کرتے ہیں نہ زر کے لیے۔ نہ کسی کے گھر میں چوری کرتے ہیں نہ ڈاکے ڈالتے ہیں اور نہ جھوٹی عزت اور شہرت کے لیے کشت و خون کرتے ہیں۔ انشاء الٰہی اور قانونِ فطرت کے مطابق اپنے حال اور اپنی کھال میں مست ہیں۔

چوں کہ ہم لوگ فطری اور قدرتی قانون کے مطابق

زندگی گزارتے ہیں، اس لیے انسانوں کی طرح عقیدوں کا بھی اختلاف نہیں ہے۔ اس کی مصنوعی زندگی سراسر جھوٹی ہے اس لیے ہر انسان کا عقیدہ الگ ہے اس لیے اس کا لباس بھی الگ ہے۔ خیال بھی اور زبان بھی۔ وہ کبھی ایک خیال یا ایک بات پر متحد اور متفق نہیں ہو سکتا۔

ہمارے جنگلی قانون کے مطابق صرف ایک راجا کافی ہے جو راجا کا راجا اور جو کی دار کا جو کی دار ہو۔ اور صرف ایک وزیر کافی ہے جس ملک میں وزیروں کی بھرمار ہوتی ہے، وہاں ٹرینیں لڑتی رہتی ہیں۔ اور گاڑیاں الٹتی رہتی ہیں، ورنہ وزیر لڑتے رہتے ہیں اور جنتا کا تختہ الٹتا رہتا ہے۔

وزیر غذائیات اجناس کے بڑے بڑے اسٹاک اور ملک کا کنکر پتھر سب ہضم کر جاتا ہے اور جنتا پیٹ پر پتھر باندھ کر صرف مہنگائی اور نایابی کا رونا روتی رہتی ہے۔ ان کو سیر و سیاحت اور آگے سرکنے کے چکر سے اتنی فرصت کہاں؟ فرصت ہوتی تو دو چار رلیاں اور منا لیتے یا روس، امریکا جا کر بیٹھے بنک میں وقت ضرورت کے لیے کچھ جمع کر کے ڈنر کھاتے اور بھاشن دیتے اور ملک کی بگڑی بات کو اپنی لڑائی اونچی کرتے۔

انسانوں کا بنایا ہوا ہر ازم چاہے وہ کمیونزم ہو، سوشلزم یا کچھ اور ہی ازم ہو، یہ سب الگ الگ ہی پکائی ہوئی کھچڑی ہے۔ اور نہ ان کا کوئی ڈھانچا متعین ہے۔ برطانیہ کی جمہوریت تاج شاہی کے زیر سایہ ہے۔ فرانس کا رنگ روپ الگ تھلگ ہے۔ امریکا کی جمہوریت یہود نوازی اور ریڈ انڈین کی سرکوبی اور ویت نام میں اپنی پسپائی کے غم و غصّہ کے درمیان سولی پر لٹکی ہوئی ایک نادیدہ طاقت کی پھنکار سے مشابہ ہے۔

روس کی اشتراکیت چین سے مختلف ہے۔ چنگیزیت کی کوئی شکل متعین نہیں۔ وقت کی ہوا کے گھوڑے پر سوار ملک گیر ہلاکو ہر دور میں نئے نئے چولے میں آتے رہے ہیں اور آئیں گے۔

تم ان انسانوں کی نقالی کبھی نہ کرنا۔ یہ نقالی میں پہلے بندر ہیں، بعد کو آدمی۔ ان کے یہاں گورے کالے کا فرق ہے، لال پیلے کا فرق ہے۔ یہ غاصب اور دغاباز بھی ہیں۔ دوسرے کے ملکوں میں زبردستی گھس بیٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ املاک و وطن پر اپنا جھنڈا گاڑ کر وارثان ملک کو غلام بنا لیتے ہیں اور مونچھیں اینٹھ کر اپنی برتری کے دعوا کے ساتھ اپنی جمہوریت پسندی کا ڈھول بھی پیٹتے ہیں۔

جانوروں میں گورے کالے کا کوئی امتیاز نہیں۔ کالی گائے، سفید گائے، کالی بکری، سفید بکری، کالی بھیڑ، سفید بھیڑ سب ایک ہیں۔

ذات کی حیثیت سے سب جانور کی صف میں ہیں۔ چیونٹی یا ہاتھی سب برابر ہیں۔ مست ہاتھی بھی کسی چیونٹی کو جان بوجھ کر روندنے کی کوشش نہیں کرتا۔ نہ ہرن کو کچلتا ہے اور نہ جنگل کے کسی اور جانور سے چھیڑ خانی کرتا ہے۔ شیر اپنے پالنے والے کے سامنے بھیگی بلی، ہاتھی اپنے پالنے والے کا وفادار، پالنے والے زہریلے سانپوں کو بھی پال لیتے ہیں اور سانپ ان کو ضرر نہیں پہنچاتا۔ کتے اپنے مالک کے لیے جان تک دے دیتے ہیں کیونکہ وہ صرف حیوان ہیں اور انھوں نے اپنی جنس میں سے کسی کو بھی احسان فراموش، محسن کش، خود غرض اور لالچی نہ پایا یا نہ دیکھا۔ اور ان حیوانوں کے سر پر نام نہاد اشرف المخلوقات کا تاج ہے۔ وہ تو سیدھے سیدھے نرے حیوان ہیں۔ پیدا کرنے والے نے جو رزق ہمارا مقرر کر دیا ہے حیوان اسے حاصل کرتے اور کھاتے ہیں۔"

کلیلہ و دمنہ: "شیر بھی تو ہرنوں کو مار کر کھا جاتا ہے۔ کل ہمارے ہرن کے بچے کے باپ کو شیر اٹھا لے گیا اور ہمارے میمنہ کی ماں کو بھیڑیا چٹ کر گیا۔ کیا یہ بربریت اور ظلم نہیں ہے؟"

لومڑی: میں اس کا جواب کل دوں گی۔

(باقی آئندہ)

عبدالملک فاروقی

شہزادہ رُمّان

(چوتھی قسط)

اسی دن شام کو مصری شہزادہ اپنے وطن واپس لوٹ گیا۔ ادھر پورے خراسان میں ایک کہرام برپا ہوگیا تھا۔ کوئی بھی اپنے نیک دل شہزادے کو ملک سے باہر بھیجنے پر تیار نہ تھا، مگر سب بادشاہ کے فیصلے سے مجبور تھے۔ مصری شہزادے کے جاتے ہی بادشاہ فیروز بخت نے ایک اور اعلان کردیا کہ شہزادہ رمّان اور وزیر زادہ حارث اگلے ماہ نیا چاند نظر آتے ہی روانہ ہو جائیں گے۔ اس وقت تک مصری شہزادے کا بھیجا ہوا سامان سفر بھی پہنچ جائے گا۔ شہزادہ رمّان کے لیے ایک بہت عالیشان پانی کا جہاز بنانے کا حکم دیا گیا۔ مچھلی پکڑنے کے لیے نئے نئے جال آنے لگے، بڑے بڑے ماہی گیر آئے اور انھوں نے ان کو مچھلی پکڑنے کی نت نئی ترکیبیں سکھائیں۔

ابھی سفر میں ایک مہینا باقی تھا، ان دونوں کو مزید جنگی داؤ پیچ سکھائے گئے۔ حالاں کہ دونوں ماہر گھوڑ سوار تھے، بہترین تیر انداز و تلوار باز تھے۔ وزیر اعظم اَبوذر کئی سو زبانیں جانتا تھا۔ اس نے یہ ساری زبانیں حارث کو سکھلا دیں، جو جنگلی، پہاڑی، سمندری، خشکی اور تمام دنیا میں بولی جانے والی زبانیں تھیں، دانا حکیموں سے علاج معالجہ سیکھا اور بھانت بھانت کے قصے کہانیاں سنانا تو اس کا خاص مشغلہ تھا۔

پلک جھپکتے ہی یہ مہینا بیت گیا، نیا چاند بھی نظر آگیا، دوسرے دن شام کو ان کی روانگی تھی، روانگی کے دن صبح ہی صبح مصری جہاز آپہنچا، جس میں مصری شہزادے نے وعدے کے مطابق سفر کا سامان بھیجا تھا۔ گیہوں، شکر، چاول، کھجور میوہ وغیرہ کی سیکڑوں بوریاں جہاز میں لدی ہوئی تھیں ہزاروں ڈرم گھی، چربی اور تیل سے لبالب تھے۔ لاتعداد موتیوں کی بوریاں تھیں، جنھیں بیچ کر دوسرے ملکوں کا سامان خریدا جاسکتا تھا۔ غرض زندگی اور زندہ رہنے کی ہر چیز موجود تھی۔ جہاز کے ساتھ آتے ہوئے مصری عالم نے سمندر اور خشکی کے تمام راستے ان کو سمجھائے دو نقشے جس میں ایک خشکی کا تھا اور ایک تری کا ان کے حوالے کیے۔ نقشے میں دنیا کا کوئی کونا نہ چھوٹا تھا۔

شام کے وقت سارا خراسان، بندرگاہ پر امڈ آیا، ملکہ اور بادشاہ کا بہت برا حال تھا، ملکہ بلقیس تو بالکل دیوانی سی ہورہی تھی، وہ کبھی شہزادہ کا ماتھا چومتی، کبھی گال اور کبھی ہاتھ۔ بوڑھے وزیر اعظم ابوذر نے لرزتے ہاتھوں سے آخری بار اپنے لخت جگر کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہا "ہمت مت ہارنا بیٹے! ہمیشہ اپنے خدا کو حاضر و ناظر جاننا، رسولؐ کی اطاعت سے کبھی روگردانی نہ کرنا، نمازوں کو اپنے وقتوں میں ادا کرنا، کبھی حجاز مقدس کے قریب سے گزرنا ہو تو اللہ اور اس کے رسول کے گھروں پر حاضری ضرور دینا، اپنے دوست، اپنے آقا صاحب عالم، ولی عہد شہزادہ رمّان کی حفاظت میں کوتاہی نہ کرنا، اگر شہزادہ کو کچھ ہوگیا خدانخواستہ، بیٹے تو تو... اپنے ...با... پ... کا مرا منھ دیکھے... گا" اور "ہاں بیٹے تو مجھ سے بہت محبت کرتا تھا نہ! ماں کی ممتا سے محروم میرے بیٹے مجھے ...... یا... دکر...... کے رو...... نا نہیں، بالکل مت...... رونا اپنی مرحوم ماں کی روح کو کبھی کبھی قرآن مقدس پڑھ کر ثواب بھیجتے رہنا، آج اس کی روح بہت...... خوش...... ہوگی ...... بہت،" "بس کیجیے۔ ابا جان بس کیجیے! اب مجھ سے نہیں سنا

جانا، آپ نے جیسا کہا ہے بالکل ویسا ہی ہوگا، میں آپ کی آرزوؤں کے ساتھ کبھی کھلواڑ نہیں کروں گا۔ یہ زندگی آپ ہی کا تو عطیہ ہے، میں اس کا قرض چکائے بنا ہرگز نہیں مروں گا، آپ بھی مجھے یاد کرکے مت روئیے گا اور..... اپنی صحت کا خیال رکھیے گا" یہ کہہ کر وزیرزادہ حارث اپنے باپ سے لپٹ گیا، اور ہچکیوں سے رونے لگا، جدائی کا یہ دلدوز منظر دیکھ کر تمام آدمیوں کے آنسو نکل آئے، لیکن جانے والے اور ان کے ماں باپ کا بہت برا حال تھا۔

دور افق مغرب میں سورج ڈوب چکا تھا، یہ لوگ آخری بار ملے۔ بادشاہ نے قطمیر کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا، بے زبان مگر حساس، قطمیر بلک اٹھا۔ قطمیر جو ساری دنیا کی سواریاں چلانا جانتا تھا، وہ اس جہاز کا کپتان تھا۔ جی ہاں قطمیر صاحب ہی اس جہاز کو چلائیں گے، مصری جہاز کو موٹی موٹی زنجیروں سے خراسانی جہاز کے پیچھے باندھا گیا دونوں جہازوں پر خراسانی جھنڈے لگائے گئے۔

اندھیرا ہوچکا تھا۔ جہاز کے لنگر اٹھا دیے گئے۔ شہزادہ اور وزیرزادہ جہاز پر سوار ہوئے۔ قطمیر لپک کر اپنی سیٹ پر پہنچ گیا۔ شہزادہ رمان نے قطمیر کو جہاز چلانے کا اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی قطمیر نے انجن اسٹارٹ کیا، جہاز آہستہ آہستہ ہچکولے لے کر چلنے لگا، تھوڑی دیر بعد جہاز ساحل پر سے ایک دھبہ کی مانند نظر آرہا تھا، بادشاہ اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ بہ چشم تر محل واپس ہوا۔

وزیرزادہ اور شہزادہ نے پورے جہاز کا گھوم پھر کر معائنہ کیا۔ دونوں نے مل کر دوسرے جہاز پر جانے کے لیے مضبوط بیڑے لگائے۔ جہاز پر روشنی کا انتظام کیا گیا، جہاز، اب کافی تیز رفتاری کے ساتھ شمال کی جانب بڑھ رہا تھا۔ آدھی رات تک دونوں ان ضروری کاموں سے تھک کر چور ہوچکے تھے۔ وہ کپتان قطمیر کے پاس آئے تو دیکھا کہ کپتان صاحب کسی خاص پرزے پر غور کر رہے تھے۔ شہزادہ نے وزیرزادہ سے کہا "بھئی حارث مجھے تو بہت زوروں کی بھوک لگ رہی ہے" وزیرزادہ نے کہا "ہاں رمان! مجھے بھی بہت بھوک لگ رہی ہے اور قطمیر بھی بھوکا ہوگا" شہزادہ نے قطمیر سے کھانے کے لیے پوچھا تو قطمیر نے لکھ کر جواب دیا "آپ لوگ کھانے کی تیاری کیجیے! میں جہاز مغرب کی جانب لگا کر بس ابھی پہنچ رہا ہوں" شہزادہ نے کھانا گرم کیا، وزیرزادہ نے پلیٹیں دھو کر دسترخوان پر لگائیں، جلدی جلدی کھانا لگایا گیا۔ اتنی دیر میں قطمیر بھی آگیا۔ پھر تینوں کھانے میں مشغول ہوگئے۔ کھانے کے بعد شہزادہ نے قطمیر سے پوچھا "اپنی ڈیوٹی پر جاؤ گے یا آرام کروگے؟؟" حسب معمول قطمیر نے لکھ کر جواب دیا "آپ لوگ سو جائیے! میں جہاز چلاؤں گا اور حفاظت کروں گا" شہزادہ کو یہ بات پسند آئی، وزیرزادہ نے بستر لگایا، تھوڑی دیر تک وہ باتیں کرتے رہے پھر نیند کی وادی میں کھو گئے۔

ہلکی ہلکی روشنی مشرق کی طرف سے اٹھ رہی تھی شہزادہ اور وزیرزادہ دونوں اٹھے۔ وضو کیا اور نماز کو کھڑے ہوگئے، نماز کے بعد دونوں نے تھوڑی دیر قرآن کی تلاوت کی اور پھر صبح کے منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے جہاز کے عرشے پر آگئے، بہت ہی سہانا اور مبارک وقت تھا، چاروں طرف سمندر کا نیلا نیلا پانی اور بیچ میں ایک تنکے کی مانند ہلتا ڈولتا جہاز، شہزادہ کو دور سے کچھ پرندے اڑتے ہوئے نظر آئے اس نے اپنے دوست حارث سے کہا "دیکھو! حارث دیکھو! کچھ پرندے اڑ رہے ہیں، لگتا ہے کہ کوئی جزیرہ قریب ہے" "ہاں، مجھے بھی لگتا ہے، میں قطمیر سے کہتا ہوں کہ وہ جہاز جزیرہ کی طرف لگا دے، تھوڑی سیر و تفریح ہو جائے گی، تم ناشتہ کی تیاری کرو! میں قطمیر کا پتا لگا کر وہیں باورچی خانہ میں پہنچتا ہوں" یہ کہہ کر وزیرزادہ ایک طرف کو نکل گیا، شہزادہ نے بھی باورچی خانہ کی طرف راہ لی۔

ناشتہ جب تیار ہوگیا تو حارث قطمیر کے پاس آیا اس سے کہا "ابھی جزیرہ دور ہے، چلو ناشتہ کر لو۔ پھر آرام کرنا" یہ کہہ کر حارث اپنے ساتھ قطمیر کو لے کر آیا انھوں نے گرم گرم روٹیوں پر مکھن لگایا اور پھر مزے لے کر کھانے لگے۔ ناشتہ کے بعد کپتان صاحب نے کہا "جزیرہ آنے کے بعد تھوڑی دیر آرام کروں گا، اتنی دیر

آپ لوگ گھوم پھر آئیے گا۔" جزیرہ اب قریب آچکا تھا۔ درخت وغیرہ بالکل صاف نظر آرہے تھے۔ کپتان نے جہاز کی رفتار بہت کم کردی۔ شہزادہ اور وزیرزادہ نے اپنے تیر کمان سنبھالے اور پھر نقشے میں جزیرے کے متعلق پڑھنے لگے۔ مصری عالم نے اس جزیرہ کے بارے میں لکھا تھا "یہ ایک بہت بڑا جزیرہ ہے۔ اس جزیرے کا نام "جزیرۃ الجن" ہے۔ ہزاروں سال پہلے یہ جزیرہ سمندر کا پانی روک کر مٹی ڈال کر جنات نے بنایا تھا۔ اس جزیرے کی جن قوم بہت نیک اور شریف ہے، اسے خاکی مہمان کی بہت قدر کرتی ہے، یہاں کے بادشاہ کا نام "شیخ ساخن" ہے، جن کی عمر نو سو پچاس سال ہے۔ یہاں انگور اور ناریل بہت پیدا ہوتے ہیں۔ غرض یہ جزیرہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔" جناتی جزیرہ کے احوال سن کر شہزادہ کو جھرجھری سی آگئی۔ شہزادہ نے وزیر زادہ سے کہا "یار حارث! مجھے تو دال میں کچھ کالا معلوم ہوتا ہے، یہاں جنات رہتے ہیں۔ ہمیں یہاں نہیں رکنا چاہیے۔" "نہیں شہزادے خوف کی کوئی بات نہیں، اوّل ہم ہتھیار سے لیس ہوں گے۔ دوسرے تسخیرِ جن کا عمل دونوں ہی جانتے ہیں۔ اور پھر مصری عالم لکھتا ہے کہ اس جزیرے کے جن بہت شریف ہیں۔" وزیر زادہ نے کہا۔ "ٹھیک ہے ہم چلتے ہیں! ہتھیار سے لیس ہو کر یہاں کے بادشاہ کے لیے تحفہ تحائف بھی لے چلتے ہیں۔" شہزادہ نے کہا اور پھر قطیر کی طرف متوجہ ہوگیا، جو جہاز کے لنگر ڈال کر حکم کا منتظر تھا "تم جہاز پر رہنا اور اس کی حفاظت کرنا۔ ضروری کام کاج کے بعد تم آرام کرلینا، کوئی پوچھے تو کہنا کہ "ہم خراسانی سیاح ہیں، دنیا کی سیر کو نکلے ہیں"۔" قطیر کو ہدایت دے کر دونوں، جزیرے پر اتر پڑے۔

جزیرہ بڑا خوب صورت تھا، ہر طرف ہریالی چھائی ہوئی تھی۔ سیب کے برابر انگور اور تربوز کے برابر ناریل لگے تھے، گلاب کے خوب صورت پھول پانی پر لگے ہوئے تھے اور کمل کے پھول خشکی پر لگے تھے، آلو، پالک، بینگن، ترئی، ہری مرچ، دھنیا۔ یہ سب بیک وقت کھجور کے پیڑ پر تھے، اور کھجور سنگھاڑے کی طرح پانی کے اندر، غرض اپنی دنیا سے ہر چیز یہاں الٹی تھی۔ وہ دونوں حیران و پریشان اس آسیبی جزیرے کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک سفید پوشوں کی ایک جماعت آتی نظر آئی، شہزادہ نے وزیرزادہ سے کہا "حارث! ادھر دیکھو، جنات آرہے ہیں۔ ہوشیار رہنا"۔ جب وہ جماعت قریب آگئی تو ان میں جو سب سے زیادہ خوب صورت اور جوان تھا اور فوجی لباس میں تھا مسکرا کر آگے بڑھا اور ان سے مخاطب ہوا "عماشن شما منامنم رزنتکم لشمی جنم"، یعنی خاکی انسانو! تمہارا آنا مبارک ہو، اور تم پر سلامتی ہو، وزیرزادہ حارث نے اسی جناتی زبان میں اس جن نوجوان کے سلام کا جواب دیا۔ اور اپنا تعارف کرایا "معزز میزبان! ہم خراسانی سیاح ہیں۔ دنیا کی سیر کو نکلے ہیں، آپ بھی اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔" نوجوان جن نے بھی اپنا تعارف اس طرح کرایا "دوستو! ہم خدا کی مخلوق، جنات ہیں، میں یہاں کی بحری و بری فوج کا کمانڈر ہوں" اور یہ میرے ماتحت سپاہی ہیں۔ میں آج سرحدی دورے پر نکلا تھا۔ اتفاق سے آپ لوگوں سے ملاقات ہوگئی میرا نام "لماسن" ہے! آپ لوگ ہمارے شہنشاہ شیخ ساخن کے پاس چلیے وہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے"، وزیرزادہ حارث نے کہا "ہم ضرور آپ کے شہنشاہ کے پاس چلیں گے۔ مگر ہمارے جہاز کی حفاظت کون کرے گا؟؟ جہاز پر ہمارا ایک دوست، کتا ہے جس کا نام قطیر ہے اور یہاں میرا نام حارث ہے، اور یہ میرے دوست رمان ہیں۔" سردار لماسن نے کہا "آپ کے جہاز کی حفاظت کا ذمہ ہم لیتے ہیں، میں ابھی سے دو ہزار جناتی فوج متعین کردیتا ہوں، ایک ہزار فوج زمین پر سے نگرانی کرے گی اور ایک ہزار اوپر خلا سے، آپ اپنے دوست قطیر کو بھی بلا لیجیے۔ پھر شاہی محل چلتے ہیں۔" شہزادہ رمان کو ساری باتیں جواب تک ہوئی تھیں وزیرزادہ حارث نے بتلادیں۔ شہزادہ نے قطیر کو آواز دی، وہ جہاز کی صفائی کر رہا تھا، فوراً آگیا۔ شہزادے نے کہا "چلو تم ہمارے ساتھ چلو"، پھر کمانڈر لماسن اپنے ساتھیوں میں سے ایک کی طرف متوجہ ہوا جو شاید سردار لماسن کا پرائیوٹ سکریٹری تھا، اس سے کہا "جاشن تم فوراً دو ہزار فوج بلوالو اور مہمانوں کے جہاز پر متعین کر دو، میں اپنے خاص طیارے سے ان کو لے کر شاہی محل جارہا ہوں۔"

محمد منظّم جیراج پوری

ایک بادشاہ کی دو بیویاں تھیں۔ اُن کے کوئی اولاد نہ تھی۔ بادشاہ ہمیشہ غمگین رہا کرتا تھا۔ ایک روز وہ آم کے درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ اتنے میں ایک بوڑھا دیو آیا اور بادشاہ سے غمگین رہنے کا سبب پوچھنے لگا۔ بادشاہ نے کہا "میری دو بیویاں ہیں۔ مگر اِن دونوں میں سے کسی کے اولاد نہیں ہوتی۔"

دیو نے آم کے پیڑ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ جو دو آم ایک ساتھ لٹک رہے ہیں ان دونوں کو ایک ہی تیر کے نشانے سے توڑ لے اور لے جا کر ان دونوں بیویوں کو کھلا دے۔ انشاءاللہ دونوں کے دو بچّے پیدا ہوں گے۔ مگر شرط یہ ہے کہ آج سے دس برس کے بعد میں تیرے یہاں آؤں گا اور تجھے اپنا بڑا لڑکا مجھے دینا ہوگا۔ بادشاہ نے یہ شرط منظور کر لی اور دیو کے کہنے پر عمل کیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد خدا کے فضل سے دو بیویوں کے یہاں دو بیٹے پیدا ہوئے۔ بادشاہ نے اپنے بڑے بیٹے کا نام شہزادہ حامد اور چھوٹے کا شہزادہ محمود رکھا۔ شہزادہ حامد بڑا ذہین، بہادر اور چالاک تھا۔ اُسے اپنی ذات پر بہت بھروسہ تھا، اور مصیبتوں پر صبر کر سکتا تھا۔

آخر دس برس کے بعد دیو لڑکے کو لینے آیا۔ بادشاہ نے شہزادہ حامد کو فوراً اُس کے حوالے کر دیا۔ دیو شہزادے کو لے کر اپنے گھر آیا اور اُس سے کہا کہ اس تپتے ہوئے کڑھاؤ کے چاروں طرف چکّر لگاؤ۔ حامد سمجھ دار تو تھا ہی، فوراً تاڑ گیا کہ دیو کی نیّت ٹھیک نہیں ہے۔ اُس نے کہا کہ پہلے تم مجھے چکّر لگا کر دکھاؤ۔ دیو اُس کے چاروں طرف چکّر لگانے لگا۔ آخر جب اُسے خوب چکّر آ گیا تو شہزادے نے اُسے دھکّا دے دیا اور وہ دھم سے کڑھاؤ کے بیچ میں جا گرا اور جل کے مر گیا۔

شہزادے نے اُس کے مکان کی کنجی تلاش کی۔ اور اس دیو کے مکان کا پہلا دروازہ کھولا، تو اُس میں ایک بہت عمدہ گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ پھر دوسرا دروازہ کھولا، اُس میں طرح طرح کے ہتھیار شکار کھیلنے کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ شہزادے نے یہ سب چیزیں اپنے قبضے میں لیں، اور گھوڑے پر سوار ہو کر جنگل میں ایک طرف کو چل دیا۔ چلتے چلتے تھوڑی دیر میں ایک شہر نظر آیا۔ وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ شہر میں ماتم ہو رہا ہے۔ یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔ لوگوں سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ معلوم ہوا کہ اس شہر سے ملا ایک جنگل ہے۔ اُس میں ایک دیونی رہتی ہے جو روزانہ اس شہر میں آتی ہے اور دو تین آدمیوں کو پھاڑ کر کھا جاتی ہے۔ اِس شہر کے بادشاہ نے اشتہار دیا ہے کہ جو اس دیونی کو مار کر لے آئے گا میں اُسے آدھی سلطنت دوں گا اور اپنی بیٹی کی شادی اُس کے ساتھ کر دوں گا۔ شہزادہ یہ بات سُن کر محل میں گیا اور بادشاہ سے اجازت لے کر دیونی

پتہ: مٹلیہ، اعظم گڑھ یوپی

مارنے کے لیے روانہ ہوگیا۔ جاتے جاتے اُسے ایک جھونپڑی نظر آئی۔ اُس کے پاس پہنچا تو اُس میں سے رونے کی آواز آرہی تھی۔ جھونپڑی کے اندر گیا تو دیکھتا ہے کہ ایک بڑھیا بیٹھی رو رہی ہے۔ شہزادہ اسے دیکھتے ہی فوراً تاڑ گیا کہ ہو نہ ہو، یہی دیونی ہے۔ اُس نے تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ بڑھیا کی گردن الگ جا پڑی۔ شہزادہ اسے لے کر بادشاہ کے پاس گیا۔ بادشاہ اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اُسی وقت تمام شہر میں خوشی کے شادیانے بجائے گئے اور شہزادہ حامد کی شادی بادشاہ کی لڑکی سے ہوگئی۔ بادشاہ نے شہزادے کو اپنی آدھی سلطنت دینی چاہی تو شہزادے نے انکار کر دیا۔ دوسرے روز شہزادے نے شہزادی کو اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا اور جنگل میں ایک طرف کو چل دیا۔ راستے میں اُسے ایک شیرنی کی آواز سنائی دی۔ قریب جاکر دیکھا تو اُس کے پاؤں میں کانٹا چبھا ہوا تھا اور وہ درد سے کراہ رہی تھی۔ شہزادے نے دل کڑا کر کے اُس کے پاؤں سے کانٹا نکال دیا۔ جب وہ وہاں سے آگے چلا تو شیرنی نے اُسے اپنا ایک بچّہ دیا اور کہا کہ آڑے وقت میں یہ تمھارا ساتھ دے گا۔ شہزادے نے اُسے اپنے ساتھ لے لیا اور آگے بڑھا۔ چلتے چلتے ایک جگہ وہ دونوں ایک آم کے پیڑ کے نیچے ٹھہرے اور کچھ کھا پی کر اُسی درخت کے نیچے سو رہے۔ اتنے میں کچھ کھڑکھڑاہٹ کی آواز سنائی۔ شہزادہ جاگ پڑا دیکھا تو ایک اژدہا پیڑ پر چڑھ رہا ہے اور پیڑ پر سے چڑیوں کے بچّوں کے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ شہزادے نے اپنی تلوار سے اژدہے کے دو ٹکڑے کر دیے اور اس سے اپنے تکیے کا کام لیا۔ جب چڑیوں کے ماں باپ آئے اور اژدہے کو مرا ہوا پایا تو بہت خوش ہوئے اور جب شہزادہ چلنے لگا تو ان سبھوں نے اپنا ایک ایک بچہ شہزادے کو دے دیا اور کہا کہ یہ تیرا ساتھ دیں گے۔ ان چڑیوں کے بچّوں میں ایک توتا بھی تھا، جو شہزادے کو راستہ بتلا رہا تھا اور شیر کا بچّہ شہزادے کو جانوروں سے بچاتا تھا۔

آخر چلتے چلتے ایک دوسرے شہر میں آ پہنچے۔ وہاں شہزادے نے اپنا گھوڑا ایک درزی کے گھر کے پاس کھڑا کیا۔ اور اُس درزی سے ایک رات اُس کے گھر میں ٹھہرنے کی اجازت مانگی۔ درزی نے کہا، تمام گھر حضور کا ہے جب تک چاہے رہیے۔ وہ درزی بڑا مکار اور لالچی تھا۔ جب اُس نے شہزادے کے گھوڑے اور جانوروں کو دیکھا تو اُس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اُس نے سوچا کسی نہ کسی طرح شہزادے سے یہ سب کچھ چھین لینا چاہیے۔ وہ ایک تلوار لے کر رات کے وقت اپنے بستر پر اس انتظار میں جاکر پڑ رہا کہ شہزادہ غافل ہو جائے تو اُسے قتل کر دے۔

شہزادہ بھی بڑا چالاک تھا۔ اُس نے سوچا کہ یہ درزی چکنی چپڑی باتیں کرتا ہے شاید کوئی دھوکا نہ دے۔ اس لیے چوکنّے رہنا ہی بہتر ہے۔ جب درزی نے دیکھا کہ رات زیادہ ہوگئی اور شہزادہ گہری نیند سو گیا تو وہ اپنی تلوار لے کر اُٹھا۔ یہ دیکھ کر توتے نے شیر سے کہا کہ "اے شیر! دیکھ وہ درزی ہاتھ میں تلوار لیے ہمارے شہزادے کو قتل کرنے آرہا ہے۔ تو جاکر اسے پھاڑ ڈال۔ شیر نے توتے کا اشارہ پاتے ہی درزی کو پھاڑ ڈالا۔ شہزادہ یہ دیکھ بہت خوش ہوا اور صبح کو شہزادی اور جانوروں سمیت اپنے باپ کے شہر میں چلا گیا۔ اس کا باپ اپنے بڑے بیٹے کو زندہ اور سلامت دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ باپ کے مرنے کے بعد شہزادہ حامد ہی اس ملک کا بادشاہ ہوا اور آرام سے زندگی گزارنے لگا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو اپنے ہی پاس رکھا کیوں کہ اُن سے اُسے بہت محبت تھی۔

آدھی ملاقات اور بچّوں کی کوششیں لکھنے والے پیامی قلم کار، اپنے خط اور مضامین صاف خوش خط اور لائن چھوڑ کر لکھیں
(اڈیٹر)

بیسویں صدی کے مشہور خطّاط و مصوّر صادقین صاحب اُتر پردیش کے قصبہ امروہہ میں ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ صادقین کو شروع ہی سے پڑھنے کی بہ نسبت لکھنے کا بہت زیادہ شوق تھا۔ اسی لیے اپنے ساتھیوں میں سب سے اچھا خط ہو گیا تھا۔ یہ لکھنے کا بے پناہ شوق ہی تھا کہ بچپن میں اپنے کورس کی تمام کتابیں خود لکھا کرتے تھے جغرافیہ کی کتابوں کے نقشے بھی خود ہی بنایا کرتے، پھر خود ہی اُن کی جلدیں باندھتے، جب سال ختم ہو جاتا اور نئی کلاس میں آتے تو ساری کتابیں عبدالمجید تمنا کو فروش اور لالہ رام سروپ پنساری کے یہاں ردّی کے بھاؤ آٹھ دس آنے میں بیچ آتے، جو پیسے ملتے اُن سے رنگ اور کاغذ لاکر تصویریں بناتے اور نئے کلاس کے لیے پھر کورس کی کتابیں لکھا کرتے تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں صادقین نے امروہہ کی گلی کوچوں کی دیواروں پر ظلم کے خلاف لڑتے ہوئے انسانوں کی تصویریں کوئلے سے بنائیں۔ آج بھی صادقین کے آرٹ میں یہی پہلو نمایاں ہے۔ ۱۹۴۸ء میں صادقین اپنے والدین کے ہمراہ پاکستان چلے گئے۔ صادقین کا شوق جاری رہا۔ مسلسل محنت کی وجہ سے صادقین کی شہرت بڑھنے لگی۔ اُن کی تصویروں کی بے شمار نمائشیں ہوئیں ۱۹۶۰ء میں آپ نے آل پاکستان نمائش میں پہلا انعام حاصل کیا اور حکومت پاکستان نے آپ کو تمغۂ امتیاز سے نوازا۔ اب تو صادقین کی شہرت خوش بُو کی ما پاکستان کی حدود کو پار کر گئی۔ امریکہ، انگلینڈ، فرانس، آ روس، مغربی جرمنی، سوئزرلینڈ، مصر، شام، عراق، کویت، ابوظہبی، سعودی عرب وغیرہ ممالک میں صاد کے فن مصوّری کی نمائشیں ہوئیں۔ ۱۹۶۷ء میں آپ ائمۂ کرام کے روضوں کی زیارت کی اوران مقدّس مق پر بنے خطاطی کے نمونوں سے بے حد متاثر ہوئے۔ ۶۸ میں غالبؔ کی صد سالہ برسی کے موقع پر آپ نے کلامِ غا پر مبنی تصاویر بنائیں۔ اوران تصاویر پر اشعار بھی ہی لکھے۔ نومبر ۱۹۶۸ء میں غالبؔ کی نمائش ہوئی دوران رمضان کا مہینہ بھی آ گیا۔ ایک روز صبح کے و اُنھوں نے خواب میں دیکھا کوئی کہتا ہے کہ "قرآن ثواب ہوگا،" اُنھوں نے جواب دیا۔ قرآن تو میں لک ثواب غالبؔ کی رُوح کو ملنا چاہیے۔ کیوں کہ غا کے اشعار لکھ کر ہی میں اس طرف متوجہ ہوا ہوں۔

اُس کے بعد صادقین نے دو سو اسّی (۲۸۰) فٹ لکڑی سورۂ یٰسین لکھی جو لاہور میوزیم کی اسلامک گیلری لگی ہوئی ہے۔ غالبؔ، اقبالؔ اور فیضؔ کے کلام خطاطی کی۔ اس کے بعد سورۂ رحمان کی خطاطی شر کی۔ سورۂ رحمان اُنھوں نے جس حسین انداز میں د ہے اُس کی واقعی تعریف کے لیے میرے پاس الف نہیں ہیں۔ اس وقت بھی سورۂ رحمان کی وہ تم تصویریں میری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ کنیڈی ہا

۴۳/۲-ایس-این ہال-اے، ایم، یو علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

میں اُن کی تصویروں کی نمائش ہوئی تھی۔ مجھے شمار یاد نہیں کہ میں نے کتنی بار وہ نمائش دیکھی۔ ہر بار مجھے وہی خوشی حاصل ہوئی۔

میری صادقین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جس چیز نے مجھے متاثر کیا اور ملاقات پر مجبور کیا وہ اُن کی سادگی، خلوص اور انکساری ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ انسان دولت، شہرت اور عزت و وقار حاصل کرلے پھر بھی یہ صفات باقی رہیں۔ صادقین صاحب کو مشاعروں سے بھی شروع ہی سے دلچسپی ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام "رباعیات صادقین نقاش" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اب تک پانچ ہزار رباعیاں لکھ چکے ہیں۔ اپنی کچھ رباعیات کی مناسبت سے تصویریں بھی بنائی ہیں۔ آپ بھی اُن کی رباعیات کا نمونہ ملاحظہ کیجیے۔

ہستی کو ہیں چمکانے والے ہم بھی
دل اپنا نہیں ہارنے والے ہم بھی
طوفانِ حوادث جو ہے آتا، آئے
ہمت تو نہیں ہارنے والے ہم بھی

ہر حال ہی میں سانس لیے جاؤں گا
ہے زندگی اک جام پیے جاؤں گا
گردن بھی جو کٹ جائے تو بے سر ہو کر
ممکن اگر ہوگا تو جیے جاؤں گا

پوشیدہ ہی ہو کر نہ ہو پیدا ہو کر
میں رہ گیا زندگی پہ شیدا ہو کر
پیدا تو نہیں ہونا ہی نہیں چاہتا تھا
مرنا بھی نہیں چاہتا پیدا ہو کر

اس وقت مجھے ایک دلچسپ بات یاد آئی۔ یہ غالباً ۲۸ فروری کا ذکر ہے کہ اُردو ڈیپارٹمنٹ میں صادقین صاحب، نورالحسن صاحب کے کمرے پر تشریف لائے۔ میں وہاں پہلے سے موجود تھی۔ اُن کے ساتھ ہی ساتھ ایم۔ اے کے کچھ طالب علم اور میمونہ جعفری صاحبہ (لیکچرر اُردو ڈیپارٹمنٹ) بھی تشریف لے آئیں۔ اور آٹوگراف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ صادقین صاحب، نورالحسن صاحب کی طرف مخاطب ہو کر بولے "جناب صبح سے پچاس ساٹھ بسم اللہ لکھ کر دے چکا ہوں۔ ایک صاحب تو بولے۔ یہ سب آپ کی یادگار رہ جائیں گی۔" اس پر نورالحسن صاحب نے برجستہ کہا "صادقین کو موت ہی کب آئے گی۔ عزرائیل آئیں گے اور آٹوگراف لے کر چلے جائیں گے۔" سب لوگ ہنسنے لگے۔ صادقین کی ایک رباعی ہے:

جو غیروں کی ہیں ایسی حدوں میں کب ہیں
نیکوں میں ہیں اتنے دوستا بدوں میں کب ہیں
میری تو مدرسوں ہی میں تصویریں ہیں
مے خانوں میں اور عشرت کدوں میں کب ہیں

حقیقت یہی ہے کہ صادقین چاہتے تو اپنے فن سے بہت کچھ دولت حاصل کر سکتے تھے۔ مشرقِ وسطیٰ کے ایک عظیم اور دولت مند بادشاہ نے اپنے ذاتی ہوائی جہاز کے لیے خطاطی کرانا چاہی مگر اس درویش صفت انسان نے انکار کر دیا۔ حالانکہ مشرقِ وسطیٰ کے بیشتر ممالک کو پبلک عمارات کے لیے تصویریں بنا چکے ہیں۔ لیکن امیروں کے محلوں کی سجاوٹ کے لیے اُن کی ذاتی فرمائش پر صادقین نے کبھی کچھ نہیں بنایا۔ خود بالکل سادہ رہتے ہیں اور اپنی دولت کا بیشتر حصہ ضرورت مندوں پر خرچ کر دیتے ہیں۔

ننھے فن کار کا انعام	اپریل ۱۹۸۲ء کے "پیامِ تعلیم" ریاض احمد معرفت سید محمد نعمت اللہ کی تصویر پہلے انعام کی مستحق ہے۔ ریاض احمد صاحب اپنا پورا پتا ارسال کریں۔

ایک شرابی ایک کنویں پر بیٹھا اندر جھانک رہا تھا اور بار بار گن رہا تھا "پچیس، پچیس! پچیس!" اتنے میں ایک دوسرا شرابی وہاں آیا اور بولا: "کیا پچیس پچیس کر رہے ہو، آگے گنو چھبیس، ستائیس، اٹھائیس۔"

"چپ رہو ــــ پچیس، پچیس ...."

"ابے کیا کر رہا ہے تو!"

"دیکھنا ہے تو جھک کر دیکھ لو۔"

جیسے ہی وہ دوسرا شرابی کنویں میں جھانکا۔ اس شرابی نے اسے کنویں میں ڈھکیل دیا اور بولا: "چھبیس! چھبیس! چھبیس!"

جاوید: (اقبال سے) "کہو بھئی کیا کھا رہے ہو؟"

اقبال: (لڈو کھاتے ہوئے) "زہر کھا رہا ہوں۔"

جاوید (ایک لڈو چھینتے ہوئے) "تو میں تمھارے بغیر جی کر کیا کروں گا۔"

جاوید نہال حسنی

ایک چور گھبرایا ہوا تھانے میں پہنچا اور ڈیوٹی افسر سے بولا:

"جناب میری جان خطرے میں ہے۔"

"کیوں کیا بات ہے۔" تھانے دار نے پوچھا۔

"جناب! ایک گم نام خط ملا ہے کہ میری مرغیاں چراؤ گے تو تمھاری جان کی خیر نہیں۔"

تھانے دار: تو پھر مرغیاں چرانا چھوڑ دو۔

"مگر جناب! لکھنے والے نے اپنا نام اور پتا تو نہیں لکھا۔ مجھے کیسے معلوم ہوگا کہ کس کی مرغیاں چرانے میں جان کا خطرہ ہے۔"

(اسحاق احمد خالد عمر نرمل ۵۰۴۱۰۶ (A.P.))

ایک مسافر کے پاس زیادہ سامان تھا اور اُسے معلوم تھا کہ سامان بُک کرانا پڑے گا۔ اُس نے ایک بات سوچی۔ اسٹیشن پر پہنچ کر ایک آدمی سے پوچھا: "بابو جی! کیا آپ بغیر سامان کے سفر کریں گے؟" اُس نے کہا: "جی ہاں!" "تو میرا ایک صندوق اپنے پاس رکھ لیجیے، اس طرح میرے پیسے بچ جائیں گے۔" یہ سُن کر بابو نے زور کا قہقہہ لگایا۔ "جناب میں ریلوے گارڈ ہوں اپنا سامان فوراً بُک کرائیے۔"

یاسمین ضیا صدیقی c/o ڈاکٹر فضیل انجم گنگیرو ضلع مظفر نگر

دو دوست آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ ایک نے دوسرے سے کہا:

"آج میرے دادا جان انتقال کر گئے ہیں۔"

دوسرا دوست: "بڑے افسوس کی بات ہے۔ مرحوم کی عمر کتنی تھی؟"

پہلا دوست: "یہی کوئی ۹۸ سال۔"

دوسرا: اوہو اگر دو سال اور زندہ رہتے تو سنچری مکمّل ہو جاتی۔

ایک فقیر کسی دولت مند کے دروازے پر گیا اور روٹی کا ٹکڑا مانگا۔ امیر نے جواب دیا "معاف کرو، اس وقت گھر میں کوئی آدمی نہیں ہے۔" فقیر نے کہا: "بابا! دم بھر کے لیے تم ہی آدمی بن جاؤ۔"

رومی شاہین۔ کلٹی (مغربی بنگال)

شکیل:۔ ڈاکٹر صاحب مجھے آپ کی دوا سے بہت فائدہ ہوا!

ڈاکٹر:۔ مگر وہ میں نے آپ کے والد صاحب کو دی تھی۔

شکیل:۔ جی۔ انھیں کو دی تھی لیکن وہ دوا پیتے ہی مر گئے اور میں ان کی ساری جائداد کا مالک بن گیا۔

(ڈاکٹر محمد شکیل کامل، رحیم پورہ کلٹی۔ بردوان)

ہ تامر "پیام تعلیم" کے دو خصوصی حالیہ شمارے نظر نواز
ئے جو جامعہ کے باشعور اور ہونہار بچوں کی کاوشوں اور
شوں کا نتیجہ، تعلیمی میلہ کی رُوداد کی تفصیل پر مشتمل اور
ے پروگراموں سے لبریز ہیں۔
س تعلیمی میلے کے انعقاد سے بچوں کی علمی اور ذہنی ارتقا
یے میں ایک خوش گوار پیغام سمجھتا ہوں کہ اس سے ان کے
ستقبل میں آنے والے لمحات میں اپنے فرائض کی تکمیل کا
پیدا ہوگا۔ اس سے ان کے عزائم بلند ہوں گے اور ان
کی تے مختلف گوشوں پر اپنی کامیابی کے راستے ابھی سے
بن گے۔ یہ پروگرام بچوں کی زندگی کی تعمیر میں لائق صد
ہے۔ بچوں کی پارلیمنٹ کے عنوان سے ان کی کوشش
کامیاب اور بے حد دلچسپ ہے۔ اس کے علاوہ تمثیلی
ہ بھی رنگ و نور میں ڈوبا ہوا سراہنے کے لائق ہے
نے محنت و جاں فشانی اور حسن سلیقے سے یہ پروگرام ترتیب
اس سے ان کی ذہانت اور اساتذہ کی محنت و تربیت کا
اندازہ ہوتا ہے۔ بہرحال یہ ایک کامیاب ترین پروگرام
ہندستان کے دوسرے تعلیمی اداروں میں اگر ایسے پروگرام
کیے جائیں تو اس سے اچھے نتائج برآمد ہونے کی توقع
ید ہے۔

مسلم اقبال
بتیانہ محلہ، کلٹی، بردوان

ماہ جنوری ۸۲ء کا شمارہ پیام تعلیم کا "تعلیمی میلہ نمبر"
جسے پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ اس مرتبہ کا میلہ پچھلے سال
کے مقابلے میں بہتر تھا۔ اس کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا تھا
کہ میں بھی اس میلے میں شریک ہوں۔

نیازمند۔ ڈاکٹر شکیل کامل
کلٹی۔ بردوان

مارچ ۱۹۸۲ء کا پیام تعلیم نظر سے گزرا۔ میں "پیام تعلیم" کے
خریدار غیر ممالک میں بھی بنا رہا ہوں۔
غلام حیدر نقوی صاحب کی کہانی چلیا ال دئی، ڈاکٹر عارفہ
عرفی کی کہانی "شیراز کا مرد فقیر" اور ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کا مضمون
مولانا حسرت موہانی مجھے اور میرے ساتھیوں کو بہت زیادہ
پسند آئے۔ اس لیے میری اور میرے دوستوں کی طرف سے
ان قلم کاروں کو مبارک باد پیش کردیں۔

مسرور حسن
لکھمنیاں۔ بیگوسرائے (بہار)

السلام علیکم
جامعہ ملیہ کی تعلیمی سرگرمیاں بڑی دلچسپ لگی ہیں۔ اگر
ہمیں قبل از وقت معلوم ہوا ہوتا تو ان تمام سرگرمیوں کو
دیکھنے دہلی آتے۔ خیر آئندہ اگر آپ نے یاد کیا تو انشاء اللہ
حاضری دی جائے گی۔

ایم۔ ای۔ ٹی۔
تھنہ منڈی جموں

رسالہ "پیام تعلیم" اپنی بھتیجیوں کے لیے بلاناغہ لاتا
ہوں۔ اگر اتفاق سے "پیام تعلیم" بک اسٹال پر آیا اور ختم
ہوگیا تو اپنی بھتیجیوں کو سمجھانا دشوار ہو جاتا ہے۔ غرض یہ کہ
یہ رسالہ میرے گھر کی زینت ہے۔ ویسے بچوں کے ساتھ میں
بھی اکثر و بیشتر پڑھ لیتا ہوں۔

خلوص کار سلطان آزاد
پٹنولین۔ گلزار باغ پٹنہ۔ ۷ (بہار)

مرتبہ: موثق الدین

ادھر ادھر سے

بھساول کی طالبہ اوّل آئی

عید میلاد النبی کے مبارک موقع پر اینگلو اُردو ہائی اسکول چالیس گاؤں کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان تقریری مقابلہ ہوا۔ پنجم تا ہفتم کے طلبہ کے جونیر گروپ میں پی۔ زیڈ ہائی اسکول بھساول کی ہوشیار طالبہ ثمینہ جلال بنت خلیل انجم نے پہلا انعام حاصل کیا۔ اس بچی کی عمر بارہ سال ہے۔

شان دار کامیابی

چالیس گاؤں اینگلو اُردو ہائی اسکول کے زیر اہتمام عید میلاد النبی کے موقع پر ہونے والے تقریری مقابلے میں تہذیب ہائی اسکول مالیگاؤں کے دو ہونہار طلبہ عبد الودود اور نثار احمد نے دوسرا انعام اور پروین اختر محمد حسین نے خصوصی انعام حاصل کیا

بھیونڈی میں سیرت النبی تقریری مقابلہ

بھیونڈی۔ چوتھا کل مہاراشٹر سیرت النبی تقریری مقابلہ انجمن فروغ تعلیم کی جانب سے نار پل تالاب میدان پر سہ پہر کو قاری شمس الدین کی تلاوتِ قرآن سے شروع ہوا۔

جناب غلام جیلانی ندوی نے ننھے مقرر طلبہ و طالبات کی کاوشوں کی ستایش کی اور ان کا شکریہ ادا کیا۔

جونیر گروپ، اوّل انعام سعدیہ بنت محمد مصطفا سوسیں ماڈل پرائمری اسکول مالیگاؤں۔

دوم: شعیب جان عالم مومن میونسپل اردو اسکول نمبر ۲ بھیونڈی۔

سوم: جویریہ خاتون محمد حسن ضلع پریشد اردو اسکول۔ آس بی بی بھیونڈی۔ سینیر گروپ اوّل مومن نوید اختر شاد آدم تیغ ٹیکنیکل ہائی اسکول بھیونڈی۔ دوم نعمانہ محمد ابراہیم انجمن تبلیغ الاسلام ہائی اسکول کرلا بمبئی۔ سوم افضل شفیق ملّا کے۔ ایم۔ ای سوسائیٹیز ہائی اسکول پڑگہ۔

بیرون بھیونڈی سے مقابلے میں شرکت کرکے سب سے زیادہ نمبرات حاصل کرکے سعدیہ بنت محمد مصطفا مالیگاؤں اور نعمانہ محمد ابراہیم کرلا بمبئی کو انجمن کی جانب سے ٹرافی دی گئی۔

(غلام نبی مومن سکریٹری مقابلہ کمیٹی)

تعلیمی اجتماع

مورخہ ۱۲ر مارچ ۸۲ء کے روز کنیا اسکول گورے گاؤں تعلقہ مانگاؤں ضلع رائے گڑھ میں کمشن وستار ادھیکاری شندے صاحب کے زیر صدارت ابتدائی مدرسین کا دو روزہ تعلیمی اجتماع منعقد ہوا۔

رائے گڑھ ضلع کی مشہور گلوکارہ ساٹھے صاحبہ کی استقبالیہ نظم کے بعد ضلع پریشد رائے گڑھ کے ممبر کھلے صاحب کے دستِ مبارک سے تعلیمی نمایش کا افتتاح عمل میں آتے ہی تعلقہ پنچایت سمیتی مانگاؤں کے نائب سبھاپتی قاضی صاحب۔ بی۔ ڈی۔ او۔ پاٹل صاحب مراٹھے، سر کاشی۔ سر شیخ، سر مومن سر اور صادق سر وغیرہ نے اساتذہ کی رہ نمائی کی۔

قومی ترانہ کے بعد دو روزہ اجتماع حسن و خوبی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا

تہذیب ہائی اسکول اوّل

مسلم ویلفیر ایسوسی ایشن نند دربار کے زیر اہتمام ہونے والے آل انڈیا مہاراشٹر تقریری مقابلے میں تہذیب ہائی اسکول مالیگاؤں کے ہونہار طالب علم پرویز اختر محمد حسن (دہم) نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کرکے سینیر گروپ اوّل نمبر کی شیلڈ حاصل کی۔ تقریر کا عنوان تھا۔ اقلیتی فرقہ اور اس کے مسائل نیز اسکول ہٰذا کے ایک اور طالب علم عبد الودود و نثار احمد (دہم) نے خصوصی انعام حاصل کیا۔

بدشعیب بادشاہ عمر ۱۱ سال
وق: نماز کی پابندی، روزانہ اسکول۔ ڈاک ٹکٹ جمع کرنا۔
. کیئر آف سید ہاتف باشاہ ۳/۱۳۳/۴۲ پولیس لائن کرنول (اے پی)

ینہ عمر ۴ سال
غلہ: بچوں جیسی باتیں کرنا، ماما کی تلاش اور ماما سے بے انتہا محبت کرنا
: جی ۳/۲/۲۷ رام نگر لین گارڈن ریچ روڈ۔ کلکتہ ۲۴

یاض احمد عمر ۱۵ سال
غلہ: نماز پڑھنا۔ ماں باپ کی خدمت۔ سائنس سے دل چسپی۔
. معرفت منشی اظہار الحق اسسٹنٹ بینک لال باغ دربھنگہ (بہار)

تم راہی عمر ۱۲ سال ۶ ماہ ۱۷ دن
وق: اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا۔ بزرگوں کی خدمت کرنا۔
. کیئر آف تعلیمی لائبریری سری پور ۳ ضلع بردوان (مغربی بنگال)

اوید اختر عمر ۱۵ سال
وق: نظم اور افسانے اور "پیام تعلیم" دل چسپی سے پڑھنا اور لکھنا۔
: جاوید اختر درجہ ہشتم، مڈل سکشن انسان اسکول کشن گنج (بہار)

ردوس حسین راٹھور عمر ۲۱ سال
شغلہ: قلمی دوستی، فوٹو اور ٹکٹ جمع کرنا۔ کرکٹ اور فوٹو گرافی۔
. فردوس حسین معرفت ریگل اسٹوڈیو ڈوڈہ سٹی ۱۸۲۲۰۲ کشمیر (بھارت)

زالہ فاطمہ زہرا عمر ۱۲ سال
شغلہ: بچوں کے رسالے کا مطالعہ۔ بہنوں سے قلمی دوستی کرنا۔
پتا: معرفت ایم۔ اے، قاسمی بلہا منور تھہ ڈاک خانہ رسل پور سیتامڑھی۔

مسعود سعد سلمان عمر ۱۰ سال
شغلہ: ڈاک ٹکٹ جمع کرنا۔ رسالہ پڑھنا۔ خطوں کا جواب دینا۔
پتا: معرفت ایم۔ اے قاسمی بلہا منور تھہ ڈاک خانہ رسل پور سیتامڑھی۔

ایم علی حسین عمر ۱۸ سال
مشغلہ: اخبار پڑھنا۔ سائنسی کتابوں کا مطالعہ، بڑوں کا ادب کرنا۔
پتا: غنی کالونی۔ ٹوپ میک انجینیرس پوسٹ اسلام پور حصن آباد ۵۱۱۵۲۶۵۸

معراج الدین عمر ۱۴ سال
مشغلہ: "پیام تعلیم"، کہانیاں لکھنا، فٹ بال کھیلنا، جاسوسی ناول پڑھنا۔
پتا: اورنگ آباد محلہ شاہ بازار گھر نمبر ۷۰-۲۱ = ۱۔ ۴۳۱۰۰۱

فہیم فاروقی عمر ۲۰ سال
شوق: کتابیں پڑھنا۔ پیار سے لڑنا وغیرہ
پتا:۔ جونا رسالہ اندور ۴۵۲۰۰۶

محمد یوسف خورشید عمر ۱۷ سال
مشغلہ: نماز پڑھنا، کالج جانا۔ افسانہ لکھنا۔
پتا: سلمیٰ فینسی اسٹورس۔ شاہی محلہ کلٹی۔ بردوان (مغربی بنگال)

نواب عتیق اطہر زاہدی عمر
مشغلہ: اپنے درجے میں فرسٹ آنا۔ بچوں کو رُلانا۔
پتا: اطہر نکیتن گرجا پاڑہ پوسٹ رانی گنج ضلع بردوان (مغربی بنگال)

سیّد ریحان علی عمر ۲۰ سال
شوق: "پیام تعلیم" اور دینی رسالے کا مطالعہ، خط کا جواب دینا۔
پتا: سیّد ریحان علی رحمت نگر نیا محلہ پوسٹ برن پور ضلع بردوان ۷۱۳۳۲۵

مکتبہ جامعہ بک کلب
کا
ممبر بن کر اُردو کی ادبی اور معیاری کتابیں رعایتی قیمت پر حاصل کیجیے
ہمیں یقین ہے کہ اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس نئی اسکیم سے استفادہ کریں گے اور ہمیں موقع دیں گے کہ ہم کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ اچھی کتابیں آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں
قواعد وضوابط :
۱۔ بک کلب کی فیس رکنیت پانچ روپے (Rs.5/=) ہوگی۔
۲۔ بک کلب کے ہر ممبر سے ماہنامہ "کتاب نما" کا (جس کا سالانہ چندہ آٹھ روپے (Rs 8/=) ہے صرف چار روپے (Rs. 4/=) سالانہ چندہ لیا جائے گا۔
۳۔ ہر ممبر کو مطبوعاتِ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (غیر درسی پر) 25% اور ہندستان میں چھپی ہوئی تمام اُردو کی کتابوں کی خریداری پر 5¼% کمیشن دیا جائے گا۔ (ہر فرمائش پر کلب کی ممبری کا حوالہ دینا ضروری ہوگا۔)
۴۔ بک کلب کا ممبر صرف انفرادی طور سے بنا جا سکتا ہے۔ کوئی لائبریری بک کلب کی ممبر نہیں بن سکتی۔
۵ ممبری کے دوران، ممبر حضرات جتنی بار چاہیں کتابیں خرید سکتے ہیں۔
۶۔ کتابیں بذریعہ وی۔پی روانہ کی جائیں گی اور اخراجاتِ روانگیٔ کتب ممبر کے ذمے ہوں گے۔
۷۔ گیارہ مہینے گزرنے کے بعد ہر ممبر کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ فیس رکنیت کی کتابیں خرید کر پچھلا حساب صاف کرے اور آیندہ کے لیے پھر سے رکنیت کی فیس بذریعہ منی آرڈر روانہ کرے۔
۸۔ بک کلب کی رکنیت کی مدت پوری ہوجانے کے باوجود اگر کسی ممبر نے اپنی طرف سے کتابوں کا آرڈر نہیں بھیجا تو ہم مجبوراً اپنی پسند کی کتاب بھیج کر حساب صاف کردیں گے۔
ممبر حضرات اپنی پسند کی کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یا اس کی کسی بھی شاخ سے حاصل کرسکتے ہیں
صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر نئی دہلی 110025
شاخیں
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اُردو بازار، دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ، بمبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 2001

بچوں کی کوشش

کوّے اور گلہری نے تیز رفتار ہرن کو ہرا دیا

ایک جھیل کے کنارے دُور دُور سے آکر جانور بسیرا کرتے اور اپنے گھونسلے بناتے تھے۔ وہاں ایک کوّے اور گلہری کی دوستی بہت مشہور تھی۔ ان دونوں کے گھونسلے بھی ایک دوسرے کے قریب تھے۔ وہ اکثر اپنے گھونسلوں میں میٹھے باتیں کرتے اور گھنے درختوں کی نرم نرم ٹہنیوں پر جھولا جھولتے رہتے۔ گرد و نواح کے ہر جانور کی زبان پر اُن کی دوستی کی داستانیں تھیں۔

وہاں ایک خوب صورت اور بہت طاقت ور ہرن بھی رہتا تھا، جو اکثر اپنے دوسرے ساتھیوں کو اپنی شرارتوں سے پریشان کیا کرتا۔ وہ بڑا مغرور تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُس سے زیادہ تیز کوئی جانور دوڑ نہیں سکتا۔ وہ جب بھی کسی سے بات کرتا تو کہتا۔ "تم ہماری کیا بات کرتے ہو، ہمیں تو ہوا بھی نہیں پکڑ سکتی میری رفتار ایک طوفان ہے۔"

کوّا اور گلہری بھی یہ تمام باتیں سُن رہے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہرن کے غرور کو کچلنے کی ترکیب سوچنے لگے۔ باتوں ہی باتوں میں کوّا کہنے لگا۔ "آیئے میرے ساتھ، ہم اس مغرور ہرن سے مقابلہ کریں گے اور اسے ایسی شکست دیں گے کہ وہ آئندہ سر نیچا کر کے چلے۔"

کوّے کی بات سُن کر گلہری نے حیرانی سے پوچھا: کوّے میاں! ہم ایسے تیز جانور کا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں؟

کوّا بولا: "گلہری بی! آپ گھبرائیں نہیں۔ بس آپ آئیں اور اس سے مقابلے کا اعلان کریں، یہ مقابلہ جیتنا ہمارا کام ہوگا۔"

ہرن شیخیاں بگھارنے میں مصروف تھا کہ اُس کی توجّہ حاصل کرنے کے لیے کوّا زور سے چیخا پھر بولا: ہرن بھائی! ادھر دیکھو گلہری آپ سے مقابلہ کرنا چاہتی ہے۔"

یہ سُن کر ہرن غصّے سے لال پیلا ہوگیا۔ کہنے لگا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھ سے تیز رفتار جانور کا مقابلہ ایک چھوٹی سی گلہری کرے۔"

ہرن کی اس بات پر جنگل کے دوسرے جانور کہنے لگے۔ "اگر گلہری نے آپ سے مقابلے کا اعلان کیا ہے تو اس میں غصّے کی کیا بات ہے؟ آپ مقابلہ کرلیں۔" ہرن راضی ہوگیا۔

شرط لگی کہ سامنے پہاڑی کی جو چوٹی ہے، وہاں پہلے کون پہنچتا ہے۔ دوسرے دن صبح ہی صبح تمام جانور جھیل کے کنارے جمع ہوگئے۔ ہر جانور گلہری کے حق میں دُعائیں مانگ رہا تھا۔ مقابلہ شروع ہوا۔ ہرن بہت تیزی سے پہاڑ کی طرف دوڑنے لگا۔ گلہری بھی اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں سے زوروں میں دوڑتی ہوئی پہاڑ کی طرف بھاگ رہی تھی۔ اچانک کوّے نے دوسرے تمام جانوروں کی نگاہیں بچا کر گلہری کو اپنے پنجے میں بڑی نرمی سے اُٹھا لیا اور پورے جوش سے پرواز کرنے لگا۔ ہرن نے ابھی آدھا سفر بھی پُورا نہیں کیا تھا کہ کوّے نے گلہری بی کو نہایت صفائی کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر بٹھا دیا اور خود چپکے سے جھیل کے کنارے آ بیٹھا۔ اُدھر ہرن بڑی تیزی سے دوڑتا ہوا جب پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو گلہری وہاں موجود تھی۔ اُسے دیکھ کر ہرن نیم پاگل ہوگیا۔ شرم سے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جب وہ واپس جھیل پر پہنچا تو ہر ایک نے اُس کا

مذاق اُڑایا۔ گلہری کی جیت پر تمام جانور ہرن کے سامنے ناچنے لگے۔

یہ منظر دیکھ کر ہرن نے جنگل کے تمام جانوروں سے معافی مانگی اور آئندہ کسی کو تنگ کرنے سے توبہ کر لی اور وہ جہاں بھی گلہری کو دیکھتا، جھک کر سلام کرتا۔

محمد قتادہ بن طلحہ کلکتہ

انگوٹھا خاں

کسی گانو میں ایک لکڑہارا رہا کرتا تھا۔ اُس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ بے چارا رات دن اِسی فکر میں رہتا کہ کوئی اولاد ہوتی۔ بڑی نااُمیدی کی حالت میں اُس نے ایک دن اپنی بیوی سے کہا: "اگر گھر میں ایک بھی بچّہ ہوتا تو وہ شور و غل کرتا اور ہم خوش ہوتے۔" بیوی نے بھی ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا: "آہ ہماری ایسی قسمت کہاں؟ اگر انگوٹھا بھر کا بھی بچّہ ہوتا تو بھی مجھے خوشی ہوتی اور میری ذات پر بے اولادی ہونے کا الزام نہ آتا۔"

خدا کو ان دونوں میاں بیوی کی حالت پر رحم آ گیا اور کچھ دنوں کے بعد لکڑہارے کی بیوی کے لڑکا پیدا ہوا، جس کا ٹھیک انگوٹھے کے برابر قد تھا۔ دونوں میاں بیوی بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے فقیروں کو کھانا کھلایا اور اُس لڑکے کا نام انگوٹھا خاں رکھ دیا۔ انگوٹھا خاں کی عمر جب دس سال کی ہوئی جب بھی اُن کا قد انگوٹھے سے زیادہ نہ بڑھا۔ دونوں میاں بیوی نے دودھ، پھل اور خوراک میں کوئی کوتاہی نہ کی لیکن انگوٹھا خاں نے کسی طرح بڑھنے کا نام ہی نہ لیا۔

ایک روز لکڑہارا لکڑی کاٹنے جنگل جا رہا تھا۔ بیل گاڑی میں بیٹھ کر جب بیل گاڑی کو ہانکتے ہانکتے تھک گیا تو کہا: "اگر کوئی ہوتا تو اُس سے گاڑی ہانک کر جنگل چلنے کو کہتا۔"

انگوٹھا خاں بولا: "ابّا! آپ فکر مت کیجیے۔ میں خود [illegible]

لے کر چلا۔ یہ دیکھ کر دو مسافروں کو بڑا تعجب ہوا۔ انھوں نے سوچا کہ شاید کوئی آدمی بیلوں کو چلنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ آؤ کچھ دور آگے بڑھ کر دیکھیں کہ کیا وجہ ہے۔ خیر وہ لوگ بھی گاڑی کے پیچھے پیچھے چل دیے۔ گاڑی ایک جگہ جا کر رُک گئی۔ اور انگوٹھا خاں بیل کے کان سے نکل کر الگ جا کھڑا ہوا۔ یہ تماشا دیکھ کر مسافروں کو سخت حیرت ہوئی۔ اُن میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے کہا: "کیا اچھا ہوتا کہ ہم لوگ اس عجیب بچّے کو خرید لیتے اور اِس کے ذریعے لوگوں کو تماشا دکھلا کر ڈھیر سارے رُپے جمع کر لیتے۔" دوسرا مسافر بھی راضی ہو گیا۔ اور دونوں لکڑہارے کے پاس پہنچے اور کہا: "اگر آپ اس بچّے کو ہمارے ہاتھوں بیچ دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔" لکڑہارے نے کہا: "اگر آپ ساری دنیا کی دولت بھی دیں گے تو بھی ہم اسے نہیں دے سکتے۔ یہی ہماری ایک اولاد ہے۔"

انگوٹھا خاں یہ ساری باتیں سُن رہا تھا۔ وہ آہستہ سے باپ کے کندھے پر جا بیٹھا اور چُپکے سے باپ کے کان میں کہنے لگا: "ابّا جان! آپ مجھے ان لوگوں کے ہاتھ سو نیب دیجیے۔" کچھ دیر کے بعد لکڑہارا راضی ہو گیا اور انگوٹھا خاں کو پانچ سو رُپوں پر مسافروں کے ہاتھ بیچ دیا۔ انگوٹھا خاں مسافر کے کندھے پر جا بیٹھا۔ یہ مسافر پہاڑ اور دریا کو پار کرتے چلے جا رہے تھے۔ بہت دیر تک چلتے رہنے کے بعد وہ لوگ آرام کرنے کے لیے ایک سایہ دار پیڑ کے نیچے بیٹھ گئے۔ موقع پاتے ہی انگوٹھا خاں چپکے سے ایک چوہے کے بل میں گھُس گئے۔ مسافروں نے بہت تلاش کیا مگر وہ نہ ملے۔ آخر بے چارے مسافر اپنی بے وقوفی پر افسوس کرتے ہوئے ایک طرف چل دیے۔ شام ہو گئی تھی۔ انگوٹھا خاں چوہے کے بل سے نکل کر گھانس پر لیٹ گیا۔ کچھ رات گئے دو چور چوری کرنے نکلے۔ اور اسی راستے سے آپس میں باتیں کرتے جا رہے تھے: "آج کسی طرح اُس امیر کی ساری دولت چُرا کر لانا چاہیے۔" یہ آواز جب انگوٹھا خاں کے کان میں پڑی تو اُس نے کہا: "ہاں ہاں! میں بھی تمھاری مدد کروں گا۔" چور یہ سُن کر گھبرائے اور چاروں [illegible]

مگر انگوٹھا خاں کی باتیں سُن کر بہت خوش ہوئے اور انگوٹھا خاں ان میں سے ایک کے کندھے پر بیٹھ گیا۔ جب چور اُس شریف آدمی کے گھر پہنچے تو انگوٹھا خاں نے کہا: "مجھے اندر جانے دو۔ میں تمھیں بتا دوں گا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔" چوروں نے ایسا ہی کیا۔ انگوٹھا خاں اندر پہنچ کر چلّایا: "دوڑو، دوڑو، جاگو چور گھر میں گھس آئے ہیں۔ اور ساری چیزیں لُوٹ رہے ہیں۔"

اس شور سے گھر کے سارے لوگ جاگ اُٹھے نتیجہ یہ ہوا کہ چور بھاگ گئے اور شریف آدمی کا مال بچ گیا۔ انگوٹھا خاں کھڑکی کی راہ سے آنگن میں پہنچ گیا۔ وہاں گائے بھینس کے کھانے کے گملے رکھے تھے۔ انگوٹھا خاں اُسی میں گھس کر سو گیا۔ صبح ہوتے ہی نوکر آیا۔ صبح ہوتے ہی نوکر آیا اور اُس نے گملا بھینس کے آگے رکھ دیا۔ بھینس چارہ کھانے لگی تو میاں انگوٹھا اُس کے حلق میں جا پہنچے، لیکن وہیں سے چلّانے لگے "مجھے بچاؤ، بچاؤ"۔ "اگر میں بھینس کے پیٹ میں چلا گیا تو تمھاری ساری دولت برباد ہو جائے گی۔"

بھینس کو آدمی کی طرح بولتے ہوئے دیکھ کر لوگ دوڑ پڑے۔ مالک کو حیرانی ہوئی۔ آخر بے چاری بھینس مار ڈالی گئی اور اس کی لاش جنگل میں پھینک دی گئی۔ ایک بھیڑیا وہاں آ گیا اور بھینس کو کھانے لگا۔ انگوٹھا خاں بھیڑیے کے پیٹ میں جا پہنچے تو اُس سے بولے "میرے اشارے پر چل تو میں تجھے وہاں لے چلوں گا جہاں اس سے زیادہ مزے دار کھانے ملیں گے۔" بھیڑیا راضی ہو گیا اور اُس کے اشارے پر چل پڑا۔ اِس طرح انگوٹھا خاں اپنے گھر آ گئے اور اپنے باپ سے چلّا کر کہا:

"ابّا! اس بھیڑیے کو مار ڈالیے، میں اِسی کے پیٹ میں ہوں۔" باپ نے کلھاڑے سے بھیڑیے کو مار ڈالا اور انگوٹھا خاں اُس کے پیٹ سے نکل آئے اور ماں باپ کے ساتھ مزے میں رہنے لگے۔

سیّد محمد احسن
۱۰۸-۳۴ امیر روڈ، ہر ان لور (یہ دواڑا)

عقل مند چرواہا

کسی گانو میں ایک غریب کسان کا لڑکا بکریاں چرا کر اپنا پیٹ پالتا تھا۔ حالاں کہ اُس کے باپ کو مرے ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے لیکن وہ اُسی وقت سے اپنی بیوہ ماں اور چھوٹی بہن کی پرورش برابر کرتا آ رہا تھا۔ اُس کی عمر کوئی سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی۔ وہ محنتی ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کا ذہین اور عقل مند تھا۔ اُس کی عقل مندی کو دیکھ کر گانو کے لوگ اُس سے ایسے سوالات کرتے جن کا جواب بہت مشکل ہوتا، لیکن وہ نوجوان چرواہا آسانی سے سوالات کے جوابات اِس طرح دیتا گویا اُس نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔

ایک مرتبہ اس گانو کے حاکم نے گانو اور اُس کے اطراف میں ڈھنڈورا پٹوایا کہ جو کوئی ہمارے تین سوالوں کا جواب صحیح طور سے دے گا، اُس کے ساتھ وہ اپنی بیٹی کی شادی کر دے گا اور اپنی جاگیر بھی انعام میں بخش دے گا۔ وہ نوجوان چرواہا جب گھر آیا تو اُس کی ماں نے خوشی خوشی منھ ہاتھ دھونے کے لیے پانی دیتے ہوئے کہا: "تو بہت عقل مند ہے مجھے تیری عقل مندی پر پورا بھروسا ہے اور یقین ہے کہ تو ہی حاکم کے تینوں سوالات کا صحیح جواب دے سکے گا۔ پھر میں حاکم کی بیٹی کی ساس بن جاؤں گی۔"

چرواہے نے حسرت سے ماں کا منھ تکتے ہوئے کہا: "ماں کیا بات ہے؟ تم ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔" ماں نے اپنے بچّے کو حاکم کا پورا اعلان سنایا۔ پہلے تو چرواہا خوش ہوا، پھر سنجیدگی سے بولا: "ماں! وہاں بڑے بڑے راجے، مہاراجے آئیں گے، میں وہاں کس گنتی میں ہوں؟ کہاں راجا بھوج اور کہاں گنگوا تیلی۔" لیکن ماں کی ضد تھی، اُسے اپنے بچّے پر پورا بھروسا تھا اور کیوں نہ ہوتا، آخر وہ اُس کی ماں تھی۔ اُس نے مقررہ وقت پر اپنے بچّے کی ہمّت بندھا کر وہاں بھیج ہی دیا۔

حاکم کی ڈیوڑھی میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ حاکم ایک اونچ[illegible]
[illegible]

(ر) دائیں ہاتھ کی جانب اُس کی کنواری بیٹی بیٹھی تھی جس (کی) شادی صحیح جواب دینے والے کے ساتھ ہونے والی تھی حاکم (کے) سامنے بڑے بڑے راجے مہاراجے آبیٹھے تھے۔ اُن کے پیچھے (ایک) غریب نوجوان چرواہا جاکر بیٹھ گیا۔ حاکم نے باری باری ہر ایک (سے) سوالات کیے، مگر وہ کسی کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ (آخ)ر میں چرواہے کی باری تھی۔ حاکم اور اس کی بیوی دونوں (ہ)ی مایوس ہوگئے کہ یہ آخری اور مفلس آدمی کیا جواب دے گا (چ)رواہا فرشی سلام کرکے ہاتھ باندھے حاکم کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ حاکم نے دوسروں کی طرح اس سے بھی پہلا سوال کیا۔

۱:- بتاؤ! سمندر میں پانی کے کتنے قطرے ہیں؟

ج:- چرواہے نے عرض کیا۔
سمندر میں جو پانی گر رہا ہے آپ اُسے رُکوا دیں تاکہ اُس کے پانی کے قطروں کا صحیح اندازہ ہوسکے۔ حاکم اور عوام بہت خوش ہوئے۔ چرواہے کو کافی داد دی۔

دوسرا سوال۔ "بتاؤ! آسمان پر ستارے کتنے ہیں؟

چرواہے نے جواب دیا۔

ج:- صحرا میں ریت کے جتنے ذرّات ہیں۔ یقین نہ آتا ہو تو گن کر دیکھ لیجیے۔

حاکم یہ جواب سن کر اُچھل پڑا اور کہا: بہت خوب! بہت خوب!

تیسرا سوال حاکم نے پوچھا۔
بتاؤ! ہماری حکومت میں سب سے زیادہ عقل مند کون ہے؟

ج:- چرواہے نے بے ساختہ جواب دیا:
"میں"

حاکم کا چہرہ فق ہوگیا۔ کہ یہ لڑکا کیسی بات کرتا ہے۔ حاکم نے اس کا سبب پوچھا کہ تم اپنے آپ کو سب سے زیادہ عقل مند کیوں سمجھتے ہو؟

چرواہے نے جواب دیا: "صرف میں نے ہی آپ کے پہلے دونوں سوالات کے بالکل صحیح جواب دیے۔ اور صحیح جواب دینے والے ہی کو عقل مند کہنا چاہیے۔

حاکم یہ جواب سن کر بہت خوش ہوا۔ اُس نے اپنے وعدے کے مطابق نوجوان چرواہے سے اپنی حسین لڑکی کی شادی کردی اور ایک بہت بڑی جاگیر انعام میں دے دی۔ اب وہ غریب چرواہا ہنسی خوشی عیش و عشرت کی زندگی گزارنے لگا۔ اور حاکم کے مرنے کے بعد یہ حاکم قرار پاگیا۔

نصرت خانم بنت محمد خاں ماسٹر
★ عمر ۹ سال، جماعت چہارم الف۔ شیگاؤں (بلڈانہ)

فرض

نیلو مینا بڑی رحم دل تھی۔ وہ دوسروں کی مدد کرنا سب سے بڑا فرض سمجھتی تھی۔ نیلو کی پڑوسن بنّی مینا تھی جو بڑی گھمنڈی اور جھگڑالو تھی۔ نیلو ہمیشہ اُس سے کہا کرتی "تم اپنی عادت بدل دو، ورنہ ایک دن ضرور مصیبت میں پڑ جاؤ گی۔"

بنّی یہ سُن کر ناک سکوڑ کر رہ جاتی۔ ایک دن نیلو بیمار پڑ گئی۔ اسی دن سے وہ دانے چگنے نہ جاسکی۔ شام کو اُس کے بچے بھوک سے بلبلانے لگے۔ بنّی کا گھونسلہ بالکل نزدیک تھا۔ نیلو نے وہیں سے کراہتے ہوئے کہا۔

"بہن بنّی! تم جانتی ہو کہ آج مجھے زبردست بخار ہے۔ اِس لیے میں آج دانہ چگنے نہ جاسکی۔"

ناک سکوڑ کر بنّی نے کہا: "تو میں کیا کروں؟"

نیلو کو یہ جواب تو بُرا لگا۔ لیکن اُس نے نرمی سے کہا:

"کیا آج تم مجھے تھوڑے سے دانے دو گی؟ میرے بچے بہت بھوکے ہیں۔"

"واہ ری! دن بھر گھوم گھام کر میں نے تھوڑے سے جو دانے ــــ جمع کیے ہیں وہ میرے بچّوں کے لیے ہیں تمھیں دے دوں تو میرے بچے کیا کھائیں گے؟"

نیلو کو ایسا جواب سُن کر بہت بُرا لگا۔ مگر وہ چُپ ہی رہی۔ تھوڑے دنوں بعد وہ ٹھیک ہوگئی۔ تب تک مینو مینا نے اُس کی مدد کی۔

ایک روز نیلو مینا نے بنّی کے گھونسلے سے رونے چلّانے کی آوازیں سُنیں۔ اُس نے بنّی کے گھونسلے میں جھانک کر دیکھا

کہ بنّی کے بچے رو رہے ہیں اور بنّی کا کہیں پتا نہیں۔
بنّی کے بچّوں سے پوچھنے پر پتا چلا کہ شام ہونے پر بھی بنّی ابھی دانہ چُگ کر لوٹی نہیں تھی اور بنّی کے ننھّے بچے بہت بھوکے تھے۔
نیلو نے پہلے بنّی کے بچّوں کو دانہ کھلایا اور پھر مینو مینا سے کہا: "آؤ ذرا بنّی کو ڈھونڈنے چلیں۔" اس پر مینو نے جانے سے منع کرتے ہوئے کہا: "جب بنّی کسی کی مدد نہیں کرتی تو ہم اُس کی مدد کیوں کریں؟"
نیلو کے بہت سمجھانے بجھانے پر وہ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ دونوں بنّی کو ڈھونڈنے کے لیے چل پڑیں۔ بہت ڈھونڈنے پر بنّی اُنھیں ایک جھاڑی میں پھنسی ہوئی ملی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ شاید "باز" (شکاری پرندے) نے اُس پر جھپٹّا مارا تھا۔ اس لیے بنّی بے ہوش ہو کر جھاڑی میں گر گئی تھی۔ جھاڑی میں سے باز اپنے شکار کو حاصل نہ کر سکا ہوگا اور پھر ہار کر لوٹ گیا ہوگا۔
نیلو اور مینو نے مل جُل کر اُسے کسی طرح جھاڑی سے باہر نکالا اور نرم نرم گھاس پر لٹا دیا۔ نیلو جا کر کہیں سے جڑی بوٹیاں لائی، اُنھیں گھس گھس کر بنّی کے زخموں پر لگا دیا اور پاس کی ندی سے اپنی چونچ میں پانی بھر بھر کر لاتی رہی اور بنّی کے منھ پر پانی ڈالتی گئی۔ دونوں کی امداد سے بنّی جلد ہی ہوش میں آ گئی۔
آنکھیں کھول کر اُس نے نیلو کو دیکھا تو اُسے شرم آ گئی۔ اُس نے اپنا سر جھکا کر کہا: "نیلو بہن! میں اُس دن کے اپنے برتاؤ سے بہت نادم ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ میں نے کیسا بُرا برتاؤ کیا تھا۔ اور تم میرے ساتھ کیسی بھلائی کر رہی ہو؟"
نیلو دھیمی آواز میں بولی: "یہ تو میرا فرض ہے۔"
اُس دن سے بنّی کی عادتیں بدل گئیں۔ اب وہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ میل جول اور پیار سے رہنے لگی اور ضرورت پڑنے پر اُن کی مدد بھی کرتی۔
(ہندی سے ترجمہ)

جاوید احمد رنگ ریز
پنچایت سمیتی کے پیچھے، عثمان آباد

کالا راستہ

کسی گانو میں ایک کمھار رہتا تھا جو بہت نیک تھا۔ اُس کا ایک بیٹا تھا، جس کا نام اختر تھا۔ یہ ابھی چھوٹا ہی تھا کہ اُس کے سر سے ماں کا سایہ اُٹھ گیا۔ اختر اب کچھ سمجھ دار ہو چکا تھا۔ اِس لیے اُس کے باپ نے اختر کو اسکول میں داخل کر دیا۔ یہ دل لگا کر پڑھتا تھا۔ اُس کا باپ جو پیسہ کماتا اُس سے اپنی اور اپنے بیٹے کی پرورش کرتا۔ اختر اسکول جاتا تو بہت غصّے میں ہوتا۔ کیوں کہ اختر کے اسکول کو جو راستہ جاتا تھا وہ گانو سے بہت نزدیک پڑتا تھا لیکن اس نزدیکی راستے سے کوئی بھی نہ جاتا۔ بلکہ گھماو کے راستے سے سب جایا کرتے۔ نزدیک والے راستے سے جو بھی جاتا، واپس نہ آتا۔ اُس راستے میں ایک پیپل کا درخت تھا، جس پر ایک کالا ناگ رہتا تھا۔ اِس لیے اُس راستے کو لوگ "کالا راستہ" کہتے تھے۔ جب اختر اور اُس کے دوست اسکول جاتے تو انھیں سڑک کی طرف سے جانا پڑتا۔ سڑک کے راستے سے اسکول بہت دور پڑ جاتا تھا۔ اختر جب اسکول جاتا تو دانت پیس کر رہ جاتا۔ ایک روز اُس کے دوست نے اختر سے کہا کہ میں تو آج اِسی نزدیکی راستے سے اسکول جاؤں گا۔ دیکھنا ہے ناگ کیا کرتا ہے؟ یہ کہہ کر اُس نے ایک لاٹھی لی اور چل پڑا۔ لوگوں نے اُسے بہت روکا لیکن وہ نہ مانا۔ لوگ اس کا انتظار کر رہے تھے، لیکن وہ نہ لوٹا۔ ماں باپ پریشان تھے، رو پیٹ رہے تھے۔ اختر سے یہ نہیں دیکھا گیا۔ اُس نے اُسی وقت قسم کھائی کہ "میں اُس ناگ کو مار ڈالوں گا۔" وہ دوڑ کر اپنے گھر گیا اور ایک موٹی سی لاٹھی اُٹھائی اور اُسی طرف دوڑنے لگا۔ لوگوں نے اُس کو بھی بہت روکا مگر وہ نہیں مانا۔ اُس کے باپ نے بھی بہت منع کیا، لیکن وہ چلا ہی گیا۔ پیپل کے پیڑ کے پاس پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنے دوست کو دیکھا جو مرا پڑا تھا۔ وہ اُسے دیکھ ہی رہا تھا کہ سانپ آ پہنچا۔ اختر ہوشیار ہو گیا۔ ناگ اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اختر نے چالاکی کی اور کہا:

"او کریم! منہ کیا تاک رہے ہو، لاٹھی چلاؤ۔"
ناگ نے مُڑ کر دیکھا۔ ناگ مُڑا ہی تھا کہ اختر نے لاٹھی چلائی جو ناگ کے سر پر لگی اور وہ چھٹپٹانے لگا۔ اختر نے دو تین لاٹھیاں اور بھی جمائیں۔ ناگ مر گیا۔ اور وہ دوڑ کر اپنے دوست کے پاس آیا۔ اس کو اُٹھا کر اپنے کندھے پر لاد لیا اور سانپ کو گھسیٹتا ہوا اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ شام ہو گئی تھی، لوگ اس کا انتظار کر رہے تھے۔

اختر آیا تو گاؤں والوں نے خوش ہو کر اس کو "بہادر لڑکا" کا خطاب دیا اور کافی انعام دیا۔

اس کے باپ نے سینے سے لگا لیا اور "بہادر بیٹے اختر" کہہ کے پیار کیا۔ وہ بہت خوش تھا۔

ہمایوں خاں
★ کلاس IX پیر بہوڑ مسلم ہائی اسکول پٹنہ۔ عمر ۱۲ سال)

حکایت

ایک رات ایک شخص نے خواب میں دیکھا۔ گویا میں ایک وسیع میدان میں ہوں۔ یکایک ایک بڑا ہولناک شیر ببر مجھے پکڑنے کے لیے میرے پیچھے دوڑا، میں شیر کے خوف سے بھاگا۔ جہاں اور جس طرف بھی میں جاتا ہوں وہ شیر میرے پیچھے ہے۔ کہیں مجھے پناہ نہ ملی مگر سامنے کی طرف مجھے ایک کنواں نظر آیا۔ جس کے کنارے پر ایک درخت کھڑا تھا اور درخت کی شاخیں کنوئیں کے اندر لٹکی ہوئی تھیں۔ میں شیر کے خوف سے جلدی سے درخت کی ٹہنیاں پکڑ کر کنوئیں کے اندر لٹک گیا۔ وہ شیر میری تلاش میں کنوئیں کے پاس میرے سر کے عین اُوپر کھڑا ہو گیا لیکن میں وہاں شیر کے خطرے سے کسی قدر محفوظ تھا۔ مگر جس وقت میں نے اپنے نیچے کنوئیں کی تہہ کی طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ وہاں ایک عظیم الشان اژدہا منہ کھولے ہوئے منتظر ہے کہ میں جوں ہی نیچے گروں تو وہ مجھے اپنا لقمہ بنا لے۔ الٰہی! خیر ہو، اُوپر شیر ہے اور نیچے اژدہا۔ اب کیا کروں؟ خیر ٹہنیاں پکڑے ہوئے میں لٹکتا رہا۔ مگر اس عالم میں بھی خیریت نظر نہ آئی۔ جن شاخوں کے سہارے میں لٹکا ہوا تھا اُن کو دو جانور ایک سفید اور ایک سیاہ بڑے بڑے چوہوں کی صورت کے اپنے تیز نکیلے دانتوں سے ان شاخوں کو کاٹ رہے ہیں جیسے ان شاخوں کو درخت سے وہ ابھی الگ کر دیں گے۔ الٰہی! اب کیا کروں؟ اُوپر شیر، اندر اژدہا، اور ٹہنیوں کو کاٹنے کے لیے دو خوفناک جانور۔

یہ ہولناک خواب دیکھ کر وہ شخص بیدار ہو گیا۔ صبح کو ایک بزرگ کے سامنے یہ خواب بیان کیا۔

بزرگ صاحب نے فرمایا: "یہ خواب جو تم کو دکھایا گیا ہے اس مصیبت میں سارا جہان گرفتار ہے۔ وہ شیر موت کا فرشتہ ہے، وہ درخت تمہاری زندگی ہے، وہ دو سیاہ و سفید جانور جو ٹہنیاں کاٹ رہے ہیں رات اور دن ہیں جن کے گزرنے سے ہر شخص کی عمر کا درخت فنا ہو جاتا ہے۔ اور وہ اژدہا قبر ہے جو ہر لمحہ منہ کھولے ہوئے ہے کہ کب تم مرو اور وہ تمہیں اپنا لقمہ بنا لے۔

محمد ظہیر الدین شوخ کیرآف محمد امام انور
★ محلہ بتیانہ۔ پوسٹ کلنا۔ ضلع بردوان (مغربی بنگال)

موجودہ دور میں تعلیم نسواں ضروری ہے

انسان کی سب سے پہلی اور بڑی معلمہ ماں کی گود ہے۔ اگر ہماری مائیں بہنیں مہذب، تعلیم یافتہ اور سلیقہ مند ہوں تو اُن کی آغوش میں پرورش پانے والی نسلیں بھی متمدن، نیک اطوار اور نیک بخت ہوں گی۔ لیکن اگر عورت جاہل اور ان پڑھ ہو گی تو اولاد بھی جاہل، بے ادب اور غیر مہذب ہو گی۔

اس لیے ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اللہ پاک نے اپنی متبرک اور شان والی کتاب میں خود فرمایا ہے کہ تعلیم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ لیکن آج ہماری مائیں اور بہنیں تعلیم کی روشنی سے دور جا پڑی ہیں۔ ماضی کی روایات کو بھول چکی ہیں اور احساس کمتری کا شکار ہو گئی ہیں، اپنی شان، شوکت، عزت، عظمت اور وقار کو کھو چکی ہیں۔ انھیں ہر جگہ ذلیل و خوار کیا جا رہا ہے۔ اور حقیر نظروں سے دیکھا جا رہا ہے۔ ایسا کیوں؟

ں کی وجہ یہ ہے کہ جس نے اسلامی تعلیمات کو بھلا دیا ہو
سزا ضرور ملے گی۔ میں مسلم خواتین سے عرض کروں گا کہ
پنے ماضی کی طرف جھانک کر دیکھیں جب کہ ساری
ں مسلم مرد اور عورتوں کی شجاعت، غیرت اور عزت کا
تھا

آج کے مشینی دور میں صرف مردوں ہی کے تعلیم حاصل
سے بات نہیں بنے گی۔ بلکہ عورتوں کو بھی مردوں کے
بہ شانہ علم و عمل کے میدان میں آگے بڑھنا ہوگا۔ ملاح
سند اور کشتی بھروسے کی ہو تو موجوں کا، گرداب کا اور
ں کا کیا ڈر؟ عورتیں نیکی اور پاکیزگی کا مجسّمہ ہیں نیک اور
یافتہ عورتوں کی گود سے علم کی رسیا اور حوصلہ مند نسل ہی
ید کی جا سکتی ہے۔

آج کا دور سائنس اور ترقی کا دور ہے۔ دنیا کی قومیں
بڑھ رہی ہیں۔ ہم یعنی ہندستانی مسلمان ترقی کی دوڑ میں
پیچھے ہیں۔ اسی لیے آج یہ مسئلہ سب سے زیادہ سمجھنے کا
اجتماعی زندگی میں مرد اور عورت کی پوزیشن کیا ہو؟
ن کی مشترکہ ذمہ داریاں کیا ہونا چاہییں۔ انسانیت
ں اُسی وقت ممکن ہے جب مرد اور عورت دونوں مل
ں کی کوشش کریں۔ عورت اور مرد دونوں میں تعلیم کا
ار قابلیت ہو تو بچوں کی ذہنی تربیت بھی بہتر ہوگی اور وہ
جوہر سے آراستہ ہوں گے۔

ی نے کیا خوب کہا ہے ؎

پگھلنا علم کی خاطر مثالِ شمع زیبا ہے
بغیر اس کے نہیں پہچان سکتے ہم خدا کیا ہے

آخر میں صرف یہ التماس ہے کہ مسلم قوم کو تعلیم نسواں پر بہت
زور دینا چاہیے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو علم و عمل کی توفیق عطا فرمائے
پنا کی توفیق دے۔ (آمین)

امتیاز احمد صدیقی
معرفت محمد نبی پان کی دکان
رحمت نگر، نیا محلہ۔ برن پور۔ ضلع بردوان

"ماں"

شکر خدا جب دُنیا میں آیا!
ماں نے گلے سے مجھ کو لگایا
چھوٹا سا اک جھولا ڈالا!
شوق سے اُس میں مجھ کو جھُلایا!
جی بھر مجھ کو پیار کیا، پھر!
گانے گا کر مجھ کو سُلایا!
اچھے اچھے دیے کھلونے
طرح طرح سے مجھ کو رِجھایا
کیسے سُہیں جھُولے میں ہم!
میری ماں نے مجھ کو سکھایا!
رو کر میں نے چیخ جو ماری!
میری ماں تب دوڑ کے آئی!
گود میں لے کر پیار کیا اور!
ہولے ہولے دودھ پلایا!
پیار سے میری جانب دیکھا!
پاؤں دبائے، سر سہلایا!
باتیں کرنا اُس نے بتایا!
تب مجھ کو یہ سب کچھ آیا!
پاؤں کے نیچے ماں کے جنت!
رب نے میرے مجھ کو بتایا!
باپ کا کہنا تم مت ٹالو!
پاشا یہ معمول بنا لو!

عبدالکریم پاشا
★ کارنجہ ۵/۱۳۴۴ جوتی گیر ضلع اکولہ (مہاراشٹر)

نمازی غلام

ایک بادشاہ کشمیر کے لیے جا رہا تھا۔ اُس کے ساتھ وزیر
اور غلام بھی تھے۔ راستے میں ایک جگہ اذان کی آواز کان
میں آئی۔ غلام بھاگ کر فوراً مسجد میں چلا گیا اور نماز ادا

کرنے لگا۔ غلام کو مسجد میں بہت دیر ہوگئی تو بادشاہ نے اپنے
وزیر سے کہا: "جاؤ غلام کو بلا لاؤ!"
وزیر مسجد کے دروازے پر کھڑا ہوکر آواز دینے لگا۔
"غلام نے کہا: "ابھی آتا ہوں"۔ مگر پھر بھی غلام کافی
دیر تک نہ آیا، تو وزیر نے پھر غلام کو آواز دی۔
غلام نے پھر کہا: "بس ابھی آرہا ہوں"۔ پھر کافی دیر
ہوگئی اور غلام واپس نہ آیا۔ تب وزیر نے مسجد میں جھانک
کر دیکھا۔ غلام کھڑا تھا۔ وزیر نے کہا:
"تو کھڑا کیوں ہے؟ باہر کیوں نہیں آتا؟"
غلام نے جواب دیا:
"اے وزیر! جو ہستی تجھے اندر آنے سے روکے ہوئے ہے
وہی مجھے باہر جانے سے روک رہی ہے۔"
وزیر یہ جواب سن کر بہت شرمندہ ہوا اور فوراً مسجد میں
جاکر نماز ادا کی۔

نواب عتیق اطہر زاہدی
★ رانی گنج اردو ہائی اسکول رانی گنج بردوان (ویسٹ بنگال)

دو دوست یا بھائی

عزیز اور جاوید دو بھائی تھے اور دونوں ایک ہی اسکول
میں پڑھتے تھے۔ "عزیز چلو بھائی اسکول جانے کا وقت
ہوگیا ہے۔"
جاوید: "ارے بھائی! اتنی جلدی کیا ہے۔ ایک گھنٹہ
دیر سے جائیں گے۔
عزیز: "ایک گھنٹہ کو تم کیا سمجھتے ہو؟ ایک گھنٹے میں تین
سوال حل کیے جا سکتے ہیں۔ اگر یہ گھنٹہ چھوڑ دو گے تو کتنا
نقصان ہوگا؟
جاوید: کسی لڑکے کی کاپی سے اُتار لیا جائے گا۔ ماسٹر صاحب
پوچھیں گے کہ کہاں تھے؟ تو کہہ دیں گے امی کی طبیعت خراب
تھی اس لیے ہم اُن کی دوا لانے چلا گیا تھا۔
(اتنے میں جاوید کی امی آگئیں اور اُنھوں نے یہ باتیں

امی: تم کیا کیا بہانے بنا رہے ہو، چلو! جاؤ جلدی
اسکول۔ دیکھو، عزیز کتنا سمجھدار لڑکا ہے۔ وہ پڑھائی سے
کسی چیز کو سمجھتا ہی نہیں اور ایک تم ہو کہ ہر وقت کھیلتے رہتے
ذرا بھی پڑھنے کو نہیں بیٹھتے۔
(جاوید غصے سے عزیز کا منھ دیکھتا ہے)
جاوید: عزیز! جاؤ اگر ایک گھنٹہ چھوڑ دینے پر تمھیں
ہو رہا ہے تو اکیلے ہی اسکول چلے جاؤ۔
عزیز جاوید کا یہ غصہ دیکھ کر چپ ہوگیا اور ڈرتے ڈرتے
عزیز: جاوید بھائی! مان لیا، تم نے کسی لڑکے سے
لکھ لیے۔ لیکن لڑکوں کے کام میں غلطیاں بھی تو بہت ہیں
اور آج جو سوال لکھایا جائے گا اُسے ماسٹر صاحب سمجھائیں
بھی۔ پھر اگر ہم حاضر نہ رہے تو سمجھیں گے کیا؟
جاوید: میں نے ایک بار کہہ دیا کہ تمھیں جانا ہے
عزیز دل ہی دل میں سوچنے لگتا ہے۔ اگر میں اسکول
جاتا ہوں تو جاوید خفا ہو جائے گا۔ اس سے اچھا ہے
نہ جائیں۔
(جاوید سے) اچھا بھائی اسکول نہیں جائیں گے۔
چل کر دونوں کچھ پڑھ تو لیں، صرف پندرہ دن امتحان
گئے ہیں۔"
جاوید: تم جاؤ، ہم نہیں آتے۔
عزیز کمرے میں جاکر پڑھنے میں مشغول ہو جاتا ہے
امی آتی ہیں۔
امی: بیٹا! آج اسکول کیوں نہیں گئے؟
عزیز: (کچھ بات بناکر) آج اسکول بند ہے۔
امی: "آج اسکول کس وجہ سے بند ہے؟
(عزیز کچھ سوچتا ہے)
امی: سوچ کیا رہے ہو عزیز!
عزیز: نہیں کچھ نہیں۔
امی: تو پھر تم جواب کیوں نہیں دیتے؟
عزیز: (بات بناتے ہوئے) آج ماسٹر صاحب
ہو رہی ہے، اسی وجہ سے اسکول بند کر دیا گیا ہے

عزیز اپنے بھائی سے بہت محبّت کرتا تھا، وہ یہ چاہتا تھا کہ جاوید مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ عزیز کی امّی سمجھ جاتی ہیں۔
عزیز دل میں سوچتا ہے، "جاوید کو پڑھنے کے لیے کہتا ہوں تو وہ مجھ سے ناراض ہو جاتا ہے۔ میں کیا کروں؟ میں تو اس سے عاجز آگیا ہوں۔"

(اتنے میں جاوید کے ابّا کمرے میں آتے ہیں)

ابّا: بیٹے عزیز، جاوید کہاں ہے؟

عزیز: وہ باہر کرکٹ کھیل رہا ہے۔

ابّا: وہ ہر وقت کھیلتا ہی رہتا ہے۔ میں اس کو کسی وقت پڑھتے ہوئے نہیں دیکھتا۔

عزیز: کیا جاوید کو بُلا لاؤں؟

ابّا: نہیں عزیز تم نہ جاؤ۔ جانے آنے میں تمھاری پڑھائی ختم رہو گی۔ تم ایک محنتی لڑکے ہو، اس سال تم ضرور فرسٹ آؤ گے؟

(ابّا جان جاوید کو بُلانے باہر جاتے ہیں)

ابّا: (زور سے آواز دیتے ہیں) جاوید!

جاوید: (سبھی لڑکوں سے) دیکھو! ہمارے ابّا جان آرہے ہیں۔ ہم جاکر کسی کونے میں چھپ جاتے ہیں۔ کوئی بتلانا نہیں۔

(ابّا جان کو جاوید نظر نہیں آتا)

ابّا: (سبھی لڑکوں سے) جاوید کہاں ہے؟

کوئی نہیں بتلاتا۔ لیکن اشرف نام کا ایک لڑکا جو بڑا ایماندار تھا، وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ اُس نے کہا۔ کس کو ڈھونڈ رہے ہیں چچا جان؟

ابّا: جاوید کو۔

اشرف: (اشارہ کرکے) اُس کونے میں چھپا ہوا ہے۔
(پکڑنے کے لیے جاتے ہیں اور جاوید کو پکڑ لیتے ہیں)

ابّا: آج تو تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

جاوید: نہیں ابّا! اب ایسی غلطی کبھی نہ ہو گی۔

ابّا: آج تو تمھیں بہت ماروں گا۔

(ابّا جان اب مارتے ہیں)

جاوید: ہائے میں مرگیا، ہائے میں مرگیا۔ کوئی مجھے بچاؤ، بچاؤ! (اتنے میں عزیز دوڑا ہوا آتا ہے)

عزیز: چھوڑ دیجیے ابّا جان! اب یہ بہت مار کھا چکا ہے۔ میری ہی غلطی ہے یہ اس وقت اتنا پٹا ہے۔

ابّا: جب تک یہ وعدہ نہیں کرتا کہ اب دل لگا کر پڑھوں گا، میں اسے نہ چھوڑوں گا۔

عزیز: میں ذمّہ لیتا ہوں کہ اب یہ پڑھے گا۔

ابّا: نہ، جب تک یہ اپنے منھ سے اقرار نہیں کرتا ہے، میں نہیں چھوڑوں گا۔

عزیز جاوید سے کہتا ہے "کہہ دو پڑھوں گا"
(جاوید چُپ رہتا ہے)

ابّا: بولتے ہو یا نہیں؟

جاوید: (آہستہ سے) ہاں! (ابّا جان چلے جاتے ہیں)

عزیز: دوست! تم نے آج اتنی مار کھائی۔ اگر میں نہ آتا تو ابّا جان آج تو تمھاری جان ہی لے لیتے۔

(اتنا کہہ کر عزیز جاوید سے لپٹ کر رونے لگتا ہے پھر جاوید سے کہتا ہے)

"اب آؤ بھائی! کمرے میں آکر پڑھو۔"

(جاوید کہانی کی کتاب پڑھنے لگتا ہے)

عزیز "ارے بھائی! اپنی کتاب پڑھو، بعد میں کہانی کی کتاب پڑھتے رہنا۔ صرف پندرہ دن امتحان کو رہ گئے ہیں۔

جاوید: ابھی پندرہ دن تو ہیں۔

(اتنے میں جاوید کے ابّا آجاتے ہیں۔ جاوید کہانی کی کتاب رکھ کر اپنی کتاب اُٹھا لیتا ہے اور پڑھنے لگتا ہے)

ابّا: پڑھ رہے ہو جاوید!

جاوید: (غصّے سے) ہاں!

(جاوید کے ابّا چلے جاتے ہیں)

جاوید: عزیز اب اتنی رات چلی گئی۔ چھوڑ دو، سو جاؤ، صبح اُٹھ کر پھر یاد کریں گے۔

عزیز: جب تک میں یہ چار سوال یاد نہیں کرتا، میں نہیں سوؤں گا۔

جاوید: تم عجیب ضدّی لڑکے ہو۔

(جاوید کے ابّا آتے ہیں)

جاوید: ابّا جان! میں کہہ رہا ہوں کہ سو جاؤ، بہت رات ہوگئی ہے۔ صبح اُٹھ کر پھر یاد کریں گے۔

ابّا: ہاں عزیز! بہت رات ہوگئی۔ اب سو جاؤ۔

عزیز: ابّا جان! ابھی میں نہیں سوؤں گا۔ جب تک میں چار سوالات یاد نہیں کر لوں گا۔

ابّا: شاباش بیٹے! اسی کا نام عقل مندی ہے۔ تم دونوں میں سے اس سال جو بھی فرسٹ آئے گا، میں اُس کو انعام میں گھڑی دوں گا۔

(جاوید بڑبڑا کر اُٹھتا ہے اور گھڑی کا نام سُن کر پڑھنے میں مشغول ہو جاتا ہے)

جاوید۔ عزیز بھائی! تب تو میں ہی انعام میں گھڑی لوں گا

عزیز: (ہنس کر) کوئی بات نہیں میرے دوست، چلو تم ہی انعام لے لینا، لیکن جب دل لگا کر پڑھو گے تب نا!

(دونوں کے امتحانات شروع ہو جاتے ہیں)

عزیز: کتنا لکھا جاوید!

(جاوید: (بات بنا کر) سب۔

(کچھ ہی دنوں کے بعد نتیجہ نکلتا ہے۔ عزیز فرسٹ آتا ہے اور جاوید فیل)

ابّا: شاباش بیٹے! لو اپنی گھڑی۔

(جاوید بیٹھ کر رونے لگتا ہے)

عزیز: تم رو کیوں رہے ہو، لو یہ گھڑی۔ تمھارے ہاتھ میں رہے یا میرے بات برابر ہے۔

ابّا: نہیں! تم اسے رکھو، میں تم دونوں ہی کے لیے دو گھڑیاں لایا ہوں۔ مجھے دیکھنا تھا کہ تم دونوں میں کتنی میل محبت ہے۔ میں بہت خوش ہوا۔ عزیز! شاباش! اسی طرح میل محبت سے رہا کرو۔ اگر عزیز سے کوئی غلطی بھی ہو جائے تو اسے معاف کر دینا! اور سنو جاوید بیٹے، دل لگا کر پڑھا کرو تاکہ تم بھی عزیز کی طرح فرسٹ ڈویژن لا سکو۔ اس سال فیل ہو گئے تو کوئی بات نہیں، محنت کرو گے تو اگلے سال تم بھی فرسٹ آؤ گے۔ انسان کو ہمیشہ ہمت سے کام لینا چاہیے۔

پیارے بچو! ہمیشہ اپنے بھائی سے محبت کیا کرو۔ دشمن تو ہمیشہ یہی چاہتا ہے کہ دو بھائیوں میں کبھی میل محبت نہ رہے اور چاہے گا کہ دونوں میں پھوٹ ڈلوا دے۔ لیکن یاد رکھو، تم دونوں میں پھوٹ کبھی نہ پڑنا چاہیے۔

محمد شاہنواز رضوی
سولیہ محلہ، پوسٹ بہار شریف ضلع نالندہ (بہار)
عمر ۱۲ سال

★

شیخ چلی کو جھوٹ کی سزا

شیخ چلی کو تو آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ ایک روز وہ جس ڈال کو کاٹ رہے تھے، اُسی پر بیٹھے بھی تھے۔ ایک دن انڈوں کی ٹوکری سر پر رکھے سوچ رہے تھے کہ ان انڈوں سے بچے نکالوں گا اور جب وہ بڑے ہو جائیں گے اور بے شمار انڈے نکلنے لگیں گے۔ اگر پڑوسی مجھ سے انڈے یا بچے مانگنے آئے تو اُنھیں ڈانٹ کر بھگا دوں گا۔ اور وہ خیالی غصہ دکھا ہی رہے تھے کہ انڈوں کی ٹوکری سر سے گر گئی اور انڈے ٹوٹ کر بہہ گئے۔

اس تعارف کے بعد سنیے۔ ہوا یہ کہ ایک دن شیخ چلی کی بیوی اُن پر بہت گرجیں "تم بالکل نکھٹو ہو۔ تم سے کوئی کام بھی نہیں ہوتا۔ بس دن رات بیٹھے پلنگ کی بان توڑتے ہو یا ہوائی قلعے بناتے رہتے ہو۔ جاؤ گھر سے باہر نکلو اور کچھ کر کے دکھاؤ۔" شیخ چلی خیالی پکانے میں تو استاد تھے۔ یہ کروں گا، وہ کروں گا، لیکن اُن سے ڈھنگ کا کوئی کام آج تک تو ہوا نہ تھا۔ ڈینگ ہانکنے کی صرف عادت تھی۔ بیوی کی خفگی حد سے باہر دیکھی تو غصے میں کہہ دیا "ہاں ہاں! سُن لیا۔ میرے کان نہ کھاؤ۔ اگر میں گھر میں پڑا رہتا ہوں تو تم سمجھتی ہو، میں نکھٹو ہوں، نکما ہوں۔ کان کھول کر سُن لو! میں کوئی معمولی آدمی نہیں۔ میں نے ہزاروں مچھروں کو چٹکی سے مسل کر رکھ دیا، لاکھوں مکھیوں کی ٹانگیں توڑ ڈالیں۔ شہر بھر میں میرا ڈنکا بج رہا ہے۔ بڑے بڑے سورماؤں کو موت کے گھاٹ اُتار چکا ہوں اور تم ہو کہ صرف طعنے دیا کرتی

ہو، اگر مجھے زیادہ جلایا اور پریشان کیا تو ابھی جا کر شاہی فوج میں بھرتی ہو جاؤں گا، پھر سر پر ہاتھ رکھ کر روتی رہنا۔"
آخر وہ بھی شیخ چلّی ہی کی بیوی تھیں، سب سمجھتی تھیں۔ جل کر کہا: "ہاں ہاں! بے شک جا کر بھرتی ہو جاؤ، جب بہادر لوگوں کی تلواریں سر پر سنسنائیں گی تب تمھیں اپنی بہادری کا پتا چلے گا۔

شیخ چلّی کو طرّارہ آگیا۔ کپڑے جوتے پہن دربار میں جا دھمکے فرشی سلام جھاڑا اور بولے "عالی جاہ!"

بادشاہ نے غور سے دیکھ کر پوچھا: تم کون ہو بھئی!"

بولے: "میں دور سے یہ سن کر آیا ہوں کہ آپ کی فوج میں کسی بہادر آدمی کی ضرورت ہے۔"

بادشاہ مسکرائے جب دیکھا کہ اُن کے سامنے ایک دُبلا پتلا شخص کھڑا ہے۔ غور سے دیکھ کر بولے "تم فوج میں نوکری کر کے ناحق اپنی جان گنواؤ گے۔ جاؤ گھر جا کر کوئی اور کام دھندا تلاش کرو اور بیوی کے ساتھ ہنسی خوشی رہو۔"

شیخ چلّی اکڑ کر بولے۔ آپ مجھ سے واقف نہیں۔ میں معمولی آدمی نہیں، مشکل سے مشکل کام کر سکتا ہوں، آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتا ہوں۔ دریا کو پہاڑوں میں دھکیل سکتا ہوں۔ بڑے بڑے بہادروں کو تگنی کا ناچ نچا سکتا ہوں اگر آپ نے مجھے نوکر نہ رکھا تو پچھتائیں گے۔ اگر میں چلا گیا تو مجھ جیسا دوسرا بہادر آپ کو نہ ملے گا۔"

بادشاہ پسیج گیا اور شیخ چلّی کو رکھ لیا۔ اُسے کیا خبر کہ یہ نری ڈینگ ہی ہے۔ نوکری کا پروانہ پا کر شیخ چلّی بہت خوش ہوئے۔ مگر وزیر کو ان سے جلن ہوئی۔ ناحق مفت کی روٹیاں توڑنے والا آدمی ہے۔ ادھر شیخ چلّی کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں، کھاتے اور توند سہلاتے۔ وزیر تو شروع ہی سے اس تاک میں تھا کہ کوئی موقع آئے اور شیخ چلّی کا امتحان ہو جائے۔ آخر وہ موقع آ ہی گیا۔

شیخ چلّی کی شامت آئی۔ ایک خوفناک ڈاکو نے شہر میں بڑا اودھم مچا رکھا تھا۔ وہ بڑا بے رحم اور ظالم تھا۔ اُس کا ایک بڑا گروہ تھا اور سب کے سب اُسی جیسے تھے۔ اُنھیں پکڑنے کی بڑی کوششیں ہوئیں مگر کامیابی نہ ہوئی تھی۔ شہر میں ہڑبونگ مچ رہی تھی۔ بادشاہ پریشان تھا۔ وزیر نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ یہ شیخ چلّی آخر کس مرض کی دوا ہے۔ فوراً بادشاہ نے اُس سے کہا: یہی وقت ہے تمھاری کارگزاری کا۔ "جاؤ ڈاکوؤں کو سردار سمیت زندہ یا مُردہ پکڑ لاؤ۔"

شیخ چلّی کے ہاتھوں کے توتے اُڑ گئے، لرزتے کانپتے گھر آئے اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ سوچا اب کیا کریں؟ پوری زندگی میں ایک ننھا سا پسّو بھی تو مارا نہیں، ان خوف ناک ڈاکوؤں کا کیا کروں۔ مرتا کیا نہ کرتا، بیوی سے کہا: "لو بھئی میں تو چلا ڈاکوؤں کو پکڑنے۔ تم ایک کام کرو، اُن کے لیے کھانا تیار کر دو۔ بیوی گھبرائی، مگر شاہی حکم کو کیا کرتی۔ کچھ روٹیاں پکائیں اور بیسن کے لڈّو تیار کر لیے۔ شیخ چلّی دادا جان مرحوم کی پُرانی مورچہ کھائی تلوار سے لیس ہو کر جنگل کی طرف ہو لیے بار بار وہ اپنے سائے ہی سے ڈر کر تلملا اُٹھتے۔ دل ہی دل میں خدا سے معافی مانگ رہے تھے اور آئندہ کے لیے ڈینگ سے توبہ کی سوچتے۔ شام ہو رہی تھی۔ شیخ چلّی نے مجبور ہو کر بھاری تلوار اور اپنی گٹھری ایک درخت کے نیچے رکھی اور جانوروں کے خوف سے اُسی درخت پر جا چڑھے۔ اوپر سے زمین پر کالے زہریلے سانپوں کو رینگتے دیکھا تو ڈر سے گھگّی بندھ گئی۔ ایک کالا لمبا سانپ کھانے کی بُو سونگھ کر پوٹلی میں گھس گیا۔ ڈرے کہ یہ کم بخت ضرور میرا کھانا چٹ کر جائے گا۔ اب بھوکوں مرنا پڑے گا ڈاکوؤں کا خوف، درندوں کا خطرہ، یہ ڈراونا جنگل، پتا نہ تھا کہ شیخی بگھارنے کا یہ نتیجہ ہوگا۔ خدا سے دُعا مانگ ہی رہے تھے کہ دیکھا سانپ پوٹلی سے نکل کے جھاڑیوں میں گھسا جا رہا ہے۔ اچانک وہ خوف ناک ڈاکو اپنے ساتھیوں سمیت وہاں آ گیا۔ شاید وہ بھوکے تھے۔ کسی آدمی کے بغیر کھانے کی پوٹلی پائی تو ٹوٹ پڑے۔ کھانا کھاتے ہی تینوں لہرا کر زمین پر گر پڑے۔ کھانے میں سانپ کا زہر اثر کر چکا تھا۔ یہی زہر رنگ لایا اور ڈاکو شکار ہو گئے۔

شیخ چلّی کی خوشی کا کیا ٹھکانا! جھومتے ہوئے درخت پر سے اُترے اور اِن تینوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر بادشاہ

کے دربار میں لائے اور ہاتھ باندھ کر سلام کرنے کے بعد اکڑ کر کورنش (شاہی آداب) بجالائے۔

بادشاہ بڑا خوش ہوا۔ وزیر کو شرمندگی ہوئی اور شیخ چلی کی تنخواہ دُگنی ہو گئی۔ بیوی کی غلط فہمی بھی دُور ہو گئی۔ شیخ چلی نے بھی ڈینگیں مارنے اور جھوٹ بولنے سے زندگی بھر کے لیے توبہ کر لی۔

آصفہ بیگم بنت عبدالرزاق
★ کلاس VII C سانے گروجی اُردو گرلز ہائی اسکول ناگپور (ایم۔ایس)

یادداشت اسلامی

قبل ہجرت

۵۴۵ء ولادت حضرت عبداللہؓ
۵۵۵ء ولادت حضرت خدیجہؓ
۵۷۰ء ولادت حضور انور رسول خدا ﷺ
۵۷۸ء وفات حضرت مطلب
۵۸۲ء سفر شام حضور انور ﷺ
۵۹۵ء تزویج حضرت خدیجہؓ
۵۹۶ء ولادت حضرت قاسمؓ
۶۰۰ء ولادت حضرت زینبؓ
۶۰۸ء ولادت حضرت اُم کلثومؓ
۶۰۲ء ولادت حضرت علیؓ
۶۰۹ء بعثت حضرت رسول کریم ﷺ
۶۱۵ء ولادت حضرت فاطمہؓ
۶۲۰ء وفات حضرت خدیجہؓ
۶۲۰ء وفات حضرت ابوطالب
۶۱۶ء شعب ابوطالب
۶۱۹ء معراج النبی ﷺ
۶۲۲ء ہجرت مبارک

یادداشت اسلامی

بعد ہجرت

سنہ ۱ھ (۶۲۲) مدینہ میں ورود مبارک
سنہ ۱ھ (۶۲۲) تعمیر مسجد نبویؐ
سنہ ۲ھ (۶۲۳) نماز روزہ فرض ہوئے
سنہ ۲ھ (۶۲۳) تحویل قبلہ
سنہ ۲ھ (۶۲۳) تزویج حضرت فاطمہؓ
سنہ ۳ھ (۶۲۴) غزوۂ اُحد
سنہ ۴ھ (۶۲۵) شراب حرام ہوئی
سنہ ۳ھ (۶۲۴) ولادت حضرت امام حسنؓ
سنہ ۴ھ (۶۲۵) ولادت حضرت امام حسینؓ
سنہ ۵ھ (۶۲۶) جنگ خندق
سنہ ۵ھ (۶۲۷) بیعت الرضوان
سنہ ۶ھ (۶۲۸) صلح حدیبیہ
سنہ ۷ھ (۶۲۹) جنگ خیبر
سنہ ۷ھ (۶۲۹) مسلمانوں کا پہلا حج
سنہ ۸ھ فتح مکّہ
سنہ ۹ھ حج فرض ہوا
سنہ ۱۰ھ جمعۃ الوداع
سنہ ۱۱ھ وصال مبارک ﷺ

قمرالنبی (ہندی پنڈت) آستانہ مخدوم الٰہی کرطیہ شریف (آندھرا پردیش)

ترانۂ وطن

ہم سب ہندستانی ہیں ہندوستان ہمارا ہے

اُس کی عظمت کی خاطر اپنی جان گنوائیں گے
اپنے جگر کے لہو سے ہم اُس کی مانگ سجائیں گے
ہمیشہ یک جہتی کی ہم سب بین بجائیں گے
بڑھتے جائیں آگے آگے یہی ارمان ہمارا ہے
ہم سب ہندستانی ہیں، ہندوستان ہمارا ہے

ہندو ہو یا مُسلم ہو، سکھ ہو یا عیسائی
ہم سب ہندستانی آپس میں ہیں بھائی بھائی
آزادی کی خاطر سب نے اپنی جان گنوائی
گیتا بھی ہم رکھتے ہیں اور قرآن ہمارا ہے
ہم سب ہندستانی ہیں ہندوستان ہمارا ہے

یہ وہ پوتر دھرتی ہے جہاں بہتی گنگا ماتا ہے
ہم وعدے نبھانے جانیں ہمیں پیار نبھانا آتا ہے
آج یہاں کا بچہ بچہ، گیت خوشی کے گاتا ہے
کہہ دو ساری دُنیا سے، ہندوستان ہمارا ہے
ہم سب ہندستانی ہیں، ہندوستان ہمارا ہے

احمد کمال حشمی
معرفت حشم الرمضان ایم کے ۲۸ ڈی بی ۔ ۲۸ ۔ بی ایل ۱۲ نیا بازار کانکی نارہ ۔ ۷۴۳۱۲۶ (ویسٹ بنگال)

ننھے فنکار
لکھیے: کون سی تصویر پہلے انعام کی مستحق ہے
Hel
خورشید بھارتی

اسلام کے مشہور امیر البحر
عبد الواحد سندھی جامعی
اس کتاب میں مسلمانوں کے جہاز سازی اور
جہاز رانی کے کارنامے نیز ان سمندری
سپہ سالاروں کے حالات بتائے گئے
ہیں جنھوں نے تاریخ میں نام اونچا کیا۔
قیمت: ۴/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار حصہ اول
دوم
عبد الواحد سندھی جامعی
بچوں کے لیے اسلام کے مشہور سپہ سالاروں کا تفصیلی
تعارف نیز ان کی زیر قیادت لڑی گئی جنگوں
کے حالات جن کے پڑھنے سے ایمان میں
تازگی آتی ہے۔
حصہ اول ۴/=
دوم ۴/=
اللہ کے خلیل
خلیل احمد جامعی
مسلمانوں کے جد امجد حضرت ابراہیمؑ کی سیرت مبارک
سے متعارف کرانے والی بچوں کے لیے
ایک عمدہ کتاب
قیمت ۲/۵۰
چنبیلی
محمد حسین حسان
ابتدائی درجوں کے
بچوں کے لیے چنبیلی نامی
ایک بلی کی مزیدار کہانی۔
قیمت ۵۰/-
دُم کٹا سانپ
محمد قاسم صدیقی
سچی عبادت، بے ایمان
قاضی اور راجا اور پرجا۔
تین سبق آموز کہانیوں کا
مجموعہ
قیمت: ۱/-
چٹانوں کی کہانی
محمد امین
قدرتی حالات و واقعات نے زمین اور چٹانوں کی
شکل و صورت کو کس طرح بدلا؟ اس کا جواب
اس کتاب میں ملے گا۔ قیمت ۴/۵۰
موم کا محل
پروفیسر محمد انس
شہد کی مکھیوں کی کہانی جو خود شہد
کی طرح میٹھی اور دل پسند ہے۔ بڑے
بچوں کے لیے کہانی کی طرز پر لکھی گئی ایک
عمدہ معلوماتی کتاب۔
قیمت: ۴/=
میر انیس
محمد حسین حسان
میر انیس کے حالات زندگی، اخلاق
و عادات اور ان کی شاعری کی خصوصیات
بتانے والی کتاب نمونہ کلام کے ساتھ
بچوں کے لیے ایک بہترین معلوماتی
کتاب۔
قیمت: ۴/۵۰
بچوں کے اقبال
اطہر پرویز
اس کتاب میں علامہ اقبال کے حالات
زندگی بڑے ہی اچھے انداز میں بتائے
گئے ہیں۔ ساتھ ہی وہ نظمیں بھی
شامل ہیں جو اقبال نے خاص طور پر بچوں کے
لیے لکھی تھیں۔ قیمت: ۴/۵۰
مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵-۱۱

Regd No D SE)-043 | May 1982

PAYAM-I-TALEEM

پیام تعلیم

کھیل سنسار (سطوت رسول)
چھوٹے بچوں کے لیے مترنم بحروں والے
گیتوں اور نظموں کا ایسا مجموعہ جسے
بچے شوق سے پڑھیں گے۔
قیمت : ۴/۵۰
دھنک (بزمی بہاری)
بچوں کے لیے لکھی گئی دلکش نظموں
کا مجموعہ جس میں بچوں کے من پسند
موضوعات پر
نظمیں شامل ہیں
قیمت : ۳/=
اسلام کیسے شروع ہوا؟
(عبدالواحد سندھی جامعی)
یہ کتاب ان مسلمان بچوں
بچیوں کے لیے لکھی گئی ہے جو اپنے
پیغمبر اور اپنے دین کے ابتدائی
حالات جاننا چاہتے ہیں۔
قیمت : ۴/۵۰
عبدالواحد سندھی جامعی
قرآن پاک کیا ہے
اس کتاب میں بچوں کے لیے نہایت آسان اور عام فہم زبان میں
قرآن پاک کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ قیمت ۲/..
سرخ جوتے
(بیگم قدسیہ زیدی)
"موتی" کو سرخ جوتے کیا ہاتھ لگے کہ
اس کی غریبی دور ہوگئی۔ ایک
دل چسپ کہانی ہے۔
قیمت ۲/۵۰
جی دارا اور ننھا فرشتہ
(ریاض احمد خاں)
یہ اس دس بارہ سال کے
ایک بہادر لڑکے کی کہانی ہے جس
نے ایک ننھے بچے کو پرجوش موجوں کی
گرفت سے بچایا۔ قیمت ۰/۸۰
پھولوں کی دیوی
(خلیق انجم اشرفی)
دھنک کے بارے میں
جاپان کی ایک دلچسپ
لوک کہانی۔
قیمت : ۰/۸۰
مکتبہ پیام تعلیم جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

جون ۱۹۸۲ء　جلد ۱۹　شمارہ ۶۰

ایڈیٹر: ولی شاہجہانپوری

فی پرچہ ڈیڑھ روپے　سالانہ پندرہ روپے
غیر ممالک کے لیے ۵۵ روپے

بچوں سے باتیں

کہیے، اب تو امتحانات سے چھٹکارا مل گیا۔ اب تو راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ سوائے اس فکر کے کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ آپ کی محنتیں بارآور ہوں۔ کیا امید کی جائے کہ پچھلے شمارے میں کی گئی ہماری اس خواہش پر آپ عمل کریں گے اور چھٹیوں کے زمانے میں اپنی سرگرمیوں سے ہمیں اور دوسرے پیامیوں کو آگاہ کیا جائے؟ اس بات کا ضرور خیال رکھا جائے کہ مضمون کاغذ کے صرف ایک طرف اور ایک سطر چھوڑ کر ہی لکھا جائے۔ یہ بھی ضروری ہے آپ مضامین کی نقلیں اپنے پاس رکھ لیا کریں۔ تاکہ مضمون چھپنے کے بعد آپ کو معلوم ہو سکے کہ مسودے میں کیا کیا ردوبدل کیا گیا ہے۔ یہ آپ کے فائدے کے لیے ہے۔

یہ تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ "پیام تعلیم" کی ضخامت میں پچھلے سال کے مقابلے میں ہم نے بارہ صفحوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ اب ۳۲ کی جگہ ۴۴ صفحے ہو گئے۔ اس کی دل چسپیاں اور افادیت بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود ہم نے اس کی قیمت نہیں بڑھائی جب کہ اس مدت میں خاص طور پر نئے بجٹ کے بعد کاغذ کی قیمتوں میں زبردست اضافہ ہو گیا ہے۔ ایسے حالات میں ہمارے نقصان کی تلافی کی سب سے آسان صورت یہی ہے کہ اس کی تعداد اشاعت میں اور اضافہ کیا جائے۔ اس کام کو سب سے زیادہ آپ ہی لوگ کر سکتے ہیں۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس سلسلے ہماری درخواست "صدا بہ صحرا" ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہماری آنکھیں ترستی ہیں یہ دیکھنے کے لیے کہ تعریفی خطوط لکھنے والوں کے کسی خط میں یہ لکھا ہوا ہے کہ ہم نے ایک نیا خریدار بھی بنایا ہے۔ یہ صورت عمل خاصی تشویش ناک ہے۔ کئی بار ہم نے پیام تعلیم کے ذریعے اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحبان سے درخواست کی کہ اپنے ادارے کی تعلیمی اور کلچرل سرگرمیوں سے ہمیں مطلع فرماتے رہیں تاکہ دوسرے اسکولوں کے بچے اور اساتذہ کی معلومات میں اضافہ ہو اور جہاں نہیں ہیں وہاں بھی اس قسم کی مفید تقریبات شروع کی جائیں۔ انفرادی طور پر بھی خطوط لکھے۔ لیکن افسوس کہ اس طرف دھیان نہیں دیا گیا۔ کاش اب بھی ایسا ہو سکے۔

بچوں کا ترانہ

مظفر حنفی
۳۵۸ - شملا ہاؤس - نئی دہلی ۲۵

رُوسی ہو، ایرانی ہو
جرمن ہو، جاپانی ہو
باشندہ ہو برما کا
یا وہ ہندستانی ہو
سب کا مان برابر ہے
ہر انسان برابر ہے

درزی ہو یا کاری گر
بابو ہو یا ہو افسر
کھینچ رہا ہو جو رکشا
جو بیٹھا ہے رکشا پر
سب کا مان برابر ہے
ہر انسان برابر ہے

کشمیری ہو یا سندھی
اردو بولے یا ہندی
دھوتی پہنے یا شلوار
پھول سجائے یا بندی
سب کا مان برابر ہے
ہر انسان برابر ہے

سیٹھ، بھکاری ایک سمان
جیسا اِس کا ویسا ہے انسان
جس کی کٹیا چھوٹی سی
جس کا بنگلہ عالی شان
سب کا مان برابر ہے
ہر انسان برابر ہے

سلما ہو یا اندو ہو
احمد ہو، اربند ہو
وہ سکھ ہو یا عیسائی
مسلم ہو یا ہندو ہو
سب کا مان برابر ہے
ہر انسان برابر ہے

کام ضروری کرتا ہو
یا مزدوری کرتا ہو
مل میں ہو یا کھیتوں میں
محنت پوری کرتا ہو
سب کا مان برابر ہے
ہر انسان برابر ہے

کیسا شیخ، برہمن کیا
ٹھاکر اور ہریجن کیا
اونچا نیچا کوئی نہیں
ذات پات کا بندھن کیا
سب کا مان برابر ہے
ہر انسان برابر ہے

بوڑھا ہو یا بچّا ہو
لیکن من کا سچّا ہو
وہ لڑکا ہو یا لڑکی
یاد رکھے تو اچھا ہو
سب کا مان برابر ہے
ہر انسان برابر ہے

رشید احمد صدیقی مرحوم

توتا کہانی

بچّو! آپ جانتے ہیں کہ یہ ہرے ہرے توتے باغ کے پھلوں کو کتنا نقصان پہنچاتے ہیں۔ بے چارے باغ کے رکھوالے دن رات ان کو اڑاتے پھرتے ہیں۔ لیکن یہ ہیں کہ پھلوں کو برابر کُتر کُتر کر ضائع کرتے رہتے ہیں۔ توتوں کی ایک عجیب خاصیت یہ ہے کہ اکثر یہ باغوں میں اُترنے سے پہلے باغ کے باہر کسی بلند درخت یا مقام پر تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ کر پھر باغ پر حملہ کرتے ہیں۔ جیسے دشمن کی فوج قلعہ کے باہر رُک کر پہلے یہ دیکھتی ہے کہ قلعہ کے کس مقام سے حملہ کیا جائے۔

باغ کے رکھوالے توتوں کی اس خاصیت سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ باغ کے چاروں طرف اونچے اونچے بانس گاڑ کر اُس کے سروں کو لمبی لمبی رسّی سے باندھ دیتے ہیں۔ اس طور پر سارے باغ کے گرد بلندی پر رسّی کا ایک حلقہ بن جاتا ہے۔ رسّی میں پتلے پتلے بانس یا نرکل کے چھوٹے بڑے ٹکڑے پرو دیتے ہیں۔ اس طور پر کہ وہ رسّی پر پھرکی کے طور پر گھوم جایا کریں۔ باغ پر حملہ کرتے والے توتے جیسا اُن کی عادت ہے۔ پہلے اس رسّی میں پروئی ہوئی نلکیوں کو مضبوط تھامے ہوئے خود بھی اُلٹ جاتے ہیں۔ پھر کچھ بھی کیوں نہ ہو جائے ٹیں ٹیں کر کے سارا باغ سر پر اُٹھا لیں گے مگر نرکل نہیں چھوڑیں گے۔ ان کو شاید یہ خطرہ ہو جاتا ہے کہ نرکل چھوٹ گیا تو زمین پر گر کر مر جائیں گے۔ اتنے میں باغ کے رکھوالے آتے ہیں اور اس کو نیچے کر کے ان کو پکڑ لیتے ہیں اور ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔

ہماری تمھاری جان سے دور۔ ایک دن کوئی بھٹکتا ہوا فیلسوف بھی وہاں جا پہنچا۔ جانتے ہو فیلسوف کسے کہتے ہیں۔ بعض لوگ فیلسوف تو کہتے ہیں بہت عقل مند کو اور بعض لوگ کسی بے وقوف کو مذاقاً فیلسوف کہتے ہیں۔ فیلسوف نے یہ حالت دیکھی تو اُس کو بڑا رنج ہوا اُس نے سوچا توتے پاگل ہیں۔ اگر ان کو اپنی بے وقوفی معلوم ہو جائے تو پھر اُن پر یہ آفت نہ آئے گی۔

چنانچہ وہ اپنے گھر آیا اور بہت سارے توتوں کے بچے خریدے اور اُن کو تعلیم دینے لگا۔ تم کو تو معلوم ہی ہے کہ توتوں کو جو کچھ پڑھا دیجیے ویسا ہی وہ پڑھنے یا دُہرانے لگتے ہیں۔ فیلسوف نے ان کو یہ سبق یاد کرایا۔

"ہم پر دار جانور ہیں شکاری کے نرکل پر کبھی نہ بیٹھیں گے، اگر بیٹھیں گے تو پر پھڑپھڑا کر اُڑ جائیں گے۔ توتے کے بچے پڑھ کر جوان ہوئے اور یہ سبق اُن کو خوب ازبر ہو گیا۔ جو لوگ کبھی کبھار فیلسوف کے گھر کی طرف نکل آتے تو اُن کو فیلسوف اور توتے دیکھ کر پُرانے زمانے کے دیہاتی مدرسوں کے مدرّس اور طالب علم پہاڑا پڑھتے پڑھاتے ہوئے یاد آ جاتے۔ ایک دن فیلسوف کو خیال آیا کہ اب ان طوطوں کو سبق خوب یاد ہو گیا ہے۔ چنانچہ اُس نے ان کو چھوڑ دیا۔ سارے توتے فیلسوف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ٹیں ٹیں کرتے ادھر اُدھر نکل گئے۔

کچھ دن بعد فیلسوف کا گزر اُس باغ کی طرف ہوا جہاں اُس نے توتوں کو پہلے گرفتار دیکھا تھا اور توتوں کو تعلیم دینے کا خیال آیا تھا۔ وہاں جا کر کیا دیکھتا ہے کہ اس کے سارے شاگرد توتے رسّیوں میں پروئی نلکیوں سے لٹکے ہوئے ہیں اور چیخ چیخ کر پڑھ رہے ہیں:

"ہم پر دار جانور ہیں، شکاری کے نرکل پر کبھی نہ بیٹھیں گے اور اگر بیٹھ گئے تو پر پھڑپھڑا کر اُڑ جائیں گے۔"

فیلسوف یہ ماجرا دیکھ کر گھر واپس آیا۔ دوسرے دن لوگوں نے دیکھا کہ فیلسوف بھی ایک رسّی سے لٹکا ہوا ہے لیکن توتوں کی مانند پاؤں سے نہیں بلکہ آدمیوں کی طرح سر سے۔

محترمہ آصفہ مجیب

بغداد کے اطراف میں ایک پُرفضا باغ تھا بہشت جیسا، سبزہ آنکھوں میں کھُبا جاتا۔ شاخوں میں ہزار ہا پھول ستاروں کی طرح کھلے ہوئے۔ خوش بو میں بسی ہوئی ہوا مہکتی رہتی۔ وہاں جانور بہت رہتے تھے۔ ایسی اچھی کھلی فضا، کھانے پینے کی افراط اور اتنی بہت سی نعمتیں پاکر بہت خوش رہتے۔ سب چین تھا۔

کہیں قریب ہی ایک خون خوار شیر رہتا تھا جو روز اپنی منحوس صورت دکھاکر بے چاروں کا سب عیش اور سکون لوٹ لیتا۔ سارا مزہ مٹی میں ملا دیتا۔ بڑے عذاب میں جان تھی۔

ایک دن سب صلاح مشورہ کرکے اُس کے پاس پہنچے اور عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر فریاد کی "اے بادشاہ ہم سب آپ کی رعیت ہیں، فرماں بردار ہیں، حضور روز بڑی تکلیف اور مشقت جھیل کر ہم میں سے ایک کا شکار کرتے ہیں اور کبھی نہیں بھی کر پاتے۔ ہم سب خوف سے لرزا کرتے ہیں۔ ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے اور سرکار ڈھونڈتے ڈھونڈتے پریشان ہوتے ہیں۔ ہم نے بہت سوچا، ایک تدبیر ہماری سمجھ میں ایسی آگئی جس میں حضور کا بھی بھلا ہے اور ہمیں بھی سکھ نصیب ہوگا۔ اگر کچھ اعتراض نہ ہو تو ہر وقت کی مصیبت سے ہمیں چھڑائیں۔ خود تشریف نہ لائیں۔ ہم روز ایک شکار ناشتے کے وقت حضور کے کھانے کے لیے بھیجا کریں گے۔ اس فرض کو ادا کرنے میں ہم سے کبھی کوتاہی نہ ہوگی۔ کبھی بھول چوک نہ ہوگی۔"

شیر اس بات پر راضی ہوگیا۔ بے چارے روز قرعہ ڈالتے۔ جس دن جس جانور کا نام نکل آتا اُسے وظیفے کے طور پر شیر کے پاس بھیج دیتے۔ ہوتے ہوتے ایک دن خرگوش کا نام نکل آیا۔ زمانے نے اُسے تیر بلا کا نشانہ بنایا۔ فکر اور غم سے آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ بے چارے کا ذرا سا منہ نکل آیا۔ سٹی گم ہوگئی۔ بس آج سب مزے تج کر موت کے منہ میں چلا جائے! آہ اس بھرے باغ کو الوداع کہے۔ یہ لہلہاتا ہوا سبزہ جو مخمل کی طرح دور تک بچھا ہوا ہے۔ کبھی اُس پر لوٹ لگاتا ہے اور میٹھی نیند کے مزے لیتا ہے۔ کبھی سوتے سوتے جاگ کر اُچھل کود کرنے لگتا ہے۔ مست مست ہوائیں، شیریں چشموں کا خنک پانی، اور یہ غذائیں، دنیا بھر کی نعمتیں۔ سب ختم۔ ایک خون خوار ظالم کے نفس کی آگ بجھانے کے لیے! کیا اس کی قوت اور حرص کے آگے بزدلی اور کم زوری سے جھک جائے؟

اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا پھر اُچھل کر بولا۔ "دوستو! ٹھہرو۔ میں تم سے ذرا دیر کی مہلت مانگتا ہوں۔ پھر اس موذی کے پھندے سے ہمیشہ کے لیے تم کو چھڑا دوں گا۔"

سب نے ایک رائے ہوکر جواب دیا۔ "اچھا تھوڑی سی دیر کرکے جانے میں کوئی حرج نہیں، تم سے جو بن پڑے کرلو۔ کیسی غضب میں جان پڑی ہے۔ ہمارا تو جینا دشوار ہوگیا۔ اس ظالم سے کسی کو نجات نہیں۔"

خرگوش اتنی دیر ٹھہرا کہ شیر کے کھانے کا وقت نکل گیا۔

جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

مارے غصے کے وہ دانت پیس رہا تھا۔

خرگوش نرم نرم چال سے چلتا وہاں دبے پانو پہنچا۔ دیکھا کہ شیر کی غصے اور بھوک نے بُری حالت ہو رہی ہے۔ غیض و غضب سے دُم زمین پر دے دے مارتا ہے ایسا لگتا تھا کہ دل سے اپنا وعدہ توڑ دینا چاہتا ہے۔ یہ دیکھ کر خرگوش ڈرتے ڈرتے سامنے آیا۔ بہت جھک کر سلام عرض کیا۔

شیر دہاڑا۔ "تم کہاں سے آرہے ہو۔ سب جانوروں کا کیا خیال ہے؟"

خرگوش نے ادب سے گزارش کی۔

"عالی جاہ! امن وامان اور شانتی ہے۔ انھوں نے دستور کے مطابق ایک خرگوش میرے ساتھ کر کے حضور کے کھانے کے لیے بھیجا تھا۔ راستے میں ایک شیر ملا۔ اور زبردستی اسے ہتھیا لیا۔ بہت کہا کہ چھوڑ دو یہ ہمارے بادشاہ کا کھانا ہے۔ جانوروں کی طرف سے روز یہ بندھا ہوا ہے۔ تمھارا کوئی حق نہیں ہے۔ پر اس نے ایک نہ سنی۔ بد زبانی پر اُتر آیا۔ بڑا آیا بادشاہ بن کے، وہ کون ہوتا ہے کھانے والا۔ میں کھاؤں گا۔ یہ میری شکارگاہ ہے۔ شکار میرا ہے۔ تو زیادہ بک بک نہ لگا۔ اپنا رستہ پکڑ۔ اس قدر اپنی بڑائیاں ہانکیں، اتنا زور طنطنہ دکھایا کہ میری کچھ نہ چلی۔ وہاں سے سیدھا حضور کی خدمت میں عرض کے لئے دوڑا۔"

شیر کی حیوانی قوت اور حمیّت جوش میں آگئی۔ وہ گرجا۔ پوری قوت سے گرجا۔

"اے خرگوش! بتا کہاں ہے وہ بدذات۔ کیا تو اسے میرے سامنے لا سکتا ہے یا میرا سامنا کرا، پھر بتاؤں اُسے میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ تیرے ساتھ جو کیا ہے اس کا اور اپنا بدلہ لوں۔ مجھ سے مقابلہ کرنا آسان نہیں ہے۔ ساری ہیکڑی ابھی نکالے دوں گا۔"

خرگوش نے آگ پر اور تیل چھڑکا "کیوں نہیں عالی جاہ! ابھی سامنے لاتا ہوں۔ سرکار کی شان میں ایسی ایسی بے ادبی کی۔ بڑی بڑی باتیں کیں اور اپنی بڑائی جتائی کہ سُن کر تن بدن میں آگ ہی لگ گئی۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ سر کچل دوں اور چیل کوّوں کو کھلاؤں۔ حضور کے جنگل میں پھنسا دیکھوں تو میرے دل کی مراد پوری ہو۔ کم بخت بچ کر کہاں جائے گا۔ ابھی لاتا ہوں روبرو۔"

یہ کہہ کر وہ بڑھا۔ شیر طاقت کے نشے میں چوُر، غرّاتا، اکڑتا پیچھے پیچھے چلا۔ خرگوش اُسے ایک بڑے سے کنویں کے پاس لے آیا۔ کنویں کا پانی اتنا صاف شفاف تھا جیسے آئینہ۔ دیکھنے والے کو اپنی صورت ایسی صاف اور صحیح نظر آتی کہ عکس کو اصل سمجھتا۔ سچا نقشہ کھنچ جاتا۔ خرگوش کنویں کی طرف اشارہ کرکے بولا۔

"حضور وہ نابکار دشمن اس کنویں میں ہے، مجھے اس سے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ سرکار مجھے اپنی پیٹھ پر بٹھالیں۔"

شیر نے اُسے اپنی پیٹھ پر چڑھا لیا اور کنویں کے اندر جھانکا۔ پانی میں اپنی اور خرگوش کی صورت دیکھی، سمجھا کہ وہی شیر ہے اور خرگوش کو جسے جانوروں نے کھانے کے لیے بھیجا تھا پیٹھ پر لادے ہے۔ خرگوش کو جلدی سے اتار کر کنویں میں پھاند گیا۔ دو چار غوطے کھائے اور خون خوار ظالم نفس کو دوزخ کے شعلوں کے سپرد کر دیا۔

خرگوش صحیح سلامت وہاں سے لوٹ کر آیا اور جانوروں سے پوری کیفیت اور حال بیان کر دیا۔ وہ سب خدا کا شکر بجا کرتے اور خوب سکھ چین سے چرتے تھے۔

رفیق عابد
(زاہدی)

[جب سبزیوں کے مشاعرے کی مکمل روداد "پیام تعلیم" میں چھپی اور اس کی مقبولیت کا غلغلہ بلند ہوا تو ادھر سبزی مشاعرے کے شاعر اور شاعرات خاص و عام میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے اور ادھر پھلوں نے دیکھا کہ اس مشاعرے نے سبزیوں کا بھاؤ بازار میں بڑھا دیا ہے اور خریداروں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی ہے تو رشک و حسد سے پھلوں کے کلیجے پکے پھوڑے بن گئے، دلوں میں داغ پڑ گئے۔ پیشانیوں سے ندامت کے پسینے جو بہے تو درختوں کے تھالے بھر گئے۔ بعض غش کھا کر اوپر سے زمین پر آ رہے۔ خربزے، تربزے لو کے انگاروں سے تپتی ہوئی زمین پر لوٹنے لگے۔

سیب کشمیر کے زعفران زار خطے سے بھاگ کر اور چھوہارے، کھجوریں عرب سے بہ ذریعۂ ہوائی جہاز ہندستان میں آئے۔ سنترے اور موسمبیاں ناگ پور اور دارجلنگ سے فرنٹیر میل سے پایۂ تخت دہلی میں آئے۔ خوبانی، کشمش، اخروٹ، بادام پشاور سے۔ خربزے لکھنؤ اور جون پور سے تربزے فرخ آباد سے کٹھل بہار سے۔ جامنیں اتر پردیش سے۔ کیلے بھساول اور سنگاپور سے آئے۔

بنارس کا لنگڑا بادشاہ تیمور لنگ کی طرح تمام پھلوں کا بادشاہ ہے اور لنگڑا ہوتے ہوئے بھی اتنا تیز رفتار ہے کہ ہندستان کے تمام قصبات اور شہروں میں بہ یک وقت پہنچتا ہے اور لندن، امریکا تک اس کی پہنچ ہے۔ اگر اس کے دونوں پاؤں سلامت ہوتے تو شاید ہر سال اپنے اصل مسکن بہشت تک پہنچ جاتا۔

پھلوں کا وفد آم کے حضوری میں خاص طور پر آیا۔ آم تو خود ہی اسی فکر میں تھا کہ ہم بہادر شاہ ظفر اور غالب کے چہیتے ہوتے ہوئے بھی آخر اس میدان میں پیچھے کیوں رہ گئے۔ حالاں کہ ہم سبزیوں کے مقابلے میں زیادہ سربلند ہیں اور بلند مرتبے پر فائز بھی ہیں۔ غالب کی روح سے استفادہ کرنے کے سبب ہم میں شاعر بھی زیادہ ہیں اور عوام و خواص سب ہمارے دل دادہ ہیں۔ ہم اس نمایشی ادبی دوڑ میں پیچھے کیوں رہ جائیں۔ کل کو اگر بینگن نے پیش قدمی کر کے اپنی اُلٹی سیدھی کتاب چھپوالی تو ہر صوبے کی اکادمی اس کو ایوارڈ سے نوازے گی کیوں کہ سبزیوں کا مسکن پورا ہندستان ہے ہر صوبے پر اس کا حق ہے اور عجب نہیں کہ مرکزی حکومت بھی اسے نوازے۔ ایسا ممکن ہے۔ تو یہ پھلوں کے حق میں ایک بڑا سانحہ اور حادثہ ہوگا۔ دراں حالے کہ سبزیاں صرف صحت مندوں ہی کے استعمال کی چیزیں ہیں۔ لیکن ہم فواکہات اور میوہ جات کی صف میں رہنے والے صحت مند اور مریض دونوں کے لیے بے شمار فوائد کے مالک اور صحت کے ضامن ہی نہیں غذائیت اور حیاتین سے بھرے ہوئے شہد کا سربہ مہر گلاس ہیں اور جنتی انعاماتِ الٰہیہ ہیں۔ بہشت میں بینگن اور بھنڈی کا جیسی سبزیاں نہیں ہوتیں اور نہ اللہ میاں نے جنتیوں سے اس کا وعدہ وعید کیا ہے۔ وہاں تو صرف ہم ہیں اس لیے ہمیں اپنا جوہر دکھانا چاہیے اور اس کی کوشش بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے مشاعرے کی روداد اور غزلوں کے مجموعے کو جلد سے جلد

اکادمی کے مالی تعاون سے چھاپ کر یا بطور خود چھاپ کر ایوارڈ لے لیں۔ اور سرکاری نوازشات سے فائدہ اٹھانے کی کو لازمی سمجھیں۔ کچھ نہیں تو پدم شری کا خطاب تو ضرور ہی مل جائے گا۔"

پا پھلوں کے وفد کے سامنے دراصل لنگڑے آم کی تقریر تھی جو ہر قسم کے مصاحب آموں میں شاعرانہ انداز اور بڑے طمطراق سے سینہ اُبھارے بیٹھا تھا۔

کٹھل، جامن، چیکو، کیلا سنترے سب نے اس کی تائید کی۔ جگہ کا تعین ہوگیا۔ کٹھل وغیرہ نے ڈائس اور پنڈال تعمیر کر دیا۔ پوسٹر چھپ کر جا بہ جا چسپاں ہوگئے۔ بجلی فٹ کر دی گئی۔ کثیر حاضرین میں انسان بھی تھے پرندے بھی اور سبزیاں بھی ایک ایک کرکے حاضر تھیں۔

چوسا، دسہری اور الفانسو (ہاپس بمبئی) کی تحریک سے لنگڑا کو نہ صرف تمام آموں کا نمائندہ بلکہ اس مشاعرے کا صدر بھی منتخب کیا گیا۔

سب نے اس کی تائید کی۔

صدر نے کٹھل کو اناؤنسر بنایا۔

صدر نے شکریہ ادا کرکے وہی باتیں دہرا دیں جو اس نے پہلے وفد سے کہیں تھیں۔ شاعروں کی فہرست صدر نے اناؤنسر کے حوالے کرکے اس کو اختیار دیا کہ وہ اپنے طور پر جس ترتیب سے مناسب سمجھے شاعروں کو بلائے۔

کٹھل نے کھڑے ہو کر صدر کا اور پھر حاضرین اور حاضرات کا شکریہ ادا کیا اور گزارش کی کہ مشاعرے کی روایات کے خلاف سب سے پہلے میں اپنے معزز صدر حضرت آم ہی کو زحمت دینے کی گستاخی کر رہا ہوں اور ایسا صرف اس لیے کر رہا ہوں کہ چوں کہ حضرت آم ہمارے امام بھی ہیں اس لیے ان کی یہ تکلیف ہمارے لیے جرأت آموز ہوگی۔

سب نے تالیاں بجائیں حضرت آم صاحب بڑی پھرتی سے اٹھے۔ ان کے پیروں میں لنگڑاپن تو کیا ذرا سا رعشہ بھی نہ تھا اور بڑی شیریں اور رس دار آواز میں انھوں نے اپنی غزل پکے لے میں سنائی۔

آم نے کہا۔ عرض کیا ہے۔ مطلع ملاحظہ ہو:

(حاضرین ضرور ضرور آپ کا مطلع چھا رسیلا ہوگا)

شہد و شکر ہیں زندگی کی اساس
بھر کے لایا ہوں سر بہ مہر گلاس

سبحان اللہ کیا مطلع ہے۔ غالب کی روح جھوم اٹھی ہوگی

"شعر ملاحظہ ہو۔" آم نے کہا۔

رنگِ رُخ زرد ہے مرے آگے
کیوں یہ چہروں پہ آگیا آماس

خوب! بہت خوب!!

دوستوں کے ہوئے شگفتہ دل
چھا گیا دشمنوں پہ آج ہراس

(واہ وا کی صدا بلند ہوئی)

مثل میرا کہاں زمانے میں
میرے آگے ہر ایک شے بکواس

رام لچھمن تھے قدرداں میرے
گیت گاتے تھے میرے تلسی داس

دیکھیے شان میری لندن میں
بندھ گئی مجھ سے زندگی کی آس

آم کھا کر مریض اچھے ہوں
ڈاکٹر نے کیا یہ نسخہ پاس

پنڈال شورِ تحسین سے گونج اٹھا۔ حضرت آم نے شاخ ثمر کی طرح جھک جھک کر سب کو فرشی سلام کیے۔ اور پھر مسند صدارت پر براجمان ہوگئے۔

چوں کہ آم کے ساتھ جامن ہی کا نام آتا ہے اس لیے اناؤنسر نے اپنی گونجیلی آواز میں جامن کو زحمت کلام دی۔ جامن اپنی کالی ساڑی سنبھالتی ہوئی بڑے ناز و انداز سے ڈائس پر آئی۔ اجازت طلب کی۔ کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولی۔ صدر اور حاضرین کی خدمت میں....

رنگِ رُخ پر مرے نہ جائیں آپ
مجھ کو خاطر میں اپنی لائیں آپ

واہ وا! خوب خاطر میں لائیں گے جی! آپ پروا نہ کریں اور

غزل سنائیں۔

امن نے کہا" عرض کرتی ہوں"

میری ہی جیب پہ آپ مت جائیں
اپنی جیب بھی ذرا دکھائیں آپ
ہو شکم میں جو دردِ الفت کا
سرکا بنوا کے میرا کھائیں آپ

بہت خوب! دردِ الفت کی دوا آج ہاتھ آئی۔

گو کسیلی ہوں پھر بھی میٹھی ہوں
مجھ کو کھا کر نہ منہ بنائیں آپ
ہے نمک ایک جزو خاص مرا
ذائقہ اک نیا سا پائیں آپ
ہری زلفِ سیاہ میں پھنس کر
نازِ غیروں کا کیوں اٹھائیں آپ
مجھ کو کہتے ہیں اہلِ دل جامن
حال اپنا ذرا بتائیں آپ

جامن صاحبہ کی اوّل تو لچکیلی آواز، دوسرے ان کی اچھی غزل، دونوں نے مل کر مشاعرہ لوٹ لیا۔

اب حضرت صدر نے کہا کہ "آم، جامن کے بعد ہندستان ے سب سے عظیم پھل کٹہل ہی کا نام لیا جاتا ہے اس لیے اگر ناؤنسر صاحب ہی زحمتِ سخن گوارا کریں تو خوب ہو۔"

سب نے تائید کی۔

حضرت کٹہل ایک قدآور شاعر کے روپ میں عظیم المرتبت ازمیں، غزل سنانے کے لیے تیار ہو گئے۔ موسم خوش گوار ما۔ آواز گو بھاری تھی مگر لہجہ بڑا میٹھا تھا۔

کٹہل نے معزز صدر اور حاضرین سے اجازت لے کر مطلع سنایا۔

کٹہل ہے مرا نام مری ذات بڑی ہے
مستور مرے سینے میں ہیروں کی لڑی ہے
تعظیم سے لیتے ہیں زمیں والے مرا نام
کہسار کی چوٹی پہ مری نال گڑی ہے

بہت خوب! نہ صرف مطلع بے پناہ ہے بلکہ دوسرا شعر بھی بہت اچھا ہے "کہسار کی چوٹی پہ مری نال گڑی ہے" اس کا جواب نہیں۔

یہ جسم، یہ صحت مری اور یہ قد و قامت
فطرت مری رستم سے بھی لڑنے پہ اڑی ہے
دشمن میں جو دم خم ہو تو آ جائے اب آگے
کٹہل کو نہ سمجھو کہ یہ پھولوں کی چھڑی ہے

"بے شک، ہاتھی کو جو بکری سمجھے اُس کی عقل میں فتور ہے۔"

کٹہل نے اپنی غزل سنا کر پھر اناؤنسر کا منصب سنبھال لیا اور حضرت سیب کشمیری کو دعوتِ سخن دی۔

سیب نے نہایت انکسار کے ساتھ صدر سے اجازت لے کر مطلع سنایا۔

یہ رنگ روپ مرا اور یہ حسنِ ترکانہ
مرا مقام سمرقند اور فرغانہ

"سبحان اللہ! اچھا مطلع ہے۔"

مری ادا میں نزاکت ہے حور و غلماں کی
ہر اک کو بھاتا ہے میرا جمالِ جانانہ
تصورات کی دنیا نہال ہے مجھ سے
تخیلات میں میرا جلال شاہانہ
جو تندرست ہیں ان کے لیے بھی نعمت ہوں
فدا مریض بھی ہوتے ہیں مثلِ پروانہ
مثال دیتے ہیں رخسارِ یار سے میری
نہیں ہے کون زمانے میں میرا دیوانہ

سیب کی تعلّی نے تمام سبزیوں کے منہ پر اوس ڈال دی۔

چھوہارا میاں قلعہ سے کے حاضر ہوئے تھے ڈائس پر آئے تو یوں نغمہ سرا ہوئے۔

مجھ کو خرما بھی لوگ کہتے ہیں
اور چھوہارا بھی لوگ کہتے ہیں
شیر خرما ہے میرا ملغوبہ
جس کو تحفہ بھی لوگ کہتے ہیں

بہت داد ملی۔ اب بی کھجور آئیں۔

عرب سے عجم تک ہے چرچا مرا
نہیں ہے کہاں آج جلوا مرا

"بہت خوب" سب نے داد دی۔

مری لذتوں سے جو واقف ہوا
سناتا ہے سب کو فسانا مرا

سب نے تعریف کی اب بادام صاحب تشریف لائے۔ بڑی نزاکت سے اپنا کلام سُنایا۔

بادام ہوں بادام ہوں بادام ہوں بادام
فطرت کی عنایت ہوں میں قدرت کا ہوں انعام
تقویتِ دل مجھ سے میسر ہے جہاں کو
میں مغز ہوں اور مغز کی طاقت ہے مرا کام

اخروٹ صاحب دوسرے میوہ جات کے بھی نمایندے بن کر آئے اور شعر الاپے۔

میں دیکھنے میں ایک بڑا سخت خول ہوں
لیکن وٹامنوں سے بھرا کیپسول ہوں
سیرت مری ہے لذت و ذوقِ نشاطِ دل
ظاہر میں کھُردرا ہوں میں صورت میں گول ہوں

سنترہ جو موسمی کا بھی نمایندہ تھا اُس نے اپنا کلام سنایا۔

زندگی کا رس مری نس نس میں قدرت نے بھرا
پوچھیے دانشوروں سے آپ میرا فائدا
ایک اک قطرہ مرا واللہ ہے آبِ حیات
زندگی پائی اسی نے جس نے مجھ کو پی لیا

سنترے کو بہت داد ملی۔ مکرر ارشاد" کی گونج سے پنڈال ہلنے لگا۔ تب حضرت انگور تشریف لائے اور میٹھی تانوں میں اپنا مزاحیہ مطلع یوں پیش کیا۔

پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت
زاغ کی چونچ میں انگور خدا کی قدرت

قہقہوں کے جھرمٹ میں داد ملی۔

میرے ہی دل میں نہیں داغِ تمنا یارو
ان کے دل میں بھی ہے ناسور خدا کی قدرت
جب میں گچھوں میں ہوا صورتِ انجم تاباں
جل اُٹھی شمع سرِ طور خدا کی قدرت
آئے لنگڑے کے مقابل، یہ حماقت دیکھو
وہ جو آنکھوں سے ہیں معذور خدا کی قدرت
اک طرف کفر و ضلالت کی گھٹا چھائی ہے
جلوہ زن ہے ادھر نور خدا کی قدرت

گرچہ رشکِ مہ و انجم ہے مری ذات مگر
آسماں سے ہوں بہت دور خدا کی قدرت
شاخِ سدرہ سے میں ٹپکا ہوں زمیں کے اوپر
کیا کروں اے دلِ مجبور خدا کی قدرت

صدرِ مشاعرہ نے پُرجوش داد دیتے ہوئے فرمایا کہ حضرت انگور کا ہر شعر بڑا پُرکیف اور نشہ آور ہے حق تو یہ ہے کہ کامیابی کا سہرا انگور کے سر ہے۔

اناؤنسر نے پکارا، کیلا اناس کا بھی نمایندہ بن کر سر کے بل میدانِ شعر میں کود پڑا اور تکلف کو بالائے طاق رکھ کر کسی سے رسمی اجازت لیے بغیر غصے میں جامے سے باہر ہو کر للکارنے کے انداز میں مطلع پھینک مارا۔

میں کیلا ہوں لیکن اکیلا نہیں ہوں
کوئی مجھ کو کھا جائے، دھوکا نہیں ہوں

اس تجنیس لفظی والے بامعنی شعر پر سب نے جی کھول کر داد دی۔ کیلے نے کسی کو سلام کیے بغیر لہک کر شعر پڑھا۔

ہر اک آنکھ میں ہوں ہر اک دل میں ہوں میں
اُٹھا دے کوئی مجھ کو، پر وا نہیں ہوں
میں حلوہ ہوں، میں رس ملائی ہوں یارو
تمھیں کیا بتاؤں کہ میں کیا نہیں ہوں

کیلے نے ذرا سنبھل کے جوش میں کہا۔
عجلت میں حسنِ مطلع بھول گیا تھا اب ارشاد کرتا ہوں۔
لنگڑے نے ہنس کر کہا۔ ارشاد ارشاد!!

میں سب سن رہا ہوں میں سب دیکھتا ہوں
میں بہرا نہیں ہوں میں اندھا نہیں ہوں
مٹھائی ہوں بچوں کی، بوڑھوں کا حلوا
بتاشا ہوں لیکن تماشا نہیں ہوں
ہر اک پارٹی میں مری قدر و قیمت
میں لڈّو نہیں ہوں کہ پیڑا نہیں ہوں
کہاں میں کہاں باپ بنتِ عنب کا
زمانے میں ایسا تو رسوا نہیں ہوں

کیلے کو بہت داد ملی۔ مسکرا کر اس نے اپنے اُتارے ہوئے لباس پہن لیے۔ بقیہ مشاعرے کے لیے آیندہ (جلد) کوئی تاریخ مقرر کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ کیوں کہ صبح ہو رہی تھی۔

اُمتہ الرحمٰن محسنی

ضدّی آدمی

پُرانے زمانے کے لوگوں کا یقین تھا کہ پریاں دُنیا کے ہر حصّے میں کثرت سے رہتی ہیں۔ ایسے ہی سوئزر لینڈ میں بھی تھیں۔ وہاں اچھی اور بُری سب طرح کی پریاں تھیں، لیکن والٹر کے ایک گانو میں خاص طور سے بہت نیک دل پریاں رہتی تھیں۔ وہ گانو والوں کی بھلائی کے لیے سب کام کیا کرتی تھیں۔ غریبوں کی ہر طرح مدد کرتی تھیں۔ کوئی بیمار ہو جائے تو علاج کرتی تھیں۔ کوئی گوالا گایوں کو ڈھونڈتا ہوا پہاڑی راستوں پر بھٹک جاتا تھا تو اسے راستہ بتا دیا کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ ضرورت پڑنے پر گانو والوں کی جھونپڑیاں تک صاف کر دیا کرتی تھیں۔ مختصر یہ کہ وہاں کی پریاں بہت ہی ہمدرد اور شریف تھیں۔ کبھی کبھی گانو کے لوگوں کو دکھائی بھی دے جاتی تھیں۔ ایک دن ایک نوجوان گوالے کو پہاڑی راستے پر گزرتے ہوئے اتفاق سے ایک پری ملی۔ وہ اس وقت گل دستہ بنانے کے لیے پھول چننے آئی تھی۔ وہ اِس قدر حسین تھی کہ فرانکوئیس اس کو دیکھتے ہی محبت کرنے لگا۔ اور فوراً اُس سے شادی کی بات چیت بھی شروع کر دی۔ پری کو ابھی اُس سے محبت نہیں ہوئی تھی۔ کہنے لگی: "ہم پریوں کو انسانوں سے شادی کرنا منع ہے، اس لیے میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔" لیکن فرانکوئیس کا اصرار اور التجائیں اتنی بڑھیں کہ پری محسوس کرنے لگی کہ اُس کی محبت سچّی ہے۔ آخر اس نے فرانکوئیس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "فرانکوئیس! میں تمھاری بیوی اس شرط پر بننا منظور کرتی ہوں کہ تم مجھ پر کبھی ناراض نہ ہونا! اور بھول کر بھی کبھی یہ نہ کہنا کہ تو ایک بُری پری ہے۔" فرانکوئیس نے سچّے دل سے وعدہ کیا کہ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔ دونوں نے چرچ میں جا کر شادی کر لی اور پھر دستور کے مطابق شادی کی دعوت کے لیے ایک گائے کاٹی گئی اور گانو والوں نے کھانا کھا کر رات بھر ناچ گانے کی محفل رکھی۔ لوگ دُلہن کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اُمید کی جا رہی تھی کہ شادی بہت خوش گوار ثابت ہوگی۔ یہ نیا جوڑا ساری زندگی بہت خوش و خرّم رہے گا۔

اور ہوا بھی ایسا ہی کہ برسوں دونوں نے بہت پُرمسرت دن گزارے
ان میں کبھی کسی بات پر لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔ تین پیارے
پیارے بچے بھی خدا نے ان کو دیے۔ فرانکوئیس جب دن
بھر کا تھکا ہارا گھر آتا تو صاف ستھرے تندرست بچے اُس
کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ اُس کا لکڑی کا گھر صاف
ستھرا ہوتا تھا۔ دیواریں سفیدی سے چمکتی ہوئی رہتی
تھیں۔ کھانا عمدہ، مزے دار تیار ملتا تھا اور ہنستی مسکراتی
بیوی اُس کے استقبال کو موجود رہتی تھی۔ وہ خود کو بہت
خوش قسمت آدمی سمجھتا تھا۔ اور اُس کا ایسا سمجھنا بالکل بجا
تھا۔ گرمیوں کے ایک دن فرانکوئیس کو جانوروں کے ہسپتال
سے ایک بیمار گائے کا علاج کرنے کے لیے بلایا گیا۔ اب وہ
گھر سے چلا تو آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور
ہوا گرم چل رہی تھی۔ وہ رُکا نہیں۔ بلکہ طوفان کے ڈر سے
گائے کے لیے دوائیں اور کچھ تدبیریں بتا کر جلد ہی گھر کی
طرف چل دیا۔

پریوں کو آنے والی باتوں کی خبر ہو جاتی ہے اور خطرے
کو ٹالنے کی تدبیریں بھی معلوم ہوتی ہیں۔ فرانکوئیس کی پری
بیوی کو معلوم ہو گیا تھا کہ اولوں کا زبردست طوفان آنے والا
ہے۔ اُس نے اپنی سہیلیوں اور رشتہ داروں کی مدد سے
اپنا سارا کھیت کاٹ لیا۔ اس کی پرواہ کیے بغیر کہ کھیت کے
سارے گیہوں ابھی کچے ہیں۔ اُس نے کاٹ کر گٹھے بنائے
اور ہر گٹھے میں ایک موٹے سے درخت کا تنہ رکھ دیا۔ اور لے جا کر
کوٹھری میں بھر دیا۔ جیسے ہی وہ یہ کام کر چکی، ایسا زبردست
طوفان آیا کہ گاؤں کے لوگوں نے برسوں سے نہیں دیکھا تھا۔ سیب
کے برابر اولے پڑے اور سارے کھیتوں کو کچل کر رکھ دیا۔ کسان
رونے پیٹنے لگے کہ سردیوں میں اُن کے پاس کھانے کے لیے
کچھ بھی نہیں ہوگا۔

جیسے طوفان شروع ہوا، فرانکوئیس گھر پہنچ گیا۔ جب
اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے جاتے ہی بیوی نے کیا کیا ہے تو وہ
غصے سے لال پیلا ہو گیا اور بیوی کو لعنت ملامت کرنے لگا۔
"بے وقوف عورت کسی نے آج تک ہرا گیہوں بھی کاٹا ہے
اولے سے کچھ تو بچتا۔ اب تو سارا کا سارا سڑ کر برباد ہوگا۔ تو بڑی
ہی خراب پری ہے۔" جیسے ہی اُس کے منہ سے یہ بات نکلی ایک
عجیب منحوس قسم کی آواز سنائی دی۔ جیسے سانپ پھنکار رہا
ہو اور اپنی دُم پٹک رہا ہو، اور اُسی لمحہ اُس کی بیوی
اُس کی آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گئی۔ اس سے اُس کا
غصہ دھیما پڑا اور وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر کوٹھری کی طرف
چلا گیا۔ کوٹھری کھول کر دیکھا تو اُس کی حیرانی کی حد نہ رہی۔ زمین
سے چھت تک سنہری پکے بہترین گیہوں سے کوٹھری بھری ہوئی
تھی۔ جب کہ اُسے وہاں ہرے کچے گیہوں دیکھنے کی اُمید تھی۔
اُس نے یہ دیکھ کر خود سے کہا۔ "دیکھے اور جانے بغیر مجھے بیوی
پر غصّہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ اُس کے ساتھ میں نے بڑی
بے انصافی کی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ گھر کی طرف بڑھ گیا۔ اُس
نے دیکھا کہ وہاں میز پر کھانا تیار رکھا ہے۔ اور بچے اُس کا
انتظار کر رہے ہیں۔ "یہ کھانا کس نے رکھا ہے؟" اُس نے
پوچھا۔ "ماں نے!" بچوں نے جواب دیا۔ "اور وہ کہاں
گئی؟" اُس نے پوچھا۔ "یہ تو ہم کو معلوم نہیں، نہ اُنھوں
نے بتایا۔ مگر اُنھوں نے کہا ہے کہ آپ کو اپنی سخت
باتوں کے لیے معافی مانگنی چاہیے،" بچوں نے جواب دیا۔
"میں معافی مانگوں؟ نہیں نہیں۔ کبھی نہیں۔" ضدی خود
سر آدمی نے جواب دیا۔ وہ کھانا کھا کر سونے چلا گیا۔ مگر بہت
رنجیدہ اور ساری رات بہت بے چین رہا۔ آرام سے سو نہیں
سکا۔ مگر معافی کا لفظ مُنہ سے نہیں نکلا، کہ اُس کی بیوی
خوش ہو کر واپس آجاتی۔ دوسری صبح کو اُس نے دیکھا کہ
سب بچوں کے کپڑے بدلے ہوئے ہیں۔ بال بنے ہوئے
ہیں اور اُنھیں کے لیے میز پر ناشتہ رکھا ہوا ہے۔ پری
نے پھر معافی کے لیے کہلوایا۔ مگر فرانکوئیس اپنی
ضد پر قایم رہا۔

کئی دن بعد وہ اپنا گیہوں چکی پر پسوانے گیا تو اتنا عمدہ
گیہوں دیکھ کر چکی والے کی آنکھیں حیرت سے کھُلی کی کھُلی
رہ گئیں۔ اُس نے پوچھا۔ "فرانکوئیس ایسا عمدہ اور
اتنا بہت سارا گیہوں تمھارے پاس کہاں سے آیا ہے؟"

جب کہ سارے گانو کی کھیتیاں تباہ ہو گئی ہیں۔" فرانکوئیس نے ساری بات بتائی تو اُس نے کہا۔ "تم جیسا احمق دُنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ تم نے ایک دفعہ نہیں دوسری دفعہ بھی معافی مانگنے سے انکار کر دیا۔ اصل میں تم جیسا بے وقوف ایسی نیک خصلت بیوی کے لائق نہیں تھا۔ فوراً گھر جاؤ اور اُس سے معافی مانگو۔ فرانکوئیس نے معافی مانگنے کا پکّا ارادہ کر لیا تھا اور وہ یہ فیصلہ کر کے خوش خوش اپنی بوری گاڑی میں رکھ کر تیز تیز گھر کی طرف چل دیا۔

گھر میں عجیب بے ترتیبی تھی، روئی کے ڈھیر پر ننھی بڑی سو رہی تھی۔ دودھ کا کنستر مکھیوں سے کالا ہو رہا تھا۔ باورچی خانے میں گندے برتنوں کا انبار ہو رہا تھا۔ صرف بچے تھے جو صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ فرانکوئیس نے جاتے ہی بچوں سے کہا کہ جب تمھاری ماں آئے تو اُس سے کہنا کہ میں معافی مانگنے کو تیار ہوں۔

دوسری صبح کو وہ کسی کے ہلکے سے تھپتھپانے سے جاگا۔ یہ اُس کی لڑکی تھی، اُس نے کہا۔ "امی آئی تھیں وہ کہتی ہیں کہ میں واپس آجاؤں گی اگر تم باورچی خانے کی پہلی چیز کو دیکھ کر پیار کر لو۔ فرانکوئیس خوشی میں اپنے بستر سے کود کر باورچی خانے کی طرف بھاگا۔ مگر وہاں اُسے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ اِس لیے اُس نے سوچا کہ یہ کوئی مذاق ہے۔ پھر اُسے ویسی ہی پھنکار کی آواز آئی۔ جیسی بیوی کے غائب ہونے کے وقت آئی تھی۔ وہ کبھی کنڈلی مار لیتا اور کبھی کھل جاتا۔ وہ ایک سانپ تھا۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ اور اپنا سر اُس کے سامنے کر دیا اور پیار کے انتظار میں اُس کے دائیں بائیں سر ہلانے لگا۔ مگر فرانکوئیس کو اُس سے اس قدر گھن آئی کہ اُس نے سانپ کو پکڑ کر زمین پر دے مارا۔ سانپ تو فوراً غائب ہو گیا مگر بیوی اُسی لمحہ آ موجود ہوئی اور بولی۔ "اگر تمھاری محبت گھن پر غالب نہیں آسکی تو تم میری معافی کے مستحق نہیں ہو۔ اب میں تمھاری خوش حالی اور بچے تمھارے سپرد کر رہی ہوں۔ تم ایک ضدی، خودسر اور مغرور آدمی ہو۔" یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئی۔

فرانکوئیس اُسی وقت جان گیا کہ اُس کی خوش نصیبی ختم ہو گئی ہے۔ اُسے اگرچہ اپنی اِس بات کا بے حد صدمہ تھا مگر اب وقت نکل چکا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ غریب سے غریب تر ہوتا گیا۔ آخر میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اور اس کے بچے بھیک مانگنے لگے۔ تاکہ زندہ رہنے کے لیے کھانا مل سکے۔ اُس کی پری بیوی کو پھر کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔

ہمدرد انسائیکلوپیڈیا

س : دنیا میں مکھی اور مچھر کا وجودِ آخر کیوں ہے ؟ اور ان سے ہمیں کیا فائدے ہوتے ہیں۔ ذرا وضاحت سے سمجھا دیجیے۔

محمود اسد اسلم

ج : سنتے تو یہی چلے آتے ہیں کہ ہر چیز میں قدرت کی کوئی حکمت ہے اور ہر جان دار اپنا ایک مقام اور فائدہ رکھتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہمیں کیڑوں مکوڑوں سے تکلیف ہوتی ہے مثلاً مکھی اور مچھر، لیکن یہ ننھے کیڑے بعض بڑے جان داروں کی غذا بنتے ہیں، بعض بیماریاں پھیلاتے ہیں۔ سائنس داں کیڑے مکوڑوں پر بھی تحقیق کر رہے ہیں جن سے بہت سی نئی نئی باتیں معلوم ہو رہی ہیں اور ان سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ طبی نقطۂ نظر سے تو ان دو کیڑوں کے نقصانات ہی بتائے گئے ہیں۔

س : مصنوعی سیارہ کیسے چھوڑا جاتا ہے ؟

جاوید احمد

ج : مصنوعی سیارہ راکٹ کے ذریعے چھوڑا جاتا ہے۔ یہ عام طور پر سہ منزلہ راکٹ ہوتا ہے۔ پیہلے سب سے نچلا راکٹ مشتعل ہوتا ہے اور کچھ اونچائی کے بعد بے کار ہو کر نیچے گر جاتا ہے۔ اسی طرح دوسرا راکٹ خود بہ خود مشتعل ہو کر مزید کچھ اونچائی طے کرتا ہے اور پھر نیچے گر جاتا ہے تو تیسرا راکٹ اپنا کام شروع کرتا ہے اور زمین سے تقریباً دو سو میل کی بلندی پر اُس جسم کو جسے مصنوعی سیارہ بننا ہوتا ہے زمین کے متوازی زور سے دھکا دیتا ہے یہ جسم اس تیسرے راکٹ کی نوک پر رکھا ہوتا ہے۔ یہ جسم دھکا کھا کر زمین کی کشش اثر میں آجاتا ہے۔ یعنی دھکے کی وجہ سے وہ آگے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور زمین اُسے اپنی طرف نیچے کھینچنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان دونوں قوتوں کے درمیان ایک طرح کا توازن یا سمجھوتا ہو جاتا ہے اور وہ جسم نہ تو خلا میں گم ہوتا ہے اور نہ نیچے گر سکتا ہے۔ وہ زمین کے چاروں طرف گھومنے لگتا ہے یعنی مصنوعی سیارہ بن جاتا ہے۔

س : زمین کیسے گول ہوئی ؟

محمد سعید شاہد

ج : مشہور نظریہ ہے کہ زمین اور دوسرے سیارے سورج سے پیدا ہوئے تھے۔ شروع میں زمین گیس اور پگھلے ہوئے مادّے کا ایک بے ڈھنگا ڈھیر یا ٹکڑا تھی۔ وہ خلا میں گھومتی رہی۔ گھومنے سے ہر چیز گول ہو جاتی ہے اس لیے زمین بھی گول ہو گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بالائی سطح ٹھنڈی ہو گئی جس پر ہم رہتے بستے ہیں۔

س : کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ "ایمپیئر" کس چیز کی اکائی ہے؟

طارق محمود بٹ

ج : کسی موصل (کنڈکٹر) مثلاً تار یا لوہے میں الیکٹرونوں کے بہاؤ کو الیکٹرک کرنٹ کہتے ہیں۔ کرنٹ کے ناپنے کی اکائی (یونٹ) کو "ایمپیئر" (AMPERE) کہتے ہیں، یعنی کسی موصل کے کسی خاص نقطے سے کرنٹ کی جو مقدار گزرتی ہے اُس مقدار کو ایمپیئر کی اکائی میں ظاہر کرتے ہیں اور ایمپیئر معلوم کرنے کے لیے جو آلہ استعمال کیا جاتا ہے وہ امیٹر (AMMETER) کہلاتا ہے۔

س : دنیا میں انسانوں سے پہلے کون سی قوم آباد تھی اور اُن کے طور طریقے کیا تھے ؟

ملک عاشق حسین۔

ج : ہماری زمین کی عمر تقریباً چار ارب سال ہے۔ شروع سے

اب تک اس پر بہت سے دور گزرے ہیں۔ انسان
کے یہاں آنے سے پہلے دیوقامت جانور آباد تھے۔
اُن کی ہڈیوں کے ڈھانچے سے ان کی جسامت (سائز)
کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ جانور بھی فنا ہو گئے اور
پہلی بار جب انسان کی شکل نمودار ہوئی تو وہ
بھی جانوروں سے کچھ بہتر نہ تھا۔ نہایت وحشی اور پس
ماندہ۔ یہ لوگ جانوروں کے گوشت اور
درختوں کے پھل پھول کھا کر اپنا گزارہ کرتے
تھے۔ رفتہ رفتہ انسان نے ترقی کی اور موجودہ
تہذیب نے جنم لیا

س: آواز کیا ہے اور کیسے پیدا ہوتی ہے؟

عبدالواحد شیخ

ج: آواز لہروں کی شکل میں چلتی ہے اور ان لہروں کو
ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے کسی
ذریعے یا واسطے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً
ہوا، لوہا، پانی وغیرہ۔ اگر کوئی ذریعہ یا واسطہ
مہیا نہ ہو تو آواز سنائی نہ دے گی۔ مثلاً چاند پر
کسی قسم کی کوئی آواز سنائی نہیں دے سکتی کیونکہ
وہاں ہوا موجود نہیں ہے۔ جب ہم بولتے ہیں تو
ہمارے ہونٹوں سے پیدا ہونے والے ارتعاشات
یا لہریں ہوا سے گزرتی ہوئی دوسرے شخص کے
کان تک پہنچ جاتی ہے اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ
ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ ریلوے لائن پر ٹرین کے
آنے سے پہلے ہی ٹرین کی آواز آنے لگتی ہے۔ آپ
لائن پر کان رکھ کر یہ آواز آسانی سے سن سکتے ہیں۔

کلوروفارم کیا ہے اور اس کے ذریعے سے انسان کو
کیسے بے ہوش کیا جاتا ہے؟

نامعلوم

انسان کے حواس کا تعلق بہت کچھ اس کے دماغ
سے ہے۔ اگر کسی طرح دماغ کو سُن کر دیا جائے تو
انسان زندہ تو رہتا ہے لیکن کسی تکلیف کو محسوس
نہیں کرتا۔ کلوروفارم یہی کام کرتا ہے۔ لیکن مریض
کو آپریشن سے پہلے بے ہوش کر دینا ایک فنی عمل ہے۔
جو ڈاکٹر یہ کام کرتے ہیں وہ اس کی خاص تربیت
حاصل کرتے ہیں۔

س: اگر ہم تفکرات میں گھرے ہوں تو نیند کیوں نہیں آتی؟

نامعلوم

ج: نیند سکون کا دوسرا نام ہے۔ اس کا تعلق بھی دماغ
سے ہے۔ اگر ہم فکروں اور پریشانیوں میں گھرے
ہوں تو دماغ پر بوجھ رہتا ہے۔ سکون غائب ہو جاتا
ہے اور نیند دور چلی جاتی ہے۔

س: اگر کسی مائع کو گرم کیا جائے تو وہ گیس میں تبدیل
ہو جاتا ہے۔ لیکن انڈے کو اُبالنے سے وہ ٹھوس
ہو جاتا ہے۔ یہ کیسے ہوتا ہے؟

سید عمران رضا کاظم

ج: مائع مثلاً پانی یا ایسا ہی کوئی دوسرا رقیق مادہ جب گرم
کیا جاتا ہے تو اس کے سالمے زیادہ رفتار حاصل کر کے
ہوا میں چلے جاتے ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ وہ بھاپ یا
گیس میں تبدیل ہو گیا۔ ایٹموں اور سالموں کی رفتار
ہی ٹھوس، مائع اور گیس کے درمیان فرق پیدا کرتی ہے
انڈے کا معاملہ مختلف ہے۔ اوّل تو وہ بند ہوتا دوسرے
اس کی سفیدی زردی پانی کی طرح مائع نہیں ہوتی بلکہ
گاڑھی ہوتی ہے لہٰذا وہ اسی طرح پک جاتی ہے
جیسے کسٹرڈ یا کوئی اور گاڑھی چیز۔

س: روٹی پکانا کس نے ایجاد کیا؟

محمد صابر

ج: ضرورت ایجاد کی ماں ہے انسان نے زراعت سیکھ لی تو گیہوں کو
پیسنا اور آٹا بنانا سیکھ لیا پھر سوچا کیوں نہ اسے پکا کر کھایا جائے۔
لہٰذا پتھروں کو گرم کر کے انھیں توا بنا لیا اور موٹی روٹی وجود میں
آئی۔ بعد میں آہستہ آہستہ توے کی موجودہ شکل بنتی گئی اور نفیس
طبع افراد چپاتی تیار کرنے لگے۔

سفید گھوڑا

ریاض احمد خاں

مرزا پور تھا تو چھوٹا سا گاؤں مگر سر سبز اور شادابی کی وجہ سے اطراف میں کافی مشہور تھا۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر کھیتوں میں کام کرتے تھے اور دن بھر مصروف رہ کر شام کو اپنے اپنے گھروں میں آرام کرتے تھے۔ اس گاؤں میں ایک چھوٹا سا اسکول بھی تھا جہاں گاؤں کے بچے خوشی خوشی پڑھتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ اسکول دن رات کھلا رہتا تھا اور بچے جب چاہتے اسکول جا سکتے تھے۔ ماسٹر صاحب بچوں کو صرف پڑھاتے تھے بلکہ ان کو ساتھ لے کر کھیتوں میں کام کرنا بھی سکھاتے تھے۔ گاؤں والوں کے پرانے مکانات کی درستی بھی ماسٹر صاحب اپنے اسکول کے بچوں کی مدد سے بغیر کسی اُجرت کے کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ماسٹر صاحب کی بچے بوڑھے، عورتیں اور جوان سب ہی عزت کرتے تھے اور ان سے محبت کرتے تھے۔

اسی اسکول میں اشرف بھی پڑھتا تھا۔ اشرف کے ماں باپ بہت غریب تھے مگر تھے بڑے محنتی۔ باپ کھیتوں میں کام کرتا اور ماں گھر کے کاموں میں لگی رہتی۔ ان کا ہاتھ بٹانے میں اشرف پیش پیش رہتا۔ دس گیارہ سال کا اشرف گاؤں بھر میں اپنی بہادری کی وجہ سے مشہور تھا۔

ایک صبح جب آدمی اپنے اپنے کھیتوں میں کام کرنے چلے گئے تھے اور عورتیں اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھیں گاؤ

۴۴/۳۴ حلیب ٹولا ۔ مودی لنیہ روڈ ۔ بمبئی ۱۰

کے چند لڑکے گھروں کے آگے میدان میں کھیل رہے تھے کہ انھیں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ انھیں بچوں میں اشرف بھی تھا۔ سب کی نظریں اُس طرف اُٹھی ہوئی تھیں جدھر سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آرہی تھی۔ انھوں نے گاؤں کی پگڈنڈی پر دھول اُڑتی ہوئی دیکھی اور آن کی آن میں انھیں ایک گھوڑا دوڑتا ہوا اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ بچّے پہلے تو ڈر گئے مگر پھر سب ہی ایک جگہ جمع ہو کر دیکھنے لگے۔ گھوڑا تیز رفتاری سے دوڑتا ہوا اس جگہ میدان میں آگیا جہاں تھوڑی دیر پہلے بچّے کھیل رہے تھے۔ بچوں کے قریب پہنچ کر گھوڑا رُک گیا۔ اُس کے پورے بدن سے پسینہ بہہ رہا تھا اور وہ زور زور سے ہانپ بھی رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے گھوڑا بہت دور سے دوڑتا ہوا آ رہا ہو۔ گھوڑا کیا تھا قدرت کا بے مثال نمونہ، بے داغ، سفید، تندرست ایسا کہ مکھی بیٹھے تو پھسل جائے۔ مضبوط ٹانگیں، روشن آنکھیں، لچھے دار موٹی اور گھنی دُم۔ ایسے خوب صورت گھوڑے کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔

تھوڑا وقت گزرنے کے بعد جب بچّوں کے دل سے گھوڑے کا ڈر دور ہوگیا۔ تب وہ اس کے پاس گئے۔ کوئی اُس کی عیال پر ہاتھ پھیرتا، کوئی اس کے جسم پر ہاتھ پھیرتا، کوئی بچّہ گھوڑے کی دُم پکڑتا۔ اشرف دوڑا دوڑا اپنے گھر گیا اور ایک بالٹی میں پانی لے کر آیا۔ گھوڑے کے سامنے بالٹی رکھی، اور پھر گھوڑے نے منہ اُس میں ڈال کر خوب پانی پیا۔ اشرف خالی بالٹی رکھ کر کچھ سوکھی روٹیاں لے آیا اور گھوڑے کو کھلائیں۔ دوسرے بچّوں نے اِدھر اُدھر سے گھاس جمع کر کے گھوڑے کے سامنے انبار لگا دیا۔

جب بچے گھوڑے کی خوب خدمت کر چکے تب انھوں نے اس پر سواری کا پلان بنایا۔ اِدھر اُدھر سے رسّیاں جمع کیں اور لگام بنائی۔ باری باری بچے بڑی مشکل سے ایک دوسرے کے کندھے پر چڑھ کر گھوڑے پر سوار ہوتے اور ایک چکر لگا کر واپس آجاتے۔ اشرف پہلے دوسرے بچوں کو گھوڑے پر سوار کراتا رہا اور جب اس کی باری آئی تو وہ بھی دوسروں کی طرح ایک لڑکے کے کندھے پر چڑھا اور اُچک کر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوگیا۔ پہلے تو گھوڑا گاؤں کے اطراف آہستہ آہستہ چلتا رہا اور پھر اُس نے جنگل کا رُخ کیا اور سرپٹ بھاگنے لگا۔ اشرف کو گھوڑ سواری کا تجربہ نہیں تھا۔ گھوڑے کی تیز رفتاری سے گھبرا گیا اور گھوڑے کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کسی حال قابو میں نہیں آتا تھا بلکہ اپنی رفتار تیز تر کرتا رہا۔ آخر اشرف نے گھوڑے کی عیال اپنے دونوں ہاتھوں سے خوب مضبوط پکڑ لی۔

گھوڑے کا رُخ جنگل کی طرف تھا اور وہ پگڈنڈی پر تیز رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کو روندتے ہوئے وہ گھنے جنگل میں سے گزر رہا تھا۔ کبھی کسی درخت کی شاخ اشرف کو بھی لگ جاتی اور اسے یہ تکلیف محسوس بھی نہیں ہوتی۔ ایک گھنٹہ کے بعد گھوڑے نے اپنی رفتار ہلکی کی۔ اور آہستہ آہستہ ایک برگد کے گھنے درخت کے نیچے رُک گیا اشرف فوراً ہی کود کر نیچے اُترا۔ وہ اس وقت بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں پر ہے۔ جنگل کی خاموشی بھی اُسے ڈرا رہی تھی، مگر چوں کہ تھا بہت ہمت والا لڑکا تھوڑی دیر میں وہ اس ماحول سے مانوس ہوگیا اور اس نے گھوڑے کو ہی اپنا ساتھی سمجھا کیوں کہ وہی اسے واپس بھی لے جا سکتا تھا۔ گھوڑا اُس سے خوب مانوس ہو چکا تھا۔ گھوڑے نے اشرف کا گریبان پکڑا اور اسے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ اشرف گھوڑے کے ساتھ چلتا ہوا ایک ندی پر پہنچا جس میں صاف شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ اشرف نے منہ ہاتھ دھو کر پانی پیا۔ اب گھوڑا آگے آگے چل رہا تھا اور اشرف اُس کے پیچھے۔ تھوڑی دور جاکر گھوڑا رُک گیا۔ یہ جگہ ایک ویران مندر کے پاس تھی۔

مندر بالکل ویران تھا۔ جگہ جگہ کی دیواریں شکستہ تھیں۔ اور باہر سوکھے پتوں سے مورتیاں تک اٹی پڑی تھیں۔ مندر کی شکستہ دیواروں پر مکڑی کے جالے تنے ہوئے تھے۔ جیسے ہی اشرف نے مندر کے صحن میں قدم رکھا بے شمار جنگلی کبوتر پھڑپھڑاتے ہوئے اُڑے۔ گھوڑا اشرف کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ چلتے چلتے اشرف کی نظریں مندر کے برآمدے میں پڑے ہوئے ایک انسان

پر پڑیں۔ پہلے تو وہ بہت ڈر گیا اور چیخ مارنے ہی والا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور جلدی جلدی اُس شخص کے قریب پہنچا۔ اشرف نے دیکھا کہ ایک معمر آدمی مندر کے برآمدے میں پڑا ہوا ہے۔ اُس شخص کی سفید داڑھی دھول مٹی میں اٹی ہوئی ہے اور اُس کی آنکھیں بند ہیں۔

گھوڑا خاموشی سے اشرف کی تمام کارروائی دیکھ رہا تھا اور اُس کے چہرے پر اطمینان جھلک رہا تھا۔ اشرف نے اپنا ہاتھ اس شخص کی ناک کے پاس کیا۔ سانس چل رہا تھا۔ اشرف خوش ہو گیا۔ دوڑا دوڑا ندی پر گیا۔ اپنی قمیص اُتار کر اسے پانی میں بھگو کر لایا اور بے ہوش آدمی کے منہ پر نچوڑ دیا۔ پانی پڑتے ہی اُس شخص نے آنکھیں کھول دیں۔ جیسے ہی اس نے آنکھیں کھولیں۔ گھوڑے نے ہنہنا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ اِدھر اشرف کی آنکھوں میں خوشی ناچنے لگی۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ بزرگ شخص ہوش میں آ گئے لیٹے لیٹے پہلے تو انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور پھر اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ گھوڑا دوڑ کر اُن کے پاس آیا اور اُن کے قدموں میں منہ رگڑنے لگا۔ اس طرح وہ اپنی بے پایاں خوشی اور مسرت کا اظہار کر رہا تھا۔ انھوں نے گھوڑے کو سہلایا۔ اور اشرف کے سر پر بھی ہاتھ پھیرتے رہے۔ جب وہ اچھی طرح ہوش و حواس میں آ گئے تب انھوں نے اشرف سے تمام حالات پوچھے۔ اشرف نے انھیں تمام باتیں تفصیل وار بتا دیں کہ کس طرح گھوڑا سرپٹ بھاگتا ہوا گاؤں میں آیا۔ اور پھر کس طرح اسے یہاں لایا۔

یہ سُن کر بزرگ نے اشرف کی بہت تعریف کی۔ اُسے خوب دُعائیں دیں اور کہنے لگے کہ وہ سفر پر تھے۔ اُن کے ساتھ اُن کا سفید گھوڑا تھا۔ سفر کیوں کہ طویل تھا۔ اس وجہ سے انھوں نے اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان بھی رکھا تھا۔ راستے میں ان کی طبیعت خراب ہونا شروع ہوئی۔ خوب چکر آنے لگے۔ آخر وہ اس جگہ بے ہوش ہو کر گر گئے۔ بعد کے حالات معلوم ہی ہو چکے تھے۔

قاضی اشفاق اختر

رمضان المبارک — تاریخ کے آئینے میں

یکم رمضان ۴۷۱ھ ولادت حضرت شیخ عبدالقادر محی الدین جیلانی

۲ رمضان ۰۲ھ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کا عقد۔

۳ رمضان ۱۱ھ وفات حضرت فاطمہؓ

۳ رمضان ۲۵۳ھ وصال حضرت سری سقطیؒ

۹ رمضان ۱۲۰ھ حضرت خواجہ حبیب عجمیؒ کا وصال

۹ رمضان ۷۲۴ھ حضرت بو علی شاہ قلندرؒ پانی پتی کا وصال

۱۳ رمضان ۸۷ھ ولید بن عبدالملک خلیفہ کے حکم سے جامع مسجد دمشق کی بنیاد رکھی گئی۔

۱۴ رمضان ۱۲۵۵ھ مغل شہنشاہ شاہجہاں کی وفات۔

۱۵ رمضان ۰۳ھ حضرت امام حسنؓ کی ولادت۔

۱۶ رمضان ۱۳۵۷ھ غازی مصطفٰے کمال کا انتقال۔

۱۷ رمضان ۰۲ھ غزوۂ بدر کا معرکہ پیش آیا۔

۱۸ رمضان ۷۲۵ھ حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کا وصال

۱۸ رمضان ۵۷ھ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی وفات۔

۱۹ رمضان ۴۰ھ حضرت علیؓ عبدالرحمان بن ملجم کے ہاتھوں زخمی

۲۰ رمضان ۸ھ فتح مکہ۔ ۲۰ رمضان ۴۲۷ھ بو علی سینا کا انتقال۔

۲۱ رمضان ۴۰ھ ابن ملجم کے لگائے زخم سے حضرت علیؓ کی شہادت۔

۲۲ رمضان ۷۷۱ھ امیر تیمور کی تخت نشینی۔

۲۳ رمضان ۱۱۱۹ھ سراج الدولہ کا کلکتہ پر قبضہ

۲۴ رمضان ۲۰۳ھ حضرت امام علی رضاؓ کا وصال۔

۲۵ رمضان ۱۰ھ آں حضرتؐ کی آخری حج کو روانگی۔

۲۵ رمضان ۵۴۴ھ امام فخر الدین رازیؒ کی ولادت۔

۲۷ رمضان ۱۱۲۷ھ حضرت مخدوم شیخ ابراہیم نقش بندیؒ کا وصال

۲۹ رمضان ۴۳ھ حضرت عمرو بن عاصؓ فاتح مصر کا انتقال۔

فرمان پور۔ اچل پور۔ مہاراشٹر

محمد احمد دلکش، ایم۔ اے، ایم۔ ایڈ

ہندستان کو سونے کی چڑیا کہا جاتا رہا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں انگریزوں نے ہندستان پر قبضہ کرلیا۔ انگریز بنیادی طور سے تاجر قوم ہیں، وہ یہاں سے کچا مال انگلستان لے جاتے اور وہاں اپنے کارخانوں میں کپڑا، مشینیں اور ضرورت کی دوسری چیزیں بناکر ہندستان اور دوسرے ملکوں میں فروخت کرکے دولت کماتے۔ جس کے نتیجے میں ہندستانی کاری گروں اور صنعتوں کو سخت نقصان ہوا اور ہندستانیوں کی حالت بہت خراب ہوگئی۔ انگریزی حکومت نے ہندستانیوں پر بہت ظلم کیے۔ جس کے باعث ہندستان کے بہت سے رہ نماؤں نے ہندستان کو انگریزی سامراج سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ ان رہ نماؤں میں مہاتما گاندھی کا نام سب سے مشہور ہے۔ اُن ہی کے ایک ساتھی مولانا محمد علی بھی تھے۔ جن کی پیدائش کا سوواں جشن دسمبر ۱۹۷۸ء میں ہندستان اور پاکستان میں منایا گیا ہے۔ حال ہی میں حیدرآباد میں شری مرارجی ڈیسائی نے ایک تقریب میں مولانا کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ وہ خدا کے ایک سچے بندے، ہندستان کے ایک بہت بڑے رہ نما اور ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار تھے۔ لہٰذا ہمیں اُن کے نقشِ قدم پر چل کر امن، اتحاد اور ترقی کا ماحول قائم کرنا چاہیے۔ اس طرح مولانا محمد علی مرحوم ایک بزرگ کی حیثیت سے بڑی عمر ہی کے لوگوں کے لیے مشعلِ ہدایت نہیں ہیں بلکہ اُن کے بچپن کے حالات سے بھی دنیا کے بچوں کو بہت سی اچھی باتیں سیکھنے کا موقع مل سکتا ہے۔

مولانا محمد علی شاعری بھی کرتے تھے۔ ایک شعر میں اپنی زندگی کے بارے میں انھوں نے فرمایا تھا کہ:

جیتے جی کچھ کر نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہرؔ آپ کے جوہر کھلے

لیکن یہ مولانا کی خاکساری تھی۔ مولانا میں بے شمار خوبیاں تھیں اور اُن کے جوہر اُن کی زندگی میں بھی ظاہر ہو گئے تھے کہ تاریخ میں اُن کا نام آج بھی جگمگا رہا ہے۔

مولانا محمد علی جوہر اُتر پردیش کی ریاست رام پور میں ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء کو پیدا ہوئے۔ اُن کی پرورش، تربیت اور ابتدائی تعلیم رام پور اور بریلی میں ہوئی۔ انھوں نے اسکول کے ساتویں درجے سے بی۔ اے تک کی تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی۔ وہاں اُن کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی بھی تعلیم پا رہے تھے اور کرکٹ کے مشہور کھلاڑی اور ٹیم کے کپتان تھے۔ مولانا محمد علی نہایت ذہین اور ہونہار طالب علم تھے۔ ۱۸۹۶ء میں انھوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں الہ آباد یونی ورسٹی سے بی۔ اے پاس کیا۔ اُس وقت صوبے میں اور کالجوں کی طرح علی گڑھ کالج کا بھی الہ آباد یونی ورسٹی سے الحاق تھا۔ یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ مولانا محمد علی یونی ورسٹی میں اوّل آئے۔

مولانا کو رام پور میں اردو کے مشہور شاعر حضرت داغ دہلوی کی خدمت میں حاضر ہونے کا اکثر موقع ملتا رہتا تھا کیوں کہ مولانا کے سب سے بڑے بھائی ذوالفقار علی گوہر داغ کے شاگرد تھے۔ چنانچہ مولانا کو بھی شعر پڑھنے اور شعر کہنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ [illegible]

خاصی غزلیں کہنے لگے اور اپنا تخلص جوہر رکھ لیا۔ وہ شروع ہی سے بہت اچھی اُردو اور انگریزی لکھتے تھے اور زوردار تقریر بھی کرتے تھے۔ اُن کی انگریزی نثر کی ایک انگریز پروفیسر تک تعریف کرتے تھے۔ بعد میں آپ انگلستان اعلیٰ تعلیم کے لیے گئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے تاریخ میں بی۔ اے (آنرز) کی ڈگری لی۔ اور ہندستان واپس آکر ریاست رام پور میں محکمۂ تعلیم کے اعلا افسر مقرر ہو گئے۔ پھر ریاست بڑودہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس کے بعد ملازمت چھوڑ کر ۱۹۱۱ء میں ہفتہ وار "کامریڈ" اخبار جاری کیا۔ کچھ دنوں کے بعد "کامریڈ" کے ساتھ ساتھ روزنامہ "ہمدرد" بھی نکالنا شروع کیا۔ ۱۹۱۴ء کی پہلی بڑی جنگ میں انگریز حکومت نے آپ کو نظربند کر دیا۔ چار سال کے بعد ۱۹۲۰ء میں رہا ہوئے تو ملک میں خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں۔ چنانچہ گاندھی جی کے ساتھ مولانا محمد علی نے بھی آزادیِ وطن کی جدوجہد میں پورا حصّہ لیا اور اسی سلسلے میں گرفتار ہوئے۔ اور کراچی میں اُن پر مقدمہ چلایا گیا اور دو سال کی سزا دی گئی۔

اس طرح مولانا نے ہندستان کی آزادی کے لیے جی جان سے کوششیں کیں اور سخت مصیبتیں جھیلیں۔

سیاسی تذکروں میں مولانا کے کارنامے تو سنہری حروف میں لکھے ہی جا چکے ہیں، لیکن اُن کی ایک زندہ و تابندہ یادگار جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی بھی ہے جو آج ہندستان کی ایک ممتاز تعلیم گاہ ہے۔ ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں ملک کے دوسرے رہنماؤں کے ساتھ مل کر جسے مولانا نے قائم کیا تھا۔ گاندھی جی اور مولانا محمد علی کا خیال تھا کہ انگریزی تعلیم ہندستانی نوجوانوں کو انگریزی تہذیب کا غلام اور دفتروں کی معمولی نوکری کے لیے تیار کرتی ہے۔ جامعہ کو مسلم یونیورسٹی کے کچھ طلبہ اور اساتذہ نے ایک آزاد قومی یونیورسٹی کے طور پر مولانا کی سربراہی میں قائم کیا اور مولانا ہی اُس کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اس طرح کی آزاد قومی تعلیم گاہوں میں طلبہ کو مادری زبان میں تعلیم دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ مسلمان طلبہ کو قرآن مع ترجمہ اور عربی، سائنس، ادب، اور یورپ یا ایشیا کی کوئی زبان پڑھانے اور دست کاریاں سکھانے کا انتظام کیا گیا۔ تاکہ تعلیم ختم کرنے کے بعد نوجوان اپنا کاروبار خود شروع کر سکیں اور اُنھیں نوکریوں کی تلاش میں پریشان نہ ہونا پڑے۔ واقعی اگر نوجوان اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ کوئی دست کاری اور پیشہ ورانہ تربیت حاصل کر لیں تو اُنھیں بہت سی مالی دشواریوں سے چھٹکارا مل جائے گا۔ بلکہ وہ اپنی تعلیم کے دوران ہی اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے اچھی خاصی کمائی کر سکیں گے۔ اِس طرح مولانا محمد علی طلبہ کو محبِ وطن، مہذب، ہنرمند اور تعلیم یافتہ ہندستانی نوجوان بنانا چاہتے تھے جو ملک کی ترقی کے لیے کوشش کر سکیں۔ مولانا کے اِس تعلیمی منصوبے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک بڑے ماہرِ تعلیم بھی تھے۔ لیکن ملک کی آزادی کی خاطر اُن کو سیاسی جدوجہد کے لیے خود کو وقف کر دینا پڑا اور ملک و ملت کی فکر اُن کی صحت کو گھن کی طرح کھاتی رہی۔ لیکن اس کے باوجود ہندستان کی آزادی کی خاطر وہ انگلستان گئے اور وہاں گول میز کانفرنس میں ہندستان کو آزادی دیے جانے کا انھوں نے مطالبہ کیا اور کہا کہ اگر ہندستان کو آزادی نہ دی گئی تو وہ انگلستان ہی میں اپنی جان دے دیں گے اور انگریزوں کو اپنی سرزمین ہی میں اُن کی قبر کے لیے جگہ دینی پڑے گی۔ لیکن انگریزوں نے اُس وقت ہندستان کو آزادی نہیں دی اور یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ انگلستان ہی میں ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو مولانا اِس دُنیا سے گزر گئے اور ملک و قوم پر اپنی جان نچھاور کر دی۔ اُن کے یکایک انتقال پر ساری دُنیا حیران و پریشان ہو گئی۔ اور اُن کا یہ شعر اُن کے حق میں بالکل سچ ثابت ہوا

سُنتے ہی جس کے خلق میں کہرام مچ گیا
جوہر وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

اِس طرح شمعِ آزادی پر مولانا پروانہ وار قربان ہو گئے اور ہندستان ہی نہیں ساری دنیا کے سیاسی رہنماؤں ادیبوں شاعروں نے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ آپ بیت المقدس میں مدفون ہوئے۔

ریاض آفندی

بڑوں کا بچپن

سچائی کی طاقت

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بڑے بزرگ اور اللہ والے تھے۔ ابھی آپؒ چھوٹے ہی تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کو بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ان دنوں بغداد علم کا مرکز تھا۔ گھر میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کو بغداد جانے کا شوق پیدا ہوا کہ وہاں جا کر آپ دین کا علم حاصل کر سکیں اور بڑے ہو کر دین کی خدمت کر سکیں۔

آپ نے اپنی ماں سے بغداد جانے کی اجازت مانگی۔ بیٹے کا شوق دیکھ کر ماں راضی ہو گئی۔

اُن دنوں سفر کرنا آسان نہ تھا۔ لوگ اونٹ، گھوڑے، گدھے اور خچر پر بیٹھ کر سفر کرتے تھے۔ اکیلے سفر کرنا مشکل تھا۔ مسافر کو تنہا دیکھ کر چور، ڈاکو اور لٹیرے لوٹ لیتے تھے، اس لیے کچھ لوگ آپس میں مل کر ایک جماعت بناتے اور جماعت کے ساتھ سفر کرتے۔ سفر کرنے والی اس جماعت کو قافلہ کہتے تھے۔

اتفاق سے ایک قافلہ بغداد جانے کے لیے تیار تھا۔ ماں نے بیٹے کو اس قافلے کے حوالے کر دیا۔ چلتے وقت ماں نے چالیس دینار آپ کے لباس میں بغل کے نیچے سی دیے اور تاکید کی کہ "بیٹا! کیسی ہی مصیبت کیوں نہ ٹوٹ پڑے اور اگر جان کے بھی لالے پڑ جائیں پھر بھی کبھی جھوٹ مت بولنا۔"

قافلہ بغداد کے لیے روانہ ہوا۔ آپ بھی ساتھ تھے۔ کچھ ہی دُور گئے ہوں گے کہ ڈاکہ پڑا۔ سارا قافلہ لٹ گیا۔ ایک ڈاکو آپ کے پاس آیا اور آپ سے پوچھا: "کیوں میاں صاحبزادے تمھارے پاس بھی کچھ ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "ہاں! میرے پاس چالیس دینار ہیں۔"

ڈاکو کو آپ کی بات پر یقین نہیں آیا۔ وہ ہنستا ہوا آگے بڑھا۔ اُس کے پیچھے دوسرا ڈاکو آیا۔ اُس نے بھی آپ سے یہی سوال پوچھا۔ آپ نے نہایت سادگی سے اُس کو بھی وہی جواب دیا جو پہلے کو دیا تھا۔

یہ بات ڈاکوؤں کے سردار تک جا پہنچی۔ سردار نے آپ کو بلایا اور پوچھا۔ آپ نے اُس کو بھی وہی جواب دیا۔

سردار نے دوسرا سوال کیا۔ "کہاں ہیں؟"

آپ نے کہا: "میرے لباس میں بغل کے نیچے سلے ہیں؟" آپ کی جامہ تلاشی ہوئی تو اُس میں سے چالیس دینار نکلے آپ کی سچائی پر سب کو تعجب ہوا۔

سردار نے پوچھا: "بیٹے! جس چیز کو تم نے اتنی احتیاط سے چھپا کے رکھا، اُس کو تم نے اتنی بے جگری سے ہم سب کو کیوں بتایا؟"

آپ نے جواب دیا: "ماں نے مجھ کو نصیحت کی تھی کہ بیٹا اگر جان پر بھی بن آئے تو کبھی جھوٹ مت بولنا۔ بھلا میں آپ سے جھوٹ بات کیوں کرتا؟"

آپ کی اس بات کا اثر ڈاکوؤں پر ایسا پڑا کہ معہ سردار کے سب ڈاکوؤں نے اپنے اس بُرے فعل سے توبہ کی اور قافلے کے لوگوں کا لوٹا ہوا مال واپس کر دیا اور سب کے سب نیک اور دین دار بن گئے۔ سچ کی اتنی بڑی طاقت ہے۔ آپ بھی ہمیشہ سچ

پتا۔ ۸/ بی بیٹ نگر ۲۲۵ لال بہادر شاستری مارگ، کرلا بمبئی ۷

بولنے کی عادت ڈالیے۔ سچ بولنے والے کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے۔

خواجہ غریب نوازؒ

آپ کا پورا نام خواجہ معین الدین حسن چشتیؒ تھا اور سب لوگ خواجہ غریب نواز اجمیریؒ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آپ کے بچپن کا ایک واقعہ ہے۔ عید کا دن تھا۔ آپ صبح سویرے اُٹھے، غسل کیا، نئے کپڑے پہنے اور گھر کے لوگوں کے ساتھ نماز کے لیے عیدگاہ کی طرف چلے۔ راستہ میں آپ کو ایک لڑکا ملا۔ اُس کے جسم پر میلے کچیلے، پھٹے پرانے کپڑے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ مایوس و پریشان منہ لٹکائے کھڑا تھا۔ آپ کو اس کی پریشانی دیکھ کر رحم آگیا۔ آپ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس لڑکے کو اپنے گھر لے آئے اور اسے اپنے ہاتھوں سے نہلایا اور اپنے نئے کپڑے اس کو پہنائے۔ اور خود پرانے دُھلے ہوئے کپڑے پہنے اور اسے اپنے ساتھ عیدگاہ لے گئے۔

خواجہ صاحب بچپن ہی سے غریب نواز تھے۔ ان کی زندگی ہمیں یہ سبق سکھاتی ہے کہ ہم بھی اپنی خوشیوں کے موقعوں پر غریب بچّوں کو نہ بھولیں اور اپنی خوشیوں میں انھیں بھی برابر کا شریک رکھیں۔

ماں کی خدمت

ماہم شہر میں سمندر کے کنارے حضرت مخدوم علی ماہمیؒ فقیہ کا مزار ہے۔ آپ قطب کوکن کے نام سے مشہور ہیں۔

آج جہاں پر آپ کا مزار ہے اس کے قریب ہی تقریباً چھ سو سال پہلے یہاں ایک چھوٹا سا کچا مکان تھا۔ آپ اپنی والدہ کے ساتھ اس مکان میں رہتے تھے۔

رات کا وقت تھا۔ گرمی سخت پڑ رہی تھی آپ کی والدہ پیاس سے بے چین تھیں۔ آپ نے بستر پر لیٹے ہوئے آواز دی: "بیٹا ایک گلاس پانی لے آ۔"

آپ ایک ہی آواز سن کر بستر سے کھڑے ہوگئے اور پانی لے کر ماں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دیکھا تو ماں کی آنکھ لگ گئی تھی۔

آپ نے والدہ کو جگانا مناسب نہ سمجھا اور ہاتھ میں پانی کا گلاس لیے والدہ کے پاس ساری رات کھڑے رہے۔ یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ والدہ اللہ کو یاد کرتی ہوئی اٹھیں تو دیکھا کہ بیٹا ویسے ہی پانی کا گلاس لیے کھڑا ہے۔

آپ کی والدہ کو یاد آیا کہ میں نے رات پانی مانگا تھا۔ کہنے لگیں: "بیٹا! تم رات بھر یوں ہی کھڑے رہے؟"

بیٹے نے جواب دیا: "اماں جان! آپ کی اسی وقت آنکھ لگی تھی آپ کو نیند میں اٹھانا مناسب نہیں تھا اور رات کو جس وقت بھی آپ کو پیاس لگے آپ کی خدمت میں پانی پیش کر دوں۔"

بیٹے کی اطاعت دیکھ کر ماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آپ کے ہاتھ سے گلاس لیا۔ آپ کی پیشانی کو چوما اور بہت دُعائیں دیں۔

ماں کی دعاؤں نے آپ کو مخدوم بنا دیا۔ مخدوم اسے کہتے ہیں جس کی خدمت کی جائے۔ پہلے دوسروں کی خدمت کرنے والا ہی بعد میں مخدوم کہلاتا ہے۔ اس لیے اب دوسرے اس کی خدمت کرنا فخر سمجھتے ہیں۔ آپ بھی اپنی ماں کی خدمت کیجیے۔ ماں کی خدمت سے اس دنیا میں عزت ملے گی اور اُس دنیا میں جنت کیونکہ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔

استاد کا ادب

بغداد میں خلیفہ ہارون رشید ایک مشہور بادشاہ گزرے ہیں۔ اُن کے دو بیٹے تھے امین الرشید اور

مامون الرشید تھے۔

ایک دن کی بات ہے کہ دونوں لڑکے اپنے استاد کے پاس پڑھ رہے تھے۔ سبق پورا ہو گیا تو استاد جانے کے لیے اُٹھے۔ ابھی استاد تیار ہو کر چلنے ہی والے تھے کہ دونوں استاد کی جوتیاں سیدھی کرنے دوڑے۔ جوتیوں کے پاس پہنچ کر وہ آپس میں لڑنے لگے۔ امین الرشید نے کہا: "جوتیوں کے پاس پہلے میں پہنچا ہوں اس لیے انھیں میں سیدھی کروں گا۔" مامون الرشید نے کہا: "نہیں جوتیوں کے پاس پہلے پہنچا ہوں اس لیے یہ میرا حق ہے جوتیاں میں سیدھی کروں گا۔"

دونوں کا یہ جذبہ دیکھ کر استاد بہت خوش ہوئے انھوں نے امین الرشید سے کہا: "تم ایک جوتی سیدھی کرو۔" اس کے بعد مامون الرشید سے کہا: "دوسری جوتی تم سیدھی کرو۔"

استاد کے حکم کے مطابق دونوں نے جوتیاں سیدھی کیں استاد دونوں کو دُعائیں دیتے ہوئے چلے گئے۔

جب خلیفہ ہارون الرشید کو اپنے بیٹوں کی یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ دونوں کو اپنے پاس بلایا۔ خوب پیار کیا اور بہت انعام دیا۔ دربار میں اپنے بیٹوں کے اس کارنامے کا ذکر بہت فخر سے کیا اور کہا: "دیکھو استاد کا مرتبہ کتنا بڑا ہے کہ شہزادے استاد کی جوتیاں سیدھی کرتے ہیں۔"

استاد کا مرتبہ بہت بڑا ہے۔ آپ بھی اپنے استاد کا ادب کرنا سیکھیے۔

نوکر کی عزت

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بانی سر سید احمد خاں چھوٹے تھے ان کے والد اللہ کو پیارے ہو گئے تھے اور ان کی والدہ ان کی پرورش کر رہی تھیں۔

ایک روز ناراض ہو کر سر سید احمد خاں نے کسی بات پر برہم ہو کر ملازم کے ایک طمانچہ مار دیا۔ ملازم نے اس بات کی شکایت سر سید احمد خاں کی والدہ سے کی۔ وہ سہم گئے اور بھاگ کر اپنی خالہ کے گھر جا کر چھپ گئے۔

سر سید احمد خاں کی والدہ نے کہا جب تک سید احمد خاں ملازم سے معافی نہیں مانگیں گے میں اُس وقت تک انھیں گھر میں نہیں آنے دوں گی۔"

نوکر سے معافی مانگنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے مگر ماں کے سامنے اُن کی ایک نہیں چلی۔ انھیں مجبور ہو کر نوکر سے معافی مانگنی پڑی تب جا کر والدہ نے انھیں گھر میں آنے کی اجازت دی۔ انھیں پیار کیا اور سمجھایا کہ اپنے سے بڑوں کی عزت کرنی چاہیے خواہ وہ مرتبے میں اپنے سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔ سید احمد خاں کو ماں کی بات زندگی بھر یاد رہی۔

کسی شہر میں ایک بوڑھا برہمن رہا کرتا تھا۔ گھر میں اُس کی بیوی اور دو بچّے تھے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ غریب لوگ تھے۔ بڑی مشکل سے گھر والوں کی پرورش ہو پاتی تھی۔ ایک دن تو حالت اتنی خراب ہوگئی کہ سُوکھی روٹی بھی انھیں نصیب نہ ہوئی، بچّے بھوک سے بلکنے لگے۔ اِس پر برہمنی سے نہ رہا گیا۔ اُس نے کہا: "بچّوں کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی، آپ اُن کے کھانے کا کوئی انتظام کیجیے۔" برہمن نے کہا: یہاں تو کچھ ہوتا دکھائی نہیں دیتا، تم پڑوس سے کچھ اُدھار مانگ لاؤ۔ میں پردیس جاکر رُوپے کمانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

برہمنی نے کچھ ستّو ایک پوٹلی میں باندھ کر برہمن کے ساتھ کر دیا۔ برہمن گھر چھوڑ کر چل دیا۔ چلتے چلتے دوپہر کے وقت ایک تالاب کے کنارے رُکا۔ تالاب کے ٹھنڈے پانی میں اُس نے ہاتھ منھ دھویا اور چادر بچھا کر بیٹھ گیا۔ شیوجی کا بڑا بھگت تھا اور اُن کی پُوجا کیے بغیر کھانا نہیں کھاتا تھا۔ اپنی عادت کے مطابق برہمن نے بڑے چاؤ سے شیوجی کی پُوجا کی۔ پوجا ختم کرنے کے بعد پوٹلی کھول کر اُس نے ستّو کھایا اور تالاب کا پانی پی کر وہیں سو گیا۔

دو تین گھنٹے وہ گہری نیند سوتا رہا۔ جب اُٹھا تو اُس کی تھکن دور ہو چکی تھی۔ آگے چلنے کے لیے جب اُس نے پوٹلی اُٹھائی تو وہ اُسے بھاری محسوس ہوئی۔ اُس نے پوٹلی کھول کر دیکھا تو وہ ستّو سے بھری ہوئی تھی۔ برہمن کو بڑا تعجّب ہوا۔ اُس نے سوچا۔ میں نے تو پوٹلی خالی کر دی تھی۔ یہ کیسے بھر گئی۔ ضرور کوئی راز ہے۔ اس راز کو جاننا چاہیے۔

برہمن نے پھر پوٹلی خالی کی اور ایک طرف رکھ دی۔ اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے گٹھری بھر گئی۔ یہ دیکھ کر برہمن نے سوچا۔ کہ یہ سب شیوجی کی مہربانی ہے۔ انھوں نے میری غریبی دُور کرنے کے لیے ایسا کیا ہے۔ یہ سوچ کر اُس کے دل میں خیال آیا کہ آگے نوکری کی تلاش میں جانا فضول ہے۔ شیوجی نے راستے میں ہی کام بنا دیا۔ اب وہ آگے جانے کی جگہ گھر کی طرف لوٹ پڑا۔ راستے میں اُس کے دوست کا گانو پڑتا تھا۔ برہمن نے سوچا۔ آئے ہیں تو دوست سے بھی ملتے چلیں۔ دوست کے گھر پہنچ کر برہمن نے اُسے اپنی پوٹلی کا راز بتا دیا۔ دوست کی بیوی بڑی لالچی تھی اور اُسے چوری کی بھی عادت تھی۔ رات کو جب سب سو گئے تو اُس نے برہمن کی ستّو کی پوٹلی اُٹھالی اور اُس کی جگہ دوسری پوٹلی رکھ دی۔ برہمن کو پتہ نہ چلا اور وہ پوٹلی اُٹھا کر گھر لوٹ آیا۔

گھر آکر اُس نے اپنی بیوی سے کہا۔ "دیکھو اب اس پوٹلی سے ہمارے کھانے کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا۔ اس کا ستّو ختم ہوتے ہی اس میں اور ستّو بھر جائے گا۔" برہمنی بہت خوش ہوئی۔ لیکن ستّو ختم ہو جانے کے بعد

C ۲/۲۴ اشلوک وہار - دہلی - ۵۲

پوٹلی خالی کی خالی رہی۔ برہمن بہت چکرایا۔ اس نے سوچا کہ اب تو ایک ہی راستہ ہے کہ دوبارہ تالاب پر جایا جائے۔

تالاب پر پہنچ کر اُس نے وہ سب کچھ پھر کیا جو پہلی بار کر چکا تھا۔ اس بار اُس کی پوٹلی رُوپیوں سے بھر گئی۔ روپے اُس نے خرچ کر ڈالے، وہ دوبارہ رُوپیوں سے بھر گئی۔ برہمن بہت خوش ہوا اور پوٹلی لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ اپنے دوست کے گھر پھر رُکا۔ پہلے کی طرح اپنی پوٹلی کا تماشا پھر دکھایا۔ دوست کی بیوی نے پہلے کی طرح برہمن کی رُوپیوں سے بھری پوٹلی کی جگہ پر دوسری پوٹلی رکھ دی۔

گھر پہنچ کر برہمن نے اپنی بیوی کو اس پوٹلی کے بارے میں بتایا۔ برہمنی بہت خوش ہوئی۔ اُس نے پوٹلی کے رُوپے سے سب گھر والوں کے لیے اچھے اچھے کپڑے سلوائے اور گھر کا سامان خریدا۔ کچھ دنوں بعد وہ پیسے ختم ہوگئے۔ لیکن پوٹلی روپیوں سے دوبارہ نہ بھری۔ برہمن پھر چکرایا۔ اُس کے دل میں اس بار اپنے دوست کے بارے میں شک آیا۔ لیکن ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے اُسے چُپ رہنا پڑا۔ اُس نے سوچا کہ پھر تالاب پر چلیں۔

تالاب پر پہنچ کر اُس نے نہانے دھونے کے بعد شیوجی کی عبادت کی اور آسن پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں اسے ایک آواز سنائی پڑی ــــــ "اے برہمن! تیری دونوں پوٹلیاں تیرے دوست کی بیوی نے چرائی ہیں۔ تو اس بار یہ ڈنڈا لے جا۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ چور کا ہاتھ لگتے ہی یہ ڈنڈا چور کو پیٹنے لگتا ہے۔ ڈنڈا تیرے پیچھے رکھا ہے۔" برہمن نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو واقعی ایک ڈنڈا وہاں رکھا ہوا تھا۔ برہمن وہ ڈنڈا لے کر چل دیا اور اپنے دوست کے گھر جا پہنچا۔ وہاں اُس نے اپنے دوست سے خوب کُھل کر ہنستے ہوئے باتیں کیں اور رات کو سوتے وقت کھاٹ کے نیچے ڈنڈا رکھ کر سوگیا۔ دوست کی بیوی نے یہ سوچا کہ اس ڈنڈے میں بھی کوئی خاص بات ہوگی۔ اُسے بھی چُرا لینے کی سوجھی اور آدھی رات کے وقت وہ برہمن کی کھاٹ کے پاس جا پہنچی۔ اس کے بعد اُس نے نیچے جھک کر دھیرے سے وہ ڈنڈا اُٹھالیا۔ لیکن یہ کیا؟ ڈنڈے نے اُسے پیٹنا شروع کر دیا۔ دوست کی بیوی وہاں سے بھاگی۔ ڈنڈا بھی اُس کے پیچھے ہولیا اور دھیا دھپ اُسے پیٹنے لگا۔ اب تو وہ چلّا اُٹھی۔

"بچاؤ، بچاؤ!"

برہمن اور اُس کے دوست کی آنکھ کھُل گئی۔ اُنھوں نے دیکھا کہ ڈنڈا "دیوی جی" کی خوب مرمّت کر رہا ہے۔ دوست کی بیوی نے برہمن سے درخواست کی کہ وہ اُسے بچائے۔ دوست نے بھی اُس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ برہمن نے کہا ـــ "میری پوٹلیاں دے دو، تو یہ ڈنڈا رُک جائے گا۔" اُس نے دونوں پوٹلیاں فوراً برہمن کو واپس کر دیں۔ برہمن نے ڈنڈا پکڑ لیا اور ڈنڈا رُک گیا۔ برہمن ڈنڈا اور پوٹلیاں لے کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

گھر پہنچ کر اُس نے برہمنی کو پوٹلیاں دکھائیں اور ڈنڈے کی کہانی سنائی۔ پوٹلیاں پاکر برہمنی کے خاندان کے دن بدل گئے۔ اُنھیں کسی قسم کی کوئی کمی نہ رہی اور وہ لوگ آرام سے رہنے لگے۔

* مسعود ظہیر نقوی۔ علیگ

سرسیّد احمد خاں

بچّو! عام طور پر دُنیا کا دستور یہ ہے کہ لوگ پیدا ہوتے ہیں، زندگی گزارتے ہیں اور مر جاتے ہیں اُن کے عزیز کچھ دن تک غم منا لیتے ہیں۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ لوگ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ کون کب پیدا ہوا، کب تک جیا اور کب مر گیا۔ مگر اس کے برعکس کچھ شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو خود تو ہمارے درمیان نہیں رہ جاتیں مگر اُن کی یاد ہمارے دلوں میں بہت دِنوں تک قائم رہتی ہے۔ بقول ساحرؔ

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے
جسم مر جاتے ہیں انسان نہیں مر جاتے

ایسی ہی شخصیتوں میں سرسیّد احمد خاں کا نام نامی بھی شامل ہے۔

سرسیّد ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی کے ایک معزّز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد سیّد متقی بہادر شاہ کے درباری تھے۔ شروع شروع میں سرسیّد بہت کھلنڈرے آدمی تھے مگر اپنے والد کے انتقال کے بعد بہت ہی سنجیدہ اور متین بن گئے۔

سرسیّد بڑے سیاست داں، ماہرِ تعلیم، سماجی اور مذہبی مصلح اور بہترین تاریخ داں تھے۔ بہ قول مرحوم رشید احمد صدّیقی مدا اگر سرسیّد خانقاہ میں بیٹھ جاتے تو بہت بڑے بُزرگ مانے جاتے۔ اگر سیاست اختیار کرتے تو سب سے بڑے سیاست داں ہوتے۔ ادب اور شاعری کی طرف نکل جاتے تو ایک زمانے سے داد پاتے۔ فلسفہ کی طرف رُخ کرتے تو کتنے ہی قافلوں کے سالار بن جاتے۔" لیکن ربّ العزّت

نقوی منزل، شبلی کالونی، رسول وائی علی گڑھ

کو سرسیّد سے ایک اور بڑا کام لینا تھا، وہ کام تھا مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنا اور زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا۔ اس کام کو انھوں نے انجام دیا اور بہت اچھی طرح انجام دیا۔ سرسیّد نے دیکھا کہ ملک انگریزوں کا غلام ہے اور قوم تعلیم اور شعورِ حکومت سے ناآشنا، خوابِ غفلت میں مدہوش ہے۔ ایسے پُر آشوب دور میں سرسیّد نے قوم کی رہ نمائی کی جس کی سخت ضرورت تھی۔

سرسیّد سمجھتے تھے کہ ملک اُس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک قوم زیورِ تعلیم سے آراستہ نہ ہو۔ جب تک قوم میں شعورِ حکومت و ریاست نہ آئے۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے اور قوم کو اعلا تعلیم سے آراستہ کرنے کا بیڑہ اُٹھا لیا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے علی گڑھ میں "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج" کھولا۔ اس کالج کے قیام کے لیے سرسیّد کو کتنی تکلیفیں اُٹھانا پڑیں، کتنی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا، کافر، مرتد اور دیوانہ جیسے خطابات سے نوازے گئے، ان کا تذکرہ ایک مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں۔

بہر حال اب یہی کالج مسلم یونی ورسٹی کے نام سے دنیا بھر کے تعلیم یافتہ طبقوں میں جانی پہچانی جاتی ہے۔

اسی یونی ورسٹی نے ملک کو بہترین سیاست داں، شاعر اور ادیب مہیّا کیے جن میں چند نام یہ ہیں:

مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں ڈاکٹر ذاکر حسین، شیخ عبداللہ، مجاز وغیرہ وغیرہ۔

ملک کی آزادی میں سر سید احمد اور علی گڑھ یونی ورسٹی کا کتنا بڑا ہاتھ ہے، اس کا اندازہ ہر سمجھ دار انسان کو ہو سکتا ہے۔

قدرت نے سر سید کو لا محدود صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ وہ تحریر و تقریر میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ اُن کی قوّت ارادی بہت زبردست تھی۔ ان میں خدمت قوم کا جذبہ، ایثار، خلوص بہت زیادہ تھا۔ انھوں نے قوم کی بھلائی کے لیے جتنی کتابیں اور مضامین لکھے اُن کی فہرست بنانا مشکل ہے۔ انھوں نے "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر دھوم مچا دی تھی۔ ایک اور کتاب خطبات احمدیہ انگریز مصنّف کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کے دنداں شکن جواب کے طور پر لکھی تھی۔ جو ملک اور بیرون ہند میں بہت مقبول ہوئی۔

سر سید کی عظمت کا مختصر اندازہ سر جان اسٹریچی، کے ان جملوں سے ہو سکتا ہے۔ "مجھے سر سید کو اپنا دوست کہنے پر فخر ہے۔ کسی اور نسل یا کسی ملک کے آدمی کے لیے میرے دل میں اتنا احترام نہیں ہے، جتنا سر سید کے لیے ہے۔ سر سید اپنے زمانے کے بہترین ججوں میں سے تھے۔ کوئی انگریز بھی اتنے حوصلے اعتماد اور ذمہ داری سے نہیں بول سکتا تھا جتنا کہ سر سید بول سکتے تھے۔

۱۸۹۸ء میں سر سید پوری عمر خدمت خلق میں صرف کر کے علی گڑھ میں کبھی نہ ٹوٹنے والی نیند سو گئے۔ اور ہندوستان کا ایک جگمگاتا ہوا ستارہ گُل ہو گیا۔

آج جب کہ قوم اور ملک کو پھر سر سید کی ضرورت ہے سر سید علی گڑھ یونی ورسٹی کی عالی شان مسجد میں ہمیشگی کی نیند سو رہے ہیں۔

محمد نظیر الحسین

(مزاحیہ ڈراما)

عثمان : ایک بہرا انسان جو بہت اونچا سنتا اور اُلٹی بلٹی سمجھتا ہے۔ لیکن جواب سے باز نہیں رہتا۔
صغیر : اُس کا علیل نواسہ۔
نور الہدٰا :۔ عثمان کا دوست اور رشتے کا بھائی۔

پہلا منظر :۔

[عثمان کا گھر۔ لڑکے کھیل رہے ہیں۔ عثمان کی بیوی بیٹھی سی رہی ہے۔ نور الہدٰا داخل ہوتا ہے اور عثمان کی بیوی سے صغیر کی علالت کا ذکر کرتا ہے۔ اتنے میں عثمان آجاتا ہے]

عثمان :۔ کیا بات ہے ؟
نور الہدٰا :۔ بھائی ! صغیر بیمار ہے۔
عثمان :۔ ہاں ! ہمارے گھر میں سبزی تیار ہے۔
نورالہدا :۔ نہیں عاصمہ کا لڑکا صغیر بیمار ہے۔
عثمان :۔ اچھا !! آج تمھاری ڈیوٹی ہے۔ کیوں کہ سوموار ہے۔

(سب زور سے ہنستے ہیں)

نورالہدا :۔ (چلا کر کہتا ہے) صغیر بیمار ہے۔
عثمان :۔ آہ ! صغیر بیمار ہے۔ اچھا میں دیکھنے جاتا ہوں۔
(عثمان چلا جاتا ہے۔ یہاں بیوی اور بچے سب ہنستے ہیں)

دوسرا منظر :۔

[عاصمہ کا دولت کدہ۔ اُس کا لڑکا صغیر جو پندرہ سال کا ہے لحاف اوڑھے پڑا ہے۔ عاصمہ کسی کام سے پڑوس میں گئی ہے]

عثمان :۔ (صغیر سے) کیوں طبیعت کیسی ہے ؟
صغیر :۔ (دھیمے لہجے میں) "اچھی نہیں ہے۔"
عثمان :۔ بہت اچھا، بہت اچھا۔ ہاں ! تمھارے باپ نے علاج کس کا شروع کیا ہے ؟

(صغیر جواب سے جل پڑتا ہے)

عثمان :۔ بہت خوب ! کتنا اچھا طبیب ہے۔ معالج بھی خوب ہے۔ اچھا ! کہیں تفریح کو بھی جاتے ہو ؟
صغیر :۔ (برافروختہ ہوکر) جیل خانے جاتا ہوں۔
عثمان :۔ اچھا ! بڑے آدمی آج کل سیر کے لیے وہیں جاتے ہیں۔ دوا کیا پیتے ہو ؟ طبیب نے کون سا مرض تجویز کیا ہے ؟
صغیر :۔ میں زہر پیتا ہوں۔ اور مرض ڈاکٹر نے موت بتایا ہے۔
عثمان :۔ بڑی اچھی دوا ہے۔ اور مرض بھی مہلک نہیں ہے۔

(صغیر ان لاحاصل باتوں سے کبیدہ ہوجاتا ہے۔ اور دردِ دار طریقے پر روتا ہے۔ عاصمہ گھبرائی ہوئی آتی ہے۔ صغیر کو دھیرج دیتی ہے۔ عثمان چلا جاتا ہے۔ ملازم سے حال سُن کر عاصمہ مسکراتی ہے۔ پردہ گرتا ہے۔)

کرسپانگ

ادھر ادھر

ایک دن کا مدرسہ

نئی دہلی، ۱۱ اپریل (بھارتی) جامعہ ملیہ کے ماڈل اسکول کے بچوں نے آج خود ہی اسکول کا سارا کام کاج چلایا۔ اسکول کے بچوں کی حکومت کے زیر انتظام چلائے گئے "ایک دن کا مدرسہ" میں بچے ہی اسکول کے نگران تھے اور بچے ہی استاد اور بورڈنگ کے اتالیق بھی۔ اسکول کی صفائی اور دفتر کے کاموں کا چارج بھی بچوں نے بہت خوبی کے ساتھ سنبھالا۔

مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین نے بچوں کی نئی تعلیم کے سلسلے میں جو تجربے کیے تھے ان میں "ایک دن کے مدرسے" کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔

ذہنی اور جسمانی اعتبار سے معذور بچوں کو عام بچوں کے ساتھ تعلیم دینے کا ایک تجربہ اسکول میں شروع کیا گیا ہے۔ آج ان معذور بچوں کے تیار کیے ہوئے سامانوں کی ایک نمائش بھی لگائی گئی۔ بال بھون کی زیر نگرانی اسکول میں چل رہے پروجیکٹ سائنسی میوزیم اور تعلیم کے سمعی بصری "آڈیو ویژول" امدادی سامان کا کمرہ بھی خاص طور سے لوگوں کی توجہ کا مرکز رہا۔

الوداعی تقریب

اردو مدرسہ ہائر جام نیر ضلع جلگاؤں کی جماعت ہفتم کے طلبہ کی الوداعی تقریب مورخہ ۳۰ اپریل کو مدرسہ ہذا میں محترم ابراہیم خاں کی صدارت میں منعقد کی گئی۔ پروگرام کا آغاز اقبال عارف کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ بعد میں محمد عارف نے ترانۂ اقبال پیش کیا۔ جماعت ہفتم کے طلبہ میں سے جمیل الدین، اقبال احمد، ظہور احمد نے مدرسہ اور استاد محترم کے تعلق سے اپنی عقیدت کے جذبات کا اظہار کیا اور وعدہ کیا کہ وہ سماج اور قوم کی فلاح و بہبود کے لیے تن من کی بازی لگانے کے لیے بھی تیار ہیں۔

مرسلہ، صدر مدرس اردو ہائر اسکول جام نیر ضلع جلگاؤں

ایوب اردو گرلز اسکول پٹنہ کو پہلا انعام

نئی دہلی ۲۴ مارچ (ی ان ا) تعلیمی میدان میں مسلمانوں کی پس ماندگی کے اسباب پر بہترین رپورٹ پیش کرنے پر ایوب اردو گرلز ہائی اسکول مہندرو پٹنہ کو ہمدرد تعلیمی انجمن کی طرف سے دس ہزار روپے کا انعام دیا گیا۔

ڈگری کالج کی سطح پر بہترین رپورٹ پر فاروق ڈگری کالج کالی کٹ اور انجمن آرٹ سائنس اور کامرس کالج بیجا پور کرناٹک کو دس ہزار روپے کا انعام دیا گیا۔ جائزے کا مقصد تعلیمی میدان میں مسلمانوں کی پس ماندگی کے اسباب کا پتا لگانا تھا۔ یہ انجمن کمزور طبقات میں جہالت کے خاتمے میں بھی مدد کرے گی۔

پرائمری اسکولوں کے بچوں کو وظیفے

نئی دہلی، ۲۷ اپریل۔ نئی دہلی میونسپل کمیٹی نے آج گیشنی بائی نگر کے ایکسٹینشن سروسز کم سائنس سینٹر پر منعقدہ ایک سادہ تقریب میں پرائمری اسکولوں کے ۷۵ بچوں کو سائنس وظیفے دیے۔ اس وظیفے کے تحت ہر بچے کو ساٹھ روپے سالانہ دیے جائیں گے۔ نئی دہلی میونسپل کمیٹی کے مالی مشیر مسٹر رام سنگھ نے بچوں کو وظیفے تقسیم کیے۔

اپریل کے "پیام تعلیم" میں خاص کر "سبزیوں کا مشاعرہ" بہت زیادہ پسند آیا۔ نظم بھی اچھی لگی۔ جاوید نہال حشمی کی کارٹونی کہانیوں کا کہنا ہی کیا۔ بس ہنستے ہنستے بے دم ہو گیا۔

جاوید اختر درجہ نہم سکنڈری سیکشن
انسان اسکول کشن گنج (پورنیا)

مئی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ میں آپ کو اور پیامیوں کو خوش خبری سناتا ہوں کہ پیام تعلیم کے رسیا۔ بچوں کو تعلیم دیتے وقت اپنی میٹھی بولی سے دلوں کو جیتنے والے استاد تاج کی شادی خانہ آبادی شکیلہ خاتون کے ہمراہ ۲۰ مئی ۸۲ء کو ہو گئی۔
میں اپنے استاد ماسٹر غیاث الدین تاج کو مبارک باد پیش کرتا ہوں

(ادارۂ پیام تعلیم کی طرف سے بھی مبارک باد) رضوان انصاری

آزاد نگر کلٹی۔ بردوان (بہار)

سب سے زیادہ مجھے ناصر زیدی کی کہانی پسند آئی۔ سبزیوں کا مشاعرہ پسند آیا۔ اس کے علاوہ تاج کی کہانی "لوٹی تلوار" اے ڈبلو شاکرہ کی کہانی "خواہش کیسے پوری ہو" شفیق احمد صدیقی کی کہانی "حسد کا انجام" بہت زیادہ پسند آئیں۔

مسرور حسن
لکھنیاں۔ بیگو سرائے۔ بہار

انتظار کے بعد اپریل کا شمارہ موصول ہوا۔ دیکھ کر خوشی ہوئی لکھ کر بیان نہیں کیا جا سکتا۔

چودھری عبدالمعید خان
مقام و ڈاک خانہ سرائے جگنا ضلع بہرائچ

تمام رعنائیوں اور خوب صورتی کے ساتھ ماہ اپریل کا "پیام تعلیم" دست یاب ہوا۔ واقعی بچوں کے لیے یہ بہت ہی لاجواب تحفہ ہے۔ اس کی رونق دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔

سیّد محمد احسن
1-6-M ایر روڈ برن پور۔ بردوان

اس بار تمام نظمیں اور مضامین معلوماتی اور دل چسپ ہیں۔ ناصر زیدی کا "سبزیوں کا مشاعرہ" اچھا لگا۔ ہم سب ہی بہن بھائی اس رسالے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

لکی عابد
میوزک کو رنر راجا تالاب چوک مین روڈ جھریا (دھنباد)

اپریل کا پیام تعلیم نظروں کے سامنے ہے۔ ناصر زیدی صاحب کا "سبزیوں کا مشاعرہ" اس شمارے کی جان ہے جس کے لیے میں تمام پیامیوں کی طرف سے مسعود احمد برکاتی صاحب کا شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر حلیم کوثر چاند پوری صاحب کا مضمون "پولیو" بھی قابل ستایش ہے۔ نظم "پیغام آخوت" بہت پسند آئی۔

احمد کمال حشمی
کانکی نارہ

ماہ فروری ۸۲ء کا تعلیمی میلا نمبر موصول ہوا۔ ظریف جبل پوری کی "سردی آئی" ظریفانہ نظم ؎
مرنا ہے تو پرمٹ لے کے مرو ۔ مرنے کی اجازت عام نہیں
اور ابو ہریرہ صاحب کی نظم ؎
یہ ہے میرا ہندستان میرے سپنوں کا جہان
دونوں نظمیں بہت پسند آئیں۔

امرناتھ بھاردواج
سنجالک گرام سیوا سینٹر ماجری

شیخ فخر الاسلام عمر ۱۵ سال
مشغلہ: مختلف قسم کی کتابوں کا مطالعہ، خطوط نویسی، اچھے لوگوں سے دوستی
پتا: نیم منزل دوسری منزلہ روم ۲۱۳-۷، ۱۵ بابو پکھوٹے اسٹریٹ، بمبئی ۳

اعجاز منصور صدیقی عمر ۱۷ سال
مشغلہ: شعر و شاعری، ڈرائنگ بنانا، پرانے ڈاک ٹکٹ وغیرہ جمع کرنا۔
پتا: راحت ہومیو مشن۔ سردار روڈ۔ ہزاری باغ ۸۲۵۳۰۱ بہار

فخر عالم فیض عمر ۱۸ سال
مشغلہ: پیام تعلیم اور دوسرے ادبی رسالوں کا مطالعہ، فٹ بال اور کرکٹ کھیلنا۔
پتا: کیر آف بی یان ستا پ نئی بستی ڈاک خانہ رحمت نگر برن پور۔ بردوان

اے، جے شاداب عمر ۱۴ سال
مشغلہ:۔ قلمی دل چسپی اور خط کا جواب جلد دینا۔
پتا: معرفت محمد ہاشم۔ کیٹرا پٹی۔ پوسٹ جھریا ضلع دھنباد۔ بہار

خان عبداللہ غلام نبی عمر ۱۹ سال
مشغلہ: فوٹو گرافی۔ ادبی رسائل کا مطالعہ، سیر و تفریح۔ کہانیاں لکھنا
پتا: ۱۳۶ ڈاکٹر ڈی۔ این روڈ۔ امپائر بلڈنگ۔ بمبئی ۱

ظفر الاسلام عمر ۱۳ سال
مشغلہ:۔ ادبی ناول پڑھنا۔ نماز پڑھنا۔
پتا: ۸ علی عمر اسٹریٹ۔ پہلا منزلہ روم نمبر ۲۱۳۔ بمبئی ۳

مہر جہاں عمر ۱۱ سال
مشغلہ: بڑوں کا کہنا ماننا۔ نماز پڑھنا۔ پیام تعلیم پڑھنا۔ خط کا جواب دینا۔

پتا: مکان نمبر ۶-۷-۵ کینہ پالمور، محبوب نگر ۵۰۹۰۰۱ (آندھرا پردیش)

سید خورشید انور عمر ۱۲ سال
مشغلہ: پیام تعلیم پڑھنا۔ دور دراز کے بھائیوں سے دوستی۔ بڑوں کی عزت کرنا۔
پتا: بیلا وارث۔ ڈسٹرکٹ اورنگ آباد ۸۲۴۱۰۱

محمد سلیم خان عمر
مشغلہ: حفظ کرنا، نماز پڑھنا، چھوٹوں سے محبت۔ فٹ بال کھیلنا۔
پتا: محمد بہاؤ الدین کیبن مین روم نمبر ۹۔ بلاک نمبر ۷، ۱۵۔ آسنسول

محمد جاوید انور
مشغلہ: کتب خانے جانا۔ فٹ بال کھیلنا۔ تصویر بنانا۔
پتا: جاوید انور۔ انسان اسکول۔ کشن گنج۔ (پورنیہ)

شاہ ابرار الرحمان عمر ۱۸ سال
مشغلہ: اچھی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ قلمی دوستی کرنا۔
پتا: مقام، پوسٹ لکھمنیاں۔ ضلع بیگو سرائے۔ (بہار)

جاوید اختر
مشغلہ: دل لگا کر پڑھنا۔ سائنس میں دل چسپی، نماز پڑھنا، اچھے لوگوں سے دوستی
پتا: جاوید اختر درجہ نہم سیکنڈری سیکشن انسان اسکول۔ کشن گنج (پورنیہ)

شاہد سعید عمر ۱۷ سال
مشغلہ: کراٹے۔ غم گین نغمات سننا۔ قلمی دوستی۔
پتا: ۱۰۰ ابا پوکھوٹے اسٹریٹ دوسرا منزلہ روم ۵۷ بمبئی ۳

فیروز سعید عمر ۱۶ سال
مشغلہ: قلمی دوستی۔ نماز پڑھنا
پتا: معرفت تاج بڑی دکان۔ شیفی بینک روڈ رحمت نگر برن پور بردوان

سہیل عارف عمر ۱۳ سال
مشغلہ: پیام تعلیم پڑھنا، ادب کی خدمت اور قلمی دوستی کرنا
پتا: معرفت سید الرحمٰن۔ سیفی بینک روڈ۔ نئی بستی رحمت نگر برنپور۔ بردوان

سیماب برق اطہر زاہدی
مشغلہ: فٹ بال کھیلنا، کہانی وغیرہ لکھنا۔
پتا: اطہر نکیتن گرجا پاڑا۔ رانی گنج۔ بردوان۔ (مغربی بنگال)

شگفتہ بنت اطہر عمر ۱۵ سال
مشغلہ: نظم اور کہانیاں لکھنا، پڑھنا۔ والی بال کھیلنا۔ بہنوں سے دوستی کرنا۔
پتا: ۳۸۵، شاہ گنج، الہ آباد ۔ ۳

میزبان: (مہمان سے) سنائیے جناب! خیریت کے ساتھ آئے......؟"
مہمان: جی نہیں... اکیلے آیا ہوں..."

★

استاد: سب لڑکوں نے دو دو صفحے کا مضمون "دودھ" پر لکھا ہے تم نے صرف آدھا صفحہ ہی لکھا؟
شکیل: جناب میں نے تو خالص دودھ پر لکھا ہے۔

غیاث الدین تاج شکیل کامل۔ بتیا نہ۔ کلنی (بردوان)

★

ریل چل رہی تھی۔ ریل میں ایک بڑھیا ہاتھ میں تھیلا لیے بیٹھی تھی۔ اچانک اُس نے زنجیر کھینچ دی۔
گارڈ: زنجیر کس نے کھینچی تھی؟
بڑھیا: میں نے۔
گارڈ: کیوں؟
بڑھیا: ارے بیٹے ذرا گاڑی آہستہ چلاؤ۔ میرے انڈے ٹوٹ جائیں گے۔

فرخ ریحان۔ بدر باغ۔ علی گڑھ

استاد: (سلیم سے) دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟
سلیم: (جلدی سے) پانچ
استاد: بیٹھ جاؤ تقریباً صحیح ہے۔

شوہر: (غصّے میں بیوی کو جھڑکتے ہوئے) چائے میں شکر نہیں اور یہ..... یہ ..... یہ کاغذ کا ٹکڑا چائے میں ڈال کر لائی ہو۔ آنکھیں پھوٹ گئیں کیا!؟
بیوی: (معصومیت سے) گھر میں شکر نہیں ہے اور آج کے اخبار میں "شکر" لکھا تھا اس لیے کاٹ کر چائے میں ڈال دی۔

محمد زبیر احمد خان پرویز فیض منزل قطب شاہی روڈ ناگنڈہ

ایک شخص کو اپنے دوست کی یاد جب بری طرح ستانے لگی تو اس نے سوچا کیوں نہ اپنے دوست کی تصویر بنائی جائے۔ چوں کہ وہ مصور نہ تھا اس لیے جب تصویر مکمل ہوئی تو وہ آہ بھر کر کہنے لگا۔ "آہ دوست، تم کتنے بدل گئے ہو۔"

★

آدھی رات کو سڑک پر ایک شرابی کو کھڑا دیکھ کر پولیس والے نے پوچھا، "تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟" شرابی نے جواب دیا "جناب اپنا گھر تلاش کر رہا ہوں۔ ویسے تمام دنیا میری آنکھوں کے سامنے کیوں گھوم رہی ہے؟" پولیس والے نے جواب دیا "بس بس زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ جیسے ہی گھوم کر گھر تمھاری آنکھوں کے سامنے آئے فوراً اس میں داخل ہو جاؤ کیوں کہ رات بہت ہو گئی ہے۔"

معلّم: (لڑکے سے) بھیڑ کو تتر بتر کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔؟
لڑکا: چندہ مانگنا شروع کر دینا چاہیے۔

★

لڑکا: ابّا جان! میں آج سے اسکول نہیں جاؤں گا۔ ماسٹر صاحب روزانہ کھڑا کر دیتے ہیں۔
والد: تب تو تمھیں کم سزا ملتی ہے۔ مجھے تو ماسٹر صاحب روزانہ مرغا بنا دیتے تھے۔

ناصر پرنس مُنوی (بہار)

مسافر (تانگے والے سے) جامع مسجد کا کیا لوگے؟
تانگے والا: بابو جی سے ایک روپیہ اور سامان مفت۔
مسافر: تو سامان لے چلو، میں پیدل چلتا ہوں۔

محمد ہارون حاجی عبدالرشید مانو کی کرانہ شاپ آکولہ

بچوں کی کوشش

اپریل فول

"۳۱ مارچ"

موسم بڑا ہی خوش گوار تھا۔ ٹھنڈی اور لطیف ہوا چل رہی تھی۔ ماحول پر خاموشی طاری تھی۔ دفعتاً اسکول کی گھنٹی حرکت میں آگئی اور خاموشی کا سکوت ٹوٹ گیا۔ طلبہ تیزی سے اسکول سے باہر نکلنے لگے۔ گویا مدت کے بعد قیدی جیل سے چھوٹے ہوں۔ احمد اور ندیم بھی باہر نکلے۔ احمد اور ندیم کا شمار نویں جماعت کے عقل مند، ذی شعور اور خوش اخلاق طلبہ میں ہوتا تھا۔

اسکول کے خوش نما باغ کی کیاری کے قریب پہنچے ہی تھے کہ احمد رک گیا اور ندیم سے بولا۔ "ندیم! کل "اپریل فول" کا دن ہے۔ کیا خیال ہے؟"

"خیال تو نیک ہے۔ چلو، پھر کسی کو قربانی کا بکرا بناتے ہیں۔" ندیم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

دونوں وہیں "اشوک" کے چھتنار درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنی اس اسپیشل قربانی کے لیے کوئی بکرا تجویز کرنے لگے۔

آخر کار اُن کے دماغ میں ایک نام اُبھرا، اور وہ نام تھا آصف کا۔ آصف اُن کی کلاس کا لائق اور فرسٹ آنے والا ایک طالب علم تھا۔ پچھلے سال بھی اُنھوں نے آصف ہی کو اپریل فول بنایا تھا جس کی وجہ سے آصف کو بہت شرمندگی اٹھانی پڑی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ احمد اور ندیم نے مل کر اپنے اسکول میں فون کیا تھا اور خود کو آصف ظاہر کرتے ہوئے پرنسپل صاحب کو چند نازیبا کلمات سے نوازا تھا۔ دوسرے دن پرنسپل صاحب آصف پر بہت برہم ہوئے۔ آصف نے اپنی صفائی پیش کرنی چاہی مگر انھوں نے آصف کو اسکول سے نکال دیا۔ آصف اپنے والدین کو لایا اور رو رو کر پرنسپل صاحب سے معافی مانگی۔ تب کہیں جاکر آصف کو اسکول آنے کی اجازت ملی۔

آصف کا خیال آتے ہی وہ مسکرا اُٹھے۔ احمد نے کہا: "دیکھنا ندیم! کل بے چارے کو کیسا سبق پڑھاتا ہوں۔ زندگی بھر نہیں تو دو تین سال تک تو ضرور یاد رکھے گا۔" دونوں ہنسنے لگے۔

"یکم اپریل"

رات کا سیاہ آنچل پھیلا ہوا تھا۔ ہوا دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ شاید صبح کے چار بجے ہوں گے۔ یکایک احمد کے بیڈ روم کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ احمد نے اونگھتے ہوئے ریسیور کان سے لگالیا اور بولا "ہیلو"۔ دوسری طرف سے جو آواز آئی اُسے سنتے ہی وہ اُچھل پڑا جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ کر چونک پڑے۔ کوئی شخص کہہ رہا تھا۔ "ہیلو! میں پولیس مین بول رہا ہوں کیا آپ احمد صدیقی ہیں؟"

"جی ہاں!" احمد نے جواب دیا۔

"یہاں اجمل پارک کے ٹیلی فون بوتھ کے برابر والی کرسی پر ندیم نامی ایک لڑکا زخمی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ پوچھ تاچھ کے سلسلے میں اُس نے آپ کا نام اور فون نمبر بتایا ہے۔

مہربانی کر کے جلد آیئے اُس کی حالت نازک ہے۔"

احمد جلدی اور گھبراہٹ میں یہ بھی بھول گیا کہ آج یکم اپریل ہے۔ ندیم اُس کا جگری دوست تھا۔ احمد نے نہ منہ ہاتھ دھوئے اور نہ ہی کپڑے بدلے۔ جھٹ پٹ اُٹھا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ مین روڈ پر پہنچا تو دُور دور کسی سواری کا کوئی پتا نہ تھا۔ وہ کچھ دور تک کسی سواری کی امید میں معمولی رفتار سے چلتا رہا اور پھر وہ دوڑ پڑا۔

ندیم کی آنکھ کھلی تو اُس نے محسوس کیا کہ کال بیل بج رہی ہے "اتنی رات کو کون ہو سکتا ہے۔" یہ سوچ کر اُس نے دروازہ کھولا تو کوئی بھی نہیں۔ اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ در اصل وہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اپنی بے وقوفی پر مسکراتے ہوئے اس نے ریسیور کانوں سے لگایا ....

وہ چونک اُٹھا۔ بدحواسی میں کپڑے پہنے اور عجلت میں گھر سے دوڑتا ہوا نکلا۔ خوش قسمتی سے اُسے ٹیکسی مل گئی۔ ٹیکسی والے کو اجمل پارک کا پتا دے کر وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

احمد تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ ہانپتا ہوا جب اجمل پارک پہنچا تو پانچ بج رہے تھے۔ پولیس مین کے بتائے ہوئے ٹیلی فون بوتھ کے قریب پہنچا تو، نہ تو پولیس مین دکھائی دیا اور نہ ندیم ہی ملا۔

احمد حیرت زدہ تھا کہ ندیم کہاں چلا گیا۔ کہیں وہ میرے آنے سے پہلے چل تو نہ بسا اور پولیس والا اُسے پوسٹ مارٹم کے لیے لے گیا۔ لیکن کرسی پر تو خون کا داغ دھبّا ہونا چاہیے تھا۔ کرسی صاف تھی۔ البتہ اسے وہاں ایک کاغذ کا ٹکڑا ملا۔ خوش خط حرفوں والا۔ "اپریل فول"۔

ابھی وہ کچھ سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ ٹیکسی رُکنے کی آواز آئی۔ ندیم ٹیکسی سے اُترا۔

ندیم کو دیکھتے ہی احمد کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ اب وہ سارا معاملہ سمجھ چکا تھا۔

اِدھر ندیم اس سوچ میں کہ احمد تو صحیح سلامت ہے پھر یہ سب کیا معاملہ ہے؟ ندیم نے آتے ہی پوچھا۔

"احمد! یہ سب کیا چکّر ہے؟ مجھے کسی نے فون پر بتایا کہ تم یہاں زخمی حالت میں پڑے ہوئے ہو، اِس لیے میں بھاگتا ہوا آ رہا ہوں۔"

احمد تصویرِ حیرت بنا خاموش رہا۔ اُس نے کاغذ کا ٹکڑا ندیم کو تھما دیا۔ اب چونکنے کی باری ندیم کی تھی اُسے اپنی بے وقوفی پر سخت غصّہ آ رہا تھا۔ احمد کو اس سانحے پر چکّر پر چکّر آ رہے تھے۔ وہ گرنے والا ہی تھا کہ ندیم نے اسے سنبھال لیا۔

احمد اپنے آپ کو فٹ محسوس کر رہا تھا۔ لہٰذا اُس نے اسکول جانے کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں ہی اسکول جا پہنچے۔ اُس وقت دونوں کے دل و دماغ میں صرف ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا کہ "انھیں بے وقوف کس نے بنایا؟"

یکایک ندیم بول پڑا۔ "احمد! کہیں آصف نے تو ہمیں بے وقوف نہیں بنایا!"

"۲ اپریل"

"وہ تھرڈ کلاس سوسائٹی کا لڑکا ہمیں کیا بے وقوف بنائے گا۔" احمد نے کڑوے لہجے میں کہا۔ مگر وہ ابھی خوش فہمی میں تھا کہ آصف آ نکلا اور آتے ہی بولا: "معاف کرنا، کل صبح میں نے تم دونوں کو پریشان کیا۔"

"یعنی وہ فون .... تم تم!" احمد ہکلایا۔

"ہاں! وہ میری ہی بدلی ہوئی آواز تھی۔" آصف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

احمد اور ندیم کا یہ حال تھا کہ "کاٹو تو لہو نہیں بدن میں" چہروں پر شرمندگی کی زردی اور جسم میں رعشہ۔

شرمندہ شرمندہ وہ اپنی کلاس کی طرف بڑھ گئے۔

بچو! بڑے بول کا سر نیچا۔ ہنسی تفریح اپنی جگہ درست لیکن احمد اور ندیم نے پرنسپل صاحب کی شخصیت کے ساتھ سخت نازیبا حرکت کی تھی اور پھر آصف کے بارے میں اُن کے خیالات تحقیر آمیز تھے۔ یہ دونوں باتیں معیوب تھیں۔

شاہد متین۔ محمدیہ ہائی اسکول، ۲ مسجد اسٹریٹ۔ بمبئی ۳

خون کا بدلہ خون

کسی ملک میں ایک جادوگر رہتا تھا۔ جس کا پیٹ انسانوں کے خون سے بھرتا تھا۔ وہ ایک شاندار حویلی میں رہا کرتا تھا۔ جب بھی اسے بھوک لگتی وہ شہر کی طرف نکل جاتا اور آدمیوں کا خون پی کر اپنے محل کی طرف واپس آجاتا۔ اس ملک کا جو بادشاہ تھا۔ اس کا خزانہ سونے چاندی اور جواہرات سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے دو شہزادے تھے۔ بادشاہ جہاں بھی جاتا اپنے لڑکوں کو ساتھ رکھتا تھا۔ ایک دن بادشاہ شکار کے لیے چلا۔ چوں کہ لڑکے بڑے بہادر اور صحت مند تھے اس لیے حسب دستور وہ بھی ساتھ تھے۔ یہ سب شکار کے لیے جا ہی رہے تھے کہ اُدھر سے جادوگر آتا ہوا دکھائی دیا۔ بادشاہ تو اسے دیکھ کر بہت پریشان ہو گیا۔ لیکن دونوں شہزادے بہت خوش ہوئے۔ کیوں کہ وہ عرصے سے اس جادوگر کی تلاش میں تھے اور طے کر رکھا تھا کہ وہ اس خون خوار کو ایک دن قتل کیے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ جب وہ جادوگر قریب آگیا تو دونوں شہزادے اس کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ جادوگر نے ان سے تین باتیں کہیں۔ (۱) میرے سامنے سے ہٹ جاؤ (۲) میرے ساتھ چلو (۳) یا مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ!

تینوں بھائیوں نے اس کی دو باتیں تو جیسے سنی ہی نہیں اور بولے تو مقابلے میں آ ہم مرنے کے لیے تیار رہیں۔ جادوگر کا ارادہ پہلے تو جنگ کا نہ تھا مگر غصے میں بھر کر وہ لڑائی پر آمادہ ہو گیا۔ ایک دوسرے سے لپٹ گئے جادوگر نے شہزادے کے سر کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ ایک شہزادے نے اس کی داڑھی پکڑ لی۔ دوسرے نے اس کے سر بال اور کمر کو پکڑ لیا سخت تکلیف کے سبب جادوگر کو جادو کرنے کا موقع ہی نہ مل رہا تھا لیکن وہ بلا کا طاقت ور تھا دن بھر لڑتا اور کوشش کرتا رہا اور شہزادوں سے نجات پانے کی کوشش کرتا رہا کہ ذرا سا بھی موقع ملے لیکن نہ ملا اور شہزادوں نے اس کو مار ہی ڈالا۔ اور اس کی لاش جلا ڈالی گئی۔ لیکن جب اس کی راکھ ہوا میں اڑی تو شہر میں مچھر اور مکھیوں کی مصیبت بیماری کے ساتھ آئی۔ مگر چند دنوں بعد ان سے شہریوں کو نجات ملی۔ لوگوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور شاہ زادوں کی بہادری کو بہت سراہا گیا۔ بادشاہ اپنے بیٹوں کی کارگزاری سے خوش ہو گیا۔

طفیل احمد سوت گرنی کوارٹر تاج آباد ناگپور

پابندی

شمس جاوید اپنے ماں باپ کا ہونہار لڑکا تھا۔ قدرت نے اُسے علم و ہنر سے مالامال کر رکھا تھا۔ ماں باپ شمس کو جاوید کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ شمس جاوید اپنے محلے کا واحد لڑکا تھا جو وقت سے تمام کام انجام دیا کرتا تھا۔

شمس جاوید کی عمر ابھی اگرچہ ۱۸ برس ہی کی تھی مگر اسی عمر میں اس نے بڑا نام پیدا کر رکھا تھا جس سے اس کے ماں باپ کا سر سماج میں اونچا ہو گیا تھا

شمس نے اپنے عزیز اوقات صرف کرنے کا ایک ڈھرا بنا لیا تھا۔ صبح کو سویرے اٹھ کر نماز پڑھتا پھر قرآن شریف کی تلاوت۔ پھر کچھ پڑھتا، پھر ناشتہ کرتا۔ کچھ دیر آرام کر کے اسکول ورک میں مصروف ہو جاتا۔ اسکول ورک پورا ہوتے ہوتے اسکول کا وقت ہو جاتا۔ بڑوں کو سلام کر کے پابندی اور شوق سے اسکول چلا جاتا۔

سالانہ امتحان کے موقع پر زیادہ پریشانی نہ ہوتی۔ ہمیشہ فائنل ٹیسٹ میں فرسٹ ڈویژن سے پاس کرتا۔ پھر بورڈ کے امتحان کی تیاری کرتا۔ بالآخر وہاں اول درجہ میں کامیابی اس کے قدم چومتی۔

جاوید شروع ہی سے محنتی تھا۔ وقت کا صحیح استعمال کرتا۔ جب ہی تو چھوٹی سی عمر میں ہی اسکول سے اچھی پوزیشن لے کر وہ کالج میں داخل ہو گیا۔

شمس جاوید کے تمام دوست احباب بھی کچھ ایسے ہی تھے جبھی تو شمس کا گروپ بھی ہونہار گروپ میں شمار کیا جانے لگا تھا اور لوگ عام طور پر سمجھنے لگے تھے کہ شمس جاوید مستقبل

میں کامیاب ترین انسان ہوگا۔

شمس جاوید کا یہ کہنا تھا کہ جو طالب علم وقت کا غلط استعمال کرتا ہے وہ ایک ہونہار اور اچھا طالب علم نہیں کہا جا سکتا۔ ایسے طالب علم اپنے ماں باپ کے ارمانوں کا خون کرتے ہیں۔

نسیمہ خاتون مولانا آزاد گرلس ہائی اسکول مٹیا برج کلکتہ ۲۔

قبر کی خبر

کسی شہر میں ایک کنجوس عورت رہتی تھی۔ وہ دان دھرم اور خیرات زکوٰۃ سے نفرت کرتی تھی۔ وہ کسی کو بھی ایک مٹھی آٹا تک دینے کی روادار نہ تھی۔

ایک دن ایک فقیر اس کنجوس عورت کے دروازے پر آیا اور صدا دی:

"مائی اللہ کے نام پر کچھ مل جائے!"

کنجوس عورت نے فقیر کو جھڑکتے ہوئے کہا:

"بھاگ جا یہاں سے، بڑا آیا ہے اللہ کے نام پر مانگنے والا، جا یہاں کچھ نہ ملے گا۔"

فقیر بہت گڑگڑایا۔ خدا کے نام کی اپیل کی، مگر بڑھیا کہاں ٹس سے مس ہونے والی تھی۔ اس نے ایک نہ سنی۔ وہ یہی کہتی رہی "بھاگ جا یہاں سے۔"

فقیر نے بڑھیا کے دروازے پر بادام کے کچھ چھلکے پڑے دیکھ لیے تھے۔ اس نے بڑھیا سے کہا۔

"یہ بے کار چھلکے ہی مجھے دے دو مائی۔ خدا کے نام پر مانگنے والے کو دروازے سے محروم تو نہ پھیرو۔"

بڑھیا کا جواب اب بھی نہیں تھا۔

اب فقیر کو ایک نئی ترکیب سوجھی اس نے کہا:

"مائی! یہ چھلکے تم مجھے دے دو۔ میں تمھارے لیے قبر کی خبر لا دوں گا۔ اس کے صلے میں اللہ میاں مجھے پانچ سو اشرفیاں دیں گے۔ وہ اشرفیاں بھی لا کر تم ہی کو دے دوں گا۔"

اشرفیوں کا نام سنتے ہی بڑھیا پھسل گئی اور اس نے بادام کے چھلکے فقیر کو دے دیے۔ اور فقیر سے کہا

"تم قبر کی خبر مت لانا۔ میں خود ہی ایک دن جاؤں گی۔"

دراصل اسے خوف تھا کہ فقیر کہیں خود ہی اشرفیاں ہڑپ نہ کر لے۔

فقیر بادام کے چھلکے لے کر چلا گیا۔

اس طرف اس کنجوس عورت نے اسی روز اپنے لیے ایک قبر کھد وائی اور کھائی کر اس میں لیٹ گئی اور گھر والوں سے کہہ دیا کہ صبح مجھے قبر میں سے نکال لینا۔

رات بھر بڑھیا ۵۰۰ اشرفیوں کی راہ دیکھتی رہی۔ نہ فقیر آیا۔ نہ اشرفیاں آئیں البتہ اس کی کھلی آنکھیں رات بھر سانپ اور بچھوؤں کی یلغار دیکھتی رہیں رات بھر بڑھیا یہ تماشا دیکھتی رہی۔ ڈر کے مارے اس کی جان سوکھ کر آدھی ہو گئی تھی اس کو اندازہ ہو چکا تھا کہ کنجوسی اور دنیاوی لالچ سب سے بڑا عذاب ہے۔ پیسہ اور مال ہوتے ہوئے زکوٰۃ ادا نہ کرنا خیر خیرات نہ کرنا۔ اللہ کا دیا مال اللہ کی راہ میں نہ خرچ کرنا اپنے حق میں سانپ اور بچھو پالنا ہے۔

بڑھیا اشرفیوں کو بھول گئی۔ رات بھر اللہ اللہ اور توبہ و استغفار کرتی رہی۔ صبح کو گھر والوں نے اس کو گڑھے سے نکالا تو وہ زرد ہو کر تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس نے فقیر کے حق میں دعائیں کیں کہ اسی کی بدولت اُسے یہ سبق ملا۔ اس نے کنجوسی اور دنیا داری کو ترک کر دیا۔ جی کھول کر خیر خیرات کرنے لگی اور سب کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنے لگی۔

رشیدہ خاتون سانے گرجی اُردو ہائی اسکول ھوتیہ دروازہ ناگ پور

بڑھیا اور بکری

بہت دنوں کی بات ہے کہ ایک گاؤں میں واحد نام کا ایک لڑکا رہتا تھا۔ بڑا نیک اور سیدھا سادا، ماں باپ کا فرماں بردار، وہ سب کی عزت کرتا۔ لوگوں کا کہنا سنتا۔ اس کے گھر میں اس کی ایک رشتہ دار بڑھیا بھی رہتی تھی۔ بڑھیا نے ایک بکری پال رکھی تھی۔ بڑھیا بڑی غصہ ور اور ظالم تھی۔ مغرور اور اسی بات پر دن بھر بڑبڑایا کرتی۔ جھڑکتی مار پیٹ پر آمادہ ہو جاتی۔ واحد کو بات بات میں ڈانٹا کرتی

وہ ایک بید بھی رکھتی تھی، اکثر اُس سے واحد کو مار دیا کرتی تھی۔ واحد اُس سے بہت ڈرتا تھا۔ اُس کا ہر حکم مانتا اور دوڑ دوڑ کر اُس کا کام کر دیا کرتا تھا۔ پھر بھی بڑھیا اس سے کبھی خوش نہ رہتی۔ اُس سے کیا وہ کسی سے خوش نہ رہتی۔ غصّہ تو اس کی ناک پر تھا۔

بڑھیا نے ایک بکری پال رکھی تھی۔ اس بکری کو وہ دن بھر گھر میں بند رکھتی۔ کھانے پینے کو دیتی ضرور تھی۔ لیکن جانور اور وہ بھی بکری جو کھلے میدانوں اور جنگلوں میں چرائی نہ کرے تو ایک جگہ باندھ رکھنے سے وہ خاک موٹی ہو گی، بے حد دُبلی تھی۔

زلیخا نامی اپنی پڑوسن کے یہاں ایک دن جو بڑھیا گئی تو اُس کی موٹی تازی بکری کو دیکھ کر عش عش کر اٹھی۔ پوچھا "بہن زلیخا! تمھاری یہ بکری اتنی موٹی، فربہ اور چونچال کیسے ہے۔ میری بکری تو اس کے سامنے مُردار سی ہے۔ حالاں کہ میں کھلانے پلانے میں کوتاہی نہیں کرتی"

زلیخا نے بتایا "بکری باندھ کر رکھنے کی چیز نہیں ہے۔ میری بکری جنگلوں میں چرنے اور گھومنے پھرنے جاتی ہے۔ گھر میں لاکھ کھلاؤ بکری جب تک اپنے من پسند گھاس، پودے نہ کھائے اور کھلے میدانوں میں کلیلیں نہ کرے اس کے بدن پر بوٹی نہیں چڑھتی۔"

بڑھیا لونی تو بات اس کی سمجھ میں آچکی تھی۔ اُس نے واحد سے کہا کہ وہ روزانہ اُس کی بکری چرالایا کرے۔ ورنہ یہ مر جائے گی۔

واحد نے یہ بات مان لی اور وہ اس کی بکری کو جنگل میں لے جانے لگا۔ چند دنوں میں بکری کا رنگ روپ نکھر آیا۔ بکری پھرتیلی ہو گئی، جنگل کی ہوا اور ہریالی نے اپنا رنگ دکھایا۔ بکری چوکڑیاں بھرنے لگی۔ ایک روز شام کو جب بکری کے گھر آنے کا وقت ہوا، اور واحد نے اُسے تلاش کیا تو بکری غائب تھی۔ بہت ڈھونڈا مگر نہ ملی۔ حیران پریشان ڈرتے ڈرتے واپس آکر اُس نے بڑھیا کو خبر دی۔ بڑھیا تو چراغ پا ہو گئی۔ واحد کو خوب بُری بھلی سنائی، مارنے دوڑی

لیکن بکری کی فکر میں جلد ہی جنگل کی طرف بھاگی۔ واحد بھی پیچھے گیا۔ کرن ڈوبنے والی تھی۔ بارے بکری ایک ٹیلے پر بیٹھی جگالیاں کرتی مل گئی۔ بڑھیا کی جان میں جان آئی۔ بکری اور واحد کو کوسنے دیتی بکری کی رسی پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی گھر کی طرف آنے لگی۔

بڑھیا بکری کو لے کر سڑک پر پہنچ گئی۔ اُدھر سے ایک ٹرک آرہا تھا۔ اُس نے ہارن پر ہارن دیا۔ لیکن بڑھیا بک بک جھک جھک کرتی غصے میں بھری بکری کو کھینچتی ہوئی اس قدر منہمک تھی کہ اُس نے نہ موٹر کی آواز سنی اور نہ واحد کی۔ موٹر رُکتے رُکتے بھی بڑھیا کو دھکا دے گیا بڑھیا زمین پر گر پڑی۔ بکری چھوٹ گئی لیکن واحد نے پکڑ لیا۔ پھر بڑھیا کو اُٹھایا کچھ دیر کے بعد بڑھیا کے حواس درست ہوئے۔ خیریت ہوئی کہ چوٹ زیادہ نہ آئی ہڈی پسلی درست رہی۔ لیکن اس چوٹ کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اب بڑھیا غصے اور بدزبانی کو سوت کے منہ سے نکل کر ہمیشہ کے لیے بھول گئی اور واحد پر مہربان ہو گئی۔

نشاط پروین۔ محلہ رحیم پور کلنی۔ بردوان ۷۱۳۱۰۴

بھیڑیا اور سارس

کسی جنگل میں ایک بھیڑیا اور سارس رہا کرتے تھے۔ ایک دن بھیڑیے کے گلے میں ایک ہڈی اٹک گئی۔ اُس نے بہت کوشش کی مگر ناکام۔ ہڈی نکل نہ سکی۔ بالآخر وہ سارس کے پاس آیا اور کہا:۔

"دوست! ہم تم دوست بھی ہیں اور عزیز پڑوسی بھی۔ ایک ہی جنگل میں ہم دونوں رہتے ہیں۔ اس لیے آج مجھ پر وقت پڑا ہے مشکل میں جان آپڑی ہے، تم میری مدد کرو۔ میرے گلے میں ہڈی پھنس گئی ہے۔ مہربانی کر کے اُسے نکال دو"۔

سارس نے پوچھا۔ "میں کیسے نکالوں؟"۔

بھیڑیے نے کہا۔ "اپنی لمبی گردن سے۔ تم اپنی چونچ میرے حلق میں ڈال کر ہڈی نکال دو۔ اس کے عوض میں تم جو مانگو گے، میں تم کو دوں گا۔"

سارس راضی ہوگیا اور اُس نے اپنی لمبی گردن اور چونچ بھیڑیے کے حلق میں ڈال کر ہڈی نکال دی۔

کچھ عرصے بعد ایک دن بھیڑیے نے ایک خرگوش کا شکار کیا اور دریا کے کنارے مزے سے بیٹھ کر کھانے لگا۔

اُس روز سارس بہت بھوکا تھا۔ اُسے کھانے کو کچھ نہ ملا تھا۔ غذا کی تلاش میں وہ بھی دریا پر پہنچا تو دیکھا کہ بھیڑیا خرگوش کا گوشت کھا رہا ہے۔

اس نے بھیڑیے سے کہا۔

"دوست! آج میں بھی بہت بھوکا ہوں۔ گوشت کا ایک ٹکڑا مجھے عنایت کردو۔"

بھیڑیے نے سنی ان سنی کر دی اور جواب گول کرگیا۔

تب سارس نے اس کو یاد دلایا۔

"دوست! اُس دن کو یاد کرو جب حلق میں ہڈی اٹک گئی تھی اور تم تکلیف میں تھے۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم یہ ہڈی نکال دوگے تو جو مانگو گے دوں گا۔"

اس پر بھیڑیے نے کہا۔

"تو کیا تم میرے اس انعام اور احسان کو بھول گئے کہ میرے حلق سے تم اپنی گردن صحیح سلامت نکال لے گئے۔ کیا میں نے اپنی دوستی کا حق ادا نہ کردیا۔"

یاد رکھیے اپنے سے بڑے اور ظالم کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور اس سے بہتری کی امید رکھنا نادانی ہے۔

پرویز احمد خان غلام نبی درجہ دہم (کامرس) انجمن اسلام ہائی اسکول، بمبئی

ہیرامن توتا

ایک بادشاہ ایک دن دربار میں بیٹھا ہوا تھا کہ محل کے باہر سے ایک میر شکار کی آواز سنائی دی جو صدا لگا کر کچھ بیچ رہا تھا۔ بادشاہ کے حکم کے مطابق اس کو دربار میں بلایا گیا اور پوچھا گیا "کیا بیچتا ہے؟"

میر شکار نے جواب دیا "جہاں پناہ! میرے پاس ایک عجیب و غریب ہیرامن توتا ہے۔ میں اسے فروخت کرنا چاہتا ہوں!" یہ کہہ کر اُس نے توتے کی اور بھی تعریفیں کیں۔

بادشاہ نے جب توتے کی اتنی تعریفیں سنیں تو اس نے توتے کو خرید لیا۔ وہ تھا بھی تعریف کا مستحق۔ بادشاہ اس کی میٹھی میٹھی بولیوں پر ایسا لٹو ہوا کہ ہر وقت اُس کا پنجرا اپنی نظروں کے سامنے رکھتا۔ ایک دن بہت سارے توتوں کا ہجوم محل میں امنڈ پڑا۔ کچھ پنجرے پر براجمان ہو گئے، کچھ منڈیروں، محرابوں، طاقوں اور کھڑکیوں پر۔ بادشاہ کو تعجب بھی ہوا اور حیرت بھی۔ اس نے ہیرامن سے پوچھا۔

"آج تمھاری ذات پات والے اتنے سارے یہاں کیوں جمع ہو گئے ہیں؟"

ہیرامن نے جواب دیا: "آج میری بہن کی شادی ہے۔ یہ سب مجھے لینے آئے ہیں۔"

بادشاہ نے کہا "توتوں کی ذات تو بے وفا مشہور ہے۔ میں تجھے چھوڑ دوں تو تیرے آنے کا کیا بھروسا؟"

توتے نے کہا: "میں اُن میں سے نہیں ہوں۔ آپ میرا بھروسا کیجیے۔ میں ضرور آؤں گا۔"

بادشاہ کو رحم آگیا۔ اس نے پنجرہ کھول دیا۔ ہیرامن چلا گیا۔ جاتے جاتے بادشاہ نے کہا "تو واپس آئے گا تو میں تیری بہن کو بہترین جہیز دوں گا۔" توتا بولا: "میں بھی آپ کے لیے بہترین تحفہ لاؤں گا اور میری بہن بھی اپنا جہیز لینے کے لیے حاضر ہوگی۔"

توتا جب دو تین دنوں بعد محل میں آیا تو اس کی چونچ میں ایک پھل دبا ہوا تھا۔ اُس نے بادشاہ سے عرض کی۔

"اس پھل کو اپنے باغ میں بو دیجیے۔ یہ انمول ہے۔"

توتے کی بہن بھی اپنے جوڑے اور چند سہیلیوں کے ساتھ سلام کے لیے حاضر ہوئی تھی۔

بادشاہ نے حسبِ وعدہ جنگل کا علاقہ اس کے جہیز میں دے کر ہمیشہ کے لیے اس میں شکار کی ممانعت کر دی۔

بیج جو بویا گیا وہ کچھ دنوں میں اچھا خاصا درخت بن کر پھل پھول لایا اور پھل پک کر تیار ہوگیا۔

توتے نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ سب سے پہلے آپ

پھل کھا لیجیے۔ لیکن بادشاہ نے احتیاطاً وہ پھل پہلے اپنے کتے کو کھلا دیا۔ کتا پھل کھاتے ہی مر گیا۔ بادشاہ کو بڑا سخت غصہ آ گیا۔ اُس نے توتے کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر چیر ڈالیں اور دور پھینک دیا اور محل میں چلا آیا۔

دو چار دنوں کے اندر ہی ایسا ہوا کہ شہر میں ایک بوڑھے میاں بیوی کے درمیان زبردست جھگڑا ہو گیا۔ بڑھیا جان سے بے زار شاہی باغ میں آئی تاکہ وہ زہریلا پھل کھا کر مر جائے اور اُس نے پھل توڑ کر کھا لیا۔

مگر یہ کیا ہوا تو پھل کھاتے ہی خوب صورت جوان عورت بن گئی۔ وہ خوشی خوشی بھاگتی ہوئی گھر گئی تو اس کا بڈھا شوہر حیران رہ گیا۔ یہ ماجرا سن کر وہ بھی بیوی کے ساتھ باغ میں آیا۔ پھل کھاتے ہی وہ بھی تندرست خوب رُو، جوان ہو گیا۔ یہ بات شہر بھر میں مشہور ہو گئی۔ بادشاہ کو معلوم ہوا تو اس نے ان دونوں کو بلایا۔ اُس کی تصدیق ہو گئی بادشاہ نے بھی اسے استعمال کیا تو جوان ہو گیا۔

اب اُسے احساس ہوا کہ اس کا ہیرامن اس کے لیے کیسا بیش بہا تحفہ لایا تھا۔

اس کو اپنے کیے اور غصّے پر بڑا پچھتاوا آیا اور اب اسے معلوم ہوا کہ جلد بازی اور حد سے زیادہ غصہ شیطانی فعل ہے۔ مگر اب یہ پچھتاوا بے موقع تھا۔

"اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"

فیروزہ بیگم نزد ماڈل مل۔ نرنل باغ۔ ناگپور

وفادار کتّا

یہ تو ہم سبھی جانتے ہیں کہ کتّا ایک نہایت وفادار جانور ہے۔ لیجیے آج میں آپ کو اس کی ایک مختصر سی وفاداری کی کہانی بھی نمونتاً سناتا ہوں۔

میرے گاؤں میں ایک قمر صاحب رہتے ہیں جن کے پاس ایک کتا بھی ہے۔ وہ اپنے دو سال کے بچے کو لے کر برآمدے میں سو رہے تھے۔ رات آہستہ آہستہ کھسک رہی تھی کہ اچانک کتّے نے غرّانا شروع کیا۔ قمر صاحب کی آنکھ کھُل گئی۔ انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو ان کو کوئی خاص بات نہ محسوس ہوئی اور نہ کوئی آہٹ ملی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بچے کی نیند میں خلل پڑے اس لیے وہ کتے کو ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن کتا تھا کہ چپ ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔

مجبوراً اُٹھے کہ دیکھا جائے کہ آخر کتا بھونکتا ہی کیوں جا رہا ہے اور اُچھل کود بھی رہا ہے۔

اب جو اُٹھے اور زمین کی طرف نگاہ کی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بہت بڑا سا کالا سانپ اُسی طرف سے پلنگ پر آنا چاہتا تھا جدھر بچہ سو رہا تھا۔

کُتّا بھونک کر اور اُچھل کر پیچھے سے سانپ کو مارتا اور دور ہٹ جاتا۔ سانپ کو آگے بڑھنے اور پلنگ پر چڑھنے کا موقع نہیں دیتا۔ سانپ زخمی ہو کر اور بھی غضب ناک ہو چکا ہے مگر کتے سے پیش نہیں پاتا۔ سانپ جس طرف سے حملہ آور ہوتا کتا اس کی مدافعت کرتا۔

قمر صاحب نے اُٹھ کر سانپ کو مار ڈالا۔

عمران علی درجہ نہم پٹنہ ہائی اسکول پٹنہ

سچی لگن

ایک گاؤں میں دو لڑکیاں رہتی تھیں۔ ایک کا نام تھا ریکھا اور دوسری کا برکھا۔ یہ دونوں تلے اوپر کی بہنیں تھیں۔ ننھی منی خوب صورت سی۔ ان کے ماں باپ بڑے غریب تھے۔ دن بھر محنت مزدوری کرتے تب کہیں پیٹ بھرنے کا سامان ہوتا۔ اب یہ دونوں لڑکیاں سمجھ دار ہو چلی تھیں۔ ماں باپ کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح ان دونوں کو تعلیم ملنا ہی چاہیے۔ ان پڑھ نہ رہ جائیں اس کی کوئی سبیل ہونا ہی چاہیے۔ مگر آہ غربت! یہ ایک ایسی مجبوری تھی جس کا علاج خود ان کے ہاتھ میں نہ تھا۔ پھر بھی سوچا کہ یہ سب اپنی جگہ پر رہے۔ دُکھ جھیلیں گے مگر پڑھائیں گے ضرور۔

انھوں نے ایک ٹیچر کا انتظام کر ہی لیا اور لڑکیوں کو پڑھنے کے لیے بٹھا دیا۔ یہ لڑکیاں چند دنوں تو شرماتی رہیں۔ پھر ان کی

جھجک دور ہوگئی اور پڑھنے میں جی لگ گیا اور خود اُن لڑکیوں نے بھی سوچا کہ پڑھنے میں شرم اور جھجک کیسی یہ لڑکیاں جن میں ایک کا نام تھا ریکھا اور دوسری کا برکھا، دونوں ہی بڑی ذہین تھیں۔ وہ اپنے ماں باپ کی محبت اور غربت پر فخر کرتیں کہ وہ غریب اور مزدور ہوتے ہوئے بھی کس ذوق شوق سے ہم لوگوں کو پڑھا رہے ہیں وہ مقدور بھر ماں باپ کی خدمت بھی کرتیں اور پڑھتیں بھی۔ ریکھا اور برکھا کے ماں باپ نے کبھی یہ نہ سوچا کہ لڑکیوں کی تعلیم پر بہت خرچ ہو رہا ہے۔ دکھ جھیلتے اور خرچ پورا کرتے رہے اور ان کی تمنا بھی پوری ہوتی رہی۔ دونوں ہی لڑکیاں پڑھنے کی شوقین تھیں۔ انھوں نے اسکول اور کالج کی تعلیم مکمل کرلی۔ تو ان کے دلوں میں اسکول کھولنے کا شوق پیدا ہوا کہ اس طرح ملک میں پڑھے لکھوں کی تعداد بھی بڑھے اور با عزت پیشہ بھی رہے۔

ماں باپ اور گاؤں والے سب نے ان لڑکیوں کی خواہش کا احترام کیا۔ ایک اسکول کھل گیا۔ ماں باپ نے دعائیں دیں۔ ان کی محبت اور قربانی کام آئی۔ گاؤں والے خوش ہو گئے گاؤں کے بچوں اور بچیوں کے پڑھنے لکھنے کا ٹھکانا ہو گیا۔ علم کی روشنی پھیلے گی۔ اسکول تو اور بھی تھے مگر سب دور تھے۔ گاؤں میں اسکول ہو جانے سے چھوٹے بچوں بچیوں کے لیے سہولت ہو گئی۔ ریکھا اور برکھا کا مستقبل بھی بن گیا اور غریب ماں باپ کے گھر میں عزت اور برکت بھی آگئی۔ یہ ہے علم کا معجزہ۔

بدر فاطمہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

فرماں بردار لڑکی

والدین کا اولاد پر کتنا بڑا احسان ہے کہ وہ اولاد کو پالنے پوسنے میں نہ ٹھٹھرا دینے والی سردیوں کی پروا کرتے ہیں نہ جھلسا دینے والی گرمیوں کی، نہ موسلا دھار بارش کی۔ سب کچھ اپنی ذات پر سہتے ہوئے اولاد کو بچاتے اور اپنا خون پسینا نچھاور کرتے ہیں۔

امراوتی ضلع کے ایک گاؤں میں ایک بچی جس کا نام رضیہ تھا ایک غریب کسان کی بچی تھی۔ اس کی عمر ابھی صرف سات سال کی تھی۔ لیکن اپنی کم عمری کے باوجود وہ بڑی سنجیدہ تھی صبح کی پہلی کرن پھوٹنے سے پہلے بستر سے اُٹھ جاتی۔ ہاتھ منہ دھو کر چائے پیتی اور اپنے والدین کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنے چلی جاتی۔

ایک دن رضیہ کی ماں سخت بیمار ہوگئی۔ اس کا باپ اناج فروخت کرنے شہر گیا ہوا تھا۔ رات کے دو بجے تھے رضیہ نے ماں کے کراہنے کی آواز سنی۔ وہ چپکے سے اٹھی اور ایک قریبی ڈاکٹر کے گھر چلی گئی۔ ڈاکٹر صاحب اُس وقت نیند میں مست تھے۔ رضیہ نے مسلسل آوازیں دیں۔ کئی بار دروازہ کھٹکھٹائے۔ تب کہیں ڈاکٹر صاحب نے دروازہ کھولا اور باہر آکر پوچھا۔ "اس وقت کیا ہے؟"

بچی سہم کر بولی۔

"ڈاکٹر صاحب! میرا دنیا میں باپ ماں کے سوا اور کوئی نہیں میری ماں بہت بیمار ہے۔ مہربانی کر کے، چل کے اسے دیکھ لیجیے۔"

ڈاکٹر صاحب ننھی سی اس جان کی باتیں سن کر بہت نرم پڑ گئے۔ ان کا غصہ کافور ہو گیا۔ اور وہ اس بچی کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے رضیہ کی ماں کا معائنہ کیا اور دوا دیتے ہوئے کہا۔

"خوش قسمت خاتون! اگر آپ کی بچی اس اندھیری رات میں تنہا میرے گھر نہ پہنچتی اور مجھے نہ لے آتی تو آپ اس وقت سخت خطرے میں تھیں اور نہ جانے کیا ہوتا۔"

ایک بار رضیہ سو رہی تھی کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی جھونپڑی سے دھواں اُٹھ رہا ہے۔ اس نے ایک نظر اپنے سوتے ہوئے والدین پر ڈالی۔ جی نہ چاہا کہ ان کے آرام میں خلل ڈالے۔ اس لیے وہ تنہا جائزہ لینے کے لیے چل پڑی کہ یہ دھواں کیوں اور کہاں سے اُٹھ رہا ہے۔ اُس نے دیکھا کہ جھونپڑی سے ملے جلے گھاس پھوس کے ڈھیر میں آگ سلگ رہی ہے اگر فوراً ہی اسے بجھایا نہ گیا تو گاؤں بھر میں آگ لگ جانے کا

اندیشہ ہے۔ وہ فوراً بھاگی بھاگی گانو کے سردار کے پاس گئی اور صورت حال بیان کی۔ گاؤں کا مکھیا چند آدمیوں کے ساتھ موقع پر آیا۔ اور سب نے مل جل کر آگ بجھا دی۔ مکھیا اس کی اس بہادری سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے بڑی تعریفیں کیں اور انعام دیا۔

رضیہ حساب کتاب میں بھی بہت ایمان دار تھی۔ بازار سے سودا سلف لایا کرتی۔ ایک پیسے کا ہیر پھیر نہ ہوتا اور باقی پیسے لوٹا دیتی۔

ایک دن ایک شخص نے سبزی لانے کے لیے حساب سے بہت زائد پیسے دے دیے۔ لیکن اس نے اس کو باقی پیسے لا کر لوٹا دیے۔ حالاں کہ وہ چاہتی تو باقی پیسے رکھ لیتی۔ وہ رحم دل بھی تھی۔ اگر گانو کا کوئی بھی بیمار پڑ جاتا تو وہ اس کے گھر جا کر بیمار پرسی اور تیمار داری کرتی۔ ڈاکٹر کے یہاں جاتی اور دوائیں لا کر دیتی۔ اس لیے گانو بھر اس سے خوش رہتا۔

ایک روز کھیت میں وہ اکیلی کام کر رہی تھی۔ بردہ فروشوں کا ایک گروہ اُدھر سے گزرا، لڑکی کو تنہا پا کر اٹھا لے گیا۔ خیریت ہوئی کہ گانو والوں کو فوراً خبر مل گئی۔ سارے گانو والے بھاگے اور بردہ فروشوں کو جا لیا۔ جم کر لڑائی ہوئی۔ دونوں طرف کے لوگ زخمی ہوئے۔ معاملہ ہر دل عزیز رضیہ کا تھا۔ گانو والے زیادہ بھی تھے اور تگڑے بھی۔ رضیہ کو گانو والوں نے چھین لیا۔ بردہ فروشوں کی خوب پٹائی ہوئی۔ وہ کسی طرح اپنی جان بچا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

ہر لڑکی کو رضیہ کی طرح بہادر، فرض کو پہچاننے والی اور ہر دل عزیز ہونا چاہیے۔

رومانہ بیگم۔ ساتویں (ج) اردو ہائی اسکول بھوتیہ دروازہ ناگپور

کر بھلا تو ہو بھلا

ایک تالاب تھا۔ تالاب کے کنارے برگد کا ایک درخت تھا۔ اس کے نیچے ایک چیونٹی رہا کرتی تھی۔ درخت کی کسی شاخ پر کبوتر کا گھونسلا تھا۔ ایک دن چیونٹی پانی پینے تالاب کے کنارے گئی۔ وہ سنبھل نہ سکی اور پانی میں جا پڑی۔ چیونٹی نے نکلنے کی بہت کوشش کی مگر بے کار۔ درخت کے اوپر سے کبوتر یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس کو اس ننھی سی جان پر بڑا رحم آیا۔ اس نے ہمدردی اور مدد کی ٹھانی اور اسے بچانے کی خاطر درخت کی پتیاں توڑ توڑ کر پانی میں پھینکنے لگا۔ ان میں سے ایک پتا چیونٹی کے پاس گرا۔ چیونٹی اس پتے پر سوار ہو گئی اور ایک پتے پر سے دوسرے پر، دوسرے سے تیسرے پر اسی طرح وہ کنارے تک پہنچ گئی اور پتے کے ذریعے خشکی پر آ گئی۔ کبوتر اپنی اس کامیابی پر خوشی کے مارے ناچ اٹھا۔ چیونٹی نے محبت سے کبوتر کی طرف دیکھا۔ اس کی مدد اور ہمدردی کا شکریہ ادا کیا۔

کچھ دنوں بعد ایک شکاری اس تالاب پر آیا۔ اس کی نظر خوب صورت کبوتر اور اس کے گھونسلے پر پڑی۔ اس نے بندوق سنبھالی اور نشانہ باندھا۔ چیونٹی یہ تماشا دیکھ رہی تھی وہ جلدی سے دوڑی اور شکاری کے پیر پر چڑھ کر اتنے زور سے کاٹا کہ شکاری بلبلا اٹھا اور اس کا نشانہ چوک گیا۔ بندوق کی آواز سن کر کبوتر پھڑپھڑا کر اڑ گیا۔

اس طرح اس ننھی سی چیونٹی نے کبوتر کی جان بچا کر اس کا احسان چکا دیا اور اپنی کامیابی پر پھولی نہ سمائی۔

ہم سب لوگوں کو اس واقعے سے سبق لینا چاہیے اور سب کے ساتھ ہمدردی، سلوک اور اخلاق سے کام لینا چاہیے۔

بزرگوں نے سچ کہا ہے۔ "کر بھلا تو ہو بھلا۔"

اختر پروین درجہ ہشتم۔ ساتویں (ج) اردو ہائی اسکول بھوتیہ دروازہ ناگپور

لالچی گیدڑ

کسی شہر میں ایک شکاری رہتا تھا۔ وہ ایک دن شکار کی تلاش میں ایک جنگل تک پہنچ گیا۔ اس نے ایک ہرن کا شکار کیا۔ جب وہ اپنے شکار کو لے کر چلنے والا تھا

کہ ایک سوّر دکھائی دیا۔ شکاری نے ہرن کو زمین پر
رکھ دیا اور سوّر کو مارنے کے لیے تیر چلایا۔ تیر لگتے
ہی سوّر غصے میں بھر کر شکاری پر جھپٹا اور اُس نے
شکاری کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔ شکاری خود شکار اور
بے جان ہو کر زمین پر گر پڑا۔ لیکن سوّر کو بھی تیر کا زخم
کاری لگا تھا۔ وہ بھی بے جان ہو کر گر پڑا۔ وہ جب
زمین پر گرا تو اس کے بھاری جسم کے نیچے ایک سانپ
بھی دب کر مر گیا۔

تھوڑی دیر میں ایک لالچی گیدڑ ادھر آ نکلا۔ ہرن،
شکاری، سوّر اور سانپ کو مردہ دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔
اُس نے سوچا کہ آج تو کھانے کی مجھے اتنی ساری چیزیں
مل گئی ہیں جو میرے واسطے مہینوں کے لیے کافی ہیں۔ آج
تو سانپ ہی کے گوشت سے میرا پیٹ بھر جائے گا۔ وہ یہی سوچتا جب
شکاری کے قریب گیا اور شکاری کی کمان پر منہ مارا اُس کی تانت
ٹوٹ گئی۔ اور شکاری کی دبی ہوئی کمان یکایک اچھلی۔
وہ اتنے زوروں سے اچھل کر گیدڑ کے سینے پر لگی کہ گیدڑ
بھی مر کر ڈھیر ہو گیا۔

یہ ہے لالچ کا نتیجہ اور یہ ہے لالچی کا انجام۔

محمد ہارون حاجی عبدالرشید مالونی (کرانشاپ) ضلع اکولہ

محنت کا پھل

ایک کسان کے چار لڑکے تھے مگر چاروں بڑے کام چور،
سست، کاہل اور محنت سے بھاگتے تھے۔ کسان اپنے
لڑکوں کے رویے سے بڑا پریشان تھا۔ وہ سوچا کرتا کہ
اگر ان کا یہی حال رہا تو میری آنکھ بند ہوتے ہی ان کا
کیا ہوگا اور کیسے ان کی گزر بسر ہوگی یہ تو بھوکوں مرنے
لگیں گے۔ ان کو راہ پر لگانے کے لیے کچھ کرنا ہی ہوگا۔
سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔
اُس نے ان چاروں کو ایک دن اپنے پاس بلایا اور
کہا "سنو! میرا کوئی ٹھکانا نہیں کب مر جاؤں۔ میں نے پائی
پائی جمع کر کے ایک بہت بڑا خزانہ کھیت میں دبا دیا ہے۔ تم
سب مل کر یا تم میں سے جس کا جی چاہے کھیت کو کھود کر وہ خزانہ
کھیت میں سے نکال لے۔ خزانہ کھیت ہی میں ہے لیکن اب
مجھے یہ یاد نہ رہا کہ خزانہ میں نے کھیت میں کہاں گاڑا ہے
بہرحال تم لوگ محنت کروگے تو وہ ملے گا ضرور۔

خزانے کا نام سن کر چاروں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ہر ایک
اپنے دل میں سوچنے لگا کہ کاش خزانہ مجھی کو ملے۔ اگر خزانہ
مل گیا تو موج اڑاؤں گا اور خوب سیر کروں گا۔

سب کی سوچ اسی قدر تھی اور یہی سوچ کر چاروں نے ایک
دوسرے کی نظریں بچا کر دن رات محنت کر کے کھیت کی خوب
خوب کھدائی کی۔ کنکر، پتھر گھاس پھوس سے زمین صاف ستھری
ہو کر نکھر گئی اور مٹی خوب پولی ہو گئی۔ اب انھوں نے سوچا
کہ خزانہ تو اب تک ہاتھ نہیں آیا ہے مگر جب محنت کی ہے
اور زمین تیار ہے تو لاؤ اس میں فصل ہی اُگائیں بیکار کیوں
پڑی رہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس میں ہل چلا کر چاروں
ہی نے بیج بو دیے۔ وقت پر پانی بھی دے دیا۔ کھاد بھی
ڈالی۔ کھیت کی گوڑائی بھی کر دی۔ کھیت لہلہا اٹھا۔ اُس کی
چمک دمک دیکھ کر سب کے دل جھوم اُٹھے۔ فصل کٹی تو کھلیان
غلے سے بھر گیا اور اتنا دانہ پیدا ہوا کہ چاروں بھائیوں کا گھر
غلے سے بھر گیا۔ بیچ کر پیسے بھی کافی ملے اور سال بھر کا اناج بھی۔
لڑکوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ وہ باپ کے پاس آئے
اور کہا:

"بابوجی! ہم نے محنت کی اور کھیت کا جیتا جاگتا خزانہ پا لیا۔
اب ہم ہر فصل اسی محنت سے اُگائیں گے اور زمین کی چھاتی سے
نہ ختم ہونے والا خزانہ نکالا کریں گے۔"

باپ خوش ہو گیا اور کہا "میں نے اسی خزانے کی بات کی تھی
محنت ضائع نہیں ہوتی۔ جتنی محنت کروگے اتنا خزانہ پاؤگے۔"
یہ کہہ کر اُس نے چاروں کو گلے لگا لیا۔ لڑکے محنت کے
عادی ہو گئے اور اس کا پھل پانے لگے۔

کنیزہ بیگم درجہ ہشتم سانے گروجی اردو ہائی اسکول

بھوتیہ دروازہ ناگپور

حسد کا انجام

ساجد ایک بہت ہی شریف اور ذہین طالب علم تھا۔ وہ غریب ضرور تھا۔ مگر بہت ہی محنتی تھا۔ وہ درجہ نہم کا طالب علم تھا۔ اور ہر سال اپنی جماعت میں اوّل آتا تھا۔ سبھی طلبہ اور اساتذہ کرام اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے اور اس کی عزت کرتے تھے۔ بہت سے لڑکوں نے تو خوب محنت کی کہ ساجد سے آگے بڑھ جائیں۔ مگر ہر بار انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ آہستہ آہستہ پورے اسکول میں اس کی دھاک جم گئی۔

لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کو اپنے سے آگے بڑھتے ہوئے دیکھ کر جلتے ہیں۔ شمیم بھی درجہ نہم کا طالب علم تھا۔ ساجد سے پہلے وہی اپنی جماعت میں اوّل آتا اور سب اسے چاہتے تھے۔ مگر ساجد کے آجانے پر اس نے اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور ہر سال سکنڈ آنے لگا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ ساجد سے آگے نکل جاؤں مگر ساجد بھی کم نہ تھا، اس نے اور کڑی محنت شروع کردی۔ شمیم کو آگے بڑھنے کا موقع نہ دیا۔ اب سب لوگ ساجد کی عزت کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شمیم اس سے حسد کرنے لگا تھا۔ شمیم کے دل میں ساجد کے خلاف آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ ساجد سے اس کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ وہ دن رات اسی اُدھیڑبن میں رہتا تھا کہ کس طرح ساجد سے انتقام لیا جائے۔ ایک روز اس کے دماغ میں ایک ترکیب آہی گئی اور وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔

سالانہ امتحان شروع ہوچکا تھا اور آج پہلا پرچہ اُردو کا تھا۔ ساجد جس سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اسی کی پیچھے والی سیٹ پر شمیم بیٹھا ہوا تھا۔ سبھی طلبہ جواب لکھنے میں مصروف تھے۔ مگر شمیم بار بار بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ اس موقع کی تلاش میں تھا کہ ساجد جلدی سے کاپی جمع کرکے چلا جائے۔ تھوڑی دیر بعد ساجد اٹھا اور کاپی جمع کرکے کمرے سے باہر نکل گیا۔ شمیم چپکے سے اٹھا اور ممتحن کی نظر بچا کر ساجد کی کاپی اُٹھالی اور اسے تہہ کرکے جیب میں رکھ لیا اور چپکے سے باہر نکل گیا۔ مگر باہر نکلتے ہی اس کی نظر اسکول کے پرنسپل پر پڑی جو اِدھر ہی آرہے تھے۔ جوں ہی ان کی نظریں شمیم کی جیب سے جھانکتے ہوئے کاغذات پر پڑیں، تو وہ فوراً شمیم کی جانب لپکے۔

"یہ کیا ہے؟" وہ اس کی جیب سے کاغذ نکالتے ہوئے بولے۔ شمیم کا منہ لٹک گیا۔ اس کی نظریں زمین میں گڑی جارہی تھیں!

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہر سال نقل کرکے ہی اوّل آیا کرتے تھے؟ ٹھہرو، اس کا مزہ چکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر پرنسپل صاحب اسے گھسیٹتے ہوئے آفس میں لائے۔ جب انھوں نے کاغذ کھول کر دیکھا تو اور بھی آگ بگولا ہوگئے۔ اور اس کی اچھی خاصی پٹائی کردی۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے اسکول میں پھیل گئی۔ سارے طلبہ شمیم کی اس حرکت پر اسے ملامت کر رہے تھے۔ اس دن پورے اسکول میں اس کی بڑی بے عزتی ہوئی اور چوری کرنے کے جرم میں اسے اُردو میں فیل کردیا گیا۔

آج نتیجہ نکلنے والا تھا۔ سبھی طلبہ ایک بڑے سے ہال میں جمع تھے۔ سب نتیجے کے اعلان کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد نتیجے کا اعلان کیا گیا۔ ساجد اپنے درجے میں اوّل آیا اور شمیم ایک مضمون میں فیل ہوجانے کی وجہ سے سکینڈ بھی نہ آسکا۔

سچ ہے حسد کا انجام بُرا ہی ہوتا ہے۔

جاوید نہال حشمی ولد محمد شمیم الدین گلی ۱۲ نیا بازار کانکی نارہ ۲۶

پیاز کی کہانی پیاز کی زبانی

میرا تعلق AMARYLIS اور LILY خاندان سے ہے۔ میرے ۵۰۰ سے زیادہ رشتہ دار ہیں۔ میں بڑی منکسر المزاج ہوں۔ مجھے باورچی خانے کی چار دیواری پسند ہے لیکن مجھے کسی قیمت پر یہ پسند نہیں کہ کوئی بھی مجھے زندگی میں اپنے گل دستے کی زینت بخشے۔

پھر مجھے لوگ دسترخوان کی زینت بناتے ہیں۔ کیوں کہ کوئی سرکہ کے خوب صورت شیشے میں چھوٹی چھوٹی ڈلیاں کرکے ڈال دیتے اور کھانے کے وقت نکال کر استعمال کرتے ہیں اور کچھ لوگ کاٹ کر خالی ہی چبا ڈالتے ہیں۔

خدا نے مجھے ایسی شان بخشی ہے کہ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی قوم ہوگی جو مجھے استعمال میں نہ لاتی ہو۔ غریب لوگ روٹی کے ساتھ کچی ہی کھاتے ہیں۔ امیر لوگ سالن بنا کر کھاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ لوگ نازک مزاج ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر لوگ مجھے آنکھوں کے لیے غیر معمولی صلاحیت کا حامل قرار دیتے ہیں اور گنجے پن کو دور کرنے کے لیے بھی استعمال کا مشورہ دیتے ہیں۔ جھلسے اور درد کے لیے میں پروانۂ موت ثابت ہوتا ہوں۔ فولاد، پروٹین اور وٹامن میرے بازو اور دماغ ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب اہرامِ مصر کی تعمیر ہو رہی تھی تو مزدور مجھ کو کثرت سے استعمال کرتے تھے اور اپنے بازوؤں میں نئی طاقت محسوس کرتے تھے۔ ہندستان کو میری وجہ سے زرِ مبادلہ ملتا ہے۔ خاص کر سنگاپور اور ملیشیا کو ۱۹۸۰ء ۱۹۷۹ء میں برآمد کرنے سے ۱۲۵ء۵۸ کروڑ روپے وصول ہوئے۔ اس لیے ۸۷۰۰۰ ٹن پیاز باہر بھیجی گئی۔

جبیب الرحمان حیرت مکان نمبر ۳۔۳۔۲۴۲ نزدیک پولیس اسٹیشن محبوب نگر (آ ے پی)

اپنی نیت اپنی نظر

کسی وقت ارشد اور شکیل نام کے دو دوست تھے ایک رات ارشد نے خواب دیکھا کہ اس کے گھر میں اشرفیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ صبح کو جب وہ کھیت کی طرف جا رہا تھا تو اس نے اپنا خواب شکیل کو سنایا۔ شکیل نے اس کو بے وقوف بناتے ہوئے کہا:

"نہیں ارشد تمھاری قسمت آسمان کی راہ سے نہیں بلکہ زمین کی راہ سے جاگے گی۔"

خدا کا کرنا ایسا کہ ہوا بھی یہی۔ ارشد مزدور کے ساتھ کھیت میں آیا۔ مزدور کھیت میں ہل چلانے لگا۔

چلتے چلتے ہل کی پھال کسی چیز سے ٹکرائی۔ ارشد اور ہلواہے نے زمین کھودی تو تانبے کا ایک برتن سونے کے سکوں سے بھرا نکلا۔

اس طرح ارشد کی قسمت زمین ہی کی راہ سے جاگ اٹھی۔ شکیل اپنے کھیت میں کام کر رہا تھا۔ ارشد نے دوڑ کر اس کو یہ خوش خبری دی کہ میری زمین سے تانبے کا ایک وزنی گھڑا نکلا ہے۔ یقیناً اس میں اشرفیاں بھری ہوں گی۔

پہلے تو شکیل نے اسے بے وقوف کہا اور پھر یہ کہا:

"اس گھڑے میں سانپ، بچھو بھرے ہوں گے۔" یہ بات شکیل نے رشک اور غم و غصہ سے کہی تھی۔ مگر دوڑ کر دیکھنے ضرور آیا۔ برتن کھولا گیا تو شکیل کو اس میں سانپ بچھو ہی نظر آئے۔ لیکن ارشد کی نگاہ میں وہ اشرفیاں تھیں۔

ارشد نے مناسب یہی سمجھا کہ یہ بات عام نہ ہو اس نے برتن کو اور گہرائی میں دفن کرادیا۔ مگر رات کو باپ کی مدد سے وہ اسے اپنے گھر اٹھالیا اور اس کے دن پھر گئے۔

معراج احمد صدیقی ۱۴۰۲ بازار چتلی قبر جامع مسجد دہلی ۶

ننھے فنکار کا انعام

مئی ۸۲ء کے "پیامِ تعلیم" میں دہلی کے ایچ۔ اے دلاور زادہ کی تصویر پہلے انعام کی مستحق قرار پائی ہے۔

دلاور زادہ صاحب اپنا پورا پتا ارسال فرمائیں۔

ننھے فنکار
لکھیے: کون سی تصویر پہلے انعام کی مستحق ہے

اسلام کے مشہور امیر البحر
عبد الواحد سندھی جامعی
اس کتاب میں مسلمانوں کے جہاز سازی اور جہاز رانی کے کارنامے نیز ان مشہور سپہ سالاروں کے حالات بتائے گئے ہیں جنھوں نے تاریخ میں نام اونچا کیا۔
قیمت: ۴/=
اسلام کے مشہور سپہ سالار حصہ اوّل دوم
عبد الواحد سندھی جامعی
بچوں کے لیے اسلام کے مشہور سپہ سالاروں کی تفصیل نیز ان کی زیر قیادت لڑی گئی جنگوں کے حالات جن کے پڑھنے سے ایمان میں تازگی آتی ہے۔
حصہ اوّل ۴/=
دوم ۴/=
اللہ کے خلیل
خلیل احمد جامعی
مسلمانوں کے جدِ امجد حضرت ابراہیمؑ کی سیرت مبارک سے متعارف کرانے والی بچوں کے لیے ایک عمدہ کتاب۔
قیمت ۲/۵۰
چنبیلی
محمد حسین حسان
ابتدائی درجوں کے بچوں کے لیے چنبیلی نامی ایک بلی کی مزیدار کہانی۔
قیمت: ۵۰/-
دُم کٹا سانپ
محمد قاسم صدیقی
سچی عبادت، بے ایمان قاضی اور راجا اور پرجا۔ تین سبق آموز کہانیوں کا مجموعہ۔
قیمت: ۱/-
چٹانوں کی کہانی
محمد امین
قدرتی حالات و واقعات نے زمین اور چٹانوں کی شکل و صورت کو کس طرح بدلا؟ اس کا جواب اس کتاب میں ملے گا۔ قیمت ۴/۵۰
موم کا محل
پروفیسر محمد انس
شہد کی مکھیوں کی کہانی جو خود شہد کی طرح میٹھی اور دل پسند ہے۔ بڑے بچوں کے لیے کہانی کی طرز پر لکھی گئی ایک عمدہ معلوماتی کتاب۔
قیمت: ۴/=
میگھ نگر کا راجا
ریاض احمد
ایک ظالم راجا کے دو بچوں کی کہانی جنھیں ڈاکو پکڑ لے گئے۔ بہت ہی دل چسپ اور سبق آموز کہانی ہے۔
قیمت: ۱/۲۵
میر انیس
محمد حسین حسان
میر انیس کے حالات زندگی، اخلاق و عادات اور ان کی شاعری کی خصوصیات بتانے والی کتاب نمونۂ کلام کے ساتھ۔ بڑے بچوں کے لیے ایک بہترین معلوماتی کتاب۔
قیمت: ۴/۵۰
بچوں کے اقبال
اطہر پرویز
اس کتاب میں علامہ اقبال کے حالات زندگی بڑے ہی اچھے انداز میں بتائے گئے ہیں۔ ساتھ ہی وہ نظمیں بھی شامل ہیں جو اقبال نے خاص طور پر بچوں کے لیے لکھی تھیں۔ قیمت: ۴/۵۰
مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دلّی ۱۱۰۰۲۵

Regd No D(SE)-043

June, 1982

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

پیامِ تعلیم

کھیل سنسار (سطوت رسول)
چھوٹے بچوں کے لیے مترنم بحروں والے
گیتوں اور نظموں کا ایسا مجموعہ جسے
بچے شوق سے پڑھیں گے۔
قیمت : ۴/۵۰
دھنک (بزمی بھارتی)
بچوں کے لیے لکھی گئی دلکش نظموں
کا مجموعہ جس میں بچوں کے من پسند
موضوعات پر
نظمیں شامل ہیں
قیمت : ۳/-
اسلام کیسے شروع ہوا
(عبدالواحد سندھی جامعی)
یہ کتاب اُن مسلمان بچوں
بچیوں کے لیے لکھی گئی ہے جو اپنے
پیغمبر اور اپنے دین کے ابتدائی
حالات جاننا چاہتے ہیں۔
قیمت : ۲/۵۰
عبدالواحد سندھی جامعی
قرآن پاک کیا ہے
اس کتاب میں بچوں کے لیے نہایت آسان اور عام فہم زبان میں
قرآن پاک کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ قیمت ۳/-
سُرخ جوتے
(بیگم قدسیہ زیدی)
"موتی" کو سُرخ جوتے کیا ہاتھ لگے کہ
اس کی غریبی دور ہوگئی۔ ایک
دل چسپ کہانی ہے۔
قیمت ۲/۵۰
جی دار اور ننھا فرشتہ
(ریاض احمد خاں)
یہ اس دس بارہ سال کے
ایک بہادر لڑکے کی کہانی ہے جس
نے ایک ننھے بچے کو ظالم موجوں کی
گرفت سے بچایا قیمت ۸۰/
پھولوں کی دیوی
(جلیس انجم اسرئی)
دھنک کے بارے میں
فلپائن کی ایک دلچسپ
لوک کہانی۔
قیمت ۸۰/-
مکتبہ پیامِ تعلیم جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

جولائی ۱۹۸۲ء جلد ۱۹ شمارہ ۷

ایڈیٹر: ولی شاہجہانپوری
فی پرچہ: ڈیڑھ روپے سالانہ پندرہ روپے
غیر ممالک کے لیے 65 روپے

گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد اسکول جلد ہی کھل جائیں گے۔ کامیاب طلبہ نئی جماعتوں میں جگہیں حاصل کریں گے اور ایک مرتبہ پڑھائی شروع ہو جائے گی۔ ایسے تمام کامیاب طلبہ ہماری مبارکباد قبول کریں۔ ہماری تمنا ہے کہ کامیابیوں کی یہ رفتار نہ صرف جاری رہے بلکہ اس میں تیزی آئے۔

جو طلبہ کامیاب ہونے سے رہ گئے، ان سے ہمیں ہمدردی ہے۔ انھیں، ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ اس عارضی ناکامی سے بددل نہ ہوں اور اس عزم کے ساتھ تعلیم کو جاری رکھیں کہ کامیابی ضرور ان کے قدم چومے گی۔

مئی اور جون میں کی گئی اپنی خواہش کی تکمیل کے ہم منتظر ہیں کہ آپ نے تعطیل کا زمانہ کس طرح گزارا نیز یہ کہ اسکولی تعلیم نے آپ میں لکھنے لکھانے کا شوق کس حد تک پیدا کیا۔ اس پر ہمیں اس لیے اصرار ہے کہ ہم صرف درسی کتابوں کے مطالعے کو بہتر معاشرتی زندگی کی ضمانت نہیں سمجھتے۔
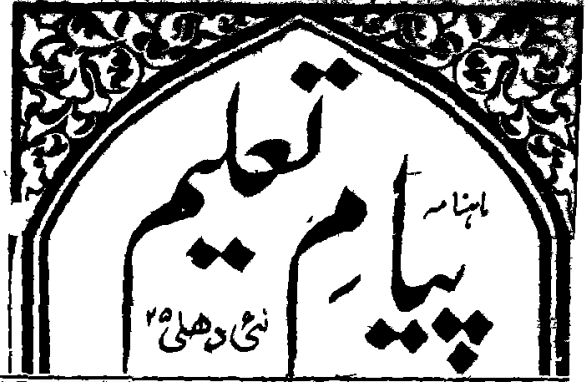
[illegible] نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

غبارہ
کہانی :- ارشد جمال حشمی
تصاویر :- جاوید جمال حشمی
پاپا! ایک غبارہ خرید دیجئے نا۔
نہیں منی! آج نہیں، کل خرید دیں گے۔
نہیں پاپا! آج ہی خرید دیجئے نا۔
اچھا بیٹی! تم یہیں ٹھہرو، میں خرید کر لاتا ہوں۔
دیکھو ذرا ٹھیک سے پکڑنا۔
پاپا! پاپا! مجھے پکڑیئے۔

شاہ واحدی مرحوم

کہاوتوں کی کہانیاں
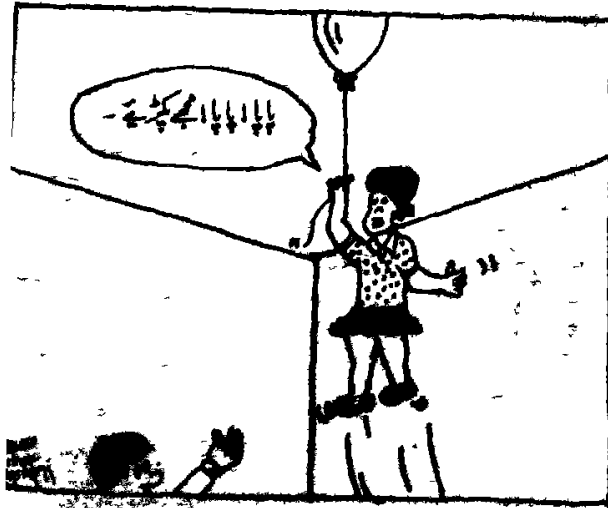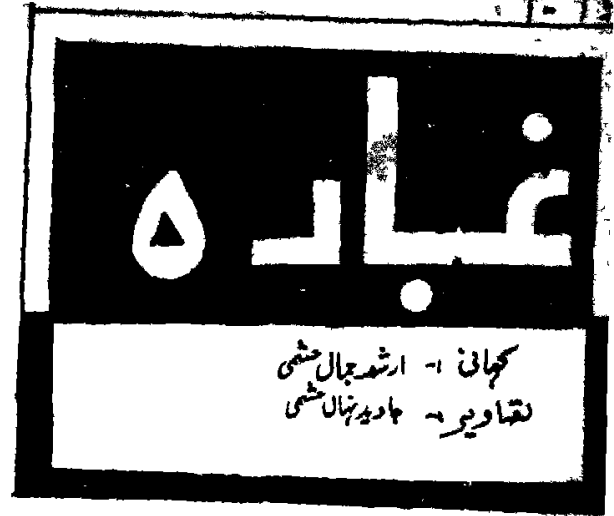
لینا ایک نہ دینا دو

ایک مینڈک اور ایک مور میں بڑی دوستی تھی۔ سمندر کے قریب درخت کے نیچے بیٹھ کر مینڈک اور مور آپس میں باتیں کیا کرتے تھے اور دل بہلایا کرتے تھے۔ ایک دن ایک شکاری اِدھر آنکلا اور اس نے جال بچھا کر مور کو پکڑ لیا۔ مور نے چیخ چیخ کر اپنے دوست مینڈک کو بلا لیا۔ مینڈک نے مور کو جو جال میں پھنسا پایا تو شکاری سے کہا کہ بھائی مور کو چھوڑ دے۔ میں اس

کے عوض تجھے ایسی چیز دوں گا جو مور کی قیمت سے کہیں زیادہ ہوگی اور یہ کہہ کر مینڈک نے سمندر میں غوطہ لگایا اور ایک لعل لا کر شکاری کو دیا۔ شکاری سمجھ گیا کہ مینڈک اور مور دوستانہ ہے، اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ بولا کہ ایک لعل اور نکالو تب مور کو چھوڑوں گا۔ مینڈک نے سوچا کہ شکاری پر لالچ سوار ہوگیا۔ دوسرا لعل لے کر بھی اس نے مور کو نہ چھوڑا تب میں کیا کروں گا۔ تاہم وہ اپنے نام کا مینڈک تھا اس نے شکاری سے کہا "تم لعل کا جوڑا شاید کسی بادشاہ کی نذر کرنا چاہتے ہو۔ مجھے تمھاری خاطر منظور ہے۔ لاؤ یہ لعل لاؤ۔ میں چھانٹ کر بالکل ایسا ہی لعل دوسرا بھی لا دوں گا۔ بادشاہ دو یکساں لعلوں کو دیکھ کر پھڑک اُٹھے گا۔" شکاری نے لعل مینڈک کو دے دیا۔ مینڈک نے پھر غوطہ لگایا اور دوسرا لعل پہلے جیسا نکال لایا اور شکاری سے کہا کہ اچھا اب تم اوّل مور کو چھوڑ دو، پھر مجھ سے دونوں لعل لے لینا۔ شکاری بولا: "میں نے مور کو چھوڑ دیا اور تو نے لعل نہ دیے تب کیا ہوگا؟" مینڈک نے جواب دیا، "بھائی یہ لعل میرے کس کام کے ہیں۔ بالفرض میں نہ دوں تو تم مور کو دوبارہ پکڑ لینا۔" شکاری کی سمجھ میں بات آگئی۔ اس نے مور کو چھوڑ دیا۔ جب مور آزاد ہوگیا تو مینڈک نے اسے اشارہ کیا کہ فوراً اُڑ کر بھاگ جا۔

مور بھاگ کر شکاری کی نظروں سے اوجھل ہوگیا اور مینڈک یہ کہتا غوطے میں چلا گیا کہ میاں شکاری تم نے دو کے

بشکریہ نونہال کراچی

ع میں ایک کو بھی کھو بیٹھا اور پھر یہ کہاوت بن گئی کہ
ا ایک نہ دنیا دونوں
ں ہاتھ دے اُٹھ ہاتھ لے
یہ کہاوت اُس وقت بولی جاتی ہے جب کسی کمزور
ظلم ہو رہا ہو اور کوئی ظالم سے زیادہ قوی آدمی
ظالم کی خبر لے ڈالے۔ اس کی کہانی بھول گیا ہوں
ر اب اسے قانونِ مکافات کا ترجمہ سمجھتا ہوں۔

تو نمازی کا ٹکا ہے

اس کی کہانی یوں ہے کہ کسی شریر لڑکے نے ایک
ز ایک نمازی کی سجدہ کرنے میں ٹانگ کھینچ لی۔ نمازی
متحمل مزاج تھا۔ اس نے لڑکے کو سزا دینے کے
ے واسطے دو پیسے انعام کے طور پر دے دیے۔ لڑکا
ھا کہ یہ تو اچھا کمائی کا ذریعہ ملا۔ اگر اسی طرح ہر
زی سے ٹکا ملتا رہا تو مزے آ گئے۔ دوسرے روز

اس نے دوسرے نمازی کی ٹانگیں کھینچیں۔ اس نے
دیکھا نہ تاؤ لڑکے کو دُھن دیا۔ جب سے یہ کہاوت مشہور
گئی کہ میاں یہ تو نمازی کا ٹکا ہے۔

ب زندم جہان زندم، آپ مردم جہان مُردم

اس کی کہانی یوں ہے کہ ایک شخص کسی باولی یا تالاب میں
پا۔ تیرنا نہیں جانتا تھا۔ اس لیے چیخنا شروع کیا کہ مجھے
نکالو۔ مگر کوئی اُس کی مدد کو نہیں بڑھا۔ آخر اُس نے
غل مچایا کہ لوگو! دُنیا ڈوبی، دنیا ڈوبی۔ یہ سوچ کر سب کو

توجہ ہو گئی اور اسے نکال کر باہر لایا گیا۔ جب اُس کے
ہوش و حواس ٹھکانے آئے تو لوگوں نے دریافت کیا
کہ تم جو کہہ رہے تھے کہ دُنیا ڈوبی۔ اس سے تمہارا کیا مطلب
تھا۔ اُس نے جواب دیا کہ آپ زندم جہان زندم، آپ
مُردم جہان مُردم۔ میں ڈوب جاتا تو میرے نزدیک ساری
دنیا ہی ڈوب جاتی۔

اُس وقت سے یہ کہاوت لوگوں کی زبان پر چڑھ گئی۔ پچاس
ساٹھ برس پہلے کی عورتیں اتنی فارسی بول لیا کرتی تھیں۔
"آپ زندم جہان زندم آپ مُردم جہان مُردم۔"

ابھی دلّی دور ہے

اِس کی کہانی یوں ہے اور یہ بھی غالباً سچی کہانی ہے کہ باغ
محل داد خاں سے ذرا آگے علی پور گاؤں کے راستے
میں ایک قاصد کسی مغل شہنشاہ کے نام کوئی پیغام
لیے پہنچا۔ وہاں ایک بڑھیا ضعیف العمر بیٹھی تھی قاصد
نے اس سے پوچھا کہ:
"اب دلّی کتنی دور ہے؟"
بڑھیا جیسے دس قدم بھی چلنا دشوار تھا۔ اپنے ادب

قیاس کر کے چار یا پانچ میل کے فاصلے کو بڑا فاصلہ سمجھا اور کہہ دیا کہ ابھی دلّی دور ہے"۔

قاصد خدا معلوم کیا لایا تھا اور اسے کس وقت بادشاہ تک پیغام پہنچانا ضروری تھا۔ بڑھیا کا یہ جواب سن کر گھبرا گیا اور ایسا گھبرایا کہ وہیں اس کی جان نکل گئی۔

بادشاہ کو جب اس کی خبر ہوئی تو بادشاہ نے اس قاصد کا اسی جگہ مقبرہ بنوا دیا جو پیک کا مقبرہ کہلاتا ہے۔ اور آج بھی موجود ہے۔ پیک قاصد کو کہتے ہیں۔

کھائیں میاں خانجانان اڑائیں میاں فہیم

یہ کہانی ایسے شخص کے متعلق بولی جاتی ہے جو دوسرے کے روپے پر دان، پن اور دریا دلی کا اظہار کرے۔ اس کی کہانی یوں ہے:

مرزا عبدالرحیم خان خاناں کے نام نامی سے لکھے پڑھے لوگ واقف ہیں۔ بڑے عالی حوصلہ اور لکھ لٹ امیر تھے۔ میاں فہیم اُن کے غلام تھے اور فیاضی میں آقا سے کم نہیں تھے۔ خوب کھانے کھلاتے اور آقا کے نام کو اطراف ہند میں روشن کرتے تھے۔ جاننے والے جانتے تھے کہ یہ سب

کچھ خان خاناں کے بل بوتے پر میاں فہیم کر رہے ہیں۔

عوام اس جود و سخا کو میاں فہیم کی فیاضی اور اپنا کیا دھرا سمجھتے تھے اور جہاں تہاں اُن کی اسی فیاضی کا ذکر کرتے تھے۔ اس پر کسی جاننے والے نے موقع پر اصل بات یوں بیان کی "کھائیں میاں خان خاناں اڑائیں میاں فہیم"۔

یوسف ناظم کے قلم سے

مٹاپا بھی اچھی چیز ہے

نام تو ان کا جمیل تھا لیکن گھر میں، محلے میں، بازار اور مدرسے میں سبھی لوگ انھیں صرف جمّو جمّو ہی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ (ایک مرتبہ جمّو کہا جائے تو کبھی نہیں سنتے تھے) ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ عمر ہوگی یہی کوئی ۱۱-۱۲ سال لیکن بہت وزنی تھے۔ جب بھی انھیں تولا گیا ۵۵ کلو سے کم پر سوئی نہیں ٹھہری۔ ان کے ساتھی انھیں ہمیشہ ٹوکا کرتے کہ میاں بار مشین پر مت چڑھا کرو۔ بگڑ جائے گی۔ گول مٹول بھی تھے۔ شمال کی طرف بڑھنے کی بجائے یہ مشرق اور مغرب میں زیادہ پھیل رہے تھے۔ ہر ۴-۶ مہینے بعد ان کے کپڑوں کی مرمت ضروری تھی۔ اُدھیڑے جاتے اور سیے جاتے۔ نئے کرتے پجامے سلتے تو ان میں اتنی گنجائش رکھی جاتی کہ ایک جوڑا اور سِل جائے۔ ان کے بھائی بہن ان کے مٹاپے سے پریشان رہتے تھے بہنیں روتی بھی تھیں۔ آخر کپڑے تو انھیں ہی ٹھیک کرتے پڑتے تھے۔ کھانے کا انھیں زیادہ شوق نہیں تھا۔ بس دن میں پانچ چھ مرتبہ کھانا کھا لیا پیٹ بھر گیا۔ بیچ بیچ میں بھی کچھ کھا پی لیتے تھے۔ بہت صفائی پسند تھے۔ ان کی امی کو نعمت خانہ صاف کرنے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہ اپنا بستر، میز، کتابیں صاف کریں یا نہ کریں نعمت خانہ ضرور صاف کر دیتے تھے۔ صحن میں سائبان میں، یا کسی کھلی جگہ چلتے تو لوگوں کو اطمینان رہتا تھا۔ باورچی خانے یا کسی کمرے میں جب بھی چلے کوئی نہ کوئی سامان ضرور گرا۔ سامنے کی طرف چلنا انھیں اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا ہمیشہ دائیں بائیں چلتے۔ سڑک پر بھی چلتے تو کیا مجال کہ پیچھے چلنے والا کوئی شخص ان سے آگے نکل جائے۔ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ دائیں طرف سے نکلے یا بائیں طرف سے۔

اسکول میں جب بھی بچوں کا ڈاکٹری معائنہ ہوتا ڈاکٹر انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ انھیں اسٹول پر کھڑا کر دیتے اور سب سے کہتے کہ دیکھو لڑکوں کو اتنا صحت مند اور تندرست ہونا چاہیے۔ ایک مرتبہ جب انھیں اسٹول پر کھڑا کیا گیا تو اسٹول ہی ٹوٹ گیا۔ اسکول کے چپراسی کو کئی دن بیٹھنے کو اسٹول ہی نہیں ملا۔ بیچارا کسی پرانے کھوکھے پر دری بچھا کر بیٹھا کرتا اور ہیڈ ماسٹر صاحب کو دن میں ۴ مرتبہ سلام کرتا۔ دوسری مرتبہ انھیں نمائش کے لیے میز پر کھڑا کیا گیا اور جب تک یہ میز پر کھڑے رہے وہ بھی ہلتی رہی۔ اس کے بعد خود ہی انھوں نے ڈاکٹروں سے کہہ دیا کہ اب وہ میز کرسیوں پر نہیں چڑھا کریں گے۔ ہم سب کے دیکھے ہوئے ہیں ایسا نہیں ہے کہ جمّو جمّو بڑے ہونے کے بعد گول مٹول ہوئے یہ بچپن ہی سے ایسے تھے۔ خوب موٹے موٹے گال تھے ان کے۔ کبھی کسی کی دو انگلیوں میں نہیں سماتے۔ اس طرح

۱۱-الہلال- ۱۳ باندرہ ریکلیمیشن بمبئی ۴۰۰۰۵۰

بھی ان کے دبیز گالوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی اور یہ جب بھی بات کرتے ہونٹوں کے ساتھ ان کے گال بھی ضرور حرکت میں آجاتے۔ ان کے استاد کہا کرتے تھے کہ جُجّو جُجّو اپنے منہ سے نہیں، اپنے گالوں سے بات کرتے ہیں۔

کمال تو یہ ہے کہ اُنھیں ٹھیک سے چلنا نہیں آتا تھا لیکن شوق تھا بھاگنے کا۔ بھاگتے تو ایسا معلوم ہوتا کوئی تربوز لڑھک رہا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ بھاگنے کی کوشش میں ہر دو قدم پر گرے نہ ہوں۔ جب بھی یہ گھر واپس ہوتے یا تو ان کی کہنیاں چھلی ہوئی ہوتیں یا گھٹنے زخمی ہوتے۔ گھر میں ان کے لیے ٹنکچر آیوڈین، نورانی تیل، آیوڈیکس وغیرہ قسم کی چیزیں ہمیشہ رکھی رہتیں۔ کھیل کود سے ان کی دل چسپی جب بہت بڑھ گئی اور یہ دن رات لڑھکتے اور زخمی ہوتے نظر آئے تو انھیں مشورہ دیا گیا کہ یہ رسہ کشی کے مقابلے میں حصہ لیا کریں اور ٹیم کے محافظ کی حیثیت سے سب کے پیچھے کھڑے ہوں۔ رسہ ان کی کمر کے گرد لپیٹ دیا جاتا اور یہ بُت بن کر کھڑے ہو جاتے۔ بالکل مجسمہ نظر آتے۔ مدرسہ میں جب بھی رسہ کشی کے جماعت واری مقابلے ہوئے ان کی ٹیم ہی فتح یاب ہوئی اور سکندر اعظم شیلڈ کی مستحق قرار پائی۔ ۱۰ کے ۱۰ کھلاڑیوں کے قدم لڑکھڑا جاتے لیکن جُجّو جُجّو اپنی جگہ جمے رہتے۔

پھر کسی نے اُنھیں مشورہ دیا کہ تم کبڈی بھی کھیل سکتے ہو کیونکہ کوئی تمھیں پکڑ ہی نہیں سکتا۔ انھوں نے کبڈی کھیلنا شروع کر دیا۔ مخالف ٹیم کا کھلاڑی دوڑتا آتا اور یہ سب سے پہلے آؤٹ ہو جاتے۔ ہل ہی نہیں پاتے تھے۔ مارے جاتے اور باہر جا کر بیٹھ جاتے۔ مخالف ٹیم کا کھلاڑی آؤٹ ہوتا اور یہ دوبارہ تشریف لاتے لیکن صرف واپس جانے کے لیے۔ پھر بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ ایک مرتبہ جب اُنھیں مخالف ٹیم کے علاقے میں داخل ہو کر [illegible] تو یہ

ٹیم کے ۵ کھلاڑیوں کے ساتھ گھسٹ کر لائن تک آگئے۔ اس دن سے اُنھیں کبڈی کا بھی چیمپین مان لیا گیا۔ پھر ان میں پھرتی نہیں لیکن وزن تو تھا۔ اور یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ کبڈی میں صرف پھرتیلا ہونا کافی نہیں، وزن دار ہونا بھی ضروری ہے۔ ایک مرتبہ تو انھوں نے کمال ہی کر دیا۔ اُدھر سے کبڈی کبڈی کہتا ہوا ایک کھلاڑی ان کی ریاست میں داخل ہوا اور ان کے ساتھیوں نے اُس کی ٹانگ پکڑ لی وہ بھی خوب تنا ہوا تھا۔ دم دار بھی تھا۔ زمین پر گر پڑا کبڈی کبڈی کرتا رہا اور لائن پار کرنے کی نوبت پر تھا کہ انھوں نے کچھ اس طرح اس کی گردن پر ہاتھ رکھا کہ اُس کے منہ سے کبڈی کبڈی کی آواز تو ایک طرف رہی، سانس چلنے کی آواز بھی مشکل ہی سے سُنائی دی۔ ان کا یہ کارنامہ کھیل کے قاعدے میں فٹ نہیں ہوتا تھا لیکن ان کے ہاتھ کی صفائی ریفری کو نظر ہی نہیں آئی۔ اُس دن سے یہ کبڈی کے گردن ناپنے والے کھلاڑی مشہور ہو گئے۔ جسم پر چُست چُست بنیان اور نیکر پہن کر جب بھی یہ کبڈی کے میدان میں اُترتے، ہر طرف سے سیٹیاں اور تالیاں بجنے لگتیں۔ اس لباس میں ان کی تصویریں کھینچ کر، ہوزیری فروخت کرنے والوں نے اپنی دُکانوں پر لگا دیں اور تصویر کے نیچے لکھ دیا کہ بڑے سے بڑے سائز کا بنیان اور نیکر ہمارے ہاں مل سکتے ہیں۔ ہم کہیں گے تو شاید کوئی یقین نہیں کرے گا لیکن ٹی شرٹ بنانے والی ایک کمپنی نے تو ان کی تصویر ہی اپنی ٹی شرٹ پر چھاپ دی اور انھیں ایک درجن ٹی شرٹ تحفے میں پیش کیں۔ (ساتھ میں خشک میوے کا ایک ڈبا بھی تھا اور جُجّو کو یہی ڈبا زیادہ پسند آیا) ہوزیری کارخانے والے تو انھیں ماڈل بھی بنانے کے لیے تیار تھے۔ کارخانے کے خرچ پر لیکن جُجّو کے والدین ہی راضی نہیں ہوئے۔ جس دن ٹی شرٹ کا تحفہ ان کے گھر پہنچا ان کی بہنیں بہت خوش ہوئیں کہ چلو اب تو ان کے کرتے نہیں

نہیں گے۔ انھوں نے ان سے کہہ بھی دیا کہ میاں اب اپنا جسم کچھ دن اسی ٹی شرٹ کے مطابق رہنے دو ورنہ یہ سب شرٹیں ضائع ہو جائیں گی۔ زیادہ پھیلنا مت۔ جوجو اس نصیحت پر اپنے دونوں گالوں سے مُسکرائے۔

لیکن جوجو اپنے حالات سے خوش نہیں تھے۔ ان کا دل رسّہ کشی اور کبڈی جیسے کھیلوں میں نہیں لگتا تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ جب وہ اپنے اس مٹاپے کے ساتھ، کام کے آدمی بن سکتے ہیں تو مٹاپا دُور کرنے کے بعد وہ کتنے زیادہ کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ جب بھی وہ اخباروں اور رسالوں میں فٹ بال اور ہاکی کے کھلاڑیوں کی تصویریں دیکھتے تو ان کا دل مچل جاتا اور وہ چاہتے کاش وہ ایسے ہی سڈول ہوتے اور فٹ بال ٹیم کا کپتان بن کر منسٹر کے ہاتھوں سے گولڈ شیلڈ لیتے اور اخباروں کے فوٹو گرافر کلک کلک ان کی تصویریں کھینچتے۔

اور ایک دن ان کے جی میں کیا آئی کہ یہ صبح سویرے ۵ بجے اُٹھ بیٹھے، ٹی شرٹ اور نیکر پہن کر گھر سے باہر نکل پڑے اور سمندر کی سمت چل دیے۔ سمندر میں کودنے کے لیے نہیں بلکہ اُچھل کود کے لیے۔ کسی نے ان سے کہا تھا کہ تندرست اور سڈول رہنے کے لیے جاگنگ (اُچھل کود) ضروری ہے۔ اتنی صبح انھیں کوئی دیکھنے والا تھا بھی نہیں۔ دو چار لوگوں نے دیکھا اور ہنسے بھی لیکن انہوں نے پرواہ نہیں کی۔ کودتے رہے (زمین ہلتی رہی)۔ ادھر گھر میں انھیں ہر طرف ڈھونڈا گیا تو کہیں نہیں پائے گئے۔ سب پریشان کہ جوجو رات کو تو بستر میں تھے۔ صبح سویرے انھیں کون اٹھا لے گیا (جیسے انھیں کوئی لے بھی جا سکتا تھا)۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد یہ واپس آئے تو سارا گھر ان کے گرد جمع ہو گیا۔ (جیسے یہ کوئی شمع ہوں اور دوسرے سب پروانے)۔ انھیں پسینہ پسینہ دیکھ کر سب لوگ اور بھی پریشان ہوئے۔ ہر شخص سوال کر رہا ہے اور یہ ہیں کہ بس کھڑے ہانپ رہے ہیں۔

بڑی دیر بعد یہ سب کو بتا سکے کہ کہاں گئے تھے اور کیوں گئے تھے؟

بھائی بہنوں نے پوچھا کہ تم دُبلے کیوں ہونا چاہتے ہو اور امی نے تو کہا "تم موٹے ہو ہی کہاں۔ دُبلے ہونے کی ضرورت نہیں تمھیں کیا شہر کا قاضی بننا ہے؟" لیکن جوجو نے طے کر لیا تو طے کر لیا۔

دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے جوجو سچ مچ کے جیل بن گئے۔ قد بھی نکل آیا اور موٹاپا جھٹ چھٹا کر بتا نہیں کہاں چلا گیا — یہ فٹ بال بھی کھیلنے لگے اور سو گز کی دوڑ میں تو جب دیکھو پہلا یا دوسرا انعام لیے چلے آ رہے ہیں اور ایک وقت تھا جب یہی جوجو خود فٹ بال کی طرح لڑھکتے تھے اور ۱۰۰ گز دوڑنا تو دُور پانچ گز بھی مشکل ہی سے دوڑ پاتے تھے اور ان کے ساتھی اتنے ہی وقت میں ۱۰۰ گز کی دوڑ پوری کر کے کپڑے وپڑے بھی پہن لیتے۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا:— اسکول کے سنہرے دن اور لڑکوں کی روپہلی ہنسی۔ جن لڑکوں کو کبھی ہنسنا نہیں آیا، جوجو کو دیکھ کر ضرور ہنسے۔ تھوڑا ہی سہی لیکن ہنسے ضرور۔

پھر یہ ہوا کہ اسکول کی تعلیم ختم ہوئی تو سب ساتھی اِدھر اُدھر ہو گئے۔ کوئی نوکری سے لگ گیا، کوئی شادی کر بیٹھا۔ کسی نے ڈاکٹری پڑھنے کے لیے ۴، ۵ جگہ فیسیں بھریں۔ وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر سفر کرتا رہا۔ کہیں نہیں رُکا۔ لوگ اس کے ساتھ چل رہے ہیں یا نہیں وقت نے کبھی پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا (اور اس کی پیٹھ پر آنکھیں بھی نہیں ہیں)۔ دن ہفتے بنے، ہفتے مہینے بنے اور مہینے سال۔ اس طرح کئی سال گزر گئے اور ایک دن جب ہم کسی اخبار میں اسپورٹس کالم کی خبریں پڑھ رہے تھے تو اچانک ہماری نظر ایک تصویر پہ ٹھہر گئی۔ کسی بڑے ٹورنا منٹ کے تقسیم انعامات کے جلسے کی تصویر تھی جس میں ایک ۲۰، ۲۲ سال کا تندرست نوجوان شہر کے میئر کے ہاتھوں سے فٹ بال شیلڈ لیتا ہوا نظر آ رہا

قومی ترانہ

ل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ دل بلیوں اچھلتا ضرور ہے
لیکن اپنی جگہ پر ہی رہتا ہے کیونکہ یہ دل ہے کوئی فٹ
بال نہیں) لکھا تھا، ایف سی کالج، چانسلر کپ فٹ بال
ٹورنامنٹ میں فتح یاب۔ کالج ٹیم کے کپتان جمیل جو شہر میں
جمو جمیل کے نام سے مشہور ہیں، ٹورنامنٹ کے سب سے
بہتر کھلاڑی مانے گئے۔ انھیں خصوصی انعام بھی دیا گیا۔
خبر پڑھ کر ہم صرف دو مرتبہ باغ باغ نہیں چار باغ
ہو گئے۔ اور اس بات پر بھی ایمان لے آئے کہ موٹاپا بھی
اچھی چیز ہے بشرطیکہ اسے چھانٹا جائے۔

جہاں بھارت کے ننھے
خدا سے اب ہیں دعا یہ کرتے
کہ دیس میں اپنے شانتی
کسی سے کوئی نہ دشمنی
لبوں پہ پیغام آشتی
پریم کی بات ہر گھڑی
یہ دیس سندر بنا کے رکھیں
یہ دیس دل میں بسا کے رکھیں
پڑھیں لکھیں اور کھیلیں، کودیں
دلوں میں الفت کا بیج بو دیں
رہِ ترقی پہ گام زن ہوں
رسیلے من ہوں، سجیلے تن ہوں
غرور و نفرت کا سر جھکائیں
سنہرا اک دور ایسا لائیں
غریبی، محتاجی کو بھگائیں
تمام دنیا سے آگے جائیں
جو کوئی ہو اس پہ حملہ آور
تو دل پہ روکیں ہر ایک
جہاں بھارت امر رہے
جہاں بھارت امر رہے

۲۵۶-جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

ٹانگ میں درد :-

س :- میری والدہ کی عمر ۴۵ سال ہے۔ اُن کی پسلی اور ٹانگ میں درد رہتا ہے۔ پیشاب بہت آتا ہے۔ ایک سال تک علاج کرایا افاقہ نہیں ہوا۔ شاہین سلطانہ

ج :- ایسا لگتا ہے کہ آپ کی والدہ کو عرق النساء (شلئے ٹیکا) کی تکلیف ہے۔ اس کے ساتھ شبہ ہوتا ہے کہ خون اور پیشاب میں شکر کا توازن بگڑ گیا ہے۔ ان کا علاج باقاعدہ کرانے کی ضرورت ہے۔ آپ نے جو حالات لکھے ہیں وہ صحیح تشخیص کے لیے ناکافی ہیں۔

لکنت :-

س :- میری زبان میں لکنت ہے۔ دوست کہتے ہیں کہ چڑیا کا جھوٹا پانی پینے سے ہکلا پن ختم ہو جاتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ کوئی علاج بتائیے۔ جاوید یوسف

ج :- کیا آپ نے کسی چڑیا کو بولتے وقت ہکلاتے سُنا ہے؟ چڑیا کے بھی زبان ہوتی ہے اور وہ بولتی بھی ہے۔ اُس کے چہچہانے میں کوئی ہکلاہٹ نہیں ہوتی۔ اِس لیے کہ چڑیا جب بولتی ہے تو اعتماد کے ساتھ بولتی ہے، اور یہ اعتماد ذات سے ہے کہ ہر ذی رُوح کو پابندیوں سے دُور رکھتا ہے۔ چڑیا کا جُھوٹا پانی پینے میں کیا حرج ہے، پی لیجیے۔ اِس لیے کہ چڑیا ہمیشہ سچ بولتی ہے۔ زبان کی لکنت کا بہترین علاج یہ ہے کہ آپ خود میں اعتماد پیدا کر لیں۔ اگر کسی قسم کا احساسِ کمتری ہے تو اُسے ذہن سے نکال دیجیے۔ آہستہ بولیے، سوچ کر تول کر بولیے، سچ بولیے اور پورے یقین کے ساتھ بولیے۔ انشاء اللہ یہ نقص جاتا رہے گا۔

نظر کم زور ہے :-

س :- میری آنکھیں بہت کم زور ہیں۔ تین سال پہلے ساڑھے تین نمبر کا چشمہ لگا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ میری آنکھیں جلد از جلد ٹھیک ہو جائیں۔ میں فوج میں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اور یہ بھی بتا دیں کہ ناشتے سے پہلے یا بعد میں یہ دوائیں کھائی جائیں۔ سیّد ابراہیم یٰس

ج :- آپ کو دوا سے زیادہ اچھی غذا کی ضرورت ہے۔ ایسی غذا جن میں حیاتین "الف، جیم اور د" زیادہ ہوں۔ اب موسم آ رہا ہے، بہ کثرت تازہ گاجریں کھائیے۔ اور اگر مشین ہے تو گاجروں کا تازہ پانی نکال کر پینا بے حد مفید ہے۔ اِس سے بینائی کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ آنکھوں کی صفائی کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔ روزانہ ٹھنڈے پانی کے چھپکے صبح و شب آنکھوں میں ماریے۔ ۱۲ دانے مغز بادام رات کو بھگو کر صبح کو چبا کر کھائیے۔

ہتھیلیوں کی کھال :-

س :- میری عمر ۱۶ سال ہے۔ میرے ہاتھوں کی ہتھیلیاں پھٹ جاتی ہیں۔ موسم سردی کا ہو یا گرمی کا۔ شمشاد علی ناز

ج :- آپ کریلے کا تازہ پانی رات کو ہاتھوں پر ملنا شروع کر دیجیے۔ اور کریلے کھانا بھی شروع کر دیجیے۔ شاید اِس سے تکلیف رفع ہو جائے۔ بشکریہ نونہال کراچی جنوری فروری

ننھے فنکار کا انعام

جون ۸۲ کا ننھے فنکار کا انعام محمد ندیم۔ محمد اصغر انصاری بمبئی کو دیا گیا۔

محمد ندیم میاں اپنی تصویر اور پورا پتا فوراً لکھیں۔

فارسی: رسول پرویزی

اُردو: شعیب اعظمی

میں نے عینک لگائی

یہ واقعہ اس حد تک زوردار ہے کہ میرے دُھندلے حافظے میں دن کی طرح روشن اور چمکیلا ہے۔ گویا دو گھنٹے پہلے واقعہ ہوا ہے۔ اور اب بھی میرے دماغ کے پہلے خانے میں موجود ہے۔

اُن دنوں تک جب تک کہ میں آٹھویں کلاس میں تھا سوچا کرتا تھا کہ چشمہ کسی چھڑی اور ٹائی کی قسم کی یوروپی چیز ہے۔ جو مہذب لوگ خوب صورتی کے لیے اپنی آنکھوں پر جمائے رہتے ہیں۔ میرے خالو غلام رضا جو بہت فیشن ایبل تھے اور پتلی مہری کا پتلون پہنا کرتے تھے اور پیرس سے منگوائی ہوئی ٹائی باندھا کرتے تھے اور نئی چیز اس کثرت سے استعمال کرتے تھے کہ شہر کے لوگ اُن کو موسیو (فرانسیسی لفظ جناب کے معنی میں) کے نام سے پکارنے لگے تھے۔ وہ پہلے چشمہ لگانے والے آدمی تھے۔ جن کو میں نے دیکھا تھا۔ خالو جان کے چرمی جوتوں، چھڑی اور ٹائی کے علاوہ دوسری فرنگی چیزوں سے دل چسپی نے میرے خیال کو اور زیادہ پختہ بنا دیا تھا۔

میں نے کہا ہو نہ ہو چشمہ ایک نئی چیز ہے جو لوگ خوب صورتی کے لیے آنکھوں پر لگاتے ہیں۔

اس بات کو پڑھنے والے اپنے ذہن میں رکھیں اور اب اس مدرسے میں تشریف لائیں جہاں میں پڑھا کرتا تھا۔ خاکسار کا قد ہمیشہ میری عمر سے بڑا تھا۔ اماں، خدا اُن کو اپنی امان میں رکھے، جب بھی میرے اور میرے بھائی کے لیے لباس خریدتیں ہمیشہ شکوہ کیا کرتیں۔

کہتی تھیں کہ تم دونوں بھائی یزید کے عَلَم کی طرح ہو۔ لمبے لمبے، معلوم ہوتا ہے کہ آسمان میں جا کر کھلیاں لگانا چاہتے ہو۔ اس لمبائی کے باوجود میری آنکھیں مرکوز نہیں ہوتی تھیں اور صحیح نہیں دیکھ پاتی تھیں۔ بغیر اس علم کے کہ میں جان سکوں کہ میری آنکھیں کمزور اور نگاہیں دُرست نہیں ہیں۔ چوں کہ کلاس میں بلیک بورڈ کو نہیں دیکھ پاتا تھا۔ ساری کلاس میں صفِ اوّل کی بنچ پر بیٹھا کرتا تھا۔ آپ سب لوگ مدرسہ جا چکے ہیں اور جانتے ہیں کہ صفِ اوّل کی بنچیں چھوٹے قد کے بچوں کی ملکیت

شعبہ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

اکرتی ہیں۔ یہ جھگڑا کلاس میں ہوا کرتا تھا۔ میں ہمیشہ
ئے بچوں کے ساتھ دست بہ گریباں رہا کرتا تھا لیکن
ل کہ میرے اندر تھوڑا شرارت کا مادہ تھا، اس لیے میری
س کے چھوٹے قد والے ہم جماعت اور ہم سبق میری باہر
شرارت اور بدمعاشی کے ڈر سے کلاس کے اندر چپ
یا کرتے تھے۔ لیکن یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی تھی۔
ک روز ماسٹر صاحب نے اپنے آپ ، مدرسہ کے گیٹ پر ہی
زوردار رسید لگائی جس کی آواز مدرسہ کے میدان
یچ تک پہنچ گئی اور بچوں کے کانوں میں داخل ہو گئی۔
میں اپنے کان پکڑے ہوئے تھا اور درد کی تیزی سے
ی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا ہوا تھا کہ جناب
د نے مجھے دو چار بازاری گالیاں دیں اور بولے:
ندھے! اب کیا تو رئیس زادہ ہو گیا ہے! گلی میں مجھ کو
ہے اور سلام نہیں کرتا ہے؟"
اب معلوم ہوا کہ کل جناب استاد گلی کے دوسرے سرے
ررہے تھے اور میں نے انھیں دیکھا نہیں اور سلام
ں کیا۔ انھوں نے میری اس نادانستہ حرکت کو
بدتمیزی سمجھا۔ اب اُس کا بدلہ لیا ہے اور تمیز سکھائی ہے۔
گھر میں بھی میرا تقریباً یہی حال تھا۔ اکثر صبح کے ناشتہ اور
کے کھانے پر میں دسترخوان سے اُٹھتا تو میری آنکھیں
یں دیکھتیں۔ میرا پانو پانی کے گلاس، کٹورے
راچی سے ٹکرا جاتا۔ یا پلیٹ کو ٹھوکر لگ جاتی نتیجے میں
ن ٹوٹ جاتا، یا پھر پانی بہنے لگتا۔ اُس وقت بغیر اس
ہ وہ یہ معلوم کریں اور سمجھیں کہ میری نگاہ کمزور ہے
اس لیے نہیں دیکھتا ہوں، غصہ ہو جاتے تھے۔ میرے
صاحب بُرا بھلا کہتے، میری والدہ طعنہ دیتیں اور
ں، بے نکیل اونٹ کی طرح ہو گیا ہے، ہر وقت بھاگم
بھاگ اور ہڑبڑاہٹ میں رہتا ہے۔ اپنے پیروں کے
نے نہیں دیکھتا ہے۔ اگر تیرے راستے میں کنواں آ
ئے تو بھی گر پڑے گا۔ بدقسمتی سے میں بھی نہیں جانتا
ہ میں آدھا اندھا ہوں۔ میں سوچتا تھا کہ سارے

لوگ اتنا ہی دیکھتے ہیں۔
اس لیے گالیاں سن لیا کرتا تھا۔ اپنے دل میں اپنے
آپ کو ستا رہتا کہ احتیاط سے راستہ کیوں نہیں چلتا ہوں۔
یہ کیسی رفتار ہے؟ ہمیشہ کوئی نہ کوئی چیز میرے پانو
سے ٹکرا جاتی ہے اور بے عزتی کا سبب بن جاتی ہے۔
دوسرے واقعات بھی پیش آتے۔ فٹ بال کھیلنے میں مجھے
کبھی ترقی نہ ہوئی۔ دوسرے لڑکوں کی طرح پانو
اوپر اُٹھاتا اور نشانہ لگا کر گیند پر پانو مارتا۔ لیکن
میرا پانو اس پر نہ لگتا اور میں کھسیانا ہو جاتا۔ لڑکے ہنسنے
لگتے تھے اور میری غیرت کو ٹھیس لگتی۔ سب سے خراب
واقعہ ایک رات ڈراما دیکھنے کے وقت پیش آیا۔
غلام حسین نامی ایک جادوگر بھیس بدلے ہوئے شیراز شہر
آیا تھا۔ اُس کی شعبدہ بازی کو دیکھنے کے لیے مرد، عورتیں
اور بچے گروہ در گروہ چلے جاتے تھے۔ مدرسہ لیشا پور کا
ہال اُس کے ڈراما دکھانے کی جگہ تھی۔ مدرسہ کے
ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے ایک مفت کا ٹکٹ عنایت
فرمایا۔ پہلی اور دوسری کلاس کے ہر شاگرد کو ایک ایک
ٹکٹ مفت ملا۔ میں ٹکٹ پا کر اپنے آپ پھولا نہیں سماتا
تھا۔ رات میں، میں چل پڑا۔ اور وہاں پہنچا۔ میری سیٹ
ہال کے آخری سرے پر تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں تماشا
دیکھنے پر لگا دیں اور بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ شعبدہ
باز اسٹیج پر آگیا۔ اور اپنا جھولا نکالا اور کھیل شروع
کر دیا۔ میرے چاروں طرف کے لوگ اُس کے کھیل میں
محو تھے۔ کبھی تعجب میں مبتلا ہو جاتے اور کبھی ڈر سے
خاموش ہو جاتے۔ اور کبھی ہنستے تھے اور تالیاں بجاتے
تھے۔ لیکن میں اپنی آنکھوں کو کتنا ہی باریک کرتا اور
اپنے آپ کو دبا کر اور سکوڑ کر دیکھتا پھر بھی ٹھیک نہیں
دیکھ پاتا تھا۔ میری نگاہوں میں مختلف چیزیں دکھائی دیتیں
لیکن میں صحیح نہیں طے کر پاتا تھا کہ کون سی چیز ہے اور
کیا ہے، اور کون کیا کر رہا ہے؟ میں تھک کر اور مایوس
ہو کر پچک گیا تھا۔ اپنے بغل والے سے پوچھا تھا کہ کیا

کر رہا ہے؟ یا تو وہ میرا جواب نہیں دیتا تھا یا کہتا تھا، کیا اندھے ہو، دیکھ نہیں رہے ہو؟ اُس رات مجھے یہ احساس ہو گیا کہ دوسرے بچّوں کی طرح نہیں ہوں لیکن پھر بھی میں نہیں سمجھا کہ آخر میری جان کو کون سا روگ لگا ہوا ہے۔ بس یہ محسوس کر سکا کہ میرے اندر کوئی خرابی ہے اور اس احساس سے ایک شدید قسم کا غم اور دُکھ میری ساری شخصیّت کا حصّہ بن گیا۔

بد قسمتی سے میری اس تکلیف کے لیے کسی نے مجھ سے جھوٹے منھ بھی نہ پوچھا۔ میری تمام غلطیوں کو جو نگاہ کی کمزوری کی وجہ سے تھیں، میری کم عقلی، نا اہلی اور لاپروائی پر محمول کیا گیا۔ میں خود بھی اُن کے اس فیصلے میں شریک تھا۔

اس کے باوجود کہ ہم کو شہر میں رہتے ہوئے نو سال ہو گئے تھے، ہمارے گھر نے گاؤں کے رہن سہن کو باقی رکھا تھا، یعنی وہاں صبح اسے دس بارہ آدمی ایک ساتھ آتے اور اپنے اونٹ، گھوڑے اور خچّر سمیت مہمان بن کر ہمارے یہاں ٹھہرتے اور کئی دن تک ہمارے یہاں ٹھہرے رہتے تھے۔ تیسرا زمیں بھی یہی طور طریقہ جاری تھا۔ میرے والد کو ٹھے پر سے گر پڑے تھے لیکن اچھے نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے دونوں ہاتھ کمر پر ہی ٹکے رہتے۔ باوجود اس کے کہ گھر کا تمام سامان یا تو گروی رکھا جا چکا تھا یا نیلامی کے لیے چڑھایا جا چکا تھا۔ لیکن پھر بھی ہماری مہمان داری ختم ہونے کو نہیں آتی تھی۔ ہر اجنبی جو دکھن کی طرف سے آتا ، ہمارے گھر میں داخل ہو جاتا۔ میرے والد کو خدا بخشے بڑے دریا دل انسان تھے۔ غریبی میں بھی بادشاہ تھے، اپنی گھڑی تک بیچ دیتے اور مہمانوں کی خاطر داری کرتے تھے۔ انھیں مہمانوں میں کازرون شہر کی رہنے والی ایک بوڑھی عورت بھی تھی۔ اُس کا کام عورتوں کے لیے ماتمی نظمیں سُنانا اور نوحے کرنا تھا۔ خوب سینہ پیٹ پیٹ کر مرثیے پڑھتی اور خوشی کے موقعوں پر گیت بھی گاتی اور بڑی چرب زبان اور بڑ بڑیا بھی تھی اور ساتھ ہی نقّال اور شیریں زبان بھی تھی۔ ہم بچے اُس سے بہت محبت کیا کرتے تھے۔ جب آجاتی، ہم لوگوں کی عید ہو جاتی۔ راتوں کو کہانیاں سناتی۔

جب کبھی وہ گھروں میں گیت گاتی، ساری عورتیں تالیاں بجاتیں۔ چوں کہ کسی سے کوئی مطلب نہیں رکھتی تھی، اس لیے بڑی کھری اور سچّی کہنے والی تھی اور لوگوں کی برائی اُن کے منہ پر کہہ دیتی۔ امّاں اُسے بہت چاہتی تھیں۔

پہلی بات تو یہ کہ امّاں اور بڑھیا دونوں کازرون کی رہنے والی تھیں، اور اس شہر کے رہنے والے دوسروں سے تعصّب کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ میری اماں کی طرف دار تھی۔ اور اُن کے لیے ہمیشہ میرے ابّا کو سخت سست کہا کرتی تھی کہ کیوں امّاں کے ساتھ بُرا برتاو کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ وہ عزیز مہمان تھی۔ البتہ اپنے ساتھ ہمیشہ پنج سورہ، روزِ قیامت، تعزیہ، تعویذ اور طرح طرح کی دعاؤں کی کتابیں رکھتی، ساری چیزوں کو ایک پٹاری میں لپیٹ دیتی اور ایک عدد عینک بھی رکھتی تھی۔ پُرانے فریم اور شکل کی عینک بالکل بادامی طرح کے شیشے والی۔ وہ اتنی پُرانی عینک تھی کہ اُس کا ایک حصّہ ٹوٹا ہوا تھا اور بوڑھی خاتون نے اُس کے فریم کے بجاے داہنی طرف تار کا ایک ٹکڑا جوڑ رکھا تھا اور اُس میں ایک پتلا بٹا ہوا دھاگا لگا کر اپنے داہنے کان کے گرداگرد لپیٹ لیا کرتی تھی۔

میں تاک میں لگا تھا اور ایک روز جب کہ بوڑھی اماں کہیں گئی تھی۔ میں نے اُس کی پٹاری کی تلاشی لینا شروع کی۔ پہلے تو کتابیں اِدھر اُدھر پلٹیں، پھر مذاق مذاق میں شرارتاً میں نے اُس کے چشمے کو خانہ سے باہر نکالا۔ اُسے میں نے اپنی آنکھوں پر لگایا، تاکہ اس مضحکہ خیز صورت میں اپنا منھ ٹیڑھا میڑھا بنا کر اپنی بہن کو ڈراؤں۔

مگر، آہ مجھے یہ واقعہ کبھی نہیں بھولے گا!!

میرے لیے یہ ایک شان دار اور تعجب میں ڈال دینے والا لمحہ تھا۔ جیسے ہی کہ عینک میری آنکھوں پر لگی اچانک دُنیا میری نگاہوں میں بدل گئی۔ ساری چیزیں میرے لیے بدل گئی تھیں۔

دھوپ ہلکی ہونے کے بجاے پیلی اور چمکیلی دکھائی دی۔ درختوں کی پتّیاں گولی کھائے ہوئے سپاہیوں کی طرح ایک ایک کرکے گر رہی تھیں۔ میں، جس نے اُس دن

درختوں پر آپس میں جھنڈ بن کر جڑی ہوئی پتیوں کے علاوہ نہ دیکھا تھا، اچانک ہر ہر پتی کو الگ الگ دیکھ رہا تھا۔ ں جو اپنے کمرے کے سامنے والی دیوار کو ملی ہوئی اور ٹ دیکھا کرتا تھا اور ساری اینٹیں ملی جلی اور جڑی ہوئی آتی تھیں۔ آج دھوپ میں ایک ایک اینٹ دیکھ رہا تھا ر اُن کے فاصلے اور فرق میں تمیز کر سکتا تھا۔ آپ کو نہیں وم، میں نے کتنی لذت محسوس کی، جیسے مجھے آج سارے لک کی دولت دے دی گئی ہو۔

پھر کبھی وہ لمحہ اور لذت حاصل نہ ہوئے۔ کوئی چیز اُن باریکیوں دل نہ بن سکی۔ میں اتنا خوش ہوا کہ میں اپنے آپ ہی بار اُچھلا، گویا میں نے محسوس کیا گویا میں پھر سے پیدا ہوں اور دنیا میرے لیے ایک نیا معنیٰ رکھتی ہے۔ میں قدر خوشی سے سرشار تھا کہ میرا گلا رندھا جا رہا تھا۔

میں نے چشمہ اُتار لیا۔ دنیا دوبارہ میری آنکھوں میں پھر ھیری ہو گئی لیکن اب میں مطمئن اور خوش تھا۔

میں نے اُسے باندھ کر خانے میں رکھ دیا اور وہاں سے میں نے کہا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں نے ایک جملہ بھی کہہ دیا تو وہ ک مجھ سے لے لیں گی اور اپنے "تحفے" کی نفی سے میرے ور گردن کی مرمت کریں گی۔ مجھے معلوم تھا کہ بوڑھی ماں رہ کئی روز تک گھر لوٹ کے آنے والی نہیں ہے۔ میں نے ک کا خانہ اپنی جیب میں ڈالا اور بڑی خوشی کے عالم میں ت و بے پروا مدرسہ کی جانب چل پڑا۔

ظہر کے بعد کا وقت تھا۔ ہماری کلاس ایک خوب صورت رئیں تھی۔ مدرسہ کی یہ عمارت کسی پرانے رئیس کی کوٹھی جس میں نارنگی کا باغ بھی تھا۔ اس کے زیادہ تر کمرے ول اور شیشوں کے کام سے آراستہ تھے۔ اور ہماری س تو اس کوٹھی کا بہترین حصہ تھی۔ لیکن کوئی کھڑکی لمبی اور پرانی طرز کی دہلیز معلوم ہوتی تھی۔ طرح کے رنگین شیشوں سے سجی ہوئی اور شام کی دھوپ سے چوند ہو جاتا تھا اور میرے ہم کلاس بچوں کے معصوم ہیرے انگوٹھی کے نگینوں کی طرح جگ مگ جگ مگ چمکتے تھے اور آنکھوں میں کھبتے تھے۔

پہلا گھنٹہ عربی زبان کی قواعد اور الفاظ کی تکرار کا تھا۔ عربی کے استاد بڑے مزاحیہ اور چٹکلے باز تھے۔ جن کی عمر پچاس اکیاون کے قریب تھی۔ میرے تمام ہم عمر جنھوں نے شہر شیراز میں تعلیم حاصل کی ہے، وہ انھیں جانتے ہیں۔ میں جو اب اپنی آنکھوں کی طرف سے بالکل مطمئن تھا۔ آج کلاس کی صفِ اوّل کی بنچوں پر بیٹھنے کی کوشش نہ کر سکا۔ گیا اور جاکر آخری قطار میں بیٹھا۔ میں چاہتا تھا کہ اپنی آنکھوں پر چشمہ لگا کر اُن کا ٹسٹ کروں۔

خوش حال گھروں کے کھاتے پیتے بچوں کا مدرسہ غریبوں کے علاقے میں تھا۔ اس لیے کلاسوں میں زیادہ لڑکے نہیں ہوتے تھے۔ بوڑھی عمر میں پنشن پانے والے لوگوں کی طرح ہر سال یہاں کے طالب علم اسکول چھوڑ جاتے اور ادب و تاریخ کی تعلیم پر پنسدوری ر ردّیاں بیچ کر زندگی گزارنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ دراصل زندگی اُن کو مدرسہ خیرباد کہنے پر مجبور کرتی تھی۔ میری کلاس میں لڑکوں کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی۔ اگر کلاس کے سارے شاگرد حاضر ہوتے تو کلاس کی چھٹی قطار تک پورے ہو جاتے تھے۔ جب کہ پورے کلاس میں بیٹھنے کی تقریباً دس قطاریں تھیں اور میں نے اپنی "مسلح" آنکھوں کا ٹسٹ لینے کے لیے کلاس کی دسویں قطار کا انتخاب کیا تھا۔ میری یہ حرکت اُن چھوٹی موٹی پہیلی شرارتوں کو جنھیں میں اکثر کیا کرتا تھا۔ سبق کے شروع میں ہمارے بوڑھے استاد کی بدگمانی کا سبب بن گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ دھیرے دھیرے کنکھیوں سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔

اُنھوں نے دل میں سوچا کہ آخر بات کیا ہے کہ یہ شیطان کی اولاد ہمیشہ کے مقابلے میں آج کلاس کے آخر میں بیٹھی ہے۔

کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔

بچے بھی تھوڑا بہت حیران تھے۔ جانتے تھے کہ پہلی قطار میں بیٹھنے کے لیے میں نے برسوں فساد مچایا ہے۔ بہرحال سبق شروع ہوا۔ استاد محترم نے عربی کی کوئی عبارت ٹھیک

بورڈ پر لکھی اور اُس کے بعد اُنھوں نے پنسل کی لائنیں کھینچیں۔
پہلے خانے میں عربی کا ایک جملہ لکھا اور اُس کے سامنے
اُس جملے کی الگ الگ تشریح کی اور اسی درمیان میں نے
موقع کو غنیمت جانا۔ ہاتھ جیب میں ڈالا، خانہ باہر نکالا اور
عینک آنکھوں پر لگالی۔

تار کے فریم کا حصہ داہنے پر کان پر لگایا اور بٹے ہوئے
دھاگوں والا حصہ بائیں کان کی طرف لے گیا اور کئی گھیرا
لپیٹ کر باندھ لیا۔

اس وقت میری صورت دیکھنے کے لائق تھی۔ میرا چہرہ
تمتمایا ہوا، لمبوتری صورت عقاب کی مانند، لمبی اور موٹی ناک کے
یہ سب اُس بادام برابر شیشوں والی عینک سے میل نہیں کھاتا
تھا اور پھر طرّہ یہ کہ ایک دستہ تار کا اور دوسرا دھاگے کا یعنی
سونے پر سہاگا تھا۔ ہر ایرا غیرا اس پر ہنستا تھا اور پھر اسکول
کے بچے جو بے سبب اور بلاوجہ خالی خولی دیوار بھی دیکھ کر ہنسنا
نہیں بھولتے تھے۔

اللہ میاں کسی کو بُرے دن نہ دکھائیں۔ پہلی ہی سطر جسے
استادِ محترم نے لکھی اور چاہا کہ کلاس کی طرف دیکھیں، اور
شاگردوں کا حال اُن کے چہروں سے معلوم کریں کہ اچانک ان
کی نگاہیں اس ناچیز پر پڑیں۔

اُنھوں نے حیرت میں مبتلا ہوکر چاک ہاتھوں سے گرادی
اور تقریباً ایک منٹ تک میرے پورے وجود، چہرہ اور میری
عینک پر نگاہیں گڑا دیں۔

میں تحریر اور اُن کی طرف متوجہ نہیں تھا اور اپنی خوشی
میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ سر پیر کا بھی ہوش نہیں تھا۔ میں جو
کہ پہلی صف میں بیٹھنے کے باوجود ہزار مصیبت اور کوشش کے
باوجود تختہ سیاہ کی تحریر کو بہ مشکل پڑھ پاتا تھا، اس وقت
دسویں قطار میں بیٹھا ہوا پڑھ رہا تھا اور بلبل کی طرح
چہک رہا تھا۔ میں اپنی دُنیا میں مست تھا۔

اس شروع کیے واقعہ کی طرف میری مطلق توجہ نہیں
تھی۔ میری یہ بے توجہی اور پھر یہ کہ میں نے اپنے چہرے
سے کسی قسم کی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ استادِ محترم کی
بدگمانی کا مزید سہارا بن گئی۔ اُنھیں یقین ہوگیا کہ میں ایک
کھلونا لایا ہوں تاکہ اُس کے ذریعے مذاق اور مسخراپن
کروں!

وہ اچانک میرے اُوپر چیتے کی طرح جھپٹے۔ اتفاقاً اُن
محترم کی بول چال کا لہجہ شیراز کی صاف ستھری زبان والا
اور اُن کی ضد ہوتی تھی کہ وہ ہمیشہ عام زبان میں بات
کریں جیسے ہی میرے قریب آئے تو اپنے خاص انداز میں فرمایا
"واہ بے واہ! گدھے کے بچے! اپنی صورت تو الو
کی سی بنا رکھی ہے؟ کیا یہاں تو الوؤں کی کوئی پارٹی
کا ارادہ ہے؟"

جب تک اُستادِ محترم نے کچھ کہا نہ تھا، کلاس [illegible]
تھی اور بچوں کی آنکھیں تختہ سیاہ پر لگی ہوئی تھیں۔ جیسے
ہی اُنھوں نے مجھ پر اعتراض کیا، سارے شاگردوں کا
رُخ میری طرف پلٹ گیا تاکہ واقعہ معلوم کریں۔ جوں ہی
سب نے میری طرف دیکھا۔ میری عینک جو میری خوشی کا
باعث تھی، گویا زلزلہ آگیا ہو اور پہاڑ ٹوٹ کر گرا ہو
وہ چکنا چُور ہوگئی ہو۔

لڑکوں کی زوردار ہنسی نے کلاس اور مدرسہ کی عمارت
ہلا کر رکھ دیا۔ ہر ایک لڑکا ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوا جا رہا
تھا۔ اس کام نے ماسٹر صاحب کو بہت زیادہ خفا کر دیا۔
نے یہ خیال کیا کہ یہ سارا کھیل میری صرف شرارت کا
لڑکوں کی ہنسی اور استادِ محترم کا حملہ میرا ہوش ٹھکانے
کر گیا۔ میں نے محسوس کر لیا کہ کوئی خطرہ درپیش ہے
نے چاہا کہ فی الحال اپنی عینک جلدی سے اُتار لوں، جیسے
ہی میرا ہاتھ عینک پر پہنچا۔ ماسٹر صاحب نے للکارا:
"اسے ہاتھ نہ لگانا، رہنے دے تاکہ میں تجھے اسی
نما شکل میں پرنسپل کے پاس لے چلوں۔"
"ارے بیٹا! تجھے تو سڑکوں پر جھاڑو دینا چاہیے۔
بھلا مدرسہ، کتاب اور پڑھائی سے کیا کام؟ جاؤ
جا کر حمام میں پانی بھرو۔"
اب کلاس زوردار ہنسی میں ڈوب چکی تھی، اور میں

[illegible] میں آدھا اندھا ہو گیا ہوں؟ [illegible]
بیٹے کا تیسا میری آنکھوں پر چڑھا ہوا ہے
[illegible] استاد محترم کو دیکھ رہا ہوں۔ اب کی
جگہ سے تیزی سے میرے سامنے آگئے۔ میری
[illegible] ہاتھ کے فاصلے پر اُن کی کوٹ کی پشت پر
دوسرا ہاتھ مجھے مارنے کے لیے اُٹھا ہوا تھا۔ اس
وہ مجھ سے بولے۔ اُٹھو کھڑا ہو، بھاگ، دفعان
اُٹھو کھڑا ہو، بھاگ! میں بدقسمت بھی اُٹھ کھڑا
[illegible] طرح میری آنکھوں پر چڑھی ہوئی تھی اور
[illegible] ہنسے جا رہی تھی۔ میں تھوڑا دبکا رہا کہ اگر وہ
[illegible] نہ لگے یا کم از کم میرے چہرے پر نہ پڑے
اور چالاکی سے میں استاد محترم کے سامنے
لیکن اچانک تھپڑ گالوں پر پڑا اور عینک کا تار
[illegible] ہوئی عینک کا منظر اور زیادہ ہنسنے کا باعث
میں نے چاہا کہ ٹوٹی ہوئی عینک کو جوڑ دوں
زبردست لاتیں کمر پر پڑیں۔ میں ہائے کرنے
رکھتا تھا۔ میں اُچھلا اور کلاس سے کود کر باہر

صاحب، نگراں صاحب اور عربی کے محترم استاد
[illegible] کر کمیشن مقرر کیا گیا اور لمبی چوڑی گفتگو کے
[illegible] سے خارج کر دینے کا فیصلہ صادر ہوا۔ جب
فیصلہ پر عمل کرنا چاہا تو میں نے اپنی کم نظری کا قصّہ
[illegible] تو انھوں نے یقین نہیں کیا۔ لیکن میرا بیان
تجربہ بھی کھل سکتا تھا۔
[illegible] سمجھ گئے کہ میں آدھا اندھا ہوں تو میرا قصور [illegible]
گیا۔ چوں کہ عربی والے استاد محترم ہر فن مولا اور
تھے، اسی انداز میں بولے،
[illegible] تھا۔ تمھاری عمر دراز ہو۔ پہلے [illegible]
[illegible]

[illegible]
شاہ چراغ میں میرزا سلیمان عینک ساز کی دکان [illegible]
عربی کے استاذ محترم بھی آگئے۔ میرزا سلیمان سے ایک [illegible]
عینک لیتے اور میری آنکھوں پر لگواتے اور مجھ سے
شاہ چراغ کی گھڑی کی طرف دیکھو، کیا چھوٹی سوئی [illegible]
ہے؟ نظر آتی ہے یا نہیں؟ قادم نے بھی ایک ایک
عینک آزمائی۔ آخر کار ایک عینک، آنکھوں پر [illegible]
اور میں نے اُس سے چھوٹی سوئی دیکھ لی۔
میں نے ساڑھے سات رُپے ادا کیے اور اُسے میرزا
سلیمان سے خرید لیا اور اپنی آنکھوں پر لگایا۔ اس طرح
عینک استعمال کرنے والا بن گیا۔

●●

منشی دیا نرائن نگم

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

آج سے پورے ایک سو سال پہلے کی بات ہے، اتر پردیش کے مشہور تجارتی اور صنعتی مرکز کان پور کے ایک معزز کالستھ خاندان میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ کالستھوں کے اس مشہور گھرانے میں وکالت آبائی پیشے کی شکل میں چلی آرہی تھی۔ بچے کے والد شیو پرشاد نگم اور دادا منشی شیو سہائے نگم شہر کے مشہور وکیلوں میں شمار ہوتے تھے لیکن خاندان کے تمام لوگوں کی خواہش اور اصرار کے باوجود وہ بچہ وکیل بننے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے اردو زبان اور ادب کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا۔ اور اس میدان میں اپنے وقت کے مشہور لوگوں سے بھی بہت آگے نکل گیا۔ اس بچے کا نام دیا نرائن نگم تھا جسے آنے والے زمانے میں ماہنامہ "زمانہ" کان پور کے اڈیٹر اور ایک مشہور قومی رہنما کی حیثیت سے شہرت ملی۔

منشی دیا نرائن نگم ۲۲ مارچ ۱۸۸۲ء کو اپنے آبائی وطن کان پور میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے کے عام دستور کے مطابق گھر ہی پر اردو فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۹ء میں کان پور [illegible] اسکول سے انٹرنس کا امتحان اول درجے میں پاس کیا اور [illegible] کالج سے بی اے پاس کیا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی انھیں مضمون لکھنے کا شوق پیدا ہو چکا تھا اور ان کی علمی صلاحیت کا یہ حال تھا کہ اس زمانے کے مشہور اخبار "مخزن" لاہور میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ "مخزن" کے اڈیٹر شیخ عبدالقادر نے جو اپنے وقت کے مشہور عالم اور ادیب تھے، نگم کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابتدا ہی میں پہچان کر ان کی حوصلہ افزائی کی۔

اردو کی ترقی کے سلسلے میں نگم کا سب سے بڑا کارنامہ ماہنامہ "زمانہ" ہے، جس کے ذریعے وہ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۴۲ء تک یعنی تقریباً چالیس برس تک زبان وادب کی خدمت کرتے رہے۔ بی اے پاس کرنے کے بعد نگم نے "زمانہ" کی ادارت سنبھالی تھی اور وہ بے شمار دشواریوں کے باوجود مرتے دم تک اسے پابندی کے ساتھ نکالتے رہے۔ یہ رسالہ فروری ۱۹۰۳ء میں بریلی سے جاری ہوا تھا اور اس کے اڈیٹر منشی شیو برت لال ورمن ایم اے تھے لیکن ۱۹۰۳ء تک یہ رسالہ ان ہی کی ادارت میں نکلا اور نومبر دسمبر ۱۹۰۳ء سے دیا نرائن نگم کی ادارت میں شائع ہونے لگا۔ "زمانہ" ابتدا میں ایک ادبی پرچہ کی شکل میں نکلنا شروع ہوا تھا جس میں

بھی اہم سیاسی مسئلوں پر معتدل اور سرسری تبصرے ہوتے تھے لیکن رفتہ رفتہ اس زمانے کے سیاسی حالات پر تفصیلی مضامین بھی شائع ہونے لگے۔ یہاں تک کہ جب کانگریس کے سالانہ اجلاس (کلکتہ) میں مکمل آزادی کا مطالبہ پیش ہوا تو نگم نے اسی زمانے یعنی ۱۹۲۸ء میں "زمانہ" کا قومی نمبر نکالا۔ ۱۹۲۹ء میں انھوں نے پھر ایک قومی نمبر نکالنے کا ارادہ کیا اور اس موقع پر بعض شریک کار حضرات سے ان کا اختلاف بھی ہوا مگر وہ نمبر نکال کر ہی رہے۔ بعد میں "رفتار زمانہ" کے تحت انھوں نے سیاسی بحثوں میں کھل کر حصہ لینا شروع کر دیا۔

نگم میں مطالعہ کی عادت اور ذہانت لڑکپن سے ہی موجود تھی۔ فرصت کے وقت میں درسی کتابوں کے علاوہ ادبی کتابیں اور رسالے کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔ اکثر اہم باتیں اور موضوعات ایک بار پڑھنے کے بعد بھی مدتوں ان کے ذہن میں محفوظ رہتے تھے۔ مستقل مزاجی اور محنت و مشقت ان کی فطرت کا ایک حصہ تھی۔ "زمانہ" نکالنے کے دوران وہ برابر مالی دشواریوں سے دوچار رہے مگر کبھی بھی انھوں نے ہمت نہ ہاری۔ اکثر رسالے پر ہزاروں روپے کا قرض ہو گیا جسے ادا کرنے کے لیے انھیں ذاتی جائداد تک بیچنا پڑی۔ لیکن رسالہ برابر نکلتا رہا۔ ان کے کام کرنے کا حال یہ تھا کہ "زمانہ" میں چھپنے والی کوئی بھی چیز ان کے بغیر دیکھے پریس میں نہیں جاتی تھی۔ دو دو بجے رات تک وہ مسودے دیکھتے، کاپیاں چیک کرتے اور تمام کاموں کو نپٹا کر ہی اٹھتے تھے۔ زندگی کے آخری برسوں میں وہ آنکھ کا آپریشن کروانے بمبئی گئے۔ آپریشن سے پہلے تکلیف بہت تھی اور درد کی شدت سے آنکھیں بند کیے لیٹے رہتے تھے۔ لیکن اس حالت میں بھی "زمانہ" کی فکر دل میں موجود تھی۔ عبدالرزاق قریشی اور سید نجیب اشرف ندوی صاحبان ان کی عیادت کو گئے تو انھوں نے قریشی صاحب سے تاکید کی کہ وہ اپنی تازہ تخلیق "زمانہ" کے لیے دیں۔ آپریشن کے بعد بھی گرچہ ڈاکٹروں نے انھیں مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا مگر وہ سانتا کروز میں اپنے ایک دوست کے گھر میں بیٹھے ہوئے "زمانہ" میں شائع ہونے والے مضامین کو درست کرواتے رہتے تھے۔ ان کی اس لگن کا نتیجہ تھا کہ "زمانہ" ہمیشہ ایک بلند پایہ رسالے کی شکل میں زندہ رہا۔

نگم کو اردو زبان سے بے حد محبت تھی۔ گرچہ زبان اور رسم الخط کے سلسلے میں ان کے بعض خیالات سے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو اختلاف ہوا لیکن اردو زبان سے ان کی محبت کا اندازہ صرف اسی ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ "زمانہ" جب قرض کے بوجھ سے لد گیا اور ہندی کے ایک رئیس قدردان نے یہ پیش کش کی کہ اگر آئندہ سے رسالہ اردو کی بجائے ہندی میں نکالا جائے تو وہ نہ صرف پچھلے نقصانات کی تلافی کر دیں گے بلکہ اس کے آئندہ اخراجات بھی پورے کرتے رہیں گے۔ تو نگم نے شکریہ کے ساتھ ان کی پیش کش نامنظور کر دی اور اردو زبان میں ہی رسالہ نکالتے رہے۔ اسی طرح الہ آباد میں جب ہندستانی اکیڈمی قائم ہوئی تو انھوں نے بار بار حکومت سے اس کی مالی امداد کرنے کی درخواست کی اور آخر کار ایک معقول سالانہ امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اردو زبان کی ترقی کے لیے آج بہت سے لوگ یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ اردو کتابوں کی چھپائی میں ٹائپ کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے۔ نگم کی دور اندیشی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ۱۹۲۵ء میں "زمانہ" کے قومی نمبر میں یہ تجویز پیش کی تھی۔

نگم بہت مخلص اور صاف دل کے آدمی تھے۔ کبھی کسی کے خلاف دل میں کینہ نہیں رکھتے تھے۔ چھوٹوں سے بے حد شفقت کے ساتھ ملتے اور لکھنے پڑھنے کے سلسلے میں اکثر ان کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ نئے مضمون نگاروں میں چھپے ہوئے ہنر کو تلاش کر کے ان کی رہنمائی کرنا نگم کو خوب آتا تھا۔ کتنے لوگ ایسے تھے جنھیں نگم نے حوصلہ دلا کر مشہور و معروف ادیب اور شاعر بنا دیا۔ برج نرائن چکبست، جگت موہن لال رواں، پریم چند، سرور جہان آبادی، اور سدرشن کے کارنامے بڑی حد تک ان کی حوصلہ افزائی کے رہین منت ہیں۔ احتشام حسین کا ایک مضمون انھیں پسند آیا تو ان کو نہ صرف کئی تعریفی خطوط لکھے بلکہ معاوضہ بھی بھیجا۔

نگم ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اور مسلمانوں کو ان کا حق دلانے کے لیے برابر کوشاں رہتے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں انگریزی حکومت نے شہر کی آرائش کے لیے مچھلی بازار کانپور کی ایک مسجد کا کچھ حصہ شہید کر دیا۔ مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا اور نگم

نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر ایک ہفتہ وار اخبار "آزاد" جاری کیا جس کے ذریعہ انھوں نے بڑی بے باکی سے برطانوی حکومت کے خلاف آواز اٹھائی۔ انگریزی حکومت کے آخری دور میں جب ہندستان کے مختلف شہروں میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تو کانپور بھی اس سے نہ بچ سکا۔ لیکن نگم صاحب کی کوششوں سے ان کے محلے میں ہمیشہ امن رہا۔ ۱۹۳۱ء کے فسادات کے دوران انھوں نے دو سو سے زیادہ مردوں اور عورتوں کو اپنے گھر میں پناہ دی۔ محلے کے کچھ غیر مسلموں نے قریب کے کچھ مندروں پر حملہ کی خبر سن کر جب محلے کی ایک مسجد پر حملہ کرنا چاہا تو نگم نے سخت مزاحمت کی اور صاف صاف کہہ دیا کہ ان کی لاش سے گزر کر ہی کوئی مسجد تک پہنچ سکتا ہے۔ اس طرح یہ معاملہ ختم ہو گیا۔

نگم ایک سچے محب وطن بھی تھے اور وطن کی آزادی کے لیے نہ صرف خود کوشش کرتے رہتے تھے بلکہ اس راہ میں لڑنے والوں کی ہر طرح سے مدد بھی کرتے تھے۔ مشہور جاں نثار وطن مولانا حسرت موہانی جب جیل میں تھے تو ان کی غیر موجودگی میں نگم نے انگریزی حکومت کی ناراضگی کی پرواہ کیے بغیر بیگم حسرت کی ہر طرح مدد کی۔ وطن کی آزادی کا انھیں بے حد شوق تھا اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے، بس ایک بار ملک کو آزاد دیکھنے کی آرزو باقی ہے۔ مگر افسوس کہ وہ ملک کی آزادی سے پہلے ہی قیدِ حیات سے آزاد ہو گئے اور ان کی یہ آخری خواہش پوری نہ ہو سکی۔

نگم بے حد ملنسار، خوش اخلاق اور پر مذاق آدمی تھے۔ دوستوں کو بڑے دلچسپ اور پر خلوص خطوط لکھتے تھے۔ شاید اسی لیے اس زمانے کے تقریباً تمام اچھے ادیبوں اور شاعروں سے وہ "زمانہ" کے لیے مضامین اور نظمیں حاصل کر لیتے تھے۔ کاروباری معاملات میں نگم بے حد سنجیدہ رہتے مگر بات چیت کے دوران زندہ دلی کا مظاہرہ اکثر ہوتا تھا۔ مثلاً ایک بار آمدنی میں ایک نئے صیغے کے اضافے کے ساتھ ایک سابقہ مد میں کمی ہو گئی تو نگم نے فوراً کہا "خدا بھی میرے ساتھ حساب کرتا ہے۔ اگر ایک در کھولتا ہے تو دوسرا بند کر دیتا ہے۔"

[illegible]ء میں نگم کا انتقال ہو گیا مگر جب تک اردو صحافت اور ادب زندہ ہے وہ ہمارے ذہنوں میں زندہ رہیں گے۔ ●

محمد غیاث الدین تاج

اُمّت کے لیے پانچ تحفے

ابو ہریرہؓ نے حضور اکرمؐ سے نقل کیا کہ میری اُمت کو رمضان شریف کے سلسلے میں پانچ چیزیں مخصوص طور پر دی گئی ہیں جو پہلی امتوں کو نہیں ملیں۔

(۱) منہ کی بُو جو اللہ کے نزدیک مشک سے زیادہ بہتر ہے۔

(۲) روزہ داروں کے لیے دریا کی مچھلیاں تک دعا کرتی ہیں اور افطار کے وقت تک دعا کرتی رہتی ہیں۔

(۳) جنت ہر روز ان کے لیے آراستہ کی جاتی ہے پھر حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں قریب ہے کہ میرے نیک بندے (دنیا کی) ساری مشقت اپنے اوپر سے پھینک کر میری طرف آئیں

(۴) رمضان کے دنوں میں سرکش شیاطین بند کر دیے جاتے ہیں رمضان شریف میں اُن برائیوں کی طرف نہیں پہنچ سکتے جن تک غیر رمضان میں پہنچ سکتے ہیں۔

(۵) رمضان شریف کی آخری رات میں روزہ داروں کی مغفرت کی جاتی ہے۔

صحابہ کرامؓ نے عرض کی۔ یہ شب مغفرت شب قدر ہے۔ فرمایا نہیں بلکہ یہ ہے کہ مزدور کو کام ختم ہوتے وقت مزدوری دی جاتی ہے۔

حضور اکرمؐ نے جن پانچ خصوصی انعامات کی بشارت دی ہے پانچ اگلی کسی امت کو نہیں ملیں۔

کاش اس نعمت کی قدر ہوتی اور مسلمان ان کے حصول کی کوشش کرتے۔

ایک دوسری حدیث میں وارد ہے کہ رمضان المبارک کی ہر شب دوزخ سے جہنم کے قیدی چھوڑ دیے جاتے ہیں اور مسلمانوں کی ہر شب دوزخ ایک دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔

بہت سی روایات میں روزہ دار کی دعا کا قبول ہونا وارد ہوا ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ افطار کے وقت دعا قبول ہوتی ہے مگر ہم لوگ اُس وقت کھانے پر اس طرح گرتے ہیں کہ دعا کی کہاں فرصت۔ خود افطار ہی کی دعا یاد نہیں رہتی۔

مقیم اقبال میموریل اردو پرائمری اسکول بتیانہ ڈاکخانہ کلٹی، بردوان

اطہر پرویز

شیخ جمن نے منت مانی

چڑھنے کو تو شیخ جمن چڑھ گئے پیڑ کے اُوپر، اور وہ بھی دوسرا پیڑ نہیں، کھجور کا پیڑ، جس میں نہ کوئی شاخ ہوتی ہے اور نہ کوئی ٹھل۔ لیکن شیخ جی دُھن کے پورے تھے کام کے پکے، مگر اب سوال یہ تھا کہ اُتریں تو کیسے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دم سے گر پڑیں، دھڑام سے اور مفت میں جان جائے۔

ہمارے شیخ جی منت اور چڑھاوے کے بڑے قائل تھے۔ اِدھر مصیبت پوری پوری آئی تھی جھٹ بول ہی تو پڑے۔ "اے اللہ میاں! اگر تو نے اپنے اس ناچیز بندے کو صحیح و سالم اُتار دیا تو بس گھر پہنچتے ہی دس روپے کی نیاز دلاؤں گا۔"

یوں تو اب منت مان لی تھی، مگر خالی منت سے کہیں کام چلتا ہے۔ کچھ تدبیر تو اُترنے کی کرنا ہی تھی۔ اب شیخ جی اُترنے کی کوشش کرنے لگے۔ اتفاق سے کچھ نیچے آ گئے۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو اُمید بندھ گئی۔ مگر ابھی کافی اُترنا تھا۔ شیخ جی نے سوچا کہ اس مہنگائی کے زمانے میں پیڑ سے اُترنے کے لیے دس روپے کی مٹھائی چڑھانا کون سی عقل مندی ہے۔ جھٹ بول اٹھے "اے اللہ میاں! دس روپے کی مٹھائی بہت ہوتی ہے، کون اتنی مٹھائی کھا سکے گا۔ لیکن ساتھ خیریت اُتر گیا تو آٹھ روپے کی مٹھائی ضرور چڑھاؤں گا۔"

اب شیخ جمن نے اللہ کا نام لے کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔ لگے پیڑ سے نیچے سرکنے۔ اب تو کچھ اور نیچے آ گئے۔ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تو وہ اطمینان سے سانس لے کر بولے۔

"اے اللہ میاں! آٹھ اور دس روپے کی مٹھائی میں فرق ہی کیا ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پانچ روپے کی مٹھائی بھی بہت ہوتی ہے۔ بس ساتھ خیریت کے اُتار دے۔ آج ہی پانچ روپے کی مٹھائی چڑھا دوں گا۔"

اب شیخ جمن کو ذرا اطمینان ہوا، اس لیے کہ آدھی دور آ گئے تھے۔ لیکن پیڑ اونچا جو تھا۔ ذرا بھی ہاتھ چھوٹ جائے تو بس یہ سمجھ لیجیے کہ ہڈی پسلی سلامت نہ بچے۔ شیخ جمن نے اللہ کا شکر ادا کیا اور بولے۔

"اے اللہ میاں! تو بھی کیا کہے گا کہ تیرا یہ بندہ کتنا بُزدل ہے کہ ایک پیڑ سے نیچے اُترنے کے لیے پانچ روپے کی منت مان لی۔ پانچ روپے آج کے زمانے میں بہت ہوتے ہیں —— بس تین روپے کی نیاز کافی ہوگی۔"

یہ کہہ کر شیخ جمن نے پھر ہمت باندھی اور اُترنا شروع کر دیا۔ اب تو شیخ جی کافی اُتر آئے۔ سر اٹھا کر اُوپر دیکھا تو بہت ہی خوش ہوئے اور دل ہی دل میں کہنے لگے کہ میں بھی کیا آدمی ہوں جو اتنے سے پیڑ سے گھبرا گیا اور یہ منت مان لی۔ وہ بھی تھوڑی نہ بہت، اکٹھا تین روپے کی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ منت تو منت ہے۔ جیسے تین کی، ویسے ایک کی۔ ثواب سب کا برابر ہوتا ہے مطلب تو ثواب سے ہے۔ بس ایک روپے کی مٹھائی منگواؤں گا۔

ایک روپے کی منت مان کر ان کو اطمینان ہوا، اور لگے اُترنے۔ اب پھر کچھ دور سا گئے تو ذرا ٹھٹک گئے تھے۔

بقیہ ص ۳۹

دودھ پور، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

رفیق حامد زاہدی

لومڑی: "اچھا بچو! آج تمھیں کل کے تمھارے سوال کا جواب چاہیے نا؟"

کل ذرا میں بھاری بھاری اور گہری باتیں کر رہی تھی، اس لیے کہ کل میری بات چیت تم بچوں سے نہ تھی بلکہ جنگل کے اُن بڑے بڑے جانوروں سے تھی جو آدمی کا رنگ ڈھنگ اختیار کر کے ان کے طور طریقوں کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

آج میں تمھاری سمجھ میں آنے والی باتیں کروں گی۔ کل تم دونوں نے بتایا تھا کہ تمھارے ساتھی ہرن کے بچے کے باپ کو شیر کھا گیا اور میمنہ کی ماں کو بھیڑیے نے پھاڑ کھایا اور اس طرح یہ دونوں بچے یتیم ہو گئے۔

سنو راجا کے پوتے کلیلہ! اور میرے یعنی (وزیر) کے بیٹے دمنہ!

کل تک اس جنگل میں نرا جیت تھی۔ جو طاقت ور تھا، وہی سب کچھ تھا۔ اسی لیے شیر اپنے کو جنگل کا راجا، جانتا تھا اور ہاتھی کو وزیر سمجھتا تھا۔ اس لیے یہ جو چاہتے تھے کر گزرتے تھے۔ یہ شیر اور ہاتھی اپنے اپنے دیس میں کھانے پینے کی چیزوں کی کمی پا کر آسام اور سندر بن، چھابن یا کالی بن سے یہاں کچھ مال۔ تھال، سودا سلف لے کر ہمارے بزرگوں کے زمانے میں اُسی طرح آئے تھے جس طرح انگریز، فرانسیسی اور پرتگالی یہاں کے آدمیوں کے بزرگوں کے زمانے میں اپنے اپنے ملکوں سے تجارتی مالوں کی کھیپ لے کر آئے اور اپنے اپنے دیسوں سے اس دیس کو اچھا پا کر دوسری اور تیسری کھیپوں میں لڑائی کا بنیا بنیا سامان اور فوج لائے۔

انگریز زیادہ ہوشیار اور چالاک تھا۔ وہ جوڑ توڑ کر کے بھارت دیس کی گدّی سنبھال بیٹھا۔ اُس نے یہاں کے آدمیوں ہی کو دُکھ نہیں دیے۔ جنگل، پہاڑ، دریا، سمندر سب پر اپنا راج پاٹ قائم کر کے دونوں ہاتھوں سے اس دیس میں لوٹ کھسوٹ کا ایک ریلا بہا دیا۔

تب کچھ خدا کے اچھے بندے اُٹھے۔ وہ نہ رائفل سے

"ٹوڑے نہ توپ اور بندوق تھے۔"

کلیلہ اور دمنہ نے کہا: "رائفل، توپ اور بندوق یہ سب کیا ہیں؟"

لومڑی: "یہ آگ اور دھوئیں کے ساتھ خطرناک گولیاں اور بڑے بڑے گولے پھینکنے والے لوہے کے ہتھیار ہیں۔ یہ اتنے خطرناک ہیں کہ شیر اور ہاتھی کی جان بھی نہیں بچ سکتی۔ پہلے آدمی کے پاس تیر، تلوار، بھالے اور خنجر تھے۔ لیکن ان سے انسان اور جانور بچ بھی سکتے تھے۔ مگر اِن موذی ہتھیاروں سے بچ جانا مشکل ہے۔ اگر تم کسی دو ٹانگ والے کے ہاتھ میں کوئی کالی سی لمبی چیز دیکھو تو کسی جھاڑی میں گھس کر جتنا دور بھاگ سکتے ہو بھاگ کر اپنی جان بچالو۔ کیوں کہ یہ کچھ جانوروں کو گوشت اور کھال کے لیے مارتے ہیں اور کچھ جانوروں کو صرف کھال کے لیے۔"

کلیلہ چوں کہ راجا کا بیٹا تھا اس لیے انسانوں کے اس ظلم اور بے رحمی پر بہت زیادہ غصّے میں بھر گیا تھا۔ اُس نے تاؤ میں آکر پوچھا۔

"یہ بے رحم اِن کھالوں کا کیا کرتے ہیں؟"

لومڑی: "وہ انھیں بیچ کر روپے کماتے ہیں اور طرح طرح سے استعمال میں لاتے ہیں۔ جوتے، ٹوپیاں، چُرّا بیں (پانو میں پہننے کے چرمی موزے) دستانے اور پوستین، جیکٹ (سردی سے بچنے کے لیے صدری) اور کوٹ بناتے ہیں۔

خیر تو میں یہ بتا رہی تھی کہ یہ بڑے جانور بھی انگریزوں کی طرح ایک جنگل کے چھوٹے جانوروں کو کچھ طاقت سے اور کچھ چالاکی سے مار کر کھا لیتے ہیں اور کچھ جانور اپنی جان بچا کر دوسرے جنگلوں اور کھیتوں میں بھاگ جاتے ہیں یا جنگل کو کاٹ کر انسان کھیت بنا لیتے ہیں تو یہ بڑے جانور دوسرے بڑے جنگلوں میں آکر ان کو اپنی راج دھانی بنا لیتے ہیں۔

ان میں ہاتھی، گینڈے، ارنا، زرافہ وغیرہ دوسرے جانوروں کے حق میں خطرناک نہیں ہیں۔ صرف اپنی طاقت کی سرمستی میں آکر کبھی کبھار کچھ نقصان پہنچا دیتے ہیں لیکن ان سے سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ یہ جنگلوں کو اُجاڑ پھینکتے ہیں اور اتنا بڑا ڈیل ڈول رکھ کر بھی اتنی سی عقل نہیں رکھتے کہ جب سر چھپانے ہی کی جگہ نہ رہے گی تو یہ عقل کے دشمن کس طرح اپنے پہاڑ جیسے ڈھانچے کو انسان سے بچا سکیں گے۔

ہم تم تو جھاڑیوں اور کھیتوں میں بھی رہ سہ سکتے ہیں۔ ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، زرافے وغیرہ زیادہ کارآمد ہیں۔ اِن میں ہاتھی تو چاندی کا پہاڑ ہے۔ اس کی کھال تو کسی کام کی نہیں لیکن ٹھاٹ باٹ اور دکھاوے اور برتری جتانے کے لیے اُس کی سواری کی جاتی ہے۔ اُس کے دکھاوے کے دانت خود اُس کے کسی کام کے نہیں مگر انسانوں کے لیے بڑے قیمتی ہیں اور اُس کے جسم کی ساری ہڈیاں بڑے کام کی اور بڑی انمول ہیں۔"

دمنہ: "اچھا تو ہاتھی پر سواری کی جاتی ہے؟"

گینڈر راجا نے ہنس کر کہا۔

"ہاں! انسان جس قدر عقل مند، بہادر، نڈر اور چالاک ہے، اُسی قدر مسخرا بھی ہے۔ وہ ہاتھی، گھوڑے اور اونٹ سے سواری کا کام لیتا ہے اور اونٹ، خچر اور گدھے پر بوجھ لاد کر اُن سے مال گاڑی کا کام لیتا ہے۔ گائے بکری اور بھینس سے دودھ حاصل کرکے دودھ سے دہی، چھاچھ، پنیر اور مسکا اور گھی بناتا ہے اور ان کی کھالوں سے جوتے وغیرہ بناتا ہے اور ہڈیوں سے کھاد بنا کر کھیتوں میں ڈالتا اور زیادہ سے زیادہ زمین کی پیداوار حاصل کرتا ہے۔ اور بیل بھینسے سے ہل جتواتا اور چھکڑے کھنچواتا ہے۔

آدمی یہ کام ہاتھیوں سے بھی لیتا ہے۔

یہ ہاتھی دیکھنے میں جتنے بڑے ہیں، عقل میں اتنے ہی چھوٹے اور یہ اپنی بے وقوفی سے اپنی قوم کے لیے مصیبت ہیں۔

جب ہاتھی کھتّے میں گرائے جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔

کلیلہ نے ٹوک کر پوچھا:
"کھتّا کیا چیز ہے؟"
"کھتّا اُس بڑے گڑھے کو کہتے ہیں جو جنگل میں کھودا جاتا ہے۔ اس کی تین طرف کی دیواریں سیدھی ہوتی ہیں ایک طرف کی سلامی۔ پھر اِس گڑھے کو پتلی پتلی کرچیوں سے پاٹ کر اِس پر مٹی اور گھاس بچھا دیتے ہیں اور اُس پر کیلے کے تنے اور پتے ڈال دیتے ہیں اور وہاں سے دور تک کیلے کے تنے بچھا دیتے ہیں۔ ہاتھیوں کا رات کو ہنکوا کیا جاتا ہے ہاتھی اس راہ پر لگ کر زمین کے ہم رنگ گڑھے تک پہنچتے اور کیلے کے لالچ میں جھپٹ کر کئی کئی گڑھے پر جا پہنچتے اور گڑھے میں گر جاتے ہیں۔ کئی روز کے بعد انسانوں کے سدھائے ہوئے ہاتھی ہی ان بھوکے پیاسے ہاتھیوں کو اُن کے پاؤں میں زنجیریں ڈال کر باہر کھینچ لاتے اور درختوں میں باندھ کر آدمیوں کا غلام بنا دیتے ہیں۔"

دمنہ: "گویا ہاتھی ان احمق ہاتھیوں کی مدد کے بغیر آدمیوں کے قبضے میں نہیں آسکتے؟"

لومڑی: "تم نے درست سمجھا۔ اس کے علاوہ بھی یہ جنگل کے حق میں سب سے بڑے خطرہ ہیں۔ یہ پتیوں اور ملائم ٹہنیوں کے لیے بھوک کی شدت میں اور کچھ شرارتاً جنگل کا جنگل اُجاڑ دیتے یا روند ڈالتے ہیں۔ بڑے اور اونچے درختوں پر ان کا بس نہیں چلتا، ان کو جنگل کا ٹھیکہ لینے والا آدمی کاٹ گراتا ہے۔ اور اُن کی موٹی موٹی سِلیوں کو یہی بدّھو ہاتھی اپنی سونڈوں میں لٹکا کر جنگل سے باہر ندیوں میں ڈال آتے ہیں جہاں سے بہہ کر یہ دُور دراز چلی جاتی ہیں۔ جنگل میں کرین (جرِّ ثقیل بوجھ اُٹھانے والی مشین) یہ کام انجام نہیں دے سکتی، اس لیے ہاتھی ہی سے یہ کام لیا جا سکتا ہے۔"

کلیلہ: "کرین کیا ہے؟"

گیدڑ بولا: "یہ لوہے کا ایک آلہ ہے جو بھاری بھاری بوجھوں کو اٹھا کر نیچے سے اوپر لے جاتا ہے۔ اور پھر جھک کر جہاں گرانا ہو گرا دیتا ہے۔ کسی دن رات کو لے چل کر جہاں جہاز سے مال اُترتا ہے تم کو یہ مشین دکھا دیں گے۔"

دمنہ: "لوہا اور جہاز، یہ کیا ہیں؟"

لومڑی: لوہا، سونا، چاندی، تانبا، پیتل کی طرح پتھر میں ملی ایک دھات ہے۔ اگرچہ تمام دھاتوں میں راجا اور سب سے زیادہ قیمتی دھات سونا ہی ہے۔ لیکن سونا صرف زیورات اور سکّوں کے لیے کام آتے ہیں۔ مگر لوہے کی ضرورت انسان کو ہر قدم پر پڑتی ہے اور تمام ضروری مشینریاں لوہے ہی سے بنتی ہیں۔ ریل، ہوائی جہاز، پانی کا جہاز، یہ سب اسی لوہے کی بدولت ہیں۔

ہاں! ہاتھی کی بات تو میں نے سنا دی۔ اب شیر کی بھی سنو، شیر کا بچہ بھی کم زوروں پر ہی تیز رہتا ہے۔ انسانوں سے یہ بھی گھبراتا ہے۔ انسان اس کو اپنی گولیوں سے مار کر اس کا چمڑا طرح طرح سے کام میں لاتا ہے۔ پھندا اور جال لگا کر اس کو زندہ پھانس لیتا ہے اور یہ چوہوں کی طرح پھنس کر بے بس ہو جاتا ہے۔

جنگل میں تو یہ بڑا اٹرلونگ مچاتا ہے۔ یہ اور اس کے خاندان کے چھٹ بھیّا، تیندوے چیتے اور ان کے اچھوت غلام بھیڑیے اور لکڑ بگھے یہ سب کے سب گوشت کھانے والے جانور ہیں۔ انتہائی مکّار اور چالاک بھی ہیں، کبھی کبھی شیر بھی اپنی بہادری سے زیادہ چوری اور مکاری سے کام لیتا ہے۔ لیکن اُس کی دھاک ایسی بیٹھی ہوئی ہے کہ اس کی آواز سے درخت کے پتّے بھی کانپتے ہیں۔ یہ نہ دانہ کھاتا ہے نہ گھاس اس حرام خور کی غذا صرف گوشت ہے۔

یہ جنگل جھاڑیوں کا دشمن نہیں ہے مگر جنگلی جانوروں کا دشمن ہے۔ بڑے جانوروں، ہاتھی، گینڈے، بھالو اور ارنا بھینسے سے جلدی نہیں اُلجھتا کیونکہ اگر یہ ہاتھی کی سونڈ کی پکڑ میں آجائے تو ہاتھی اس کو ہلکی پھلکی گیند کی طرح بہت دور پھینک دے گا یا پاؤں کے نیچے چیونٹی کی طرح مسل ڈالے گا یا پتھر پر دے مارے گا۔ لیکن

گر یہ سونڈ سے بچ کر کن پٹی پر حملہ کرے تو کان اور گردن کی کھال اُدھیڑ ڈالے۔ شیر جنگلی سؤر سے بھی گھبراتا ہے۔ گینڈے کی سخت کھال پر شیر کے دانت اور پنجے اپنا صحیح کام نہیں کر پاتے اور گینڈا شیر کے پیٹ میں اپنا سر ڈال کر اپنے سینگ سے پیٹ پھاڑ ڈالتا ہے۔ سؤر بھی اپنے باہر نکلے ہوئے دانت سے کاری وار کرتا ہے۔ جسمانی طاقت میں تھوڑا کم ہے۔ مگر ضدی اور سر پھرا بہت ہے۔ اگر کوئی اس کو چھیڑ دے تو پھر مقابلے سے پیچھے ہٹ نہیں سکتا۔ یا تو جان لے لے گا یا جان دے دے گا۔

بھالو اپنے بالوں کی کثرت، تیز پکڑ اور ہاتھ پاؤں کے بہوتر نوکیلے ناخنوں کی وجہ سے آسان لقمہ نہیں۔ ارنا بھینسا خونی ہوتا ہے اور حد درجہ غصہ ور اور جنونی۔ جانور تو بیر جانور ہیں، اگر جنون میں آجائے تو اپنے مضبوط سینگ اور سر کی خوفناک ٹکر سے بڑے بڑے درختوں کی دھجیاں اڑا ڈالتا ہے۔

شیر اژدہے سے بھی بے حد ڈرتا ہے۔ یہ درخت میں اپنی دُم لپیٹ کر بجلی کی طرح ٹوٹتا ہے اور آنکھ جھپکتے اس طرح لپیٹ لیتا ہے کہ ساری طاقت دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور اژدہا اس کی ہڈی پسلی چور کر کے نگل جاتا ہے۔"

کلیلا اور دمنہ: "آپ نے بتایا تھا کہ آدمی "پھندا" اور جال لگا کر شکار کو پھانس لیتا ہے۔ یہ "پھندا" کیا چیز ہے؟ اور جال کیسا ہوتا ہے؟"

لومڑی مسکرانے لگی اور گیدڑ راجا نے بہت خوش ہو کر کہا۔

"شاباش! خوب تم لوگوں نے اس بات کو یاد رکھا۔ اگر اسی طرح تم لوگ دھیان سے باتیں سنتے رہے اور حالات کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ آپس میں مل جل کر اور آپس میں مخلص دوست بن کر رہے تو ہر خطرے سے تم لوگ محفوظ رہو گے۔ کیا تم نے ایک چوہے اور شیر کی دوستی کا قصہ سنا ہے۔؟"

دونوں نے کہا "نہیں!"

(باقی آئندہ)
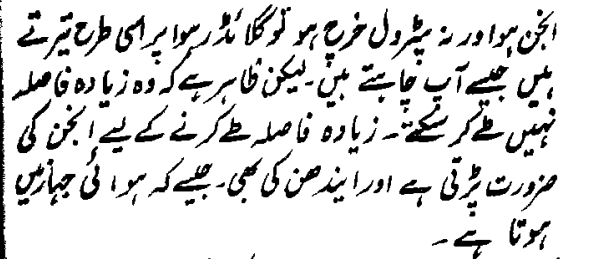
س: کھانا کھانے کے بعد غنودگی کیوں طاری ہوتی ہے؟

محمد فہیم حاجی عبداللہ

ج: کھانا کھاتے ہی ہاضمے کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور تبخیر کا بھی، یعنی کچھ گیس دماغ کی طرف رجوع ہوتی ہے اور دماغ سست پڑ جاتا ہے تو غنودگی طاری ہوتی ہے۔

س: ہم سائیکل وغیرہ کو آگے کی طرف تو توازن (بیلنس) کر لیتے ہیں۔ لیکن پیچھے کی طرف نہیں کر سکتے۔ کیوں؟

ج۔ یہ بات بالکل اسی طرح ہے۔ جیسے ہم آگے کے بجائے پیچھے کی طرف اُلٹے چلیں۔ ایسا کرنے میں ہمیں دقت محسوس ہوتی ہے۔ کیوں کہ اوّل تو ہماری پشت پر کوئی آنکھ نہیں ہوتی اور پیچھے کی طرف دیکھنے کے لیے ہمیں مڑنا پڑتا ہے دوسرے ہم شروع سے آگے کی طرف چلنے کے عادی ہوتے ہیں۔ پیچھے کی جانب نہیں۔ یہی دقت ہمیں سائیکل یا کار پیچھے کی طرف چلانے میں محسوس ہوتی ہے۔

س: کیا اُڑنے والے سانپ پائے جاتے ہیں؟

شاہ جہاں

ج: سانپوں کے پر تو نہیں ہوتے لیکن ان میں سے بعض چھوٹے ہلکے اور پتلے ہونے کی وجہ سے اتنے پھرتیلے ہوتے ہیں کہ وہ جست لگاتے ہیں۔ اس لیے وہ اُڑنے والے سانپ مشہور ہو گئے۔

س: کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم کوئی ایسی چیز بنالیں جو ہوا کے اوپر تیر سکے۔ جیسے بحری جہاز پانی پر تیرتے ہیں۔؟

نامعلوم

ج: اگر آپ کی مراد کسی ایسے طیارے سے ہے جس میں نہ کوئی انجن ہو اور نہ پیٹرول خرچ ہو تو گلائیڈر ہوا پر اسی طرح تیرتے ہیں جیسے آپ چاہتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ زیادہ فاصلہ نہیں طے کر سکتے۔ زیادہ فاصلہ طے کرنے کے لیے انجن کی ضرورت پڑتی ہے اور ایندھن کی بھی۔ جیسے کہ ہوائی جہاز میں ہوتا ہے۔

س: کیا انسان نے مصنوعی کان ابھی تک نہیں بنایا جیسے دوسرے انسانی اعضا بنا لیے ہیں۔

حبیب اللہ

ج: مصنوعی کان بن چکا ہے جسے اونچا سننے والے افراد استعمال کرتے ہیں۔ وہ بیٹری سے چلتا ہے اور سننے میں مدد دیتا ہے

س: اُڑتے ہوئے جیٹ طیارے ہمیں نظر نہیں آتے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ایم۔ اکبر آرزو

ج: اس لیے کہ جیٹ طیارے زیادہ اونچائی پر بہت تیز رفتار کے ساتھ اُڑتے ہیں۔

س: ہوائی جہاز کس طرح اُڑتا ہے؟ جب ہوائی جہاز فضا میں اُڑ رہا ہوتا ہے تو زمین کی کشش اسے اپنی طرف کیوں نہیں کھینچتی؟

طاہر احمد

ج: ہوائی جہاز ہوا میں اور جیٹ خلا میں اسی طرح اُڑتے ہیں جیسے ہم پانی کو پیچھے دھکیل کر پانی پر تیرتے ہیں۔ اسی لیے ہوائی جہاز میں تیزی سے آگے بڑھنے کے لیے نہایت قوی انجن استعمال کیے جاتے ہیں فضا میں توازن قائم رکھنے کے لیے بازو لگے ہوتے ہیں۔ راستہ تبدیل کرنے کے لیے پیچھے دُم پر پتوار کی شکل کا ایک پُرزہ لگا ہوتا ہے۔ جیٹ میں گیس کی دھار تیزی سے پیچھے سے نکلتی ہے تو وہ ردِّ عمل کے طور پر آگے بڑھتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ زمین کی کشش ہوائی جہاز کو نیچے کیوں نہیں گرا لیتی تو اس کا جواب یہ ہے کہ جہاز کو آگے بڑھانے والی قوت زمین کی کشش کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے وہ آگے جاتا ہے نیچے نہیں گرتا۔

محمد ابراہیم کمال

ج: رنگ کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ جسم صرف اس رنگ کی شعاعیں واپس کر رہا ہے۔ آسمان نیلا نظر آتا ہے یعنی صرف نیلے رنگ کی شعاعیں واپس آرہی ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ سفید رنگ کی شعاعوں میں سات رنگ شامل ہوتے ہیں۔ بنفشی، کاہی، نیلا، سبز، زرد، نارنجی اور سرخ سورج سے آنے والی شعاعیں گرد کے ان بے شمار ذرات سے ٹکراتی ہیں جو ہماری زمین کے چاروں طرف لپٹی ہوئی ہوا میں بھرے رہتے ہیں۔ ان ذرّوں سے ٹکرا کر یہ شعاعیں سات رنگوں میں بکھر جاتی ہیں۔ باقی رنگ تو اوپر واپس چلے جاتے ہیں۔ صرف نیلے رنگ کی شعاعیں مڑکر نیچے آجاتی ہیں اور ہماری آنکھوں میں داخل ہو کر ہمیں یہ احساس دلاتی ہیں کہ ہم اپنے سروں پر ایک نیلی چادر تنی دیکھ رہے ہیں۔ جسے ہم آسمان کہتے ہیں۔ آسمان کوئی ٹھوس گنبد نہیں ہے بلکہ ان شعاعوں واپس ہونے کی حد ہے۔

س: پانی کے گلاس میں پڑا ہوا سیدھا چمچہ ٹیڑھا کیوں نظر آتا ہے؟ نیز شفاف پانی کا دریا یا تالاب بظاہر کم گہرا کیوں معلوم ہوتا ہے؟

ج: آپ دراصل انعطاف کا ایک قانون دریافت کر رہے ہیں۔ جو علم طبیعیات میں روشنی کے باب میں پڑھایا جاتا ہے اور وہ قانون یہ ہے کہ روشنی جب ایک واسطے سے نکل کر دوسرے واسطے میں داخل ہوتی ہے تو وہ اپنے اصل راستے سے ہٹ جاتی ہے یا مڑ جاتی ہے۔ شفاف پانی میں پڑا ہوا چمچہ یا چھری یا جھیل کی تہہ ان سب سے روشنی ٹکرا کر پانی کو چیرتی ہوئی جب ہوا میں داخل ہوتی ہیں تو ہماری آنکھوں تک سیدھی نہیں آتیں بلکہ خم کھا کر آتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم چمچے کو اس جگہ نہیں دیکھتے جہاں وہ واقعی ہے بلکہ تھوڑا سا اپنی جگہ سے ہٹا ہوا دیکھتے ہیں اس لیے وہ ٹیڑھا نظر آتا ہے۔ یہی صورت شفاف جھیل کی تہہ کی ہے۔

س: سنا ہے مشینی انسان بننے لگے ہیں۔ براہ کرم بتایئے یہ کس طرح کام کرتے ہیں اور ان کا موجد کون ہے؟

ج: جی ہاں، مشینی انسان اب طرح طرح کے بننے لگے ہیں۔ اور یہ سب کچھ الیکٹرانکس کی برکت ہے۔ اب مشینی دماغ بہت سے ایسے کام کر رہے ہیں جو زندہ انسان نہیں کر سکتے۔ وہ ایک سگنل موصول کرتے ہی اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ کمپیوٹر بھی ایسی ہی ایک مشین ہے جو ایسے مسائل اتنی جلدی حل کر سکتی ہے کہ جو زندہ انسان نہیں کر سکتا اس میں آپ کسی بھی قسم کی معلومات محفوظ کر سکتے ہیں اور وہ نہایت تیزی سے ضرورت پڑنے پر یہ معلومات کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پیش کر دیتا ہے۔

س: ذرا تفصیل سے بتائیں کہ ہم ذائقہ کیسے محسوس کرتے ہیں؟

ج: ذائقے کا تعلق ہماری زبان اور صحیح دماغ سے ہے۔ کیوں کہ دماغ میں جملہ حواسوں کے لیے الگ الگ مرکز ہیں اور زبان پر ایسے نقطے ہوتے ہیں جو مختلف ذائقوں سے الگ الگ متاثر ہوتے ہیں۔ یہ احساس باریک رگوں، ریشوں کے ذریعے سے ہمارے دماغ تک پہنچتا ہے اور ہم سمجھ جاتے ہیں کہ ہم کوئی میٹھی چیز کھا رہے ہیں یا نمکین۔

عرفان علی

اینس تھیٹک

بے ہوش کرنے والی دوا

اینس تھیٹک بے ہوش کرنے والی دوا کو کہتے ہیں۔ اُس کی ضرورت اُس وقت پڑتی ہے جب کہ کسی مریض کا آپریشن کرنے سے پہلے اُسے بے ہوش کرنا ہوتا ہے۔ کیوں کہ بغیر بے ہوش کیے ہوئے آپریشن کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس وقت جب کہ Anesthatic Medicines کی ایجاد نہیں ہوئی تھی سرجری کے میدان میں ایک بہت خلاء محسوس کیا جا رہا تھا۔ ڈاکٹروں کو آپریشن کرنے میں بے حد دشواریاں اور مریض کو بے پناہ تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا مگر اس کے باوجود صحیح طور پر آپریشن کر سکنا ممکن نہ ہو پاتا تھا۔

چنانچہ اس وقت آپریشن کرنے سے قبل مریض کو بے ہوش کرنے کے لیے مختلف طریقے استعمال کیے جاتے تھے جو سائنس کی ترقی کے ساتھ بدلتے گئے۔ اُس زمانے میں بے ہوش کرنے کے لیے مریض کے جسم سے اس قدر خون نکال لیا جاتا تھا کہ وہ کم زور ہو جائے اور آپریشن کے وقت بہ سبب کم زوری اُسے درد کا احساس کم ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ مریض میں برداشت کرنے کی قوت ختم ہو جاتی تھی اور وہ ہلاک ہو جاتا تھا۔ اکثر مریض کے سر پر کسی بھاری چیز سے ایسی چوٹ لگائی جاتی تھی کہ وہ ضرب سے بے ہوش ہو جاتا تھا اور تب ڈاکٹر آپریشن کرتے تھے۔ مگر یہ طریقہ بھی محفوظ اور زیادہ مفید نہ تھا۔ اکثر اوقات ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ دوران آپریشن ہی مریض ہوش میں آ جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں ایک ڈر یہ بھی تھا کہ اگر سر پر زیادہ زور میں چوٹ لگ جاتی تھی تو پھر مریض کا بچنا مشتبہ ہو جاتا تھا۔

اُس وقت صرف اہل چین ہی کچھ ایسے طریقوں سے واقف تھے جن سے آپریشن کرنے میں سہولت ہوتی تھی۔ وہ آپریشن سے پہلے ایسی خواب آور دواؤں کا استعمال کراتے تھے، جن سے مریض نیم بے ہوشی کی حالت میں ہو جاتا تھا اور اس بیچ ڈاکٹر اپنا کام تمام کر چکے ہوتے تھے۔ مگر یہ طریقہ بھی غیر محفوظ تھا کیوں کہ اس میں سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ اگر مریض کو دوا کم مقدار میں استعمال کرا دی جاتی تھی تو اُس کا اثر کم ہوتا تھا اور آپریشن مکمل ہونے سے قبل مریض ہوش میں آ جاتا تھا اور اگر دوا زیادہ مقدار میں استعمال کرا دی جاتی تھی تو مریض ایسا بے ہوش ہوتا تھا کہ پھر اُسے کبھی ہوش نہ آتا تھا۔ اس لیے یہ تمام طریقے جو آپریشن کے قبل بے ہوش کرنے کے لیے رائج تھے وہ بے کار ثابت ہوئے۔

لہٰذا اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے ۱۷۷۲ء میں Joseph Priestely نے ایک ایسی گیس کی ایجاد کی جس کے متعلق ۳۰ سال بعد Humper Davy نے بہ غور مشاہدہ کر کے اُسے Laughing گیس کا نام دیا اور یہ بھی بتایا کہ یہ گیس آپریشن سے قبل استعمال کرائی جا سکتی ہے جس سے درد میں کمی محسوس ہو گی۔ لیکن اُس وقت اس پر کسی نے توجہ نہ دی۔ جب امریکہ والوں کو اس گیس کا علم ہوا تو انھوں نے اس گیس کو محض تفریح کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا۔ خصوصاً پارٹی وغیرہ میں لوگ اس گیس کا استعمال کر کے نشے کی حالت میں ہو جاتے تھے اور خوب ہنسی مذاق کرتے تھے۔ لیکن کسی نے اس گیس کے بارے میں کوئی مزید معلومات حاصل نہ کی۔ کافی عرصے بعد ویلز نامی ایک شخص پارٹی میں موجود ہنستے ہوئے ایک شخص کو بہ غور دیکھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ جب اس گیس کا استعمال کر لیتے ہیں تو پھر انھیں کسی قسم کے درد کا احساس نہیں ہوتا۔ چنانچہ اُس نے اس گیس کا تجربہ خود اپنے اوپر اس طرح سے کیا کہ خود Laughing gass سونگھے اور اُس کے ایک دوست نے اُس کے دانت اُکھاڑ

سرائے الہ آباد ۱۲

دیے لیکن اُسے کسی قسم کے درد کا احساس نہ ہوا جب کہ اُس کے دانت کافی مضبوط تھے۔ اب اس گیس کا استعمال صرف اُس وقت ہونے لگا جب کہ کسی مریض کا دانت اُکھاڑنا ہوتا تھا۔ علاوہ اس کے اور کسی آپریشن سے قبل اس کا استعمال نہ ہوتا تھا۔ لیکن ۱۸۴۵ء میں ویلز نے یہ طریقہ دوسرے لوگوں کو بتایا، مگر اُس وقت اُسے سخت ناکامی ہوئی جب اُس نے اس گیس کا استعمال کم مقدار میں کراکے اُس مریض کے دانت اُکھاڑنے چاہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مریض درد کی شدت سے بے تاب ہو گیا۔ لوگوں نے جب یہ دیکھا تو ویلز کا مذاق اُڑایا مگر ویلز ہمت نہ ہارا۔ اُس نے دوسری بار اس گیس کا استعمال زیادہ مقدار میں کراکے ایک مریض کا دانت اُکھاڑ دیا جس سے مریض ہنستے ہنستے مر گیا۔ اور ویلز ان دونوں واقعات سے بے حد مایوس ہو گیا اور اپنی سخت ناکامی کے سبب خودکشی کر لی۔ اس طرح Laughing gass کے بھی خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے تو دوسری گیسوں کی تلاش شروع ہوئی جنھیں بطور اینستھیٹک استعمال کرایا جاسکے۔ اس لیے برابر تجربات ہوتے رہے اور اس میدان میں کامیابی Y.G. Simpson کو ملی جو ڈاکٹر بننے کے لیے ایڈن برگ میں جاکر تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس زمانے میں لندن میں ...rt Liston ایک شخص نے ایتھر کو بطور اینستھیٹک استعمال کیا اور بے حد کامیاب رہا۔ جب یہ خبر Simpson کو ملی تو اُس نے لندن جاکر ایتھر حاصل کیا اور سیدھا ایڈن برگ پہنچا تاکہ اس کو حاصل کرکے اُس کا تجربہ کر سکے۔ لیکن بعد میں تجربہ کرنے پر Simpson کو ایتھر کے بُرے اثرات کی واقفیت ہوئی۔ کیوں کہ ایتھر کے استعمال سے آپریشن کے بعد مریض پر اُس کے بُرے اثرات پڑتے تھے۔ چنانچہ Simpson نے مایوس ہو کر دوسری گیسوں کی تلاش شروع کی۔ تقریباً ایک سال تک لگاتار تجربہ کرنے کے بعد Simpson اور اُس کے دوستوں نے بہترین اینستھیٹک کی ایجاد کر لی جو آج بھی رائج ہے۔ اس اینستھیٹک کا تجربہ خود Simpson نے اپنے اُوپر کیا کہ اُس کا استعمال کرنے کے بعد وہ میز پر لڑھک گیا۔ اور جب وہ ہوش میں آیا تو اُسے اس بات کا احساس ہو گیا کہ یہ سب سے بہترین اینستھیٹک ہے۔ اور یہ اینستھیٹک کلوروفارم گیس کہلائی جو آج بھی رائج ہے۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو الٰہ آباد)

کھیل

سطوت رسول

صبح کا سورج ہوا طلوع
کٹھ پتلی کا کھیل شروع
گھر سے نکلی رُوپ بھرے
ایک نیا بہروپ بھرے
ہاتھوں میں کچھ پھول لیے
آنچل میں کچھ دھول لیے
ہونٹوں پر مُسکان لیے
بچوں کا طوفان لیے
چھوڑے تیر کمان سے وہ
آتی ہے کس شان سے وہ
غبّاروں میں رنگ بھرے
سب سے اکڑے جنگ کرے
بچوں کے سنگ کھیل کرے
پل میں روٹھے میل کرے
بچو بچو شاد رہو
خوشیوں سے آباد رہو

مشہور و معروف ڈراما نگار برنارڈ شا نے اپنے ایک ڈرامے کے پہلے شو کے دو ٹکٹ چرچل کو بھیجے اور ساتھ ایک خط بھی۔
خط میں تحریر فرمایا تھا کہ ان میں سے ایک ٹکٹ آپ کے لیے ور دوسرا آپ کے دوست کے لیے اگر آپ کا کوئی دوست ہو تو ؛
چرچل نے جواباً تحریر فرمایا
آپ کے ڈرامے کے پہلے شو میں تو نہ آسکوں گا دوسرے شو کے ٹکٹ بھیج دیجیے۔ حقیقت میں اگر دوسرا شو ہونے والا ہو تو!

تمھارے بال اتنی جلد کیوں کر سفید ہوئے ؟
فکر سے
کس فکر ؟
بال کالے کس طرح رہیں گے۔ یہی فکر

(نوگل بھارتی)

ہیڈ کلرک : کیا موت کے بعد یا آخرت کی زندگی پر تمھارا عقیدہ ہے۔
کلرک : جی ہاں کیوں نہیں۔
ہیڈ کلرک : پھر تو سب کچھ ٹھیک ہے کل تم نے اپنے دادا میاں کے جنازے میں شریک ہونے کے لیے چھٹی لی تھی اور تمھارے جانے کے کچھ دیر بعد وہ خود تمھیں دیکھنے دفتر میں آئے تھے

قلمی دوستی

نام: ایس، ایم، شاہد
مشغلہ: پیام تعلیم کا مطالعہ کرنا۔ بھائیوں اور بہنو
کے خطوط کا جواب دینا۔
پتا: سمیل گرام کوارٹر $\frac{12}{1}$ c کلٹی بردوان۔ مغربی بنگا

نام: محمد اقبال حسین عمر ۱۵ سا
شوق: بزرگوں کی تعظیم کرنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ کہانیا
پتا: ولد محمد علی حسین۔ محلہ بتیانہ، ڈاکخانہ کلٹی، ضلع بردوان (مغربی بنگال)، پن کوڈ

نام: سلمہ خان عمر ۱۶ سا
مشغلہ: نماز پڑھنا۔ بڑوں کا احترام کرنا۔
پتا: ۱۵۷ ٹیمکر اسٹریٹ منزل نمبر ۲ روم نمبر ۹ ممبئی

نام رضوانہ خاں عمر ۱۶
شوق: نماز پڑھنا۔ بڑوں کی باتیں سننا۔ بہن بھائی
سے خط و کتابت کرنا۔
پتا: ۵۵، ٹیمکر اسٹریٹ تیسرا منزلہ روم ۱۵، ۱۶ ممبئی ۸

نام: سہیل عزیز عمر ۲۰
شوق: اچھی کہانیوں کا مطالعہ کرنا، دوستی کرن
پتا: ایم۔ اے۔ اینڈ سنز، ٹیلہ، اوپر کوٹ، علی گ

نام: غانم بن حیرت عمر ۱۹
شوق: نماز پڑھنا۔ نعتیں سننا اور سنانا
پتا: کوچہ واحد علی، دہلی گیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

مئی کا پیام تعلیم، موصول ہوا۔ سبھی مضامیں ایک سے بڑھ کر ایک رہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ سر ورق زیادہ سے زیادہ پندرہ سال تک کے بچوں کی تصویریں دیا کریں اور (INDEX) میں بچوں کی کوششیں، میں شائع ہونے والی کہانیوں کے نام بھی دیا کریں۔

پیام تعلیم، خوب ترقی کرے۔ یہی دعا ہے۔

• شگفتہ بنت ھز۔ الہ آباد۔

مجھے (مجھے) اُردو زبان سیکھنے (سیکھنے) کی خوش قسمتی ابھی حال ہی میں حاصل ہوئی ہے۔ میں اس زبان کو بہت پسند کرتا ہوں میں چاہتا ہوں کہ کسی میگزین (میگزین) کو شروع کروں۔ آپ کا پیام تعلیم مناصب (مناسب) معلوم ہوتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ مجھے (مجھے) پیام تعلیم کی ایک کاپی حاصل کرانے (دلوانے) کی مہربانی (مہربانی) کرے۔

• کے۔ ایل مدھوک،

گرودوارہ روڈ قرول باغ نئی دہلی ۵

"پیام تعلیم" کے گزشتہ ۲ ماہ کے مشاعرے "سبزیوں کا مشاعرہ" "درپھلوں کا مشاعرہ" قارئین حلقوں میں ہل چل مچا دیے ہیں۔ اس میں ترکاریوں اور میووں کی شکل و صورت، رنگ و روپ، ذائقے اور غذائی افادیت، موجودہ دور کے سائنسدانوں کی روسے اس میں پائے جانے والے وٹامن پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی۔

ہم اڈیٹر صاحب کے ممنون و مشکور ہیں کہ آپ نے ایسے دلچسپ مضامین سے "پیام تعلیم" کی کایا ہی پلٹ دی ہے۔

• خلیل الرحمن ویلور ۶۳۲۰۱۲

ماہ جون ۱۹۸۲ء کا پیام تعلیم دستیاب ہوا پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ سبھی کہانیاں پسند آئیں۔ مظفر حنفی، ریاض آفندی، آصفہ مجیب، محمود احمد دلکش، مسعود ظہیر نقوی، وغیرہ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ننھے فنکار میں شکیل احمد قریشی کا بنایا ہوا ڈیزائن کافی پسند آیا۔

• عبد المطلب، محمد مسلم

بی۔ایم۔سی چال نمبرا روم نمبر ۹۶ ایس ایس روڈ بمبئی ۱۱

جون ۱۹۸۲ء کا پیام تعلیم نظر نواز ہوا۔ مظفر حنفی صاحب کی نظم بچوں کا ترانہ، پڑھ کر کافی مسرت ہوئی ہمدرد انسائیکلو پیڈیا کا سلسلہ کافی معلوماتی ہے۔ سفید گھوڑا، سر سید احمد خاں، مولانا محمد علی جوہر، بڑوں کا بچپن، معلوماتی مضامین بہت اچھے لگے۔

• محمد سلیم۔ انجمن خیر الاسلام اُردو ہائی اسکول تھانہ ۴۰۰۶۰۱

پیام تعلیم کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ ہم دونوں سہیلیوں کو یہ پرچہ اتنا اچھا لگا کہ ہم لوگ اسکول کی کتابیں چھوڑ کر اسے پڑھنے بیٹھ گئے۔

کچھ مضامین ہماری سمجھ سے باہر ہیں پھر بھی اچھے ہیں۔

• ہاجرہ نازلی۔ افسانہ بیگم

اقبال میموریل اُردو پرائمری اسکول

آزاد نگر کلٹی، بردوان (بنگال)

اِدھر اُدھر سے

ٹائپ کرنے والا کتا: لندن ۲۸ رمئی ساؤتھ ویلز کی ایک ٹائپسٹ خاتون ایلز بتھ کے پاس آرمی نامی ایک کتا ہے جو بآسانی ٹائپ کر لیتا ہے۔ ایلز بتھ کاغذ پر چند فقرے لکھ کر کتے کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ کتا الفاظ کو دیکھ کر دونوں پانو سے ٹائپ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ (بھارتی)

بولنے والی گھڑی: مدراس، ۲۷ رمئی سیونج کی ایک فرم نے دنیا میں گھڑیوں کی تکنیک میں ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ مذکورہ فرم نے ایک ایسی کلائی گھڑی تیار کی ہے جسے بولتی گھڑی کہا جا سکتا ہے۔ یہ گھڑی وقت بتانے کے ساتھ ساتھ موسیقی سناتی ہے اور گھڑی پہننے والے کو اس کے کاموں کو یہ کہہ کر یاد دلاتی ہیں۔ اٹھو جلدی کرو۔ مذکورہ فرم نے ابھی یہ نہیں بتایا ہے کہ اس گھڑی کی قیمت کیا ہوگی اور بازار میں کب تک آئے گی۔

بچوں کے پینٹنگ کے مقابلے

نئی دہلی ۲۰ رمئی چاندنی چوک چلڈرن کلب کے زیر اہتمام پانچ سے سولہ سال کے بچوں کے گروپ کے لیے پینٹنگ کے مقابلہ میں آج ۷۵ بچوں نے حصہ لیا۔ بچوں کو تین زمروں میں بانٹا گیا تھا۔ پانچ سے ۱۰ سال تک ۱۰ سے ۱۲ سال تک اور ۱۳ سے ۱۶ سال۔ جیتنے والوں کو یکم جون کو انعامات دیے جائیں گے۔

بمعرفت مکتبہ جامعہ لمیٹڈ بمبئی ۳

جاپان کے چار سو کھلاڑی: ٹوکیو ۲۶ رمئی (پ) جاپان اولمپک کمیٹی نے آج اعلان کیا کہ وہ نئی دہلی میں ہونے والے ایشیائی کھیلوں میں حصہ لینے کے لیے اپنے ۴۲۲ ممبروں پر مشتمل وفد بھیجے گا۔ اس میں ۸۷ کوچ اور افسران شامل ہوں گے۔ منتخبہ جاپانی کھلاڑی مردوں اور عورتوں کے تمام ۲۱ کھیلوں میں حصہ لیں گے۔ جاپانیوں کو امید ہے کہ وہ نئی دہلی میں سب سے زیادہ میڈل حاصل کریں گے۔ ۱۹۷۸ء بنکاک میں جو آٹھویں ایشیائی کھیل ہوئے تھے ان میں جاپان نے ستر سونے کے ۶۰ چاندی کے ۴۷ کانسے کے میڈل حاصل کیے تھے جبکہ چین نے مجموعی طور پر ۱۵۲ میڈل حاصل کیے تھے۔ (جن میں کہ ۵۱ سونے کے تمغے شامل تھے۔)

سینئر اسکول سرٹیفکٹ امتحان

نئی دہلی ۲۸ رمئی آل انڈیا سینئر اسکول سرٹیفکیٹ اگزامینیشن کے جن نتائج کا آج اعلان کیا گیا ہے ان میں میرٹ کے لحاظ سے کیندریہ ودیالیہ ٹیگور گارڈن کے طالب علم آر۔ پرمنا بھاراؤ اول رہے ہیں۔ انھوں نے ۹۴،۵ فیصد نمبر حاصل کیے اور سائنس گروپ میں سب سے اونچی پوزیشن پر رہے۔ انگریزی، ریاضی، کیمسٹری، بائیولوجی اور فزکس میں انھوں نے ۷۵ فیصد یا اس سے زیادہ نمبر لیے۔ دہلی پبلک اسکول سیکٹر XII آر۔ کے۔ پورم۔ چارو آہوجہ نے ہیومینیٹیز گروپ میں ۳۴۵ نمبر حاصل کر کے اول پوزیشن حاصل کی۔

الفاظ سے ٹائپ کرنے کی مشین

نیویارک ۲۲ رمئی (بھارتی) امریکہ نے ایک ایسا ٹائپ رائٹر ایجاد کیا ہے جو الفاظ کو سن کر ٹائپ کر دیتا ہے اس میں جو کمپیوٹر لگا ہے وہ اس کو برقی لہروں میں تبدیل کر دیتا ہے اور لہریں حروف کو ٹائپ کر دیتی ہیں۔

کفایت شعاری

آصف بی اے فرسٹ ڈویژن پاس تھا۔ مالی دشواریوں کے سبب اسے اپنی تعلیم کو خیرآباد کہنا پڑا۔ ہمارے ملک میں ہزاروں ایسے بہترین طالب علم ہیں جو مالی مشکلات کے پیش نظر آگے نہیں پڑھ پاتے اور ڈگریاں لے کر نوکری کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ وہی حال آصف کا ہوا۔ اسے بھی نوکری کی تلاش میں در در خاک چھاننی پڑی۔ مگر سب بے سود! اُسے کہیں بھی نوکری نہ مل سکی۔

ایک دن اس نے اخبار میں اشتہار دیکھا، ایک پن کے کارخانے میں سپروائزر کی ضرورت ہے۔ آصف کو امید کی ہلکی سی کرن نظر آئی، وہ فوراً اس فیکٹری میں پہنچا۔ منیجر سے ملا تو معلوم ہوا کہ وہ نوکری کسی کو دے دی گئی ہے۔ اپنی قسمت کو روتا ہوا جیسے ہی وہ منیجر کے آفس سے باہر نکلا اسے فرش پر ایک چیز چمکتی دکھائی دی آصف نے اُسے اٹھالیا وہ ایک پن تھی جو شائد کاریگروں کی لاپرواہی کے سبب وہاں پڑی تھی آصف وہ پن لے کر واپس منیجر کے آفس میں گیا آصف نے وہ پن پن کُشن میں لگادی اور جیسے ہی وہ واپس ہوا منیجر نے اسے بلایا اور پوچھا "یہ کیا حرکت تھی؟"

"سر ایک پن باہر پڑی تھی میں نے سوچا کہ باہر پڑے رہنے سے یہ پن ضائع ہو گی اس لیے اسے پن کشن میں لگا دیا ہے۔" منیجر آصف کی اس کفایت شعاری پر خوش ہوا اور سپروائزر کی نوکری آصف کو دے دی۔

• شاہد سیّد
محمدیہ ہائی اسکول ممبئی ۳

ٹوٹے ہاتھوں کا طمانچہ

شہزاد ایک مصور تھا۔ اس کی مصوری کی دھوم دور دراز کے علاقوں میں مچی ہوئی تھی ان تصویروں کو دیکھتے ہی زبان واہ واہ کہہ اٹھتی تھی۔ اس ملک میں ایک ظالم بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس ظالم بادشاہ نے ایک تقریب منعقد کی۔ جس میں ہر مصور کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کی کھلی آزادی دی گئی تھی۔ شہزاد بھی ہفتوں کی جان توڑ کوششوں کے بعد آج ایک بے حد خوب صورت تصویر بنانے میں کامیاب ہوگیا تھا اسے پورا یقین تھا کہ آج انعام اسے ضرور ملے گا۔

اس تقریب کا اہتمام ایک بڑے میدان میں کیا گیا تھا۔ دن کا دوسرا پہر ڈھلتے ہی لوگوں کی بھیڑ اس طرف جا رہی تھی۔ کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں تصویریں تھیں۔ جو انھیں بڑی احتیاط سے چھپا کر لے جا رہے تھے۔ اور کچھ لوگ خالی ہاتھ تھے جو

تماشائی تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ ہی دیر میں شہر کی آدھی آبادی اس میدان میں آ گئی۔ ہر مصور کی نگاہیں بادشاہ کی منتظر تھیں۔ کچھ دور سے اس کی بگھی آتی دکھائی دی۔ "بادشاہ سلامت زندہ باد" کے نعرے بلند ہوئے۔ بگھی سے اتر کر میدان کے بیچوں بیچ میں ایک عالی شان تخت پر بادشاہ بیٹھ گیا۔ اس کے سپہ سالار بڑے ہی ادب سے اس کے پیچھے کھڑے تھے۔ حکم ہوا کہ ہر مصور اپنا شاہکار بادشاہ سلامت کی خدمت میں پیش کرے۔ سبھوں نے اپنی بنائی ہوئی تصویریں بادشاہ کے سامنے رکھ دیں۔ وہ باری باری سب تصویروں کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ ہر مصور کی نگاہیں بادشاہ کے چہرے پر جمی تھیں۔ ہر کوئی اپنے آپ کو انعام کا حق دار سمجھ رہا تھا۔ کسی تصویر میں بادشاہ کو شکار کھیلتے دکھایا گیا تھا تو کسی میں وہ دربار میں بیٹھے گفتگو میں مشغول تھا۔ تو کسی میں گھوڑے پر سوار ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔

بادشاہ یہ سب دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ لیکن ایک تصویر ایسی تھی۔ جسے دیکھتے ہی بادشاہ آگ بگولہ ہو گیا۔ غصہ کے عالم میں اس کے دانت کٹکٹانے لگے۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ آنکھوں سے خون ٹپک پڑے گا۔ تصویر میں بادشاہ ایک بے قصور انسان کو کوڑے لگوا رہا تھا۔ بادشاہ کی یہ حالت دیکھ کر عوام خوف سے کپکپانے لگے۔ کس گستاخ نے ایسی تصویر بنانے کی جرأت کی۔ اسے میرے سامنے پیش کیا جائے۔ بادشاہ غصہ سے گرجا۔ اس وقت ایک نوجوان شخص بھیڑ سے نکل کر آگے بڑھا۔ وہ شہزاد مصور تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا تخت کے قریب آ کر رک گیا۔ اس کے لب ہلے اور ایک مدھم آواز سی ابھری۔ جہاں پناہ یہ تصویر میں نے بنائی ہے۔ تم نے! آخر تم نے اتنی بڑی گستاخی کیوں کی؟ بادشاہ غصے سے بولا۔ میں نے کوئی گستاخی نہیں کی۔ بلکہ حقیقت کو تصویر کا جامہ پہنایا ہے۔ میں اور مصوروں کی طرح نہیں ہوں جو صرف انعام کے لالچ میں آپ کی جھوٹی تعریف کرے۔ شہزاد نے بڑے ہی ادب سے کہا۔

بادشاہ نے کہا کہ اس کی سزا تمہیں ضرور ملے گی۔ "جلاد اس کے دونوں ہاتھ کاٹ دو۔" بادشاہ نے حکم دیا۔ فضا میں ایک دل خراش چیخ بلند ہوئی اور بے چارے شہزاد کے دونوں ہاتھ تن سے الگ ہو گئے۔ اور اسے اسپتال بھیج دیا گیا۔ مجمع میں افرا تفری مچ گئی۔ لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ جا... ہفتے میں زخم ٹھیک ہوا۔ تب شہزاد اسپتال سے ڈسچارج ہوا اور اپنی قسمت کو کوستا ہوا ایک طرف چل پڑا۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ اس طرح برسوں گزر گئے۔ ان دنوں ایک بات شہر کے کونے کونے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہوئی تھی کہ شہر سے دور ایک جنگل میں ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں ایک مصور رہتا ہے۔ جس کے دونوں ہاتھ نہیں ہیں۔ لیکن وہ اپنے منہ میں برش پکڑ کر تصویریں بناتا ہے اس کی بنائی ہوئی تصویریں بڑی خوبصورت جھونپڑی میں رکھی ہوئی ہیں۔ پھر اُس ظالم بادشاہ نے ایک تقریب منعقد کی جس میں ہر مصور کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کی کھلی آزادی تھی۔ دن کا دوسرا پہر ڈھلتے ہی لوگوں کی ایک بھیڑ اس میدان میں جمع ہو گئی۔ بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھا۔ حکم ہوا۔ لوگ اپنی بنائی ہوئی تصویریں بادشاہ کے سامنے پیش کریں۔ فوراً حکم کی تعمیل ہوئی بادشاہ ان تصویروں کو باری باری دیکھنے لگا۔ اُس وقت اس کی نگاہیں ایک خوبصورت تصویر پر آکر جم گئیں۔ وہ تصویر دیکھ کر مسکرا اٹھا۔ واقعی تصویر بنانے والے نے جان توڑ محنت کی ہے۔ وہ دل ہی دل میں کہہ اٹھا۔ یہ تصویر کس نے بنائی ہے۔ اُس کو میرے سامنے پیش کیا جا...

شاہ نے قدرے خوشی کے لہجہ میں کہا۔ اس وقت
کو چیرتا ہوا ایک پریشان حال شخص باہر آیا۔ اس کے
بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں سُرخ اور سوجی ہوئی
ں۔ جیسے وہ ساری رات روتا رہا ہو۔
اس کے کندھوں سے لے کر گھٹنوں تک ایک
سیدہ چادر لٹک رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا
بادشاہ کے قریب آیا اور رُک گیا۔ اُس کے
ہلے اور ایک آواز فضا میں گونجی۔
جہاں پناہ! یہ تصویر میں نے بنائی ہے۔
خوب بہت خوب۔ مانگو کیا مانگتے ہو۔ آج تم
انگو گے وہی ملے گا۔ بادشاہ خوشی سے چلا اٹھا
شہزاد نے کہا۔ بادشاہ سلامت تم کیا دو گے
جو مانگوں گا۔ وہ تو تم نہیں دے سکتے۔ اگر اپنے
سے مانگوں تو وہ مجھ کو ضرور دے سکتا ہے۔ مگر تم نہیں
سکتے۔
بہت خوب۔ بادشاہ خوشی سے بولا۔ جو
گے وہی ملے گا۔ اس اجنبی مصور نے ایک
سے اپنے جسم پر لٹکتی ہوئی چادر زمین پر گرا
اس کی قمیص کے دونوں بازو ہوا میں جھول
تھے۔ وہ چیخا۔
بادشاہ تم مجھے کیا دو گے اگر دے سکتے ہو
میرے یہ دونوں بازو لوٹا دو۔ جو تم نے چند سال
مجھ سے چھین لیے تھے۔ اور وہ قہقہے لگاتا ہوا
میں گم ہو گیا۔ یہ اجنبی شہزاد مصور تھا۔
بادشاہ حیرت و استعجاب کا بُت بنا اس
تے کو بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ جس سے شہزاد
تھا۔ اس کے دل و دماغ میں اب بھی یہ الفاظ
گونج رہے تھے۔
بادشاہ۔ تم مجھے کیا دو گے! ہاں اگر دے
سکتے ہو تو میرے یہ دونوں بازو لوٹا دو۔ جو
برسوں پہلے مجھ سے چھین لیے تھے۔

● عبدالخالق ناگپوری C/O ڈاکٹر عبدالرحمٰن
بورگاؤں، گوڑرائے دارہ ٹیک روڈ ناگپور،
مہاراشٹر ۴۴۰۰۱۳

کرکٹ کا چوکا؟

کرکٹ کا کھیل تو بہت ہی پُرانا ہے لیکن اس کے
اُصول اتنے پُرانے نہیں ہیں۔ بہت پہلے یہ کھیل ویسے
ہی کھیلا جاتا تھا جس طرح آج کل گاؤں اور شہروں میں
لڑکے گلی ڈنڈا کھیلتے ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی تھا
جب کہ کرکٹ کے کھیل میں چوکے اور چھکے نہیں ہوتے
تھے۔ گیند کو ہٹ کرنے کے بعد بلے باز دوڑ کر ہی رن
(Run) بناتے تھے۔

۱۸۶۱ء کے اخیر کی بات کہ انگلینڈ کا ایک
سوداگر جو سونے کی کھدائی کرتا تھا، وہ اس سلسلے
میں ایک مرتبہ نیوزی لینڈ بھی گیا۔ اس کی ایک
بہن آسٹریلیا کے ایک شہر ملبورن میں رہتی تھی
جب یہ سوداگر نیوزی لینڈ میں تھا تو اسے یہ خبر ملی
کہ اس کی بہن بیمار ہے۔ فوراً ہی اس نے اپنا
سارا مال تیس پونڈ میں فروخت کر کے جہاز پر
سوار ہو کر آسٹریلیا کے لیے روانہ ہو گیا۔
سوداگر یکم جنوری ۱۸۶۲ء کو علی الصبح آسٹریلیا
اپنی بہن کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اس نے اپنی بہن سے اس کی
خیریت دریافت کی، پھر غسل اور ناشتہ کیا۔ یہ خیال کر کے
کہ بہن کی طبیعت کچھ ٹھیک ہے، شہر میں سیر و تفریح
کے لیے نکل گیا۔ سوداگر کی بیوی ان دنوں اسی شہر
میں رہتی تھی۔ شہر میں پہنچنے کے بعد اسے یہ خبر ملی کہ
انگلینڈ کی کرکٹ ٹیم آسٹریلیا آئی ہوئی ہے اور
آج ہی یہاں ان دونوں ملکوں کی ٹیموں کے درمیان
مقابلہ ہونے والا ہے۔ ان دنوں ٹسٹ مقابلے نہیں
ہوا کرتے تھے۔
سوداگر کی ایک اچھی عادت یہ تھی کہ وہ ہمیشہ

ڈائری لکھا کرتا تھا۔ رات میں گھر لوٹنے کے بعد
اس نے اپنی بیوی کے متعلق لکھا ساتھ ہی کرکٹ
میچ کے بارے میں بھی لکھا۔ اس مقابلہ میں دونوں ٹیموں
کے اٹھارہ اٹھارہ کھلاڑی کھیل رہے تھے اور Over
چار گیندوں کا ہوتا تھا۔ مقابلہ کو دیکھنے کے لیے لوگوں
نے شرکت کی۔ سوداگر کو انگلینڈ کے ایک تیز کھلاڑی
Griffith کا کھیل بہت پسند آیا۔ جس کے متعلق
اپنی ڈائری میں یہ لکھا ـــ "جب وہ گیند کو Hit
کرتا تو وہ دوڑ کر رن (Run) بنانے کے بدلے ایک،
دو، تین، چار کی گنتی گننے لگتا کیا شور ہوتا! لوگ
کہتے اس نے گیند کو باؤنڈری (Boundary) کے باہر
کر دیا ہے۔ اسی لیے شاید وہ چار تک کی گنتی
گنتا ہے اور دوڑتا نہیں۔"

عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ کرکٹ کے
اصولوں میں چوکے کو ۱۸۶۶ء میں شامل کیا گیا اور
اس اصول کے مطابق پہلا مقابلہ ایٹن اور ہیرد
کے درمیان انگلینڈ کے لارڈس میدان میں ہوا۔
لیکن اس سوداگر کی ڈائری نے لوگوں کے خیال کو
غلط ثابت کر دیا ہے۔ پہلی بار کسی چوکے کا تحریری
ذکر ملتا ہے تو اس سوداگر کی ڈائری میں یہی وجہ
ہے کہ بہت سے کرکٹ شائقین یہ تسلیم کرنے لگے
ہیں کہ کرکٹ کے چوکے کی شروعات آسٹریلیا
والوں نے ہی کی تھی۔ (ہندی سے ترجمہ)

● مسرور احمد آزاد محلہ شیخانہ کلاں
بہار شریف (نالندہ)

عید کا دن

عید کے لیے امی جان نے حامد کو نئے کپڑے
بنا دیے تھے وہ نئے کپڑے پہن کر پھولے نہیں سما
رہا تھا۔ اس کا دوست سعید جو گھر کا رئیس تھا قیمتی
کپڑے اور جوتا پہن کر حامد کے گھر آیا۔ لیکن جیسے
ہی حامد نے سعید کا جوتا دیکھا اس کا دماغ خراب
اس نے امی جان کے سامنے رٹ لگا دی کہ جو
چاہیے اور ابھی چاہیے میں بغیر نیا جوتا پہنے عید
نہیں جاؤں گا۔ اس کی امی جان نے اسے سمجھایا
لیکن وہ نہ مانا۔ اس کی ضد بڑھتی جا رہی تھی اس
امی جان پریشان ہو گئیں۔ وہ پیر پٹک رہا تھا ا
روتا جا رہا تھا اس کی امی بہت سمجھدار تھیں وہ
مناسب نہیں سمجھتی تھیں کہ عید کے دن اسے ما
پیٹا جائے یا برا بھلا کہا جائے انھوں نے اس
دادا جان کو آواز دے کر کہا کہ اسے عیدگاہ کسی
طرح لے جائیں تاکہ حامد وہاں لوگوں کا ہجوم ا
بچوں کو دیکھ کر بہل جائے۔

اس کے دادا جان اسے لے کر چلے۔ لیکن
مانتا کیسے۔ اس کے سر پر شیطان سوار تھا۔ و
تو بہت سے بچے اور ان کے نت نئے لباس دیکھ
اور بھی مچل جاتا۔ اس کے دادا جان بھی پریشا
ہو چکے تھے انھیں ایک ترکیب سوجھی۔ وہ ا
لے کر عیدگاہ کے دروازے کے پاس گئے۔ جہا
بہت سے بچے کھڑے تھے۔ وہ ایک بچے کے
پاس گئے جس کے بدن پر صرف ایک پھٹی سی قمیص
تھی۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ میرا نام شکیل ہے
حامد اب خاموش ہو چکا تھا۔ پھر دادا جان نے
شکیل سے پوچھا: "بیٹا تم خوش کیوں ہو جب
تمھارے بدن پر نئے کیا پرانے بھی کپڑے نہیں"
لڑکے نے کہا نہیں۔ میرے پاس اتنے پیسے کہا
ہیں جو میں کپڑے بناتا۔ پھر بھی میں بہت خوش
ہوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس
مجھے سب کچھ دیا۔ دو ہاتھ۔ دو پیر۔ دو آنکھ۔ کا
ناک۔ غرض کہ جسم کے تمام اعضا سے نوازا مجھ
دی۔ تو پھر میں خوش نہیں رہوں تو کیا روؤں
کیا رونے سے میری تقدیر بدل جائے گی؟

حامد بڑی خاموشی کے ساتھ سن رہا تھا۔ دھیرے
دھیرے اس کی سمجھ میں بات آرہی تھی۔ پھر اس کے
بعد اس کے دادا جان ایک لنگڑے آدمی کے پاس
گئے اور اس سے پوچھا: "تم یہاں کیوں آئے؟" اُس
لنگڑے آدمی نے جواب دیا کہ "میں اللہ تعالیٰ کا شکر
ادا کرتا آیا ہوں۔ حامد کے داد جان نے کہا کیسا
شکر؟ اور کاہے کا شکر؟ نہ تمھارے پاس کپڑے
نہ جوتے اور پھر بھی تم اللہ میاں کا شکر ادا کر رہے
ہو۔ لنگڑا بولا: ہاں تو ذرا سامنے دیکھیے وہ لڑکا لنگڑا
ہونے کے باوجود دونوں آنکھوں سے اندھا ہے
اگر اللہ تعالیٰ مجھے بھی ویسا ہی بنا دیتا تو؟"

حامد کے دادا نے حامد سے کہا "دیکھا یہاں
کیسے کیسے لوگ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے آتے
ہیں۔ اور ایک تو ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سب کچھ دینے
کے باوجود بھی عید کے دن رو رہا ہے۔ حامد نے کہا:
"ہیں دادا جان ابھی تک میں غفلت میں تھا۔ اب میں
کبھی نہیں روؤں گا اور جو بھی چیز مجھے ملے گی۔ میں
اللہ تعالیٰ کا شکر خوشی سے ادا کروں گا۔"

اشفاق احمد سوت گرنی کوارٹر تاج آباد، ناگپور

وفادار ساتھی

ایک چھوٹی سی ریاست کا ایک راجا تھا۔ شکار کھیلنا
اس کا شوق تھا۔ شکار پر جانے کے لیے اس کا ایک
بہت ہی پیارا اور وفادار ہاتھی تھا جس کا نام راجا
نے ایراوت رکھا تھا۔ جب کبھی راجا شکار کھیلنے کے
لیے جاتا۔ وہ اسی ہاتھی پر بیٹھ کر جاتا۔ ساتھ رہتے
رہتے راجا کو ایراوت سے بےحد پیار ہو گیا تھا اتنا پیار تھا کہ
جب تک دن میں ایک بار ہاتھی کو اپنے ہاتھ سے
کھلا نہیں لیتا اُسے چین نصیب نہیں ہوتا تھا اور ایسا
ہی حال ہاتھی کا بھی تھا۔ اگر راجا اسے کھلانے نہیں
آتے تو ایراوت بھوکا ہی رہنا پسند کرتا۔

ایک دن کچھ لوگ دربار میں آئے۔ انھوں نے
راجا کو اطلاع دی کہ ایک شیر اور شیرنی کا جوڑا اُن کے
گاؤں کے پاس ہی کے جنگل میں آکر بس گیا ہے۔ راجا
رعایا کے دُکھ درد کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ دوسرے
دن راجا نے شکار کی تیاری کی۔ شکار میں کام آنے
والے ہتھیار اور سامان اور کچھ نوکروں کو ساتھ
لے کر راجا ایراوت پر بیٹھ کر شکار کرنے نکل پڑا۔
دن بھر شیر شیرنی کی تلاش جاری رہی۔ اسی طرح
شام ہو گئی لیکن ابھی تک شیر اور شیرنی کی ایک
جھلک بھی نہ دکھائی دی۔

اچانک قریب کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ
ہوئی۔ راجا کو سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ وہ ہشیار اور
چوکنا ہو کر بندوق سنبھالے ہوئے آنے والے خطرہ
کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد ہی
ایک خونخوار شیر سامنے آگیا۔ اس کے پیچھے شیرنی
بھی تھی۔ دونوں شاہانہ انداز میں مست جھومتے
ہوئے چلے آرہے تھے۔ راجا نے بغیر وقت برباد
کیے ہوئے بندوق چلا دی۔ گولی نشانے پر لگی۔
بھیانک دہاڑ کے بعد شیر زمین پر گر پڑا۔ شیرنی
پلٹ کر بھاگنے لگی۔ راجا نے اُسے بھی نشانہ بنا
ڈالا۔ شیرنی زخمی ہو گئی لیکن بچ نکلی۔ راجا شیر
کو مار کر بے حد خوش ہوا تھا لیکن فوراً ہی اس کی
خوشی مایوسی میں تبدیل ہو گئی۔ راجا شکاری تھا۔
وہ سمجھتا تھا کہ زخمی شیرنی کا زندہ رہنا گاؤں والوں
کے لیے خطرہ ہے۔

رات ہو چلی تھی اب شیرنی کو تلاش کرنا
بہت ہی مشکل مسئلہ بن چکا تھا۔ اس کے باوجود
راجا نے ہمت نہ ہاری۔ اُس نے دوسرے دن شکار
پر آنے کا تہیہ کر لیا اور پاس ہی کے گاؤں میں رات
گزارنے کی ٹھان لی۔ جس کی غرض سے اس نے اپنے
ایراوت کا رُخ گاؤں کی طرف موڑ دیا۔ گاؤں کے
جنگل سے کچھ ہی دور زخمی شیرنی راجا کے قریب

بھی زوروں سے دہاڑ رہی تھی۔ راجا چونک اٹھا۔ شیرنی بالکل راجا کے سامنے کھڑی تھی۔

شیرنی کا پہلا وار ایراوت کی سونڈ پر ہوا اور سونڈ خون سے لت پت ہو گئی۔ ایراوت گھبرا کر پیچھے ہٹا تب تک شیرنی کے پنجے ایراوت کے مستک پر تھے۔ ایراوت خوفزدہ ہو کر اپنے آپ کو سنبھالنے لگا۔ شیرنی کا وار مہاوت پر ہوا اور اُس کی جانگھ سے گوشت کا ٹکڑا زمین پر آ گرا۔ مہاوت چیخ اٹھا۔ اب اُسے اپنی موت قریب نظر آنے لگی وہ چلّا کر ایراوت سے بول اٹھا۔ ایراوت تیرا راجا مرنے والا ہے۔ کیا تو کھڑا دیکھتا رہے گا؟ جیسے ایراوت سب کچھ سمجھ گیا ہو۔ چند ہی لمحوں میں اس کی سونڈ شیرنی کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی اور ایک ہی پل میں شیرنی ایراوت کے پیر کے نیچے تھی۔ اب وہ بھی مر کر شیر کے پاس پہنچ چکی تھی۔ وہ شیر کی موت کا بدلہ نہیں لے سکی۔

ادھر راجا کا ساتھی ایراوت جس نے اپنی وفاداری نبھا دی تھی، خون سے لت پت پڑا تھا۔ اُس کی محبت سے بھری آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ہم جانور ہیں، پھر بھی ہمیں پیار کرنا آتا ہے اور وفاداری بھی نبھانا آتی ہے۔ (ہندی سے ترجمہ)

● محمد فیروز احمد
معرفت محمد انور حسین بی اے محلہ تیلیانہ ڈاکخانہ کلٹی
ضلع بردوان پن کوڈ ۷۱۳۳۴۳

سچائی کا پھل

بہت دنوں کی بات ہے کہ کسی گاؤں میں ایک بوڑھی عورت رہتی تھی۔ وہ بہت ہی غریب تھی۔ وہ سوت کات کر اپنا اور اپنے بیٹے عامر کا پیٹ پالتی تھی۔ عامر ذہین، شریف اور خوش مزاج لڑکا تھا وہ پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ایک دن وہ عورت سوت کاتنے جا رہی تھی تو عامر نے کہا امی جان آج جب آپ سوت کات کر لوٹیں تو میرے لیے ایک گیند لیتی آئیے گا۔ ماں نے کہا اچھا بیٹا اور سوت کاتنے چلی گئی۔ عامر نے اسکول سے آ کر کپڑے بدلے اور دروازے کے پاس بیٹھ کر اپنی امی کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ امی آ رہی ہیں اور ان کے ہاتھ میں ایک لال خوبصورت سی گیند ہے۔ گیند دیکھ کر عامر پھولے نہ سمایا اور دوڑ کر امی سے گیند لے کر میدان کی طرف بھاگا۔ میدان میں جا کر گیند کو خوشی سے ایک بار زور سے پھینکا اتفاق سے وہ گیند میدان کے پاس رہنے والے گھر کی کھڑکی پر جا لگی۔ جس سے کھڑکی کا شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ وہ عورت اپنے گھر سے باہر آئی۔ اور غصّے سے عامر سے پوچھا کیوں میری کھڑکی کا شیشہ کس نے توڑا۔ پہلے تو عامر نے سوچا کہ وہ جھوٹ بول دے لیکن نہیں۔ اچھے بچے جھوٹ نہیں بولتے۔ عامر نے کہا۔ آنٹی آپ کی کھڑکی کا شیشہ مجھ سے ٹوٹا ہے آپ مجھے معاف کر دیجیے۔ عورت عامر کی سچائی دیکھ کر بہت متاثر ہوئی اور عورت نے کہا کہ نہیں بیٹے کوئی بات نہیں تم بھی میرے بیٹے کی طرح ہی ہو۔ عامر گیند لے کر خوش خوش اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

ثمینہ دین محمد (IX) جے آر نمبر ۲
(ڈونگری ممبئی)

عقلمندی

ایک شہر میں شاہد نامی ایک دولت مند آدمی رہا کرتا تھا۔ جب وہ بوڑھا ہو گیا تو اُس نے اپنی دولت اپنے تینوں لڑکوں میں برابر تقسیم کر دی۔ اب صرف اس کے پاس ہیرے کی ایک انگوٹھی بچی تھی۔ اس نے سوچا میں یہ انگوٹھی اس لڑکے

کو دوں گا۔ جو سب سے زیادہ عقلمند ثابت ہوگا۔
چنانچہ ایک دن اس شخص نے پہلے اپنے سب سے
بڑے بیٹے کو بلایا اور اس سے کہا: "بیٹا میں تمہیں
تین روپے دیتا ہوں۔ تم ایک روپے کی "اب"
لاؤ۔ ایک روپیہ کی "تب" لاؤ اور ایک روپے کی
"اب نہ تب" لاؤ۔"

بڑا بیٹا پہلے تو پریشان ہوگیا کہ یہ کیا بلا ہے
جب اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بازار چلا گیا۔ وہ والد
کی کہی ہوئی باتیں ہر دکان دار سے کہتا۔ مگر دکان دار
تو ہنس دیتا۔ یا آگے چلیے کہہ کر اس کو آگے بڑھا دیتے۔
آخرکار وہ مایوس ہوکر واپس آگیا۔ اب والد صاحب
نے دوسرے بیٹے کو بھی تین روپے دیے اور وہی
چیزیں لانے کے لیے کہا مگر دوسرا بیٹا بھی خالی ہاتھ
واپس آگیا۔ اب تیسرے بیٹے کی باری آئی۔ یہ بہت
ذہین اور عقلمند تھا۔ وہ ایک جگہ رک کر سوچنے لگا
پھر تھوڑی دیر کے بعد باغ کے مالی کے پاس گیا
اور اس سے ایک روپے کے گلاب کے پھول خریدے،
پھر اس نے ایک روپیہ ایک غریب کو دے دیا۔ اور
ایک روپیہ نالی میں پھینک دیا۔ جب وہ واپس اپنے
گھر آیا تو والد نے پوچھا: "بیٹے کیا تم وہ چیزیں لے
آئے؟"

بیٹے نے کہا: "جی ہاں ابا حضور! میں نے آپ کے
دیے ہوئے تین روپے میں سے ایک روپے کے
گلاب کے پھول آپ کے سونگھنے کے لیے ہیں۔ یہ کام
آئیں گے "اب" نہیں تو یہ پھول شام تک مرجھا
جائیں گے۔ ایک روپیہ میں نے ایک غریب کو دے
دیا۔ جو کام آئے گا "تب" یعنی آخرت میں اور
ایک روپیہ میں نے نالی میں پھینک دیا۔ جو کام
آئے گا "اب نہ تب" یعنی دنیا میں بھی کام نہیں
آئے گا اور آخرت میں بھی کام نہیں آئے گا۔
والد صاحب اپنے بیٹے کی عقلمندی پر بہت خوش
ہوئے اور ہیرے کی انگوٹھی اپنے چھوٹے بیٹے کو
دے دی۔

• معراج الدین
معراج کرانا اسٹورس چیلی پورہ۔ اورنگ آباد

رحم کا پھل

انور کے باپ اس کے بچپن میں ہی اس دنیا
سے چل بسے تھے۔ اس کی ماں محنت مزدوری
کرکے اپنا اور انور کا پیٹ پالتی تھی۔ انور بچپن
سے ہی رحم دل اور خوش اخلاق تھا۔ وہ اپنے پڑوسیوں
کے ساتھ بہت ہی محبت سے پیش آتا تھا۔

جب انور پندرہ سال کا ہوا وہ اپنی ماں
کا سہارا بن گیا۔ وہ روز صبح سویرے اٹھتا اور
شام کے وقت جنگل سے لکڑیاں لے کر واپس
چلا آتا۔ اس کی ماں لکڑیاں بیچ کر چاول اور دوسری
چیزیں خرید لاتی۔ وہ جنگل جاتے وقت اپنے ساتھ
روٹی لے جاتا اور دوپہر کو روٹی کھا کر پانی پیتا
اور پھر کام میں لگ جاتا۔

ایک دن ہمیشہ کی طرح انور جنگل گیا۔ کچھ
لکڑیاں کاٹ کر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی آنکھ لگ گئی۔
وہ سونے کے بعد کھانے کے لیے بیٹھا۔ اتنے میں جھاڑی
سے ایک بوڑھا آدمی باہر نکلا اور انور کے پاس
آکر کہنے لگا۔ بیٹا مجھے بے حد بھوک لگی ہے مجھے بھی
تھوڑی سی روٹی دے دے۔ خدا تیرا بھلا کرے گا۔
بوڑھے کی بات سن کر انور کو رحم آگیا۔ اس نے روٹی
اور چٹنی بوڑھے کو دے دی۔ بوڑھا روٹی
کھا کر بہت خوش ہوا۔ جاتے وقت اس بوڑھے
نے انور سے کہا: "بیٹا اب تو جو درخت کاٹے
گا اس میں تجھے ایک چیز ملے گی اور تو امیر ہوجائے
گا۔ اتنا کہہ کر وہ بوڑھا وہاں سے چلا گیا۔ انور ایک
سوکھا درخت کاٹ رہا تھا۔ اتنے میں اس کو

درخت کی کھوہ میں ایک بار نظر آیا۔ انور نے بار باہر نکال کر دیکھا تو وہ اصلی ہیروں کا تھا۔ انور وہ ہار لے کر سیدھا گھر آیا اور ہار بیچ کر ایک بہت بڑا آدمی بن گیا۔ اس نے ایک گھر بنایا اور اس میں وہ امی کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگا۔

● ذاکر حسین
بار علی چک ہسپورہ اورنگ آباد
(بہار)

نصیحت کی روشنی میں کہانیوں کا گلدستہ

ایک بلی نے ایک شیرنی پر طعنہ زنی کی کہ تو میری کیا برابری کرے گی میں ایک جھول میں دس بچے دیتی ہوں اور تو صرف ایک۔ شیرنی نے برجستہ جواب دیا۔ ہاں مگر میرا بچہ بڑا ہو کر شیر ہوتا ہے۔
(ایک لائق بیٹا دس نالائق بیٹوں سے اچھا ہے)

شکاری کتوں نے ایک بکری کا پیچھا کیا بکری بھاگ کر درخت میں چھپ گئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد کم بخت نے درختوں کے سارے پتے کھا ڈالے۔ کتوں نے اس کو دیکھ لیا اور دوڑ کر مار ڈالا۔
(جو اپنے خیر خواہوں کے ساتھ برا سلوک کرتا ہے وہ جلد سزا پاتا ہے)۔

ایک مرتبہ آنکھوں نے زبان سے پوچھا کہ تجھ کو ہر طرف سے دشمن گھیرے ہوئے ہیں اور دانتوں کی چھری ہر وقت تجھ پر تیز رہتی ہے۔ تو اپنے بچاؤ کی کیا تدبیر کرتی ہے۔ زبان نے کہا: نرمی!
(دشمن کے ساتھ بھی نرمی برتنا چاہیے، یہ بڑا عمدہ ہتھیار ہے۔)

ایک شیر ایک بیل کے پیچھے دوڑا۔ بیل بدحواس ہو کر ایک گڈریے کے گھر میں گھسنے لگا تو گھر کی بکری نے اسے روکا۔ بیل نے کہا بڑی بے رحم ہے، میں جان بچانے کے لیے تیرے پاس پناہ لینے کو آیا ہوں اور تو روکتی ہے۔ بکری نے کہا۔ رحم کروں تو اپنی جان پر آفت لاؤں اور تجھے نہ بچاؤں تو بے رحم کہلاؤں۔
(لوگوں کی مدد کرنی چاہیے مگر ایسی نہیں کہ خود اپنا نقصان ہو جائے۔)

● جاوید اختر روشن ۔ کشن گنج (پورنیہ)

(باقی صفحہ ۲ پر)

سو چاسانس لے لیں۔ آخر اتنی دور آ گئے۔ اور اب سچ پوچھو تو خطرے سے بھی بچ نکلے تھے۔ اطمینان کا سانس کیوں نہ لیتے اسی لیے تو فوراً بولے "اے خدا صاحب! منت ہی کی بات ہے کہ ایک روپے کی مٹھائی چڑھائی جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دس پیسے کے بتاشے کا چڑھاوا بھی کافی ہو سکتا ہے۔ بات وہی ہوئی۔ چاہے دس پیسے کا چڑھاوا ہو یا دس روپے کا مطلب تو ثواب سے ہے۔ بس دس پیسے کے بتاشے لے کر چڑھاؤں گا۔ اللہ میاں اُتار دو بس۔ ذرا سا دور ہی تو رہ گیا ہوں"۔

شیخ چمن نے بس ایک آخری ہمت اور کی، لیکن تھک کر چور ہو گئے تھے، اتنے اونچے پیڑ پر چڑھنے اُترنے کی مشق نہیں تھی۔ ایک پاؤں جو نیچے سرکایا تو دونوں ہاتھ چھوٹ گئے۔ اور یہ دھڑام سے نیچے آ گرے۔ بے چارے کے بہت چوٹ آئی۔ سر میں چوٹ، ہاتھ میں چوٹ، پیر میں چوٹ۔

اب یہ ہسپتال میں پڑے خدا سے لو لگائے ہیں۔ ہر وقت یہی رٹ ہے۔ "اللہ میاں جلدی سے اچھا کر دو تو پورے دس روپے کی نیاز دلاؤں گا۔ ایک پیسہ کم نہ کروں گا۔"

ختم شد

ننھے فنکار
بتایئے! کون سی تصویر پہلے انعام کی مستحق ہے
MATIN
HSCO KULTI

اسلام کے مشہور امیر البحر
عبد الواحد سندھی جامعی
اس کتاب میں مسلمانوں کے جہاز سازی اور جہازرانی کے کارنامے نیز ان سمندری سپہ سالاروں کے حالات بتائے گئے ہیں جنھوں نے تاریخ میں نام اونچا کیا۔
قیمت: ۴/=
اسلام کے مشہور سپہ سالار حصہ اول دوم
عبد الواحد سندھی جامعی
بچوں کے لیے اسلام کے مشہور سپہ سالاروں کا تفصیلی تعارف نیز ان کی زیر قیادت لڑی گئی جنگوں کے حالات جن کے پڑھنے سے ایمان میں تازگی آتی ہے۔
حصہ اول ۴/=
دوم ۴/=
اللہ کے خلیل
خلیل احمد جامعی
مسلمانوں کے جد امجد حضرت ابراہیم کی سیرت مبارک سے متعارف کرانے والی بچوں کے لیے ایک عمدہ کتاب۔
قیمت ۲/۵۰
دُم کٹا سانپ
محمد قاسم صدیقی
سچی عبادت، بے ایمان قاضی اور راجا اور پرجا۔ تین سبق آموز کہانیوں کا مجموعہ۔
قیمت: ۱/-
چنبیلی
محمد حسین حسان
ابتدائی درجوں کے بچوں کے لیے ...سی نامی ایک بلی کی مزیدار کہانی۔
قیمت: ۵۰/-
چٹانوں کی کہانی
محمد امین
قدرتی حالات و واقعات نے زمین اور چٹانوں کی شکل و صورت کو کس طرح بدلا؟ اس کا جواب اس کتاب میں ملے گا۔ قیمت ۲/۵۰
موم کا محل
پروفیسر محمد انس
شہد کی مکھیوں کی کہانی جو خود شہد کی طرح میٹھی اور دل پسند ہے۔ بڑے بچوں کے لیے کہانی کی طرز پر لکھی گئی ایک عمدہ معلوماتی کتاب۔
قیمت: ۴/=
بچوں کے اقبال
اطہر پرویز
اس کتاب میں علامہ اقبال کے حالات زندگی بڑے ہی اچھے انداز میں بتائے گئے ہیں۔ ساتھ ہی وہ نظمیں بھی شامل ہیں جو اقبال نے خاص طور پر بچوں کے لیے لکھی تھیں۔ قیمت: ۲/۵۰
میر انیس
محمد حسین حسان
میر انیس کے حالات زندگی، اخلاق و عادات اور ان کی شاعری کی خصوصیات بتانے والی کتاب نمونۂ کلام کے ساتھ۔ بڑے بچوں کے لیے ایک بہترین معلوماتی کتاب۔
قیمت ۲/۵۰
میگھ نگر کا راجا
ریاض احمد خان
ایک ظالم راجا کے دو بچوں کی کہانی جنھیں ڈاکو پکڑ لے... بہت ہی دل چسپ اور ... کہانی ہے۔
قیمت: ۱/۲۵
مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دلی ۱۱۰۰۲۵

Regd No. D(SE)-043 July, 1982

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

برنی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دلی ۲

پیام تعلیم
عید مبارک

جوتے کی فریاد

"ارے واہ! تم کتنے اچھے لڑکے ہو۔ سنو! اب میں تم سے کہنے والی ہوں "آپ کا مزاج کیسا ہے؟" اس کے بعد تم کو ایسے جواب دینا چاہیے۔"

"جی ہاں! بالکل ٹھیک ہوں شکریہ" اس کے بعد انابی نے بہت ملائم اور میٹھی آواز میں بھالو سے کہا۔ "کیسے مزاج ہیں آپ کے؟" اور ساتھ ہی انھوں نے بھالو کی کمر کو دبایا۔ وہ فوراً غرّایا۔ اُس کے غرّانے کی آواز ایسی لگ رہی تھی جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ "بالکل ٹھیک، آپ کا شکریہ!"

سیمیں نے دل میں کہا۔ "ارے یہ تو بڑا ہوشیار ہے!"

انابی نے بھالو سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بھالو بھیّا! تم نے آداب بہت اچھی طرح سیکھے ہیں۔ شاباش، اب اور باتیں اس وقت تم کو نہیں سکھا سکتی۔ کیوں کہ مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔ دوسرا سبق تم کو کل دوں گی۔"

جب انابی کمرے سے چلی گئیں، تو کچھ دیر تک سیمیں اپنے کھلونوں کو کھڑی دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے اپنے بھالو کو اُٹھایا اور اُس کی کمر دبانے لگی۔ تاکہ اُس سے شکریہ اور بالکل ٹھیک کہنا سنے۔ اسے بھالو کی آواز میں یہ کہنا بہت اچھا لگا تھا۔

سیمیں نے اپنی تینوں گڑیوں، بھالو اور گلابی خرگوش سب کو ایک گول دائرے کی شکل میں بٹھا دیا۔ بیچ میں خود کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"میرے سب کھلونو، سنو! اب میں تم کو ملنے کے آداب سکھاؤں گی۔ میری امّی کہتی ہیں کہ ملنے ملانے کے آداب سب کو سیکھنا چاہییں۔" سب کھلونے سننے کے لیے تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ بس حبشی گڑیا تھی جو بیٹھ نہیں رہی تھی گر گر پڑتی تھی۔ سیمیں نے پہلے تو سب کو باری باری شکریہ اور مہربانی ہے کے الفاظ کہلوانے کے لیے دبایا۔ پھر اُس نے ہر ایک کے سامنے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

اس دفعہ جواب کے لیے اُس نے دبایا نہیں۔ بلکہ اُن کی طرف سے آواز بنا کر خود ہی جواب دینے لگی۔ سب سے پہلے وہ بھالو کی غرّائی ہوئی آواز میں بولی۔ "جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔ شکریہ!"

پھر اُس نے جہاز کے کیپٹن گڈّا سے ہاتھ ملائے اور کہا۔ "کیپٹن کیسے مزاج ہیں آپ کے؟" اور خود کیپٹن گڈّا کی طرف سے بہت ملائم آواز میں جواب دیا "بالکل ٹھیک ہوں۔ شکریہ!" پھر اُس نے بے بی گڑیا کی ننھی منّی انگلیوں کو چھوا اور کہا۔

"منّی بی بی! ٹھیک ہو نا تم؟" اور اُس کی باریک آواز بنا کر خود ہی جواب دیا "ٹھیک ہوں، شکریہ!" اس وقت اپنے کھلونوں کو ملاقات کے آداب سکھانے میں اُسے بڑا مزہ آرہا تھا۔ سب کھلونے دھیان اور تمیز سے آداب سیکھ رہے تھے۔ سوائے حبشی گڑیا کے جو منھ اوندھائے پڑی تھی۔ سیمیں نے ان سب کو یہ بھی بتلایا کہ ان کا داہنا ہاتھ کون سا ہے۔

ابھی کھلونے اپنے آداب سیکھ ہی رہے تھے کہ دروازہ کھلا اور سیمیں کی امّی اور اُن کی ایک سہیلی بیگم سلیم مسکراتی ہوئی دروازے پر کھڑی نظر آئیں۔

امّی نے پوچھا۔ "کیوں بھئی سیمیں کیا کر رہی ہو؟"

سیمیں نے خوش ہو کر کہا۔ "امّی میں اپنے کھلونوں کو ملنے کے آداب سکھا رہی ہوں۔ امّی! ذرا بھالو کو تو دیکھیے وہ مجھ سے ہاتھ ملاتا ہے اور کہتا ہے۔ "بالکل ٹھیک ہوں۔ شکریہ"

امّی اور بیگم سلیم دیکھنے لگیں۔

بھالو نے بڑی تمیز سے ہاتھ ملائے۔ سیمیں نے اُس کو بیچ میں سے دبایا تو وہ غرّایا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ بالکل ٹھیک ہوں۔ شکریہ!

"ارے واہ! تمھارے کھلونے تو بہت ہی تمیز دار ہیں" بیگم سلیم نے مسکرا کر کہا۔ اُس کی امّی بھی مسکرائیں اور بولیں "ہاں بہن یہ بات بڑی عجیب ہے کہ سیمیں کو تو شکریہ یا بالکل ٹھیک ہوں وغیرہ کہنے ابھی تک بھی نہ آئے اور اُس کے کھلونوں کو سب باتیں آتی ہیں۔"

سیمیں فوراً بولی۔ "میں یہ سب آداب جانتی ہوں، میں نے

ڈاکٹر قنبر رضوی

عراق

قدیم تہذیب کا گہوارہ

ملک ترکی کے جنوب مشرق میں دریائے فرات اور دریائے دجلہ کے دو آبہ کی زمین پر جسے "میسوپوٹامیا" کہا جاتا تھا، آج ملک عراق واقع ہے اسی دو آبہ کی سرزمین پر قدیم سامری۔ بابلی اور اسیریائی تہذیب کے نقوش آج بھی پائے جاتے ہیں۔ یہیں کسی زمانے میں سامرہ۔ بابل اور اسیریا کی قدیم ترین حکومتیں قائم تھیں۔ ان قدیم تہذیبوں کے زوال کے بعد سولھویں صدی میں اس زرخیز سرزمین پر ترکوں نے اپنا اقتدار قائم کرلیا اپنی تین ولایتوں یا صوبوں یعنی بغداد۔ بصرہ اور موصل کا قیام کیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد کردستان کے پٹھار سے خلیج فارس تک یہ حصہ انگریزوں نے ایک شہنشاہیت میں بدل دیا۔ ١٩٥٨ء میں شہنشاہیت کا خاتمہ ہونے کے بعد ایک آزاد حکومت نے جنم لیا جو آج روسی نظام سیاست سے متاثر ہے اور ایک سوشلسٹ جمہوریت کی شکل میں موجود ہے۔ عراق مغربی ایشیا کا ایک اہم ترین ملک ہے۔

شعبہ جغرافیہ، اے۔ کے۔ کالج، شکوہ آباد (یو۔پی)

ملک کے شمال میں ترکی، مشرق میں ایران، مغرب میں اردن اور شام کے ممالک میں جنوب میں خلیج فارس۔ قویت (کویت) اور سعودی عرب اس کی سرحد بناتے ہیں۔ یہ ملک ٢٩° شمالی ارض البلد سے ٣٨° شمالی عرض البلد تک اور ٣٨° مشرقی طول البلد سے ٤٨° مشرق طول البلد کے درمیان واقع ہے۔ ملک کا کل رقبہ ٤٣٨٥٥٦ مربع کلومیٹر (١-١٥٠٩ مربع میل) ہے۔ کل آبادی تقریباً ٩٥ لاکھ ہے اور فی مربع کلومیٹر آبادی کا تناسب صرف ٢٢ ہے۔ ملک کی لمبائی شمال سے جنوب ١١٢٥ کلومیٹر اور مشرق سے مغرب صرف ٨٠٤ کلومیٹر ہے۔ ملک کی سطح زمین آب و ہوا اور نباتات میں بڑا اختلاف اور تضاد پایا جاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر ملک کے مختلف حصوں میں جغرافیائی حالات بھی مختلف ہیں۔ شمال میں کردستان کا پٹھار جو کہیں کہیں ٤٢٥٠ میٹر سے بھی اونچا ہے تو جنوب میں فرات اور دجلہ ندیوں کے مل جانے

کے بعد نشیبی زمین یا ڈیلٹا ہے۔ مشرق میں ایران کی سرحد پر اونچی زیگرا "Zagros" کی پہاڑیاں نو سو میٹر سے زیادہ اونچی ہیں جن پر جنگلات چھائے ہوئے ہیں تو جنوب مغرب میں وسیع۔ لق و دق سیریا اور عرب کا ریگستان ہے۔ دوآبہ کی زمین بہت زرخیز اور سرسبز ہے اور اسی دوآبہ یا میسوپوٹامیہ ہی میں قدیم تہذیب، بابل کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ آب و ہوا میں اختلاف اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں گرمیوں کا اوسط درجہ حرارت ۳۰° سینٹی گریڈ ہو جاتا ہے۔ جبکہ جاڑوں میں ۱۰° سے ۱۵° تک ہی رہتا ہے۔ درجۂ حرارت کا سالانہ فرق ۱۰° رہتا ہے۔ دن میں حرارت اتنی ہو جاتی ہے کہ لوگ تہ خانوں میں گزر کرتے ہیں جبکہ رات میں موسم سہانا ہو جاتا ہے۔ کردستان کے اونچے حصے میں بارش ۵۰ سینٹی میٹر سے ۵، سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔ جبکہ دوآبہ کے اوپری حصے میں صرف ۴۵ سینٹی میٹر اور نیچے میدانی حصے میں ۲۵ سینٹی میٹر سے بھی کم بارش ہوتی ہے۔

کردستان کے پہاڑی ڈھال پر اوک اور اخروٹ کے چوڑی پتیوں والے درخت میدانی حصے میں اسٹیپس جیسی گھاس کے میدان اور جنوبی میدانی حصے اور ریگستان کے قریب کانٹے دار جھاڑیوں اور کھجور کے درخت پائے جاتے ہیں۔

دجلہ اور فرات ندیوں کے سنگم کے بعد خلیج فارس تک بہنے والے دریا کو شط العرب کہتے ہیں۔ شط العرب کے دونوں طرف ۱۶۰ کلو میٹر کی لمبائی اور ۳ کلو میٹر کی چوڑائی میں ایک وسیع علاقہ کھجور کے درختوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ دنیا کا سب سے زیادہ کھجور پیدا کرنے والا علاقہ ہے۔ (بقیہ آئندہ)

(بقیہ صفحہ ۷ کا)

فرمایا کہ یہ اسی وقت تک برائیوں سے بچا سکتی ہے جب تک تم جھوٹ اور غیبت سے اس میں سوراخ نہ کر دو۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "جو روزہ رکھے اس کو چاہیے کہ لغو اور فحش باتیں نہ بکے اور نہ جہالت (غصہ) کرے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی اس سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو اور گالی بھی دے، تو یہی کہے کہ میں روزہ سے ہوں"۔ اور جو اس طرح رمضان کے پورے روزے رکھے تو خدا کا یہ وعدہ ہے کہ "روزہ میرے لیے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا"۔

۲۹ رمضان المبارک کو ماہ شوال یعنی عید کا چاند دیکھنے کی سب کوشش کرتے ہیں اور ۲۹ تاریخ کے چاند کی بچوں کو خاص کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ ۲۹ کو اگر چاند نہیں ہوا تو ۳۰ کا یقینی ہوتا ہے اور پھر چاند رات کیا خوشیوں کی بارات ہوتی ہے نئے نئے کپڑے سل رہے رہے ہیں، بازار میں سوئیوں، عطر، موزے جوتے، رومال، بنیائن وغیرہ کی خریداری، غرض پوری رات آنکھوں میں کاٹنے کی کوشش اور اگر آنکھ لگ گئی تو صبح صبح اٹھ گئے اور نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے بدل کر، شیر وغیرہ کھا کر اللہ کی بڑائی، اس کی ذات کی یکتائی اور پاکی و بڑائی بیان کرتے ہوئے عید الفطر کی نماز کے لیے چل دیے۔ کل تک سورج نکلنے سے چھپنے تک سب کچھ کھانا پینا حرام تھا اور آج عید کے دن کا روزہ حرام ہے۔ روزے پورے ہونے کی خوشی میں آج کے دن بھی غریب اور کمزور لوگوں کو نہیں بھلایا گیا بلکہ فطرہ نکالا گیا اور وہ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

عیدگاہ یا جامع مسجد پہنچ کر چھ زائد تکبیروں کے ساتھ دو رکعت نماز واجب ادا کی گئی اور اس کے بعد اللہ کا شکر ادا کیا گیا۔ دعائیں مانگی گئیں اور پھر ایک دوسرے سے محبت، خلوص، پیار اور بھائی چارے کے رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے گلے ملے۔

بچوں نے عیدگاہ کے باہر میلہ سے رنگ برنگی چیزیں لیں، گھر پہنچ کر سب کو سلام کیا، دعائیں اور عیدیاں لیں اور اس طرح ایک سال کے لیے پھر رمضان اور اس کے بعد اگلی عید کا انتظار۔

میرے دوستو آپ مجھے نہیں پہچانتے ؟
پہچان بھی کیسے سکتے ہو! آپ نے ۱۹۵۱ء میں مجھے دیکھا ہوگا۔ جب میری عمر ایک برس بھی نہیں تھی۔ اب میں دوبارہ آپ سے ملنے آیا ہوں۔ آپ میں سے کتنے بچے جوان ہو گئے ہیں اور جوان بوڑھے ہو چکے ہیں۔ میری بھی تو عمر تقریباً ۳۲ برس ہونے والی ہے۔

"میں کون ہوں؟"
ہاں، ہاں! یہ بھی بتلاؤں گا۔ مگر پہلے یہ تو بتا لینے دیجیے کہ میں اتنے دنوں کہاں رہا۔ آپ لوگوں سے الگ ہو کر کس کس ملک کا سفر کیا اور کن کن راستوں کی خاک چھانی۔ فلپائن، جاپان، انڈونیشیا اور تھائی لینڈ وغیرہ کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ یہ سب برّاعظم ایشیا کے ممالک ہیں جس میں خود آپ کا ملک بھی واقع ہے۔ بس میں ان ہی ملکوں کے سفر میں رہا۔ ۱۹۵۴ء فلپائن میں گزارا۔ پھر جاپان انڈونیشیا اور تھائی لینڈ میں قیام کیا۔ جب میں دہلی میں تھا تو گیارہ ایشیائی ملکوں سے تعلق رکھنے والے کل پانچ سو آدمی میرے شیدائی تھے۔ لیکن دھیرے دھیرے میرے چاہنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ اب میں جہاں جاتا ہوں، ہزاروں لوگ مجھے دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں اور میرے چاہنے والوں کی تعداد تو لاکھوں سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔

"میں یہاں کیوں آیا ہوں؟"
یہ سوال بھی دلچسپ ہے ——— ارے بھئی میرا اس ملک سے بہت گہرا اور پرانا رشتہ ہے۔ میری تو پیدائش ہی یہیں ہوئی ہے۔ میں مادرِ وطن کو کیسے بھول سکتا ہوں؟ جنھیں بڑے لوگ پنڈت نہرو کہتے ہیں اور بچے چاچا نہرو، وہ مجھے بے حد مانتے تھے۔ انھوں نے ہی تو ۱۳ فروری ۱۹۴۹ء کو پاکستان، فلپائن، برما اور افغانستان کے رہنماؤں سے مل کر میری پرورش و پرداخت اور تربیت کا انتظام کیا تھا۔ پچھلی بار جب میں ۴ مارچ سے ۱۱ مارچ ۱۹۵۱ء تک آپ کے ہاں ٹھہرا تھا تو میری بڑی خاطر ہوئی تھی۔

"اس بار مجھے آپ کا ملک کیسا لگا؟"
یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کے ملک نے بہت ترقی کی ہے۔ دہلی کی زیادہ تر سڑکیں چوڑی ہو چکی ہیں اور بقیہ چوڑی کی جا رہی ہیں۔ ٹریفک کا ہجوم کم کرنے کے لیے مختلف جگہوں پر سات نئے "فلائی اوور" بنا دیے گئے ہیں۔ روشنی سے سڑکیں رات کو بھی دن کی طرح چمکتی ہیں۔ مودی روڈ کے جنوب میں پرگتی وہار ہوسٹل کے سامنے بنا ہوا خوبصورت جواہر لال نہرو اسٹیڈیم دیکھ کر تو آدمی حیران ہو جاتا ہے۔ اس دو منزلہ اسٹیڈیم کو بنوانے میں تقریباً سولہ کروڑ روپے خرچ ہوئے ہیں اور اس میں بیک وقت پچھتر ہزار لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام ہے۔ اندر پر سطح میں انڈور کھیلوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ اسٹیڈیم بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس ایر کنڈیشنڈ اسٹیڈیم میں تقریباً

پچیس ہزار لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے اور یہ دنیا کا چوتھا سب سے بڑا اسٹیڈیم ہے۔ کھلاڑیوں کے لیے بنایا گیا ایک "کھیل گاؤں" بھی خوب ہے۔ اس میں تقریباً پانچ ہزار لوگ قیام کریں گے۔ سچ کہتا ہوں، یہاں کا تو نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ یہ جان کر تو مجھے اور خوشی ہوئی کہ یہ سب میرے استقبال کے لیے ہوا ہے۔ میں تو

آپ میرا نام جاننے کے لیے پھر بے چین ہو اٹھے؟ اچھا تو اب میں بھی آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرانا چاہتا۔

میرا نام "ایشین گیمز" ہے اور لوگ مجھے "ایشیائی کھیل" بھی کہا کرتے ہیں۔

میں ۱۹ نومبر سے ۴ دسمبر ۱۹۸۲ء تک آپ کا مہمان ہوں گا۔ اس وقت تک آپ مجھ سے مل سکتے ہیں اور مجھے دیکھ کر خوش ہو سکتے ہیں۔ اگر براہ راست مجھ سے نہ مل سکیں تو ریڈیو پر میری خبریں سن سکتے ہیں اور ٹیلی وژن پر مجھے دیکھ سکتے ہیں لیکن ہر موقع پر اپنے سارے چاچا نہرو کی یہ بات ضرور یاد رکھیے گا کہ "کھیل کو کھیل کے جذبے سے کھیلنا چاہیئے"●●

نثار چنگیزی

پندرہ اگست

چلے جو بات تو پندرہ اگست کی بات چلے
ہماری آرزو یہ ہے کہ تاحیات چلے

جو جشنِ صبح شروع ہو تو ساری رات چلے
خوشی میں ساتھ یہ دنیائے ممکنات چلے

یہی سکھاتی ہے ہم کو ہماری آزادی
نہ بھید بھاؤ ہو ہم میں نہ ذات پات چلے

چلے یہ ذکر چلے عرش پر شہیدوں کا
چلے یہ فرش پہ جب تک یہ کائنات چلے

نثار ایسی خوشی میں سجائیں بزمِ سخن
کہ جس میں صبح تلک دورِ غزلیات چلے

بیروا چندن پور رکھوریا بازار ضلع گورکھپور

• آصف نقوی

سانپ

دشمن یا دوست؟
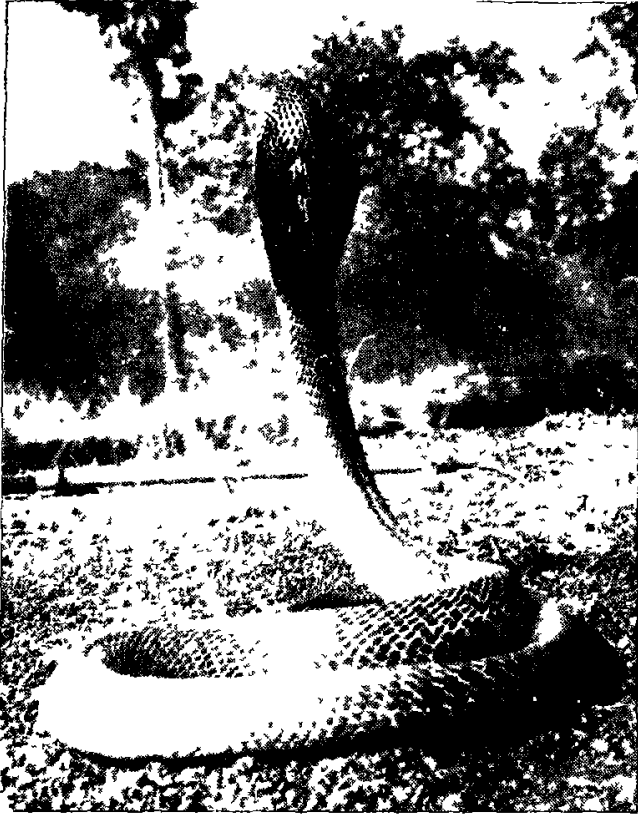
سانپ کا نام آتے ہی خوف، گھن اور نفرت کے جذبات فوراً ہمارے آپ کے ذہن میں ابھرتے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ سانپ سے متعلق ہزاروں جھوٹے سچے قصّے ہم میں سے ہر ایک کے پاس سُنانے کے لیے ضرور ہوتے ہیں۔ اور ہمارے ہندستان میں تو ویسے ہی سانپ کو کہانی قصّوں میں بہت اہم مقام حاصل ہے۔ سانپ کا خزانے کی حفاظت کرنا، سانپ کا بدلہ لینا، سانپ کا ہیرا اُگلنا اور نہ جانے کیا کیا۔ سپیرے بھی خوب لوگوں کو سانپ کا تماشا دکھاتے ہیں اور ڈراتے ہیں۔ غرض جانوروں میں شاید سب سے زیادہ غلط معلومات لوگوں کو سانپوں کے بارے میں ہی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ سینکڑوں سوالات ہیں۔ اسی لیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ آپ کو سانپوں کے بارے میں صحیح باتیں بتائیں اور سانپوں کے بارے میں صدیوں سے پھیلی ہوئی غلط فہمیاں دُور کریں۔

سانپ ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں (Vertebrates) میں سے ہیں جو زمین پر رینگ کر چلتے ہیں (Reptiles) ان سے تعلق رکھتا ہے۔ اور چھپکلی اور مگرمچھ، کچھوا اس کے

عادولا، حامونگر، ی دکار ۲۵ اقسم رشتہ دار ہیں ان میں

اور سانپوں میں فرق یہ ہے کہ یہ سب ٹانگیں ہوتے ہوئے بھی زمین سے مِل کر چلتے ہیں اور سانپ کی ٹانگیں سرے سے ہی غائب ہوتی ہیں اور اس لیے یہ پورا جسم زمین سے ملاکر گھسیٹ کر چلتا ہے۔ سانپ زمین اور پانی دونوں جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔ مگر سانس صرف ہوا سے ہی لے سکتے ہیں۔ سانپ کی اوسط عمر دس سے بیس سال ہوتی ہے۔ مگر کبھی کبھی کچھ سانپ تیس سال تک زندہ رہتے ہیں۔ دنیا میں ۲۵۰۰ قسم کے سانپ پائے جاتے ہیں۔ جس میں سے دو سو اقسام ہندستان میں ہی ملتی ہیں۔ مگر ان میں سے صرف ۲۰ فی صدی سانپ زہریلے ہوتے ہیں۔ جو کہ ۲۰۰ میں سے صرف چار قسموں سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۱) ناگ (Cobra)

(۲) کریت (Krait)
(۳) گھوڑ نس (Russels' Viper)
(۴) وائپر (Scaled Viper)

مندرجہ بالا میں سے کریت (Krait) ہندستان کا سب سے زہریلا سانپ ہے۔ جب کہ دُنیا کا سب سے زہریلا سانپ آسٹریلیا میں پایا جانے والا ٹائیگر سانپ ہے۔

سپیرے سانپ نچاتے ہیں اور ہم سب سمجھتے ہیں کہ سانپ بین کی لَے پر جھوم رہا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سانپ بے چارہ تو بہرا ہوتا ہے۔ وہ کیا جانے موسیقی کیا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ سانپ جب سپیرے کے ٹوکرے سے نکلتا ہے اور سپیرا اُنگلی سے اُس کو ٹھوکتا ہے یا ہاتھ لگا کر اپنی طرف متوجہ کرتا ہے تو سانپ کی نظر بین پر پڑتی ہے اور پھر سپیرا بین بجانا شروع کر دیتا ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ بین کو بھی ہلاتا اور گھماتا جاتا ہے۔ بے چارہ سانپ بین کو دشمن سمجھ کر اس پر اپنی نظریں جمائے پھن پھیلا کر بین کے ساتھ ہلنے لگتا ہے، جس کو ہم آپ سمجھتے ہیں کہ وہ بین کی دُھن پر جھوم رہا ہے۔

سانپ کا کاٹا پانی نہیں مانگتا

سانپ کے کاٹنے کے بھی آپ نے بہت سے قصّے سُنے ہوں گے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ ویدجی حکیم صاحب اور بابا یا صوفی صاحب نے کس طرح زہر جھاڑ دیا۔ یا فلاں صاحب نے ناگ کے ڈسے کو کیسے بچا لیا۔ پتھر باندھ دیا اور زہر ایک دم کھینچ آیا۔ نہ جانے کیا کیا قصّے۔ حقیقت کم کہانی زیادہ۔

یہ ضرور ہے کہ سانپ کاٹ بھی لیتا اور بعض زہریلے سانپوں کا کاٹا جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر سانپ بالکل مجبوراً کاٹتا ہے، جب کہ خود اُس کی جان پر بن آئے تب، ورنہ زہریلے سے زہریلا سانپ تو خود آدمی سے خوف زدہ رہتا ہے۔ اور اگر ہم سانپ کو دیکھ کر زور سے زمین پر تیر ہی مار دیں تو وہ بھاگ جائے گا۔ مگر سب لوگ مقابلے کی ٹھان لیتے ہیں تو بے چارہ سانپ بھی موقع دیکھ کر کاٹ ہی لے گا۔ کبھی کبھی لوگ انجانے میں اُس کو چھیڑ دیتے ہیں اور سانپ اُن کو ڈس لیتا ہے۔ ہندستان میں جتنے بھی زہریلے سانپ ہیں وہ کبھی کبھی ہی انسان کے سامنے آتے ہیں۔ کیوں کہ ان میں سے زیادہ تر اُن جنگلوں پر رہتے ہیں جہاں زیادہ آبادی نہیں ہوتی اور ویسے بھی جن کو ہم زہریلے سانپ کہتے ہیں ان میں سے ایک دو میں ہی اتنی زہر کی مقدار ہوتی ہے جو انسان کے لیے جان لیوا ثابت ہو۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ زہر کا اصلی استعمال تو سانپ چوہوں اور مینڈکوں کو مار کر ان سے اپنا پیٹ بھرنے کے لیے کرتے ہیں۔

جیسا ہم نے پہلے بتایا صرف چار قسم کے سانپ انسانوں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں اور وہ بستیوں میں بھی نکل آتے ہیں اور جانے انجانے آدمی کو اکثر کاٹ بھی لیتے ہیں جو کہ جان لیوا بھی ہو سکتا ہے۔

اُس کے کاٹے کا علاج ہے

سانپ اگر کاٹ لے تو اُس کی دوا ہے اور زہریلے سے زہریلے سانپ کا کاٹا بھی زندہ بچ سکتا ہے۔ بشرطیکہ بغیر گھبرائے بروقت انجکشن لگوا لیا جائے۔ سانپ کے کاٹے کی دوا سانپ ہی کے زہر سے تیار کی گئی ہے۔ جس کو زہر توڑ دوا (Antivenom serum) کہا جاتا ہے تو اگر اینٹی وینوم سیرم کا بروقت انجکشن لگ جائے تو جان بچ سکتی ہے۔ کبھی کبھی سانپ کے کاٹے کے دیسی علاج بھی کارآمد معلوم ہوتے ہیں۔ دراصل وہ اثر نہیں کرتے بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جس سانپ نے کاٹا ہوتا ہے یا تو وہ سرے سے ہی زہریلا سانپ نہیں ہوتا ہے یا اگر ہوتا بھی ہے تو زہر کی اتنی مقدار آدمی کے جسم میں داخل نہیں ہوتی جو کہ جان لیوا ثابت ہو۔ یہ

اِس بات کو بھول گئے۔

مگر جلد ہی وہ موقع آگیا۔ ایک شکاری نے ایک مضبوط جال لگا کر گوشت کے ٹکڑے ڈال دیے تھے۔ اناڑی اور نوجوان شیر جا کر جال میں پھنس گیا۔ چھٹکارے کے لیے جتنا ہی تڑپا اتنا ہی جال میں جکڑتا گیا۔ تڑپتے تڑپتے بے حال ہو گیا تب وہ زور سے دہاڑا۔

یہ جگہ اُس کے غار سے قریب تھی۔ شیرنی اور شیر دونوں دوڑ کر پہنچے۔ بچّے کو اِس مصیبت میں گرفتار دیکھ کر اُن کے ہاتھوں کے توتے اُڑ گئے۔ لیکن اُن کے پاس اِس کا کوئی علاج نہ تھا۔ دونوں سکتے میں تھے۔ وہ جال کی حقیقت سے واقف تھے کہ جتنا ہی چھٹکارے کی کوشش کی جائے گی جال کے بندھن اور بھی کستے ہی جائیں گے اور پھنسنے والے کا دم گھٹتا جائے گا۔

وہ پریشان اور حیران کھڑے تھے کہ اتنے میں چوہا دوڑتا ہوا آیا اور اُس کے پیچھے اُس کی ماں بھی تھی۔ دونوں ہی جلدی جلدی دو طرف سے جال کو کاٹنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں نے جال کے ٹکڑے اُڑا دیے۔ شیر آزاد ہو گیا۔ جال کے پُرزے شکاری کی قسمت پر ہنس رہے تھے۔ گوشت کے ٹکڑوں پر شیر اور چوہے مل کر ضیافت اُڑا کر اپنے ٹھکانے چلے گئے۔

آج شیر کی سمجھ میں مخلص دوست کی دوستی آ گئی۔ ننھے چوہے نے اتنا بڑا کام کیا تھا جس سے اُس کے ماں باپ عاجز اور مجبور تھے۔

تو بچو! دنیا میں دوستی بڑی اچھی چیز ہے۔ دوست پر بھروسہ کرو اور اُس کی قدر کرو۔

اب ماہ بہ دولت کی لومڑی تم کو جال اور "پھندے" سے آگاہ کرے گی۔

لومڑی کلیلہ اور دمنہ سے مخاطب ہو کر بولی۔

"سنو بچو! جال مضبوط سوتی ڈور کے ہوتے ہیں اور اُن کے نیچے لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے ہوتے ہیں یہ جال شکاری ایک خاص ڈھنگ سے لگاتے ہیں۔ جب جانور جال میں داخل ہو کر لگی ہوئی چیز کو کھینچتا ہے تو جال اُلٹ کر جانور کو لپیٹ لیتا ہے اور لوہے کے ٹکڑے ایک دوسرے میں گتھ جاتے ہیں اور جال ایک گٹھری بن جاتا ہے۔ جانور بے بس ہو جاتا ہے۔

ایک لوہے کا بڑا شکنجہ ہوتا ہے۔ شکنجے کے کھٹکے میں گوشت کا بڑا لوتھڑا لٹکا دیا جاتا ہے یہ کمانی پر بنا ہوتا ہے جانور جب اُس پر اپنا پاؤں رکھ کر گوشت پر منھ یا پنجہ مارتا ہے تو کمانی اُس کے پاؤں، پنجے یا منھ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

ایک پھٹکا ہوتا ہے۔ وہ ایک بڑی لوہے کی سلاخوں والی الماری ہوتی ہے۔ اُس کا پھاٹک کھلا ہوتا ہے اُس میں گوشت یا چھوٹا موٹا بکرا ایک کمانی سے باندھ دیا جاتا ہے۔ جب کوئی جانور اُس میں داخل ہو کر بکرے یا گوشت کو کھینچتا ہے تو پھاٹک بند ہو جاتا ہے اور جانور اُس پنجرے میں بند ہو جاتا ہے۔ اِس طرح شیر کو پھنسا کر چڑیا خانہ، عجائب گھر وغیرہ میں قیمتاً بھیج دیے جاتے ہیں۔

بچو! تم "جال"، "شکنجے" اور "پھٹکے" کو دیکھو تو ہرگز ہرگز لالچ میں آکر اُس کے قریب نہ جاؤ۔"

تو یوں شیر اور ہاتھی دوسرے جنگلوں سے اُس کا اور اُن کے جانوروں کا صفایا کر کے دوسرے جنگل میں آ جاتے اور جنگل پر حکومت کرنے لگتے ہیں۔

ہم لوگ اِس سے پہلے بڑے امن و سکون سے زندگی گزار رہے تھے کہ ہاتھیوں کا ایک غول اور شیروں کا ایک جوڑا کہیں سے آ گیا اور اُن کے پیچھے پیچھے چند تیندوے، بھیڑیے اور لکڑ بگھے بھی آ دھمکے۔ اِس جنگل کے چھوٹے موٹے بے ضرر جانوروں پر آفت سی ٹوٹ پڑی۔ ورنہ چاروں طرف سے پہاڑوں اور سمندر سے گھرا ہوا یہ جنگل ہر طرح کے جانوروں کا مسکن ضرور تھا، لیکن آدمیوں کی دست بُرد اور لوٹ کھسوٹ سے بچا ہوا تھا اور نہ آدمیوں کو اِس کی ضرورت پڑی کہ وہ اِس جنگل کو

کاٹ کر کھیت بنا لیے۔ اس جنگل میں سانپ، بچھو، بھالو، بندر، لنگور، گیدڑ، لومڑی، ہرن، بیل، گاؤ، جنگلی گائیں، بیل، بھینس، بھینسے، جنگلی گھوڑے، لمبے چوڑے سانبھر، چیتل، بارہ سنگھے، خرگوش اور چوہے۔ گلہریوں کی کثرت تھی۔ درختوں اور پہاڑ کے غاروں میں بہت بڑے بڑے اژدہوں کے گھر تھے۔ دلدلوں، کھاڑیوں اور جھیلوں میں گھڑیال بہت ہیں۔ مرغابیوں، مچھلیوں اور کچھوؤں کی بھرمار ہے۔ جنگل پھلوں، پھولوں، طرح طرح کی خوش رنگ چھوٹی بڑی چڑیوں، مرغوں، مرغیوں، ... سے بھرا پڑا ہے۔ جنگل سے ملے جلے کھیتوں، جیسے مٹر اور جوار وغیرہ کے کھیت ہوتے ہیں۔ ... تربوز، امرود، بیریں، آم، جامن، کٹھل اور کیلوں سے جنگل مہکتا رہتا ہے۔

ہمارے بزرگوں کے زمانے کو نہ پوچھو، سنہری زمانہ تھا ان کا اپنا راج تھا۔ آدمیوں کے شہروں سے دور، اُن کی نگاہوں سے دور، پہاڑوں کی کھلی کھلیاں میں یہ اپنے خزانوں سے اُبلتا ہوا جنگل ہمارے بزرگوں کے لیے قدرت کی بہت بڑی نعمت کی طرح پہاڑوں کی کوکھ میں اور سمندر، ندیوں اور دریاؤں کی گود میں دسترخوان کی طرح بچھا ہوا تھا اور اپنی اولادوں کو چمکار چمکار کر کھلا رہا تھا۔

یکایک کہیں سے پہلے چیتوں کا ایک جوڑا آیا اور یہ چھوٹے چھوٹے جانوروں پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔

پھر تیندوے اور چیتے آئے۔ اس کے بعد تو تانتا سا بندھ گیا۔ لکڑ بگھے، بھیڑیے، کالے بھورے ریچھ، ہاتھی و گینڈوں کا ٹھٹ اپنی خرمستیاں دکھاتا آ کودا۔

معلوم ہوا کہ آسام کا ایک خطرناک جنگل کٹ جانے سے یہ ساری مصیبتیں ہمارے ٹھکانوں پر ٹوٹ پڑی تھیں۔

ہم آدمی نہ تھے اور نہ خود غرض آدمیوں کی طرح سوچا کرتے تھے۔ ہم تعلیم یافتہ بھی نہ تھے کہ زمین پر رہ کر آسمان کی سوچتے یا جھونپڑے میں رہ کر چاند پر سیڑھی لگا کر پہنچنے کی تمنا کرتے یا آسامی غیر آسامی، بنگالی اور غیر بنگالی کا ٹنٹا بٹورتے، مہاجر اور اصلی وطن والوں کا جھگڑا کرتے، نہ ہمارے بزرگ خود غرض انسانوں کی طرح روٹی چور اور لیموں نچوڑ تھے کہ پاسپورٹ اور ویزا کا بکھیڑا پالتے۔ ہمارے وطن میں آ کر اگر یہ حیوان اپنی ہی کھال میں رہتے اور انسانی کرتب نہ دکھاتے تو ہم کو اُن سے کوئی شکایت نہ ہوتی۔"

کلیلہ اور دمنہ: "پھر کیا ہوا؟"

لومڑی: "پھر ہم لوگوں نے ایک وفد بنایا۔ اژدہے، شیر، چیتے، بھیڑیے وغیرہ کو اکٹھا کیا۔ ہاتھی اور گینڈے ہمارے ساتھ تھے۔ ہم لوگوں نے ان کو مشورہ دیا۔

"آپ ہمارے ملک میں آئے ہیں تو سر آنکھوں پر مہمان بن کر سدھانت سے رہیے۔ قدرت نے کھانے پینے کو بہت کچھ دے رکھا ہے اُس پر قناعت کیجیے اور ہم کمزوروں کی زندگی اجیرن نہ کیجیے تو اچھا ہے۔ یہ افریقہ نہیں جہاں آپ نراجیت پھیلائیں۔ اپنی ٹانگوں کو اپنی حد میں رکھیے۔ آدمیوں کے رنگ ڈھنگ اختیار کر کے اپنے ہی لوگوں کی چیر پھاڑ کی عادت ترک کیجیے نہیں تو جس طرح ایک عاجز چیونٹی ہاتھی کی سونڈ میں گھس کر اس کی موت کا سبب بن جاتی ہے۔ ہم کو بھی آپ کے متعلق کچھ سوچنا ہی پڑے گا۔"

اس پر تمام درندوں نے ہم کو آنکھیں دکھائیں اور کوئی معقول جواب دینے کے بدلے جنگ کا الٹی میٹم دینے لگے۔

تب ہم لوگ اُٹھ کر چلے آئے اور جنگل کے سارے جانور اکٹھے ہوئے۔ اژدہے، سانپ اور بچھو چونکہ مدتوں سے ہمارے ساتھ رہتے آئے تھے اس لیے وہ قدرتاً ہمارے ساتھ ہو گئے۔ سیاہ گوش اور جنگلی کتے بڑے ایسے جنگلی جانور ہیں کہ ان کے سامنے کسی کی دال نہیں گلتی، ہمارے ساتھ تھے۔ گینڈے اور ہاتھی نباتات کھانے والے ہیں اس لیے وہ بھی ہمارے ساتھ ہو گئے۔ گھڑیال بھی یہاں چین کی بنسی بجا رہے تھے، ان درندوں کی آمد سے اُن کے چین میں بھی خلل پڑ گیا تھا اس لیے اُن کا ووٹ بھی ہمارے حق میں تھا۔

سب سے پہلے ہم نے سب کی رائے سے گیدڑ کو اپنا

راجا چُنا اور راجا نے سب کی رائے سے مجھے اپنا وزیر بنا لیا اور
جنگ کی رائے پاس کر کے مجھ کو اختیار دیا کہ میں جا کر اُن
سے آخری گفتگو کر لوں اور وہ نہ مانیں تو جنگ کا الٹی میٹم
دے دوں۔

پس میں ایک ہاتھی، ایک گینڈے، ایک کتے اور ایک
سیاہ گوش اور ایک اژدہے کو لے کر درندوں کے مجمع میں
گئی اور دھیرج اور عاجزی کے ساتھ اُن سے کہا:

میں: "غالباً آپ لوگوں نے ہم جانوروں کی درخواست
پر خوب غور کر لیا ہوگا؛ اور "جیو اور جینے دو" کے اصول پر
عمل کرنے کو تیار ہوں گے۔"

مگر اُن کے منھ تو خون لگا تھا انکار کر دیا اور فوراً ہی حملہ
کرنے کو تیار ہو گئے۔

میں نے کہا: "تو سنو اے مغرور درندو! خون ناحق سے تمھارا
قلب سیاہ ہو گیا ہے اور تم جانور کے رُوپ میں ناحق خون
بہانے والے فرقہ پرست، صوبہ پسند آدمی بن گئے ہو۔ تم جہاں
جاتے ہو اپنا جھنڈا لہرانا چاہتے ہو تو یاد رکھو ہم انسان نہیں
حیوان ہیں۔ ہم اہنسا کے نام پر ہنسا نہیں کرتے، مذہب
کے نام پر شیطان کا چرخہ نہیں چلاتے۔ سیدھا سا اصول امن تو
امن اور جنگ تو جنگ۔ اب آ جاؤ میدان میں۔ ظالم کی ناؤ ہمیشہ
نہیں چلتی۔ تمھاری لٹیا بھی ڈوبنے ہی والی ہے۔"

گیڈر راجا نے کہا۔

"بچو! تم نے دیکھا، دو گھنٹوں کے اندر مہا بھارت کی
جگہ "مہا جنگل" کی یدھ (جنگ) ٹھن گئی۔ شیر، چیتے، تیندوے
لکڑ بگھے، بھیڑیے، بلے، بلیاں صف بہ صف بڑھے۔
اُن پر ہاتھیوں نے یلغار کی۔ مگر مچھوں نے للکارا، اژدہے
پھنکارے۔ زہریلے سانپ بل کھا کر سرسرائے۔ بچھوؤں نے
ڈنک اُٹھا کر لڑائی کا ڈنکا پیٹا۔ کتوں نے آفت مچا دی
بوٹیوں پر بوٹیاں اُڑانے لگے۔ سیاہ گوشوں کی بوچھار تو
قیامت تھی قیامت۔ کلیجوں تک گھس کر دل گردوں کی
تکا بوٹی کرنے لگے۔

اژدہوں نے اپنے شکنجوں میں جکڑ لیا اور اس طرح اپنے
پیچ در پیچ میں کس لیا کہ ان درندوں کی چیں بول گئی۔ ہم
نے بھی اپنے حصے کی لڑائی میں پوری سرگرمیاں دکھائیں۔
لیکن ہم نے فرقہ پرست تنگ نظر فسادی انسانوں کی طرح ان
کے کمزوروں، بڈھوں اور بچوں کو بالکل نہ چھیڑا، جوانوں،
تو مندوں اور سرپھروں کا صفایا کر دیا۔

بڈھوں اور بچوں کے سامنے ہم نے اپنی تجویز رکھی:

"ہم جانور ہیں۔ فطرتاً ہمیں جانوروں سے پیار ہے
ہم آدمیوں کی طرح کمزوروں اور بچوں کو نہیں ستاتے
ایک زہریلا سانپ بھی بڑوں کو اس ڈر سے کاٹ لیتا ہے
کہ کہیں وہ اُسے مار ڈالے لیکن بچوں سے خود کترا جاتا
ہے۔ اس لیے ہم تم کو معاف کرتے ہیں۔ اگر تم ان چھوٹے
بچوں کو لے کر اس جنگل میں ہم لوگوں کے ساتھ رہنا چاہو
تو آج سے تم نباتات اور قدرت کے دیے ہوئے پھل پھول
یا مردہ جانوروں کے گوشت پوست پر گزر کرو۔ اگر ایسا ہو تو
ہم کو کوئی اعتراض نہیں، تم شوق سے ہمارے ساتھ اسی
جنگل میں رہو۔ ہم تمھاری اور تمھارے بچوں کی پوری پوری
حفاظت کریں گے۔"

لیکن وہ اس قدر ڈرے ہوئے تھے کہ انھوں نے ہم سے
یہ کہتے ہوئے صرف یہ درخواست کی:

"ہم اپنی فطرت بدل نہیں سکتے اور فرض کر لیجیے کہ ہم
بڈھے اگر اس کا اقرار کر بھی لیں تو جلد ہی ہم پیٹ کے
روگ میں مبتلا ہو کر مر جائیں گے تو ہمارے یہ بچے
جوان ہو کر وہی کچھ کرنے لگیں گے جو ان کے باپ دادا
کی ریت تھی۔ اس لیے ہم لوگوں کا یہاں سے چلا جانا ہی
بھلا ہے۔ البتہ اتنی درخواست ہے کہ ہم کو اور ان
بچوں کو کوئی یہاں کی بھول بھلیوں سے نکال کر
دوسرے جنگل کے سلسلے میں داخل کر دے تو ہم یہاں
سے دور بہت دور اپنے بھائی بندوں میں جا کر
مطمئن ہو جائیں۔"

گیڈر راجا نے کہا:

"ہم نے یہ سن کر کہا " خوب! بہت خوب!!"

تھا۔ اے کلیلہ اور دمنہ! تم نے دیکھا کہ ہم نے حیوان ہو کر کس قدر سچی انسانیت کا ثبوت دیا کہ ان بڈھے شیر، شیرنیوں اور تمام درندوں کے بچوں کو حفاظت کے ساتھ جنگلوں اور پہاڑوں کے اندر ہی اندر یہاں سے بہت دور ان کے جرگے میں پہنچا دیا۔ حالاں کہ ہم جو اذیت پر اتر آتے تو بڑی ہی آسانی کے ساتھ ان کو اپنا لقمہ بنا لیتے۔"

کلیلہ و دمنہ: "سچی انسانیت کیا ہے؟"

لومڑی: "بچو! غور سے سنو!

انسان کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا تھا ہم کو جانور بنا کر یہ احسان کیا کہ ایک وقت میں پیٹ بھر کر ہم مطمئن ہو جاتے ہیں اور اپنے خالق اور رازق کا شکر ادا کرتے ہیں۔ ہم ایک جنس کے علاوہ دوسروں کی زبان بھی سمجھتے ہیں۔ سمجھاتے ہیں۔ ہم سب اپنی فطرت پر ہیں اور انسان خواہش، تمنا اور لالچ میں پھنس سکتا ہے اس لیے عقیدہ خفی ہو جاتا ہے اور دوسروں کے رنگ میں رنگ بھی جاتا ہے۔ اسی لیے وہ لالچی، خود غرض، حریص، جھوٹا، مکار اور دغاباز ہو کر اپنی انسانی فطرت اور جبلت سے بہت دور چلا جاتا ہے اور انسانیت کے مرتبے سے گر جاتا ہے۔ ورنہ صحیح انسان ہیں پہلے پیغمبر ہوتے تھے اب اللہ نے اپنا آخری نبی بھیج کر اس سلسلے کو بند کر دیا لیکن ان کی راہ پر چلنے والوں میں پیر فقیر اور اولیاء اللہ پیدا ہوتے رہے اب بھی ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ یہ لوگ سچے انسان ہیں اور تمام مخلوق، جانوروں کو دوست رکھتے ہیں۔ ملک اور حکومت کے وفادار، وطن کی ترقی چاہنے والے نیک اور سچے ہیں اور ہر مذہب میں اصلی اور سچے مذہبی ایسے ہی نیک، سچے اور امن پسند ہوتے ہیں وہ شانتی چاہتے ہیں صرف شانتی اور سکھ چاہتے ہیں سارے انسانوں کا سکھ۔ ایسے بہت سے لوگ جنگلوں میں پہلے بھی رہے اور اب بھی ہیں۔ سب بھائی چارہ [illegible] یہی سچے انسان ہیں۔ [illegible] محبت کرتے ہیں انسانوں سے بھی اور جانوروں سے بھی [illegible] کا مذہب یہی سکھاتا ہے [illegible] شانتی۔ [illegible] کلیلہ و دمنہ نے اس کا اقرار کیا

(ختم شد)

محمد غیاث الدین تاج

بہترین جہاد کون سا ہے؟

اسلام کے نزدیک والدین کی خدمت سے بڑھ کر کوئی جہاد اور عبادت نہیں ہے۔ اسی لیے اسلام نے مسلمانوں کو سختی کے ساتھ والدین کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ اس بارے میں نبی کریمؐ کا ارشاد ہے۔

"حضرت جابر بن جاہمہؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ! میں نے جہاد میں جانے کا ارادہ کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "کیا تیری ماں زندہ ہے؟" میں نے عرض کیا۔ ہاں زندہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا جاؤ اور ماں کی خدمت کرو۔ کیوں کہ جنت ماں کے قدموں میں ہے۔" (احمد، نسائی)

گویا ماں کی خدمت کرنا میدانِ جہاد میں جان دینے کے برابر ہے۔ اسی طرح ایک دوسری حدیث ہے۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے "کوئی ایسا بیٹا جو ماں باپ کی طرف شفقت اور محبت کی نظر سے دیکھے تو اللہ اس کے حساب میں ہر نظر کے بدلے ایک مقبول حج کا ثواب لکھتے ہیں۔" صحابہؓ نے عرض کیا "اگرچہ دن بھر میں سو مرتبہ دیکھے؟" آپؐ نے فرمایا "ہاں اللہ بڑا اور پاکیزہ ہے۔" (بیہقی)

ان احادیث سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام نے والدین کی اطاعت و فرماں برداری اور ان کی خدمت کو کتنی بڑی اہمیت دی ہے اور اسے بہترین سعادت قرار دیا ہے۔ لیکن زمانۂ حاضرہ کے بچے اور نوجوان والدین کے احترام کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ انھیں ان احادیث سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

اسسٹنٹ ٹیچر اقبال میموریل اردو اسکول
پتیانہ۔ کلٹی۔ بردوان

لیلے والا! ۔ آنے میں دو آنے میں دو
یک گاہک :۔ جانے میں کتنے ؟

لکی راجہ

یاض: (جمیل سے) " دوست، میرے ابا جان ایک ہاتھ سے
یل گاڑی روک لیتے ہیں۔
میل : کیا وہ بہت بڑے پہلوان ہیں ؟
یاض: نہیں وہ ریلوے میں گارڈ ہیں!

ایچ ۔ ایم ۔ رنگ ریز

یک صاحب ایک بہت بڑی تھیلی لے کر بس میں سوار
ہوئے ۔ کنڈکٹر نے بڑے تھیلے کا الگ سے کرایہ مانگا۔
افی جھک جھک کے بعد وہ صاحب آدھا کرایہ دینے کو تیار
ہوئے لیکن کنڈکٹر نہ مانا اور اس نے کہا، اس تھیلا کا وزن
بہت زیادہ ہے، اس لیے آپ کو ایک پوری سواری کا
کرایا دینا پڑے گا۔
یہ سنتے ہی ان صاحب نے تھیلے کو کھول دیا اور بولے
" منے کی اماں" باہر نکل آؤ۔ جب پورا ہی ٹکٹ خریدنا
ہے تو تھیلے میں سفر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

یک پریشان حال مریض ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوا اور
کہنے لگا کہ " ڈاکٹر صاحب مجھے جتنی جلدی ہو سکے دیکھیے۔ میں
بیس سکنڈ میں مرنے والا ہوں۔"
ڈاکٹر نے جواب دیا آپ صرف ایک منٹ انتظار کریں۔

محمد افضل حسین، احنا پرتھوی

باپ (بیٹے سے) بیٹا تمہاری ماں کا انتقال ہو گیا ہے میرے
پاس تمہارے ماموں کا پتا نہیں ہے ان کو کیسے اطلاع
دی جائے ؟
بیٹا (باپ سے) ابا ماموں کو ایک خط لکھ کر پتا منگوا لیا
جائے اور پھر ماں کے انتقال کی خبر دی جائے۔

اسحاق احمد خالد

ڈاکٹر !۔ (مریض سے) اب تو تم کافی صحت مند نظر آتے ہو۔
معلوم ہوتا ہے کہ تم نے میری ہدایت پر آب و ہوا تبدیل
کی ہے۔
مریض :۔ جی ہاں
ڈاکٹر :۔ کہاں گئے تھے ؟
مریض :۔ ایک دوسرے ڈاکٹر کے پاس جس کے مطلب
کی آب و ہوا آپ کے یہاں سے اچھی ہے۔

اُستاد (حمید سے) ! تم بڑے شرارتی ہو، تمہاری شرارت تو
کے علاج کے لیے تمہارے ابا کو بلانا پڑے گا۔
حمید! میرے ابا تو ڈاکٹر ہیں، ان کے یہاں آنے کی
فیس کون دے گا۔

ایک صاحب دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک مچھر
نے انھیں کاٹ لیا۔
صاحب نے جھنجھلا کر کہا " بھائی تمہاری جب ڈیوٹی
ہوگی تو تم اپنا کام کرنا۔ ابھی کیوں پریشان کر رہے ہو
مچھر نے جواب دیا " مہنگائی کا زمانہ ہے نا اوور ٹائم کر
ہوں "

مس چاروسیتا چکرورتی (سائنس گروپ)

(سندیپ گپتا (سائنس گروپ)

سینیر اسکول سرٹیفکٹ کے نتائج

(مس منجو گپتا (ہیومنیٹز گروپ)

نئی دہلی ۳ جون (س ن) سندیپ گپتا اور مس چاروسیتا چکرورتی نے دہلی سینیر اسکول سرٹیفکٹ کلاس XII کے امتحان میں ۹۵ نیصدی نمبر لاکر تمام پچھلے ریکارڈ توڑ دیے ہیں آج یہاں نتائج کا اعلان کرتے ہوئے سینٹرل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن چیرمین مسٹر ٹی ڈی رکتوکل نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ گورنمنٹ بوائز سینیر سیکنڈری اسکول سرائے روہیلہ کے سندیپ اور کونٹ میری اسکول تیس ہزاری کی طالبہ مس چکرورتی دونوں نے ۵۰۰ نمبروں میں ۴۸۰ نمبر حاصل کیے۔

ہریانہ معذور طلبہ کو وظائف:

نئی دہلی ۱۰ جولائی - ہریانہ کے سوشل ویلفیر محکمہ نے ریاست میں اندھے بہرے اور گونگے طالب علموں کو وظائف دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ وظائف نویں جماعت سے دیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ کالج اور پیشہ ورٹریننگ کے طالب علموں کو ۶۰ روپے ماہوار سے وظیفے بڑھا کر ۱۷۰ روپیہ ماہوار تک دیے جائیں گے۔ اندھوں اور معذوروں کو ٹرانسپورٹ الاؤنس بھی دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ کسی منظور شدہ صنعتی ادارے میں زیر ٹریننگ معذور کو ۱۲۰ روپے ماہانہ ایک سال تک وظیفہ دیا جائے گا۔

سنبھل کی طالبہ صبا سعادت

سنبھل ۱۰ جولائی - بال ودیا مندر سنبھل کی طالبہ صبا سعادت نے جونیر ہائی اسکول کے امتحان میں چھ مضامین میں امتیازی نمبر حاصل کر کے ضلع میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ اس نے اسکول کی سالانہ تقریبات میں بھی متعدد انعامات و میڈل حاصل کیے تھے۔

لوہے کے پھیپھڑے

برطانیہ کے پال ٹینز نامی ایک شخص کے سینے میں گذشتہ ۲۵-۲۴ برس سے لوہے کے پھیپھڑے لگے ہوئے ہیں پال ہارشم مغربی سوسکس برطانیہ کا رہنے والا ہے ●

اپریل ۱۹۸۲ کا شمارہ سبزیوں کے ذائقے سے بھرپور تھا ابھی ہم انگلیاں ہی چاٹ رہے تھے کہ پھلوں کے وٹامن میں ڈوبا ہوا۔ جون ۱۹۸۲ کا "پیام تعلیم" موصول ہوا۔ میں ناصر زیدی صاحب کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی اسی طرح صحت مند مشاعرے کا اہتمام کرتے رہیں گے۔ میری طرف سے پیام تعلیم کے تمام قلم کاروں اور ننھے فنکاروں کو مبارک باد قبول ہو۔

انصاری قیوم سروری

بھیونڈی ۴۲۱۳۰۲

ننھے فنکار میں نواب عتیق اطہر زیدی کی تصویر پہلے انعام کی مستحق ہے۔ مظفر حنفی کی نظم "بچوں کا ترانہ" رشید احمد صدیقی مرحوم کی کہانی "توتا کہانی" اور رفیق عابد صاحب کا "پھلوں کا مشاعرہ" اس شمارے کی جان ہے۔

اسحاق احمد خالد
طالب علم
نرمل ، ۵۰۴۱۰۶

اپریل ۱۹۸۲ء کے رسالہ میں سبزیوں کا مشاعرہ بہت پسند آیا۔ اس مشاعرہ میں خاص طور سے کریلے صاحب کے نیم چڑھے اشعار اور ٹماٹر کے میٹھے رسیلے اشعار بہت پسند آئے۔ اور اس رسالے میں کارٹون کہانی "کرکٹ"، "ڈیڑھ ہوشیار تلوار ..." ...

جون ۱۹۸۲ء کے رسالے میں "پھلوں کا مشاعرہ اور بچوں کی کوششیں بھی بہت پسند آئے۔

سید شعیب بادشاہ
کیر آف سید یوسف بادشاہ
سی - ۱۳۳/۴۲ - تھرڈ پولیس لائن مسجد - کرنول
(آندھرا پردیش)

آپ کے خوبصورت پرچہ پیام تعلیم پر نظر پڑی بچوں کا یہ پیارا پرچہ پڑھکر دل خوش ہوگیا۔ جون کے شمارہ میں محمد احمد دلکش کا دل چھو لینے والا مضمون "مولانا محمد علی جوہر" رفیق عابدی کی مزاحیہ کہانی "پھلوں کا مشاعرہ" بے حد پسند آیا۔ اسکے علاوہ "سفید گھوڑا" بھی دلچسپ کہانی تھی۔

عرشی خاتون ، لکھمنیاں ، بیگوسرائے

جون کا "پیام تعلیم" نظر نواز ہوا جس میں شاہد سید کی بھیجی ہوئی کہانی "اپریل فول" پڑھنے کا موقع ملا۔ اس قسم کی اور کہانیاں "پیام تعلیم" میں شائع کردائیں اور بچوں کو سبق سکھائیں۔

قاضی امین الدین شہاب الدین
محمدیہ ہائی اسکول، ۲ مسجد اسٹریٹ، بمبئی ۳

سبھی معلوماتی مضامین اور کہانیاں دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ دوسرے جس طرح پیام تعلیم دن بدن عام ہوتا جارہا ہے اسکے مضامین بھی معیاری اور دلچسپ ہوتے جارہے ہیں اور صفحات بھی کچھ بڑھ چکے ہیں۔ یہ تمام تبدیلیاں میں سمجھتا ہوں آپ کی مدیرانہ صلاحیت کا نتیجہ ہے۔

اشفاق احمد
سوت گرنی کوارٹر، عمر ہمدرد روڈ۔ ناگپور - ۹

جولائی ۸۲ کا ننھے فنکار کا انعام

ننھے فنکار مرزا الیسین بیگ (نرمل) کو دیا گیا۔

کا ... مرزا الیسین بیگ اپنی تصویر اور پورا پتا ...

بچوں کی کوشش

سوال

"ہمالیہ پہاڑ کی ایک بستی المورڑہ میں ایک بڑے میاں رہتے تھے جن کا نام ابوخاں تھا۔ انہیں بکریاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ اکیلے آدمی تھے بس ایک دو بکریاں رکھتے، سارا دن چراتے پھرتے اور ان کے عجیب و غریب نام رکھتے"

یہ باتیں ذاکر صاحب کی کہانی "ابوخاں کی بکری" میں آپ سب ہی نے پڑھی ہوں گی۔ اور اگر آپ کو یہ کہانی یاد ہے تو یہ بھی یاد ہو گا کہ ان کی ایک بکری کا نام چاندنی تھا جو پہاڑی بھیڑیے سے مقابلہ کرتے کرتے بے دم ہو کر زمین پر گر پڑی تھی۔ بھیڑیے نے اسے دبوچ لیا تھا اور اوپر درخت پر چڑیاں بیٹھی بحث کر رہی تھیں۔ "بھیڑیا جیتا یا چاندنی۔؟

دراصل چاندنی کو بھیڑیے نے دبوچ لیا تھا۔ بوڑھے ابوخاں نے یہ سمجھا کہ وہ ختم کر چکا لیکن جب ابوخاں صدمے سے نڈھال سر پکڑے بیٹھے تھے تبھی وہاں سے ذاکر صاحب کا گزر ہوا تھا انہوں نے جب یہ منظر دیکھا تو بھیڑیے کو مار بھگایا اور خون میں ڈوبی چاندنی کو اپنی گاڑی میں ڈال کر گھر لے آئے تھے۔ اس کے زخموں پر ہر طرح طرح کے لیپ کیے۔ اسے دودھ میں ہلدی ملا کر پلائی۔ آہستہ آہستہ چاندنی کے زخم بھرنے لگے۔ وہ تندرست ہونے لگی لیکن اب وہ ڈری ڈری سہمی سہمی سی رہا کرتی تھی کبھی تو وہ ذاکر صاحب سے بھی ڈرنے لگتی۔ ان کے یہاں آنے والوں مہمانوں کو چونک کر دیکھتی وہ سمجھتی تھی ان میں کوئی بھیڑیے کا مالک نہ ہو۔

ابھی اس کے زخم پوری طرح بھرنے بھی نہ پائے تھے اور ذاکر صاحب کی تمام احتیاطی تدبیروں کے بعد بھی۔ ایک روز . . . .

ایک روز نہ جانے کہاں سے بھیڑیا وہاں آن پہنچا۔ چاندنی نے اپنی سہمی ہوئی نظروں سے پہلے تو بھیڑیے کو دیکھا پھر وہ ذاکر صاحب کو ڈھونڈنے لگی

ذاکر صاحب اپنے مکان کے کسی محفوظ کمرے میں بیٹھے فائلوں کو الٹ پلٹ رہے تھے۔ چاندنی کی ڈری ڈری میں میں سن کر وہ تیزی سے نیچے اترے۔ دیکھا بھیڑیا اور چاندنی ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہیں اور اس سے پہلے کہ وہ بھیڑیے پر جھپٹے بھیڑیے نے چاندنی پر حملہ کر دیا۔ چاندنی نے جھکائی دینی چاہی لیکن ناکام رہی۔ اس کے بھرے ہوئے زخموں کے منھ کھل گئے خون رسنے لگا۔ ذاکر صاحب بھیڑیے پر لپکے۔ اس نے چاندنی کو چھوڑا ذاکر صاحب پر چھلانگ لگا دی۔ انھیں لہو لہان کیا۔ ذاکر صاحب اور چاندنی کی چیخ پر نوکر چاکر دوڑے۔ لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر بھیڑیا فرار ہو گیا۔

بڑے بڑے لوگ جمع ہوئے۔ بڑے پیمانے پر باتیں ہوئیں۔ سرکاری افسروں نے چند آدمیوں کے ذمہ یہ کام سونپا کہ وہ اس بات کا پتا چلائیں کہ ہری ہری بستیوں میں بھیڑیا آتا کہاں سے ہے۔

آج بھی وہ سرکاری افسر اس سوال کا جواب تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن بھیڑیا آج بھی حملے کر رہا ہے۔

اور آج مہر نے میرے ساتھ شرارت کی یا حماقت۔

ظہیر خاں
درجہ نہم
سانے گروجی ہائی اسکول ناگپور

اندھی عقل

ایک بہت بڑے بزرگ تھے۔ ان کے دو شاگرد تھے۔ ایک دن بزرگ نے دونوں شاگردوں کو اپنے پاس بلا کر کہا "میرے پیارے بچو میں اجمیر شریف جا رہا ہوں۔ میں وہاں سے آٹھ سال کے بعد لوٹوں گا۔ میرے پاس صرف دو سیر چنے ہیں جنہیں میں تمہارے درمیان تقسیم کر رہا ہوں۔ واپس آنے کے بعد دیکھوں گا کہ تم نے ان چنوں کا کیا کیا۔" بزرگ نے دونوں شاگردوں کو چنے دے دیئے اور اجمیر چلے گئے۔ وقت گزرنے لگا۔ جب آٹھ سال پورے ہونے لگے تو دونوں شاگرد بزرگ کا انتظار کرنے لگے۔ آٹھ سال کے بعد بزرگ واپس آ گئے۔ انہوں نے پہلے شاگرد سے پوچھا "بیٹا بتاؤ تم نے دیے ہوئے چنے کا کیا کیا؟" شاگرد نے [illegible] کی طرف اشارہ کیا "یہ رہا حضرت آپ کا دیا ہوا تحفہ۔" بزرگ نے حیرت سے سب کچھ دیکھا اور بولے "لیکن یہ سب کیسے ہوا؟" شاگرد نے بتایا "آپ کی دعا کا اثر ہے۔ مجھے آپ نے جو چنے دیے تھے میں نے ان کو بو دیا اور ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کی۔ اسی محنت سے ایک سیر چنے سے کئی من چنے پیدا ہو گئے۔ [illegible] [illegible] [illegible] سیر چنے کا [illegible] ہے۔"

بزرگ نے جب دوسرے شاگرد کو بلایا [illegible] [illegible] تم نے میرے چنے کا کیا کیا؟ [illegible] خوبصورت تھیلی [illegible] [illegible] کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔ [illegible] نے حیرت سے پوچھا کیا ہے۔ دوسرے شاگرد

نے بڑی عقل مندی سے کہا "حضرت یہ آپ ہی کا دیا ہوا تحفہ ہے میں نے آپ کے دیے چنے اس مخمل کے کپڑے میں بند کر رکھے ہیں روزانہ صبح اٹھ کر میں ان پر فاتحہ پڑھتا ہوں۔" بزرگ نے مسکراتے ہوئے کہا "ذرا اسے کھولنا تو سہی۔" کھولا تو معلوم ہوا کہ چنے خراب ہو گئے ہیں یہ حالت دیکھ کر کہا "بیٹے اگر تم نے عقل سے کام لیا ہوتا تو یہ چنے بڑھ سکتے تھے۔ لیکن تم نے اپنی بیوقوفی سے انھیں برباد کر ڈالا۔" تمہارے دوست نے عقل سے کام کیا اس لیے اس کے چنوں میں برکت ہوئی۔ تم نے اپنی اندھی عقل سے چنے بھی برباد کیے اور آٹھ سال بھی۔ صرف فاتحہ پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کامیابی کے لیے عمل بھی ضروری ہے۔

افسر اقبال
تاج آباد شریف ٹھاکر پلاٹ ناگپور
اسکول: سانے گروجی اردو ہائی اسکول (ناگپور)

گلاب پری

کسی گاؤں میں ایک درزی رہتا تھا۔ اس کے تین لڑکے تھے۔ بڑا لڑکا پردیس گھومنے گیا۔ اس کی خالہ نے اس کو ایک گدھا دیا اور کہا کہ اس سے کہو کہ "اگل" تو یہ فوراً سونا اگلے گا، اور پوری تھیلی بھر دے گا۔ لڑکا خوش خوش گھر روانہ ہوا۔ چلتے چلتے رات ہو گئی، لڑکا ایک سرائے میں ٹھہر گیا۔ بھٹیارے سے لڑکے نے کہا خوب عمدہ عمدہ کھانا لاؤ۔ بھٹیارا اچھے اچھے عمدہ کھانے پکوا کر لایا، لڑکے نے سونے کے ٹکڑے بھٹیارے کو دیے۔ بھٹیارا بڑا خوش ہوا اور سوچنے لگا یہ سونے کے ٹکڑے لڑکے کے پاس کہاں سے آئے۔ ہو نہ ہو کوئی خوبی اسی گدھے میں ضرور ہے۔ یہ سوچ کر بھٹیارا جاگتا رہا۔ جب لڑکا سو گیا تو گدھے کو چرا کر لے گیا اور دوسرا گدھا اس کی جگہ پر باندھ دیا۔

لڑکا اندھیرے منہ اٹھا اور گدھے کو

لے کر روانہ ہوگیا۔ گھر پہنچا تو اسے دیکھ کر باپ بھائی سب جمع ہوگئے اور خوشی خوشی باتیں کرنے لگے۔

باپ: "کہو بیٹا پردیس میں کیا کیا سیکھا؟"

لڑکا: "سوداگری" باپ: "ہمارے لیے کیا لائے ہو؟"

لڑکا: "یہ گدھا" باپ: "توبہ کرو۔ گدھا لانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہاں سینکڑوں گدھے مارے مارے پھرتے ہیں"

لڑکا: "نہیں ابا جان یہ معمولی گدھا نہیں ہے۔ اس میں ایک خاص بات ہے۔" باپ "وہ کیا؟"

لڑکا: "اس میں خوبی یہ ہے کہ اس کے منہ میں تھیلی باندھ دیں اور کہیں کہ "اگل" تو یہ فوراً سونا اگلنے لگتا ہے اور تھیلی کو بھر دیتا ہے۔" بوڑھا بیٹے کی بات کو تعجب سے سنتا رہا اور شک کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ آخر لڑکے نے کہا "آپ اپنے دوستوں کو بلایئے میں ابھی سب کو دولت سے مالا مال کیے دیتا ہوں" درزی نے اپنے خاص خاص دوستوں کو جمع کیا۔ جب سب لوگ آ گئے تو لڑکا گدھے کو لے کر آیا۔ اس کے منہ میں تھیلی باندھی اور کہا کہ "اگل"۔ لیکن گدھا جوں کا توں کھڑا رہا لڑکے نے کئی مرتبہ چلا چلا کر کہا "اگل" "اگل"۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ تھیلی جیسی خالی تھی ویسی ہی رہی اور گدھا چپ چاپ کھڑا رہا۔

اب لڑکا سمجھا کہ بھٹیارے نے گدھا چرا لیا۔ درزی اپنے دوستوں کے سامنے بڑا شرمندہ ہوا۔ لڑکے پر خفا ہونے لگا "تو نے مجھے سب کے سامنے ذلیل کیا" لڑکے نے سارا قصہ اپنے منجھلے بھائی کو سنایا۔ جس سرائے میں ٹھہرا تھا وہاں کا پتا بتلا دیا۔ اب دوسرا بھائی سفر پر روانہ ہوا۔ کئی دن تک برابر چلتا رہا کئی دن بعد ایک دن اس کو ایک بڑھیا ملی، بڑھیا جنگل کے کنارے ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں رہتی تھی، لڑکا بڑھیا کے ساتھ رہنے لگا۔ بڑھیا جو کام بتلاتی اس کو بڑی محنت سے کرتا۔ بڑھیا اس کے کام سے بڑی خوش تھی۔

ایک دن لڑکے نے گھر جانے کو کہا۔ بڑھیا نے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا، اور کہا "دیکھو بیٹا میرے پاس ایک "سینی" ہے۔ جب کہو گے کہ "بھر جا" تو یہ بہترین کھانوں سے بھر جائے گی، اور جتنے آدمی بیٹھے ہوں گے پیٹ بھر کے کھائیں گے۔ تم یہ سینی لیتے جاؤ"۔ لڑکا سینی پا کر بہت خوش ہوا اور گھر کی طرف چلا۔ راستے میں اس کو وہی سرائے ملی جہاں بڑے بھائی کا گدھا چوری گیا تھا۔ رات بسر کرنے کے لیے رک گیا۔

بھٹیارے نے کھانے کے لیے پوچھا۔ لڑکے نے کہا "میں خود تم کو کھلا دوں گا۔" بھٹیارے نے کہا "تمہارے پاس تو کچھ ہے نہیں تم کہاں سے کھلاؤ گے۔" لڑکے نے کہا "ٹھہرو" "سینی" سامنے نکال کر رکھ دی اور کہا "بھر جا" یہ کہتے ہی سینی اچھے اچھے کھانوں سے بھر گئی۔ بھٹیارا اس نرالی سینی کو لالچ بھری نظروں سے تکنے لگا۔ اور اس کو چرانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔

لڑکا کافی تھکا ہوا تھا کھانا کھا کر سو گیا۔ بھٹیارا تاک میں تو لگا ہی ہوا تھا۔ جب لڑکا سو گیا تو چپکے سے "سینی" اٹھا کر لے گیا، اور اس کی جگہ پر ویسی ہی سینی رکھ دی۔

لڑکا صبح سویرے اٹھا اور "سینی" لے کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچا تو باپ، بھائی سب اس کو دیکھ کر خوش ہو گئے۔ اور باتیں کرنے لگے۔ لڑکے نے اپنے سفر کا سارا حال بیان کیا اور مزے لے لے کر "سینی" کی خوبی بیان کی، درزی کو "سینی" کی اس خوبی کا یقین نہ آیا۔ لڑکے نے کہا امتحان لے لیجیے۔ آپ لوگوں کو بلوایئے دیکھیے میں ابھی سب کے لیے اچھے اچھے کھانے منگوائے دیتا ہوں۔ لڑکے نے جب بہت ہی اصرار سے "سینی" کی خوبی بیان کی تو باپ نے اپنے چند دوستوں کی دعوت کی، سب لوگ گول دائرہ بنا کر بیٹھے اور بیچ میں "سینی" رکھی گئی۔ لڑکے نے کہا "بھر جا" لیکن "سینی" خالی کی خالی ہی رہی۔ اس نے پھر کہا بھر جا لیکن پھر بھی کچھ نہ ہوا تین چار مرتبہ چلا چلا کر کہا بھر جا، بھر جا، لیکن سینی ویسی ہی

اسکول کے احاطے میں ہم دونوں کے داخل ہوتے ہی گھنٹی بج گئی۔ میں تیزی سے اپنے کمرے کی طرف لپکا۔ لیکن طارق کی چال میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ سستی کے ساتھ چلتا ہوا آکر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سوال کے پرچے بٹنے لگے۔ میں نے سوال کا پرچہ لیکر ایک مرتبہ آنکھیں بند کر کے خدا کو یاد کیا اور جواب لکھنا شروع کر دیا۔ درمیان میں جب کبھی طارق پر نظر پڑتی اسکے ہاتھ میں مڑے تڑے کاغذ دیکھ کر مجھے جھرجھری سی ہونے لگتی۔

"صرف آدھا گھنٹہ باقی ہے۔" استاد صاحب نے آواز دی۔ میں نے ماتھے پر آئے پسینے کو ہینڈ سے رگڑتے ہوئے سوال کے پرچہ پر نگاہ ڈالی۔ صرف ایک سوال باقی تھا۔ آخری سوال!

لڑکوں کے قلم کی حرکت تیز ہوتی جا رہی تھی۔ [illegible] نے سوال پڑھا۔ پڑھتے ہی سر چکرا گیا۔ جس سوال کے [illegible] امید میں نے خواب میں بھی نہیں کی تھی وہ آج اس [illegible] ہمارے سامنے تھا۔ سوچا یہ سوال حل نہیں کیا تو [illegible] فیصد کی نمبر حاصل کرنے کی امید رکھی رہ جائیگی۔ [illegible] پر نگاہ گئی تو سارے حروف دھندلے نظر آنے لگے۔ [illegible] نظر گئی تو طارق میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

"ہو گیا ختم؟" وہ قلم کو جیب میں رکھتا ہوا بولا۔

"نہیں آخری سوال نہیں آتا۔" میرا گلا رندھ گیا۔

[illegible] طارق مسکرایا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ [illegible] نے کرسی کے پیچھے چھپا ایک کاغذ نکالا اور [illegible] کی پڑیا بنا کر میری طرف اچھالتا ہوا بولا۔

"[illegible] لے [illegible] بات ہے۔"

جیسے ہی وہ پڑیا میری ڈیسک پر گری میں [illegible] ٹھٹک گیا۔ جیسے کسی نے بجلی کا تار چھوا [illegible] دوسرے ہی لمحہ حالات حاضرہ پر نگاہ ڈالتے [illegible] پڑیا کو ہاتھ سے ڈھک کر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ [illegible]د صاحب کھڑکی کے پاس کھڑے باہر کا معائنہ کر رہے تھے۔ میں نے پڑیا کھول دی۔ اس پر لکھے الفاظ کے پیچھے پیچھے کامیابی رقص کرتی نظر آئی۔ من ہی من میں خدا سے معافی مانگی اور عہد کیا۔ "یہ امتحان میں کی گئی میری پہلی اور آخری نقل ہوگی۔ اسکے بعد زندگی میں ایسا کام کبھی نہیں کرونگا۔" دوبارہ سہمی ہوئی نظروں سے استاد صاحب کو دیکھا وہ اب بھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے کھڑکی کے سلاخوں سے پھسلتی ہوئی میری نگاہ سڑک پر جا پہنچی۔ سڑک پر مزدور ادھر سے ادھر دوڑ رہے تھے اور کولتار کے ڈرم ادھر ادھر لڑھک رہے تھے۔ ایک مستری سڑک پر پتھر کے ٹکڑوں کو پھیلا رہا تھا ٹھیک اسی لگن کے ساتھ جس طرح رامو کہا کرتا تھا۔ یکایک...

...... "چھوٹے بابو۔ میری عادت بگڑ جائیگی۔ ایک بار بے گار ٹالنے کی، غلط کام کرنے کی عادت پڑ گئی تو پھر عادت تو عادت ہی ہے۔" رامو مستری کے کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے اور مجھے محسوس ہوا جیسے یہ الفاظ میرے دل میں نشتر کی طرح چبھ رہے ہیں اور ہاتھ میں کھلا ہوا کاغذ پھر پڑیا بن گیا اور میں اسے بغل والی کھڑکی سے باہر اچھال کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

ارشد مسعود ہاشمی
محلہ کرہ، مظفرپور، بہار

ندامت

ماسٹر اشفاق نے کلاس میں داخل ہوتے ہی حامد کو ایک گلاس پانی لانے کا حکم د[illegible] حامد نے فوراً ایک شیشے کے گلاس میں پانی ما[illegible] اشفاق کی جانب بڑھایا۔ لیکن اچانک گلا[illegible] حامد کے ہاتھ سے گر کر چور چور ہو گیا۔ پانی کے چند قطرے ماسٹر صاحب کے کپڑوں پر گر[illegible] حامد ڈر کر ماسٹر اشفاق کی طرف دیکھنے لگا۔ دوبارہ ماسٹر اشفاق نے پانی لانے کے [illegible] کہا جب وہ دوبارہ پانی لے کر آ رہا تھا۔ [illegible]

اچانک ایک ٹھوکر لگی اور حامد کے ہاتھ سے گلاس دور جا پڑا۔ یہ دیکھ کر ماسٹر اشفاق کو غصہ آگیا۔ انھوں نے حامد کو بہت ڈانٹا۔ اور مٹی کا گھڑا جو پانی سے بھرا ہوا تھا حامد کے سر پر رکھ دیا اور کہا کہ جب تک چھٹی کی گھنٹی نہ بجے تم اس وقت تک اسے لیے کھڑے رہو۔ کلاس کا ہر لڑکا حامد کی طرف دیکھ کر ہنس رہا تھا اور حامد کی نظر ندامت کی وجہ سے جھکی ہوئی تھی۔ وزنی گھڑا ہونے کی وجہ سے حامد پسینے پسینے ہو رہا تھا۔

چھٹی کی گھنٹی بجنے میں ابھی تھوڑی دیر باقی تھی کہ گھڑا حامد کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ یہ دیکھ کر ماسٹر اشفاق مارے غصہ کے چھڑی لے کر حامد کو مارنے لگے۔ اسکول کے تمام ماسٹر اور لڑکوں کے بیچ حامد تماشا بنا مار کھا رہا تھا۔ ماسٹر اشفاق کی نظر اس کو مارتے ہوئے گھڑے کے اس ٹکڑے پر پڑی جو کچھ دیر پہلے ٹوٹ گیا تھا۔ اس میں ایک چھوٹی ہوئی چھپکلی پڑی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ ماسٹر اشفاق پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ وہاں پر جتنے لوگ موجود تھے سب کی نظریں اس چھپکلی پر پڑیں۔ یہ دیکھ کر سب حیرت میں پڑ گئے۔

ماسٹر اشفاق ندامت کی وجہ سے سر جھکائے ہوئے تھے جو تھوڑی دیر پہلے ہنس رہے تھے۔ اب نادم تھے۔ ماسٹر اشفاق نے دوڑ کر حامد کو گلے لگایا اور کہا خدا نے تمھاری وجہ سے میری اور کتنوں کی جانیں بچا لیں۔

سچ ہے کہ خدا اپنے اچھے بندوں کی ہر طرح سے حفاظت کرتا ہے۔

سہیل عارف
نئی بستی رحمت نگر، برنپور، بردوان

Regd No. D(SE)-043 August, 1982

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

برلی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، دہلی

پیامِ تعلیم

بچوں کی کتابیں
اسلام کے مشہور سپہ سالار حصہ اول، دوم
عبدالواحد سندھی جامعی
بچوں کے لیے اسلام کے مشہور سپہ سالاروں کا تفصیلی تعارف جن کی زیر قیادت لڑی گئی جنگوں کے حالات جن کے پڑھنے سے ایمان میں تازگی آتی ہے۔
حصہ اول ۴/= دوم ۴/=
اسلام کے مشہور امیر البحر
عبدالواحد سندھی جامعی
اس کتاب میں مسلمانوں کے جہاز سازی اور جہاز رانی کے کارنامے نیز ان سمندری سپہ سالاروں کے حالات بتائے گئے ہیں جنھوں نے تاریخ میں نام اونچا کیا۔
قیمت: ۴/=
اللہ کے خلیل
خلیل احمد جامعی
مسلمانوں کے جد امجد حضرت ابراہیمؑ کی سیرت مبارک سے متعارف کرانے والی بچوں کے لیے ایک عمدہ کتاب
چنبیلی
محمد حسین حسان
ابتدائی درجوں کے بچوں کے لیے چنبیلی نامی ایک بلی کی مزیدار کہانی۔
قیمت: ۵۰/-
دُم کٹا سانپ
محمد قاسم صدیقی
سچی عبادت، بے ایمان قاضی اور راجا اور پرجا۔ تین سبق آموز کہانیوں کا مجموعہ
قیمت: ۱/-
چٹانوں کی کہانی
محمد امین
قدرتی حالات و واقعات نے زمین اور چٹانوں کی شکل و صورت کو کس طرح بدلا؟ اس کا جواب اس کتاب میں ملے گا۔ قیمت ۴/۵۰
موم کا محل
پروفیسر محمد انس
شہد کی مکھیوں کی کہانی جو خود شہد کی طرح میٹھی اور دل پسند ہے۔ بڑے بچوں کے لیے کہانی کی طرز پر لکھی گئی ایک عمدہ معلوماتی کتاب۔
قیمت: ۴/=
میگھ نگر کا راجا
ریاض احمد خاں
قیمت: ۱/۲۵
میر انیس
محمد حسین حسان
قیمت: ۴/۵۰
بچوں کے اقبال
اطہر پرویز
قیمت: ۴/۵۰
مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵-۱۱

ستمبر ۱۹۸۲ء　جلد ۱۹　شمارہ ۹

اڈیٹر: ولی شاہجہانپوری
فی پرچہ: ڈیڑھ روپے　سالانہ پندرہ روپے
غیر ممالک کے لیے 65 روپے

عید الفطر کی مبارکباد باسی ہوکر آپ تک پہنچی تھی میٹھی چیزیں ٹھنڈی ہی مزا دیتی ہیں! لیجیے اب عید قرباں کی مبارکباد قبول فرمائیے۔ دعا ہے کہ خلوصِ نیت سے پیش کی گئی قربانیاں بارگاہِ رب العزت میں قبولیت کا شرف حاصل کریں۔

اگست کا شمارہ اپنے مضامین کے ساتھ رنگین صفحات کی وجہ سے کافی پسند کیا گیا۔ بعض خط ایسے بھی ملے جن میں کہا گیا ہے کہ رنگین کاغذ سے آنکھوں پر اچھا اثر نہیں پڑتا۔ رنگین کاغذ پر حروف واضح نہیں ہو پاتے۔ ڈاکٹر قنبر احمد رضوی کا "عراق" کافی پسند کیا گیا۔ اس کی دوسری قسط اس شمارے میں پڑھیے اور اگلے شمارے میں بھی۔ امید ہے کہ قنبر صاحب آپ کو گھر بیٹھے پوری دنیا کی سیر کرا دیں گے۔ ہم ابھی سے ان کا پیشگی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اگست میں مسعود احمد برکاتی صاحب کا "جوتے کی فریاد" سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔

نظموں میں ڈاکٹر امانت کی "اندھی لڑکی کی آرزو" دل پر اثر کرنے والی نظم بھی پسند آئی اور امۃ الرحمٰن محسنی نے بچوں کو ملاقات کے آداب سکھانے کا دلچسپ طریقہ بتایا ہے اسے بھی سراہا گیا ہے۔

اس مرتبہ شمس فرخ آبادی صاحب نے کچھ جانوروں کا تعارف بڑے انوکھے اور دلچسپ انداز میں کرایا ہے۔

اس شمارے کے مضامین، کہانیاں اور نظمیں، سب اپنی اپنی جگہ دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ پسند کریں گے۔ ان کے بارے میں اپنی رائے لکھنا نہ بھولیے

پرنٹر پبلشر سید احمد ذکی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

دعوت کے دوران ایک بچے نے میزبان خاتون سے میٹھے کی پلیٹ دوبارہ مانگی... میزبان خاتون نے اسے پلیٹ دیتے ہوئے کہا...

بیٹے! کیا تمھاری ممی نے تمہیں نہیں بتایا کہ محفل میں بیٹھ کر میٹھا دوبارہ نہیں مانگا کرتے۔
بچے نے برجستہ جواب دیا۔ لیکن انھیں یہ کیا خبر تھی کہ دعوت میں پلیٹ میں اتنا کم میٹھا ہوتا ہے۔

محمد سیف اللہ، محلہ پتیانہ کلٹی بردوان

لڑکا: پاپا جب میں میٹرک کا امتحان پاس کر جاؤں گا تب آپ مجھے کیا دلوائیں گے۔
باپ: پاس ہو گئے تو سائیکل، فیل ہو گئے تو رکشا۔

سید شمس العارفین رضوی ہپورڈ (اورنگ آباد) بہار

ایک ضعیف عورت سڑک کے کنارے گر پڑی ایک نوجوان لڑکے نے اسے پکڑ کر اٹھایا تو ضعیف عورت نے دعا دیتے ہوئے کہا،
"یا اللہ جس طرح اس نے مجھے اٹھایا ہے تو بھی اسے اٹھالے"

رومی شاہین سلطانہ، محلہ پتیانہ، کلٹی، مغربی بنگال

ایک صاحب پاگل خانے گئے کئی پاگلوں کو دیکھ کر ایک کوٹھری پر گئے دیکھا ایک اچھا خاصا آدمی بیٹھا ہے علیک سلیک کے بعد پوچھا کہ آپ تو اچھے خاصے نظر آتے ہیں پھر آپ کو یہاں کیوں رکھا ہے۔
جواب دیا کہ میں پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا ان انگریز بچوں نے مجھے پاگل سمجھ کر یہاں بھیج دیا۔ یہ سن کر پڑوس کی کوٹھری سے آواز آئی "یہ جھوٹا ہے میں نے کسی کو پیغمبر نہیں بنایا۔
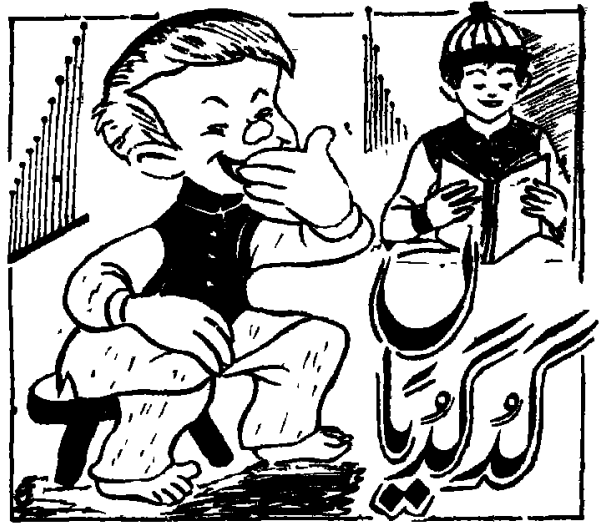
ایک صاحب دو جوڑے جوتے خرید کر لائے، ایک سفید ایک سیاہ، صبح دفتر گئے تو ایک پیر میں سفید اور ایک پیر میں سیاہ جوتا پہن کر چلے گئے۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا۔ کہنے لگے۔
دکاندار نے یہی دیے تھے، شام کو گھر آئے تو دیکھا کہ ایک کالا اور ایک سفید جوتا رکھا ہے بولے کمبخت نے دوسرا جوڑا بھی ایسا ہی دے دیا

واثقہ ولی

استاد: ۔ آصف! تم نے لکھتے لکھتے قلم جیب میں کیوں رکھ لیا۔
آصف: ۔ سر! آپ ہی نے تو کہا ہے کہ بابر کے بارے میں قلم بند کرو۔

محمد اقبال حسین، کیندوا ہائی اسکول، کلٹی

ماسٹر:- بچو، لفظ "حق" کو جملے میں استعمال کرو۔
ایک لڑکا:- مولوی عبدالحق اردو کے بہت بڑے ادیب تھے۔

جاوید نہال حشمی، کانکی نارہ

اگست ۸۲ کا ننھے فنکار کا انعام
ننھے فنکار شنوبنت ہنر (الہ آباد) کو دیا گیا۔
شنوبنت ہنر اپنی تصویر اور پورا پتا فوراً لکھیں۔

کا انعام

ایک تھا پہاڑ۔ اس پہاڑ کے نچلے حصّے میں تھا ایک غار۔ نہ بہت گہرا اور نہ بہت چھوٹا۔ اُس غار کے اندر رہتا تھا ایک بوڑھا خرگوش۔ جب جوان تھا تو سارا دن اپنے ساتھیوں کے ساتھ اِدھر اُدھر گھوم پھر کر وقت گزار دیتا تھا۔ کوئی فکر نہیں تھی۔ کوئی غم نہیں تھا۔ بوڑھا ہوا تو زیادہ گھوم پھر نہیں سکتا تھا۔ خوش قسمتی یہ ہوئی کہ ایک روز اسے اس غار کا علم ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ کھا پی کر غار میں آجاتا تھا اور ساری رات سوتا رہتا تھا۔

آدمی ہو یا کوئی جانور اُسے تنہائی زیادہ دیر تک پسند نہیں آتی۔ خرگوش کو اور تو کوئی تکلیف نہیں تھی۔ مگر تنہائی کا اذیت ناک احساس اسے اس قدر ستاتا رہتا تھا کہ بے چارہ رو پڑتا تھا اور دل میں یہ سوچ لیتا تھا کہ وہ دوسرے دن صبح ہی کو جو بھی ہرن، بارہ سنگھا یا کوئی اور جانور نظر آئے گا اسے اپنا دوست بنا کر اپنے گھر میں لے آئے گا۔ غار کو وہ اپنا گھر سمجھتا تھا۔ اور یہ غار اُس کا گھر نہیں تھا تو اور کیا تھا؟

ایک دن ملی اسے ایک بکری سفید رنگ کی نیچے میدان میں گھاس چر رہی تھی۔ خرگوش اس کے پاس پہنچا اور ادب سے بولا:

"بہن بکری سلام!"

بکری نے جو اپنے سامنے خرگوش کو دیکھا تو ہنس کے کہنے لگی:۔

"ارے تو کب سے میرا بھائی بن گیا۔ میں بکری، تو ذرا سا خرگوش۔ میرا تجھ سے کیا واسطہ؟"

خرگوش کو اُس کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ تاہم اُس نے تو سوچ رکھا تھا کہ کسی کو اپنے گھر میں لا کر ہر وقت کی تنہائی کو دور کر دے گا۔ دوبارہ بکری سے مخاطب ہوا۔

"بکری بہن! میں نے تو کوئی بری بات نہیں کی سلام کیا ہے۔"

"اچھا، سلام کیا ہے، وعلیکم السلام۔ مزاج کیسے ہیں حضور کے، کہاں رہتے ہیں۔" بکری نے ذرا محبت سے پوچھا۔

خرگوش خوش ہوا کہ بکری نرم پڑ گئی ہے۔ بولا:

"وہ سامنے میرا مکان ہے پسند فرمائیں تو تشریف لے چلیں۔"

معرفت نونہال کراچی

بکری نے کہا: "ذرا ٹھہر جاؤ، ابھی میرا پیٹ پوری طرح نہیں بھرا۔" اور جب بکری کا پیٹ بھر گیا تو وہ خرگوش کے ساتھ غار میں آگئی۔

"واہ وا، بہت اچھا گھر ہے" وہ غار دیکھ کر خوش ہوگئی۔

"تو بہن بکری! میری بات مانیں گی؟" خرگوش بولا۔

"ضرور، ضرور، کہو، ماننے والی بات ہوگی تو ماننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

"بکری بہن! آپ نے اس گھر کو پسند کر لیا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ آپ بھی اسے اپنا گھر بنا لیں۔ دونوں مزے سے رہیں گے۔"

خرگوش نے جیسے ہی یہ لفظ کہے تو بکری کا تو ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔ بے اختیار ہنسے جا رہی تھی۔ جب ذرا سنبھلی تو کہنے لگی۔

"ارے خرگوش میاں، تو نے کیا سمجھ کر یہ بات کہی ہے۔ میرا اپنا گھر نہیں ہے جو میں اس واہیات غار کے اندر رہوں گی؟ میری ماں ہے، باپ ہے۔ خالہ ہے۔ کتنے ہی رشتہ دار ہیں۔ ہم سب سامنے جنگل کے اس پار ایک آدمی کے گھر میں رہتے ہیں جو ہمارا بہت خیال رکھتا ہے۔ ہمیں ہر روز اپنے ساتھ لے کر یہاں آتا ہے۔ میرے عزیز ندی کے کنارے پھر رہے ہوں گے۔ میرا جی چاہا کہ ذرا پہاڑی کی سیر کر لوں۔ اس لیے آگئی۔"

بکری نے یہ کہا اور ایک ہی منٹ میں نظروں سے غائب ہوگئی۔ خرگوش اسے دیکھتا رہ گیا۔

ایک بار اس نے ایک مور سے بھی اپنے گھر میں رہنے کے لیے کہا۔ اس کا بھی وہی رویہ تھا جو بکری کا تھا۔

خرگوش مایوس ہو گیا۔ اس نے پھر کسی سے یہ بات نہ کہی۔

اس پہاڑ پر بارش تو ہوتی ہی رہتی تھی۔ لیکن زیادہ نہیں۔ بس ایک بار ایسا ہوا کہ بارش شروع ہوئی تو ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ خرگوش کا گھر بالکل محفوظ تھا۔ نہ صرف گھر محفوظ تھا بلکہ اردگرد بھی پانی جمع نہیں رہا تھا۔

پورا دن گزر گیا اور بارش کے زور شور میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ خرگوش اپنے گھر میں مزے سے بیٹھا تھا۔ اس کے جی میں آئی کہ ذرا باہر جا کر تو دیکھوں پانی کہاں کہاں تک پھیل گیا ہے۔

اس نے دیکھا کہ ایک جنگلی بلی بری طرح کانپ رہی ہے۔ وہ اس کے پاس گیا۔

"سلام خالہ جان! کہیے کیا حال ہے؟"

بلی کے منہ سے بڑی مشکل سے نکلا۔

"مر رہی ہوں، کوئی جگہ بتاؤ۔"

"آؤ خالہ! کیا یاد کرو گی۔ تمہارا یہ بھانجا آخر کس دن تمہارے کام آئے گا۔"

خرگوش بلی کو اپنے گھر لے آیا۔ غار کی گرم فضا میں بلی کی جان میں جان آئی۔ شکریہ ادا کر کے کہنے لگی۔

"پیارے بھانجے! تو بہت اچھا اور پیارا بھانجا ہے۔ میری ایک بہن بھی ہے جو میری طرح باہر سردی میں کہیں پڑی ہوگی۔ شاباش، ذرا ڈھونڈ تو اسے۔"

"کہاں ڈھونڈوں، خالہ؟"

"بیٹا! یہیں کہیں ہوگی۔ سردی سے مر جائے گی۔"

خرگوش غار سے نکل آیا۔ ایک جگہ اسے بلی کی بہن مل گئی۔ اس طرح کانپ رہی تھی کہ لگتا تھا تھوڑی دیر میں مر جائے گی۔ خرگوش نے اسے بتایا کہ وہ اس کی بہن کو اپنے گھر لے گیا ہے اور اب اسے لے جانے کے لیے باہر آیا ہے۔ وہ فوراً اس کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوگئی۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے کہ ایک ہرن ملا۔ اس کی ایک ٹانگ زخمی تھی۔ بڑی مشکل سے قدم اٹھاتا تھا۔ کہیں دور سے آیا تھا۔ برف اس کے جسم پر جمی تھی۔ اس نے خرگوش کو دیکھا تو کہنے لگا۔

"خرگوش بھائی! سنا ہے تم ایک غار میں رہتے ہو جو بڑا گرم ہے۔ میں کافی دیر سے تمہارا غار ڈھونڈ رہا ہوں۔ اللہ کے واسطے مجھے لے چلو۔"

خرگوش بولا: "چلو بھائی جان! یہاں کیوں کھڑے ہو؟ چلے آؤ۔"

ہرن بولا: "تمہارا یہ غار نہ جانے کہاں ہے؟ نظر ہی نہیں آتا

خرگوش نے اسے بھی ساتھ لے لیا۔ دونوں غار میں پہنچے
تو غار کی گرمی سے ان کی حالت بالکل ٹھیک ہو گئی۔
خرگوش تھوڑی دیر کے بعد غار سے باہر آگیا۔ "ہو سکتا ہے
کوئی اور بھی میری مدد کا منتظر ہو۔" اس نے غار سے باہر
نکلتے ہوئے سوچا۔

اب کے ایک بارہ سنگھا اُس کے ساتھ غار میں آگیا۔
خرگوش بہت خوش تھا کہ اس نے ان جانوروں کی
بہت مدد کی ہے۔ اب وہ ضرور اس کے دوست بن
جائیں گے اور ممکن ہے کہ کوئی اُس کے ساتھ رہنے پر بھی
آمادہ ہو جائے۔ دونوں بلیاں، بارہ سنگھا اور ہرن خرگوش
کے بہت ممنون تھے اور بار بار اُس کا شکریہ ادا کرتے تھے۔
خرگوش نے دل میں کہا: "بارش بڑے زور سے ہو رہی
ہے۔ اگر کوئی اور جانور اس طرح بارش سے پناہ مانگ
رہا ہو تو اسے بھی یہاں لے آؤں۔" جب اس نے اپنے
اس ارادے کا اظہار ان جانوروں سے کیا تو ہر ایک نے
اس کی بڑی تعریف کی۔ ہر ایک نے اس کے نیک ارادے
کو سراہا۔

خرگوش تو نکل آیا باہر اور ان جانوروں کی نیت خراب
ہونے لگی۔

ایک بلی بولی۔
"اتنی اچھی جگہ ہو اور اس میں صرف ایک خرگوش رہے
مجھے تو بات کچھ پسند نہیں ہے۔"
"ہاں آپا! بوڑھا تو ہے، اسے بھلا اتنی
گرم جگہ کی کیا ضرورت ہے؟" اس کی بہن نے یہ کہہ کر اس
کی تائید کی۔

ہرن نے اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا۔
"میں تو کہتا ہوں یہ جگہ ہم جیسے جوانوں کو درکار ہے۔ یہاں
دشمن سے بھی محفوظ رہ سکتے ہیں۔"
"اور کیا؟ خرگوش کو بھلا کیا ضرورت ہے یہاں رہنے کی۔"
ہرن کو یک لخت ایک اور خیال آیا۔
"خرگوش کسی اور کو بھی لے آئے گا۔ غار چھوٹا ہے، ہم
بہ مشکل یہاں رہ سکتے ہیں۔"

سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ خرگوش کو اندر
آنے ہی نہ دیا جائے اور اس لیے انھوں نے یہ انتظام کیا کہ
جیسے ہی وہ اندر آئے بارہ سنگھا اُسے سینگ مار کر باہر
پھینک دے۔ مر جائے گا۔ اور اگر مرے گا نہیں تو پھر کبھی غار
میں آنے کی جرأت نہیں کرے گا۔

خرگوش کچھ دیر ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ اُسے کوئی جانور دکھائی
نہ دیا۔ اُسے سردی لگنے لگی تو وہ غار کی طرف آنے لگا۔ اندر آیا
تو سب نے کہا: "خوش آمدید نیک خرگوش!"
خرگوش نے کہا۔
"میرے معزز ساتھیو! میں آپ سب کا شکر گزار ہوں۔ آپ
نے میری بڑی عزت افزائی کی ہے۔"
بارہ سنگھا بولا:
"ہم آپ کی اور عزت افزائی کرنا چاہتے ہیں۔" اور یہ
کہتے ہوئے اس نے خرگوش کو جو سینگ مارا تو وہ غار کے
منہ سے دس فٹ دور جا پڑا۔
"ہیں یہ کیا؟" خرگوش حیران و پریشان ہو گیا۔
بارہ سنگھے نے سینگ اس زور سے مارا تھا کہ وہ مرتے مرتے
بچا۔ اس کے سارے جسم میں درد ہونے لگا۔ اتنے میں اسے
بارہ سنگھے کی آواز سنائی دی۔
"خبردار! جو کبھی ادھر آنے کی جرأت کی۔"

اب وہ کیا کر سکتا تھا۔ اس نے تو کبھی سوچا تک نہیں تھا
کہ اسے نیکی کا یہ بدلہ ملے گا۔ یہ اچھا ہوا کہ بارش تھم گئی ورنہ
وہ سردی سے مر جاتا یا پانی کے ریلے میں بہہ جاتا۔ وہ سخت
مایوس تھا کہ اُدھر سے ایک سفید ریچھ کا گزر ہوا۔ اُس کے ساتھ
کبھی خرگوش کی دوستی رہ چکی تھی۔ اس لیے وہ خوب اسے
جانتا تھا۔

"کیا بات ہے ننھے دوست؟" سفید ریچھ نے پوچھا۔
خرگوش نے اسے ساری بپتا سنا دی۔
"اچھا تو یہ معاملہ ہے۔ اب تم خاموشی سے تماشا دیکھو۔"
ریچھ غار کے دروازے پر پہنچا اور اندر منہ کر کے بولا۔

"دوستو! غار کا منہ چھوٹا ہے اور میں بہت موٹا ہوں۔ اندر نہیں آسکتا۔ میرے دوست خرگوش نے کہا ہے کہ تم لوگوں کی ہر ضرورت پوری کردوں۔ کسی کو کھانے پینے کی ضرورت ہو تو بتا دے۔"

بلی بولی: "خالو جان اور تو کچھ نہیں چاہیے۔ بس ذرا بھوک لگی ہے۔"

"ابھی اس کا علاج کرتا ہوں، نرم نرم گوشت لاتا ہوں۔"

اور یہ کہہ کر ریچھ چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آکر بولا۔

"مزے دار گوشت لایا ہوں۔ دونوں بلیاں آجائیں۔"

بلیاں باہر آئیں تو ریچھ نے ایک بلی کو ایسا پنجہ مارا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔ دوسری فوراً بھاگ گئی۔

چند منٹ بعد ریچھ بولا،

"ہرن اور بارہ سنگھے کو کیا چاہیے۔ ابھی حاضر کرتا ہوں۔"

ہرن بولا:

"چچا جان! وہ بلیاں گوشت لے کر اندر کیوں نہیں آئیں؟"

ریچھ بولا،

"بھتیجے انھوں نے زیادہ کھا لیا ہے۔ آرام کر رہی ہیں۔"

کافی دیر گزر گئی اور بلیاں غار کے اندر نہ پہنچیں۔ ہرن نے بارہ سنگھے سے کہا۔

"دوست مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔ ذرا باہر دیکھنا تو وہ کہاں آرام کر رہی ہیں۔"

ہرن نے غار کے باہر دیکھا۔ ایک بلی بے حس و حرکت پڑی تھی۔ بولا: "دوست! بلی ہمیشہ کے لیے آرام کر رہی ہے ہم باہر نکلیں گے تو یہی کچھ ہمارے ساتھ بھی ہوگا۔ وہ جھٹ میرے سینگوں کو پکڑ کر مجھے بے بس کر دے گا۔"

"تو اب کیا کریں؟"

"سوچتے ہیں۔"

اور بارہ سنگھے نے سوچ کر کہا۔

"ماموں جان! ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ ذرا گھومنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ غار بہت تنگ ہے۔"

"بہتر تشریف لائیے۔"

بارہ سنگھا بولا۔

"ماموں جان! آپ کے سامنے سیر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

"تو کوئی بات نہیں۔ میں چلا جاتا ہوں۔"

ریچھ کے پیچھے ہٹ گیا اور ایسی جگہ کھڑا ہو گیا کہ غار سے باہر آنے والے کو نظر نہیں آسکتا تھا۔

بارہ سنگھا جیسے ہی باہر آیا۔ ریچھ تو اسی تاک میں کھڑا تھا۔ اس نے اس کے سینگ پکڑ لیے اور ایسا جھٹکا دیا کہ سینگ ٹوٹ گئے اور وہ چیختا چلاتا ہوا بھاگ گیا۔ ہرن نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ وہ بھی بھاگ گیا۔ مگر ریچھ نے اس کی کمر پر زور سے دوہتڑ مارا، اور وہ بلبلا اٹھا۔

اب میدان صاف ہو گیا تھا۔

خرگوش نے ریچھ کا شکریہ ادا کیا اور اپنے گھر کے اندر چلا گیا۔　　　(بشکریہ "نونہال" کراچی)

عراق
قدیم تہذیب کا گہوارہ

ڈاکٹر قنبر رضوی

(مسلسل)

ملک عراق کو متبرک زیارت گاہوں اور مقبروں کا ملک کہنا بے جا نہ ہوگا۔ عراق پرانی تہذیب سے مزین ایک نیا ملک ہے۔ آثارِ قدیمہ اس ملک کے گوشے گوشے میں بکھرے پڑے ہیں۔ ہر بڑے شہر، ہر بستی اور ہر آبادی کے قرب میں قدیم تہذیب کے نقوش موجود ہیں جو نئے تمدن سے ہم آغوش ہیں۔ وہ بصرہ ہو یا قطر، بغداد ہو یا سامرہ، کربلا ہو یا نجف، موصل ہو یا کرکک۔ آج ہر مقام پر نئی اور پرانی تہذیب کے نقوش کا سنگم دکھائی دے گا۔ مقبروں اور محلوں، باغات اور کھنڈرات کے مسجدیں، درگاہیں اور زیارت گاہیں۔ منارے، چمنیاں اور کارخانے، کارواں سرائے۔ ریلوے اسٹیشن اور ہوائی اڈے۔ یہ سب وہ آثار ہیں جو بابل کی قدیم تہذیب کو عہدِ وسطیٰ کی اسلامی تہذیب اور جدید مغربی تہذیب کے نقوش سے بغل گیر کر رہے ہیں۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، ملک عراق دو ندیوں — فرات اور دجلہ کی دین ہے۔ ان کے دوآبے میسوپوٹامیہ — کو دریائے دجلہ اور دریائے فرات کا تحفہ کہا جاتا ہے۔

(شعبۂ جغرافیہ۔ اے۔ کے کالج، شکوہ آباد (یوپی))

جنوبی عراق تو خلیج فارس کے دہانے تک دونوں کے اتحاد سے بنی ہوئی ندی — "شط العرب" ہی کے فیض سے آباد اور ترقی پذیر ہے۔ تمدن کے سارے آثار صرف انھیں دو ندیوں کی بدولت وجود میں آئے۔

دریائے دجلہ کے کنارے ملک عراق کا دارالسلطنت بغداد واقع ہے۔ یہی وہ شہر ہے جسے خلیفہ ہارون الرشید سے منسوب الف لیلیٰ کی داستانوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ یہی شہر سندباد جہازی کی کہانیوں کا اہم ترین پس منظر پیش کرتا ہے۔ یہی شہر بغداد شریف۔ اسلامی دنیا کی اہم ترین شخصیتوں کا مدفن اور متبرک زیارت گاہوں کا حامل ہے۔ دجلہ ندی کے مغرب میں واقع قدیم شہر بغداد اس زمانے میں ترقی کے اعلاترین مدارج پر تھا۔ آج کا بغداد ندی کے پورب میں بسا ہوا ہے جو ملک کی راجدھانی بھی ہے۔

اسلامی دور سے پہلے بغداد کی تمدنی حالت کے بارے میں کچھ زیادہ تفصیل سے نہیں معلوم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سنہ ۷۶۲ء میں خلیفہ منصور نے اپنا دارالخلافہ دمشق سے

منتقل کر کے دجلہ ندی کے کنارے بنایا۔ وسط شہر میں مسجد اور محل بنانے کے بعد اس کے چاروں طرف ایک کے بعد ایک۔ پے در پے تین دائرہ نما مگر مضبوط دیواریں بنا کر شہر پناہ قائم کی۔ پہلی اور دوسری دیوار کے درمیان شہریوں کو آباد کیا گیا اور بازار قائم کیے گئے۔ دوسری اور تیسری دیوار کے درمیان، بہ خیال حفاظت خالی رکھا گیا اور اسے حفاظتی دستوں کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

تقریباً چوتھائی صدی کے بعد خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں یہ شہر ایک بہت بڑی سلطنت کا دارالخلافہ بن چکا تھا۔ مغربی مورخین کا بیان ہے کہ اس زمانے میں خلیفہ ہارون الرشید کا دربار دنیا کا سب سے زیادہ شان دار دربار تھا۔ محل میں اسّی ہزار ملازمین پرورش پاتے تھے۔ دربار ہال سونے اور چاندی سے مزین تھا۔ درمیان میں ایک سونے کا درخت بنایا گیا تھا جس پر سونے چاندی کی چڑیاں بیٹھی رہتی تھیں اور ان کے پروں پر قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے۔

خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں یہ شہر ہر اعتبار سے اپنے عروج پر تھا۔ تجارت و حکمت، ادب اور فن، ہر شے بلند پیمانے پر تھی۔ بغداد اس عظیم سلطنت کی راجدھانی بن چکا تھا جس کی حدود میں دجلہ و فرات کا دوآبہ ہی نہیں بلکہ ملک عرب، مصر، شام، ایران اور بحر اسود سے متصل ممالک اور کوہ قاف کے اس پار کے علاقے جیسے جارجیہ وغیرہ شامل تھے۔ لیکن ہارون الرشید کے عہد خلافت کے بعد کئی ایک جنگوں میں شہر تباہ ہو جانے کے بعد پھر جب آباد کیا گیا تو اپنی کھوئی ہوئی شان و شوکت کو پھر نہ پا سکا۔ کبھی اسے ترکوں نے مسمار کیا تو کبھی مغلوں اور پارسیوں نے تباہ کیا۔ آخری بار ۱۶۳۸ء میں ترکوں نے اس پر قبضہ کر لیا جو پہلی جنگ عظیم تک قائم رہا۔ لیکن موجودہ بغداد اس قدیم شہر سے مختلف ہے۔ قدیم بغداد دریائے دجلہ کے مغرب میں شاہی مقبروں، زیارت گاہوں، مساجد اور کھنڈرات سے بھرا پڑا ہے۔ جہاں ایک طرف شاہانہ وقار کی یادگار خلیفہ ہارون الرشید کی چہیتی بیوی زبیدہ کا مقبرہ ہے۔ وہیں فقیرانہ عظمتوں کا نمونہ۔ عقیدت مندوں کی آماجگاہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (بڑے پیر صاحب) کی بارگاہ بھی ہے۔ اسی شہر بغداد سے متصل کاظمین میں حضرت موسیٰ کاظمؑ اور حضرت امام محمد تقیؑ کے مزار محبانِ اہلِ بیتِ رسولؐ کی کشش کا مرکز بنے ہیں تو دوسری طرف سامرہ میں حضرت امام مہدیؑ کی مقدس پناہ گاہ ہے جہاں زائرین جوق در جوق آتے رہتے ہیں۔

قدیم شہر بغداد کو جدید شہر سے جوڑنے کے لیے دریائے دجلہ پر دو پل بنا دیے گئے ہیں۔ آج کا بغداد جو عراق کی راجدھانی ہے دجلہ کے مشرقی کنارے پر تقریباً تین کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے اور پرانے شہر سے ایک نئی شاہراہ سے ملا ہوا ہے جو ترکوں نے ۱۹۱۶ء میں بنائی تھی اور جس کو برطانوی حکومت نے اپنے دور میں نہ صرف قائم رکھا بلکہ وسعت بھی دی۔ نئی شاہراہ سے دریائے دجلہ تک مختلف سڑکیں اور گلیاں ہیں جن پر بازار واقع ہیں۔ مقررہ دنوں میں یہ بازار مختلف اقوام کے لوگوں اور انواع و اقسام کے مالوں سے بھرے پڑے رہتے ہیں۔ انھیں بازاروں میں جہاں تہاں خطوط نویس اور عرائض نویس بھی اپنے اپنے موکلوں سے گھرے ہوئے ملتے ہیں جس کا سبب یہ ہے کہ عراق میں تعلیم کے سلسلے میں لوگ بہت پیچھے ہیں۔ انھیں بازاروں میں مشرقی طرز کے طبیب یا معالج اور جراح بھی کثرت سے دکھائی دیتے ہیں۔ بغداد میں لوگوں کا رہن سہن اور گھروں کی تعمیر بھی بہت دلچسپ ہوئی ہے۔ چونکہ یہاں اپریل سے اکتوبر تک سخت گرمی پڑتی ہے اس لیے انتہائی شدت کی گرمی سے محفوظ رہنے کے لیے گھروں میں تہہ خانے بھی بنائے جاتے ہیں۔ کھڑکیاں اور روشن دان بھی مناسب طریقے سے بلندی پر بنائے جاتے ہیں۔ رات کو لوگ کھلی چھتوں پر سوتے ہیں لیکن صبح کو دھوپ نکلتے ہی تہہ خانوں میں گھس جاتے ہیں۔ اور بلا مجبوری

باہر نہیں نکلتے۔ یہاں راتیں خنک ہوتی ہیں مگر سردیوں میں درجۂ حرارت گر کر کبھی کبھی نقطۂ انجماد سے نیچے چلا جاتا ہے اور برف بھی پڑ جاتی ہے۔

شہر میں ہوٹلوں کے علاوہ قہوہ خانے بہت عام ہیں۔ رمضان المبارک کے مہینے میں تو یہ قہوہ خانے دن بھر بند رہتے ہیں مگر رات بھر اتنی رونق رہتی ہے گویا رات کو دن بنا دیتے ہیں۔

شہر کی آبادی تقریباً ۲۵ لاکھ ہے۔ یہ مشرقی اور مغربی دنیا کے درمیان صرف قدیم کارواں سرائے ہی نہیں بلکہ دور حاضر میں اہم ترین بین الاقوامی ہوائی اڈہ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عراق کے اس دارالحکومت کو اہم تجارتی و صنعتی مرکز قرار دے دیا گیا ہے۔ یہاں معدنی تیل صاف کرنے کے کارخانے کے علاوہ جا بجا نئی صنعتیں قائم ہیں۔ کپڑا بننے کی صنعت ترقی پذیر ہے۔ اکثر دن کی تیز گرمی سے بچنے کے لیے کھجوروں کے باغوں میں سکئے میں بھی صنعتی کام کیے جاتے ہیں۔ مشہور ''کراکل'' بھیڑوں کی کھالوں سے مختلف سامان اور لباس تیار کرنے کا کام بھی اکثر کھلی ہوا میں کیا جاتا ہے۔ اس کے اون سے ''استراخان'' بھی تیار کیا جاتا ہے۔ دجلہ ندی کے کنارے وخانی کشتیوں یا موٹر بوٹوں کے ذریعے تجارتی سامان اور مسافروں کی آمد و رفت کا کام کیا جاتا ہے۔ بغداد کو صرف عراق کے مختلف شہروں سے ہی نہیں بلکہ مغربی ایشیا کے ہر بڑے شہر سے سڑکوں، ریلوں اور ہوائی راستوں کے ذریعے ملا دیا گیا ہے اور ہر روز افزوں ترقی پر ہے۔ (باقی آئندہ)

پروفیسر دستگیر شہاب

کالو اور بھیڑیا

ایک دیہات میں گڈریا تھا
نام کالو تھا اور جھوٹا تھا

یونہی جھوٹی صدا لگاتا تھا
بھیڑیا آیا، بھیڑیا آیا

لوگ اس کی پکار کو سن کر
دوڑ پڑتے تھے لاٹھیاں لے کر

جب پہاڑی پہ اس جگہ آتے
کچھ عجب ہی سماں وہاں پاتے

نہ کوئی بھیڑیا نہ بھالو ہے
بس مویشی ہیں اور کالو ہے

پوچھتے وہ ''یہ کیا تماشا ہے
اس طرح کیوں ہمیں بلایا ہے''

قہقہہ مار کے وہ کہہ اُٹھتا
''میں تو یونہی تمھیں ''دو بناتا'' تھا!''

جب یہ دیکھا کہ ہے نرا جھوٹا!
تنگ آ کر یہ سب نے اس سے کہا

''ہم یہ دھوکہ کبھی نہ کھائیں گے
لاکھ چلاؤ، ہم نہ آئیں گے''

ایک دن اتفاق ایسا ہوا!
اس پہاڑی پہ بھیڑیا آیا!!

خوف کے مارے کالو چلایا
بھیڑیا آیا، بھیڑیا آیا

بات کو سب نے جھوٹ ہی جانا
کوئی امداد کو نہیں پہنچا

بھیڑیا بکریوں پہ ٹوٹ پڑا
اور کالو کو بھی ہلاک کیا!

۳۴۷، مینشن، سرکٹ وادی، پونا۔۱

شمس فرخ آبادی

عبرت

(آسمانی عدالت میں یہ آواز گونجتی ہے)

آواز: ۔ عالی جاہ! اللہ تعالیٰ نے جس پرندے کو خوبصورت رنگ برنگے پَر دیئے، سر پر حسین پَروں کا تاج دیا اور اُس کو ناچنے کی صلاحیت دی، یہ اتنی نعمتیں پاکر مغرور ہوگیا، خود کو جنگل کا بادشاہ سمجھ بیٹھا، کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔

منصف: ۔ اس غرور کرنے والے مور کی سزا یہ ہے کہ یہ صرف جنگل ہی میں ناچے جہاں اس کا ناچ دیکھنے والا بھی کوئی نہ ہو۔ اور اس کے پاؤں اور پنجے بدصورت اور بھدّے کر دیے جائیں تاکہ جب یہ ناچتے ناچتے تھک کر سر جھکائے تو اپنے بدنما پیروں کو دیکھ کر آنسو بہاتا ہے۔

آواز: سرکار! اللہ پاک نے اس جانور کو انسانوں کے سے ہاتھ، پیر دیے، دماغ دیا۔ جن سے خود تو اپنے سر چھپانے کی جگہ تک نہیں بنا پاتا، بلکہ دوسروں کے کیے پر حسد، بغض اور کینہ رکھتا ہے، حد ہے کہ ایک ننھے سے بیے کا گھونسلا دیکھ کر بھی جل جاتا ہے اور اُس کی چھوٹی چونچ کو نوچ کھسوٹ کر پھینک دیتا ہے۔

منصف: تو پھر اس حاسد بندر کو مداریوں کی روزی کمانے کا ذریعہ بنا دیا جائے تاکہ وہ اس کی گردن میں رسی ڈال کر گلی گلی اس کا تماشا بنائے پھریں۔

آواز: ۔ جناب عالی! یہ ناکارہ پرندہ دوسروں کی محنت کا پھل خود چرا کر کھا جاتا ہے ۔ کویل بیچاری جب انڈے دیتی ہے تو یہ اس کو خوف زدہ کر کے گھونسلے سے بھگا دیتا ہے، اور اس کے انڈے چرا کر خود کھا لیتا ہے۔ پھر اُس کے گھونسلے میں خود انڈے دے کر غائب ہو جاتا ہے۔ ناداں کویل انھیں اپنے انڈے سمجھ کر سینے لگتی ہے لیکن جب اُن سے بچے نکلتے ہیں تو ان کو یہ اُڑا لے جاتا ہے۔ بچاری کویل باغوں باغوں صدا لگاتی اپنے بچوں کو ڈھونڈتی پھرتی ہے۔

منصف: ۔ اس چور اور حرام کا کھانے والے بددیانت کوّے کا منہ کالا کر دیا جائے۔ اور اس کی خوراک میں غلاظت بھی شامل کر دی جائے تاکہ یہ جس گھر کی منڈیر پر بیٹھے تو وہاں سے بھگا دیا جایا کرے۔

آواز: ۔ غریب پرور! یہ چغل خور، ایک دوسرے کی برائی کر کے آپس میں لڑائی کراتا ہے۔ اللہ پاک نے اس کو پرندوں جیسے پَر دیے، چرندوں جیسے دانت دیے۔ مگر اس نے اُس کی نعمت کا غلط استعمال کیا، یہ دانت دکھا کر چرندوں میں شامل ہوا اور پرندوں کی برائیاں کیں، پَر دکھا کر پرندوں میں شریک ہوا اور چرندوں کی غیبت کی۔ بس اسی طرح ایک دوسرے کی برائی کر کے آپس میں لڑواتا رہا ہے۔

منصف: اس فسادی اور ایک دوسرے کی برائی کرنے والے چمگادڑ کو ساری عمر پیڑوں پر الٹا لٹکنے کی سزا دی جائے اور جب سب چرند پرند سو جایا کریں تب اس کو اڑنے کی اجازت دی جائے۔ چغل خوری کی سزا یہ ہے کہ یہ جس منہ سے کھاتا ہے اُسی سے پاخانہ بھی کرے۔

آواز: ۔ حضور! اللہ میاں نے اس جانور کو اس کی وفاداری کی وجہ سے شیر کے جیسے ہاتھ پیر کیا دیے کہ یہ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتا۔ سب پر اپنا رعب

سحر و منزل گولا گنج لکھنؤ

جماتا ہے۔ غرّاتا ہے، اپنی دُم کو تان تان کر ہر ایک پر بھونکتا ہے۔ حد ہے کہ اپنے ہم جنسوں کا بھی خیال نہیں کرتا۔ ان سے بھی بل جل کر نہیں رہتا ہے۔

منصف: رُعب اور رعونت کی سزا یہ ہے کہ اُس کو گلی در گلی کا کتا کر دیا جائے اور اس کی تنی ہوئی دُم کو ایسا ٹیڑھا کیا جائے کہ اگر بارہ سال بھی نلکی میں رکھی جائے تب بھی سیدھی نہ ہو۔

آواز: ۔ جہاں پناہ! یہ صرف اپنی بڑائی اور تعریف کرنے والا ایک ناشکرا پرندہ ہے جس کو اللہ نے خوش رنگ ہرے پَر دیے، خوش نما سُرخ چونچ دی، انسانوں کی سی زبان دی مگر جب یہ بولنے پر آیا تو اپنے ہی منہ میاں مٹھو بننے لگا۔

منصف: اپنی بڑائی اور دوسروں کی ناشکری کرنے والے رَٹو توتے کے گلے میں لعنت کا سرخ طوق ڈال دیا جائے اور اس کی لال چونچ کو ٹیڑھا کرکے پنجرے کا قیدی کر دیا جائے۔

آواز: ۔ اے میرے منصف! اللہ پاک نے اس جانور کو اتنا شاندار بنایا کہ لوگ اسے شیر کی خالہ کہنے لگے۔ لیکن اس نے کسی خوبی کو برقرار نہیں رکھا بلکہ یہ تو بہت ہی جھوٹی، بزدل اور مکار نکلی۔ یہ سیدھے سادے چوہوں اور بھولی بھالی چڑیوں کو اپنے جھوٹ، مکر اور عیاری کے دام میں پھنسا کر چٹ کر جاتی ہے۔

منصف: ۔ جھوٹ بولنے والی اس مکار بلّی کی آواز ہی ایسی بنا دی جائے کہ یہ جب جھوٹ بولے تو اس کا جھوٹ ایک میاؤں سے کھل جائے۔ جس کو سن کر چوہے، چڑیاں غائب ہو جایا کریں اور یہ چھپ چھپا کر جھوٹے برتن ہی چاٹ کر پیٹ پالے۔

(عدالت کا ٹائم ختم ہونے کو آیا منصف نے آواز سے سوال کیا)

منصف: ۔ مگر تم کون ہو؟ جس نے اتنے چرندوں، پرندوں کے عیب بیان کیے۔ اس طرح کسی کے عیب گنانا بھی تو گناہ ہے۔

یہ بات سُن کر عیب بیان کرنے والے کی گھگھی بندھ گئی اور وہ سر پر سجی سُرخ کلغی، کانوں کے سفید موتیوں جیسے بندے، اور لہراتی ہوئی دُم کے پَروں کو سمیٹ کر بولا۔

آواز: ۔ غریب پرور! میں ۔۔۔۔ وہی ہوں جو ہر صبح کی خبر اپنی بانگ سے دے کر سوتے ہوؤں کو جگاتا ہے۔

منصف: ۔ تو اس نیک کام کے بدلے میں تم کو معبود نے خوبصورت جسم بھی تو عطا کر دیا۔ مگر اب دوسروں کے عیب بیان کرنے کی سزا تو بھگتنی ہی پڑے گی۔ جاؤ عمر بھر کے لیے مرغا بن جاؤ اور گھورے پر دانا ڈُنکا۔

یاد رکھیے

"بچوں کی کوششیں" میں اب صرف ان بچوں کی کہانیاں شائع ہوں گی جو اپنے نام کے ساتھ اپنی عمر بھی لکھیں گے۔

اڈیٹر

جنگل کی امانت

وکیل نجیب

بہت دنوں کی بات ہے ایک گانو میں ایک لڑکا رہا کرتا تھا۔ رامو اس کا نام تھا۔ اس کے ماں باپ، بھائی بہن، کوئی نہیں تھا۔ وہ بالکل اکیلا تھا۔ اسے بس اتنا یاد ہے کہ اس کا باپ چاقو چھری تیز کیا کرتا تھا۔ رامو بھی اس کے ساتھ دھندے پر جاتا تھا۔ اس کے باپ کو شراب پینے کی بری عادت تھی۔ جو کچھ کماتا اس کی شراب پی جاتا۔ نشے کی حالت میں اکثر اپنے بیٹے کو مارا کرتا تھا۔ بہت زیادہ شراب پینے سے اس کی حالت خراب ہوگئی اور وہ مر گیا۔ باپ کے مرجانے کے بعد رامو نے اس کی چاقو چھری تیز کرنے کی گاڑی لے لی اور گانو گانو گھومنے لگا۔ جو بھی تھوڑا بہت کماتا اس کے کھانے کے لیے پورا ہو جاتا تھا۔

جہاں وہ رہتا تھا وہ گانو چھوٹا تھا۔ آبادی بھی کم تھی۔ اس لیے کمائی بھی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ رامو تھا تو غریب لیکن تھا بڑا ہی ایماندار اور خوددار۔ جتنی محنت ہوتی اتنی ہی اجرت لیتا۔ کبھی کسی کے ساتھ دھوکا نہ کرتا۔ اس لیے لوگ بھروسے کے ساتھ بلا جھجک اس سے اپنے اوزار تیز کروایا کرتے تھے۔

نجیب منزل متصل لال اردو اسکول، مومن پورہ۔ ناگپور - ۱۸

رامو اکثر سوچتا کہ اس چھوٹے سے گانو میں وہ کبھی ترقی نہیں کر سکے گا۔ اسے کسی شہر میں جانا چاہیے۔ وہاں اس کی اچھی کمائی ہوگی۔ کچھ پیسے جمع ہو جائیں گے تو کوئی دوسرا کاروبار کرے گا۔

آخر ایک دن وہ شہر کے لیے روانہ ہو ہی گیا۔ گانو سے چلتے وقت کچھ روٹی سبزی ساتھ لے لی تھی کہ راستے میں بھوک لگے تو کھالے گا۔ چلتے چلتے دوپہر ہو گئی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ درخت، پیڑ پودے اور گھاس پھوس سب خاموش تھے۔ کبھی کبھی ہوا کی ہلکی سرسراہٹ سنائی دے جاتی تھی۔ اسے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ وہ کھانے کے لیے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ کچھ دوری پر پانی کا ایک نالا بہہ رہا تھا۔ درخت کے نیچے بیٹھ کر اس نے اطمینان سے کھانا کھایا اور پانی پینے کے لیے نالے پر چلا گیا۔ نالے میں صاف ٹھنڈا پانی بہہ رہا تھا۔ پانی پیا منہ ہاتھ دھویا اور پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ اسے ایک درخت کے نیچے ایک چھوٹا سا بندر دکھائی دیا۔ بندر بے ہوش پڑا تھا اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا رامو نے سوچا کہ اگر یہ بندر جوں ہی یہاں پڑا رہا تو مر جائے گا۔ اس نے بندر کو اٹھا لیا۔ نالے پر لے کر آیا اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے بندر ہوش میں آ گیا۔ رامو نے ایک کپڑے سے اس کے زخم کو صاف کیا اور گیلا کپڑا اس کے زخم پر باندھ دیا۔ جس سے خون کا بہنا بند ہو گیا۔

رامو کے پاس کچھ روٹی بچی تھی۔ اس نے وہ روٹی بندر کو دی جسے بندر نے بڑے شوق سے کھایا۔ نالے پر جا کر پانی پیا اور پھر رامو کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ رامو اپنی گاڑی لے کر آگے بڑھا تو بندر بھی اس کے پیچھے چلا آیا۔ آخر رامو نے بندر کو اپنے کاندھے پر بٹھا لیا اور شہر کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا۔

شہر پہنچ کر رامو نے کام کی تلاش کی۔ کافی دوڑ دھوپ کرنے کے بعد اسے کچھ پیسے مل گئے۔ ان پیسوں سے اس نے خود بھی کھایا اور بندر کو بھی کھلایا۔ اس طرح وہ بندر اس کا ساتھی اور دوست بن گیا۔ جہاں رات ہوتی وہ سو جاتے اور سویرا ہوتے ہی کام کی تلاش میں گھومنے لگتے۔ اس طرح گھوم پھر کر اس نے کافی پیسے پس انداز کر لیے۔

شہر بڑا تھا اور آبادی بہت زیادہ تھی رہنے کی جگہ کی بہت قلت تھی۔ رامو اکثر سوچا کرتا کہ اگر اس شہر میں اسے کہیں سر چھپانے کی جگہ مل جائے تو وہ ایک اچھی اور پرسکون زندگی گزار سکے گا۔ بڑی تلاش کے بعد شہر کی سرحد پر بسی ایک جھونپڑپٹی میں اسے ایک جھونپڑا مل ہی گیا۔ جمع شدہ تمام رقم دے کر اس نے وہ جھونپڑا حاصل کر لیا اور اس میں اپنے ساتھی بندر کے ساتھ رہنے لگا۔

اب وہ شہر میں کافی مشہور ہو چکا تھا۔ جہاں کہیں بھی جاتا بچے چلانے لگتے۔ "چھری والا بندر آیا" "چھری والا بندر آیا"۔ بچے بندر کا تماشا دیکھنے کے لیے اپنے گھروں سے ضد کر کے چھری چاقو لے آتے اور رامو سے تیز کرواتے۔ کبھی کبھی بندر خود چرخی چلاتا جس سے پتھر کی سل لگی ہوئی تھی۔ بندر گاہکوں سے چھری چاقو لے کر آتا اور دھار بن جانے کے بعد جس کی چیز ہوتی اسے واپس کرتا اور پیسے لے کر آتا۔

اس طرح بندر کی وجہ سے رامو کی شہرت اور آمدنی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس نے اچھی خاصی رقم جمع کر لی تھی۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ جب میرے پاس زیادہ رقم ہو جائے گی تو چاقو چھری کی ایک دکان لگاؤں گا اور ایک جگہ بیٹھ کر دھندا کروں گا۔

رامو میں ایک عیب تھا کہ وہ پڑھا لکھا نہ تھا۔ جس کا اسے بڑا افسوس ہوتا تھا۔ کبھی کبھی اسے حساب کرنے میں بڑی دقت ہو جاتی تھی۔ لیکن محنتی اور ہوشیار ہونے کی وجہ سے وہ ہر کام کو ٹھیک طرح انجام دیا کرتا تھا۔ وہ باتیں بھی سب سے اچھی کیا کرتا تھا۔ نہ کبھی کسی سے جھگڑا کرتا اور نہ گالی گلوچ کرتا۔ اسے ان بری عادتوں سے بڑی نفرت تھی۔

جس جھونپڑے میں وہ رہتا تھا وہیں پر کچھ بدمعاش شرابی اور غنڈے قسم کے لوگ رہا کرتے تھے جو اکثر غریبوں کو ستاتے اور ان کی محنت کی کمائی چھین لیا کرتے تھے۔ ڈر کر لوگ انھیں کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے۔

ایک دن ایسا ہی ایک شرابی رات میں رامو

جھونپڑی میں گھس گیا۔ اور اس سے پیسے مانگنے ۔ رامو نے پیسے دینے سے انکار کیا تو اس نے سو کو خوب مارا۔ اس کے سب پیسے چھین لیے ر اس کی چھری تیز کرنے کی گاڑی بھی اٹھا کر لے گئے۔ رامو روتا رہا، چیختا رہا، لوگوں کو مدد کے لیے پکارتا رہا لیکن کوئی اس کی مدد کو نہیں آیا۔ ت بھر رامو سسک سسک کر روتا رہا۔

صبح ہوئی تو اس نے طے کر لیا کہ اب وہ ں جگہ نہیں رہے گا۔ اس کے جھونپڑے کے بازو ں ایک بڑی بی رہا کرتی تھیں جنھیں وہ خالہ کہا رتا تھا۔ جو اس کے لیے کبھی کبھی روٹی سبزی بکا دیا کرتی تھیں۔ رامو ان کے پاس گیا اور رات کا واقعہ بیان کیا۔ وہ بے چاری ایک بوڑھی عورت تھیں، بھلا اس کی کیا مدد کر سکتی تھیں۔ خالہ نے اسے دلاسا دیا۔ رامو نے کہا کہ وہ اب اس جگہ ایک پل نہیں رہے گا۔ اس نے اپنا جھونپڑا خالہ کے حوالے کیا اور وہاں سے چل دیا۔

چلتے چلتے کافی وقت گزر گیا۔ دوپہر ہو گئی۔ بندر اس کے ساتھ تھا۔ بھوک اور پیدل سفر کی وجہ سے وہ تھک گیا اور ایک اسکول کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ رامو آج بہت اداس تھا، رنجیدہ اور غمگین بندر اس کی اس کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک بندر رامو کو دیکھتا رہا پھر اس سے تھوڑے فاصلے پر آکر اچھلنے کودنے لگا۔ کبھی وہ اپنے مالک کی طرح اشارے سے چھری تیز کرنے کی چرخی گھماتا۔ ہاتھ کو آگے پیچھے کرتا جیسے ہاتھ میں چھری ہو۔ پھر انگوٹھے سے اوزار کی دھار دیکھتا۔ منھ سے طرح طرح کی آوازیں نکالتا۔ پیروں کے ذریعے چرخی پھرانے کی نقل کرتا۔ کبھی پڑوس کی کبڑی بڑھیا کی طرح کمر پر ہاتھ رکھ کر جھک کر چلنے لگتا۔ یہ تماشا بندر اپنے مالک کو خوش کرنے کے لیے کر رہا تھا لیکن اسکول کے بہت سارے بچے وہاں جمع ہو گئے۔ بہت سے راہ گیر بھی کھڑے ہو گئے اور مزہ لینے لگے۔ آخر بندر تھک کر بیٹھ گیا۔ جتنے لوگ وہاں موجود تھے انھوں نے اپنی حیثیت کے مطابق پیسے زمین پر پھینک دیے۔ بندر نے تمام پیسوں کو جمع کیا اور رامو کی جیب میں لاکر ڈال دیے۔ رامو نے ایک ہاتھ سے بندر کو دور ہٹایا اور پھر سارے پیسے زمین پر پھینک دیے، بندر نے پھر پیسوں کو اکٹھا کیا اور رامو کے قریب جاکر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا اور پھر پیسے اس کی جیب میں ڈال دیے۔ رامو نے پھر پیسوں کو زمین پر پھینک دیا۔ بندر ایک طرف جاکر بیٹھ گیا۔

یہ تماشا وہاں پر کھڑے ایک بزرگ بھی دیکھ رہے تھے، وہ رامو کے قریب آئے اور اس سے کہا:۔

"کیوں بیٹے کیا بات ہے؟ آج تم بہت اداس ہو۔ تمھاری چھری تیز کرنے والی گاڑی بھی نہیں دکھائی دے رہی ہے؟"

رامو نے نظریں اٹھا کر انھیں دیکھا ۔ رات کا منظر اس کی آنکھوں میں گھومنے لگا اور وہ بے اختیار رونے لگا۔ جب ذرا سکون ہوا تو اس نے پوری کہانی ان بزرگ کو سنا دی۔ ان کو اس پر بڑا ترس آیا، وہ اسے اپنے گھر لے آئے۔ اسے اور اس کے بندر کو کھانا کھلایا۔ پھر رامو سے کہا:۔

"دیکھو بیٹے! ابھی تک تم نے کمایا اور بندر کو کھلایا۔ آج بندر نے یہ کمائی کی ہے۔ اس لیے ان پیسوں کو لینے سے تمھیں انکار نہیں کرنا چاہیے۔ دوست وہی جو مصیبت میں کام آئے۔ آج تم پر مصیبت آئی ہے تو بندر نے تمھارا ساتھ نہیں چھوڑا

ہے۔ بلکہ تمہاری دل جوئی کر رہا ہے۔ تم ایک نوجوان لڑکے ہو۔ تمھیں زندگی کے لمبے سفر سے گزرنا ہے اگر اس طرح معمولی معمولی حادثات سے گھبرا جاؤ گے، ہمت ہار دو گے تو تمھیں یہ دنیا آرام سے جینے نہیں دے گی۔ حوصلہ رکھو۔ یہ امتحان کی گھڑی ہے۔ اگر آج تم کامیاب ہو گئے تو پھر زندگی کی بڑی سے بڑی مصیبت بھی تمھارے قدم نہیں ڈگمگا سکے گی۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا اچھا تم یہ بتاؤ کہ اب کہاں جانا چاہتے ہو اور کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"صاحب! میرے پاس نہ تو پیسا ہے اور نہ ہی میری گاڑی ہے۔ میں اپنے گاؤں جانا چاہتا ہوں۔ کسی نہ کسی طرح چلا جاؤں گا" رامو نے کہا۔

"اچھا ایسا کرو کل تم اپنے بندر کو لے کر سٹی اسکول آجانا۔ میں وہاں پر ہیڈ ماسٹر ہوں وہاں پر تم بندر کے کچھ کمال دکھانا۔ بچے خوش ہو کر تمھیں پیسے دیں گے، ان سے تم اپنی گاڑی خرید لینا اور اپنے گاؤں چلے جانا۔ لیکن ایک وعدہ کرو کہ تم نے جس جگہ سے بندر کو اٹھایا تھا بندر کو لے جاکر وہیں چھوڑ دو گے کیونکہ جس طرح تم کو اپنے گھر سے، اپنے گاؤں سے پیار ہے اسی طرح جنگل کے جانوروں کو بھی اپنے گھر اور جنگل سے پیار ہوتا ہے۔ وہ اسی جگہ رہنا پسند کرتے ہیں اس مصنوعی ماحول میں ان کی صحت برباد ہو جاتی ہے اور جنگل کی خوبصورتی ختم ہو جاتی ہے۔ ان کو دوسری جگہ کتنا ہی آرام ملے وہ اپنے گھر میں ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ جنگلی جانور جنگل کی امانت ہیں۔ جو لوگ انھیں مارتے ہیں، قید کرتے ہیں یا پالتے ہیں وہ امانت میں خیانت کرتے ہیں۔ ان بے زبان جانوروں پر ظلم کرتے ہیں۔ اس لیے وعدہ کرو کہ تم اسے جنگل میں لے جاکر چھوڑ دو گے۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب کی بات رامو کی سمجھ میں آگئی اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ بندر کو لے جاکر جنگل میں چھوڑ دے گا۔

دوسرے دن وہ بندر کو لے کر سٹی اسکول پہنچ گیا۔ وہاں پر بندر نے کچھ کھیل تماشا دکھایا جس سے خوش ہو کر بچوں نے پیسے دیے۔ اساتذہ نے بھی کچھ پیسے دیے۔ اس طرح اس کے پاس اتنے پیسے ہو گئے کہ وہ چھری تیز کرنے کی گاڑی خرید سکے۔ رامو نے ہیڈ ماسٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ بازار سے جاکر چرخی خریدی کچھ چھریاں خریدیں اور اسی راستے سے اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہوا جس راستے سے آیا تھا۔

چلتے چلتے وہ اس جگہ پر پہنچا جہاں اسے بندر پڑا ہوا ملا تھا۔ وہاں اس نے بندر کو، اپنے دوست کو چھوڑ دیا۔ جیسے ہی بندر کو اس نے چھوڑا بندر درخت پر چڑھ گیا۔ کبھی وہ ایک شاخ پر جاتا تو کبھی چھلانگ لگا کر دوسری شاخ پر پہنچ جاتا۔ ایک درخت سے کود کر دوسرے درخت پر جاتا۔ کچھ دوسرے بندر بھی وہاں موجود تھے وہ ان کی ٹولی میں شامل ہو گیا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بچے کو اپنی کھوئی ہوئی ماں مل گئی ہے۔ اس کی گود میں پھولا نہیں سما رہا ہے۔

اچھے لوگ دوسروں کی خوشی دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ رامو بھی بندر کی خوشی دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اس نے اپنے دوست بندر پر آخری الوداعی نظر ڈالی اور گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

گاؤں میں آکر اس نے نئے سرے سے اپنا دھندا شروع کیا۔ یہاں اسے پیار ملا۔ محبت ملی۔ ہمدردی ملی۔ اطمینان کی روٹی کھانے کو ملی۔ یہی زندگی کا سب سے بڑا سکھ ہے۔

علی ناصر زیدی

ہماری زمین پر بے شمار پہاڑ ہیں، انھیں زمین کے چہرے کی جھرّیاں کہنا چاہیے۔ ان سب میں چٹانی مادّہ پایا جاتا ہے۔ لیکن وہ کئی باتوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ دنیا میں کوہ ہمالیہ سب سے اونچا پہاڑ ہے۔ اور ماؤنٹ ایورسٹ اسی کی چوٹی ہے جو دنیا میں سب سے اونچی ہے۔ وہ نیپال میں واقع ہے۔ ہمارے ملک میں دوسرا اہم پہاڑی سلسلہ قراقرم ہے۔ جس کی چوٹی کے۔ٹو، ساری دنیا میں مشہور ہے۔ کیوں کہ وہ دوسری سب سے اونچی چوٹی ہے۔

زمین پر پہاڑ بننے کی وجہ سمجھنے کے لیے ہم اپنے ماضی کا جائزہ لیں گے۔ ماضی بھی کروڑوں سال پہلے کا جب انسان کا کہیں وجود بھی نہیں تھا۔ ہماری زمین اربوں سال پہلے پیدا ہوئی تھی۔ شروع میں وہ دہکتی گیس کا گولا تھی۔ رفتہ رفتہ ٹھنڈی پڑی، لیکن اُس کے اندر ابھی تک آگ بھری ہے۔ ٹھنڈی ہونے کے ساتھ ساتھ زمین سکڑتی بھی گئی اور یوں اُس کی سطح پر کچھ سلوٹیں پڑ گئیں، کہیں زیادہ اُونچی اور کہیں کم۔ ہم اُن سلوٹوں کو پہاڑ کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب سے ہماری زمین وجود میں آئی ہے اُس وقت سے اب تک اُس پر طرح طرح کے دَور گزرے ہیں۔ ہمارے پاس اس بات کے کتنے ہی ثبوت موجود ہیں کہ جہاں اب پہاڑ ہیں وہاں کسی زمانے میں پانی موجود تھا۔ دنیا کے کئی پہاڑوں پر چٹانوں میں گھونگھوں اور سمندری جانوروں کے ڈھانچے دبے ہوئے ملے ہیں۔ پتھروں پر اُن کے نقش تک بن جاتے ہیں، کیوں کہ اندرونی طور پر زبردست دباو پڑتا ہے۔ سائنس داں ایسے مُردہ جانوروں یا نباتات کے پتھرائے ہوئے باقیات کو "فاسل" (FOSSIL) کہتے ہیں۔

آپ تعجب کریں گے اگر آپ کو ہم بتائیں کہ کوہ ہمالیہ کے بعض سلسلوں میں چھے ہزار میٹر تک کی بلندی پر بھی سمندری جانوروں کے باقیات پائے گئے ہیں۔ یعنی اتنی بلندی والے پہاڑ بھی کسی زمانے میں سمندروں کی تہہ میں تھے۔ پھر انقلاب آیا اور سمندروں کی تہہ بلند ہو گئی جسے اب ہم پہاڑی سلسلہ کہتے ہیں۔

بشکریہ ہمدرد نونہال کراچی

اسی طرح دنیا کے بڑے بڑے ریگستانوں پر بھی کسی زمانے میں پانی کا راج تھا۔ افریقہ کا برّاعظم دنیا کے تمام برّاعظموں میں اِس لحاظ سے الگ ہے کہ وہاں بڑے قدیم آثار پائے گئے ہیں۔ اسی برّاعظم کے شمال میں صحرائے اعظم واقع ہے جو دنیا کا سب سے بڑا ریگستان ہے۔ یہ بھی کسی زمانے میں سمندر تھا اور سندھ بھی جہاں اکثر ریت ملتی ہے کسی زمانے میں پانی کے نیچے تھا۔

پہاڑ خشکی پر ہی نہیں بلکہ سمندروں میں بھی موجود ہیں اور اُن کے وہاں موجود ہونے کی وہی وجہ ہے جو ہم نے بیان کی یعنی جس طرح خشکی پر کسی زمانے میں پانی تھا اسی طرح جہاں اب بحر اعظم ہیں وہاں کسی دور میں برّاعظم واقع تھے۔ یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہمارے جزیرے اصل میں اُن پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں جو سمندروں میں چھپے ہیں۔ یعنی ہر جزیرے کی جڑ سمندر کی تہہ میں واقع ہوتی ہے۔ ان چوٹیوں پر بارشیں ہوئیں، درخت اور نباتات اُگ آئے اور پھر وہاں انسان آباد ہو گئے۔ یہ ہیں ہمارے جزیرے۔

ہماری زمین کے اندر ابھی تک تلاطم موجود ہے۔ اس کے اندر پہلے کی طرح انقلاب آتے رہتے ہیں جن کی وجہ سے بعض جزیرے سمندر میں غائب ہو جاتے ہیں اور بعض جگہ نئے جزیرے اُبھر آتے ہیں۔

دُنیا میں کئی بڑے پہاڑی سلسلے پائے جاتے ہیں مثلاً ہمالیہ، آلپس، راکیز اور اینڈیز وغیرہ۔ یہ سب زمین کی اندرونی تبدیلیوں اور طرح طرح کے انقلابات سے وجود میں آئے۔ پس ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پہاڑ بننے کی بنیادی وجہ زمین کی اندرونی قوتیں ہیں۔

انھی اندرونی قوتوں میں آتش فشانی کا عمل بھی شامل ہے۔ جس نے بہت سے پہاڑوں کو جنم دیا۔ زمین کی نچلی تہوں سے لاوا پھٹ کر اندرونی دباؤ کی وجہ سے اوپر آجاتا ہے۔ ان آتش فشاں پہاڑوں میں جاپان کا فیوجی یاما، اٹلی کا کوہ وسووئیس اور جزیرۂ ہوائی کے پہاڑ شامل ہیں۔

(بشکریہ نونہال کراچی)

مظفر حنفی

چار پھولوں کا ہار

نرسری کے لیے ایک نظم

میں ہوں شمّی
میری امّی
چھوٹا ڈبّو
پیارے ابّو

ہم سب مل کر چار ہوئے

امّی کافی
ابّو ٹافی
ڈبّو پپّی
کہہ دے اپّی

پھول ملے تو ہار ہوئے

میں ہوں شمّی
میری امّی
چھوٹا ڈبّو
پیارے ابّو

ہم سب مل کر چار ہوئے
پھول ملے تو ہار ہوئے

۲۵۸، شبلہ ہاؤس، نئی دِلّی

شفیق احمد وردولوی

ایک گانو تھا۔ گانو چھوٹا سا تھا۔ اس گانو کی آبادی سے تھوڑی دوری پر ایک مندر تھا۔ مندر کے اطراف آم کے درخت تھے۔ مندر کے ٹھیک سامنے سے ایک پگ ڈنڈی گزرتی تھی۔ اس پگ ڈنڈی سے گانو کے لوگوں اور مسافروں کی آمد ورفت جاری رہتی۔ تھکے ماندے راستہ چلنے والے اکثر آرام کی غرض سے اُن آموں کے درختوں کی چھانو میں ٹھہر جاتے۔ ساتھ میں لایا ہوا توشہ کھاتے، پانی پیتے اور ساتھ ہی ساتھ مندر میں بھگوان کا درشن کرنے آجاتے اور دوبارہ اپنی منزل کے لیے روانہ ہو جاتے۔ اس مندر میں ایک پجاری جی تھے۔ وہ بلا ناغہ اس مندر میں پوجا پاٹھ کرنے روزانہ آتے۔ مندر کی صفائی، بھگوان کی پوجا کرنا اور لوگوں کو نصیحت کرنا اور خود بھی اچھی اور نیک باتوں پر عمل کرنا ان کا روزانہ کا معمول تھا۔

ایک دن اس مندر میں ایک شخص آیا جو بڑا عالم اور سنیاسی تھا۔ سنیاسی پوجا کے ساتھ ساتھ آرام بھی کرنا چاہتا تھا۔ اس سنیاسی بابا کی پجاری جی نے جہاں تک ان سے بنا خدمت کی۔ مندر کی صفائی اور پجاری کی عقیدت کا حال دیکھ کر اس مہمان سنیاسی کو بڑی مسرت ہوئی۔

درگاہ روڈ بھیونڈی (تھانے)

رات کا وقت تھا۔ دوسرے روز وہ سنیاسی بابا وہاں سے چلے جانے والے تھے۔ پجاری نے سوچا اس مہمان اور نیک سنیاسی سے خود بھی کچھ نیک اور کار آمد باتیں معلوم کرنی چاہییں۔ یہ سوچ کر اس نے سنیاسی سے گزارش کی:

"مہاراج! میرے دل میں ہمیشہ جو شک وشبہات نیز سوالات اٹھتے رہتے ہیں اور مجھے بے چین کیے ہوئے ہیں، ان کے جوابات میں آپ سے جاننا چاہتا ہوں۔" سنیاسی نے بھی بڑے نرم لہجے میں کہا: "یقیناً آپ کو جو بھی باتیں معلوم کرنا ہیں بے جھجک معلوم کیجیے۔ میں ضرور ان کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔" پجاری جی نے کہنا شروع کیا: "مہاراج میں ایک جاہل اور بے علم انسان ہوں۔ مجھے نہ لکھنا آتا ہے اور نہ پڑھنا، جو کچھ آپ جیسے نیک لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے اور خدمت سے حاصل ہوتا ہے وہی میرا علم ہے، بتائیے مہاراج زندگی کا سب سے بڑا سُکھ کون سا ہے؟ کون سا عمل ایسا ہے جس کے کرنے سے روحانی سکون حاصل ہوتا ہے؟"

پجاری کا سوال سُن کر سنیاسی مہاراج مسکرائے اور کہنے لگے: "زندگی کا سب سے بڑا سکھ دوسروں

کے لیے ایثار کرنا، خلقِ خدا کی خدمت کرنا ہے۔ اس سے جو سکون حاصل ہوتا ہے وہی زندگی کا سب سے بڑا سکون اور اثاثہ ہے ہم دوسروں کے لیے جو کچھ عمل کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے لوگوں کو جو آرام اور فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس میں ہماری سب سے بڑی خوشی اور زندگی کے سکون کا راز پوشیدہ ہے۔ اس لیے ہم دوسروں کے لیے کیا کر سکتے ہیں اور کیا کیا کر سکتے ہیں؟ اس پر غور و خوض کرنا' دوسروں کے لیے ذاتی مفاد کو قربان کر دینا' یہ قربانی تن من دھن دولت جائداد کسی کی بھی ہو سکتی ہے۔ اس طرح کے ایثار کرنے سے ہی سب سے بڑا روحانی سکون حاصل ہوتا ہے۔" سنیاسی مہاراج کی سچی بات سن کر پجاری کو ایک طرح سے اطمینان اور خوشی حاصل ہوئی۔ وہ رات جب سونے کے لیے بستر پر دراز ہوا تو اس کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ رہ رہ کر اس کے دل میں ایک ہی خیال آتا کہ میں نے اب تک دوسروں کے لیے کیا کیا' یا میں دوسروں کی بھلائی کے لیے کیا کچھ کر سکتا ہوں؟ پہلے سوال کا جواب اس کے پاس نہیں کے برابر تھا۔ کیوں کہ وہ مندر کی صفائی کرتا اس کا معاوضہ وہ گانو والوں سے حاصل کر لیتا تھا۔ گانو والے اس کے بدلے اسے روپیا پیسا یا اناج دے دیتے تھے۔ اور اگر وہ مندر میں بیٹھ کر بھگوان کی عبادت کرتا ہے تو یہ اس کا فرض ہے۔

دوسرے دن صبح سویرے پجاری جی اٹھے روزانہ کی طرح مندر کی صفائی کا کام انجام دیا اور پوجا پاٹ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد انھوں نے سب سے پہلے اپنے پڑوسیوں کی حالت جاننے کی کوشش کی کہ کوئی بیمار تو نہیں، کسی کو کسی بات کا دکھ یا حاجت تو نہیں ہے؟ خود اپنی طرح ان کو بھی پیٹ بھر کے روکھی سوکھی میسر ہے یا نہیں؟ گانو میں جو بیمار تھے ان کی عیادت کی، معذور اور اپاہج لوگوں کی خبر گیری کی۔ جو بچے مدرسہ نہیں گئے تھے۔ ان کے والدین کو سمجھایا کہ انھیں مدرسہ ضرور روانہ کر دیا کریں اگر کسی طالب علم کو تعلیمی اشیا میسر نہیں تھیں تو اس پر غور کیا کچھ اپنے طور پر اور کچھ گانو کے بڑوں سے سفارش کر کے حاصل کر دینے کا وعدہ کیا۔ کسی غریب اور فقیر کو اپنے ساتھ کھانے کے لیے گھر لے گیا اور ان تمام امور خدمتِ خلق کو اپنا روزانہ کا معمول بنا لیا۔ اس کے بعد اس نے دیکھا اس کو سچی زندگی کی مسرت، دل کا سچا چین اور سکون حاصل ہو گیا ہے، اس کے چہرے پر بلا کا اطمینان اور روحانی تقدس جھلکنے لگا تھا۔ اور رات جب وہ سونے کے لیے بستر پر دراز ہوتا تو اسے بے حد فرحت اور آرام کا احساس ہوتا کہ اس کا دن عبادت اور خلق خدا میں بسر ہونے لگا ہے۔ گویا اسے من کا چین حاصل ہو گیا تھا۔

مختار عالم صدیقی

اپاہج کی کمائی

کر کے بل کھسکتے کھسکتے وہ جیسے ہی اپنے دروازے پر پہنچا اس کی بھابی نے جو پہلے ہی سے دروازے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی، کندھے پر لدے سامان کے ساتھ اس کی جیب کے سارے پیسے بھی جھپٹ کر نکال لیے۔

دوسرے دنوں کے مقابلے میں آج اس نے زیادہ ہی پیسے کمائے تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ ان میں سے کچھ پیسے آج اپنے پاس رکھ لے گا۔ ویسے بھی اپنے دوسرے ساتھیوں کی بہ نسبت وہ ہر روز زیادہ کما لیتا تھا۔ اس کے ہاتھ کی بُنائی اوروں سے زیادہ مضبوط اور خوبصورت ہوا کرتی تھی اس لیے اس کے پاس گاہک زیادہ آیا کرتے تھے۔
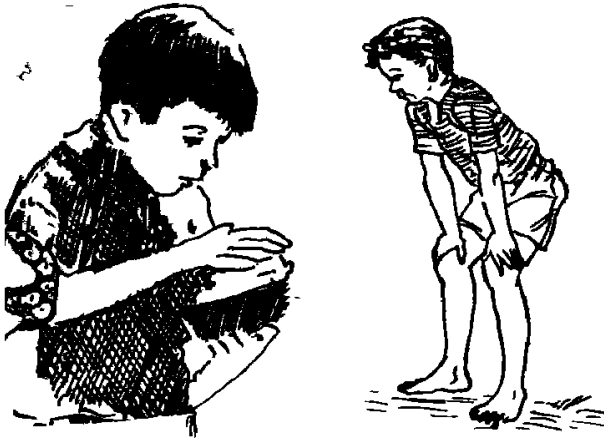
اس کا نچلا آدھا دھڑ بیکار تھا۔ بچپن میں اسے پولیو ہو گیا تھا۔ کمر سے اوپر کا دھڑ دیکھ کر کوئی یقین بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اپاہج ہے۔ جب تک ماں زندہ رہی پندرہ برس کا ہو جانے کے بعد بھی اسے گود میں اٹھائے پھرتی رہی۔ کسی بھی ضرورت کے لیے جانا ہوتا تو گود میں اٹھا کر لے جاتی۔ حیثیت کے مطابق سب سے اچھا کھانا اسے ہی کھلاتی۔ خود پیاز سے روٹی کھا لیتی۔ پندرہ برس کا ہوتے ہوتے وہ پورا جوان اور چوڑا چکلا مرد جیسا لگنے لگا تھا۔ دبلی پتلی ماں اس کا بوجھ کیسے اٹھاتی تھی یہ وہی جانے۔

ایک دن لکڑیاں کاٹتے ہوئے ماں کے پاؤں میں ایک کیل چبھ گئی۔ کیل زنگ آلود تھی اور ٹیٹنس کے انجکشن کے لیے پیسے نہیں تھے۔ اس طرح وہی کیل اس کے لیے موت کا فرشتہ بن گئی۔ بچپن میں پولیو کے علاج کے لیے پیسے نہ ہونے کے سبب اس کی دونوں ٹانگیں خراب ہو گئی تھیں، اور اب وہی غریبی اس کی ماں کو بھی اس سے چھین کر لے گئی تھی۔

بڑا بھائی جو دو چار روپے روزانہ کماتا تھا اس سے بھیا اور بھابی کا خرچ بھی مشکل سے چلتا تھا۔ ماں کی موت کے بعد پہلی بار اُسے اپنے اپاہج پن کا احساس ہوا اور پھر اسے پیسے کمانے کی فکر ہو گئی۔ اس نے ڈلیا اور گل دستے نما ٹوکریاں بُننے کا کام شروع کیا، ساتھ میں وہ کاغذ کے گل دستے اور بید کی کرسیاں بھی بنانے لگا۔ اس طرح ہر روز پندرہ بیس روپے کی کمائی ہو جاتی۔ مگر وہ جتنا بھی کماتا اس کے نصیب کا نہیں تھا۔ اس کی ساری کمائی چھن جاتی اور بدلے میں اسے روکھا سوکھا کھانا مل جایا کرتا۔ اس وقت اسے شدت

ڈی، اے ۲۱/۲۲-ڈی۔ ڈبلو سکشن، ایم، بی۔ ایف۔ امبرناتھ۔ تھانے۔ ۴۲۱۵۰۲

سے ماں کی یاد ستانے لگتی اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ مگر اس نے کبھی بھائی سے کسی قسم کی شکایت نہیں کی۔ اس کی کمائی سے بھابی نے دو تین زیور بھی بنوا لیے تھے مگر اسے یہ کبھی زیادہ برا نہیں لگا بلکہ خوشی ہی ہوتی تھی کہ بھابی اور بھیا کی تنگ دستی ختم ہو گئی ہے۔ دکھ تھا تو صرف اس بات کا کہ اس کی اپنی کمائی میں سے دو چار روپے بھی اس کا حق نہیں رہنے دیا جاتا تھا۔

گرمیوں کی آگ اگلتی دوپہر میں جب نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر ٹوکریاں بنتے بنتے اسے زور کی پیاس لگتی تو ایک گلاس شربت پینے کو اس کا جی مچل اٹھتا یا چاٹ والے سے پچیس پیسے کے چاٹ یا جلیبی والے سے ایک دو جلیبیاں لے کر کھانے کو دل کرتا۔ مگر اس کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے۔ شام ڈھلے وہ گھر لوٹتا تھا۔ پیسے شام کو ہی اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ اس وقت تک چاٹ والے، گول گپے والے دریا کنارے جا چکے ہوتے تھے کیونکہ گرمی کے موسم میں وہاں شام جوان ہو کر نکھر جاتی تھی۔ ایک طرف جوہی اور چنبیلی کے گجرے بیچنے والوں کا شور ہوتا اور مٹھائی والوں کی چہل پہل۔ عورتیں اور لڑکیاں شوہروں کے خریدے ہوئے گجرے چوٹی میں سجا کر گھومتی پھرتیں۔ چنبیلی کی خوشبو میں بسی ہوئی ہوا ہگلی کا دور تک پھیلا ہوا پانی جس کا دوسرا کنارا تو نظر نہیں آتا تھا۔ بڑے بڑے بھٹی نماں جہاز، چھلک چھلک کر تیرتی ہوئی کشتیاں مرر گھرر کرتے جھلمل بتیوں والے دور سے آتے جاتے سٹیمر.......

دریا کنارے اگر وہ جاتا تو اس کی بکری چوگنی ہو سکتی تھی۔ مگر جاتا تو کیسے؟ منزل دور تھی اور وہ مجبور تھا۔ ہاں اسے ادّھا ہی کہتے تھے لوگ، (آدھے دھڑ والے کو کہیں بھی تو کیا کہیں) اس طرح اسے سب سے بڑا دکھ یہی تھا کہ ہر روز پندرہ روپے سے زیادہ کمانے کے باوجود اس کی جیب میں پندرہ پیسے بھی نہیں رہتے تھے۔

بھابی ابھی بکس میں پیسے رکھ بھی نہیں پائی تھی کہ بھیا آگیا "ارے یہ اتنے پیسے کہاں سے آگئے"

"ادّھے کے ہیں"۔

"ادّھے کے! اتنے پیسے کما کر لایا ہے وہ!"

"ہاں بھیا، آج بکری بہت اچھی رہی اور بھی زیادہ ہو سکتے تھے اگر میں دریا کے کنارے جا سکتا" وہ کچھ اداس ہو کر بولا۔ "سارے ساتھی چلے جاتے ہیں ایک میں ہی ...."

"کھانا کھا لیا تو نے"؟ بھیا نے پوچھا۔

"کھاؤں گا بھیا" وہ تھکی تھکی آواز میں بولا۔

اسے کھانے کو کیا ملے گا وہ جانتا تھا۔

"بہت تھک گیا ہے نا، ٹھہر میں تیرے لیے مٹھائی لے کر آتا ہوں، بہت دن سے نہیں کھائی نا؟ میٹھی چیز کھانے سے تھکن کم ہو جاتی ہے"

بھیا بھابی کے ہاتھ سے کچھ پیسے اٹھا کر باہر چلا گیا۔ بھابی کا چہرا کڑواہٹ سے بھر اٹھا ہے یہ ادّھے نے صاف دیکھ لیا تھا۔ گھنٹہ بھر بعد بھیا مٹھائی کا ڈبہ ہاتھ میں جھلاتا آگیا۔

"لے منے دیکھ میں تیرے لیے رس گلے اور ربڑی لایا ہوں۔ چل کھا لے"

"کھانا کھانے کے بعد کھاؤں گا بھیا۔ آپ لوگ کھا کر میرا حصہ رکھ دیں"

"کیوں ابھی تک تو نے کھانا نہیں کھایا؟"

"ابھی تو منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا، میں ذرا ستانے لگا تھا" اس نے صاف جھوٹ بول دیا ورنہ وہ تو منہ ہاتھ دھوئے کب سے بیٹھا تھا۔

"اچھا اب میں تو سونے جا رہا ہوں تم کھانا کھا کر مٹھائی کھا لینا۔"

صبح کو آٹھ بجے کے قریب جب بھیا اس کے کمرے کے پاس سے گزرا تو اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ منّے کا سامان ابھی تک برآمدے میں پڑا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ابھی باہر نہیں گیا۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوتا۔ وہ تو صبح چھ بجے ہی گھر سے نکل جاتا ہے۔

کہیں اسے بخار وخار تو........ اور یہ سوچ کر بھیا جلدی سے کمرے میں گھس گیا۔ وہ اس وقت کھڑکی کی طرف منہ کیے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کھڑکی کے چوکھٹے پہ ٹکی تھی اور آنکھوں سے آنسوں ٹپ ٹپ سوکھے پیروں پر گر رہے تھے۔

رات کو اسے مٹھائی نہیں ملی تھی اور کھانے میں بھی دن کے رکھے ہوئے پچپچے چاول جن سے ہلکی ہلکی بو بھی اٹھ رہی تھی اور دال ملی تھی جب کہ گھر میں پرول آلو کی سبزی اور کریلے کے بھجیا کے علاوہ پودینے کی چٹنی اور اچار بھی موجود تھا بھیا اسے روتا دیکھ کر گھبرا گیا۔

"کیا ہوا منّے تو رو کیوں رہا ہے؟ ماں کی یاد آتی ہے؟ رات کو مٹھائی کھائی تھی تو نے اور مٹھائی لے گا؟ لا دوں؟"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اس نے بھیا کے سینے میں منہ چھپا لیا۔

"وہ شاید اسے مٹھائی دینا بھول گئی" بھیا نے سوچا۔ پھر بیوی سے کہا "ارے او شبانہ، تو نے منّے کو مٹھائی نہیں دی ہے؟"

اسی وقت کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور بھیا دروازے کی طرف بڑھ گیا، وہ جیسے ہی باہر نکلا بھابھی نے باورچی خانے سے نکل کر چٹنی چڑھا دی۔

باہر خالد کھڑا تھا۔ بھیا کو دیکھ کر بولا "جلدی چلیے بھیا، بہت دیر کر دی آپ نے، نہیں تو شاید حاضری بھی نہیں لکھی جائے گی۔"

بھیا ہڑبڑا کر چلا گیا مگر جاتے جاتے باہر سے ہی آواز لگا کر اسے ناشتہ کرا کے مٹھائی کھلا دینے کی ہدایت کرتا گیا۔ بھابی شیرنی کی طرح اس کے کمرے میں آئی اور جھپٹ کر اس کا گلا پکڑ لیا۔

"کیوں رے لنگڑے شکایت کرتا ہے میری! گلا گھونٹ دوں گی تیرا" اور سچ مچ اس کی گرفت اس کے گلے پر سخت ہونے لگی۔ ادّھے کا دم گھٹنے لگا شاید وہ اسے ختم کر ڈالتی کہ اچانک باہر کا دروازہ دھڑ دھڑا اٹھا۔ چونک کر اس نے گردن چھوڑ دی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ادھا دھیرے سے اٹھا اور اپنا سامان اٹھا کر کھسکتا ہوا باہر نکل گیا۔

شام گھر آئی تھی تمام پھیری والے ریڈ روڈ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ ادّھے کی دو ٹوکریاں باقی رہ گئی تھیں۔ اندھیرا گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ یہ ٹوکریاں بک جائیں تو وہ بھی گھر کو چل دے۔ جب بہت دیر ہو گئی اور کوئی گاہک نہ آیا تو اس نے ٹوکری میں سارا سامان بھرا اور گلے میں ڈال کر بیٹھک کی طرف گھما کر کھسکنے لگا۔

یہ پہلا موقع تھا جب اس کی دو ٹوکریاں گھر واپس جا رہی تھیں۔ گردن پر زیادہ بوجھ تھا، اندھیرا گھنا۔ راستہ سنسان اور نیم کے پتے عجیب پراسرار سی لے میں سرسرا رہے تھے۔ وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ اسے دن والا حادثہ یاد آ گیا اور اس نے پورے جسم میں جھرجھری سی لی۔

"اگر دروازہ نہ دھڑدھڑایا ہوتا تو........؟"

اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ سوچنے لگا گھر جائے یا نہ جائے۔ لیکن اگر گھر نہیں جائے گا تو

جائے گا بھی کہاں ؟ پیروں والا تو ہے نہیں کہ جب چاہے جہاں چاہے چلا جائے۔ ابھی وہ اسی سوچ میں گم تھا کہ اچانک روڈ کے کنارے جھاڑی ہلی اور اس میں سے ایک سایہ نکلا اور پیچھے سے ادّھے پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے ادّھے کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور اس کے دونوں ہاتھ کھینچے اور انہیں ہتھوڑے سے کچل ڈالا۔ اندھیرے میں بھی ادّھا اس سائے کو پہچان گیا۔ وہ انور تھا جو اس سے بری طرح جلتا تھا۔ صرف اس لیے کہ اس کی ٹوکریاں نہیں بکتی تھیں جبکہ ادّھے کے ہنر نے گاہکوں کے دل موہ لیے تھے۔

جب کافی رات گزر گئی اور ادّھا نہ لوٹا تو بھیّا بہت پریشان ہوا۔ آخر جب اس کی بے چینی بے انتہا ہو گئی تو وہ اٹھ کر خالد کے گھر کی طرف چل پڑا۔ خالد کو جگا کر اسے اپنے ساتھ لیا اور ادّھے کو ڈھونڈنے نکل پڑا۔

ادّھا اسے سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر بے ہوش پڑا ہوا ملا۔ اس کے دونوں ہاتھ بری طرح کچلے ہوئے تھے۔ خون بہہ بہہ کر جم گیا تھا۔

"منے! میرے منے! یہ کیا ہو گیا تجھے؟" بھیّا تڑپ کر اس سے لپٹ گیا پھر خالد اور بھیّا نے مل کر منہ میں ٹھنسا کپڑا نکالا اور بڑی مشکل سے لاد کر اسے ہسپتال لے گئے۔ مرہم پٹی کرانے کے بعد وہ اسے گھر کی لے کر چل پڑے کیونکہ غریب لوگ پولیس کے جھمیلے میں پڑنا نہیں چاہتے۔ کیا پتا خود ان کی ہی گردن کس جائے کیونکہ رشوت کے لیے ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔

دوسرے دن جب پڑوسی وغیرہ مزاج پرسی کو آئے تو دیکھا کہ بھابھی ادّھے کا زخمی ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر رو رہی تھی اور ادّھا نہ جانے کن خیالوں میں گم تھا اور اشک جاری تھے۔

برسات

فخر واحدی

دیکھو پھر برسات ہے آئی
رنگ برنگے تحفے لائی
لو اور دھوپ کی ہار ہوئی ہے
ٹھنڈک اب بیدار ہوئی ہے
دھرتی پر ہیں سبز بچھونے
پیڑ بنے ہیں حسیں کھلونے
بادل نقارے ہیں بجاتے
گرج گرج کر دھوم مچاتے
رقص گگن پر برق دکھاتی
چمک چمک کر ہے چھپ جاتی
میٹھے سُر کوئل کے سن کے
ناچ اٹھے ہیں مور خوشی سے
بچو تم بھی خوشی مناؤ
کھیلو کودو، ناچو گاؤ
دیکھو پھر برسات ہے آئی
رنگ برنگے تحفے لائی

شیخانہ، قنوج ۲۹۷۲۵

حکیم محمد سعید

طب کی روشنی میں

آدھے سر کا درد :-

س :- میری والدہ کے آدھے سر میں بہت شدید درد رہتا ہے کوئی دوا بتائیے ؟ طاہر احمد

ج :- نیم سر (درد شقیقہ = مائگرین) کے لیے ایک مفید علاج یہ ہے :

دونوں وقت کھانے کے بعد جوارش انارین ٦، ٦ گرام کھائیں اور ایک ماہ تک اس کا استعمال جاری رکھیں۔

دیواروں کا چونا کھاتی ہوں :-

س :- میں کوئی دو سال سے دیواروں کا چونا بہت کھانے لگی ہوں اور نہ معلوم کتنا چونا کھا جاتی ہوں۔ مہربانی فرماکر مشورہ دیں ؟ طاہر سلطانہ

ج :- یہ عادت بہت ہی خراب اور سخت نقصان دینے والی ہے۔ اس سے جگر کا نظام خراب ہو سکتا ہے اور اس سے مختلف قسم کی تکلیفیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ بظاہر یہ جسم میں کیلشیم کی کمی سے ہوتی ہے۔ اس کو ایسی غذاؤں سے پورا کرنا چاہیے جن میں کیلشیم خوب ہوتا ہے۔ مثلاً دودھ میں کیلشیم کی کافی مقدار ہوتی ہے۔

ہاتھ کانپتے ہیں :-

س :- میری عمر ۱۸ سال ہے۔ جب کوئی بھاری یا ہلکی چیز اٹھاتا ہوں تو میرے ہاتھ کانپنے لگتے ہیں۔ مہربانی فرماکر اس کا کوئی علاج بتائیے۔ شاد محمد فنی

ج :- آپ کا نظام عصبی کم زور ہے، اس پر توجہ دیجیے۔ "شاید خوبا" آپ کے لیے مفید ہو۔

خراب ہاضمہ :-

س : میرا معدہ کم زور ہے اور کھانا اچھی طرح ہضم نہیں ہوتا۔ اور پیٹ میں خرابی رہتی ہے۔ معدے کی اصلاح کے لیے کوئی نسخہ تحریر کردیں۔ طاہر نصرت اللہ

ج :- انسان کو جینے کے لیے کھانا چاہیے۔ کھانے کے لیے جینا نہیں چاہیے۔ ارشاد نبوی ہے کہ تھوڑی بھوک باقی رہے جب ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لو۔ یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ اس سے آپ کا پیٹ خراب نہیں ہوگا۔ ورزش بھی پابندی سے کیا کیجیے یا کوئی کھیل کھیلا کیجیے۔

جوڑوں کا درد :-

س : میری عمر ۱۴ سال ہے۔ میری انگلیاں آہستہ آہستہ مڑ رہی ہیں اور خود بہ خود ٹیڑھی ہوتی جا رہی ہیں۔ مہربانی فرماکر کوئی علاج بتائیے :- شاداب اختر

ج :- بہ ظاہر یہ جوڑوں کے درد کے بعد کی کیفیت ہے۔ کسی اچھے معالج سے مل کر علاج کرائیے۔

آنتوں کی خشکی :-

س :- عرصے سے آنتوں کی خشکی میں مبتلا ہوں۔ جسم میں گرمی کا سخت احساس ہوتا ہے۔ دوپہر میں چکر شروع ہو جاتا ہے۔ کوئی علاج تجویز فرمائیے۔ داؤد

ج :- آپ عمدہ سا "گلقند گلاب" ۲ تولے (۲۴ گرام) صبح یا رات کو سوتے وقت کھائیں۔ آنتوں کے لیے بہت خوب چیز ہے۔

(بشکریہ نونہال جنوری)

(تھوڑی سی کاٹ چھانٹ اور ضروری تلخیص کے ساتھ)

بمعرفت ماہنامہ "نونہال" کراچی ۱۸

خلیل الرحمان

سیّاح اپنی سیر و تفریح کی روئداد سناتا ہے۔ آپ بھی کان دھر کر غور سے سنیے :۔

کوہ کیلاش اور جھیل مانسرور ہندوؤں اور جینیوں کی دو مقدّس تیرتھ گاہیں ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں ہند اور چین کے درمیان کچھ ناگوار واقعات رونما ہوئے۔ جن کے تحت ان مقامات کی سیر و سیاحت میں کھنڈت پڑ گئی۔ حالیہ چینی وزیر خارجہ کے ورود کے دوران یہ خوش خبری ملی کہ ۱۹۸۱ء میں کچھ افراد کو ان مقامات کی زیارت کی اجازت دی گئی۔ کیلاش اور مانسرور سطح سمندر سے ۴۵۰۰ میٹر بلندی پر ہیں۔ جن کا احاطہ ۱۰۰ کلومیٹر ہے۔

کیلاش اور مانسرور کو دیکھنے کا شوق ہر ایک دل کو گدگداتا رہا۔ اس لیے قرعہ اندازی (نام کی پرچی نکالنے کے طریقے سے) کے ذریعے اٹھارہ افراد منتخب ہوئے۔ تین ممبران پارلیمنٹ تھے۔ پندرہ دوسرے یاتری (زائرین) تھے۔

یاتری ۹ ستمبر ۱۹۸۱ء کو مختصر وداعی تقریب کے بعد یو۔پی کے وزیر اعظم کے دعائیہ کلمات کے ہمراہ دہلی سے سفر پر روانہ ہوئے۔

یہ قافلہ نے "ویاس وادی" کے راستے دو دن میں ۶۴۲ کلومیٹر بس کے ذریعے طے کر کے "کالی" کی وادی میں پہنچ کر پڑاؤ ڈالا۔ یہاں سے "لیپو لک درّے" تک جو چینی تبت

نمبر ۱/۳۰ کری آچاری گلی ویلور۔۱۲

کی دہلیز کہلاتا ہے، طے کرنے میں سات دن گزر گئے۔ راہ میں کتنے مندر نظر پڑے۔ آسمان پر کالے کالے بادل بھی سردی سے جم کے ٹھٹھر گئے تھے۔ اور سورج بھی کسی طرف سیاہ لبادہ اوڑھ کر سو گیا تھا۔ فلک بوس پہاڑوں کی قطاریں جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں، اس دُنیا کی چھت "تبت" کی پاسبانی کر رہی تھیں۔ جگہ جگہ سبزہ پھوٹ پڑا تھا۔ مخملی فرش پر نہروں کا پانی اُچھلتا، کودتا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ اونچے نیچے ہموار اور ناہموار راستوں کو طے کرتے وقت اُن کے "پتّے" پانی پانی ہو گئے۔ تیز ہوائیں اور سردی خطرناک تھیں۔ تین ساتھی ہمّت ہار کر قریبی آشرم میں پناہ گزیں ہو گئے۔ باقی لوگ ۱۸ ستمبر کو آگے روانہ ہوئے۔

مقامی باشندوں نے مہمانوں کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ چائے بسکٹ سے تواضع کی۔ لڑکوں نے "لوک گیت" سُریلے لہجے میں گائے۔ لڑکیاں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر خوشی سے ناچیں۔ مائیں تالیاں بجا کر تال دیتی رہیں۔

قبیلے کے سردار اپنی تقدیر کا رونا روتے۔ ہند کی تبت سے تجارتی تعلقات قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

سرحدی پولیس یاتریوں (زائرین) کی صحّت کا ہر وقت خیال رکھتی تھی۔ طبّی امداد سے کبھی دریغ نہ کیا۔ جو لوگ آگے بڑھنے سے مجبور تھے۔ اُن کے قیام و طعام کا ذمہ اپنے سر لے لیا۔

رات بسر کرنے کے لیے ہر جگہ ڈاک بنگلوں کا انتظام تھا۔

منزل "کالا پانی" میں خیمے نصب کیے گئے۔ جو راتوں کی تند و تیز بارش میں غیر مفید ٹھہرے۔ مگر رات آہستہ آہستہ بیت ہی گئی۔ منزل "بدّھی" سے "کیپولک درے" تک سواری کے لیے ٹٹوؤں کا انتظام تھا۔ یہ ٹولی منزل "تکلاکوٹ" سطح سمندر سے ۳۹۹۰ میٹر بلندی پر ہے۔ اور تین ندیوں کے سنگم کے قریب واقع ہے مشرقی جانب تبتی لوگ قدیم طرز کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ مغربی جانب نیپالی بستے ہیں۔ ادہری جانب چینی لوگ جدید طرز کے مکانوں میں قیام پذیر ہیں۔ نیپالی لوگ مارکٹ میں ہندوستانی مصنوعات کے بدلے اون (Wool) اور مشک خریدتے ہیں۔ تکلاکوٹ سے کیلاش ۱۱۰ کلومیٹر دوری پر واقع ہے۔

ممبران پارلیمنٹ اپنا دورہ ختم کر کے ۲۰ ستمبر کو دہلی روانہ ہو گئے۔

بقیہ لوگ ۲۰ ستمبر کو اپنے دورے پر نکلے۔ یہ سفر نہایت دل آزار تھا۔ مان سرور سے مغربی جانب "رکشاش" ندی کا نیلگوں پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ڈھائی دن میں ۱۸ افراد نے کیلاش (جو سطح سمندر سے ۶۶۰۸ میٹر بلندی پر ہے) کا دورہ کیا۔ مان سرور کا (صرف ۵ یاتریوں کو) دورہ کرنے میں چار دن گزر گئے۔ راستے میں پانچ بدھی خانقاہیں ملیں۔ یہاں چینی ریاض کرتے ہیں۔ زائرین کی خدمت کو اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔

۲۴ ستمبر کو یہ لوگ اپنی قیام کی جگہ پر لوٹے۔ سرد ہوا کے تھپیڑوں سے سارے جسم پر کپکپی سوار تھی۔ سانس رکنے سے دم گھٹا جا رہا تھا۔ ۲۵ ستمبر کو افق پر سورج نمودار ہوا۔ گرد و پیش روشن ہو گئے۔ موسم قدرے بہتر تھا۔ چند شائقین نے مان سرور میں غوطے لگائے۔ کھانے کے بعد تکلاکوٹ پہنچے۔ تحفے تحائف خریدنے میں وقت گزر گیا۔ نیند نے زائرین کو پچھاڑ دیا۔

چینی افسر نہایت خلیق اور ملنسار تھے۔ ہر قسم کی سہولتیں مہیا کیں۔ مگر نیپالیوں سے گہرے روابط قائم کرنے کا موقع ہی نہ دیا اور ۲۵ ستمبر کو مہمانوں کو "الوداع" کہا۔

تبت ایک محدب علاقہ ہے۔ یہ سطح سمندر سے ۳۶۰۰ سے ۴۸۰۰ میٹر بلندی پر پھیلا ہوا ہے۔ شمال اور جنوب میں پہاڑوں کے سلسلے ہیں۔ وسط میں جھیل "رکشاش" اور مان سرور ہیں۔ لوگ اُجڈ اور وحشی ہیں۔ بنجاروں جیسی گزر بسر کرتے ہیں۔ یاک (تبت کا بیل) اور بھیڑیں پالتے ہیں۔ اُن کے چارے کے لیے مارے مارے گھومتے رہتے ہیں۔ اُن کا لباس موٹا جھوٹا ہوتا ہے۔ نمک ملی ہوئی چائے استعمال کرتے ہیں۔ اُس میں کبھی کبھی مکھن بھی شامل کر لیتے ہیں۔

۲۶ ستمبر کو چل کر زائرین (یاتری) اپنے مال و اسباب کے ساتھ ۲ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو دلی وارد ہوئے۔

(ترجمہ)

ہمدرد انسائیکلو پیڈیا کے سوال و جواب بہت معلوماتی ہیں۔ یوسف ناظم صاحب کی کہانی "مٹاپا بھی اچھی چیز ہے" بہت خوب ہے۔ ہماری طرف سے مبارک باد پیش کریں۔

محمد اقبال

مومن پورہ۔ محبوب نگر

اگست کا پیامِ تعلیم نظر نواز ہوا۔ پانچ رنگ کے حسین امتزاج نے پرچے میں دلکشی، دل فریبی، رنگینی اور رعنائی کی لہر پیدا کر دی۔ سرورق بھی کافی دلچسپی کا باعث تھا۔

عفران الحق نور

محلہ شیخانہ خورد، بہار شریف (نالندہ)

میرے والد صاحب کی رائے ہے کہ اس کے رنگین اوراق آنکھوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اس لیے سفید کاغذ ہی استعمال کریے۔ میں دوسروں کو پیامِ تعلیم کے خریدار بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

سعید احمد مرزا، سورت

اگست کے شمارے میں مسعود احمد برکاتی صاحب کی "جوتے کی فریاد"، ڈاکٹر عارفہ عرفی صاحبہ کی "حوصلے کا صلہ"، صابرہ تسکین صاحبہ کا "دانت کی سرگزشت" اور اعجاز علی ارشد صاحب کی "میں کون ہوں" بطورِ خاص پسند آئے۔ ان تمام قلم کاروں کو میری جانب سے دلی مبارکباد پیش ہے۔

میں بھی مسعود احمد برکاتی صاحب اور حکیم محمد سعید صاحب کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے "نونہال" سے دلچسپ اور مفید مضامین پیامِ تعلیم میں چھاپنے کی اجازت دے دی۔

محمد زبیر آفاق

۵۲۰، مسلم پور، وانمباڑی ۶۳۵۷۵۱

اگر آپ اس بات کا وعدہ کر لیں کہ اب پیامِ تعلیم ایسے ہی شائع ہوگا (چاہے قیمت بڑھا کر دوگنی کیوں نہ کر دیں)، تو میں بھی نئے خریدار فراہم کرنے کا وعدہ کر لوں گا۔

شفیق احمد محمد صدیق

مسلم نگر سروے ۱۵۹، اقبال سیٹھ کے سامنے مالیگاؤں

خوب صورت سرورق اور خوبصورت رنگوں کے ساتھ پیامِ تعلیم موصول ہوا۔ اندھی لڑکی کی آرزو، نظم نے بہت متاثر کیا۔ سانپ۔ عراق، اور میں کون ہوں، مضمون بہت اچھے لگے۔

شنو بنت ہنر،

۳۸۵، شاہ گنج الہ آباد

اس شمارے میں علی ناصر زیدی (کراچی) پروفیسر قنبر احمد رضوی، مس بدر جہاں، غلام دستگیر اور سطوت رسول صاحبان نے شامل ہو کر چار چاند لگا دیے۔ جاوید نہال حشمی کی کارٹونی کہانی بھی بہت پسند آئی۔

قمر العارفین رضوی

ہسپورہ۔ اورنگ آباد (بہار)

"میں نے عینک لگائی" یہ مضمون تو ہنسی، مذاق اور ظرافت کا پٹارا ہے۔ بیگم آنجہانی کی چالیس سالہ اردو کی بے لوث خدمت اردو داں طبقے کے لیے موجبِ فخر ہے۔

"جدید کلیلہ دمنہ" میں شیر، ہاتھی، درندوں اور گوشت خور پرندوں کا تذکرہ قابلِ دید ہے۔

خلیل الرحمٰن

ویلور ۶۳۲۰۱۲

ضیاء الاسلام جونیر ہائی اسکول بلند شہر:

بلند شہر۔ ۱۰ر جولائی۔ مقامی ضیاء الاسلام جونیر ہائی اسکول کے امتحان کا نتیجہ بہت شان دار رہا ہے۔ امسال پہلی بار ہی اسکول کے ۲۰ طلبہ امتحان میں شریک ہوئے اور وہ تمام پاس ہو گئے ان میں سے ۱۷ نے سیکنڈ ڈویژن حاصل کی۔ جبکہ تین طلبہ فرسٹ ڈویژن میں آئے۔

۴۰۔ لاکھ اسکولی بچوں کی دیکھ بھال:

نئی دہلی رواں مالی سال کے دوران اسکولوں میں طبی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے ۴۰ لاکھ روپے کا ایک پراجکٹ مرتب کیا گیا ہے، جس کے تحت ۲ لاکھ سے زیادہ پرائمری اسکولوں کے بچوں کو طبی سہولت فراہم کی جائیں گی۔ یہ سہولتیں ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام ۳۰۔ علاقوں کے ۲۵ ضلعوں میں ۵۰ مخصوص ابتدائی صحت کے مرکزوں کے دائرے میں پڑھنے والے بچوں کو فراہم کی جائیں گی۔

دبستان نو پرائمری اسکول:

نئی دہلی ۵ر مئی۔ دبستان نو پرائمری اسکول باڑہ ہندوراؤ دہلی میں آج طلبہ کو نتائج تقسیم کیے گئے۔ اس موقع پر ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے آل انڈیا نوجوان تعلیمی کمیٹی کے جنرل سکریٹری مسٹر وسیع احمد نے تمام درجات اول، دوم، سوم آنے والے طلبہ کو سرسید اردو انعامات تقسیم کیے۔

دہلی کے اسکول میں تقریری مقابلہ:

نئی دہلی ۱۸ر اگست نوجن کلیان پریشد کے زیر اہتمام آج مظہر الاسلام سکنڈری اسکول میں اردو کے مڈل اور سینیر سکنڈری اسکولوں نے "ڈسپلن تعلیم کے لیے ضروری ہے" کے موضوع پر ہونے والے مباحثہ میں شرکت کی۔

گورنمنٹ گرلز سکنڈری اسکول بلبلی خانہ سے راشدہ سلطانہ سینیر سکنڈری اسکول فتحپوری سے انظار نجمی اور سید محمد انیس، زینت محل گرلز اسکول سے سعدیہ سنبل، لال کنواں گرلز اسکول سے سعدیہ بانو۔ اینگلو عربک اسکول سے عبدالعلیم اور متین احمد، مڈل اسکول بلبلی خانہ سے سعدہ بانو اور سائرہ نسرین مظہر الاسلام

(دائیں سے بائیں) عبدالعلیم (اول) اینگلو عربک سینیر سکنڈری اسکول اجمیری گیٹ محمد عامر (دوئم) سید سعود احمد (سوم) مظہر الاسلام سینیر سکنڈری اسکول فراشخانہ (تصویر: نور جہاں ثروت)

اسکول سے سید سعود احمد اور محمد عامر، زینت محل مڈل اسکول سے زرتاج بانو نے اس مباحثہ میں حصہ لیا۔

فرحی حیدر عمر ۱۱ سال
مشغلہ: نماز پڑھنا، پیام تعلیم کا مطالعہ کرنا اور اچھی کتابیں پڑھنا۔
پتا: سی ۵۰/۲۴۲۷ بٹلا ہاؤس۔ جامعہ نگر۔ اوکھلا۔ نئی دہلی۔۲۵۔

• **عبدالجاوید عبدالمنان** عمر ۱۸ سال
مشغلہ اور شوق: کرکٹ کھیلنا، پیام تعلیم پڑھنا۔
پتا: عبدالجاوید۔ قاصد پورا، پاتور

لیاقت خاں (عرف لاکھن) عمر ۱۷ سال
مشغلہ اور شوق: استاد کا ادب کرنا، بڑوں کی عزت کرنا
پتا: سائیکل والے، ولی چوک غریب نواز ہوٹل کے پیچھے۔

سکندر خاں (عرف چھنو) عمر ۱۷ سال
مشغلہ اور شوق: نماز پڑھنا۔
پتا: سکندر خاں راجہ پان ہاؤس۔ مقام پوسٹ ملکاپور

فاروق خاں عمر ۱۸ سال
مشغلہ اور شوق: نماز پڑھنا، قلمی دوستی کرنا
پتا: ریان خان، کالی پورا۔ ملکاپور (بلڈانہ)

شیخ ہاشم شیخ کاسم عمر ۱۶ سال
مشغلہ اور شوق: ماں باپ کی خدمت کرنا، دوستوں سے اچھی طرح پیش آنا۔
پتا: شیخ ہاشم شیخ کاسم، راجہ پان ہاؤس۔ ملکاپور، ضلع بلڈانہ)

...و دوست

سلیم اور احمد ایک مدرسے میں پڑھتے تھے۔
...لیم بہت امیر گھر کا لڑکا تھا اور بہت شریر بھی تھا،
...ستاد کا ادب نہ کرتا تھا اور نہ ہی دل لگا کر پڑھتا
...تھا۔ بات بات پر لڑکوں سے لڑتا تھا۔ مگر احمد بے حد
شریف لڑکا تھا جو سلیم کے بالکل برعکس تھا۔ پڑھنے
...ں بہت تیز، استاد، والدین اور تمام بڑے بھائی
...نوں کا ادب کرتا تھا۔
پڑھائی میں خوب محنت کرتا اور ہر سال امتحان
...ں اول نمبر سے پاس ہوتا تھا" استاد اسے بہت چاہتے
تھے، احمد روزانہ صبح اٹھ کر قرآن شریف کی تلاوت
...رتا۔

ایک دن کی بات ہے کہ سلیم ناشتہ کر رہا تھا کہ
...ک فقیر نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا کہ میں چار روز سے
بھوکا ہوں کچھ کھانے کے لیے دے دو اللہ تعالیٰ تم پر رحم
کرے گا لیکن سلیم نے اسے دھکا دے دیا اور کہا جاؤ
کہیں اور جاکر مرو۔ فقیر نے سلیم کو بد دعا دی کہ جا ایک
دن تیرے بدن سے کیڑے گریں گے اور تیرا کوئی اپنا
تیرے پاس بھی نہ آئے گا۔

پھر فقیر احمد کے گھر گیا اس وقت احمد قرآن شریف
کی تلاوت کر رہا تھا کہ فقیر نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا
کہ میں چار روز سے بھوکا ہوں مجھے کچھ کھانے کو دے
دو، اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے گا۔ احمد نے جلدی سے
فقیر کو اندر بلایا اور تمیز کے ساتھ بٹھایا اور اپنی امی سے
ناشتہ میں جو کچھ بھی تھا لاکر رکھ دیا فقیر نے کھانے
کے بعد احمد کو بہت ساری دعائیں دیں اور کہا کہ
انشاء اللہ تو ایک دن بادشاہ بنے گا اور دنیا میں اپنے
ماں باپ کا نام روشن کرے گا۔

وقت گزرتا گیا اور احمد اور سلیم دونوں بڑے
ہو گئے۔ سلیم کو کوڑھ کی بیماری ہو گئی اور وہ حقیقت
میں اپنے جسم سے کیڑے نکالتا رہتا اور اپنے گزرے
ہوئے زمانے کو یاد کر کے روتا۔

دوسری طرف احمد اپنی عقل مندی اور رحم دلی
کی وجہ سے اپنے ملک کا بادشاہ ہو گیا۔ وہ اپنی رعایا
کے ساتھ انصاف کرتا اور اس کی رعایا اس سے بے حد
خوش تھی۔

یہ سب اس فقیر کی بد دعا اور دعا کا اثر تھا کہ سلیم
دنیا سے بیکار ہو کر رہ گیا اور احمد دنیا والوں کے کام
آیا۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ فقیر کون تھا۔؟ وہ ایک فرشتہ
تھا! اسی لیے بچو! جب بھی تم کو کوئی فقیر یا کوئی بزرگ
نظر آئیں تو ان کی مدد کرو ان کا ادب کرو کیونکہ پتا نہیں
خدا تعالیٰ کو کس وقت تمہارا کیا کام پسند آجائے۔

امتیاز احمد اشرفی
معرفت نثار احمد اشرفی
۴، علی گول موحال، بارکپور ۲۴ پرگنہ

غصہ کا انجام

بہت دنوں کی بات ہے۔ کسی گانو میں ایک راجا حکومت کرتا تھا۔ راجا بہت ہی رحم دل تھا رعایا کی اچھی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس لیے رعایا بھی بہت خوش تھی۔ راجا کو شکار کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ ایک دن وہ اپنے درباریوں کے ساتھ شکار کے لیے نکلا۔ ساتھ میں اس کا ایک باز بھی تھا۔ جسے وہ بہت عزیز رکھتا تھا۔ شکار کی کھوج میں راجا اپنے درباریوں سے بہت دور نکل گیا۔ لیکن کوئی شکار ہاتھ نہ آیا۔ راجا کو بہت پیاس لگی۔

بہت تلاش کے بعد وہ ایک جھرنے کے پاس پہنچا۔ راجا نے پیالا جھرنے سے لگایا۔ جب پیالا پانی سے بھر گیا اور وہ پیالے کو منہ سے لگانے کو ہوا تو باز نے جھپٹا مار کر پیالے کو گرا دیا۔ دوسری بار راجا نے پھر پیالا کو بھرا اور جیسے ہی پینا چاہا ویسے ہی باز نے اپنے پنکھوں کو پھڑ پھڑا کر پھر پیالے کو گرا دیا۔ راجا پیاس کی شدّت سے بے تاب تھا۔ اس نے غصہ میں آکر باز کو پتھر پر پٹک دیا۔ باز تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ ایک بار پھر راجا کی نظر جھرنے پر پڑی تو اس نے دیکھا کہ ایک زہریلا سانپ جھرنے کے پانی میں مرا پڑا ہے اور اس کے منہ کا زہر پانی میں مل کر آرہا ہے اب راجا کو سمجھ میں آیا کہ باز کیوں اسے پانی پینے سے روکتا تھا۔ اب راجا پچھتانے لگا۔

افروز انور
پٹنہ مسلم ہائی اسکول، پھر بھورہ ۔ پٹنہ ۶

عقل مند بیٹا

کئی سال کی بات ہے ایک چھوٹے سے ملک کے جوان آدمیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ سارے بوڑھے آدمیوں کو قتل کر دیا جائے۔ ان کے خیال میں بوڑھوں کو زندہ رہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ان کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ کام کرتے نہیں صرف کھاتے ہیں۔ اس وقت بادشاہ بھی ایک جوان آدمی ہی تھا۔ اس نے حکم دے دیا کہ پچاس سال سے زیادہ عمر والوں کو قتل کر دیا جائے۔ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ یہ بوڑھے تجربہ کار ہوتے ہیں اور مصیبتوں میں مفید مشورے دیتے ہیں اور ہمت افزائی کرتے ہیں۔

چنانچہ سارے بوڑھے قتل کر دیے گئے۔ لوگوں نے بوڑھے باپ تک پر رحم نہیں کیا۔ انھوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ یہ ہمارے باپ ہیں جنھوں نے ہمیں پال پوس کر بڑا کیا۔ صرف ایک آدمی نے اپنے باپ پر رحم کیا اور اسے تہہ خانے میں چھپا دیا۔ وہ اس کی ضرورت کی چیزیں تہہ خانے میں پہنچا دیا کرتا تھا۔

کچھ دن بعد ملک میں سوکھا پڑ گیا۔ لوگ بھوک سے مرنے لگے۔ ان کے پاس جو کچھ تھا سب کھا پی گئے یہاں تک کہ ان کے پاس اناج کا ایک دانہ تک نہیں بچا۔ جوان آدمیوں کے اوپر پہلی بار اتنی سخت مصیبت پڑی تھی۔ وہ گھبرا گئے اور پریشان ہو گئے۔ ان سے جو کچھ بن پڑا کیا مگر کچھ نتیجہ نہیں نکلا۔

پھر خدا کا کرشمہ کہ بارش ہوئی۔ سوکھا دور ہوا۔ لیکن اب ان کے پاس بونے کے لیے اناج نہیں تھا۔ بادشاہ سے لے کر بھکاری تک پریشان کہ کیا ہو گا۔ بادشاہ نے درباریوں کو بلایا۔ مگر وہ بھی کچھ حل نہ نکال سکے۔ وہ اپنے پڑوسی ملک سے قرض بھی نہیں لے سکتے تھے۔ کیونکہ ان کے تعلقات اس ملک سے خراب تھے۔

ادھر وہ شخص بھی پریشان تھا۔ جس نے اپنے باپ کو تہہ خانے میں چھپایا تھا۔ بوڑھے نے اپنے بیٹے کو غمگین اور پریشان دیکھ کر ایک دن پوچھا "بیٹے کیا بات ہے۔ مجھ کو بتاؤ شاید میں کوئی مشورہ دے سکوں"۔ اس آدمی نے ساری پریشانیاں بتائیں۔ بوڑھے نے کچھ دیر سوچا پھر کہا "میں تم کو ایک ترکیب بتاتا ہوں لیکن تم یہ کسی کو مت بتانا۔ تم جاؤ اور اپنے گھر کے سامنے کی گلیوں اور سڑکوں پر ہل چلاؤ"۔ اس آدمی نے ایسا ہی کیا۔ کچھ دن بعد ان جگہوں سے

جہاں اس نے ہل چلائے تھے پودے نکلنے لگے۔ کہیں گیہوں، کہیں جو، کہیں چنا مٹر وغیرہ۔ پھر مہینوں بعد فصل تیار ہو گئی۔ اب وہ فصل کاٹ رہا تھا۔ پورے ملک میں یہ خبر پھیل گئی کہ ایک آدمی ایسی جگہ سے فصل کاٹ رہا ہے جہاں اس نے کچھ نہیں بویا تھا۔ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی۔

بادشاہ کو خبر ہوئی۔ اس نے اس آدمی کو بلایا اور اس سے ایک ساتھ کئی سوالات پوچھ ڈالے "تم نے کیا کیا تھا، کیسے کیا تھا؟ کس نے تمہیں ایسا کرنے کے لیے کہا تھا"

اس آدمی نے پوری بات صاف صاف بتادی۔ بادشاہ نے بوڑھے کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ بوڑھا حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اس سے بھی وہی سوالات کیے۔

بوڑھے نے کہا: "جناب عالی! جب لوگ اناج کو کھیت سے کاٹ کر گاڑیوں پر گھر لاتے ہیں تو بہت سے دانے گلیوں اور سڑکوں پر گر جاتے ہیں۔ وہ وہیں دب جاتے ہیں۔ ان ہی بیجوں سے یہ فصل تیار ہوئی ہے"

بادشاہ بوڑھے کی اس سوجھ بوجھ اور عقل مندی سے بہت متاثر اور خوش ہوا۔ اس کو بہت سا انعام دیا اپنی پچھلی بے وقوفی پر بہت شرمندہ ہوا۔ اس نے بوڑھے کے عقل مند بیٹے کو بھی معاف کر دیا کیوں کہ اس نے اپنے باپ کی جان بچا کر پورے ملک کی جان بچائی تھی۔ اس کے بعد پھر اس ملک میں کسی بوڑھے کو قتل نہیں کیا گیا۔

سید محمد احسن

ا-۶-ایم اپر روڈ۔ برن پور۔ بردوان

فتنہ

حسد کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے۔
حسد انسان کو شیطان بنا دیتا ہے۔

ایک غریب گھرانہ جس میں کل چھ افراد تھے دادا اماں اور جوان بیٹے مع اپنی اہلیہ کے۔ اس غریبی میں سب ہی خوش تھے۔ آہستہ آہستہ اس گھر میں ترقی کے دروازے کھلتے گئے۔ اور ساتھ ہی اس گھر کے افراد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ترقی اس طرح کی کہ چھوٹا لڑکا جس کی نوکری شہر کے ایک مل میں لگ گئی اور وہ بابو بن گیا۔ دوسرے لڑکے کو اس کے نانا نے اس کی نانی کے زیورات بیچ کر کارخانہ لگا دیا۔ اب اس طرح سے دونوں ترقی کرتے رہے یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا کہ بڑا لڑکا چھوٹے کارخانے سے ایک اچھے بڑے کارخانہ کا مالک بن گیا۔ جس سے بڑے لڑکے کی بیوی کو گھمنڈ ہو گیا۔ بڑے لڑکے کے کل چار بچے تھے اور چھوٹے لڑکے کے چھ بچے تھے۔ اس لیے بڑی بہو چھوٹی بہو سے لڑنے لگی اور الگ ہونا چاہتی تھی کیونکہ بڑے لڑکے کی کمائی زیادہ تھی اور چھوٹے لڑکے کی کم تھی، کیونکہ وہ صرف ایک بابو تھا۔ اور بڑی بہو کی آنکھوں میں یہ بات کھٹکتی تھی، پھر اسے گھمنڈ بھی تھا۔ اس لیے وہ صرف اپنے نانا کے مرنے کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن وہ زیادہ انتظار نہ کر سکی۔ اس نے اپنے نانا کے دل پر ایک وار کر ہی دیا اور الگ ہونے کا اعلان کر اور ساتھ میں چیلنج بھی کیا کہ دیکھتے ہیں تم کیسے اپنا گھر چلاتے ہو۔ اچھی چیزیں کیسے کھاتے ہو اور کیسے اچھے کپڑے پہن سکتے ہو۔ بڑا بھائی سب کچھ دیکھتا رہا لیکن منہ سے ایک لفظ بھی نہ بولا۔ بولتا بھی کیوں وہ تو جورو کا غلام تھا چھوٹے بھائی نے ان کے چیلنج کو قبول کیا۔

خدا جس کا ساتھی ہو اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا اس حصہ میں چھوٹے بھائی کا بھی حق تھا جس پر بڑی بہو کو گھمنڈ تھا کیونکہ اس کاروبار میں ان کے نانا کا پیسا لگا تھا اس کا حق مارا گیا لیکن وہ اللہ پر بھروسا رکھ کر خاموش رہا۔ اب یہاں سے چھوٹے بھائی کی ترقی شروع ہوئی اس نے اپنے عہدے میں ترقی پائی اور زیادہ تنخوا

پانے لگا۔ تھوڑے پیسے بچا کر اور کچھ قرض لے کر دو سال
میں ایک دکان بھی لگا لی۔ اب اسے کسی سے کیا شکوہ
اسے تو اللہ نے سب کچھ دے دیا۔ اب جو دیکھا بڑی بہو
نے تو پھر ان سے تعلقات بڑھانے لگی۔ چھوٹے بھائی نے
بھی ان کے لیے اپنے دروازے کھول دیے۔ کیونکہ وہ خدا کو
خوش رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس پر بھی وہ جل بھن کر جھگڑنے
لگی۔ ایک تو پہلے ہی اس نے پیار بھرے گھر میں آگ
لگائی اور اب کیا چاہتی ہے۔ ایسی عورت سماج میں ایک
ناسور ہے اسے گھمنڈ ہوتا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتی کہ یہ
سب اسے کس نے دیا ہے جس پر اسے اتنا گھمنڈ ہے۔
کتنی ناشکری عورت ہے وہ۔ اسی بات سے اب وہ
ہمیشہ بیمار رہنے لگی۔ بہت پیسا تھا بڑے سے بڑا ڈاکٹر
بلایا اور علاج کرایا مگر فائدہ نہ ہوا۔ جب اللہ ہی خوش
نہیں ہے تو ڈاکٹر کیا کرے گا۔ میری تو بس یہی دعا ہے
کہ خدا ہر گھر کو ایسی عورت سے بچائے جو بیوی اور بہو نہیں
بلکہ ایک فتنہ بن کر گھر میں آتی ہے۔

شمس الحق
کلاس ہفتم۔ مومن پورہ۔ ناگپور

ماہرِ نفسیات

میں ایک بار ٹیکسی میں بیٹھا تو مجھے اپنے پاؤں کے
پاس چھوٹا سا پیکٹ نظر آیا۔ میں نے اٹھایا تو اس پر
جواہرات کی مشہور دکان کا لیبل نظر آیا۔ میں نے ٹیکسی
والے کی طرف یہ پیکٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "شاید
کوئی مسافر بھول گیا ہے۔" ٹیکسی والے نے پیکٹ لیتے
ہوئے شکریہ کہا اور آگے بنے ہوئے خانے میں ڈال
دیا۔ میں نے دیکھا وہاں اس طرح کے اور بہت سے پیکٹ
پڑے ہوئے ہیں۔ ٹیکسی والے نے مجھے حیران و پریشان
دیکھا تو بولا گھبرائیے نہیں بابو جی یہ تو ایک نفسیاتی کھیل ہے جو
میں ہر روز کھیلتا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ پانچ مسافر
عورتوں میں سے چار اسے لے جاتی ہیں اور ایک اسے
واپس کر دیتی ہے اور پانچ مسافر مردوں میں سے تین
واپس کر دیتے ہیں اور باقی چھپا کر لے جاتے ہیں۔
میں نے پوچھا اس میں کیا ہے؟ اس نے کہا "کچھ نہیں
صرف ایک کاغذ کا ٹکڑا ہے جس پر لکھا ہوا ہے چوری
بُری عادت ہے۔"

نواب عتیق اطہر زاہدی
رانی گنج اردو ہائی اسکول رانی گنج، بردوان
(ویسٹ بنگال)

انار کا پھل — کچھ دلچسپ معلومات

انار ایک مشہور پھل ہے۔ انار کو عربی میں رمّان،
فارسی، ہندی اور اردو میں انار، سنسکرت اور بنگلہ میں ڈاڑم
گجراتی میں ڈاڑیم، کشمیری میں ڈانُن انگریزی میں
پومی گرینیٹ (Pomegranate) کہتے ہیں۔

انار کے درخت اس برّاعظم میں ہر جگہ بوئے
جاتے ہیں۔ بعض درخت ۲۰ فٹ تک اونچے ہوتے
ہیں۔ ان کا تنا پتلا ہوتا ہے۔ جس کی گولائی ۳ یا ۴ فٹ
تک ہوتی ہے۔ انار کے درخت کی چھال کچھ پیلی یا گہرے
رنگ کی ہوتی ہے۔ اس کے سرخ رنگ کے پھول ایک
ہی جگہ دو نکلتے ہیں۔ پھولوں کے جھڑ جانے کے بعد پھل
آتے ہیں۔ پھل اور پھول نو مہینے لگاتار آتے ہیں۔

کابلی انار سب ملکوں کے اناروں سے بہتر ہوتا
ہے۔ اس کے بعد پٹنہ کا انار ہوتا ہے۔ سب سے بہتر
انار وہ ہے جس کا دانہ بڑا اور شیریں ہوتا ہے۔
قرآن مجید میں بھی اس کو جنت کی نعمتوں میں شمار کرایا گیا
ہے۔ سورہ رحمٰن میں ارشاد ہوا ہے فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَّ
نَخْلٌ وَّرُمَّانٌ (ان باغوں میں میوے اور کھجوریں اور
انار ہیں)

انار کا شربت دماغ کے مرض کے لیے مفید ہے۔
میٹھے انار کے پتوں کو سائے میں سکھا کر اس میں شہد
ملا کر گولیاں بنا کر ایک ایک کھائیں تو اس سے نزلہ

کو فائدہ پہنچتا ہے۔ انار کے پتوں کو پیس کر آنکھوں پر
باندھنے سے دکھتی آنکھیں ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ انار شیریں
کے دانوں کا پانی ایک بوتل میں بھر کر دھوپ میں یہاں
تک رکھا جائے جب تک وہ گاڑھا نہ ہو جائے اور پھر
اسے آنکھوں میں لگانے سے آنکھوں کی روشنی بڑھ
جاتی ہے۔ یہ جتنا پرانا ہو بہتر ہے۔ انار شیریں کے
دانوں کا پانی شہد کے ساتھ ملا کر کان میں ڈالا جائے
تو کان کے درد کو آرام ملتا ہے۔ خالی انار کے پانی
کو ڈالنے سے بھی کان کا درد ختم ہو جاتا ہے۔

میٹھے انار کے رس کو ناک میں ٹپکانے سے ناک
کے اندر کی پھنسی کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اور نکسیر کے لیے بھی
مفید ہے۔ منہ میں چھالے ہو جائیں تو میٹھے انار کے پانی سے
کلیاں کرنے سے آرام ملتا ہے۔ میٹھے انار کا شربت پینے
سے سینہ کے درد اور کھانسی میں بھی آرام ملتا ہے۔
کھٹے انار کو آگ میں بھلبلا کر بدن پر ملنے سے تر و خشک
خارش کو فائدہ ہوتا ہے۔ کھٹے انار کا پانی گندے زخم
پر لگانے سے زخم بھر جاتا ہے۔ انار کے پیڑ کی چھال کو
باریک پیس کر شہد کے ساتھ چیچک کے چھالوں پر لگانے
سے اس کی پیپ (رطوبت) خشک ہو جاتی ہے۔

بہرحال انار صحت کے لیے عام طور پر نہایت عمدہ
چیز ہے۔ اس سے خون صالح پیدا ہوتا ہے۔ اور بدن میں
طاقت آتی ہے۔

فرخ ریحان
(بدر باغ، علی گڑھ)

لالچ کا انجام

ایک چالاک بڑھیا ایک کنویں پر بیٹھی رو رہی تھی
کہ ایک لالچی آدمی آیا اور بڑھیا سے رونے کا سبب
پوچھا۔ بڑھیا نے جواب دیا، "ایک سونے کا پان دان
اور ایک ہیرے کی انگوٹھی اس میں گر گئی ہے۔" یہ سنتے
ہی اُس آدمی نے فوراً کپڑے اتار دیئے اور کنویں میں اتر
پڑا۔ دیر تک سونے کا پان دان اور ہیرے کی انگوٹھی
کنویں کی تہہ میں ڈھونڈتا رہا۔

مگر جب اسے وہ چیزیں نہ ملیں تو ناامید ہو کر
باہر نکلا۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہاں نہ اس کے کپڑے ہیں
اور نہ وہ بڑھیا۔

سیماب بریق اطہر زاہدی
اطہر منزل گرجہ پاڑہ رانی گنج (بردوان)

شیخ چلی کا خواب

ایک تھے شیخ چلی ان کی لاٹری نکل آئی۔ شیخ چلی
نے ایک شاندار مکان بنوایا، بڑھیا بڑھیا پکوان پکوایا
اور سارے محلے والوں کو بلوایا۔ خوب دھوم دھام سے
دعوتیں ہونے لگیں۔ نتیجہ یہ کہ دولت جلد ہی ختم ہونے لگی۔
شیخ چلی نے بچی کچھ رقم اکٹھا کی اور سوچا کہ کہیں چل کر کوئی
کاروبار کیا جائے۔ اب سوچا کون سا کاروبار کیا جائے۔
آخر سوچتے سوچتے وہ خوشی سے اچھل پڑا اور دوڑ کر اپنی
بیوی کے پاس پہنچا اور کہا: "تم جلدی سے میرے راستے
کی روٹی پکا دو میں پردیس جا رہا ہوں۔" بیوی نے پوچھا:
"پردیس جا کر کیا کرو گے؟" اس نے کہا پردیس جا کر
اپنے باپ دادا کا ادھورا خواب پورا کروں گا۔ جو کام وہ
نہ کر سکے میں اسے انجام دوں گا۔"

شیخ چلی پردیس میں انڈے اور مرغیوں کا کاروبار
کرنے لگے۔ کاروبار میں اچھا منافع ہوا۔ پھر انھوں نے
بکریوں کا اور اُس کے بعد گائے کا کاروبار شروع کیا۔
بکریوں اور گایوں کے دھندے میں کافی آمدنی ہوئی۔
شیخ چلی اپنی کامیابی پر بڑا خوش تھا۔ اُس نے سوچا کیوں
نہ ساری گائیں اور بکریوں کو بیچ کر بھینسوں کا کاروبار
کیا جائے۔ انھوں نے تمام گائیں اور بکریاں بیچ ڈالیں
اور بھینسیں خریدنے منڈی کی طرف چل پڑے۔ منڈی
میں پہنچ کر انھوں نے کچھ بھینسوں کا سودا کیا۔ بھینس کے
سوداگر نے جب شیخ چلی کے پاس کافی رقم دیکھی تو اس کی

نیت بھر گئی، اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے شیخ چلی سے کہا: "برادر شام کا وقت ہو چکا ہے رات کو یہ سب بھینسیں لے کر کہاں جائیے گا۔ اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو اس خادم کے غریب خانے پر قیام فرمائیں۔ صبح یہ خادم بہ حفاظت آپ کے مقام تک پہنچا دے گا۔" شیخ چلی سوداگر کی چکنی چپڑی باتوں میں آگیا اور اس کے ساتھ ہولیا۔ سوداگر نے شیخ چلی کی خوب خاطر مدارات کی اور اس کی دولت غائب کر دی۔ ساری دولت ہتھیا کر سوداگر نے شیخ چلی سے کہا: "اے میاں یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو چلو یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔" شیخ چلی نے حیرت سے کہا: "آپ نے تو مجھے مہمان بنایا ہے!" سوداگر نے آنکھیں نکال کر کہا: "کاہے کا مہمان! جاتا ہے یا نکالوں تجھے۔" شیخ جی ہائے واویلا مچانے لگے تو سوداگر نے چور چور کہہ کر شور مچایا۔ اب تو شیخ چلی نے بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی اور وہاں سے بے تحاشہ بھاگے۔ رات کا اندھیرا تھا شیخ چلی ایک گڑھ میں جا گرے۔ گڑھے سے باہر نکلے تو سر سے پانو تک کیچڑ میں لت پت تھے۔ ایسی حالت میں ایک گانو میں جا پہنچے۔ گانو میں کہرام مچ گیا۔ "ایک کالا بھوت بغیر سر پیر کا گانو میں گھوم رہا ہے۔" اب تو ہر کوئی اپنے گھر میں جا دُبکا۔ سارا گانو سناٹے میں ڈوب گیا۔ اچانک شیخ چلی کی مڈبھیڑ ڈاکوؤں کے ایک گروہ سے ہوگئی۔ ڈاکوؤں نے شیخ چلی کو پکڑ لیا اور کہا: "ہم جیسا کہیں ویسا ہی کرنا، نہیں تو جان کی خیر نہیں۔"

ڈاکو شیخ چلی کو ایک کنویں پر لے گئے۔ وہاں صرف رسی تھی، ڈول کا پتا نہ تھا۔ ڈاکوؤں نے شیخ چلی کو رسی سے باندھ کر کنویں میں اتار دیا اور کہا: "نہا لینا تو ہمیں خبر کر دینا۔" شیخ چلی نے نہانے کے بعد ڈاکوؤں سے کہا: "میں نہا چکا ہوں مجھے نکالو۔" ڈاکوؤں نے اسے اوپر کی طرف کھینچنا شروع کیا ابھی انھوں نے شیخ چلی کو منڈیر تک بھی نہیں کھینچا تھا کہ کچھ سپاہی آ پہنچے۔ سپاہیوں کو دیکھ کر ڈاکو رسی کو چھوڑ کر بھاگ نکلے اور شیخ چلی دھڑام سے پانی میں جا گرے اور چیخنے چلانے لگے۔ "ہائے بچاؤ بچاؤ۔"

بچاؤ بچاؤ کی آواز سن کر شیخ چلی کی بیوی اور اڑوس پڑوس کے سارے لوگ دوڑ پڑے۔ دیکھا تو شیخ چلی اپنی ٹوٹی پھوٹی چارپائی کی باردان میں پھنسے ہوئے چلائے جا رہے ہیں بچاؤ بچاؤ۔ شیخ چلی کی بیوی نے جھنجھوڑ کر شیخ چلی کو اٹھایا اور پوچھا کیا ہوا؟ شیخ چلی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور غصے سے بولے: "ارے کمبخت یہ پوچھ کیا نہیں ہوا۔ میری لاٹری نکلی تھی مگر ساری دولت ڈوب گئی۔ ہائے میں لٹ گیا برباد ہوگیا۔" قصہ یہ تھا کہ انھوں نے صرف خواب دیکھا تھا۔

انصاری قیوم سروری اسلام پورہ بھیونڈی

لکھیے:-
کون سی تصویر پہلے انعام کی مستحق ہے

کھیل سنسار
چھوٹے بچوں کے لیے مترنم بحروں
گیتوں اور نظموں کا ایسا مجموعہ جسے
بچے شوق سے پڑھیں گے۔
قیمت : ۴/۵۰
(بزمی بھارتی)
دھنک
بچوں کے لیے لکھی گئی دلکش نظموں
کا مجموعہ جس میں بچوں کے من پسند
موضوعات پر
نظمیں شامل ہیں
قیمت : ۳/-
اسلام کیسے شروع ہوا ؟
(عبدالواحد سندھی جامعی)
یہ کتاب اُن مسلمان بچوں
بچیوں کے لیے لکھی گئی ہے جو اپنے
پیغمبر اور اپنے دین کے ابتدائی
حالات جاننا چاہتے ہیں۔
قیمت : ۴/۵۰
عبدالواحد سندھی جامعی
قرآن پاک کیا ہے
اس کتاب میں بچوں کے لیے نہایت آسان اور عام فہم زبان میں
قرآن پاک کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ قیمت ۳/۰۰
سُرخ جوتے
(بیگم قدسیہ زیدی)
"موتی" کو سُرخ جوتے کیا ہاتھ لگے کہ
اس کی غریبی دور ہوگئی۔ ایک
دل چسپ کہانی ہے۔
قیمت ۲/۵۰
جی دار اور ننھا فرشتہ
(ریاض احمد خاں)
یہ اس دس بارہ سال کے
ایک بہادر لڑکے کی کہانی ہے جس
نے ایک ننھے بچے کو پُرجوش مرغوں کی
گرفت سے بچایا۔ قیمت : ۰/۸۰
پھولوں کی دیوی
(خلیق انجم اشرفی)
دھنک کے بارے میں
فلپائن کی ایک دلچسپ
لوک کہانی۔
قیمت : ۰/۸۰
مکتبہ پیامِ تعلیم جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

Regd No D(SE)-043 September, 1982

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

لبرٹی آرٹ پریس (پرو پرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دہلی ۲

پیامِ تعلیم

یوم تاسیس نمبر
جامعہ ملیہ اسلامیہ

کھیل سنسار
چھوٹے بچوں کے لیے مترنم بحروں والے
گیتوں اور نظموں کا ایسا مجموعہ جسے
بچے شوق سے پڑھیں گے۔
قیمت : ۴/۵۰
(ابرقی بھارتی)
دھنک
بچوں کے لیے لکھی گئی دلکش نظموں
کا مجموعہ جس میں بچوں کے من پسند
موضوعات پر
نظمیں شامل ہیں
قیمت : ۳/=
اسلام کیسے شروع ہوا
(عبدالواحد سندھی جامعی)
یہ کتاب اُن مسلمان بچوں
بچیوں کے لیے لکھی گئی ہے جو اپنے
پیغمبر اور اپنے دین کے ابتدائی
حالات جاننا چاہتے ہیں۔
قیمت : ۴/۵۰
عبدالواحد سندھی جامعی
قرآن پاک کیا ہے
اس کتاب میں بچوں کے لیے نہایت آسان اور عام فہم زبان میں
قرآن پاک کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ قیمت: ۳/۰۰
سرخ جوتے
(بیگم قدسیہ زیدی)
"موتی" کو سرخ جوتے کیا ہاتھ لگے کہ
اس کی غریبی دور ہو گئی۔ ایک
دل چسپ کہانی ہے۔
قیمت
جی دار اور ننھا فرشتہ
(ریاض احمد خاں)
یہ اس دس بارہ سال کے
ایک بہادر لڑکے کی کہانی ہے جس
نے ایک ننھے کو پرجوش موجوں کی
گرفت سے بچایا۔ قیمت: ۱/۵۰
پھولوں کی دیوی
(خلیق انجم اشرفی)
کے بارے میں
کی ایک دلچسپ
کہانی۔
قیمت: ۰۰
مکتبہ پیام تعلیم جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی ۲۵

یومِ تاسیس نمبر

اکتوبر ۱۹۸۲ء جلد ۱۹ شمارہ ۱۰

نگراں : عبدالحق خاں (پرنسپل)

صلاح کار : خالد محمود

مہتممین : سید غلام محمد قاسم رضوی
مدیح الرحمٰن صہیب

مجلسِ مشاورت :
سید رضا حیدر
نگار زہرہ زیدی
شگفتہ یاسمین
عطرت سرمدی
عظمیٰ سیدہ
رمانہ بیگم
نصرت ظہور
مسعود مفتی

ایڈیٹر : ولی شاہجہانپوری

اس شمارے کی قیمت ۴ روپے

سالانہ ۱۵ روپے

غیر ممالک سے ۶۵ روپے

اعتراف

پیامِ تعلیم کا یوم تاسیس نمبر پیش خدمت ہے۔

جشن تاسیس کے بعد یہ خواہش بیدار ہوئی کہ ان لوگوں کو بھی رنگارنگ تقریبات سے متعارف کرایا جائے جو انھیں دیکھ نہیں سکے اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ذہن میں آئی کہ کوئی ایسی دستاویز تیار ہوجائے۔ جو ہمیشہ اس خوبصورت جشن کی یاد دلاتی رہے۔ اس سلسلے میں ہم جناب شاہد علی خاں اور اڈیٹر پیام تعلیم جناب ولی شاہجہاں پوری کے تہہ دل سے شکرگزار ہیں کہ انھوں نے پیام تعلیم کا ایک شمارہ اس مقصد کے لیے مرحمت فرمایا۔

ہماری یہ بھی خواہش تھی کہ یہ نمبر پیام تعلیم اور جشنِ تاسیس دونوں کے شایانِ شان ہو۔ مگر اس کے لیے جتنا وقت درکار تھا وہ ہم نہ دے سکے کیونکہ یہی ہمارے امتحانات کا بھی زمانہ تھا۔ اس کے باوجود اپنے مشفق اساتذہ کی رہنمائی میں جو کام ہم نے انجام دیا ہے اس سے اپنے طور پر مطمئن ہیں — ہم شیخ الجامعہ صاحب اور محترم عبدالحق خاں صاحب کے ممنون ہیں جن کی سرپرستی میں ہمیں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملا۔ اُن تمام اکابرین کے بھی مرہون منت ہیں جنھوں نے جشن کے سلسلے میں رہبری فرمائی اور حوصلہ افزا پیغامات سے نوازا۔ اپنے ان تمام ساتھیوں کے بھی شکرگزار ہیں جنھوں نے قدم قدم پر ہمیں سہارا دیا خاص طور پر جنھوں نے اپنی تخلیقات سے اس دستاویز کی تشکیل کو ممکن بنایا۔ جناب انور انصاری اور جناب عارج بن حیرت نے بھی اس نمبر کی ترتیب میں ہماری جو مدد فرمائی ہے آخر میں ہم ان کا بھی شکریہ ادا کرنا فرض سمجھتے ہیں ہمیں امید ہے کہ قارئین کرام اپنی مفید آرا سے ضرور سرفراز فرمائیں گے۔

جنبشِ خامہ نہیں گرچہ کسی کی پابند
پھر بھی تحریرِ وفا، پاسِ ادب مانگے ہے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس، دریاگنج، نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

جامعہ کی ۶۱ ویں سالگرہ کے موقع پر یہ نظم سید رضا حیدر نے پڑھ کر سنائی

جامعہ اے میری جنت میرے خوابوں کے جہاں ۔ دامنِ جمنا کے اے شاداب و دلکش گلستاں
میری خوشیوں کے خزانے میری خواہش کی زباں ۔ اتحاد و اتفاق و ایکتا کی ترجماں
خسروِ سائنس و حکمت علم و دانش کے ستوں ۔ قلزمِ چشمِ بصیرت ساحلِ امن و سکوں
واقفِ طبعِ زمانہ حامیِ وضعِ قدیم ۔ بادۂ شعر و لطافت جادۂ عقلِ سلیم
رہنمائے ملک و ملت رہبرِ ہندوستاں ۔ تربیت گاہِ جوانانِ دیارِ مہرباں
مرکزِ مہر و محبت حاملِ اعلا صفات ۔ تیرے ہونٹوں پر ہمیشہ رقص کرتی ہے حیات
تجھ سے وابستہ ہیں جتنے ہیں خوشی سے آشنا ۔ نور ہی ہر دم مذاقِ زندگی سے آشنا
منسلک جو ہستیاں ہیں جامعہ کی ذات سے ۔ علم کے جوہر عیاں ہوتے ہیں ان کی بات سے
ہے دعا اے میری جنت تیرے سارے نوجواں ۔ زندگی کی گود میں ہوں عالمِ امکاں کی جاں
اور تجھ پر ہر گھڑی احباب کا سایا رہے ۔ دیکھنے والا ترقی پر تری عش عش کرے
تو ہے محفوظ ان سے جو کہ تیرے درمیاں ۔ آستیں کے سانپ ہیں لیکن برنگِ دوستاں
تو ہے واقف ہمیشہ حاسدوں کی چال سے ۔ تو رہے محفوظ ہر دم دشمنوں کے جال سے
جامعہ دنیا میں تیری عظمتِ کردار سے ۔ ہو کے رہ جائیں گے بداندیش بھی لاچار سے
دشمن و حاسد ترے سب ایک دن ہوں گے خراب ۔ عمر بھر مہکا کریں گے تیری خوشیوں کے گلاب

خالد محمود

انگلش ڈیبیٹ کے موقع پر مہمان خصوصی جناب سلمان خورشید صاحب (ایڈیشنل سپیشل ڈیوٹی پرائم منسٹر آفس) جناب انوار جمال قدوائی صاحب اور جناب عبدالحق خاں صاحب کے ہمراہ تشریف لاتے ہوئے

دائیں جانب سے مہمان خصوصی بیگم عابدہ علی ہمراہ شیخ الجامعہ صاحب انور جمال قدوائی۔ پرنسپل عبدالحق صاحب

خالد محمود صاحب انعام یافتگان کے ناموں کا اعلان کر رہے ہیں ساتھ خوشونت سنگھ صاحب تقسیم انعامات کے لیے تشریف لاتے ہوئے۔

سید غلام محمد قائم رضوی

کاغذی ہے پیرہن

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ۶۱ ویں سالگرہ کے موقع پر جشن تعلیمی کی مفصل رپورٹ

سر عبدالقادر نے ۱۹۴۶ء میں اپنے خطبہ تقسیم اسناد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اہم خصوصیت کو نمایاں کرتے ہوئے جامعہ ملیہ میں توسیعی خطبات کے اہتمام کو بہت سراہا تھا۔ اُن دنوں مصر کے مشہور عالم ڈاکٹر بہجت وہبی اور مشہور ترکی محب وطن خالدہ ادیب خانم کے خطبات سے یہاں کی فضا گونجی ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ سر عبدالقادر کو اُن ادبی تہذیبی تربیتی کارکردگیوں کا علم نہ ہو سکا تھا جو جامعہ میں ثانوی اور ابتدائی سطح پر ہوتی رہی ہیں اور اب تک اسی روایتی اہتمام سے باقی ہیں، ورنہ اپنے خطبے میں وہ ان کا ذکر بھی ضرور کرتے اس لیے کہ اس تعلیمی ادارے میں جو تربیتی اصول برتے جاتے ہیں وہ اسی کا حصہ ہیں۔ اس درگاہ کی امتیازی خصوصیت اس کی یہی سرگرمیاں ہیں جو لالۂ تشنہ کام، کو "نم شبنم" سے سیراب کرتی رہتی ہیں ؎

مابہ فروغ زندگی آتش اُو فزودہ ایم
تو نم شبنم بدہ لالۂ تشنہ کام را

یہ سوچنا غلط نہ ہوگا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے ذہن میں اس کی یہی خصوصیت رہی ہوگی جب انھوں نے کہا تھا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تعلیمی نظام اعضا کے عمل کا نام ہے —
بقول ڈاکٹر ذاکر حسین، "اپنی صلاحیت اور اپنی انفرادیت کو پالینا اور اس کے مختلف عناصر میں یک جہتی پیدا کر لینا ہی کیرکٹر ہے" — اور یہ اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ایک

(مقیم طالب علم یازدہم سائنس)

طالب علم مختلف قسم کی کارکردگیوں کو آزمائے نہیں۔ یہاں طالب علم کے لیے اپنے کو آزمانے کے مواقع فراہم کیے جاتے ہ
جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے پس منظر پر نظر ڈالی تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں تنظیم مدرسہ میں غیر درسی مشغولیات کو اتنی اہمیت کیوں حاصل ہے؟ — اس کی خا وجہ یہ ہے کہ اپنی بنیادی حیثیت میں یہ تدریسی ادارہ نہ تھ — بلکہ ایک تحریک تھا —
دوسری بڑی وجہ وہ اذہان ہیں جو اس کی تشکیل و تعم کے وقت اسے ملے۔ جن میں کا ہر ذہن آفاقی، عہد آفریں ا تہذیب ساز تھا۔
جامعہ کے قیام کے دوسرے ہی سال جب ابتدا درجات قائم ہوئے تو طلبہ کے ادبی اور سیاسی ذوق ورجحا کی تربیت کے لیے ایک قلمی ہفت روزہ "الرشید" جاری ہو گیا۔ جس کا نام مولانا محمد علی کے نام پر بعد میں جوہر رکھ دیا گ طلبہ کی تنظیمی صلاحیتوں نے "انجمن اتحاد" اور "بزم کھا کی شکل میں نمو پایا۔ ادبی سرگرمیوں نے "یوم حالی" "یو اقبال" "یوم شبلی" اور "یوم قرآن" جیسے جلسوں کا ان کر کے انھیں تاریخ کا جز بنا دیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ا تمام سرگرمیوں میں ابتدائی اور ثانوی درجات کے طلبہ حصہ زیادہ ہے۔
موجودہ صورت میں اگرچہ اس کی حیثیت ایک خال تدریسی ادارہ کی رہ گئی ہے، پھر بھی تربیتی امور کو قط

نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔

ان تمام سرگرمیوں میں نمایاں اور مرکزی حیثیت شعبۂ ثانوی کو حاصل ہے۔ جہاں "انجمن اتحاد" اور "بزم کمال" کی بجائے "اردو کلب" قائم ہے۔ طلبہ کے ادبی ذوق اور تہذیبی شعور کو بیدار کرنے میں اس وقت کے تقریبًا سبھی اساتذہ نگرانِ مدرسہ جناب عبدالحق خاں صاحب کا کردار اہم ہے جو اردو کلب کی سرپرستی اور تربیتی کلاسوں کے انعقاد سے طلبہ میں تحریری اور تقریری مذاق پیدا کرتے اور ان کی تربیت فرماتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ انگریزی کے استاذ جناب محمد احمد صاحب دلکش اور جناب شکیل اللہ خاں صاحب فزکس کے استاذ جناب محمد یوسف پاپا ہندی کے استاذ جناب ڈاکٹر جے پال ترنگ صاحب اور اردو کے استاذ جناب خالد محمود صاحب کے نام اہم ہیں۔

اردو کلب اور "تربیتی کلاس"

اردو کلب کی جانب سے "تربیتی کلاس" یہاں کی ایک مستقل اور منفرد سرگرمی ہے اس کو یہاں متعارف کرانے کا سہرا اردو کے موجودہ استاذ جناب خالد محمود صاحب کے سر جاتا ہے۔ ہر سنیچر کو اردو کی کلاس میں ایک بزم ادب کا انعقاد ہوتا ہے جس میں صدر مہمانِ خصوصی، مقرر، مبصر اور نقیب تمام عہدے طلبہ ہی سنبھالتے ہیں۔ طلبہ ہی اپنی تخلیقات نثر و نظم پیش کرتے ہیں اور طلبہ ہی اس پر بحث کرتے ہیں۔ عمومًا اردو کے استاد کے علاوہ دوسرے اساتذہ بھی اس بزم میں شریک ہو کر طلبہ کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی فرماتے ہیں۔ پروگرام کے اختتام پر استاد مجموعی حیثیت سے طلبہ کی کارکردگی پر تبصرہ فرما کر طلبہ کی خوبیوں خامیوں کی نشان دہی اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ یہ پروگرام اپنی دلچسپی اور افادیت کی وجہ سے طلبہ میں بہت زیادہ مقبول ہے۔

پچھلے دس برس سے بعض وجوہ کی بنا پر جامعہ کے تعلیمی ہفتے سے مشہور و مقبول یہ پروگرام بالکل موقوف تھا۔ شکر ہے کہ اس سال مدرسۂ ثانوی کے پرنسپل جناب عبدالحق خاں صاحب کی تحریک اور اساتذہ کے اشتراک و تعاون سے یہ روایت دوبارہ زندگی سے مالا مال ہوئی اور جامعہ کے یوم تاسیس ۲۹ اکتوبر ۸۱ء سے ۳ نومبر ۸۱ء تک تعلیمی ہفتے کا شاندار پروگرام پوری شان و شوکت کے ساتھ منایا گیا۔ اس رنگارنگ تعلیمی ہفتے میں جامعہ ہائر سکنڈری اسکول کی جانب سے جو پروگرام پیش کیے گئے ان کی تفصیل کنوینرز حضرات کے ناموں کے ساتھ حسب ذیل ہے۔

تاریخ	پروگرام	کنوینر
۱۔ ۲۸ر اکتوبر ۱۹۸۱ء	جلسۂ سیرۃ النبیؐ	محمد مکرم احمد صاحب
۲۔ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۸۱ء	آن دی اسپاٹ پینٹنگ کمپٹیشن	مس فاطمہ عبداللہ
۳۔ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۸۱ء	انگلش ڈبیٹ (رفیع احمد قدوائی ٹرافی)	محمد شکیل اللہ خاں صاحب
۴۔ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۸۱ء	تمثیلی مشاعرہ	رضی احمد کمال صاحب و خالد محمود صاحب
۵۔ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۸۱ء	کل ہند مقابلۂ غزل سرائی (محمد حسین اکبر ٹرافی)	خالد محمود صاحب و مسز رضیہ محسنی صاحبہ
۶۔ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۸۱ء	گاندھی ٹرافی کمپٹیشن	رضی احمد کمال صاحب و مس کلپنا سکسینہ صاحبہ
۷۔ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۸۱ء	بیت بازی ابنائے قدیم	خالد سیف اللہ صاحب و خالد محمود صاحب
۸۔ یکم نومبر ۸۱ء	کل ہند اردو مباحثہ (ڈاکٹر ذاکر حسین ٹرافی)	خالد محمود صاحب و مسز کشور انصاری صاحبہ
۹۔ یکم نومبر ۸۱ء	فی البدیہہ ہندی نظم گوئی و نظم خوانی	ڈاکٹر جے پال ترنگ صاحب و مس ہیما جوشی صاحبہ
۱۰ر نومبر ۸۱ء	تعلیمی سیمینار "فرار مردہ" (ڈرامہ)	ڈاکٹر جے پال ترنگ صاحب ملک سرور خاں انعامی صاحب

(جامعہ مڈل اسکول کے "تعلیمی میلا نمبر" میں ہمارے جن پروگراموں کی رپورٹ شامل ہو گئی ہے تکرار سے بچنے کی خاطر یہاں ان کی تفصیل سے گریز کی گئی ہے۔)

جلسہ سیرت النبیؐ　　۲۸ر اکتوبر ۸۱ء

جشن تعلیمی کی آغاز کے طور پر یوم تاسیس سے پہلی شام کو جلسہ سیرت

کا انعقاد ہوا۔ اس کا اہتمام جامعہ ہائر سکنڈری اسکول کے استاد مفتی محمد مکرم احمد صاحب نے فرمایا تھا۔ خصوصی مقرر کی حیثیت سے مولانا نواب الدین صاحب نے شرکت فرمائی۔ نظامت کے فرائض دوازدہم سائنس کے طالب علم شکیل احمد نے انجام دیے۔ جلسے کا آغاز مڈل اسکول کے طالب علم عاصم قاسمی صاحب کی تلاوت کلام مجید سے ہوا۔ یازدہم کی طالبہ عظمیٰ سیدہ نے اپنے دلکش ترنم میں حمد پیش کی۔ دوازدہم کی طالبہ ثریا پروین اور عائشہ ناہید نے عربی اور فارسی میں نعت رسولؐ پیش کی۔ یازدہم کی طالبہ شگفتہ یاسمین نے سیرت کے موضوع پر ایک مضمون پیش کیا۔ اس کے بعد وحید احمد غزالی نے کیف آفریں لحن میں ایک اردو کی نعت سنائی۔ جلسے کا اختتام مہمان مقرر مولانا نواب الدین صاحب کی تقریر پر ہوا۔

روز پرچم کشائی ۲۹ راکتوبر ۱۹۸۱ء

جامعہ کے یوم تاسیس' ۲۹ راکتوبر کو جامعہ کا پرچم شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی صاحب کے ہاتھوں لہرایا گیا۔ طلبہ نے اسکاوٹ پریڈ کی نمایش کی۔ شیخ الجامعہ کو سلامی دی' سلامی لینے کے بعد جناب شیخ الجامعہ نے پرچم کشائی کی رسم ادا کی۔ اور مدرسۂ ثانوی کے طلبہ وطالبات نے جامعہ کا ترانہ پیش کیا۔

اس رسمی کارروائی کے بعد ڈین ایر تھیٹر میں جامعہ کے یوم تاسیس کی مناسبت سے جامعہ مڈل اسکول' جامعہ ہائر سکنڈری اسکول اور جامعہ کالج کے طلبہ کا ایک مشترکہ پروگرام جناب شیخ الجامعہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس پروگرام میں جامعہ ہائر سیکنڈری اسکول کی جانب سے سید رضا حیدر اور شگفتہ یاسمین نے نمایندگی کی۔ سید رضا حیدر نے اپنے مخصوص انداز میں جناب خالد محمود صاحب کی نظم پیش کی جو بے حد پسند کی گئیں۔ شگفتہ یاسمین نے "جامعہ ایک روشنی" کے عنوان سے مضمون پڑھا۔

کرشمہ سازی تصویر

(آن دی اسپاٹ پینٹنگ کمپٹیشن) (۳۰ راکتوبر ۱۹۸۱ء)

مختلف اسکولوں سے تشریف لائے ہوئے طلبہ وطالبات کے درمیان پینٹنگ کا یہ مقابلہ لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کیے بغیر نہ رہ سکا۔ بعض طالب علموں نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اس مقابلے میں شرکت کرنے والے طلبہ کی انعامات سے حوصلہ افزائی کی گئی۔

کل ہند انگلش ڈبیٹ (۳۰ راکتوبر ۱۹۸۱ء)

رفیع احمد قدوائی ٹرافی کے لیے انگلش ڈبیٹ کا یہ خوبصورت پروگرام ۳۰ راکتوبر کو صبح ساڑھے نو بجے کامن روم میں منعقد کیا گیا۔ اس میں دلی کے کم وبیش تمام معیاری اسکولوں نے شرکت کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر پرائم منسٹر آفس کے آفیسر اسپیشل ڈیوٹی جناب سلمان خورشید صاحب تشریف لائے شیخ جناب انور جمال قدوائی صاحب کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہوے۔ نظامت کے فرائض نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ خواجہ شمس عبدالرحمٰن نے انجام دیے۔ مندرجہ ذیل اسکولوں نے اس میں شرکت کی:

۱۔ فتح پوری اسکول دہلی۔
۲۔ سمر فیلڈز اسکول دہلی
۳۔ کیندریہ ودیالیہ
۴۔ گروہرکشن اسکول
۵۔ مدرز انٹرنیشنل اسکول
۶۔ این پی۔ بنگالی ہائر سکنڈری اسکول
۷۔ دہلی پبلک اسکول متھرا روڈ
۸۔ دہلی پبلک اسکول۔ آر کے پورم
۹۔ گرلز ہائر سکنڈری اسکول' بلبلی خانہ

ججز کے فرائض (۱) جناب مینائی صاحب (۲) جناب انور صاحب اور (۳) جناب اسد صاحب نے انجام دیے۔ ٹرافی مستحق مدرز انٹرنیشنل اسکول کی ٹیم قرار پائی۔ دوسری ٹرافی کی مستحق خود جامعہ کی ٹیم ٹھہری لیکن اعلان کے مطابق میزبان ہونے کی حیثیت سے مستثنیٰ رہی اور یہ ٹرافی تیسرے نمبر آنے والی کیندریہ ودیالیہ گرلز اسکول کی ٹیم کو ملی۔

انفرادی انعامات میں پہلا انعام مدرز انٹرنیشنل کی جیسکا پال اور دوسرا انعام جامعہ ہائر سکنڈری اسکول کے طالب فیروز حامد عثمانی نے حاصل کیے۔

تمثیلی مشاعرہ　　(۳۰ر اکتوبر ۸۱ء)

ایک حد تک تمثیلی مشاعرہ بھی اردو کی ادبی رسوم میں داخل ہے اور بڑی شاندار روایت کا حامل ہے۔ اپنے عہد کے بڑے بڑے شعرا نے اپنے پیش رو شعرا کی تمثیل پیش کی ہے۔ کلکتے کے فضلی برادران کا سنہ ۱۹۴۴ء کا تمثیلی مشاعرہ اس سلسلے میں بہت مشہور ہے جس میں نذر الاسلام، علامہ وحشت، ساغر نظامی، جگر مراد آبادی، اور مولوی عبدالحق نے میر، غالب، مومن، داغ، اور حالی کی نمایندگی کی تھی۔

زندہ دلان جامعہ کے ذوق کی داد دینی ہوگی کہ یہاں اس قسم کے پروگرام ہمیشہ سرسبز رہے اور جامعہ والوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تمثیلی مشاعرے کی روایت بھی جامعہ میں اگرچہ نئی نہیں لیکن کافی عرصہ گزر جانے کی وجہ سے خوش مذاقی گرد آلود ہوتی جا رہی تھی کہ جناب عبدالحق خاں صاحب اور جناب خالد سیف اللہ صاحب کی کاوش سے جشن تعلیمی کی شکل میں فرحت بخش ہواؤں کے چند خوش گوار جھونکے چلے اور اہل جامعہ کے ذوق کی چنگاری دیکھتے دیکھتے شعلہ جوالہ بن گئی۔ ایک طویل عرصے کی فراموشی کے بعد تمثیلی مشاعرے کی کامیابی اس بات کا بین ثبوت ہے۔

کل ہند مقابلۂ غزل سرائی　　(۳۱ر اکتوبر ۸۱ء)
(محمد حسین آلو ٹرافی)

غزل سرائی کا یہ دلچسپ مقابلہ جامعہ ملیہ کی ادبی اور کلچرل روایات میں توسیع کے طور پر سب سے پہلے ۱۹۷۸ء میں منعقد کیا گیا۔ محمد حسین آلو ٹرافی کو متعارف کرانے کا سہرا اردو کے مقبول استاد جناب خالد محمود صاحب کے سر جاتا ہے۔

محمد حسین آلو کا نام جامعہ ہائر سکنڈری اسکول کی تاریخ کے علاوہ کسی تاریخ میں نہیں ملے گا۔ بڑی شخصیتوں کی طرح ان کی عام شہرت و مقبولیت بھی نہیں ہے۔ پھر اُن کے نام ٹرافی کا انتساب ضرور کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ اس لیے اس مقام پر ان کا ذکر قدرے تفصیل طلب ہے۔

محمد حسین آلو کا تعلق حیدرآباد کی تاریخی اور تاریخ ساز سرزمین سے تھا لیکن تعلیم جامعہ ملیہ (دہلی) میں حاصل کی۔ ۱۹۲۶ء میں یہاں داخلہ لیا۔ ۱۹۳۴ء میں اردو سے بی اے کی سند لے کر وطن واپس ہوگئے۔ ۱۹۴۳ء میں ابتدائی درجات میں اردو کے معلّم کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔ آخر تک اسی عہدے سے متعلق رہے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں جامعہ نے ان کو اپنے حیاتی ارکان کے حلقے میں شامل کر لیا تھا۔ ان کی شخصیت کی عظمت میں ان کے عملی کردار کا حصہ ان کے علم سے زیادہ ہے۔ اخلاق و مروّت اور ایثار و شفقت کے ساتھ ساتھ خودداری و خود اعتمادی — مجموعی اعتبار سے انھوں نے متوازن۔ باہمہ اور بے ہمہ شخصیت پائی تھی۔ یہ ان کی پرخلوص شخصیت کا جادو تھا کہ ان کے انتقال کے بعد جامعہ ہائر سکنڈری اسکول میگزین "امنگ" نے ان پر خصوصی نمبر شائع کر کے ان کی شخصیت کے نقوش کو ابدیت بخشی

بنا کردند خوش رسمے برائے دیگراں بودن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

محمد حسین آلو کی بھی "برائے دیگراں بودن" کی خصوصیت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ اس ٹرافی کو ان کے نام سے معنون کیا جائے

اس سال اس پروگرام کو بڑے اہتمام سے منعقد کیا گیا۔ اور محمد حسین آلو ٹرافی کے نام سے دو ٹرافیاں علی الترتیب اول اور دوم آنے والی ٹیموں کو دی گئیں۔ تین انفرادی انعامات کے علاوہ مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں صاحب کی جانب سے چار خصوصی اعزازی انعامات بھی دیے گئے۔

تقسیم انعامات اور پروگرام کی صدارت اردو کے مشہور ادیب و صحافی جناب شہباز حسین صاحب (ڈائرکٹر اردو بورڈ اور سابق مدیر ماہنامہ "آج کل" (اردو) نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض درجہ یازدہم (آرٹس) کی طالبہ عظمٰی سیدہ اور درجہ یازدہم (سائنس) کی طالبہ عطرت سرمدی نے انجام دیے۔ ججز کی حیثیت سے (۱) پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صدر شعبۂ اسلامیات جامعہ ملیہ اسلامیہ (۲) استاد ہلال خاں فیکلٹی آف ایجوکیشن جامعہ ملیہ اسلامیہ

(۳) ڈاکٹر ظہور محمد خاں استاد شعبۂ سیاسیات جامعہ ملیہ اسلامیہ اور (۴) ڈاکٹر شمیم حنفی استاد شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے فیصلے کی ذمہ داری سرانجام دی۔

اس دلچسپ پروگرام کا انعقاد ۱۳ر اکتوبر بروز سنیچر جامعہ اسکولس کے سینٹرل اسٹیج پر صبح ساڑھے نو بجے ہوا۔ اور تقریباً ایک بجے تک جاری رہا۔ اسٹیج کے سامنے زمینی فرش کے علاوہ کثیر تعداد میں کرسیوں پر لاتعداد سامعین موجود تھے اس میں دہلی و بیرون دہلی سے ۱۲ ٹیموں نے شرکت کی۔ خود جامعہ کے ہائر سیکنڈری اسکول کی جانب سے وحید احمد غزالی، سعدیہ فاطمہ اور شاہد اقبال نے مقابلے میں شرکت کی۔

پروگرام کا آغاز عظمیٰ سیدہ کی اس تقریر سے ہوا:

معزز حضرات! جامعہ اسکول اگر ایک طرف اپنے طلبہ کی ذہنی تربیت اور ہندستانی سیکولر (SECULER) تہذیب کا ورثہ ہے تو دوسری جانب اپنے رنگ برنگے کلچرل (CULTURAL) اور ادبی جلسوں کے لیے بھی مشہور ہے۔ "محمد حسین ابو ٹرافی" غزل سرائی کا یہ کل ہند مقابلہ جامعہ کی انھیں صالح روایات کی ایک ہلکی سی جھلک ہے۔

محمد حسین ابو مرحوم جن کے نام آج کی ٹرافی کا انتساب کیا گیا ہے، ہمارے اسکول میں اردو کے مشہور استاد ہونے کے علاوہ ایک ایسی پیاری شخصیت کے مالک تھے جس کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔ محمد حسین ابو اپنے طلبہ اور ساتھی اساتذہ کے علاوہ جامعہ کی پوری بستی میں یکساں مقبول تھے۔ ان کی شخصیت کا ایک کرشمہ یہ تھا کہ جو شخص اس پیکرِ ایثار و خلوص سے ایک بار ملاقات کر لیتا ان کا گرویدہ ہو جاتا چنانچہ ہم نے ان کی یاد کے معطر پھولوں کو تازہ رکھنے کے لیے اس ٹرافی کو محمد حسین ابو کے نام سے منسوب کیا ہے۔

ہمارے لیے یہ بات قابل فخر ہے کہ آج کے اس پروگرام کی صدارت ملک کے مشہور ادیب و صحافی جناب شہباز حسین صاحب فرما رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ غزل سرائی کی مقابلی پیش کش کے بعد وہ غزل اور غزل سرائی سے متعلق اپنے خیالات سے ہمیں آشنا ہونے کا شرف بخشیں گے۔

عظمیٰ سیدہ کی تعارفی تقریر کے بعد عظمت سرمدی نے مقابلے کے شرائط و ضوابط سے سامعین کو آگاہ کیا۔ اسی کے ساتھ غزل سرائی کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے جامعہ ہائر سیکنڈری اسکول کے طالب علم وحید احمد غزالی نے اپنی مسحور کن آواز میں میر کی غزل پیش کی۔

اس کے بعد علی الترتیب مندرجہ ذیل اسکولوں کی ٹیموں نے غزل سرائی کا مظاہرہ کیا۔

۱۔ امام المدارس۔ امروہہ۔ ناصر عباس، خسرو مرزا۔
۲۔ رابعہ گرلس پبلک اسکول دہلی فرزانہ حفیظ۔ ناظمہ تنظیم احمد
۳۔ جامعہ جونیئر اسکول۔ دہلی۔ مزمل ہلال۔ مجیب ہلال
۴۔ مظہر الاسلام ہائر سکنڈری اسکول (دہلی) محمد الیاس۔ عشرت کفیل
۵۔ شفیق میموریل ہائر سکنڈری اسکول۔ محمد رئیس۔ شاہد۔
۶۔ دیو سماج موڈرن اسکول (دہلی) فرحت ظہور، شہباز مسرور
۷۔ چیتم بلڈنگ ہائر سیکنڈری اسکول (دہلی) نجمہ یوسف، بشریٰ نورعین
۸۔ فتح پوری مسلم ہائر سکنڈری اسکول (دہلی) نظر نجمی، عبدالحق
۹۔ فیض عام انٹر کالج (میرٹھ) خالد انور، آصف علی۔
۱۰۔ این۔ پی۔ بنگالی ہائر سکنڈری اسکول (دہلی) مینا بجاج، شاہد اقبال
۱۱۔ جامعہ سینیئر سکنڈری اسکول: وحید احمد غزالی۔ سعدیہ فاطمہ، شاہد اقبال
۱۲۔ اینگلو عربک ہائر سکنڈری اسکول (دہلی) ذکر الرحمٰن، محمد محسن

غزل سرائی کی تقابلی پیش کش کے بعد مہمان خصوصی اور پروگرام کے صدر جناب شہباز حسین صاحب نے اپنے تاثرات سے سامعین کو مستفیض فرمایا۔ جناب شہباز حسین صاحب کی صدارتی تقریر کے بعد کنوینر جناب خالد محمود صاحب نے نتائج کا اعلان فرمایا۔

نتائج

جج صاحبان کے فیصلے کے مطابق پہلی ٹرافی کی مستحق جامعہ ہائر سکنڈری اسکول کی ٹیم قرار پائی۔ لیکن اعلان کے بموجب میزبان ٹیم ہونے کی حیثیت سے ٹرافی سے مستثنیٰ قرار دی گئی۔

ٹرافی دوسرے نمبر پر آنے والی دیو سماج ماڈرن اسکول دہلی کی ٹیم کو ملی۔

دوسری ٹرافی فیض عام انٹر کالج میرٹھ کی ٹیم نے حاصل کی۔
ٹرافیوں کے علاوہ تین انفرادی انعامات مندرجہ ذیل طلبہ نے حاصل کیے۔
پہلا انعام، دیو سماج، ماڈرن اسکول کی طالبہ فرحت ظہور نے حاصل کیا۔
دوسرا انعام، جامعہ ہائر سکنڈری اسکول کے طالب علم وحید احمد غزالی نے حاصل کیا۔
تیسرا انعام، فیض عام انٹر کالج (میرٹھ) کے طالب علم آصف علی نے حاصل کیا۔
انفرادی انعامات کے علاوہ مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں صاحب کی جانب سے چار خصوصی اعزازی انعامات مندرجہ ذیل طلبہ نے حاصل کیے۔

۱۔ خسرو مرزا — امام المدارس (امروہہ)
۲۔ نجمہ یوسف — چشم بلڈنگ (دہلی)
۳۔ مینا بجاج — این. پی. بنگالی اسکول (دہلی)
۴۔ محمد محسن — اینگلو عربی اسکول (دہلی)

پروگرام کے خاتمے پر فرحت ظہور، وحید احمد غزالی، آصف علی اور مینا بجاج کو سامعین کے اصرار پر دوبارہ غزل سرائی کی دعوت دی گئی۔ آخر میں عطرت سرہندی کے متشکرانہ الفاظ پر یہ دلچسپ پروگرام بڑی کامیابی سے اختتام پذیر ہوا۔

گاندھی ٹرافی کمپٹیشن (۳۱ر اکتوبر ۸۱ء)

گاندھی جی سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ناقابل فراموش قلبی رشتے کے پیش نظر جامعہ میں یہ ٹرافی بہت پہلے متعارف کی گئی تھی۔ گیت، مونو ایکٹنگ، گروپ سانگ، ایکشن سانگ اور فوک ڈانس کے پروگراموں کی یہ خوب صورت نشانی۔ پرانی یادوں کو سینے میں بسائے اس وقت کی منتظر تھی جب کوئی صاحب ذوق اسے دعوت نظارگی کا موقع فراہم کرے۔ جناب عبدالحق خاں صاحب نے جشن تعلیمی کے موقع پر اس کی اس آرزو کو پورا کرنے کا فیصلہ فرمایا جس کے نتیجے میں ایک بہترین کلچرل پروگرام پیش کیا گیا۔ دلی کے مختلف معیاری اسکولوں نے اس میں شرکت کی۔ محترمہ بیگم عابدہ علی احمد صاحب نے بطور مہمان خصوصی تشریف لاکر طلبہ وطالبات کی حوصلہ افزائی فرمائی۔
آغاز عظمیٰ سیّدہ کی افتتاحی تقریر سے ہوا اور مہمان خصوصی کی تقریر پر پروگرام کا اختتام ہوا۔

بیت بازی ابنائے قدیم (۳۱ر اکتوبر ۸۱ء)

میر نے کہا تھا ع "بیت بحثی طبع نازک پر ہے اپنے ناگوار"۔ لیکن جامعہ کے ابنائے قدیم نے جامعہ کی ۶۱ ویں سالگرہ کے موقع پر اس پروگرام کو اس قدر دلچسپ انداز میں پیش کیا کہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی نشست کے بعد جب اختتام کا اعلان ہوا تو سامعین کی طبع پر ناگوار ہو رہا تھا۔ جامعہ اسکولز کے سنٹرل اسٹیج پر یہ پروگرام ۳۱ر اکتوبر کی شام میں منعقد ہوا۔
اس پروگرام میں جامعہ کے موجودہ طلبہ وطالبات کے علاوہ اساتذہ نے بھی حصہ لیا۔ ہمیں یقین ہے کہ جشن تعلیمی کے یادگار پروگرام کی حیثیت سے اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

کل ہند اردو مباحثہ یکم نومبر ۱۹۸۱ء
ڈاکٹر ذاکر حسین ٹرافی

غزل سرائی کی طرح اس دلچسپ اور وقیع ادبی پروگرام کی بنیاد بھی جناب خالد محمود صاحب کے ہاتھوں ۱۹۷۶ء میں پڑی۔ اس مقابلے میں دو ٹرافیوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ جو علی الترتیب اول اور دوم آنے والی ٹیموں کو دی گئیں۔ تین انفرادی انعامات کے علاوہ مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں صاحب کی طرف سے چھ اعزازی انعامات بھی دیے گئے۔
پروگرام کی صدارت کے لیے عالمی شہرت یافتہ ادیب وصحافی جناب سردار خشونت سنگھ صاحب کو دعوت دی گئی تھی۔ موصوف نے اس پروگرام میں شرکت فرما کر اس کو کافی حد تک تاریخی حیثیت بخش دی۔ جج کے فرائض (۱) جناب ڈاکٹر انوار علی خاں سوز استاد شعبۂ انگریزی جامعہ ملیہ اسلامیہ (۲) ڈاکٹر عنوان چشتی ریڈر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ (۳) ڈاکٹر محمد حنیف کیفی استاد شعبۂ اردو جامعہ ملیہ نے انجام دیے۔ نظامت درجہ یازدہم سائنس کے طالب علم سید غلام محمد قائم رضوی اور درجہ یازدہم

(آرٹس) کی طالبہ نگار زہرہ زیدی نے انجام دی۔

مباحثے کا عنوان، علامہ اقبال کا ایک مصرع تھا ع

"جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی" یہ دلچسپ ادبی پروگرام یکم نومبر بروز اتوار، جامعہ ہائر سکینڈری اسکول کے کامن روم میں صبح ساڑھے نو بجے منعقد ہوا۔ جو تقریباً ساڑھے بارہ بجے تک جاری رہا۔ پورا ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ بلکہ کچھ لوگ پیچھے اور دائیں بائیں کھڑے ہوئے بھی نظر آرہے تھے۔

دہلی و بیرونِ دہلی سے کل بارہ ٹیموں نے اس مباحثے میں شرکت کی۔ آغاز محمد قائم رضوی کی تعارفی تقریر سے ہوا۔ سردار خشونت سنگھ کا تعارف ان الفاظ میں ہوا۔

میرا خیال ہے کہ شاید ہی ہندستان میں کوئی ایسا تعلیم یافتہ گھرانا ہوگا جو خشونت سنگھ کے نام سے آشنا نہ ہو —— وہ بنیادی طور پر انگریزی کے ادیب وصحافی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ اردو اور فارسی زبانوں پر بھی انھیں قدرت حاصل ہے۔ اردو اور پنجابی زبانوں سے انگریزی میں متعدد ترجمے، خصوصاً سکھ مذہب اور تاریخ پر ان کی متعدد تصانیف اپنے موضوع کے اعتبار سے انگریزی زبان کے سرمائے میں اضافے کا درجہ رکھتی ہیں۔ ترجمہ بجائے خود بڑا اہم کام ہے۔ ترجمے میں طبع زاد تخلیق سے زیادہ تخلیقی کاوش کرنا پڑتی ہے اور تخلیقی جوہر ترجموں میں طبع زاد تصنیف سے زیادہ ابھر کر سامنے آتا ہے لیکن عموماً طبع زاد تخلیق کو ترجمہ پر فوقیت دی جاتی ہے۔ خشونت سنگھ نے انگریزی ادب کو متعدد طبع زاد تخلیقات بھی دی ہیں TRAIN TO PAKISTAN اور I SHALL NOT HEAR THE NIGHTINGLE ان کے مشہور انگریزی کے ناول بڑی قدر وقیمت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

اردو زبان وادب میں ان کا خاص میدان اقبالیات ہے۔ اقبال سے انھیں عشق ہے۔ انھوں نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ ہر قوم، قبیلے اور قریے کا ایک پیغمبر ہوتا ہے۔ پنجاب کا پیغمبر اقبال ہے۔ وہ اقبال کے کلیات اپنی میز کی درازوں میں اپنے سرہانے اور اپنی الماریوں میں بڑے اہتمام سے رکھتے ہیں۔ اقبال کی مشہور نظم "شکوہ اور جواب شکوہ" کا انگریزی ترجمہ ان کا اقبالیات کے سلسلے میں وقیع اور مشہور کارنامہ ہے جس پر اردو اور انگریزی دونوں زبانیں ہمیشہ تشکر وامتنان کے معطر پھول نچھاور کرتی رہیں گی۔

یہی نہیں کہ وہ اقبال کے عاشق محض ہیں۔ اقبال اور ان کی شخصیت میں بڑی اہم چیزیں یکساں طور پر ملتی ہیں۔ حق گوئی، جوش وخروش، شوخی، لطیف مزاح، نازک اور باریک طنز —— علمی زندگی میں صداقت وحقانیت، صاف گوئی بے باکی، سادگی، خوش سلیقگی اور خوش مزاجی دونوں کی شخصیتوں کے اہم ترین پہلو ہیں، جو بالکل یکساں ہیں۔

خشونت سنگھ کی شخصیت کا بھرپور حصہ ان کی صحافت میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس میدان میں انھوں نے اپنی انفرادیت کے نقوش وعلائم فروزاں کیے ہیں بلکہ ان کا نام ایک وقیع ادبی صحافت کی علامت بن چکا ہے جس میں طنز کی ملاحت اور مزاح کی شیرینی کے ساتھ حقیقت نگاری ہوتی ہے۔ ہندستان ہی نہیں دنیا کے اخبارات ورسائل میں خشونت سنگھ کا نام اخبار کے معیار کی ضمانت ہوتا ہے

ILLUSTRATED WEEKLY یا INDIAN EXPRESS ان کے نام سے وقعت واہمیت حاصل کرتے ہیں۔

یہ ایک حسنِ اتفاق ہے کہ آج کے مباحثے میں موصوف کی شرکت کئی وجوہ سے مناسبت رکھتی ہے۔ سب سے بڑی مناسبت تو یہ ہے کہ آج کا موضوع بحث سردار صاحب کا بھی ایک دلچسپ موضوع بحث ہے۔ انشاء اللہ ہم مقابلہ کے تقریری پروگرام کے بعد ان کے وقیع ونادر خیالات سے مستفید ہوں گے۔ دوسری دلچسپ مناسبت یہ ہے کہ بحث کا عنوان ان کے محبوب شاعر علامہ اقبال کا ایک مصرع ہے۔

"جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"

ایک مناسبت اور ہے جو جامعہ اور ان کے درمیان مولانا شفیع الدین نیّر مرحوم کے زاویہ سے ایک مثلث بناتی ہے۔ یہ ایک قابل ذکر بات ہے کہ سردار خشونت سنگھ اردو کے مشہور شاعر اور جامعہ ہائر سکنڈری اسکول کے مقبول استاد کے تلامذہ میں سے ہیں جن کے استاد ہونے پر خود مولانا شفیع الدین نیّر صاحب

رحوم فخر کیا کرتے تھے۔

ہم شکر گذار ہیں کہ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ہماری درخواست قبول فرمائی اور ہماری بزم کو اپنی تشریف آوری سے رونق بخشی۔"

محمد قائم رضوی کی اس تعارفی تقریر کے بعد تقریری سلسلے کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے جامعہ ہائر سکنڈری اسکول کے طلبہ نے تقریریں کیں۔ جامعہ ہائر سکنڈری اسکول سے درجۂ یازدہم سائنس کے طلبہ سید رضا حیدر اور مدیح الرحمٰن صہیب نے علی الترتیب موضوع کی موافقت اور مخالفت میں تقریر کی۔ ان کے بعد حسب ترتیب مندرجہ ذیل ٹیموں نے حصہ لیا۔

	کامران خورشید	(موافقت)
۱۔ امام المدارس امروہہ	خسرو مرزا	(مخالفت)
	سراج آصف	(موافقت)
۲۔ شفیق میموریل ہائر سکنڈری اسکول دہلی۔	آصف علی	(مخالفت)
	محمد احمر	(موافقت)
۳۔ سٹی ہائی اسکول (علی گڑھ)	احمر عمر	(مخالفت)
	ذکر الرحمٰن	(موافقت)
۴۔ اینگلو عربک ہائر سکنڈری اسکول (دہلی)	فیض الاسلام	(مخالفت)
	آصف علی	(موافقت)
۵۔ فیض عام انٹر کالج (میرٹھ)	خالد انور	(مخالفت)
	راشدہ سلطانہ	(موافقت)
۶۔ چشمہ بلڈنگ ہائر سکنڈری اسکول (دہلی)	سنجیدہ واجدہ	(مخالفت)
	عشرت کفیل	(موافقت)
۷۔ منظہر الاسلام ہائر سکنڈری اسکول (دہلی)	یوسف جمال	(مخالفت)
	ریحانہ رحمت علی	(موافقت)
۸۔ رابعہ گرلس پبلک اسکول (دہلی)	فرحانہ فضل الرحمٰن	(مخالفت)
	محمد انس	(موافقت)
۹۔ فتح پوری مسلم ہائر سکنڈری اسکول (دہلی)، جامعہ ہائر سکنڈری اسکول (دہلی)	عادل ضمیر	(مخالفت)
	سعید احمد	(موافقت)
۱۰۔ جامعہ جونیئر اسکول (دہلی)	ریاض الدین	(مخالفت)

(فتح پوری مسلم ہائر سکنڈری اسکول (دہلی) سے صرف ایک طالبعلم محمد انس نے موضوع کی موافقت میں تقریر کی۔ ٹیم کے دوسرے فرد کی حیثیت سے عادل ضمیر جامعہ ہائر سکنڈری اسکول کے ایک طالب علم نے موضوع کی مخالفت کی۔)

تقابلی تقریری سلسلے کے بعد صدر مجلس اور مہمان خصوصی جناب سردار خشونت سنگھ صاحب نے تقریر فرمائی۔ ان کی تقریر تین پہلوؤں سے خاصی اہم تھی۔ اولاً موصوف نے اقبال کے سلسلے میں اپنے خیالات اور نظریہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی، ثانیاً اپنے اور مولانا شفیع الدین نیّر صاحب مرحوم کے تعلق، مولانا مرحوم کی شاگردی اور شاگردی سے انھیں جو لازوال فائدہ پہنچا، گراں قدر الفاظ میں اس کا ذکر فرمایا۔ ثالثاً ان کی اس تقریر سے ان کی اپنی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں پر روشنی پڑی۔ ابتدائی تقریر میں یہ کہا گیا تھا کہ وہ اقبال کو پنجاب کا پیغمبر مانتے ہیں اس بات کو دہراتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں اقبال کو صرف پنجاب کا پیغمبر نہیں بلکہ پورے ہندستان کا پیغمبر مانتا ہوں اور انھیں ایک اسلامی شاعر کی بجائے ایک کائناتی شاعر و مفکر کی حیثیت دیتا ہوں۔ اس بات کا افسوس ہے کہ موصوف کی تقریر محفوظ نہ کی جا سکی۔

آخر میں ڈاکٹر ذاکر حسین ٹرافی کے کنوینر جناب خالد محمود صاحب نے نتائج کا اعلان فرمایا اور مہمان خصوصی جناب خشونت سنگھ صاحب نے انعامات تقسیم فرمائے۔

نتائج

ٹرافیاں

جج صاحبان کے فیصلے کے مطابق:

ڈاکٹر ذاکر حسین رننگ ٹرافی کی مستحق جامعہ ہائر سکنڈری اسکول کی ٹیم قرار پائی لیکن میزبان ٹیم ہونے کی حیثیت سے ٹرافی سے مستثنیٰ قرار دی گئی۔

ٹرافی دوسرے نمبر پر آنے والی فیض عام انٹر کالج (میرٹھ) کو دی گئی۔

دوسری ٹرافی امام المدارس (امروہہ) کی ٹیم کو ملی

انفرادی انعامات

مکتبۂ جامعہ کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں صاحب کی جانب

سے مندرجہ ذیل چھ طلبہ کو اعزازی انعامات بھی دیے گئے۔

۱۔ کامران خورشید (امام المدارس امروہہ)
۲۔ خسرو مرزا (امام المدارس امروہہ)
۳۔ محمد انس (فتح پوری مسلم ہائر سکنڈری اسکول دہلی)
۴۔ ریاض الدین (جامعہ جونیئر اسکول دہلی)
۵۔ راشدہ سلطانہ (چیمس فورڈ ہائر سکنڈری اسکول۔ دہلی)
۶۔ ریحانہ رحمت (درالعبہ گرلس ہائر سکنڈری اسکول دہلی)

اس دلچسپ اور یادگار پروگرام کا اختتام، نگار زہرہ زیدی کے شکریہ کے ان الفاظ پر ہوا۔

"خدا کا شکر ہے کہ ہمارا مباحثے کا پروگرام بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا۔ اب میں اس خوش گوار فرض کو ادا کرنا چاہتی ہوں جس کے بغیر پروگرام کا اختتام غیر رسمی سا ہوگا۔ یعنی میں ان سبھی حضرات کا شکریہ ادا کرتی ہوں، جنھوں نے اس پروگرام میں کسی بھی طور پر ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے خصوصاً ان ٹیموں کا جو مختلف قریب و دور مقامات سے اس میں شرکت کے لیے آئیں، ان اساتذہ کا جو ان ٹیموں کے ساتھ تشریف لائے اور خصوصاً جناب سردار خشونت سنگھ صاحب کا جنھوں نے ہمارے لیے اپنا قیمتی وقت قربان کیا اور اپنی صدارت سے اس پروگرام کو وقیع بنایا اور جج حضرات کا جنھوں نے اس پروگرام کے فیصلہ کن مرحلے کی سنگین ذمہ داری اپنے سر لی۔ اور ان تمام حضرات کا جنھوں نے کسی بھی طور پر ہمارے ساتھ اشتراک کیا ہے۔

ہندی مقابلۂ نظم (یکم نومبر ۱۹۸۱ء)

نظم خوانی اور فی البدیہہ نظم گوئی کا یہ دلچسپ مقابلہ یکم نومبر ۸۱ء کو کامن روم میں منعقد ہوا۔ اس میں جامعہ کے علاوہ دلی کے بہت سے اسکولوں نے حصہ لیا۔ اس مقابلہ میں نظم سرائی کے علاوہ وہ وقتی طور پر دیے گئے عنوانات پر فی البدیہہ نظم گوئی کا پروگرام خاصا وقیع تھا

پرنسپل عبد الحق خاں صاحب نے اس پروگرام کی صدارت فرمائی۔ نظامت کے فرائض اروند شرما اور سریندر موہن چھابڑا نے انجام دیے۔ طبع زاد نظم خوانی میں دہلی پبلک اسکول کے سوربھ سنگھ نے پہلا انعام اور جامعہ کی ثمینہ نے دوسرا انعام حاصل کیا۔

تعلیمی سیمینار (۳۰ نومبر ۸۱ء)

یہ ادبی و علمی کارگزاری اپنی نوعیت کی اکیلی اور خاصی وقیع تھی۔ جو پہلی مرتبہ منعقد کی گئی تھی۔ اس کے انعقاد کا سہرا پرنسپل جناب عبد الحق خاں صاحب کے علاوہ خصوصی طور پر جناب ڈاکٹر جے پال ترنگ صاحب کے سر ہے۔

یہ دن بھر کا سیمینار تین نشستوں میں منقسم تھا۔ افتتاحی نشست کی صدارت فادر ٹی وی کونکل (چیئرمین سنٹرل بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن) نے فرمائی۔ اس کے علاوہ مقررین کی حیثیت سے

جناب عبد الحق خاں صاحب۔ ڈائرکٹر سیمینار
جناب انور جمال قدوائی۔ وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ
جناب ڈاکٹر جے پی ترنگ۔ کنوینر سیمینار
جناب ڈاکٹر ایم جی چترویدی۔ ریڈر۔ این سی۔ آرٹی۔
اور جناب ڈاکٹر ڈی جوشی۔ ریڈر جامعہ ملیہ اسلامیہ

نے شرکت فرمائی۔ اس نشست میں سیمینار کے خاص موضوع کے علاوہ مختلف تعلیمی مسائل بھی زیر بحث آئے۔

دوسری نشست ڈاکٹر و برش پرنسپل ڈی۔ پی۔ ایس کی صدارت میں ہوئی۔ اس نشست میں سیمینار کا خاص موضوع یعنی

STATUS OF TEXT BOOKS IN TEACHING OF SOCIAL SCIENCES AND SCIENCES

پر مباحثہ ہوا۔ شرکا تھے۔

مسٹر آر آر اوجھا۔ موڈرن اسکول
مسٹر راجندر سنگھ۔ لکچرر ایس۔ پی کالج ہریانہ
مسٹر ایس سنگھ۔ پی۔ جی۔ ٹی (کیمسٹری) آر کے پورم
اور مسٹر نیر جاکھگو ترا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نام آتے ہی جامعہ اپنے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ذہن میں ابھرتی ہے۔ جامعہ ملیہ ایک تحریک بھی ہے، وہ تحریک جو ہماری آزادی کی جنگ کی تحریک کے ساتھ جڑی ہوئی ہے وہ تحریک جس سے ہندستان کی جنگ آزادی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی ملی غیرت کے لیے اپنا سب کچھ یہاں تک کہ اپنی زندگی بھی قربان کر دینے کی تاریخ وابستہ ہے اگر ہماری جنگ آزادی کی تحریک سے خلافت کی تحریک اور ترک موالات کی تحریک کے باب کو نکال دیا جائے تو یہ تاریخ ادھوری رہ جاتی ہے۔ لیکن یہاں میں آپ کو اس تحریک کی تفصیل بتانے نہیں جا رہی ہوں۔

جامعہ ایک شخصیت بھی ہے ایک ایسی دلنواز شخصیت جس کا لباس بردباری متانت اور نرم روی ہے جس کے سینے میں ایک درد مند دل ہے جو اپنے گھر کے اندر معاشی پریشانیوں کو نظر انداز کر کے ہمہ وقت اپنے ساتھیوں کے آرام و آسائش کے لیے کوشاں رہتی ہے اس شخصیت کا دماغ بہت پہلے یہ سوچ چکا تھا کہ ملک اور قوم کی بھلائی صرف سیاسی آزادی جیت لینے سے نہیں ہو سکتی اس کے لیے ایسے افراد کی بھی ضرورت ہے جن کے ذہن ہر طرح کی تنگ نظری کی آلودگیوں سے پاک و صاف ہوں اور جو علم حاصل کر کے اپنے وطن کی خدمت کر سکیں۔ یہ شخصیت وہ تھی جس کا عقیدہ لمبی چوڑی باتوں کے بجائے خاموشی کے ساتھ گھٹ گھٹ کر جینے میں تھا۔

یازدہم (آرٹس) جامعہ ہائر سکنڈری اسکول

جامعہ ایک تعلیمی نظریہ بھی ہے جس کے تحت بچوں کی تعلیم و تربیت کا مقصد اس کی شخصیت کو ابھار کر اس کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا اس کی ذات میں علم و عمل کا ایک ایسا امتزاج پیدا کرنا ہے جو اسے [illegible] سماج پر ایک بوجھ بن جانے سے بچائے۔ جامعہ کا [illegible] تعلیمی نظریہ دوسرے لفظوں میں یہ نظریہ [illegible] کو علم کا ٹیپ ریکارڈر بنانے کے بجائے ایک انسان بنانے کی کوشش کرتا ہے ایک ایسا انسان جو [illegible] کتابوں میں درج اصول وضوابط کی اندھی تقلید کے بجائے حالات اور موقع کے مطابق صحیح فیصلہ کی لیاقت رکھتا ہو۔ اس نظریہ کو کسی نے وردھا اسکیم کا نام دیا اور کسی نے بنیادی تعلیم کہا۔ لیکن اس بات سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ تعلیم کے اس تصور کا جنم داتا جامعہ کا ہی ایک سپوت تھا اور اس پر [illegible] تجربے بھی جامعہ میں ہی ہوئے۔

جامعہ ایک تہذیب بھی ہے ایک ایسی تہذیب جس کی دو راہیں صلح و آشتی اور تمام مذاہب کے لیے یکساں عزت و عقیدت کے جذبے سے بنی ہے اس تہذیب میں مذہب کو کوئی امتیازی حیثیت نہیں دی جاتی۔ کچھ سال کی بات ہے ایک بار حکومت کی طرف سے جامعہ ملیہ کے پاس ایک سوالنامہ آیا تھا اس سوالنامے میں پوچھا گیا تھا کہ جامعہ میں کتنے طالب علم مسلمان اور کتنے ہندو ہیں جامعہ سے اس کا جواب دیا گیا کہ ہمارے [illegible] مذہب کا کوئی خانہ نہیں ہم انسانوں کو جانتے ہیں یہ تہذیب آپس میں میل و محبت بھائی چارہ ایک دوسرے کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہنے بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت ان تمام باتوں سے عبارت ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک تعلیمی ادارہ [illegible] ایک ایسا تعلیمی ادارہ جس نے ایک لمبے عرصے تک اپنی مالی حالت کے لیے کبھی حکومت کے سامنے دست طلب دراز نہیں کیا اور آزادی کے بعد جب یہ گفتگو شروع ہوئی کہ جامعہ کو

مرکزی حکومت سے امداد ملے تو ہمارے رہبروں نے یہ بات حکومت کے اراکین پر اچھی طرح واضح کردی کہ ہم اس مالی امداد کے بدلے اپنی آزادیٔ فکر اور آزادیٔ فیصلہ نہیں ختم ہونے دیں گے۔ اس تعلیمی ادارے کے مشکل دنوں کو یاد کرتے ہوئے ایک بار ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے کہا تھا "تنگی کے دن کچھ اچھے ہی دن تھے سامان نہیں تھا ارمان تھے، دولت نہیں تھی ہمت تھی، سامنے ایک آدرش تھا، دل میں ایک لگن تھی، اختیار مانگنے کا کسے دھیان تھا، نیا کام پورا کرنے کی دھن تھی، جان کھپانے میں جی سکھ پاتا تھا، ہر بچہ جو اس بے سروسامان بستی میں آجاتا تھا اس کی آنکھوں میں ہمیں آزادی کی چمک دکھائی دیتی تھی، ہم سے غلامی نے جو کچھ چھین لیا تھا وہ سب ہمیں ان بچوں میں مل جاتا تھا۔ ہر بچے میں ایک گاندھی ایک جمل خاں ایک اروند ایک محمد علی ایک نہرو ایک ونوبھا چھپا لگتا تھا، جس کام کے اپنے ہاتھوں پورا ہونے کی امید نہ تھی اس کی تکمیل کی ساری امیدیں ان بچوں سے بندھی ہوئی تھیں۔ بڑا اچھا زمانہ تھا یہ دوستو!"

جامعہ ایک برادری ہے اور ہم سب اپنی شخصیتوں کی تشکیل اور تکمیل کے لیے یہاں آئے ہیں اس مقصد کے حاصل کرنے کے دوران اگر ہم جامعہ کے قیام کے مقصد کو فراموش کر بیٹھے تو یہ سودا ہمارے لیے بہت مہنگا ہوگا۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنے دل میں ایک نیا شوق اور بدن میں ایک نئی جان پیدا کریں تاکہ دشواریاں اور خطرات ہماری ہمت بڑھاتے رہیں اور ہم نظر کو بلندی پر جما کر اپنے آپ کو اسی طرح اوپر پہنچانے کی کوشش کرتے رہیں جس طرح لوگ پہاڑوں کی چوٹیوں کو سر کرنے کے لیے رسی تھام کر آگے بڑھتے جاتے ہیں۔

خط و کتابت کرتے وقت
اپنا پتا صاف اور خوشخط
تحریر فرمائیے

اب سے تقریباً باسٹھ برس پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ جن اعلا مقاصد کے تحت وجود میں آئی تھی۔ الحمدللہ آج کے پریشان کن ماحول میں بھی وہ ان روایات پر بہ حسن وخوبی گامزن ہے۔ طلبہ کی صحیح تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ ان میں دینی کردار کی پختگی اور روایات اسلامیہ کو قائم اور باقی رکھنے کا جذبہ پیدا کرنا اس ادارے کا نصب العین رہا ہے۔

اسی پاکیزہ جذبہ کے تحت سالہائے سابقہ میں بھی اس ادارے میں مذہبی ثقافتی پروگرام منعقد کیے جاتے رہے ہیں۔ اس سال بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول کے زیر اہتمام ۱۹۸۱ء میں ایک تعلیمی ہفتہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یوم تاسیس کے موقع پر منایا گیا۔ جس میں مختلف علوم و فنون پر مشتمل پروگرام طلبہ اور طالبات نے پیش کیے۔ اس تعلیمی میلے کا آغاز ایک مبارک تقریب "جلسہ سیرت النبیؐ" سے ہوا۔ جس کے منعقد کرانے میں ہمارے پرنسپل جناب عبدالحق خاں صاحب اور دیگر اساتذہ کرام نے طلبہ کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا اور ہمت افزائی فرمائی۔ طلبہ اور طالبات نے بھی اس کی ترتیب میں اپنے اسلامی شعور اور اسلامی شوق کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

یہ جلسہ ۲۸ر اکتوبر کو شام ½۶ بجے منعقد ہوا۔

اس جلسہ میں دعوت نامے اسکول کے دفتر کی طرف سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تمام تعلیمی و انتظامی دفاتر میں بھیج دیے گئے تھے۔ انفرادی طور پر اوکھلا گاؤں اور متعلقہ آبادی کے مقامی باشندوں کو بھی اس کی خبر کر دی گئی تھی۔

۲۸ر اکتوبر کو صبح سے ہی اوپن ایر تھیٹر کو روشنی اور فرش و شامیانوں سے مزین کر دیا گیا تھا۔ شام چھ بجے سے کثیر تعداد میں عاشقان رسولؐ خواتین و حضرات، طلبہ و طالبات اوپن ایر تھیٹر میں جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ ٹھیک ساڑھے چھ بجے جلسہ کی کارروائی کے اناؤنسر جناب شکیل احمد (متعلم جماعت بارہویں سائنس) نے جب اعلان کیا کہ دہلی کی دو مقتدر شخصیتیں جلسہ میں شرکت کے لیے تشریف لا چکی ہیں تو حاضرین کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی۔ منتظر نظریں فرش راہ ہوگئیں۔ کچھ ہی دیر بعد شاہی مسجد فتح پوری دہلی کے امام حضرت مولانا مفتی محمد مکرم احمد صاحب اور حضرت مولانا نواب الدین صاحب پرنسپل صاحب کی معیت میں اسٹیج پر تشریف لائے۔ اناؤنسر نے اعلان کیا کہ جلسہ کی صدارت حضرت امام صاحب مسجد فتح پوری فرما رہے ہیں صدر محترم کی اجازت سے جلسہ کی باضابطہ کارروائی کا آغاز مڈل اسکول کے طالب علم عاصم قاسمی صاحب کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ تلاوت کے بعد گیارہویں جماعت کی طالبہ عظمٰی سیدہ نے حمد باری تعالےٰ اپنی دلکش آواز میں پیش کی جس کو حاضرین نے بہت سراہا۔ حمد کے بعد نعت شریف کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے بارہویں جماعت کی طالبہ ثریا پروین نے عربی نعت پڑھی جس نے حاضرین کو بہت محظوظ کیا۔ عائشہ ناہید صاحبہ نے ترنم کے ساتھ فارسی نعت پیش کی جس نے حاضرین پر وجدانی کیفیت طاری کر دی اس کے بعد شگفتہ یاسمین متعلمہ گیارہویں جماعت نے آنحضورؐ کی سیرت پاک پر ایک جامع مضمون پڑھا۔ یہ مضمون اگرچہ مختصر تھا لیکن اس کی جامعیت قابل داد تھی اس کے بعد وحید احمد غزالی متعلم جماعت دہم نے اردو نعت شریف پیش کی۔ غزالی کی دلکش اور پر اثر آواز سے ایک روحانی سماں بندھ گیا۔

نعتوں کے اختتام پر مہمان مقرر مولانا نواب الدین صاحب نے ایک جامع اور پر اثر تقریر سے حاضرین جلسہ کو مستفید فرمایا مولانا نے اپنی نصف گھنٹہ کی تقریر میں سیرت پاک کے مختلف

(دوازدہم د آرٹس) جامعہ ہائر سکنڈری اسکول جامعہ نگر نئی دلی ۲۵

یوم تاسیس سے متعلق تمام پروگرام ختم ہوگئے تو میں نے
اطمینان کی سانس لی کہ چلو اب ایک بوجھ ہٹ گیا اور میں
مسرورانہ انداز میں غالب کا یہ مصرع گنگنانے لگا ع

ہوچکیں غالب بلائیں سب تمام

لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ ابھی ع

ایک مرگ ناگہانی اور ہے

کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا۔ خیال تھا کہ بہت تفریح کر لی اب
تعلیم کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت
ایک رات کو کیمسٹری کی کتاب لے کر بیٹھا ہی تھا کہ قائم رضوی
ملک الموت کی طرح مجھ پر نازل ہو گئے۔ ارشاد ہوا کہ چلیے خالد بھائی
نے یاد فرمایا ہے۔ میں ایک دم گھبرا گیا کہ یا الٰہی خیر! اب کیا ہونے
والا ہے؟ موصوف جب بھی بلاتے ہیں کوئی نہ کوئی ادبی پروگرام
لگا دیتے ہیں۔ بہر حال رضوی صاحب کے ہمراہ [illegible] منزل کی
طرف روانہ ہوا۔ خالد صاحب کے در دولت پر پہنچ کر اندر آنے کی
اجازت چاہی۔ وہ تو گویا چاہنے سے پہلے ہی مل چکی تھی۔

"آؤ بھئی مدیح الرحمٰن! تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

"فرمائیے میرے لائق کیا خدمت ہے؟" میں نے ہونٹوں
پر مسکراہٹ لاتے ہوئے پوچھا۔

"بھئی وہ ایسا ہے کہ پیام تعلیم کا ایک نمبر ہمیں مل رہا
ہے۔ اس کے لیے رپورٹ قائم رضوی تیار کر رہے ہیں۔ میں
چاہتا ہوں کہ چند رپورتاژ بھی ہو جائیں۔ میرا خیال ہے
کہ تم یہ کام بخوبی کر سکتے ہو، اس لیے ایسا کرو کہ اردو مباحثے
سے متعلق ایک رپورتاژ لکھ ڈالو۔" لیجیے۔ اتنا سننا تھا کہ میری
روح فنا ہو گئی۔ نظر کے سامنے کیمسٹری کی کتابیں چاروں طرف رقص
کرتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ دل ہی دل میں پیام تعلیم کو دو چار
صلواتیں سنائیں، مگر سوائے ہار ماننے کے کوئی گنجائش نہ تھی چنانچہ حامی
بھر لی۔ ویسے اگر سچ پوچھیے تو لاشعوری طور پر اس پروگرام سے متعلق
کچھ لکھنے کی خواہش میرے ذہن میں پل رہی تھی اب جو خالد
صاحب نے رپورتاژ لکھنے کی بات کہی تو بقول غالب ع

میں نے جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

بندہ کا حال یہ ہے کہ رپورتاژ کی الف بے سے بھی واقف نہیں۔ ایک
دو رپورتاژ قرۃ العین حیدر کا پڑھا ہے اور بس اللہ اللہ
خیر صلا۔ مگر بہر حال لکھنا تو تھا ہی، چنانچہ لکھا۔ اگر پسند آجائے
تو شکریہ اور اگر پسند نہ آئے تو مکرر شکریہ۔

آج ۱۳ اکتوبر ہے۔ میں کل گھر سے بقر عید کی تعطیلات کے
بعد واپس لوٹا ہوں۔ غالباً تیسرا یا چوتھا پہر ہے۔ چمکیلی دھوپ
چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ سامنے سے خالد صاحب اپنے
مخصوص انداز میں چلے آ رہے ہیں۔

"السلام علیکم" میں لپک کر سلام کرتا ہوں۔

"ارے بھئی مدیح الرحمٰن تم گھر سے کب واپس آ گئے؟"

"جی کل واپس ہوا۔"

"بھئی اس سال جامعہ کی پرانی روایت کو پھر سے زندہ
کیا جا رہا ہے۔ یوم تاسیس کے موقع پر تعلیمی ہفتہ منانے کا پروگرام
بنایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک ہفتے تک مختلف قسم کے پروگرام
ہوں گے جن میں دہلی کے تمام اسکولوں کے طالب علموں کے بعض مقابلے

مقیم طالب علم یازدہم (سائنس)، جامعہ ہائر سکنڈری اسکول، نئی دہلی ۲۵

تو آل انڈیا بھی ہیں تم یہ بتاؤ ڈبیٹ وغیرہ میں دلچسپی رکھتے ہو؟"

"جی ہاں — کیوں نہیں۔ ڈبیٹ میں تو بہت دلچسپی ہے کئی دفعہ مقابلوں میں حصہ بھی لے چکا ہوں۔"

"اچھا تو ایسا کرو کہ 'جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی' اس موضوع کی مخالفت میں ایک چھوٹی سی تقریر لکھ لو۔ میں نے کچھ اور لڑکوں سے بھی کہہ دیا ہے۔ قائم رضوی اور رضا حیدر اس کی موافقت میں لکھ رہے ہیں۔ لیکن وقت کم رہ گیا ہے، اس لیے یہ کام جلد ہونا چاہیے۔"

میں نے وعدہ کر لیا ہے کہ چند دن بعد لکھ کر دکھا دوں گا۔ لیکن دل میں سوچ رہا ہوں کہ کیسے لکھوں گا۔ نہ سیاست کا مطالعہ کیا ہے اور نہ ہی دین سے متعلق پوری معلومات ہے۔ بہر حال اس خیال سے کچھ ڈھارس بندھی ہوئی ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس سلسلے میں مدد کر سکیں گے۔ سوچ رہا ہوں کہ کل ضیاء صاحب کے پاس جاؤں گا وہ یقیناً اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ معلومات بہم پہنچائیں گے۔

۹؍ اکتوبر — آج بدھ ہے۔ اس وقت شام کے چار بجے ہیں۔ میں قائم رضوی کے ساتھ ضیاء صاحب کے مکان کی جانب چل رہا ہوں۔ سورج مغرب میں جھکتا جا رہا ہے اس کی سنہری کرنیں اونچے اونچے درختوں کی چوٹیوں پر پڑ کر انھیں پگھلے ہوئے سونے سے نہلا رہی ہیں۔ نہایت دلکش منظر ہے میں نہ جانے کس فضا میں پرواز کرنے لگا تھا کہ قائم رضوی کا ٹہوکا مجھے پھر اسی عالم رنگ و بو میں کھینچ لایا ہے— "اجی قبلہ ذرا تیز قدم چلیے تاخیر ہو رہی ہے۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہے ہیں۔ میں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر تیز تیز چلنے لگا ہوں۔ ایک بس تیز رفتاری سے دھول اڑاتی ہوئی سامنے سے چلی آ رہی ہے۔

"ٹرررن۔" میں ضیاء صاحب کے گھر پہنچ کر کال بیل کا بٹن دبا رہا ہوں۔ قدموں کی چاپ ... دروازہ خود ضیاء صاحب ہی نے کھولا ہے۔ "ارے بھئی صہیب تم — آؤ۔" ضیاء صاحب جامعہ ملیہ میں شعبۂ اسلامیات میں پروفیسر ہیں۔ اپنے مضمون پر قدرت حاصل ہے۔ ملک کے مشہور علما [illegible] شمار ہوتا ہے

میرے والد سے ان کی بڑی دوستی ہے اسی لیے میں انھیں چچا کہتا ہوں "کہو بھئی کیسے آنا ہوا؟" ضیاء صاحب نے مجھے اور قائم رضوی کو اپنے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا ہے۔

"جی۔ وہ۔ ہمارے اسکول میں ایک تقریری مقابلہ ہونے والا ہے۔ عنوان ہے 'جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی' مجھ سے اس موضوع کی مخالفت میں لکھنے کو کہا گیا ہے اگر آپ اس سلسلے میں کچھ مدد کر سکیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

"ہوں —" ضیاء صاحب پر فکر انداز میں اپنی انگلیوں میں دبی ہوئی سگریٹ پر نظریں گاڑے ہوئے ہیں۔ "بھئی اس موضوع کی مخالفت بڑی مشکل ہے۔ کیوں کہ معاملہ دین کا ہے۔ اس لیے کہیں مولوی صاحبان خفا نہ ہو جائیں ——"

ضیاء صاحب نے بڑی پرمذاق طبیعت پائی ہے۔ اپنی ہی بات پر بڑے بلند بانگ قہقہے لگاتے ہیں۔ اس وقت بھی ایک زوردار قہقہے پر ان کا جملہ ختم ہوا ہے۔

"لیکن میں اور تمھارے والد دونوں ہی اس کی مخالفت کریں گے —" تھوڑی دیر تک ہنستے رہنے کے بعد انھوں نے بات پھر شروع کی ہے "اول تو یہ خیال فرسودہ ہو چکا ہے۔ یہ خیال دراصل عہد وسطیٰ کا ہے۔ اقبال نے بھی جس وقت یہ بات کہی تھی اس وقت ہندستان کے سیاسی حالات کچھ اور تھے"

میں بڑے غور سے ضیاء صاحب کی باتیں سن رہا ہوں۔

باتوں میں وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ اس وقت ساڑھے پانچ بجے ہیں۔ میں قائم رضوی کے ہمراہ ہوسٹل کو لوٹ رہا ہوں سورج میں سرخی آ چکی ہے۔ اس کی کرنیں مسجد کے اونچے اونچے میناروں پر پڑ رہی ہیں، جس کی وجہ سے ان میں ایک عجیب تقدس سا پیدا ہو گیا ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ کل عتیق صدیقی صاحب کے پاس بھی جاؤں گا۔ وہ بھی یقیناً اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ مدد ضرور کریں گے۔

جمعرات — ۱۰؍ اکتوبر۔ میں بٹلہ ہاؤس میں عتیق صدیقی صاحب کے گھر کی جانب بڑھ رہا ہوں۔ شام ہو چکی ہے — بٹلہ ہاؤس کی تنگ گلیوں میں اندھیرا ہونے لگا ہے۔ جس گلی میں عتیق صاحب کا گھر ہے، اس کے نکڑ پر آدم و حوا پبلک اسکول کا اشتہار لگا

ہوا ہے۔ میں آج تک اس اسکول کے نام کی وجہ تسمیہ نہ سمجھ سکا۔
اور ہاں، ایک بورڈ اس اشتہار کے نیچے اور بھی ہے "نیلی ہوسٹل
کے نام کا۔ شام کا دھندلکا گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ میں عتیق صدیقی
صاحب کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔

"کون صاحب ہیں؟" یہ سوال کرنے والی آواز بڑی دبنگ
ہے۔ یقیناً عتیق صدیقی صاحب ہوں گے۔ دروازہ کھلا۔ سامنے
عتیق صاحب کھڑے ہیں۔ مائل بہ مٹاپا جسم، تھوڑی موٹی
ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ جن سے علم و دانش کی روشنی
پھوٹتی ہے، موٹے موٹے ہونٹ جن سے نہایت شیریں کلمات
نکلتے ہیں۔ یہ ہیں عتیق صدیقی صاحب۔ کئی کتابوں کے
مصنف سوانح اور تحقیق آپ کے خاص میدان ہیں۔

"او ہو۔ تم ہو۔ بھئی تم بڑے بے وقوف لڑکے ہو۔
کبھی آکے جھانکتے ہی نہیں۔ تم سے کتنا کہا کہ ہفتے میں کم سے
کم ایک مرتبہ ضرور آیا کرو۔" میرے سلام کے جواب میں
عتیق صاحب نہایت محبت بھرے انداز میں ڈانٹ رہے ہیں۔

"دیکھیے اب حاضر ہو تو گیا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ
ہے۔"

"تمہارے باپ کا کوئی خط آیا؟"

"جی ہاں۔ تین چار دن ہوئے تب ایک خط
آیا تھا۔"

"کیا حال ہے؟"

"خدا کا شکر ہے ٹھیک ہیں۔"

خسرو، عتیق صاحب کے سب سے چھوٹے صاحبزادے
چائے رکھ گئے ہیں۔ میں چائے پیتے ہوئے سوچ رہا ہوں کہ مطلب
کی بات کس طرح شروع کروں۔ عتیق صاحب سوچیں گے کہ
آیا بھی تو مطلب سے۔ میرے آنے سے پہلے عتیق صاحب شاید
کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ اب چوکی پر ڈھیر کی شکل میں پڑی ہوئی
کتابیں الٹ پلٹ رہے ہیں۔ میری چائے ختم ہوتی جا
رہی ہے۔ انھوں نے اس چیز کے ملنے سے مایوس ہو کر جھنجھلا
کے پائپ سلگا لیا ہے اور ہلکے ہلکے کش لگاتے ہوئے کچھ سوچ
رہے ہیں۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ وہ میری طرف متوجہ
ہو گئے ہیں۔

"ہمارے اسکول میں ایک تقریری مقابلہ ہونے والا ہے میں
اسی سلسلے میں آپ کے پاس آیا تھا۔" میں جھجکتے ہوئے کہہ رہا ہوں۔

"اوہ۔ تو یہ بات تھی۔" عتیق صاحب مسکرا رہے ہیں۔ "موضوع
کیا ہے؟"

"جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی" مجھے اس
کی مخالفت کرنی ہے۔"

"بھئی اس کے لیے تو تمہیں کچھ دن پہلے آنا چاہیے تھا۔ کل
میں پندرہ بیس دن کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ تم ایسا کرو "خطبات
آزاد" دیکھو۔" ان کی نظریں پر خیال انداز میں چھت پر ٹکی ہوئی
ہیں" اور اس میں بھی رام گڑھ کا خطبہ خاص طور پر دیکھ لینا۔

"جی بہت بہتر۔"

"جا رہے ہو؟" مجھے اٹھتا دیکھ کر عتیق صاحب کہہ رہے ہیں

"جی ہاں چلوں۔ وقت کافی ہو گیا۔" میں عتیق صاحب کے
گھر سے باہر آگیا ہوں۔ گلی میں کچھ بچے شور مچاتے ہوئے ایک
دوسرے کے پیچھے بھاگتے پھر رہے ہیں۔ ایک کتا مرے مرے قدم
رکھتا ہوا میرے آگے آگے جا رہا ہے۔ میں شرارتاً زور سے کھونک
دیا۔ کتا دم دبا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

اس وقت شام کے ساڑھے سات بجے ہیں۔ میں ابھی ابھی
عتیق صاحب کے گھر سے واپس لوٹا ہوں اور اس وقت مڈل
اسکول کی لائبریری میں بیٹھا خطبات آزاد کی ورق گردانی کر
رہا ہوں۔ کچھ باتیں ضیاء صاحب نے بتائی تھیں اور کچھ خطبات
آزاد میں مل گئیں۔ موضوع سے متعلق اچھا خاصہ مواد مل چکا ہے
اتنا بھروسا تو مجھے ہے کہ اب بغیر کسی دشواری کے لکھ لوں گا۔

آج اور کل کے چکر میں دو دن گزر چکے ہیں۔ آج ۷ اکتوبر
ہے۔ ابھی تک میں نے لکھنا شروع نہیں کیا ہے۔ آج صبح خالد
محمود صاحب نے کل تک لکھ کر دکھا دینے کا الٹی میٹم دے دیا
اس وقت رات کے ساڑھے آٹھ بج چکے ہیں۔ میں ہاتھ میں
قلم لیے بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ کس طرح لکھنا شروع کروں۔ اب
تک کئی کئی مرتبہ تین تین، چار چار سطریں لکھ کر کاٹ چکا
ہوں، لکھنا جتنا آسان سوچا تھا اتنا ہی مشکل ثابت ہو رہا ہے۔

لیکن آخر کار گتھی کا سرا ہاتھ آ ہی گیا۔ میرا قلم کاغذ پر دوڑنے لگا ہے اور میں لکھ رہا ہوں "وہ ایک عظیم شاعر کا خوب صورت مصرع ہے، لیکن اس مصرع میں لفظ دین کے استعمال نے اس کی معنویت بہت مشکل بنا دی ہے ....." اب ایک ڈیڑھ گھنٹے میں مضمون مکمل ہو جائے گا۔

اور ایسا ہی ہوا بھی۔ میں نے ساڑھے آٹھ بجے لکھنا شروع کیا تھا اس وقت میری گھڑی دس بجا رہی ہے اور میں آخری سطریں لکھ رہا ہوں۔

اسکول کی گھنٹی بج چکی ہے۔ میری آنکھ ابھی ابھی کھلی ہے۔ رات میں مضمون پر نظر ثانی کر کے سو گیا تھا۔ اس وقت ترانا ختم ہو چکا ہے۔ طلبہ کلاسوں میں جا چکے ہیں۔ میں تیز تیز قدموں سے فزکس لیب کی طرف جا رہا ہوں۔ آفس کے سامنے خالد صاحب کھڑے مجھے اشارے سے بلا رہے ہیں۔

"بھئی وہ مضمون مکمل کر لیا؟"

"جی ہاں۔ دکھاؤں؟"

"نہیں اس وقت لو رہنے دو۔ رات کو تمثیلی مشاعرے کی ریہرسل کے بعد رضا حیدر اور قائم رضوی کو لے کر میرے گھر پر آ جانا۔ اسی وقت سن لوں گا۔ ان دونوں نے بھی غالباً لکھ لیے ہوں گے۔"

"جی بہت بہتر"

اب رات کے ½9 بج چکے ہیں۔ تمثیلی مشاعرے کی ریہرسل بھی ابھی ختم ہوئی ہے۔ میں قائم رضوی اور رضا حیدر کے ساتھ خالد محمود صاحب کے در دولت کے سامنے کھڑا ان کے نکلنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ دستک دے چکا ہوں۔

"آ گئے آپ لوگ۔ چلیے سامنے کمرے میں چل کر بیٹھیے۔ میں آتا ہوں۔" خالد صاحب ہم لوگوں کو کھڑا دیکھ کر کہہ رہے ہیں۔

"جناب صدر اور معزز حاضرین جلسہ..... وغیرہ وغیرہ۔

قائم رضوی اور رضا حیدر اپنی تقاریر سنا چکے، اب میں دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی تقریر سنا رہا ہوں۔ قائم رضوی سے خالد صاحب دوبارہ لکھنے کو کہا ہے کیوں کہ انھوں نے اپنی عادت کے مطابق اردو الفاظ کو فارسی اور عربی الفاظ کے ساتھ کہیں کہیں استعمال کیا ہے۔ رضا حیدر کی شاید مضمون پر گرفت بہت اچھی تھی، اس لیے وہ بجائے چار کے آٹھ منٹ کی تقریر لکھ لائے۔ ان کو حکم ہوا ہے کہ کل اس کو ساڑھے تین منٹ کی کر کے لائیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ دیکھیے اب میری تقریر کی کیا درگت بنتی ہے۔ میں تقریر کر چکا ہوں۔ خالد محمود صاحب آنکھیں بند کیے کچھ سوچ رہے ہیں۔

"ہوں۔۔ اچھا لکھا ہے۔" وہ آنکھیں موندے ہوئے کہہ رہے ہیں۔ "وقت بھی کم لگا۔" میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ چلو محنت بار آور ہوئی۔

"اچھا اب یہ بتائیے کہ یاد کب تک ہو جائے گی؟"

"کل شام تک یاد کر کے سنا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے ــــ اور رضا صاحب آپ کب تک یاد کر لیں گے؟"

"جی ـــ میں ـــ پرسوں صبح تک یاد کر لوں گا۔" رضا کچھ سوچتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔

"اچھا تو پھر پرسوں پہلے پیریڈ میں آپ دونوں حضرات اردو روم میں آ جائیں گے۔ دو لڑکوں نے اور بھی تیاری کر لی ہے ـــ میں ان سے بھی کہہ دوں گا۔ جو بھی وقت پر نہیں آئے گا وہ خارج!"

"جی بہت اچھا۔"

آج ۲۰ر تاریخ ہے۔ صبح کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ میں اور رضا حیدر اردو روم میں بیٹھے خالد صاحب کا انتظار کر رہے ہیں۔ دوسرے دونوں لڑکے بھی آ چکے ہیں۔ مجھے اپنی تقریر یاد ہے شاید رضا حیدر بھی یاد کر چکے ہیں لیکن ہمارے علاوہ جو دو لڑکے ہیں انھیں ابھی پوری طرح اپنی تقاریر یاد نہیں ہیں۔ اس وقت بھی وہ دونوں بیٹھے یاد ہی کر رہے ہیں۔

خالد صاحب کے ساتھ تشکیل اللہ خاں صاحب بھی تشریف لائے ہیں تقاریر سنی گئیں، فیصلہ میرے اور رضا حیدر کے حق میں ہوا۔ لیکن تقاریر وہ دونوں بھی کریں گے مگر مقابلے میں حصہ نہیں لیں گے۔

"بھئی ایسا کرو کہ تم دونوں جاوید حبیب صاحب سے ملو۔ وہ

ذاکر نگر میں رہتے ہیں۔ اچھے مقرروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔"
خالد محمود صاحب اردو روم سے نکلتے ہوئے مجھ سے اور رضا حیدر سے کہہ رہے ہیں۔

۲۱ / اکتوبر، صبح کے دس بجے کا وقت ہے۔ سورج مشرق میں کافی بلند ہو چکا ہے۔ چمکیلی دھوپ چاروں طرف پھیل چکی ہے۔ میں اور رضا حیدر جاوید صاحب کے گھر کی جانب جا رہے ہیں۔ کل شام رضا حیدر نے ان کے گھر جا کر آج دس گیارہ بجے کا وقت لے لیا تھا۔

"اندر آ جائیے۔" کال بیل کے جواب میں کوئی صاحب اندر سے زور سے کہہ رہے ہیں۔

کمرے میں ایک میز کے سامنے جاوید حبیب صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ یہ جوان العمر آدمی ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹس یونین کے صدر رہ چکے ہیں۔ تقریر کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ آج کل ایک اخبار "ہجوم" نکالتے ہیں۔ آنکھوں سے ذہانت جھلکتی ہے۔ فراخ پیشانی بھی ان کے ذہین ہونے کی گواہی دے رہی ہے۔ ہم دونوں کو اندر آتا دیکھ کر جاوید صاحب نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے اور سامنے پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔

"موضوع کی مخالفت آپ کر رہے ہیں؟" وہ مجھ سے مخاطب ہیں۔

"جی ہاں!"

"میں لکھ کر تقریر کرنے کے خلاف ہوں۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جاوید صاحب کہہ رہے ہیں۔ "اس طرح ممکن ہے آپ انعام تو حاصل کر لیں لیکن آئندہ کے لیے یہ چیز نقصان دہ ثابت ہوگی۔ آپ دونوں میرے ساتھ اس موضوع پر تبادلۂ خیال کیجیے۔ اس طرح یہ موضوع آپ کے ذہن میں صاف ہو جائے گا اس کے بعد آپ سے ٹیپ ریکارڈر کے سامنے تقاریر کروائی جایا کریں گی۔ پھر آپ وہ ٹیپ سنیں گے اور خود فیصلہ کریں گے کہ آپ کہاں غلط بولے۔"

صبح کے سات بجے ہیں۔ میں غسل خانے میں صابن لگائے کھڑا پانی آنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ آج خالد صاحب کے ساتھ ظہور صاحب کے پاس جانا ہے۔ کل جاوید حبیب صاحب کے گھر سے لوٹ کر جب میں نے تمام گفتگو خالد صاحب کو بتائی تھی تو انھوں نے کہا تھا کہ جاوید صاحب کی بات تو بالکل صحیح ہے مگر بہت دیر طلب ہے اور ہمارے پاس اب وقت رہا نہیں ہے۔ اس لیے جاوید صاحب سے اب کسی اور موقع پر مدد لیں گے۔ کل صبح تم لوگ میرے ساتھ ظہور صاحب کے یہاں چلو۔ وہ پہلے بھی ڈبیٹ وغیرہ کے سلسلے میں مدد کر چکے ہیں، وہ باہر گئے ہوئے تھے مگر اب واپس آ گئے ہیں۔

اس وقت غسل خانے میں کھڑا میں ڈر رہا ہوں کہ دیر ہو گئی تو خالد صاحب ناراض ہوں گے۔

"مدیح الرحمٰن" یہ رضا حیدر کی آواز تھی وہ شاید مجھے بلانے آیا ہوگا۔

"رضا یہاں غسل خانے میں" زور سے چلّانے کی وجہ سے میرے گلے میں خراش پڑ گئی۔

"بھئی جلدی کرو خالد صاحب ناراض ہو رہے ہیں۔" وہ غسل خانے کے دروازے پر کھڑا کہہ رہا ہے۔

"ارے یار جلدی کہاں سے کر دوں۔ جسم پر صابن لگا ہے اور پانی غائب ہے۔ تم ایسا کرو ڈائننگ ہال سے بالٹی لے کر ذرا جلدی سے ایک بالٹی پانی لا دو۔" رضا حیدر کے لوٹنے کا انتظار کرتا ہوا میں اندر کھڑا کپکپا رہا ہوں۔ اتنی سردی تو آ ہی چکی ہے کہ ننگے آدمی کے جسم میں، اور وہ بھی ایسے میں جب کہ وہ بھیگا ہوا ہو، کپکپی پیدا کر دے۔

"یہ لو پانی" رضا حیدر کی آواز نے میرے جسم میں جان ڈال دی۔ جلدی جلدی جسم سے صابن صاف کر کے اور کپڑے پہن کر میں نیچے خالد صاحب کے پاس پہنچا۔ شاید رضا حیدر نے انھیں میری پریشانی بتا دی ہے، کیوں کہ وہ غصے میں نہیں ہیں۔

ہم لوگ ظہور صاحب کے گھر کی طرف چل دیے۔ ان کا مکان نور نگر میں ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی عام سی بستی ہے۔ تنگ گلیاں، جن میں سورج بلند ہو جانے پر بھی ابھی دھوپ نہیں آ پائی ہے۔ ہر گھر کے سامنے غلاظت کا ایک ڈھیر ہے جس پر مرغیاں

ادھر ادھر بچے مارتی ہوئی ناشتہ کرنے میں مصروف ہیں۔ ننگ دھڑنگ بچے ان گلیوں میں رینگتے پھر رہے ہیں۔

خالد صاحب ظہور رضا صاحب کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں۔

"کون؟" اندر سے کوئی مردانہ آواز میں پوچھ رہا ہے۔

"خالد"!

"اچھا خالد صاحب۔ آئیے" دروازہ کھل گیا، سامنے چھوٹے سے قد کے کوئی صاحب کھڑے ہیں جنھوں نے تہبند باندھ رکھا ہے اور اوپری جسم پر چادر لپیٹے ہوئے ہیں۔ غالباً یہی ظہور رضا صاحب ہیں۔ ہم پانچوں لوگ اندر داخل ہوئے۔ میرے، رضا حیدر کے اور قائم رضوی کے علاوہ خالد صاحب کے ساتھ غزالی بھی آئے ہیں۔ یہ غزل سرائی میں حصہ لے رہے ہیں۔ خالد صاحب نے ظہور رضا صاحب سے ہمارا تعارف کرایا۔ ظہور رضا صاحب میری اور قائم رضوی کی لکھی ہوئی تقاریر سننے اور مفید مشورے دینے کے بعد اب غزالی کو ایک غزل کی طرز سکھا رہے ہیں۔ خدا نے ان کو سریلا گلا عطا کیا ہے۔

تقریباً نو بج چکے ہیں۔ ہم لوگ واپس اسکول جا رہے ہیں غزالی کو طرز سکھانے کے بعد ظہور رضا صاحب نے مجھے اور قائم رضوی کو موضوع بحث کے بارے میں چند باتیں بتائی تھیں۔ اب طے یہ ہوا ہے کہ ہم دونوں ان کی بتائی ہوئی باتوں کو بھی اپنی تقاریر میں شامل کر کے کل ان سے تصحیح کرا لیں۔

آج ۲۴ تاریخ ہے۔ میں، رضا اور قائم رضوی آفس کے سامنے لان میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ صبح کے ۹، ساڑھے نو بجے ہیں۔ ہری ہری گھاس پر اوس کی بوندیں اس شعر کی تشریح کر رہی ہیں ؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

کل ظہور رضا صاحب نے ہماری تقاریر تصحیح کر کے واپس کر دی تھیں۔ طے یہ ہوا کہ میرے مقابل موضوع کی موافقت میں رضا حیدر تقریر کریں گے اور قائم رضوی اس تقریری مقابلے کی نظامت کریں گے۔ اس کام میں نگار زیدی ان کی مدد کریں گی۔ نگار کے علاوہ ہم لوگوں کے ساتھ دو لڑکیاں اور بھی ہیں۔ یہ ہیں عطرت سرمدی اور عظمیٰ سیدہ۔ یہ دونوں مقابلۂ غزل سرائی کو کنڈکٹ کر رہی ہیں۔ ان لوگوں کو بھی خالد صاحب نے ریہرسل کے لیے بلایا ہے۔

مجھ سے اور رضا حیدر سے تقاریر سننے کے بعد خالد صاحب نے ہم دونوں کو الگ الگ کھڑے ہو کر ریہرسل کرنے کو کہا ہے چنانچہ میں اور رضا حیدر تھوڑے فاصلے پر کھڑے خیالی سامعین کو مخاطب کر کے بار بار اپنی تقریریں دہرا رہے ہیں۔

یکم نومبر۔ آج اردو ڈبیٹ ہے۔ صبح کے ساڑھے سات بج چکے ہیں۔ محترم عبدالحق صاحب اور خالد صاحب اپنی نگرانی میں کامن روم کی سجاوٹ کرا رہے ہیں۔ لڑکے گملے اٹھا اٹھا کر لا رہے ہیں اور ان کی بنائی ہوئی جگہوں پر رکھ رہے ہیں۔ سامنے اسٹیج بنا ہوا ہے، جس پر تین کرسیاں اور ایک میز رکھی ہے، میز پر ایک گلدان میں خوب صورت سا گل دستہ لگا ہوا ہے۔ اسٹیج کے سامنے نیم دائرے کی شکل میں کرسیاں ترتیب سے لگائی گئی ہیں۔ مقابلہ شروع ہونے میں ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے۔ میں تمام کاموں سے فارغ ہو کر خالد صاحب سے ناشتہ کرنے کے لیے جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔ خالد صاحب نے جلدی آنے کا کہہ کر جانے کی اجازت دے دی ہے۔

کامن روم میں دھیرے دھیرے سامعین جمع ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ میں ابھی ابھی ناشتہ کر کے واپس لوٹا ہوں۔ سامنے قائم رضوی کھڑے ہیں۔ انھیں دیکھ کر میں بڑی مشکل سے اپنا قہقہہ ضبط کر سکا۔ بڑے پائچوں کے پاجامے پر زرد رنگ کی شیروانی اور ٹوپی میں وہ عجیب مضحکہ خیز لگ رہے ہیں۔

"اجی حضرت یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟" میں اپنے لہجے میں مصنوعی تشویش پیدا کرتے ہوئے پوچھ رہا ہوں۔

"اجی بس کیا عرض کروں" وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اپنے جانے پہچانے انداز میں کہہ رہے ہیں۔ "پرنسپل صاحب نے مجھے کرتا پاجامہ پہنے دیکھ کر شیروانی اور ٹوپی پہننے کا حکم صادر فرمایا۔ چنانچہ نتیجہ آپ کے سامنے ہے"

مقابلے میں حصہ لینے والی تقریباً تمام ٹیمیں آ چکی ہیں

جناب خشونت سنگھ صاحب، جو ہندستان کے مشہور لکھنے والوں میں سے ہیں، بحیثیت مہمان خصوصی اسٹیج پر رونق افروز ہیں۔ جناب ضیاءالحسن فاروقی صاحب ان کے بائیں جانب رونق افروز ہیں۔ دائیں ہاتھ پر قائم رضوی بیٹھے ہیں۔ مقابلے میں حصہ لینے والے طلبہ اسٹیج کے دائیں بائیں اس طرح بیٹھتے ہیں کہ وہ طلبہ جو موضوع کی موافقت کر رہے ہیں، اسٹیج کے دائیں طرف اور مخالفت کرنے والے طلبہ بائیں طرف بیٹھے ہیں۔ خلاف امید سامعین بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ کامن روم میں رکھی کرسیاں کم پڑ جانے کی وجہ سے بہت سے لوگ دیواروں سے لگے بھی کھڑے ہیں۔ سامنے کرسیوں پر کالج کی کئی مقتدر ہستیاں بیٹھی ہیں۔ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے قائم رضوی نے مہمان خصوصی اور سامعین کو خوش آمدید کہا اور مہمان خصوصی جناب خوشونت سنگھ جی کو متعارف کرایا۔ ان کی تقریر بہت پسند کی گئی۔ اور اب مقابلہ شروع ہو چکا ہے۔ طلبہ یکے بعد دیگرے تقاریر کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے جامعہ کی ٹیم نے تقریریں کیں۔ ہماری تقاریر بہت پسند کی گئیں۔ اپنی پسند کا اظہار سامعین نے بیچ بیچ میں تالیاں بجا کر کیا۔

اور اب جو صاحب تقریر کرنے آ رہے ہیں، ان کا حلیہ کچھ عجیب سا ہے۔ شرٹ کے اوپر کے دو تین بٹن کھول رکھے ہیں گلے میں ایک رنگین رومال بندھا ہوا ہے۔ یہ موضوع کی مخالفت فرمائیں گے۔ ان کو دیکھ کر تو ایسا لگ رہا ہے کہ یہ اپنی بات منوانے کے لیے بجائے زبان کے ہاتھ پیر استعمال کریں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ان حضرت نے نہایت اطمینان سے تقریر کی۔۔ لیکن نہ جانے کیوں میں یہ نہ سمجھ سکا کہ ان کی تقریر موضوع کی مخالفت میں تھی یا موافقت میں۔ یہ شاید میری کم علمی کی وجہ ہے۔ مگر نہیں۔ باقی سامعین کا بھی یہی حال ہے۔ ہال میں چہ می گوئیاں ہو رہی ہیں۔ میں ڈر رہا ہوں کہ کہیں حسب عادت قائم رضوی کوئی چبھتا ہوا جملہ نہ کہہ بیٹھیں۔ ورنہ خالد صاحب کو پھر ان کی اصلاح کرنی پڑے گی قائم رضوی اگلے مقرر کو دعوتِ تقریر دینے ڈائس پر آئے۔ خدا نے ان کی مشکل آسان کر دی۔ جناب انوار علی خاں سوز صاحب جو جج ہیں، خود ہی ان کو اشارہ کر رہے ہیں کہ ابھی جن صاحب نے تقریر کی تھی، ان سے پوچھیں کہ ان کی تقریر موضوع کی مخالفت میں تھی یا موافقت میں۔ قائم رضوی اپنے مخصوص انداز میں پوچھ رہے ہیں ـــ "حضرت آپ نے موضوع کی مخالفت فرمائی یا موافقت؟"

اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ بہر حال یہ بات طے ہو گئی کہ ان حضرت کی تقریر مخالفت نہیں ہی تھی۔ اور اب جو صاحب تقریر فرما رہے ہیں، ان کے انداز سے لگ رہا ہے کہ وہ بجائے تقریر کے کوئی انگریزی ڈانس کر رہے ہیں۔ کبھی ان کا ایک ہاتھ ہوا میں لہراتا ہے تو کبھی دوسرا، کبھی اسٹینڈ پر گھونسہ جماتے ہیں تو کبھی اسے دونوں ہاتھوں سے جکڑ لیتے ہیں اور جب وہ چنگیزی کا ذکر کرتے ہیں تو اس انداز میں اپنے گلے پر ہاتھ پھیرتے ہیں جیسے چاقو چلا رہے ہوں۔

اب فتح پوری سے آئے ہوئے ایک مولانا قسم کے صاحب موضوع کی موافقت میں تقریر فرما رہے ہیں۔ وہاں سے صرف یہی حضرت آئے ہیں مخالفت کرنے والا کوئی نہیں آیا۔ اس لیے ان کا ساتھ جامعہ کے عادل ضمیر دیں گے۔ فتح پوری سے آنے والے طالب علم نے بہت اچھی تقریر کی۔ اب مقابلہ ختم ہو چکا ہے۔ اس وقت مہمان خصوصی جناب خشونت صاحب تقریر فرما رہے ہیں۔ قائم رضوی نے ان کا تعارف کراتے وقت کہا تھا کہ وہ اقبال کے بڑے مداح ہیں اور اقبال کو پنجاب کا پیغمبر کہتے ہیں۔ اپنی تقریر میں اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے وہ کہہ رہے ہیں ـــ "میں اقبال کو نہ صرف پنجاب، بلکہ پورے ہندستان کا پیغمبر سمجھتا ہوں"۔

اپنی تقریر میں خشونت سنگھ جی نے جامعہ اور اردو سے اپنے تعلق کا اظہار کیا۔ وہ اردو کے مشہور بچوں کے ادیب شفیع الدین نیر مرحوم کے شاگرد رہے ہیں۔ وہ تقریر کر کے واپس اپنی جگہ تشریف لے جا رہے ہیں اور قائم رضوی محترم ضیاء صاحب سے اپنے خیالات اور تاثرات کا اظہار کرنے کی درخواست کر رہے ہیں۔ ضیاء صاحب تقریر کرنے تشریف لا ـــ چکے وہ موضوع بحث کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرما رہے

ہیں۔ ان کا خیال موضوع کے حق میں ہے۔

اور اب وہ وقت آچکا ہے جس کا تمام سامعین اور مقابلے میں حصہ لینے والوں کو انتظار تھا۔ اب خالد صاحب نتیجہ سنانے تشریف لا رہے ہیں۔ جامعہ کی ٹیم نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے ہیں لیکن میزبان ٹیم ہونے کی وجہ سے ٹرافی دوسرے نمبر پر آنے والی فیض عام انٹر کالج میرٹھ کی ٹیم کو دی گئی ہے۔ پہلا انعام فیض عام انٹر کالج کے جناب آصف علی صاحب کو، دوسرا انعام رضا حیدر کو اور تیسرا انعام مجھے ملا ہے۔ مجھے اس نتیجے سے کچھ مایوسی ہوئی ہے۔ کیوں کہ مجھے پوری امید تھی کہ اگر پہلے کا نہیں تو دوسرے انعام کا حق دار تو میں ضرور رہی ہوں گا۔ خیر جو مل گیا سو غنیمت ہے سامعین انعام حاصل کرنے والوں کو مبارک باد دے رہے ہیں خالد صاحب چائے کے لیے تمام ٹیموں کو آرٹس روم لے چلنے کو کہہ رہے ہیں، چائے کا انتظام کرمانی صاحب کے سپرد تھا جو اس قسم کے کاموں کے لیے موزوں ترین شخصیت ہیں۔

چائے ختم ہوئی، تمام ٹیمیں جا چکی ہیں۔ میں ہلکے ہلکے قدم رکھتا ڈرامے کی ریہرسل کے لیے اوپن ایر تھیٹر کی جانب جا رہا ہوں۔ صبح کا سورج آہستہ آہستہ نصف النہار کی طرف بڑھ رہا ہے۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

(کل ہند اردو مباحثے میں کی گئی تقریر)

صدر محترم اور معزز سامعین، زیر بحث موضوع "جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی" کی مخالفت اس میں لفظ دین کے استعمال نے بہت مشکل بنا دی ہے۔ کیوں کہ اگر کوئی بات دین کا نام لے کر کہی جائے تو سننے والوں کے جذبات برانگیختہ ہو جاتے ہیں اور اگر جذبات برانگیختہ ہو جائیں تو عقل مغلوب ہو جاتی ہے اور انسان معمولی سے معمولی بات سمجھنے سے بھی قاصر رہتا ہے تاہم اگر ہم جذبات کی سطح سے اوپر اٹھ کر اس مصرع کا تجزیہ کریں تو یہ بات ماننے پر مجبور ہوں گے کہ تاریخ اور موجودہ حالات دونوں کی شہادت اس کے خلاف ہے۔ تاریخ میں بہت تھوڑی مدت کو چھوڑ کر جب کبھی کبھی دین اور سیاست کو یک جا کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے نتائج بھیانک ہی نکلے۔ عہد وسطیٰ کے یوروپ میں عیسائی فرقوں کی باہمی چپقلش اور قتل و غارت گری سے کون واقف نہیں، خود تاریخ اسلام میں بھی حضور اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے مختصر عہد کو چھوڑ کر، باقی تمام مسلم سلاطین نے جو نام کے خلیفہ تھے، دین کو اپنے مقاصد کی براری کے لیے استعمال کیا اور اس سے اسلام کو بھی نقصان ہی پہنچا۔

دراصل ہوتا یہ ہے کہ جب بھی کبھی دین اور سیاست کو یک جا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو سیاست دین پر غالب آ جاتی ہے اور دین سیاست کا تابع بن جاتا ہے۔ اس سے دین کو تو نقصان پہنچتا ہی ہے، ظلم و ستم کی بھی بنیاد پڑتی ہے۔ کیوں کہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، اگر کوئی کام 'دین' کا نام لے کر کیا جائے تو اس کی مخالفت کرنا آسان نہیں رہتا تاریخ گواہ ہے کہ منصور کو 'دین' کا نام لے کر ہی دار پر چڑھایا گیا اور سرمد کا سر بھی تن سے دین ہی کے نام پر جدا کیا گیا۔ عالم گیر جیسے جلیل القدر بادشاہ نے بھی اپنے باپ شاہجہاں کو دین کی حفاظت کے نام پر ہی قید کیا اور گاندھی جی کے قاتل کا دعوا بھی یہی تھا کہ وہ اپنے دین کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ جناب اعلا سیاست دانوں نے دین کا نام لے کر وہ وہ مظالم کیے ہیں کہ عہد چنگیزی کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔

آج بھی ایران اور پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ ان ملکوں کے سربراہ دین کا نام لے کر جو مظالم کر رہے ہیں اس سے اسلام کی کتنی بدنامی ہو رہی ہے اور وہاں کے عوام کس عذاب میں مبتلا ہیں۔ اگر ان ممالک کے حالات کا مقابلہ ہم اپنے ملک کے حالات سے کریں تو بات پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے ملک کے حالات مثالی ہیں، یا یہاں ظلم وستم ہوتے ہی نہیں۔ لیکن یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک کا غیر مذہبی کردار ان ملکوں کے نام نہاد مذہبی کردار کے مقابلے میں کہیں زیادہ امن

اور آزادی کا ضامن ہے خود ہمارے ملک میں بھی جب اور جہاں قتل و غارت گری کی گرم بازاری ہوتی ہے تو اس کے پیچھے ان سیاسی جماعتوں کا ہاتھ ہوتا ہے جو دین کے نام پر عوام کو ورغلاتی اور اشتعال دلاتی ہیں۔

اس سلسلے میں کارل مارکس کا نظریہ سائنٹفک معلوم ہوتا ہے وہ تاریخ کا مطالعہ بھی معاشی اقتدار کے حصول کی جدوجہد کے پس منظر میں کرتا ہے۔ اس کے مطابق "جن لوگوں کو معاشی اقتدار حاصل ہوجاتا ہے وہی لوگ رفتہ رفتہ سیاسی اقتدار کے بھی مالک بن جاتے ہیں۔ اپنے اس اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے وہ اپنی پوری کوشش کرتے ہیں کہ معاشی طبقے بنائے رکھیں، غریب امیر کے خلاف بغاوت نہ کر دے، اس لیے غریب کے ذہن میں امیر کے پیدا کردہ خیالات پلتے رہتے ہیں۔ یہ بات دین کے ذریعے عوام کے ذہن نشین کر دی جاتی ہے کہ انھیں جو کچھ مشکلات یا پریشانیاں ہیں وہ دراصل ان کے پچھلے جنم کے کرموں کا پھل ہیں یا اس کا اجر و ثواب انھیں آخرت میں ملے گا۔ اس طرح عوام مطمئن ہوکر اپنی پریشانیوں کے ذمہ داران کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتے، اور حالات کا رخ وہی رہتا ہے جو اصحاب اقتدار چاہتے ہیں۔

حضرات دین کا اصلی مقصد اخلاق و کردار کی پاکیزگی ہے نہ کہ اقتدار و سیادت کا حصول۔ دین جب اقتدار حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیا جائے، جو سیاست کا مطمح نظر ہے، تو دین اپنی پاکیزگی کھو دیتا ہے اور سیاست بے لگام ہو جاتی ہے، کیوں کہ کس کی مجال ہے جو دین کا کاروبار کرنے والوں پر انگلی اٹھا سکے، ان کا ہاتھ پکڑنا تو دور کی بات رہی۔

اب آپ حضرات سے میری گذارش ہے کہ ان باتوں پر ٹھنڈے دل سے اور جذبات کی رو میں بہے بغیر غور کریں مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے اس بات پر متفق ہو جائیں گے کہ دین اور سیاست دو الگ الگ چیزیں ہیں اور جنگیزیت تب وجود میں آتی ہے جب ان دونوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی جائے نہ کہ تب جب یہ دونوں الگ الگ ہوں۔

ثمینہ کوثر

جیون کی مجبوری

(اس نظم پر مس ثمینہ کوثر متعلم یازدہم نے آن دی اسپاٹ ہندی پوئٹری کمپٹیشن میں دوسرا انعام حاصل کیا۔ یہ نظم مقابلے کے وقت دیے گئے عنوان پر فی البدیہہ کہی گئی تھی۔ مواد اور پڑھنے کے انداز پر ثمینہ کوثر نے سامعین سے بے حد داد وصول کی

(مرتب)

دیکھو جیون کی مجبوری
درد
جو اسے اپناتا ہے
من میں بساتا ہے
وہی
بس وہی
کانٹے کی نوک پر
پھول کھلاتا ہے
اسی لیے کہتی ہوں
غور سے سنیے
لوک کے دکھ درد
من کی آنکھوں سے چنیے
ان دکھ درد کو سمیٹ کر
کلا میں لپیٹ کر
اس طرح کہیے
بنا کہے مت رہیے
کہ پتھر گل سکے
اندھکار جل سکے
مانوتا کے رنگ میں
نیا منش ڈھل سکے

بہت دن سے سن رہے تھے کہ تعلیمی میلا ہونے والا ہے۔ یہ بات زیادہ تر ہمارے اردو کے استاد محترم جناب خالد محمود صاحب کے ذریعے ہمارے کانوں میں ڈالی جاتی تھی لیکن ہم زیادہ دھیان نہیں دیتے تھے۔ نہ اسے جب ہوگا تو دیکھا جائے گا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ کبھی کبھی خالی گھنٹوں میں یا انٹرول میں اس سے متعلق تھوڑی بہت بحث ہو جاتی تھی کہ ارے سنا ہے تعلیمی میلا ہونے والا ہے اس میں کون کون حصہ لے گا، ہوگا بھی یا صرف افواہ ہی ہے۔ خیر صاحب ہم نے زیادہ کان نہیں دھرا اور کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔

ایک دن اڑتی اڑتی خبر سننے میں آئی کہ یہ میلا ایک ہفتے چلے گا اور اس کی تاریخ کا بھی تعین ہوگیا ہے، ۲۹ر اکتوبر سے ۳ر نومبر تک۔ پھر اساتذہ سے اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ مگر ہم ہنوز خواب خرگوش کے مزے لوٹتے رہے۔ ہمارے کان پر نہ جوں رینگنی تھی نہ رینگی۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ ہر طرف زور و شور سے تیاری ہو رہی ہے، طبلے کی ٹھن ٹھن، گھنگھروؤں کی چھن چھن سے ہر وقت اسکول گونجتا رہتا۔ ادھر ملک صاحب اپنے ڈرامے کی ریہرسل کرا رہے ہیں تو ادھر رضی کمال صاحب گاندھی ڈرانی کے کلچرل پروگراموں کی تیاریوں میں رات دن ایک کیے ہوئے ہیں۔ ایک طرف خالد محمود صاحب اردو کے پروگراموں کے سلسلے میں لڑکوں اور لڑکیوں کو پکڑے بیٹھے ہیں تو دوسری طرف شکیل اللہ خاں صاحب اور مکرم صاحب جلسہ سیرت النبیؐ کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔

کیوں کہ یہ میلا ہائر سیکنڈری اور مڈل اسکول دونوں کی جانب سے تھا، اس لیے مڈل اسکول میں بھی ایک مہینہ پہلے سے اس سلسلے میں تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہر وقت بھاگ دوڑ میں مصروف رہتے۔ ایک دن میں اور میری ایک سہیلی چھٹی کے بعد مڈل اسکول سے گزر رہے تھے کہ ایک کلاس سے گانے بجانے کی آواز آئی۔ اس وقت ہم نے سوچا کہ شاید مڈل اسکول میں میوزک کے کوئی ٹیچر آئے ہیں اور بچوں کو میوزک کی تعلیم دے رہے ہیں۔ بعد میں عقدہ کھلا کہ وہ بھی تعلیمی میلے ہی کی تیاری تھی۔

جب میں نے دیکھا کہ یہ تو ہر شخص کسی نہ کسی چیز میں حصہ لے رہا ہے تو میں بھی گویا خواب سے چونکی اور میرے اندر بھی کسی چیز میں حصہ لینے کی خواہش انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے لگی۔ گروپ سانگ میں حصہ لینے کے لیے معلوم کرنے گئی تو کورا جواب ملا کہ اب تو تمام تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں اور اب کسی کی ضرورت نہیں ہے میں ادھر سے منہ لٹکائے لوٹ ہی رہی تھی کہ خالد محمود صاحب کسی فرشتۂ رحمت کی طرح مل گئے۔ ارشاد ہوا۔ "بھئی عطرت مجھے اردو کے پروگراموں کے لیے کچھ ایسے طلبہ کی ضرورت ہے جو ان پروگراموں کو کنڈکٹ کرسکیں۔ میں چاہتا ہوں کہ غزل سرائی کی نظامت کا کام تمہارے سپرد کر دیا جائے۔"

مجھے تو گویا نعمت غیر مترقبہ مل گئی۔ میں نے بنا کوئی ہچکچاہٹ ظاہر کیے حامی بھر لی۔ مشق کروائی گئی اور میرا اور عظمیٰ نسیدا کا تقرر بحیثیت اناؤنسر برائے مقابلۂ غزل سرائی ہوگیا۔

خیر صاحب، دن گزرتے گئے اور خدا خدا کرکے وہ دن بھی آ ہی گیا جس دن تعلیمی میلے کا افتتاح ہونا تھا۔ اسکول ایک ہفتے کے لیے بالکل بند کر دیا گیا تھا۔ ہر شخص میں ایک عجیب سا جوش اور ولولہ تھا۔ کسی نے مقابلوں میں حصہ لیا تھا تو کوئی صرف یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ ایسے رنگا رنگ پروگرام دیکھنے کو ملیں گے۔ اسکول میں بہار کا سا سماں تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی پروگرام ہوتا رہتا تھا۔ اسکول میں ہی دکانیں لگیں اور طلبہ ہی دکان دار بنے۔ ہائر سیکنڈری اسکول کے بڑے اسٹیج کو بہت خوبصورت طریقے سے آراستہ کی

گیا تھا۔ اسٹیج کے سامنے ایک شامیانہ لگا ہوا تھا۔ اس شامیانے میں کرسیاں بچھا کر مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا جدھر نظر ڈالیے لوگوں کی بھیڑ۔ کھوے سے کھوا چھلنے والا محاورہ سچ ثابت ہو گیا تھا۔

غزل سرائی کا مقابلہ محمد حسین الود (مرحوم) سے منسوب کیا گیا تھا۔ جس طرح دوسرے مقابلوں میں ٹرافی اپنے اسکول کو نہیں ملتی تھی خواہ وہ اس کا مستحق ہو یا نہ ہو، اسی طرح اس ٹرافی سے بھی ہمارا اسکول مستثنیٰ تھا۔ البتہ انفرادی انعامات مل سکتے تھے۔ ہائر سکنڈری اسکول اور مڈل اسکول کے پروگراموں کے اوقات اس طرح رکھے گئے تھے کہ دونوں کا کوئی پروگرام ایک وقت میں نہیں تھا، ایک کا صبح کے وقت میں تو دوسرے کا شام کے وقت ویسے کوئی نہ کوئی پروگرام چلتا ہی رہتا تھا۔ آخر میرے لیے وہ پر مسرت دن بھی آ گیا جس کا میں خوشی اور گھبراہٹ کے ملے جلے جذبات کے ساتھ انتظار کر رہی تھی۔ یہ پروگرام بڑے اسٹیج پر رکھا گیا تھا۔ جناب شہباز حسین صاحب اس کے لیے مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیے گئے تھے۔ تین جج صاحبان بھی مقرر کیے گئے تھے۔ اس مقابلے میں دہلی کے تمام قابلِ ذکر اسکولوں نے حصہ لیا۔ اس کے علاوہ ایک ٹیم امروہہ سے اور ایک میرٹھ سے بھی آئی تھی۔ ہر اسکول کی ٹیم دو طلبہ پر مشتمل تھی۔ ہمارے اسکول سے وحید احمد غزالی اور سعدیہ فاطمہ حصہ لے رہے تھے۔

مقابلہ ۳۰ر اکتوبر کو صبح ۹ بجے شروع ہوا۔ ہم مہمان خصوصی کو لے کر اسٹیج پر جا بیٹھے اور جو ٹیمیں آئیں ان کو بھی اسٹیج پر بٹھایا گیا۔ سب سے پہلے عظمیٰ سیدہ نے محمد حسین الود مرحوم کی تعریف میں چند باتیں کہیں، پھر میں نے پروگرام کے اصول اور قوانین پڑھ کر سنائے اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے وحید احمد غزالی کو ڈائس پر بلایا گیا۔ غزالی نے جب اپنی پرسوز آواز میں غزل چھیڑی تو تمام سامعین پر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔

غزالی نے غزل ختم کی تو پنڈال بہت دیر تک تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونجتا رہا۔

غزل سرا ایک کے بعد ایک آتے رہے، مقابلہ بہت اچھے انداز سے چل رہا تھا۔ حاضرین خاموشی سے بیٹھے ہر غزل کا لطف لے رہے تھے اور داد دے رہے تھے۔ پھر ایک اسکول کی طالبہ فرحت ظہور کو دعوت دی گئی وہ اسٹیج پر آئیں اور غزل شروع کی۔ پنڈال میں بالکل سناٹا چھا گیا۔ فرحت ظہور کی پرکیف آواز سامعین کے دل میں اترتی چلی گئی۔ اگر ان کے بارے میں یہ شعر کہوں تو بیجا نہ ہوگا:

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

جب تک جج صاحبان نتیجہ تیار کرتے، حاضرین کی فرمائش پر وحید احمد غزالی اور فرحت ظہور نے ایک ایک غزل پیش کی۔ پھر نتیجہ سنایا گیا۔ امید کے مطابق غزالی کو دوم اور فرحت ظہور کو اول انعام ملا۔ آخر میں مہمان خصوصی جناب شہباز حسین صاحب نے اس مقابلے پر اپنی رائے کا اظہار کیا اور اس طرح تمام حاضرین، مہمانِ خصوصی، جج صاحبان، باہر سے آئی ہوئی تمام ٹیموں اور اساتذہ کے شکریے کے ساتھ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

محمد ہدایت اللہ

رنگارنگ بزم آرائیاں

گاندھی جی نے خواب دیکھا تھا۔ ایک ایسے ہندستان کا جس میں کوئی روتا نہ ہوگا، کوئی افسردہ نہ ہوگا اور چاروں طرف خوشیاں ہوں گی۔ یہ خواب تو شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا مگر جامعہ ہائر سکنڈری اسکول نے اس کی ایک ہلکی سی جھلک ضرور دکھادی گاندھی ٹرافی کے ذریعے۔ گاندھی ٹرافی جامعہ کی چند خوبصورت روایات میں سے ایک ہے۔ اب سے چند سال پہلے تک اس ٹرافی کے مقابلے بڑے اہتمام سے ہوا کرتے تھے۔ مگر پھر بعض وجوہات کی بنا پر یہ مقابلے بند کردینے پڑے۔ اس مرتبہ جب یوم تاسیس منانے کا فیصلہ کیا گیا تو خیال ہوا کہ کیوں نہ اس حسین روایت کو پھر سے شروع کیا جائے۔ چنانچہ فیصلہ ہوگیا اور یوم تاسیس کے مختلف پروگراموں میں ایک پروگرام یہ بھی شامل کردیا گیا۔

اکتوبر کی آخری تاریخوں کی ایک حسین شام تھی، درختوں کے سائے لمبے ہوچکے تھے۔ سورج آہستہ آہستہ مغرب میں جھکتا جارہا تھا۔ ہری بھری لان کے سامنے خوبصورتی سے سجا ہوا اسٹیج دیکھنے والوں کو متاثر کررہا تھا۔ سریلے قہقہے، رنگ برنگے آنچل فضا میں لہرا رہے تھے۔ اور اس خوبصورت پس منظر میں گاندھی ٹرافی کے خوبصورت پروگرام یکے بعد دیگرے اسٹیج ہورہے تھے۔ گاندھی ٹرافی دراصل مختلف کلچرل پروگراموں کا مجموعہ ہے۔ ان میں مقابلۂ غزل گائکی، مونوایکٹنگ، گروپ سانگ اور ایکشن سانگ خاص ہیں۔ ان تمام پروگراموں کا مختصر تعارف مندرجہ ذیل ہے۔

یوں تو رونا اور گانا کسے نہیں آتا۔ تمام میں ہر شخص تان سین اور بیجو باورا ہے۔ مگر معاملہ جب واقعی گانے کا درپیش ہو اور وہ بھی سامعین کی ایک بڑی تعداد کے سامنے، تو اچھے اچھوں کو رونا آجاتا ہے۔ بعض ڈھیٹ اگر خود نہیں روتے تو کم از کم سامعین کو تو ضرور ہی رونے پر مجبور کردیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ وہ گلوکار ہیں اور اگر بدقسمتی سے کوئی ان کے منہ پر ان کی تعریف کردے تب تو پھر ان پر یہی مثل صادق آتی ہے کہ "منہ لگائی ڈومنی گائے تال بے تال"۔ حقیقی فنکار وہ ہے جو نہ تو خود روئے اور نہ دوسروں کو رونے پر مجبور کرے بلکہ کچھ دیر کے لیے سامعین کو دنیا و مافیہا سے غافل کردے۔ گاندھی ٹرافی کے مقابلۂ غزل گائکی میں حصہ لینے والے بعض طلبہ واقعی فنکار تھے۔ حسین موسم، شام کا سہانا وقت اور اس پر سے کوئی خوبصورت آواز۔ اندازہ کیجیے کیا سماں ہوگا۔

رقص کا سرزمین ہند سے بہت قدیم اور نہایت گہرا تعلق ہے۔ اچھے رقاص اور رقاصاؤں کی یہاں ہمیشہ

(طالب علم دہم (سائنس) مقیم جامعہ ہائر سکنڈری اسکول)

قدر کی گئی ہے اور آج بھی کی جاتی ہے۔ شاید یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ رقص ہندستان کی روح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رقص گاندھی ٹرافی کا ایک اہم جز ہے۔ دہلی کے کئی اسکولوں نے اس مقابلے میں حصہ لیا۔ بعض رقص واقعی بہت خوبصورت تھے۔ کچھ علاقائی رقص دیکھ کر تو حاضرین حیران رہ گئے کہ یہ رقص واقعی طلبہ پیش کر رہے ہیں یا اس علاقے کے لوگ بذات خود ناچنے آگئے ہیں۔

رقص کے ساتھ گیتوں کو بھی ہندستان کی تاریخ میں بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ آج بھی یہاں گیتوں کے شائقین کی بڑی تعداد موجود ہے۔ اس کے علاوہ گیتوں کو ادبی اہمیت بھی حاصل ہے۔ ناچ گانے کو خوشی کے اظہار کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ مختلف تیوہاروں اور تقریبات میں لوگ ناچتے اور گاتے ہیں۔ گاندھی ٹرافی کے زیر اہتمام ہونے والا یہ مقابلہ بھی بہت خوبصورت تھا۔ ساز اور آواز کے تال میل نے ایک عجیب سماں باندھ دیا تھا۔ بعض گیتوں نے سامعین سے بہت داد وصول کی۔

جیسے جیسے سائنس ترقی کرتی جارہی ہے ویسے ویسے انسان کی مصروفیت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ پیار، محبت اور دوستی جیسے الفاظ کو وہ بھلاتا جارہا ہے۔ ہر رشتہ دکھاوے کا اور ہر جذبہ اوپری رہ گیا ہے۔ مسکراہٹیں پھیکی اور ہنسی کھوکھلی ہوتی جارہی ہے۔ کھل کر دل کی گہرائی سے ہنسنے کے مواقع آج کے انسان کی زندگی میں بہت کم آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلموں میں اور ادب میں مزاح نگاری کے اضافے کے ساتھ ساتھ دیگر مزاحیہ پروگراموں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ اسی قبیل کی ایک چیز ہے مونو ایکٹنگ۔ گاندھی ٹرافی کے تمام مقابلوں میں یہ سب سے زیادہ کامیاب مقابلہ تھا۔ لوگ کھلے دل سے قہقہے لگا رہے تھے، ہنس رہے تھے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس پروگرام کو دیکھ سکے کیوں کہ آج جب ہنسی کا فقدان ہے وہ ہنس لیے۔

تمام مقابلوں کے اختتام کے بعد ہندستان کے سابق صدر جناب فخرالدین علی صاحب کی اہلیہ، جنابہ عابدہ احمد صاحبہ نے انعامات تقسیم کیے۔ اور یوں یہ شام جامعہ کی ان گنت حسین شاموں میں ایک اور اضافہ کر گئی۔

ایک یادگار

فیروز حامد عثمانی

انگلش ڈبیٹ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دور انگریزی کا تقریری مقابلہ۔

چونکیے نہیں یہ سچ ہے جامعہ کا نام آتے ہی لوگوں کے
ہن میں ایک مذہبی ادبی مدرسے کا تصور اُبھر آتا ہے۔ عام
ر پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ جامعہ کا انگریزی اور جدید تعلیم سے
ئی تعلق نہیں ہے یہ خیال در اصل ناقص معلومات کا
یہ ہے یہ سچ ہے کہ جامعہ میں طلبہ کے مذہبی اور اخلاقی کردار
ا تشکیل پر بہت توجہ دی جاتی ہے مگر اس کا مطلب ہرگز
ہیں ہے کہ یہاں انگریزی اور سائنسی علوم کی جدید تعلیم
پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ یہاں کے طلبہ سائنٹفک
لج میں کسی بھی اسکول کے طلبہ کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت
ھتے ہیں جہاں تک انگریزی کا تعلق ہے تو اس کا اندازہ آپ
انگلش ڈبیٹ کے نتائج سے ہو جائے گا۔

پچھلے دنوں جامعہ میں یوم تاسیس کے موقعہ پر ایک
لیمی میلے کا اہتمام کیا گیا اس جشن تعلیمی کا ایک اہم جز
نگلش ڈبیٹ بھی تھی۔ یہ مقابلہ ۳۰ اکتوبر کو صبح ساڑھے
ں بجے جامعہ ہایر سکنڈری اسکول کے کامن روم میں
وا۔ اس مقابلے کے منتظم جناب شکیل اللہ خاں صاحب
ح سے ہی لڑکوں کے ساتھ کامن روم کی سجاوٹ میں
مروف تھے۔ اسٹیج کے چاروں طرف رنگ برنگ پھولوں
کے گملے سجے ہوئے تھے۔ سامنے نشستیں بڑی باقاعدگی
سے دو قطاروں میں رکھی ہوئی تھی۔ اسٹیج کے دائیں اور
بائیں ایک ایک اسٹینڈ رکھا ہوا تھا۔ دائیں طرف والا
اسٹینڈ موضوع کی موافقت کے لیے تھا اور بائیں طرف
والے اسٹینڈ سے موضوع کی مخالفت ہونی تھی۔

جوں جوں مقابلے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا مقابلے
میں حصہ لینے والوں کی دل کی دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔
جامعہ ہائر سکنڈری اسکول کی طرف سے مقابلے میں حصہ
لینے والے طلبہ تو دو ہی تھے۔ مگر تقاریر چار کو کرنی تھیں۔
آخر خدا خدا کرکے دس بجے اور مہمان ٹیمیں آنی شروع
ہو گئیں۔ جامعہ کے علاوہ دہلی کے آٹھ دیگر اسکولوں
کی ٹیمیں اس مقابلے میں حصہ لینے کے لیے آئیں۔ اِن
اسکولوں کے نام اس طرح ہیں۔

دہلی پبلک اسکول متھرا روڈ،
دہلی پبلک اسکول آر، کے پورم،
کیندریہ ودھیالہ
گرو ہر کرشن پبلک اسکول
مدرز انٹرنیشنل گرلز اسکول،
اینگلو عربک اسکول
گرلز اسکول بلبلی خانہ
سمر فیلڈ اسکول۔ فتح پوری اسکول دہلی

اس مقابلے کے لیے دو ٹرافیاں تھیں۔ ایک ونرز
دوسری رنرز ونر ٹرافی رفیع احمد قدوائی مرحوم سے منسوب

ہے۔ رفیع احمد قدوائی صاحب کا شمار ہندستان کے چند عظیم لیڈروں میں ہوتا ہے۔ ایک بڑا لیڈر ہونے کے باوجود انھوں نے نہایت سادہ زندگی بسر کی۔ ایمانداری ان کے کردار کا سب سے بڑا وصف تھا۔

ٹھیک ساڑھے دس بجے مقابلہ شروع ہوا۔ اس مقابلے کی نظامت کی ذمہ داری خواجہ شمس (متعلم درجہ دوازدہم سائنس) کے سپرد تھی جسے انھوں نے اس حسن وخوبی سے سر انجام دیا کہ مہمان خصوصی اور وائس چانسلر تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ قدوائی صاحب (وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے اس مقابلے کی صدارت فرمائی۔ مہمانِ خصوصی محترم جناب سلمان خورشید صاحب تھے۔ جج کے فرائض محترم جناب نذیر الدین مینائی صاحب، محترم جناب انور صدیقی صاحب اور محترم جناب اسد علی صاحب نے انجام دیے۔

تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں مقابلے کی کارروائی آگے بڑھتی رہی طلبہ یکے بعد دیگرے ڈائس پر آکر تقاریر کرتے رہے۔ جامعہ کے طلبہ نے بہت اچھی کارگزاری کا مظاہرہ کیا اور سامعین سے داد وصول کی۔ تمام تقاریر ختم ہونے کے بعد جناب سلمان خورشید صاحب نے تقریر کی۔ وہ خود ایک بہت اچھے مقرر ہیں اپنی تقریر میں انھوں نے فنِ تقریر سے متعلق کچھ باتیں بتائیں اور پھر موضوع کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ آخر میں محترم انور جمال قدوائی صاحب تقریر کرنے کے لیے تشریف لائے۔ انھوں نے جامعہ کے طلبہ کی کارگزاری کی تعریف کی اور ہمت افزائی فرمائی۔ اس کے بعد نتائج کا اعلان کیا گیا۔ جامعہ ہائر سکنڈری اسکول کے فیروز حامد عثمانی نے دوسرا انعام حاصل کیا اوّل انعام کی حقدار مدرز انٹرنیشنل اسکول کی مس جیسکا پال قرار پائیں۔ مقابلہ سخت ہونے کی بنا پر ججوں کو دو دوسرے انعام دینے پڑے۔ فیروز عثمانی کے علاوہ مدرز انٹرنیشنل اسکول کی مس پونم اسار نے بھی دوسرا انعام حاصل کیا۔ تیسرا انعام دہلی پبلک اسکول (متھرا روڈ) کے سندیپ شارلیکر نے حاصل کیا۔ ہمت افزائی کے لیے گرلز اسکول بلبلی خانہ کی مس طاہرہ خان کو بھی ایک انعام دیا گیا اور اس طرح مختلف اسکولوں کے تعاون سے یہ مقابلہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔
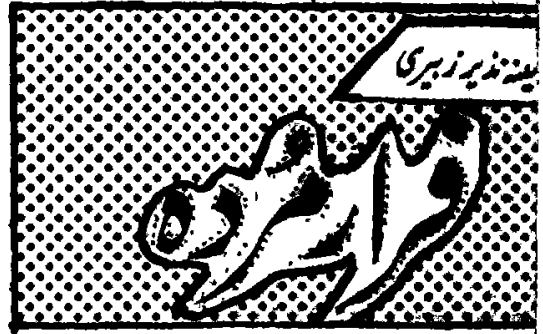
نہیں! ڈریے نہیں" فرار مردے" سے مراد سچ مچ کوئی
دہ نہیں یہ نام ہے۔ ہمارے کیمسٹری کے استاد ملک سرور
انعامی صاحب کے ایک ڈرامے کا۔

عنوان پڑھنے کے بعد ہر شخص میں تجسس ضرور پیدا ہوا
کہ یہ تھا کیا؟ یہ ڈراما کب اسٹیج ہوا؟ کس کس نے اس میں
لیا اور خصوصاً مردے کا رول کس نے کیا وغیرہ۔ لیجیے۔ اب تجسس
لیجیے اور اس مضمون میں اس کے بارے میں پڑھیے۔ مختصراً
کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

ملک سرور انعامی صاحب نہایت معروف استاد ہیں
اپنے مضمون سے تعلق رکھنے والے۔ گھنٹہ لیا اور اپنے لیب
داخل ہو گئے مگر تعجب کی بات ہے ان جناب کو بھی ڈرامے
شوق پیدا ہوا اور یہ فطری بھی تھا۔ کیوں کہ ان دنوں جامعہ
کلچرل پروگراموں کی فضا سی بن گئی تھی۔ یعنی اس بنے
ماحول سے موصوف نے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈرامہ
تصنیف فرمائی اور اس کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ہمارے لیے وہ دن بڑے خوش گوار تھے۔ ملک صاحب
سے گھنٹے چھوڑ دیا کرتے تھے اور ان گھنٹوں میں اپنے ڈرامے
فرار مردا" کی تیاری کرواتے تھے۔ مگر قابل ذکر بات یہ ہے
ڈرامے میں بھی وہ اپنے مضمون سے ذرا نہیں ہٹے۔ اس کا اندازہ
کو اس ڈرامے کے کرداروں سے ہو جائے گا۔

۱۔ ڈاکٹر جرمینیم یہ کردار مدیح الرحمٰن نے کیا تھا۔

۲۔ کیلیم	رضا حیدر
۳۔ سوڈیم	ثریا پروین
۴۔ کرچہ ٹوویم	فیروز حامد عثمانی
۵۔ سلیکا	شمس العارفین
۶۔ آرگن سنگھ	ذی شان احمد
۷۔ لالا پولونیم	پروین عالم
۸۔ مردہ	احسان الحق

ان کے علاوہ سلمٰی غیاث۔ سلمٰی احسان۔ اسد اللہ خان
محمد تحسین۔ عامر سلیمان منجیو دت۔ سہیل نعمانی۔ ہدایت اللہ
نشاط افزا بیگ وغیرہ وغیرہ نے بھی اس ڈرامے میں بے نام کردار
ادا کیے تھے۔ ریہرسل کے دوران سب لوگ اپنے اپنے
ڈائیلاگ یاد کرنے میں لگے رہتے۔ ڈرامہ میں کام کرنے
والے طالب علموں کو ان کی کلاسوں سے بلوا لیا جاتا۔ ان کے
ساتھ ہی ہم لوگوں کو چھوڑ دیا جاتا اور ہم ان کے ساتھ ان
کے ڈرامے کی تیاری دیکھنے جاتے۔ کئی روز تک دیکھنے کے بعد
ہمیں یہ یقین ہو چلا تھا کہ ڈرامہ ہوگا بڑا دھانسو۔

خدا خدا کر کے وہ دن بھی آگیا جس کا ہم سب کو بے
چینی سے انتظار تھا۔ یعنی ۳ نومبر ۱۹۸۱ء یہی وہ دن تھا جس
دن ڈراما اسٹیج ہونا تھا۔ ڈرامے کا وقت چھ بجے شام کا تھا
سب لوگ چھ بجے سے پہلے ہی اوپن ایر تھیٹر میں پہنچ گئے
یہ سوچ کر کہ ملک سرور صاحب وقت کے پابند ہیں۔ ڈرامہ
ٹھیک وقت پر شروع ہو جائے گا۔ ابھی ۶ بجنے بھی نہیں پائے
تھے، وہ لوگ جو ڈرامہ میں حصہ لینے والے تھے۔ اندر اپنے اپنے
میک اپ میں مصروف تھے کہ اچانک لائٹ غائب ہو گئی میرے
خیال میں میک اپ ابھی پورا نہیں ہو سکا تھا۔ لڑکیوں میں
کسی کی صرف ایک آنکھ میں کاجل لگا تھا تو کسی کی صرف ایک
چوٹی ہوئی تھی اور لڑکوں میں کسی کی مونچھیں لگ پائی تھیں،
داڑھی ندارد تھی، کسی کی داڑھی تھی تو مونچھیں غائب!
سردار جی کی پگڑی بھی ابھی باندھے جانے کے مراحل سے
گزر رہی تھی۔ غرض سب کچھ دھرا کا دھرا رہ گیا۔

چھ بجے ساڑھے چھ بجے، سات بجے۔ غرض وقت بیتتا چلا
گیا مگر لائٹ کو نہ آنا تھا نہ آئی اور سب لوگ جو خوشی خوشی ڈرامہ
دیکھنے آئے تھے، یہ امید لے کر کہ کل دیکھا جائے گا، اپنے اپنے

نہم (سائنس) جامعہ ہائر سکنڈری اسکول

گھروں کو روانہ ہوگئے۔ دوسرا دن آیا پھر اسی وقت سارے لوگ اوپن ایر تھیٹر میں پہنچ گئے۔ آج لائٹ نہیں کٹی تھی۔ سب لوگ ڈرامے کی شروعات کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں یک بارگی اسٹیج کا پردہ اٹھ گیا۔

سب سے پہلے ڈاکٹر جرمینم کو دکھایا گیا کہ وہ پڑھائی میں مصروف ہیں۔ اتنے میں ان کے بھائی گیلیم اندر داخل ہوتے ہیں جن سے جرمینیم ان کے کیمسٹری کے پیپر کے بارے میں پوچھتے ہیں "کہو بھئی تمہارا پیپر کیسا رہا گیلیم۔ بہت اچھا" جرمینیم پرچہ دیکھتے ہیں اور اس میں سے ایک سوال کا جواب طلب کرتے ہیں۔ "بتاؤ گولڈ کی سیٹلمنٹ جی میں میں کیا لکھا ہے۔؟" گیلیم خوشی سے جواب دیتے ہیں "ارے اتنا آسان سوال! یہ تو مجھے بہت ہی اچھی طرح یاد تھا۔ بس سب کچھ لکھ دیا۔

"پھر بھی کیا لکھا" "ارے وہی گولڈ کی یاد کی ہوئی پوری نظم لکھ دی" وغیرہ وغیرہ۔

ایک دو سین کے بعد ایک اسٹریچر پر ایک "مردہ" آتا ہے جو واقعی مردہ ہی لگ رہا تھا۔ بچے غالباً ڈر گئے ہوں گے اور طرّہ یہ کہ وہ بول رہا تھا کافی ڈائیلاگ کے بعد وہ فرار بھی ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر جرمینیم بہت پریشان ہوتے ہیں اور اخبار میں اس کا اشتہار نکال دیتے ہیں۔ ساتھ ہی انعام کا اعلان بھی کروا دیتے ہیں جس کے لالچ میں آکر مس سماریم ایک بڈھے کو لے جاتی ہیں اور اس کو "فرار مردہ" بتاتی ہیں لفظ "مردہ" سن کر بڈھا گرم ہو جاتا ہے اور راز کو فاش کر دیتا ہے اور سماریم یہی کہتی رہ جاتی ہے کہ "اور میرا انعام"۔

یہ ڈرامہ کا آخری سین تھا۔ اس کے بعد سب کردار اسٹیج پر لائے گئے تعارف کرایا گیا۔ اور ڈرامے کے اختتام کا اعلان کر دیا گیا۔ یہی ہمارے تعلیمی میلے کا اختتام تھا۔ مگر واہ! واہ بھئی کیا دن تھے کہ بھلائے نہ بھولیں گے!

پیام تعلیم کہاں کہاں ملتا ہے

سعیدی کتب خانہ۔ ناکہ بھنڈی بازار، بمبئی ۳
ناز بکڈپو بھنڈی بازار، بمبئی ۳
بچوں کا کتب خانہ، ناکہ جے جے ہسپتال، بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ا
نیشنل بکڈپو، بگتیا روڈ، گیا
زینت اردو نیوز ایجنسی، پرانا محلہ الیال (کرناٹک)
مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ، تھانہ منڈی (کشمیر)
ہلال نیوز ایجنسی۔ شیواجی پول، پوسد (مہاراشٹر)
محمد بدر الدین۔ بیڑ (مہاراشٹر)
ایم۔کے ندراف، باگیواڑی (کرناٹک)
اردو بکس ایجنسی، چترادرگ (کرناٹک)
ایم عزیز احمد نیوز ایجنٹ۔ نواب پورہ ۴۸-۷-۴۔ اورنگ آباد
محمد الیاس ۹۱ کولوٹولہ اسٹریٹ، کلکتہ ۳
بک امپوریم سبزی باغ، پٹنہ ۴
مکتبہ اطفال۔ مالیگاؤں (ناسک)
سنٹرل اسٹور، رام دیو اسٹریٹ، بیلگام
غیاث الدین تاج، ٹیٹیانہ، کاٹی (مغربی بنگال)
شمع بک اسٹال، چوک گھنٹہ گھر سبزی منڈی، الہ آباد ۳
مدینہ بکڈپو، اسلام پورہ، جلگاؤں
تنویر بک ڈپو، جی۔ ٹی روڈ، آسنسول
محمد عبد القدیر بک اسٹال۔ مین روڈ، موتی ہاری (بہار)
مکتبہ معارف الاسلام، قاضی باڑہ، نظام پورہ۔ بھیونڈی (تھانہ)
سراج الحسین خاں، گنج دوم، بتیا (چمپارن)
نائج سنٹر، مقابل پی۔ یو لائبریری۔ پٹنہ ۶
مسٹر جنید عالم۔ کریم گنج، گیا (بہار)
شیخ بک ایجنٹ ناریتھ قصبہ شولاپور
ہمارا بک ڈپو۔ ترکی واڑ، سورت
طارق نیوز ایجنسی، مومن پورہ۔ ناگپور
ریڈرز ڈپو، بھولی موڑ، دھنباد
مسلم اقبال۔ ٹیٹیانہ۔ کلٹی (مغربی بنگال)
کتاب گھر۔ سٹی چوک، اورنگ آباد
جنرل بک اسٹال، کشن گنج (بہار)
بھوپال بک ہاؤس، بدھوارہ، بھوپال
عظیم آباد کتاب گھر، گردنی باغ، پٹنہ
نکہت بک ڈپو، اے، بی روڈ آسنسول

کا

ممبر بن کر اُردو کی ادبی اور معیاری کتابیں رعایتی قیمت پر حاصل کیجیے

ہمیں یقین ہے کہ اُردو ادب سے دل چسپی رکھنے والے حضرات اس نئی اسکیم سے استفادہ کریں گے اور ہمیں موقع دیں گے کہ ہم کم سے کم مدّت میں زیادہ سے زیادہ اچھی کتابیں آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں

قواعد وضوابط :

۱۔ بک کلب کی فیس رکنیت پانچ روپے (Rs.5/=) ہوگی۔

۲۔ بک کلب کے ہر ممبر سے ماہنامہ "کتاب نما" کا (جس کا سالانہ چندہ آٹھ روپے (Rs 8/=) ہے صرف چار روپے (Rs. 4/=) سالانہ چندہ لیا جائے گا۔

۳۔ ہر ممبر کو مطبوعاتِ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (غیر درسی پر) 25 % اور ہندستان میں چھپی ہوئی تمام اُردو کی کتابوں کی خریداری پر $6\frac{1}{4}$ % کمیشن دیا جائے گا۔ (ہر فرمایش پر کلب کی ممبری کا حوالہ دینا ضروری ہوگا۔)

۴۔ بک کلب کا ممبر صرف انفرادی طور سے بنا جا سکتا ہے۔ کوئی لائبریری بک کلب کی ممبر نہیں بن سکتی۔

۵۔ ممبری کے دوران، ممبر حضرات جتنی بار چاہیں کتابیں خرید سکتے ہیں۔

۶۔ کتابیں بذریعہ وی۔ پی روانہ کی جائیں گی اور اخراجاتِ روانگی کتب ممبر کے ذمّے ہوں گے۔

۷۔ گیارہ مہینے گزرنے کے بعد ہر ممبر کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ فیس رکنیت کی کتابیں خرید کر پچھلا حساب صاف کرے اور آیندہ کے لیے پھر سے رکنیت کی فیس بذریعہ منی آرڈر روانہ کرے۔

۸۔ بک کلب کی رکنیت کی مدّت پوری ہو جانے کے باوجود اگر کسی ممبر نے اپنی طرف سے کتابوں کا آرڈر نہیں بھیجا تو ہم مجبوراً اپنی پسند کی کتاب بھیج کر حساب صاف کر دیں گے۔

ممبر حضرات اپنی پسند کی کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یا اس کی کسی بھی شاخ سے حاصل کر سکتے ہیں

صدر دفتر :
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر نئی دہلی 110025

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اُردو بازار، دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنس بلڈنگ، بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

پیغامات

میں نے بارہا اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ جامعہ کے اسکولوں میں یہاں کی تہذیب و روایات کی پاسداری کا نسبتاً زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ اسکولوں کے بچوں اور اُستادوں سے مل کر مجھے ہمیشہ مسرت اور طمانیت کے احساس کے ساتھ جامعہ کے لیے زیادہ سے زیادہ کام کرنے کا حوصلہ ملا ہے۔

پچھلے دنوں یومِ تاسیس کے موقع پر مختلف کلچرل اور ادبی پروگراموں میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی اور اطمینان ہوا کہ ہمارے لڑکے اور لڑکیوں میں اعلا درجے کی صلاحیتیں موجود ہیں اور ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے جامعہ کے اسکولوں نے موثر قدم اُٹھائے ہیں۔

میں اپنے بچوں سے خوش آیند توقعات وابستہ کرتے ہوئے اُمید کرتا ہوں کہ وہ ملک و ملت کی تعمیر میں سرگرم رہتے ہوئے سارے عالم میں اپنے ادارے کا نام روشن کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔

آخر میں "پیامِ تعلیم" کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس رسالے نے بچوں کی ادبی صلاحیتوں کو اُبھارنے اور ان میں ذوقِ سلیم پیدا کرنے میں ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا ہے۔ میری دعا ہے کہ پیامِ تعلیم اور یہ نونہالانِ جامعہ زندگی کی ہر آزمایشی گھڑی میں ثابت قدم رہیں اور اپنے تمام نیک ارادوں میں کامرانی، سُرخروئی اور سربلندی حاصل کریں۔ (آمین)

انور جمال قدوائی
(وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ)

خدا کا شکر ہے کہ تعلیمی میلا بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا۔ جامعہ کی دس بارہ سال پرانی روایت کو زندہ کرنے کا خیال اگر ایک طرف مسرت افزا تھا تو دوسری جانب عملی طور پر دشوار گزار بھی نظر آتا تھا۔ پرانے حالات اور نئے کوائف میں زمین آسمان کا فرق آچکا ہے، قدریں بدل چکی ہیں۔ نہ وہ پرانا مذاق ہے نہ شوق، نہ وہ وقت ہے نہ وہ لوگ۔ کیا یہ میلا قدیم انداز کو پا سکے گا۔؟ بار بار یہی خیال ذہن میں آتا تھا۔ لیکن اپنے آزمودہ کار ساتھی اساتذہ اور ہونہار طلبہ و طالبات نے جلد ہی یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ کسی بھی کام کو بہتر طریقے پر انجام دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔

تجربہ کار اساتذہ کے تربیت یافتہ فن کاروں کے ادبی اور کلچرل پروگراموں کے معیار اور سلیقہ شعاری کو دیکھ کر فخر و مسرت کے احساس کے ساتھ بے اختیار دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ ان کی صلاحیتوں میں اس قدر اضافہ کرے کہ یہ اپنے خاندان اور درس گاہ کے علاوہ ملک و قوم کا نام روشن کرنے کے اہل بن سکیں۔

جشنِ تعلیمی میلا میں طلبہ کے کارناموں کو دیکھنے اور سراہنے والوں کے لیے یہ خبر اور زیادہ مسرت کا باعث ہوگی کہ "پیامِ تعلیم" کا یہ نمبر جو اس وقت آپ کے زیرِ مطالعہ ہے مکمل طور پر طلبہ و طالبات کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

(پرنسپل) عبد الحق خاں

جامعہ کی زندگی پر بہت دنوں سے جمود طاری تھا یہاں کے بعض اداروں اور شعبوں میں وقتاً فوقتاً ادبی اور ثقافتی پروگرام ہوتے رہتے تھے۔ لیکن اکثر و بیشتر ان پروگراموں کا علم جامعہ برادری کو ہو ہی نہیں پاتا تھا۔ اس کمی کو سب ہی ایک عرصہ سے محسوس کر رہے تھے۔ موجودہ تعلیمی سال میں اسکولوں کے طالب علموں اور اساتذہ کی مشترکہ کوششوں نے اس جمود کو توڑا۔ گیارہ سال سے خوابیدہ ثقافتی سرگرمیوں نے انگڑائی لی اور جامعہ برادری میں زندگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ۲۹ اکتوبر کو یوم تاسیس کی تقریب سے تعلیمی میلا کا آغاز ہوا۔ تین دن تک یہ میلا بڑی شان و شوکت سے چلتا رہا اور پیاسی روحیں سیراب ہوتی رہیں۔ اس موقع پر مدرسہ ثانوی نے جو پروگرام پیش کیے ان سے اندازہ ہوا کہ کیسے کیسے باصلاحیت نوجوان ہمارے اداروں میں موجود ہیں۔ میں نے سوچا "توجہ ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی" (علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

کتابوں سے اکتساب علم اپنی جگہ بہت اہم ہے لیکن اپنی تہذیبی روایات سے واقفیت اور ہر کام میں ترتیب تنظیم اور سلیقہ سکھانے کا سب سے بہتر اور موثر طریقہ یہی ہے اجتماعی کاموں کے ذریعہ افراد کی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع بھی ملتا ہے اور مل جل کر کام کرنے کی افادیت اور اہمیت بھی افراد پر بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ میلے کے موقع پر مدرسہ ثانوی کے طالب علموں کے کاموں کو میں اس سلسلے میں ثبوت کے طور پر پیش کر سکتا ہوں۔

میں ان لوگوں کو فرداً فرداً بھی مبارک باد دے چکا ہوں اور ایک بار پھر ان کو مبارک باد پیش کرتا ہوں مجھے امید ہے کہ اپنی اس شاندار روایت کو زندہ رکھنے میں مدرسہ ثانوی آیندہ بھی پیش پیش رہے گا۔

دعاؤں کے ساتھ
خالد سیف اللہ
ہیڈ ماسٹر جامعہ مڈل اسکول

نو عمری کا زمانہ، زندگی میں سب سے زیادہ تکلیف دہ دور ہوتا ہے۔ لیکن ... اس راستہ پر تو آپ کو چلنا ہی ہے۔ یہ تکلیف تو برداشت کرنی ہی ہے۔ آپ کے سینوں میں نئی نئی منہ زور امنگیں سر اٹھائیں گی اور ٹھوس حقیقتوں سے ٹکرا کر آپ کو بے چین کرتی رہیں گی۔

ساتھ ہی یہ دور آپ کو زندگی کی سدا بہار رعنائی کو، اس کی بے کراں وسعت اور گہرائی کو اپنے اندر زیادہ سے زیادہ جذب کرنے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔

آپ جس ادارے سے وابستہ ہیں، اس کی اپنی تاریخ اسی وسیع النظری کی ترجمان ہے۔ اس تاریخ کو جاننا، اسے سمجھنا، اور آج کے حالات سے اسے جوڑ سکنا ...... یہ عمل خود آپ کو مستقبل میں ایک مربوط اور توانا شخصیت حاصل کر لینے کا ضامن بن سکتا ہے۔ آپ کی پرواز امکان،

ئی عمر کے لیے میرا یہی چھوٹا سا پیغام ہے۔

فہمیدہ ریاض
اقامتی شاعرہ
جامعہ ملیہ اسلامیہ

آج سے لگ بھگ ۲۵ سال پہلے جب میں جامعہ برادری میں شامل ہوا تو یہاں کی ثقافتی سرگرمیوں سے تعلیمی میلے کے ذریعہ متعارف ہوا۔ جامعہ کے مدرسوں کے جلسوں اور پروگراموں کو دیکھ کر میں بے حد متاثر ہوا تھا۔ ایک چھوٹے سے اسکول میں اتنی بہت سی صلاحیتوں کا یکجا ہو جانا ناقابل یقین سی بات تھی میں اس کو محض ایک امر اتفاقی سمجھا۔ لیکن وقت کے ساتھ میں نے جامعہ کی زندگی کو قریب سے دیکھا تو محسوس ہوا کہ یہ کوئی عجوبہ نہیں بلکہ یہاں کی دیرینہ روایت ہے اور یہاں جلسے اور پروگرام ایسے ہی ہوتے چلے آئے ہیں۔

تعلیمی میلے کی زیادہ تر سرگرمیوں کا محور مرکز جامعہ کے مدرسے تھے۔ جہاں طالب علم مختلف سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے تھے اور میلے کی رونق اور کامیابی انھیں کی ان تھک محنت اور عمدہ صلاحیتوں کی رہین منت ہوتی تھی۔ یہاں کے بچے اپنے جلسے جس خوش اسلوبی اور سلیقے سے کرتے ہیں وہ دوسرے اسکولوں کے لیے یہاں تک کہ بڑوں کے لیے بھی مشعل راہ ہیں اور ایک عمدہ نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خواہ وہ بیت بازی ہو یا تقریری مقابلہ، ڈرامہ ہو یا رقص و موسیقی کا پروگرام ہر میدان میں جس عمدہ صلاحیت، اعلا معیار اور خوش سلیقگی کا مظاہرہ ہوتا ہے وہ انتہائی حوصلہ افزا اور خوش کن ہوتا ہے۔

ادھر کچھ دنوں سے تعلیمی میلا بوجوہ موقوف تھا۔ جامعہ کی زندگی بے جان اور بے کیف سی ہو کر رہ گئی تھی، لیکن اس سال پھر سے اس روایت کو زندہ کیا گیا۔ اس کا سہرا بھی مدرسوں کے سر ہے۔ گو پہلے کی طرح پروگرام اتنے وسیع پیمانے پر منعقد نہیں ہوئے لیکن پھر بھی جامعہ کی ثقافتی تشنگی کے لیے یہ دو چار بوندیں یا ہلکی سی پھوار غنیمت ثابت ہوتی۔ جمود ٹوٹا۔ بے جان سے جسم میں کچھ حرکت پیدا ہوئی اور یہ محسوس ہوا کہ اس "ویرانے" میں ایک بار پھر بہار آگئی۔ میں بھی مدتوں کے پیاسے کی طرح ٹوٹ پڑا۔ مدرسہ ثانوی کے زیر اہتمام تقریر، بیت بازی اور نظم خوانی کے مقابلوں اور تمثیلی مشاعرہ وغیرہ سبھی پروگراموں میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ دل میں ایک بار گمان گزرا کہ ان جلسوں میں اب وہ پہلا معیار کہاں سے دیکھنے کو ملے گا لیکن میری حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے ان تمام پروگراموں میں جامعہ کی دیرینہ روایات کو زندہ و تابندہ دیکھا۔ طلبہ میں وہی اعتماد، وہی سلیقہ، وہی صلاحیت، وہی لگن اور تن دہی اور وہی ذوق و شوق پایا۔ ہر جلسے کے انتظام میں وہی مخصوص جامعی سلیقہ تھا۔ نظم خوانی اور بیت بازی میں سنجیدہ اور معیاری اشعار کے انتخاب اور ان پر اثر اور پر وقار ادائگی نے پرانی یادیں تازہ کر دیں۔ اردو زبان تو بہرحال جامعہ کی اپنی زبان ہے لیکن انگریزی میں تقریری

مقابلہ بھی اتنا ہی حوصلہ افزا تھا۔ ہمارے طلبہ کی کوششیں بھی انگریزی اسکولوں کے طالب علموں سے کسی صورت کم تر نہ تھیں۔ اپنے طلبہ کو انگریزی میں اعتماد کے ساتھ تقریر کرتے دیکھ کر دل بلیوں اچھل گیا۔ تمثیلی مشاعرہ بھی بہت کامیاب رہا اور تمثیل کا حق ادا کر دیا۔
قابل مبارکباد و لائق ستایش ہیں ایسے ہونہار اور باصلاحیت طلبہ اور ان کے اساتذہ جنھوں نے ہمارے دلوں سے مایوسی کو دھو ڈالا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سرگرمیاں جامعہ کی دیرینہ روایات کے مطابق اسی ذوق و شوق اور ولولے کے ساتھ جاری رہیں گی۔

نذیرالدین مینائیؔ
جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی ۲۵

☼

جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا جاتا ہے، ذہنی ترقی کی رفتار بھی تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں کی طرح تعلیمی معاشرے میں زوال کا سبب یہ نہیں کہ اب طلبہ ذہین نہیں ہوتے۔ اصل میں خرابی ہمارے رویوں اور اسالیب فکر میں پیدا ہوئی ہے۔ تربیت اور اخلاقیات کے ایک مربوط تصور سے عاری تعلیم صرف کاروباری شخصیت بنا سکتی ہے۔ جامعہ کا تعلیمی میلا مجھے اسی لیے اچھا لگا تھا کہ اس کے مقاصد ہمہ گیر تھے، تفریح بھی اور اسی کے ساتھ ساتھ ذہنی ورزش بھی۔ طلبہ کے کم و بیش تمام مقابلے معیاری بھی تھے اور ان کی شخصیت کا اظہار بھی ان مقابلوں میں جس سطح پر ہوا وہ تعلیم کے یک رخے تصور کا مثبت اور موثر جواب فراہم کرتی ہے۔ تقریری مقابلے میں بس اکا دکا طلبہ اپنے بڑوں کی زبان میں بول رہے تھے۔ بیشتر کی شخصیت اپنے الفاظ و اظہار سے ہم آہنگ دکھائی دیتی تھی اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ آزادانہ غور و فکر کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔
جامعہ کی انفرادیت اسی نوع کی سرگرمیوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ان میں طلبہ صرف کتاب خواں نظر نہیں آتے انھیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اپنی انسانیت کے بقا اور ترویج کی جد و جہد میں مصروف ہیں۔ اس روایت کو قائم رہنا چاہیے۔ طلبہ اور اساتذہ دونوں یکساں طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

شمیم حنفی
جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی

☼

ماہرین تعلیم نے طلبہ کی شخصیت کی نشو و نما میں غیر نصابی سرگرمیوں کی اہمیت پر کافی زور دیا ہے، کیونکہ یہ ان کی فکری قوتوں اور تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے اور انھیں آزادانہ طور پر بروے کار لانے کے قابل بناتی ہیں۔ ان سے طلبہ میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے، نیز مقابلہ و مسابقت کا جوش و ولولہ

انھیں آگے بڑھ کر خود ہاتھ میں مینا اٹھانے کی ترغیب دیتا ہے۔ ان سرگرمیوں کا ایک نہایت اہم پہلو یہ بھی ہے کہ طلبہ اور اساتذہ میں آزادانہ ربط باہم کی فضا پیدا ہوتی ہے اور وہ کلاس کے باہر کے کھلے ماحول میں ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور اس طرح بہتر طور پر ایک دوسرے کو سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ یہ سب باتیں مل کر طلبہ کی ہمہ جہت شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں معاون ہوتی ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اسکولوں کے حالیہ تعلیمی میلے میں غیر نصابی سرگرمیوں کے یہ سارے تعمیری پہلو دیکھنے میں آئے۔ طلبہ کے جوش و خروش کے مظاہرے، ان کی انفرادی صلاحیتوں کے نمونے اور ان کے اساتذہ کی مشفقانہ رہبری کے جلوے قدم قدم پر نظر آرہے تھے اور ان کا یہ امتیازی پہلو تھا کہ ان پر جامعہ کی مخصوص روایات کی چھاپ واضح طور پر دیکھی جا سکتی تھی۔ تمثیلی مشاعرہ اور بچوں کی پارلیمنٹ کی کاروائی مجھے بطور خاص پسند آئی۔ امید ہے کہ یہ روایت، جس کی تجدید خاصے طویل وقفے کے بعد کی گئی ہے، مستقبل میں بھی نہ صرف برابر جاری رہے گی، بلکہ اس کا ہر آیندہ نقش سابقہ نقوش سے بہتر اور زیادہ بامعنی ہوگا۔

حنیف کیفی
جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی ۲۵

☼

جامعہ کی فضا میں بہت دن بعد جب تعلیمی میلے کے لفظ ایک بار پھر گونجے تو مجھے کچھ بچوں جیسی ہی خوشی ہوئی۔ میرے دماغ میں ایک فلم سی گھوم گئی۔ آزادی سے پہلے کے میلے جامعہ کی پچیس سالہ جوبلی کی تقریب پر اب تک کا سب سے بڑا میلا بشرطے کہ میرے بزرگ جوبلی کی تقریب کو 'میلا' کہنے پر ناراض نہ ہوں۔ آزادی کے بعد کے میلے۔ چالیس سالہ جوبلی کا میلا، اور پھر شاید دس بارہ سال کا طویل سنّاٹا، اداسی، اور اب ایک بار پھر میلے کا چرچا۔

شہر کی بھاگ دوڑ، شور شغب سے دور، دریا کے کنارے خاموش فضا میں جامعہ کی ادھوری سی بستی میں، 'تعلیمی میلے' بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ یہ تعلیمی بھی ہوتے، تربیتی بھی اور تفریحی بھی، اور کچھ دن کے لیے یہاں کی خاموش فضا میں ایک ہلچل سی پیدا ہو جاتی۔

۱۹۳۴ء میں جامعہ کے ہی ایک اسکول میں میں پڑھتا تھا جب پہلی بار میں نے اوکھلا میں ہونے والے میلے کا نام سنا۔ آپ اس شوق اور بیتابی کا اندازہ نہیں لگا سکتے جس کے ساتھ ہم نے ۲۹ اکتوبر کے دن گنے ہوں گے اور جب یہ معلوم ہوا کہ چار دن اور چار رات ہمیں وہیں خیموں میں رہنا ہوگا اور بچوں کے ہوٹل میں پکوڑی اور چاٹ بیچنی ہوگی تو ایسا لگا جیسے ہمیں زندگی میں ہی کچھ دن جنت میں رہنے کی خوشخبری سنادی گئی ہے۔ اس زمانے میں ان میلوں کو محمد علی جوہر مرحوم کی یاد میں مقابلوں کا نام دیا جاتا تھا۔ [illegible] کی دکانیں ابتدائی اور ثانوی کی دونوں عمارتوں کے درمیان پھیلی ہوتیں جن پر صرف بچوں کا راج ہوتا۔

پھر آزادی کے بعد کے میلے۔ تعلیمی سال شروع ہوتے ہی ۲۹ اکتوبر کا انتظار شروع ہو جاتا۔ مہینوں

پہلے سے نمایشوں، پروجیکٹوں کی تیاری شروع ہو جاتی اور پھر جیسے ہی اوپن ایر تھیٹر کے اسٹیج پر پہلی رات بلب جلتا تو میلے کی خوشی کی لہر بجلی کے کرنٹ کی طرح پوری جامعہ میں پھیل جاتی۔ پھر آہستہ آہستہ جامعہ کی راتیں بھی دنوں میں بدل جاتیں۔ جامعہ نگر میں رہنے والے خاندان کہا کرتے تھے کہ یہاں کا سب سے بڑا تہوار "میلا" ہوتا ہے۔ عید، بقرعید تو ایک ایک دن کی ہوتی ہیں اور یہ تین دن کا جد صر دیکھیے ڈراموں کی تیاری کا شور، موسیقی اور کلچرل پروگراموں کی ہل چل، مکتبہ جامعہ کی طرف سے اعلا معیار کے ادبی پروگرام۔ "فن اور فنکار" کی تیاری۔ دہلی کے کالج والوں کی کانفرنس اور ان کے لیے ڈرامے کی تیاری اس دعوت میں ایک نیا ہی مزہ پیدا کرتی تھی۔ غرض مہینوں کی تیاری، تین چار دن کا میلا اور ہفتوں کی اداسی، یہی یہاں کی زندگی کا سب سے بڑا ہنگامہ اور سب سے اہم تقریب تھی۔

چالیس سالہ جوبلی کی تقریب کے موقع پر جو میلا ہوا وہ آزادی کے بعد کی جامعہ کی تقریبوں میں شاید سب سے اہم تھا۔ اس کا شور تو کچھ سال بھر سے زیادہ ہی رہا۔ جامعہ کی آبادی بھی اب اتنی بڑی ہو چکی تھی کہ وہ اوپن ایر تھیٹر جس میں بڑے سے بڑا ڈراما یا کوئی جلسہ بھی آسانی سے ہو جاتا تھا اب بالکل گڑیا گھر سا لگنے لگا۔ مدرسہ ابتدائی کے کھیل کے میدان کے ٹیلے کو اسٹیج بنا کر اس کے نیچے کے میدان میں ایک بہت بڑا پنڈال سجایا جانے لگا۔ مگر کچھ ہی سال بعد یہ پھیلاو کچھ ایسے مسئلے پیدا کرنے لگا کہ آخر جامعہ کے بزرگوں کو یہ سوچنا پڑا کہ یہ میلا اب نہ "تعلیمی" رہا نہ "تفریحی"، بلکہ کچھ "تخریبی" ہو گیا ہے۔ چنانچہ اسے بند کر دیا گیا۔

اب اس سال یہ اطلاع سُن کر کہ بچوں کی حکومت نے یوم تاسیس کے موقع پر ایک بار پھر میلا کرنے کی ہمت کی ہے، میرا جی چاہا کہ انھیں اس ہمت و جرأت کے لیے مبارک باد اور شاباشی دوں۔ اس میلے کی تیاری کے زمانے میں میری طبیعت کچھ خراب تھی۔ پھر بھی جب اوپن ایر تھیٹر سے مختلف پروگراموں کی تیاری کی آوازیں رات کے سناٹے میں گونجتیں تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ان باہمت لوگوں کے ساتھ اگر خود کچھ کام نہیں کر سکتا تو کم سے کم انھیں کام کرتے دیکھ ہی لوں۔

بالکل بچوں کی طرح بے چینی سے انتظار کرتے کرتے آخر وہ دن آ ہی گیا جس کا شور ہفتوں سے کانوں میں پڑ رہا تھا۔ میں اور میرے بچے سب اس دن کا انتظار کر رہے تھے۔ فرق یہ تھا کہ انھیں خود بہت سے پروگراموں میں حصہ لینا تھا اور میں اس میلے کے پروگرام دیکھ کر اپنے بچپن کے دنوں کی یاد تازہ کرنا چاہتا تھا۔

جی تو یہی چاہتا تھا کہ اس میلے کے پہلے پروگرام سے آخری پروگرام تک ایک ایک منٹ وہیں گزار دوں، مگر کچھ صحت کی خرابی اور کچھ دوسری مجبوریوں کی وجہ سے میں چند ہی پروگرام دیکھ سکا۔ بہرحال ان پروگراموں سے ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ اس میلے کے لیے خوب تیاری کی گئی ہے۔

یوم تاسیس کے جلسے کا سارا انتظام اسکول کے بچوں نے ہی کیا تھا۔ جی چاہا کہ جلسے کی کامیابی کی مبارک باد ایک ایک بچے کو الگ الگ دوں۔ بچوں کے کہانیوں کے مقابلے میں بار بار جی چاہ رہا تھا کہ اسٹیج پر چلا جاؤں اور انھیں کی زبان اور انھیں کے بھولے بھالے اور بھولے بھولے انداز میں جتنی بھی کہانیاں مجھے یاد ہیں سنانے لگوں۔ بچوں کی بیت بازی کے مقابلے کو سن کر اور دیکھ کر بڑا سکون سا ہوا اور شکر ادا کیا

کہ ابھی ایسے ہونہار بچے جامعہ میں آ رہے ہیں جو ہماری پرانی اور نئی شاعری کی حفاظت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ میں کلچرل پروگرام نہیں دیکھ پایا۔ سنا ہے بہت دلچسپ پروگرام تھا۔ مگر تمثیلی مشاعرہ میں تو برسوں کی یادیں اور خاک میں پنہاں صورتیں آنکھوں میں گھوم گئیں۔ جامعہ میں اس سے پہلے بھی بہت سے تمثیلی مشاعرے ہو چکے ہیں۔ مگر ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اس سے پہلے ایسا کوئی مشاعرہ نہیں دیکھا تھا، جس میں نقلی شاعروں نے اصلی شاعروں کا سا لطف پیدا کر دیا ہو، ضرور حیرتناک بات ہوگی۔ کس کس کی تعریف کی جائے۔ جس شاعر کو پیش کیا گیا ایسا لگا جیسے سچ مچ اسی سے کلام سن رہے ہوں۔ جن لوگوں نے گذشتہ شعرا، جگر، شمیم کرہانی، جانثار اختر، سید محمد جعفری وغیرہ کو سنا ہے اور جنھوں نے موجودہ شعرا سردار جعفری، شاعر نظامی (اور میلے کے زمانہ میں زندہ مگر اب مرحوم) فراق گورکھپوری وغیرہ کو سنا ہے وہ گواہی دیں گے کہ ان کے تمثیلی کرداروں نے اصلی شاعروں کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ جتنی دیر یہ تمثیلی مشاعرہ ہوتا رہا۔ گذشتہ مشاعروں اور اردو کے ان عظیم شاعروں کی یاد تازہ ہوتی رہی۔

اسی کی شام کو میلے کے آخری پروگرام سے پہلے تقسیم انعامات کا جلسہ ہوا جس میں شریک نہ ہو سکنے کا مجھے افسوس ہے۔ اس کا ذکر میں نے اس لیے خاص طور پر کیا کہ اس میں مکتبہ جامعہ نے بچوں اور کچھ بڑوں کی ہمت افزائی کے لیے بہت سے انعامات تقسیم کیے تھے۔ مجھے خود بھی ان لوگوں کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ انھوں نے مجھے بچوں کے لیے لکھنے کے سلسلے میں انعام دیا۔ مگر اس سے اگلا پروگرام، جس میں شریک نہ ہو سکنے کا زیادہ افسوس ہے، وہ ایک ایسا نادر موقع تھا جس میں جامعہ کے بہت پرانے طالب علموں اور موجودہ طالب علموں کی سخن فہمی کا مقابلہ تھا۔ یعنی بیت بازی۔ سنا ہے یہ پروگرام بہت اچھا ہوا۔ جیسا لوگوں نے بتایا اس سے ایک بار پھر یقین ہوا کہ اردو شاعری میں اب بھی اتنی دلچسپی لینے والے لوگ باقی ہیں کہ جو اچھے شعر یاد کرتے ہیں اور انھیں سنتے سناتے رہیں۔

گو کہ میلے کی باقاعدہ کارروائی تو ۳۱ کی شام کو ختم ہو گئی تھی مگر پہلی نومبر کی صبح کو ہائر سکنڈری اسکول کی طرف سے ایک اور بہت اچھا پروگرام ہوا، جو میلے کا ہی ایک حصہ تھا مگر وقت کی کمی کی بنا پر اسے آگے بڑھا دیا گیا تھا۔ یہ تھا تقریری مقابلہ۔ اس میں دہلی اور دہلی سے باہر کے بہت سے اسکولوں نے حصہ لیا۔ اس میں کچھ تقریریں بہت اچھی تھیں۔ اس پروگرام کے خصوصی مہمان اور صدر سردار خوشونت سنگھ صاحب کی صدارتی تقریر اور ہائر سکنڈری کے ایک طالب علم قائم رضوی صاحب کی تعارفی تقریر دونوں بہت اچھی تھیں۔

غرض ہمیشہ کی طرح ہلچل، شور شغب، بڑوں اور بچوں کی بھاگ دوڑ، دلچسپ پروگراموں، نمائشوں، کہانیوں، گیتوں اور طرح طرح کی دلچسپیوں سے بھرا یہ ہفتہ آخر گزر ہی گیا، اور بچے تو بچے بڑے بھی کچھ دن ایسے اداس اداس سے نظر آئے جیسے اب ان کے پاس کرنے کے لیے کچھ بچا ہی نہ ہو۔

میلے کی کامیابی کے لیے سب سے زیادہ مبارک باد تو مڈل اسکول اور ہائر سکنڈری اسکول کے ان بچوں کو دی جائے جنھوں نے اس میلے کو کامیاب بنانے میں کام کیا اور پھر ان استادوں کو جنھوں

نے اِن پروگراموں کی تیاری میں دن رات محنت کی اور انھیں کامیاب بنایا۔
خدا کرے کہ یہ روایت جسے پوری ہمت اور جرأت کے ساتھ اس سال اِن لوگوں نے دوبارہ شروع کیا ہے آنے والے سالوں میں قائم رہے اور اس سے زیادہ کامیابی کے ساتھ تعلیمی میلے ہوتے رہیں۔

غلام حیدر
۴۴۔اے ذاکر نگر
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

☼

۲۹ اکتوبر جامعہ کا یوم تاسیس ہے جسے ہمیشہ جامعہ میں بہت دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ جب ہم ثانوی میں پڑھتے تھے تو ۲۹ اکتوبر کا انتظار ہمیں کس بے چینی سے رہا کرتا تھا۔ اس لیے کہ اسی دن سے جامعہ کا میلا بھی شروع ہوتا تھا جس کی تیاریاں ستمبر بلکہ اگست کے آخر سے ہی شروع ہو جاتیں، مختلف قسم کے پروجیکٹ چلائے جاتے، دہلی میوزیم میں دہلی کی مختلف تاریخی عمارتوں پر مضامین لکھے جاتے اور پھر ان کو پمفلٹ کی شکل میں میوزیم میں رکھ دیا جاتا جس کا ٹائٹل اختر صاحب ڈرائنگ کی کلاس میں بنواتے۔
بیت بازی، بچوں کا مشاعرہ، ڈراما، گاندھی ٹرافی کے مقابلے غرض کہ ایک ڈیڑھ مہینے ثانوی کے استادوں اور طالب علموں کو اپنا ہوش نہ رہتا اور تین دن میلا ہوتا، باہر کے لوگ آتے۔ اکثر پنڈت جواہر لال نہرو بھی آیا کرتے تھے۔ کبھی ذاکر صاحب آتے تو جی بھر کے بچوں کے کاموں کی تعریف کرتے۔ پلک جھپکتے یہ تین دن گزر جاتے۔ مگر ان کی یاد مہینوں رہتی۔ اور پھر ہم لوگ میلے کی تیاری میں لگ جاتے۔
اسکول چھوڑا، کالج کی تعلیم کے لیے علی گڑھ جانا ہوا تو وہاں سے ہم سب طالب علم میلے پر تین چار دن کے لیے میلے میں شریک ہونے ضرور آتے۔ پھر زمانہ بدلا، حالات بدلے۔ جامعہ بھی بدلنے لگی۔ جامعہ کا تعلیمی میلا بھی ختم کر دیا گیا۔ بس اس کی یادیں رہ گئیں۔ مگر اس سال جب یہ سنا کہ جامعہ میں پھر سے میلا شروع ہونے والا ہے تو ایک عجیب طرح کی خوشی کا احساس ہوا۔ جامعہ کی ایک اچھی روایت کو پھر سے زندہ کیا جا رہا ہے حسب سابق یہ میلا مدرسہ ابتدائی، جو اب مڈل اسکول کہلاتا ہے اور مدرسہ ثانوی کے اہتمام میں منایا گیا اور خوشی کی بات یہ ہے کہ ایک لمبے وقفے کے باوجود اس میلے نے پرانے میلوں کی یاد تازہ کر دی۔ ثانوی اور مدرسۂ ابتدائی کے طالب علم تھے اس کے روحِ رواں۔
ثانوی کی طرف سے بیت بازی کا مقابلہ ہوا، گاندھی ٹرافی کے مقابلے اور مباحثے کی روایت کو بھی تازہ کیا گیا جو جامعہ کی ایک اچھی روایت تھی مگر اب یہ ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ثانوی کی طرف سے ایک تمثیلی مشاعرہ بھی ہوا جو بہت دلچسپ مشاعرہ تھا۔ اس میں جامعہ کے موجودہ طالب علموں اور استادوں کے علاوہ پرانے استادوں اور پرانے طالب علموں اور طالبات نے بھی حصہ لیا۔ شکیل اختر فاروقی اور مرتضیٰ حسین نے ہمیشہ کی طرح میک اپ میں اپنا کمال دکھایا تھا اور بعض حضرات نے تو شاعروں کی اتنی اچھی نقلیں اتاریں کہ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ واقعی ہم جگر، فراق، جوش وغیرہ کو سن رہے ہیں۔ اس

کے علاوہ قدیم ترین اور قدیم طلبہ کے مابین جامعہ کی طرف سے ایک بیت بازی کا مقابلہ بھی ہوا جسے جامعہ برادری میں بہت پسند کیا گیا۔ غرض کہ مجموعی حیثیت سے یہ تعلیمی میلا بہت کامیاب رہا۔ مدرسہ ثانوی کے نگراں، استاد اور طلبہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ بچوں نے اپنی محنت، لگن اور خوش ذوقی سے تعلیمی میلے کو کامیاب بنایا۔ خدا کرے یہ روایت جو محترم عبدالحق خاں اور جناب خالد سیف اللہ کی سربراہی میں شیخ الجامعہ محترم انور جمال قدوائی صاحب کی فرمائش پر پھر سے شروع ہوئی ہے جاری رہے اور اگلے سال اس سے زیادہ بڑے پیمانے پر جامعہ کا یوم تاسیس تعلیمی میلے کی شکل میں منایا جائے۔

صغرا مہدی
شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی ۲۵

☼

یادش بخیر مدت کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیمی میلہ کا احیا ہوا جس کا سہرا جامعہ اسکول کے طلبہ و اساتذہ صاحبان کے سر ہے۔ اس جشن تعلیمی میں طلبہ نے تمثیل، نظم خوانی، اردو انگریزی مباحثہ نیز مصوری کے مقابلوں اور نمائش کا اہتمام کیا اور اس جشن میں ان کے اساتذہ کی تربیت و رہنمائی اور خود طلبہ کے شوق، محنت اور خداداد صلاحیتوں کے باعث چار چاند لگ گئے۔ نیز طلبہ ہی نے تمام انتظامی ذمہ داریوں کو اپنے کندھوں پر سنبھالا۔ ان علمی و ثقافتی سرگرمیوں میں نمائش فن و تہذیب کا ایک سنہری موقع تو حاصل ہوا ہی لیکن اس سے زیادہ مفید نتیجہ یہ نکلا کہ طلبہ کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہو کر منظر عام پر آئیں اور خصوصیت سے ذمہ داران جامعہ کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جامعہ کے طلبہ نہ صرف اردو و ہندی میں بہت اچھی تقریر کر سکتے ہیں، بلکہ وہ ہندستان گیر مقابلہ میں انگریزی میں اچھی تقریر اور مباحثہ کر سکتے ہیں، کیونکہ ان مقابلوں میں تمام ہندستان کے طلبہ کو یہ کہہ کر دعوت شرکت دی گئی تھی کہ ع

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

علاوہ ازیں اس طرح کی غیر درسی یعنی ایکسٹرا کریکولر کوشش اور مصروفیات طلبہ کی بشاشت طبع کے علاوہ ان کی ذہنی، جسمانی، تہذیبی و روحانی تربیت کر کے تعلیم کے حقیقی مقصد کی تکمیل کرتی ہیں، نیز طلبہ اور ان کے اساتذہ کے لیے علمی ریگستان میں جمالیاتی نخلستان کی فراہمی کا باعث ہوتی ہیں اور اس طرح ملک اور دنیا کے لیے نوجوان طلبہ میں سے اچھے اور ذمہ دار شہریوں کی تشکیل و تنظیم اور تربیت ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں گرد و نواح کے سماج نیز طلبہ کے سرپرست صاحبان اور احباب کے لیے یہ امر مسرت و اطمینان کا باعث ہوتا ہے کہ نوجوان واقعی کچھ اچھی چیزیں سیکھ رہے ہیں اور قوم کے وسائل اور بچوں کی عمر کا زیاں نہیں ہو رہا ہے۔

میرے دو مایہ ناز شاگرد، عزیز القدر میاں قاسم رضوی اور میاں مدیح الرحمان خواہش مند ہیں کہ میں چند کلمات خیر و دعا لکھوں کیونکہ وہ اس تعلیمی میلے کی سرگرمیوں کو "پیام تعلیم" میں قلم بند کر رہے ہیں۔ میری

دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ انھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دیگر طلبہ کو علم واقبال کی دولت سے نوازے اور صراط مستقیم پر استقامت عطا فرمائے، نیز پیام تعلیم کا یہ شمارہ اپنی تابناک تاریخ کے شایانِ شان ہو اور قارئین کے لیے دلچسپی کے مضامین فراہم کرے اور تمام دنیا میں ہمارے اردو داں نوجوان طلبہ اس خصوصی مجلہ کے مطالعے سے کارہائے نمایاں انجام دینے کا حوصلہ حاصل کریں۔ آمین!

علاوہ ازیں میں اپنے طلبہ کو ہدایت کرتا ہوں کہ انھیں جناب شاہد علی خاں صاحب جنرل منیجر مکتبہ جامعہ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ وہ ان کے علمی کاموں کی سرپرستی کی خاطر اپنے ادارہ کے "پیام تعلیم" کو کلیتہً ان کی قلمی کاوشوں کے لیے وقف کر دیتے ہیں اور اس طرح وہ علم وفن کی بجا طور پر آبیاری کر رہے ہیں۔

نوجوانوں سے ہے ہر پیر وجواں کو امید ان سے ہے عالم ہر وہم وگماں کو امید
نوجواں چاہیں تو دنیا کو بنا دیں فردوس نوجوان ہی سے دلکش ہے جہاں کو امید

محمد احمد دلکش
جامعہ ہائر سکنڈری اسکول
نئی دہلی

☼

پیام تعلیم کا "یوم تاسیس نمبر" اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ جامعہ اسکول کے ذہین طلبہ کی جانفشانی کا مظہر ہے۔ ایک صلاح کار کی حیثیت سے میرے اس اعتراف میں فخر ومسرت کا عنصر غالب ہے کہ ہمارے طلبہ نے اس شمارے کے سارے مضامین اور ترتیب وتزئین کے تمام مراحل طے کرنے کی نہایت کامیاب کوشش کی ہے۔ میری نظر میں اس نمبر کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس میں جو کچھ بھی ہے طلبہ اور طالبات کی جنبش قلم بالخصوص اس کے مرتبین سید غلام محمد قاسم رضوی اور مدیح الرحمٰن صہیب کی ذاتی دلچسپی اور پر خلوص کاوش کا لازمی نتیجہ ہے۔ ان نوجوانوں میں ادبی صلاحیت کا جوہر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ سید غلام محمد قاسم رضوی کم عمری کے باوجود ہدایت گڑھ کے ایک ماہنامہ "کائنات" کے ایڈیٹر ہیں اور اردو دنیا میں عقیل الغروی کے نام سے اپنی پہچان کرانا چاہتے ہیں حال ہی میں طالب علمی کی مصروفیات کے باوصف انھوں نے کائنات کا ایک ضخیم "جمیل مظہری نمبر" اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے دوسرے طالب علم مدیح الرحمٰن صہیب تخلیقی مزاج کے حامل ہیں۔ انھوں نے "تربیتی کلاس" کے مختلف جلسوں میں اپنے افسانے اور انشائیے سنا کر ساتھی طلبہ اور اساتذہ سے خاصی داد وصول کی ہے۔

ہم ان طلبہ سے خوش آئند توقعات وابستہ کرتے ہوئے انھیں یہ بھی یاد دلانا چاہتے ہیں کہ وہ سائنس کے طالب علم ہیں ان کی ادبی سرگرمیاں اتنی نہ بڑھ جائیں کہ بنیادی مضامین پر اثر انداز ہونے کا خدشہ لاحق ہو جائے۔

آخر میں اپنے کرم فرما برادرم شاہد علی خاں صاحب (جنرل منیجر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) کا شکریہ ادا کرنا اپنا خوش گوار فرض سمجھتا ہوں کہ انھوں نے میری درخواست پر پیام تعلیم کا ایک شمارہ یوم تاسیس نمبر کے لیے مخصوص کر کے طلبہ کی حوصلہ افزائی فرمائی اور انھیں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کا موقع فراہم کیا۔ (خالد محمود)

پان کھاکر، طبلہ بجاکر رام ناچا
ایک مزے دار کہانی
جو خاص طور سے چھوٹے بچّوں کے
لیے لکھی گئی ہے
قیمت : ۱/۵۰
پتھر میں جگنوں کیا خاک
نہایت آسان زبان میں
چھوٹے بچّوں کے لیے
ایک کہانی
قیمت : ۱/۵۰
تاک دِنا دن تا کے سے
چھوٹے بچّوں کے لیے
چھوٹے چھوٹے جملوں میں لکھی گئی
مزے دار کہانی
قیمت : ۱/۵۰
پکڑ دُم کٹے کو
ایک گدھے نے شیر کو بھگا دیا۔
بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ چھوٹے
بچّوں کے لیے۔ قیمت ۱/۵۰
پانچ بونے
پانچ کام چور بونوں
کی کہانی چھوٹے بچّوں کے
لیے۔ قیمت : ۱/۵۰
ہپّو جپّو
یہ کہانی بھی چھوٹے بچّوں
کے لیے لکھی گئی ہے، انھیں
کی زبان میں۔ قیمت ۱/۵۰
روٹی کس نے پکائی
چھوٹے بچّوں کے لیے انھی
کی زبان میں ایک دلچسپ
کہانی۔ قیمت : ۲/۵۰
بچّوں کے لیے عبدالواحد سندھی جامعی کی کتابیں
بی پدڑی اور کوا
چھوٹے بچّوں کے لیے
آسان زبان میں لکھی
گئی ایک دلچسپ کہانی
قیمت : ۱/۵۰
چیونٹی رانی
کہانی کی کہانی اور معلومات
کی معلومات۔
قیمت ۱/۵۰
جادو کا گھر
چھوٹے بچّوں کے لیے آسان زبان
میں لکھی گئی ایک مزے دار
کہانی۔ قیمت ۱/۵۰
بچوں کی کہانیاں
ایک کتاب اور
سب کہانیاں
سب مزے دار
قیمت : ۱/۵۰
دہلی
بمبئی
علی گڑھ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
مدورانا پردیس چلے
مگر کیسے چلے؟ اور راستے میں کیا
کیا ہوا، یہ تو پڑھنے
سے ہی پتا چلے گا۔
قیمت :
۱/۵۰

Regd No. D(SE)-043 October, 1982

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دہلی ۲

پیام تعلیم

بچوں کے لیے عبدالواحد سندھی جامعی کی کتابیں
پھر میں چگوں کیا خاک
نہایت آسان زبان میں
چھوٹے بچوں کے لیے
ایک کہانی
قیمت: ۱/۵۰
پان کھاکر، طبلہ بجاکر رام ناچا
ایک مزے دار کہانی
جو خاص طور سے چھوٹے بچوں کے
لیے لکھی گئی ہے
قیمت۔ ۱/۵۰
چھوٹے بچوں کے لیے
مزے دار کہانی
قیمت: ۱/۵۰
ہپو چپو
یہ کہانی بھی چھوٹے بچوں
کے لیے لکھی گئی ہے، انھیں
کی زبان میں۔ قیمت ۱/۵۰
پانچ بونے
پانچ کام چور بونوں
کی کہانی چھوٹے بچوں کے
لیے۔ قیمت: ۱/۵۰
پکڑ دُم کٹے کو
ایک گدھے نے شیر کو بھگا دیا۔
بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ چھوٹے
بچوں کے لیے۔ قیمت ۱/۵۰
جادو کا گھر
چھوٹے بچوں کے لیے آسان زبان
میں لکھی گئی ایک مزے دار
کہانی۔ قیمت ۱/۵۰
چیونٹی رانی
کہانی کی کہانی اور معلومات
کی معلومات۔
قیمت ۱/۵۰
بی بندری اور کوا
چھوٹے بچوں کے لیے
آسان زبان میں لکھی
گئی ایک دلچسپ کہانی
قیمت: ۱/۵۰
بچوں کی کہانیاں
ایک کتاب اور
کہانیاں سبھی سب
کی سب مزے دار
قیمت: ۱/۵۰
مدو رانا پردیس چلے
مگر کیسے چلے؟ اور راستے میں کیا
کیا ہوا، یہ تو پڑھنے
سے ہی پتا چلے گا۔
قیمت:
۱/۵۰
دہلی ۶
بمبئی ۳
علی گڑھ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دلی

نومبر ۱۹۸۲ء جلد ۱۹ شمارہ ۱۱

ایڈیٹر۔ ولی شاہجہانپوری

فی پرچہ ڈیڑھ روپے

سالانہ ۱۵ روپے

غیر ممالک سے ۶۵ روپے

کہیے اکتوبر یومِ تاسیس نمبر پسند آیا؟

جامعہ ملیہ کا یوم تاسیس ہر سال اکتوبر کی اسیویں تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ اس مرتبہ بھی یہ تقریب ۲۹ اکتوبر کو منائی جائے گی۔

اکتوبر کے شمارے میں ۱۹۸۱ء کے یوم تاسیس اور تعلیمی میلے کی وہ کارروائیاں ہیں جن کا ایک حصہ جنوری اور فروری میں جامعہ مڈل اسکول کے طلبہ نے ترتیب دیا تھا۔ اس شمارے کے مرتب مدرسہ ثانوی کے طلبہ ہیں۔ انھوں نے ان سرگرمیوں کی تفصیلات پیش کی ہیں جس کا تعلق ہائر سکنڈری اسکول کے طلبہ سے تھا۔ مڈل اسکول کی طرح مدرسہ ثانوی کے پروگرام بھی بہت دلچسپ تھے۔ امید کہ آپ نے پسند کیے ہوں گے۔

لیجیے، نومبر کا شمارہ حاضر ہے۔ اس مہینے نویں ایشیائی کھیل دہلی میں منعقد ہو رہے ہیں۔ اس پر ارشد صاحب کا معلوماتی مضمون پڑھیے۔ اگست میں اسی سے متعلق اس کا دلچسپ مضمون "میں کون ہوں" دلچسپی سے پڑھا گیا تھا۔ مدیرہ خاتون عثمانی نے "چھوٹی سی کہانی" بڑی آسان زبان میں لکھی ہے۔ نئے لکھنے والوں کو اسی قسم کی زبان میں کہانی یا مضمون لکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر معز اللہ فاروقی نے آنکھوں کی حفاظت سے متعلق مفید مضمون لکھا ہے۔ ابراہیم فکری صاحب نے عربی کی ایک کہانی کا ترجمہ کیا ہے۔ نظموں میں محبوب راہی اور عزیز مراد آبادی صاحبان کی نظمیں بھی دلچسپ ہیں۔ آپ بھی اپنی رائے لکھیے۔

پرنٹر و پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹوڈی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔
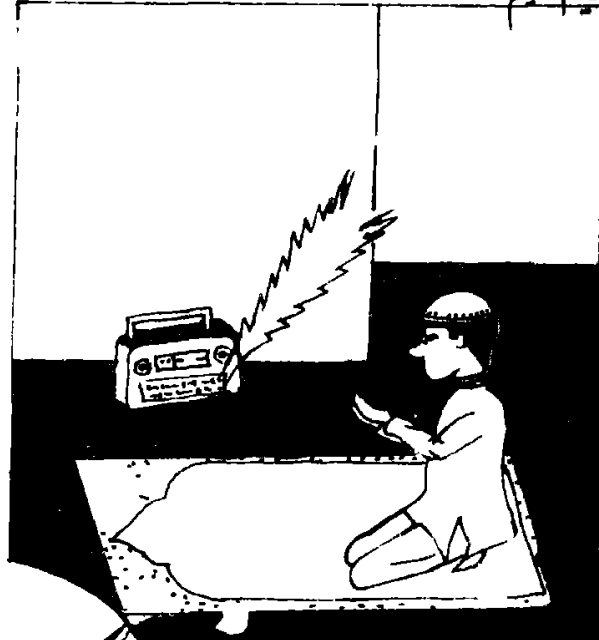
کمنٹری پر تصاویر
جاوید سہیل حشمی
"جناب، ابتک کتنے رن بنے ہیں؟"
تین وکٹ پر تیرے رن!
جناب، کیا وقت ہو رہا ہے

توتے، مینا اور کبوتر — ہاتھی، گھوڑے، شیر اور بندر
چابی بھر دینے سے فوراً — چلنے لگتے ہیں یہ فر فر...!
مور پروں سے کرتا سایا
بچو! کھلونے والا آیا

دیکھو، فوجی چوکس کتنا! — خاکی وردی میں ہے جچتا
دیش کی سرحد پر یہ ڈٹ کر — دشمن کو ہے مار بھگاتا!
طاقت ور ہے اس کی کایا
بچو! کھلونے والا آیا
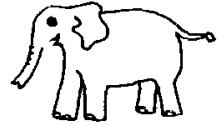
دیکھو، یہ ہے گھاٹ یہ دھوبی — مت سمجھو تم اس کو درزی
روزانہ کپڑے دھوتا ہے — تب ملتی ہے اس کو روٹی
محنت ہے بس اس کی مایا!
بچو! کھلونے والا آیا!

کھیل رہے ہیں یہ کچھ بچے — پڑھنے میں بھی یہ ہیں اچھے!
مل جل کر سب کھیل رہے ہیں — دوست ہیں اک دوجے کے سچے
یہ کیا جانیں "اپنا پرایا"
بچو! کھلونے والا آیا

جلدی جلدی آؤ، بچو! — پیسے ویسے لاؤ بچو!
من چاہے لے جاؤ کھلونے — گھر کو خوب سجاؤ بچو!
دیوالی کا موقع آیا
بچو! کھلونے والا آیا

قاضیان، بسی کرت پور، بجنور

(برما کی کہانی)

مناظر صدیقی

برما کے ایک پہاڑ سیگو یوما کے دامن میں ایک چھوٹا سا گانوٗ آباد تھا۔ اس گانوٗ میں ایک لڑکی ماماگیل رہتی تھی۔ یہ گانوٗ چونکہ رنگون شہر سے بہت دور تھا، اس لیے ماماگیل کو رنگون کی سڑکوں پر دوڑتی ہوئی نئی نئی چمکدار کاروں، رنگون سے چلنے والی ریل اور وہاں کے خوب صورت بازاروں کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ البتہ وہ جنگلی پھلوں پھولوں، بانسوں، جڑی بوٹیوں اور جانوروں کے متعلق بہت کچھ جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ کون سے مرض کے لیے کون سی جڑی بوٹی استعمال کی جاتی ہے۔ اُسے جنگل کی ہر چیز کے متعلق معمولی سے معمولی بات بھی معلوم تھی۔ ماماگیل کی زندگی بڑی ہنسی خوشی گزر رہی تھی۔ اب وہ سولہ سال کی ہو چکی تھی۔ گانوٗ کے ہر آدمی سے محبت کرتی تھی۔ بڑوں کی عزت کرتی تھی اور چھوٹوں سے پیار۔ اسی لیے گانوٗ کے آدمی بھی ماماگیل سے بڑی محبت کرتے تھے۔

ایک روز ماماگیل اپنے مکان میں سو رہی تھی۔ اس کا مکان بڑے بڑے شہتیروں اور موٹے موٹے بانسوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ اچانک اس کی آنکھ کھُل گئی۔ اُس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو باہر گہرا اندھیرا تھا۔ مکان کی دیواریں اُسے ہلتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ دیواریں تو بانسوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھیں اس لیے ان کی درزوں میں سے تیز ہوا اندر آ رہی تھی۔ اب ماماگیل نے غور کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ اس کا پلنگ بھی ہل رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ زلزلے کے آثار ہیں۔ زلزلے کے ساتھ ہی طوفان بھی آ رہا ہے۔

وہ پلنگ سے اُتر کر اپنے باپ کو جگانے کے لیے دوڑی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے والدین کے کمرے تک پہنچتی اُس نے ایسی آوازیں سنیں جیسے بہت سی شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں، اسی کے ساتھ کچھ ایسی آوازیں بھی سنائی دیں جیسے کئی ہاتھی بانس کے جنگلوں میں گھس گئے ہوں اور ان کی وجہ سے بہت سے بانس ایک ساتھ کڑکڑا کر ٹوٹے ہوں پھر جیسے ہی اس نے دوسرے کمرے کے دروازے میں قدم رکھا پورا مکان ہلنے لگا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کسی جھولے میں کھڑی ہو۔ اُس نے گھبرا کر چوکھٹ پکڑ لی۔ اس کے باوجود وہ زمین پر گر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دیکھا کہ کمرے کے ایک طرف کی دیوار گر پڑی۔ ساتھ ہی چھت بھی نیچے آ رہی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ماں باپ اس چھت کے نیچے دب گئے۔ یہ حالت دیکھ کر ماماگیل کی چیخ نکل گئی۔ ابھی وہ یہ سمجھ بھی نہ پائی تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے کہ اچانک اس کے چہرے پر پانی کی بوندیں گرنے لگیں اور ہوا کا ایک تیز جھونکا اُس کے بدن سے ٹکرایا۔ یہ جھونکا اتنا تیز تھا کہ وہ ایک طرف لڑھک گئی۔ ہوا اور پانی اتنے تیز تھے کہ اس سے سانس بھی نہیں لی جا رہی تھی۔ اُسی وقت کوئی وزنی چیز اس سے ٹکراتی ہوئی کسی اور طرف لڑھک گئی۔ یہ چوٹ اتنی سخت تھی کہ ماماگیل بے ہوش ہو گئی۔

صبح جب ماماگیل کی آنکھ کھُلی تو طوفان تھم چکا تھا، ہر طرف

معرفت نونہال کراچی (پاکستان)

تیز دھوپ چمک رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف گانو کے مکانات کا ملبا پڑا ہوا تھا۔ اُس کے ماں باپ سمیت گانو کے تمام آدمی اس زلزلے اور طوفان سے مر چکے تھے۔ پورے گانو میں سے صرف وہی اکیلی زندہ بچی تھی۔ یہ ساری تباہی دیکھ کر ماماگیل رونے لگی۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ اب کوئی شیر یا کوئی درندہ اُسے کھا بھی جائے گا۔

ماماگیل کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب وہ کیا کرے، کہاں جائے! ٹھیک اسی وقت اُس نے دیکھا کہ جنگل سے ایک ہاتھی نکل کر اس کی طرف آرہا ہے۔ ماماگیل اسے پہچان گئی۔ یہ اونگھتا ہاتھی تھا جو جنگل سے کٹے ہوئے درختوں کے بڑے بڑے لٹھے دریا تک پہنچاتا تھا۔ اونگھتا اُس کا دوست بھی تھا۔ بہت دنوں پہلے اس نے اونگھتا کے ایک زخمی پیر کی مرہم پٹی کی تھی۔ اسی وقت سے اس کی اونگھتا سے دوستی ہو گئی تھی۔ اونگھتا کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اب اس کی جان بچ جائے گی۔ وہ کھڑے ہو کر اونگھتا کو آوازیں دینے لگی۔ اونگھتا نے اس کی آواز سن لی۔ اور سیدھا ماماگیل کے پاس آگیا۔ پھر اس نے ماماگیل کو اپنی سونڈ میں لپیٹ کر اپنی گردن پر بٹھا لیا۔ اب ماماگیل نے ہاتھی سے کہا کہ اسے جنگل میں بڑے بڑے درخت کاٹنے والوں کے کیمپ میں پہنچا دے۔ اونگھتا نے دوست کا کہنا مانا۔ لیکن وہ جب اس کیمپ کے پاس پہنچے تو ماماگیل کو یہ دیکھ کر اور زیادہ افسوس ہوا کہ یہ کیمپ بھی اس کے گانو کی طرح ویران ہو چکا ہے۔ اب تو ماماگیل اور زیادہ پریشان ہوئی۔ وہ اتنی پریشان تھی کہ ہاتھی کی گردن پر بیٹھے بیٹھے ہی ایک مرتبہ پھر بے ہوش ہو گئی۔ پھر جب وہ گرنے لگی تو ہاتھی اونگھتا نے اسے دوبارہ اپنی سونڈ میں لپیٹ لیا اور اسے سنبھالے ہوئے ایک مرتبہ پھر جنگل میں گھس گیا۔ دوپہر کے قریب ہاتھی ماماگیل کو لے کر جنگل کے نگراں اُوڈٹاؤ کے جھونپڑے کے سامنے پہنچ گیا۔ جھونپڑے کے سامنے اس نے ماماگیل کو آہستہ سے زمین پر لٹا دیا۔ پھر وہ بڑے زور سے چنگھاڑا تاکہ اوڈٹاؤ باہر نکل آئے۔ اس وقت اوڈٹاؤ شاید گھر پر نہیں تھا۔ اس لیے ہاتھی کی چنگھاڑ سن کر اُوڈٹاؤ کی بیوی مافاؤ باہر نکلی۔ اس نے جو ایک لڑکی کو زمین پر پڑے اور ہاتھی کو اُس کے سامنے کھڑے دیکھا تو وہ بہت ڈر گئی۔ پہلے تو وہ یہ سمجھی کہ شاید اونگھتا مست ہو گیا ہے اور اس نے اس لڑکی کو

مار دیا ہے لیکن جب اُس نے غور کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ لڑکی مری نہیں بلکہ صرف بے ہوش ہے۔ اسی وقت اوڈٹاؤ بھی واپس آگیا۔ اوڈٹاؤ اور مافاؤ مل کر ماماگیل کو اپنے جھونپڑے کے اندر لے گئے۔ پھر جب ماماگیل کو ہوش آیا تو اس نے اپنے گانو کی تباہی کی ساری کہانی سنا دی۔

اوڈٹاؤ اور اس کی بیوی مافاؤ دونوں ہی بڑے نیک تھے۔ انھوں نے ماماگیل کو اپنی بیٹی بنا لیا۔ اب ماماگیل ان کے ساتھ رہنے لگی۔ اُس نے مافاؤ کو جنگلی جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے کے طریقے بھی سکھائے اور جنگل کے تمام پھلوں اور درختوں کے متعلق بھی بتایا۔ ادھر مافاؤ نے ماماگیل کو لکھنا پڑھنا سکھایا اور اُسے عمدہ عمدہ کھانے پکانے اور اچھے اچھے کپڑے سینے سکھا دیے۔ اس کے علاوہ مافاؤ نے ماماگیل کو اور بھی بہت سی ایسی باتیں سکھائیں جو اچھی لڑکیوں کے لیے بہت ضروری ہوتی ہیں۔ پھر دو تین سال کے بعد اُوڈٹاؤ نے اپنی منھ بولی بیٹی ماماگیل کی شادی ایک امیر آدمی اوپوٹا سے کر دی۔

اوپوٹا کے پاس دھان کے کئی کھیت تھے۔ وہ تھا تو جوان آدمی لیکن اس کے پاس دولت بہت زیادہ تھی اس لیے وہ کاہل بھی ہوگیا تھا۔ کسان کھیتوں میں کام کرتے اور اوپوٹا دن بھر گھر میں آرام کرتا رہتا یا اپنے دوستوں کو جمع کرکے ان کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت گزارتا۔ جب فصلیں کٹ جاتیں اور کھیتوں پر کوئی کام نہیں رہتا اور کسانوں سے پیسے بھی وصول ہوجاتے تو وہ تفریح کے لیے نکل جاتا اور کئی شہروں میں گھوم پھر کر جی بہلاتا۔ وہ سفر پر جاتا تو ماماگیل کو اپنے ساتھ نہیں لے جاتا تھا۔ بے چاری ماماگیل گھر ہی پر رہتی۔ اوپوٹا کی واپسی کے بعد ماماگیل کا صرف یہ کام رہ جاتا کہ دن بھر بیٹھی اوپوٹا کو پنکھا جھلتی رہے اور اسے چائے بنا بنا کر پلاتی رہے۔ اوپوٹا جب گھر پر ہوتا تو اپنا پلنگ برآمدے میں بچھا لیتا۔ اس کا ایک کھیت مکان سے ملا ہوا تھا۔ اس میں اس نے چڑیوں کو ڈرانے کے لیے کچھ بے ڈھنگے پتلے بنا کر کھڑے کر دیے تھے اور ان میں گھنٹیاں باندھ دی تھیں۔ اس کا کام اتنا تھا کہ سوتے سوتے جب کبھی آنکھ کھلتی وہ ان میں سے کوئی ڈور پکڑ کر ہلا دیتا۔ اس طرح کھیت میں کھڑے ہوئے کسی پتلے کی گھنٹی بجنے لگتی۔

ماماگیل نے اوپوٹا کی اتنی خدمت کی کہ رفتہ رفتہ اس نے کھیتوں کا بہت سا کام بھی ماماگیل کے سپرد کر دیا۔ اب وہی کسانوں اور ملازموں سے پیسے وصول کرنے لگی۔ ماماگیل بہت عقل مند تھی اُسے معلوم تھا کہ اوپوٹا کو جتنے پیسے ملتے ہیں وہ سب خرچ کر دیتا ہے۔ اب اس نے دھیرے دھیرے کچھ پیسے بچانے شروع کر دیے کیوں کہ اب اسے اللہ نے دو بھولے بھالے بچے بھی دے دیے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ ان بچوں کی تعلیم کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوگی کیوں کہ علم بھی وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جن کے پاس بہت سی دولت ہو۔ اوپوٹا جب بھی اس سے پیسوں کے متعلق پوچھتا کہ کھیتوں سے کتنی آمدنی ہوئی ہے تو وہ کچھ پیسے کم ہی بتاتی۔ اوپوٹا کو پیسوں کی زیادہ فکر بھی نہیں تھی کیوں کہ ماماگیل جتنے روپے بتاتی وہی اس کے خرچ کے لیے کافی ہوتے۔

ماماگیل کے دن اسی طرح کٹ رہے تھے۔ اب تو کھیتوں کی نگرانی اور ملازموں سے کام لینے کی تمام ذمہ داری ماماگیل ہی کے ذمے تھی۔ اوپوٹا تو اب پہلے کے مقابلے میں اور زیادہ کاہل ہوگیا تھا۔ ایک دن اوپوٹا ہمیشہ کی طرح برآمدے میں پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ ماماگیل نے سوچا کہ چلو اتنی دیر میں ذرا قریب کے کھیت میں جا کر دیکھ آئے کہ لوگ ٹھیک طرح سے کام کر رہے ہیں یا نہیں۔ یہ سوچ کر وہ کھیت کی طرف چلی گئی۔ اسی وقت اوپوٹا کی آنکھ کھلی۔ اس نے اپنی عادت کے مطابق برآمدے کے ستون میں بندھی ہوئی رسی کھینچنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تاکہ رسی کھینچ کر کھیت میں کھڑے ہوئے کسی پتلے کی گھنٹی بجا دے۔ اوپوٹا نیند میں تو تھا ہی آنکھیں کھولے بغیر اس نے رسی پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس وقت نہ جانے کہاں سے ایک سخت زہریلا سانپ ان رسیوں کے پاس آگیا تھا۔ اوپوٹا نے ہاتھ بڑھایا تو رسی کے بجائے اس کا ہاتھ اس سانپ پر پڑ گیا۔ سانپ نے اسے کاٹ لیا۔ اب ماماگیل جب واپس پہنچی تو اوپوٹا ایک ایسے سفر پر روانہ ہو چکا تھا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

اوپوٹا کے مرنے کے بعد ماماگیل قریب کے شہر میں منتقل ہوگئی جہاں سے وہ مہینے دو مہینے کے بعد کھیتوں کی نگرانی کے لیے آسکتی تھی۔ اس شہر میں اس نے بچوں کو اسکول میں داخل کرا دیا۔ جمع شدہ رقم اس نے مختلف تجارتوں میں لگا دی جس سے اُسے منافع ملنے لگا تھا۔ اس نے منافع کی رقم اپنے پاس جمع رکھنے کے بجائے ضرورت مندوں اور غریبوں کی خدمت میں خرچ کرنا شروع کر دیا۔ اس لیے اس شہر کے لوگ اس سے بہت محبت کرنے لگے۔ جب شہر کی بلدیہ کے انتخابات ہوئے تو لوگوں نے اُسے مجبور کیا کہ وہ بھی اس میں حصہ لے۔ اس طرح وہ بلدیہ کی رکن بھی بن گئی۔ اب اس کے بچے بھی بڑے ہوگئے تھے۔ اس نے اپنے بچوں کو پڑھنے کے لیے رنگون بھیج دیا جو برما کا دارالحکومت تھا۔ اس کے چھوٹے بیٹے ماؤتھا نے جب اپنی تعلیم مکمل کر لی تو وہ بھی اپنی ماں ماماگیل کی طرح غریبوں کی خدمت اور شہریوں کی بھلائی کے کام میں لگ گیا اور کچھ دنوں بعد پارلیمنٹ کا رکن بن گیا۔ ان دونوں نے اپنے وطن کی اتنی خدمت کی کہ ان کے شہر کے لوگوں نے ان کے کئی مجسمے بنوا کر سڑکوں پر لگوائے۔ کہتے ہیں کہ برما کے لوگ اب بھی ماماگیل اور ماؤتھا کو یاد کرتے ہیں۔

(بہ شکریہ نونہال کراچی)

نواں ایشیائی کھیل

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

دہلی کی مشہور عمارتوں میں ایک سولہویں صدی کا تعمیر کردہ "جنتر منتر" بھی ہے۔ یہی جنتر منتر نومبر ۱۹۸۲ء میں منعقد ہونے والے ایشیائی کھیلوں کا نشان ہے۔ لیکن یہ ایشیائی کھیل ہیں کیا؟

یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ خشکی کے بڑے بڑے حصے برّاعظم کہلاتے ہیں اور ہماری دنیا میں کل چھ برّاعظم ہیں جن میں سے سب سے بڑا اور پرانا براعظم ایشیا ہے۔ ہندستان، پاکستان، چین، جاپان، فلپائن، ایران، عراق اور برما وغیرہ ممالک اسی براعظم میں ہیں۔ لیکن مختلف قدرتی وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود یہ ممالک کھیل کود کے میدان میں بہت پیچھے رہے ہیں۔ اسی کمی کو دور کرنے اور ان ملکوں میں کھیل کا معیار بلند کرنے کے لیے ۱۹۵۱ء سے ہر چار سال پر کسی ایک ایشیائی ملک میں کھیلوں کے ایسے مقابلے کروائے جا رہے ہیں جس میں صرف ایشیائی ممالک ہی حصے لیتے ہیں۔ ان ہی کھیلوں کو ایشین گیمز یا ایشیائی کھیل کہتے ہیں۔ یہ مقابلے اولمپک کھیلوں کے انداز میں منعقد کیے جاتے ہیں۔ مقابلوں میں ٹریک، فیلڈ اور سوئمنگ کے علاوہ دیگر کھیل میزبان ملک کی مرضی سے شامل کیے جاتے ہیں۔ لیکن ہر کھیل میں کم از کم چار ملکوں کا حصہ لینا ضروری ہے۔

ایشیائی کھیلوں کی ابتدا ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔ ۱۳ فروری ۱۹۴۹ء کو ہندستان، پاکستان، فلپائن، افغانستان اور برما کے نمائندوں کی ایک میٹنگ دہلی میں ہوئی جس میں ایشین گیمز فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا اور ہر چار سال بعد ایشیائی کھیل منعقد کرانے کا فیصلہ کیا گیا۔

(اندرپرستھ میں بنایا گیا ایئرکنڈیشنڈ ان ڈور اسٹیڈیم جو ایشیا میں سب سے بڑا ان ڈور اسٹیڈیم ہے۔)

فلاورہ کالج - باغ پالو - پٹنہ

پہلی بار ایشیائی گیمز ۴ مارچ سے ۱۱ مارچ ۱۹۵۱ء تک نئی دہلی میں منعقد ہوئے جن میں گیارہ ایشیائی ملکوں کے کل پانچ سو کھلاڑیوں اور عہدہ داروں نے حصہ لیا۔ اس موقع پر کل

(لودی روڈ پر بنا جواہر لال نہرو اسٹیڈیم جو ستر ایکڑ میں واقع ہے۔)

چھ کھیلوں کے مقابلے ہوئے۔ دہلی میں انڈیا گیٹ کے قریب واقع نیشنل اسٹیڈیم آج بھی ان کھیلوں کی یاد دلاتا ہے۔ دوسرے ایشیائی کھیلوں کی میزبانی ۱۹۵۴ء میں فلپائن نے کی۔ اس کے بعد جاپان، انڈونیشیا اور تھائی لینڈ وغیرہ میں یہ کھیل منعقد ہوتے رہے۔ نویں ایشیائی گیمز ایک بار پھر دہلی میں منعقد ہو رہے ہیں اور اپنے ملک کے مختلف حصوں سے آنے والے شائقین کے علاوہ دور دور کے ملکوں سے آنے والے مہمانوں کا استقبال کرنے کے لیے دہلی کو دلہن کی طرح سجایا جا رہا ہے۔

دہلی کی زیادہ تر اہم شاہراہوں کو چوڑا کیا جا چکا ہے اور باقی کو وسیع کرنے کا کام تکمیل کے قریب ہے۔ سڑکوں پر ٹریفک کا ہجوم کم کرنے کے لیے مختلف مقامات پر سات فلائی اوور تعمیر کیے گئے ہیں۔

قطب مینار سے تقریباً پانچ کلومیٹر دور تاریخی سیری قلعہ کے پاس ایک ”ایشیائی کھیل گاؤں“ بھی بسایا گیا ہے جس میں تقریباً پانچ ہزار ڈیلی گیٹوں کو ٹھہرانے کا نظم ہے۔ سڑکوں پر روشنی کا بہترین انتظام کر دیا گیا ہے اور سیاحوں کے ٹھہرنے کے لیے تین نئے فائیو اسٹار ہوٹلوں کے علاوہ ایک یوتھ ہوسٹل کی تعمیر بھی مکمل ہو چکی ہے۔
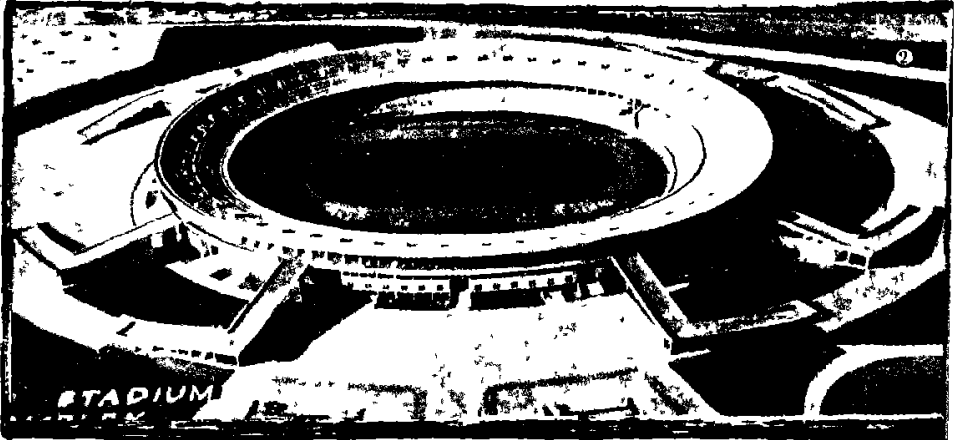
ان کھیلوں کے لیے دہلی کے مختلف مقامات پر کل ستّرہ اسٹیڈیم درست کیے گئے ہیں جن میں سے ایک ”آؤٹ ڈور“ اور ایک ”ان ڈور اسٹیڈیم“ خاص طور پر نویں ایشیائی کھیلوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ اندر پرستھ کا ایرکنڈیشنڈ ”ان ڈور اسٹیڈیم“ ایشیا کا سب سے بڑا اور دنیا کا چوتھا سب سے بڑا اسٹیڈیم ہے۔ جس میں تقریباً ۲۵ ہزار آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ اس میں ٹینس، ٹیبل ٹینس، ہینڈ بال، باسکٹ بال، بیڈمنٹن، کشتی اور باکسنگ کے مقابلے منعقد ہوں گے لودی روڈ پر بنائے گئے دو منزلہ جواہر لال نہرو اسٹیڈیم میں پچھتر ہزار لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے مگر اس کے دروازے اس انداز سے بنائے گئے ہیں کہ سات

تال کٹورہ سوئمنگ پول — تعمیر کا خوبصورت نمونہ

منٹ کے اندر پورا اسٹیڈیم خالی ہو جائے گا۔ اس میں فٹ بال اور اتھلیٹکس وغیرہ کے مقابلے ہوں گے۔

۱۹ نومبر سے ۴ دسمبر ۸۲ء تک ہونے والے اس نویں ایشیائی کھیل میں کل اکیس (۲۱) کھیلوں میں مقابلے ہوں گے۔ جن میں سے انیس (۱۹) کھیل دہلی میں، ایک بمبئی میں اور ایک جے پور میں ہونے کی امید ہے۔ اس بار کھیلوں کی تعداد اب تک منعقد ہونے والے تمام مقابلوں سے زیادہ ہے اور چار کھیل یعنی گھوڑ سواری، کشتی رانی، گولف اور ہینڈ بال تو ان کھیلوں کی تاریخ میں پہلی بار شریک ہو رہے ہیں۔

ہندستان اور پاکستان کے کھلاڑی ایشیائی کھیلوں میں نمایاں مقام حاصل کرتے رہے ہیں۔ ہاکی کے کھیل میں تو ان دونوں کی مہارت پوری دنیا میں مشہور ہے۔ پچھلے ایشیائی کھیل میں ہندستان نے کل ۱۴ طلائی تمغے جیتے تھے جن میں سے چھیالیس صرف اتھلیٹکس میں ملے تھے۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے نوجوان ہندستانی کھلاڑیوں کی اس اعلا روایت کو قائم رکھنے کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ اپنے فرصت کے وقت میں سے تھوڑا سا وقت بھی اگر ہم کھیلوں پر صرف کریں تو اس سے نہ صرف ہماری تندرستی قائم رہے گی بلکہ ملک میں کھیل کا معیار بھی بڑھے گا۔ آخر گولڈ میڈل حاصل کرنے والے یہ بڑے بڑے کھلاڑی بھی بچپن میں بچوں ہی جیسے تھے۔ ●

مینا رانی کی شادی

محبوب راہی

کوّوں نے کی جا کے منادی
مینا رانی کی ہے شادی
چڑیاں ساری ہنستی گاتی
جنگل سے سب آئے براتی
مینڈک بینڈ بجاتا آیا
کوئل نے اک راگ سنایا
بندر آئے ڈھول بجاتے
بھالو آئے ناچ دکھاتے
جھوم کے ناچے مور چھما چھم
خوب مچایا شور چھما چھم
لے کر چوہا ہلدی آیا
دوڑ کے جلدی جلدی آیا
منڈپ سورج کی کرنوں کا
جس میں رقص ہوا ہرنوں کا
شیر ببر نے عقد پڑھایا
فاختہ بی نے سہرا گایا
لومڑی اور بلی خالہ نے
سناٹے میں کھانے چنوائے
پہلے سب نے کھانا کھایا
پھر مل جل کر گانا گایا
گونج اٹھا سب جنگل راہی
جنگل میں منگل تھا راہی

متصل گلزاری مسجد، بارسی تاکلی، اکولہ - مہاراشٹر

حکیم محمد سعید

طب کی روشنی میں

تربوز اور امرود

س: کھانا کھانے کے بعد فوراً تربوز کھانا، اور امرود کھانے کے بعد پانی پینا کیوں مضر ہے؟

سیّد وسیم علی سیّد باقر حسین

ج: ہر انسان کا مزاج الگ ہوتا ہے۔ ہر قوم کی روایت جدا ہوتی ہے، ہندپاک میں تربوز کھانے کے بعد کھانا مضر خیال کیا جاتا ہے۔ مگر عرب میں کھانے کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ مصر میں، ایک دعوت میں میں نے کھانے کے بعد تربوز کھا لیا۔ مجھے تکلیف ہوئی مگر دوسروں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس قسم کے معاملات میں ہر ایک کو اپنے مزاج کے مطابق فیصلہ کر لینا چاہیے۔ امرود کھانے کے بعد پانی پینے میں بہ ظاہر کوئی نقصان نہیں ہے۔

سینے میں درد

س: سینے کو دبانے سے سخت درد ہوتا ہے۔ ڈاکٹری علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آپ کوئی حل بتائیں۔

محمد اشرف

ج: بہ ظاہر یہ عضلاتی (گوشت کا) درد ہے اور کسی مناسب بام سے اسے دور ہو جانا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ کھیل کود کے دوران کوئی چوٹ لگ گئی ہو۔ آپ کسی اچھے دواخانے سے فیروطی آرد کرسنہ خرید لیجیے اور رات کو درد کی جگہ اس کو چند روز ملیے۔

انشاء اللہ فائدہ ہوگا۔

آنکھ سے پانی

س: پڑھتے وقت میری بائیں آنکھ سے پانی بہتا ہے۔ ہاتھوں اور پیروں میں پسینہ بھی بہت آتا ہے۔ علاج بتائیے۔

محمد اسلم

ج: آپ نے اپنی عمر نہیں لکھی۔ بہ ظاہر ایسا لگتا ہے کہ آپ عصبی المزاج ہیں اور بات بات پر الجھتے ہیں گھبراہٹ اور کوئی خوف ہے۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں پسینہ آیا کرتا ہے۔ اپنی صحت کی طرف توجہ کیجیے۔ اعتدال کا دامن پکڑیے اور یہ خوب جان لیجیے کہ صحت اگر ہاتھ سے چلی گئی تو اسے روپے پیسے سے آپ خرید نہیں سکتے۔ دنیا کی ہر چیز شاید خریدی جاسکتی ہے۔ مگر صحت نہیں۔ احتیاطاً اپنی آنکھیں کسی ماہر چشم سے ٹیسٹ کرا لیجیے

آنکھوں میں پانی

س: مطالعے کے دوران آنکھوں میں پانی آجاتا ہے، کیوں؟ پڑھنے کے بعد سامنے اندھیرا بھی چھا جاتا ہے۔ کیا لیٹ کر پڑھنا مضر ہے؟ تدبیر و علاج سے نوازیے۔

غلام عباس، انور علی ضمیر الرحمان، عرفان۔

ج: لیٹ کر پڑھنا اچھی عادت نہیں ہے۔ تاہم اگر خوب روشنی ہو اور صاف دکھائی دے رہا ہو تو اس میں کوئی زیادہ خرابی بھی نہیں ہے۔ ہاں کتاب اور آنکھوں کا فاصلہ زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ مطالعے کے دوران آنکھوں سے پانی اس وجہ سے بھی آسکتا ہے کہ آنکھوں میں رو ہے پڑ گئے ہوں۔ مناسب ہے صاف شفاف ٹھنڈے پانی سے صبح آنکھوں میں پانی کے چھینٹے ماریے۔ اس سے آنکھوں میں تازگی آجائے گی۔ اگر آپ نے پڑھائی کی خاطر نیند کم کی ہے اور راتوں کو جاگے ہیں تو آنکھوں کے لیے بھی یہ حرکت مضر ہے اور صحت کے لیے بھی۔ ●

معیت ماہنامہ نونہال کراچی (پاکستان)

ابراہیم فکری

ہرے بھرے کھیت میں ایک مرغی دانہ چگ رہی تھی صاف ستھری ہوا اور دھوپ کا مزہ لے رہی تھی کہ اچانک کھجور کے درخت سے ایک خوشہ (گچھا) اس کے سر پر آگرا ، جس سے اس کو بڑی چوٹ آئی اس سے یہ بیچاری بہت ڈری اور پریشان ہوگئی ۔ اس نے خیال کیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان نیچے آئے گا اور زمین پھٹ جائے گی ۔ اس نے سوچا کہ یہ جو بڑی مصیبت آنے والی ہے اس کی خبر پرندوں اور جانوروں کے بادشاہ کو بھی دینی چاہیے ۔

وہ تیزی سے چلی جا رہی تھی کہ اسے راستے میں مرغ (مرغا) ملا اور کہنے لگا : "بہن اتنی تیزی سے کہاں دوڑی چلی جا رہی ہو ۔ آخر کیا بات ہے ایسا تو نہیں کہ تم لومڑی سے ڈر رہی ہو ۔ ذرا رکو تو شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں ۔

مرغی نے گھبراہٹ اور خوف میں جواب دیا : "مرغوں کے سردار ! ہم سب پرندے ایک بہت بڑے حادثے سے دوچار ہونے والے ہیں اور یہ آسمان زمین پر گرنے والا ہے ۔ میں اس کی خبر بادشاہ کو دینے جا رہی ہوں ۔ اور اس سے اس سلسلے میں مدد کی طلب گار ہوں ۔"

مرغا بولا : "اس دنیا پر افسوس ہے ۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو ۔ مجھے بھی ڈر معلوم ہو رہا ہے کہ کہیں واقعی آسمان نیچے نہ آن پڑے اور ہم سب تباہ ہو جائیں ۔"

اب یہ ایک سے دو ہو گئے ۔ راستے میں بطخ صاحبہ سے مڈبھیڑ ہو گئی ۔ بطخ نے ان دونوں کو روک کر صورت حال دریافت کی ۔ دونوں نے بتایا کہ ہم سب ایک بڑے حادثہ میں گرفتار ہونے والے ہیں ۔ آسمان نیچے گرنے والا ہے جس سے کہ جانوروں کی پوری جماعت تباہ ہو جائے گی ۔ ابھی یہ اپنی بات پوری کرنے بھی نہ پائے تھے کہ بطخ پر بھی خوف طاری ہو گیا ۔ اس نے کہا : "بھئی ! میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چل رہی ہوں ۔" یہ تینوں چلے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک چینی مرغی جو اپنے قریبی کھیت میں چگ رہی تھی ملی اس نے بلند آواز سے تینوں کو آواز دی اور کہا : "ذرا ٹھہرو تو ۔ تم سب کہاں جا رہے ہو ۔ تینوں ۔ بیک آواز کہا کہ بھئی جلد ہی آسمان نیچے زمین پر گرنے والا ۔ ہم اس آنے والے حادثہ کے سلسلے میں اپنے پرندوں اور جانوروں کے بادشاہ کو خبردار کرنا چاہتے ہیں کہ شاید وہ ہم سب کی حفاظت کا کوئی بندوبست کر سکیں ۔ چینی مرغی بھی گھبرا گئی اور اس نے کہا : "تو میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں ۔" مرغی ، مرغا ، بطخ ، اور چینی مرغی چاروں کے چاروں

ظفر منزل ، جامعہ نگر ، نئی دہلی ۔ ۲۵

بادشاہ سے شکایت کرنے چل پڑے۔

یہ سب جلدی جلدی راستہ طے کر رہے تھے کہ ان کو راستہ میں ایک مکار لومڑی مل گئی۔ اس نے کہا، "تم سب کی یہ پوری کی پوری جماعت کدھر جا رہی ہے آخر کون سی مصیبت درپیش ہے۔ میں نے ایک پریشان کن وحشت ناک خبر سنی ہے اور اگر وہ صحیح ہے تو ہم سارے کے سارے برباد ہو جائیں گے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان نیچے آنے والا ہے اس زمین پر۔"

تو سب نے بیک آواز کہا کہ یہ بالکل صحیح ہے

تو لومڑی نے کہا پھر اس سے بچنے کے لیے اب ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ سب پرندوں نے کہا کہ ہم اپنے بادشاہ کے پاس جا رہے ہیں۔ کہ وہ اپنی تدبیر سے ہم کو اس مصیبت سے چھٹکارا دلا سکیں گے۔

لومڑی نے کہا۔ "اے لوگو میں آپ کی ہر طرح کی خدمت کے لیے تیار ہوں۔ واقعی اس خطرہ کی لپیٹ میں ہم سب آجائیں گے۔" کچھ سوچ بچار کے بعد پرندوں نے لومڑی کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔

لومڑی بجائے اس کے کہ پرندوں اور جانوروں کے بادشاہ کے گھر کی طرف رہنمائی کرتی وہ ان سب کو اپنے گھر لے گئی۔ اور کہا کہ ہم سب کو بادشاہ کے پاس پہنچنا ہے میں تم سب لوگوں کی دعوت کا انتظام کر رہی ہوں۔ دعوت کے بعد سب چلے چلیں گے۔ اور اصل میں اس نے اس دعوت کا بندوبست خود اپنے کھانے کے لیے کیا تھا۔

اس نے اپنے کنبہ کی تین لومڑیوں کو آواز دے کر بلایا۔ اور پھر ان سب لومڑیوں نے مرغی، مرغا، بطخ اور چینی مرغی کا صفایا منٹوں میں کر دیا۔

(عربی سے ترجمہ)

★ ★ ★

بقیہ صفحہ ۱۳

بھکاری کی بات مکھیا کے بھی سمجھ میں نہ آئی۔ وہ بولے۔ "دیکھو پہیلیاں نہ بجھاؤ میں گول مول بات سننے کا عادی نہیں ہوں۔"

"مکھیا جی! میری بیوی ایک راکشسنی ہے راکشسنی کی بہن سمجھیے وہ ذرا بھی کام دھام نہیں کرتی۔ دن بھر پڑی رہتی ہے نہ کام کی نہ کاج کی، دشمن اناج کی۔ ایک کٹوری چاول وہی ٹھونس لیتی ہے۔" گوپال نے کہا۔

ہوں! مکھیا نے پوچھا۔ "تم اُدھار کیسے دیتے ہو؟"

"جی" "پانچ برس کا ایک میرا بیٹا ہے۔ بڑھاپے کی لکڑی۔ وہ میری آنکھوں کا تارا ہے، ایک کٹوری چاول میں اسے کھلا دیتا ہوں۔ ابھی اس کی عمر کھانے کھیلنے کی ہے۔ میرا ہاتھ پیر چل رہا ہے۔ ابھی میں اس کو پال پوس رہا ہوں۔ کچھ دنوں میں وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا اور پھر میری ڈھلتی عمر میں مجھے کھلائے گا۔ ایسے میں اُدھار دینا ہی سمجھتا ہوں۔"

"اور پانی کے دھارے میں پھینکنے سے کیا مطلب ہے؟"

"میری ایک بیٹی ہے۔ چھوٹی موٹی سی۔ ابھی اس کی عمر گڈا گڑیا کھیلنے کی ہے۔ ایک کٹوری چاول میں اُسے کھلاتا ہوں۔ لڑکی کو بڑھنے میں دیر نہیں لگتی۔ جہاں وہ بڑی ہوئی کہ سسرال چلی جائے گی۔ اس کا پالن پوسن پانی کے دھارے میں پھینکنا ہی تو ہے۔"

"بہت خوب!" مکھیا نے کہا۔ "اب تم یہ بھی بتا دو کہ مندر میں کس دیوتا کو روزانہ ایک کٹوری چاول چڑھاتے ہو؟"

"مکھیا جی! مجھے کہیں دور نہیں جانا پڑتا۔" گوپال نے کہا۔ "میرا تن ہی مندر ہے۔ میری روح میرا دیوتا ہے۔ میں روزانہ اپنے دیوتا کو ایک کٹوری چاول چڑھاتا ہوں۔ میرا دیوتا میرے جسم کو قوت دیتا ہے۔"

مکھیا گوپال کی ساری باتیں سن کر بہت خوش ہوا اور گوپال کو اپنے پاس نوکر رکھ لیا۔

سلطان احمد

چار کٹوری چاول

کسی گانو میں ایک بھکاری رہتا تھا۔ اس کا نام گوپال تھا۔ وہ صبح ہوتے ہی اپنی جھونپڑی سے نکل پڑتا اور دن بھر بھیک مانگ کر شام ڈھلے اپنے بال بچوں کے پاس لوٹ کر آتا تو اس کی جھولی میں چار کٹوری چاول ہوتا اور اسی سے اس کا اور اس کے بال بچوں کا جیسے تیسے گزارا ہو جایا کرتا تھا۔

ایک دن گانو کے چوراہے پر بیٹھے آٹھ دس آدمی آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ادھر سے گوپال آنکلا۔ ایک آدمی نے گوپال کو بلایا اور کہا: "تم دن بھر میں اتنا چاول پاتے ہو، تو کیا سارا اکیلے کھا جاتے ہو؟"

"صبح سے شام تک بھیک مانگنے پر آپ لوگوں کی مہربانی سے چار کٹوری چاول مل جاتا ہے۔" گوپال نے میٹھے لہجے میں کہا: "ایک کٹوری ایک راکشسنی کو دیتا ہوں، ایک کٹوری ذی روح کو ادھار دیتا ہوں، ایک کٹوری پانی کے دھارے میں پھینک دیتا ہوں اور ایک کٹوری مندر میں دیوتا کے چرنوں میں چڑھا دیتا ہوں۔"

گوپال کی بات کسی کے بھی سمجھ میں نہ آئی۔ ایک آدمی نے کہا: "اب اسے بھیک نہیں دیں گے۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ ضرور سارا چاول بنیے کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ جھوٹا کہیں کا۔"

"ہاں ہاں! ٹھیک کہتے ہو!" دوسرے آدمیوں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

تیسرے آدمی نے آنکھیں نکال کر کہا: "گوپال تم ہم لوگوں کو بیوقوف بنا رہے ہو! کہاں ہے وہ راکشسنی؟"

چوتھے آدمی نے تیکھے لہجے میں کہا: "بتا تجھ سے کون ادھار لے جاتا ہے؟ کنگال کہیں کا۔"

"ہاں ہاں یہ بھی بتا کہ کس پانی کے دھارے میں تو چاول بہاتا ہے؟" پانچویں آدمی نے پوچھا۔

اور چھٹے آدمی نے طنزیہ لہجے میں کہا: "دھرماتما وہ مندر کہاں ہے، جس کے دیوتا کو تو چاول چڑھاتا ہے؟"

ایک ساتھ اتنے سوالوں کی بوچھار دیکھ کر گوپال گھبرا گیا ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ اس سے ان لوگوں کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ وہ لوگ گوپال کو پکڑ کر گانو کے مکھیا کے پاس لے گئے۔

مکھیا نے پوچھا۔ "بھائی بتاؤ آخر سارا چاول کیا کرتے ہو؟"

گوپال نے بتایا۔ "صبح سے شام تک بھیک مانگنے پر چار کٹوری چاول مل جاتا ہے۔ ایک کٹوری میں راکشسنی کو دیتا ہوں، ایک کٹوری ایک ذی روح کو ادھار دیتا ہوں۔ ایک کٹوری پانی کے دھارے میں پھینک دیتا ہوں۔ اور ایک کٹوری مندر میں دیوتا کے چرنوں میں چڑھاتا ہوں۔"

باقی صفحہ ۱۷ پر

سردار روڈ۔ ہزاری باغ (بہار)

غلام صابر قدیری، سندیلوی

محنت کی کمائی

کسی شہر میں ایک بہت بڑا تاجر رہا کرتا تھا۔ وہ غلّہ اور کپاس کا کاروبار کیا کرتا۔ اس کام میں اس کو بڑی آمدنی ہوتی۔ شہر میں اس کی بڑی شہرت تھی۔ اس کی کئی کوٹھیاں اور بہت سی دکانیں تھیں، ان سے بھی اُسے بڑی رقم ہر ماہ کرایے کی صورت میں ملتی تھی۔ اس کے پاس دو موٹریں، دو موٹر سائیکلیں اور گھوڑا گاڑی بھی تھی۔ گھر سے باہر تک دولت اور پیسے کی ریل پیل تھی۔ نوکر چاکر خدمت پر مامور تھے۔ اچھّے سے اچھا کھاتا اور بہتر سے بہتر پہنتا تھا۔ کوئی فکر اور کوئی پریشانی نہ تھی۔ اس کے کارندے بھی نیک اور ایماندار تھے لہٰذا کاروبار میں ترقی اور برکت تھی اور یہ تمام دولت اور یہ امیری اس کو اپنی کوششوں اور سخت محنت سے ملی تھی۔

وہ ایک غریب آدمی کا لڑکا اور معمولی گھرانے کا ایک فرد تھا۔ شروع شروع تو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لیے اس نے بڑی بڑی مشقتیں کیں اور بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں۔ بچپن میں اس کا باپ مر گیا تھا اور اس کا کوئی سہارا نہ رہ گیا تھا مگر خدا نے اسے بڑی سُوجھ بُوجھ دی تھی۔ چھوٹی عمر میں اس کو مزدوری کرنا پڑی اور پیٹ پالنے کے لیے خون پسینہ ایک کرنا پڑا۔ اس کو کام کی سچّی لگن تھی۔ محنت کا شوق تھا اور جدوجہد سے عشق تھا لہٰذا خدا نے اس کی مدد کی کیوں کہ خدا ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی آپ مدد کرتے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ وہ اپنی دھن میں آگے بڑھتا گیا اور کامیابی اس کے قدم چومتی گئی اور آخر کار ایک دن اس کی زندگی میں ایسا بھی آیا جب وہ شہر کا سب سے زیادہ مالدار، ممتاز اور مشہور آدمی بن گیا اور اس کی اَن تھک کوششوں کا اس کو پھل مل گیا۔

اس رئیس کے صرف ایک ہی لڑکا تھا جس کو ماں باپ دونوں ہی بے حد چاہتے تھے۔ یہ لڑکا بڑے ناز و نعم سے پالا گیا تھا۔ ذرا سی چھینک آئی تو بڑے

۱۷۴ دریائی ٹولہ، یاٹا نالہ۔ لکھنؤ ۳-۲۲۶

سے بڑے حکیم ڈاکٹر دروازے پر حاضر ہو جاتے۔ ذرا
سی تکلیف ہو جاتی تو ماں باپ کا دل پسیج جاتا۔ غرض
وہ باپ کی آنکھ کا تارا اور ماں کے دل کا سہارا تھا۔
رفتہ رفتہ یہ بچہ بڑا ہوتا گیا اور عمر کی منزلیں جوانی کی
طرف بڑھتی گئیں۔ جب بڑا ہوا تو گھر کے ٹھاٹ باٹ
اور اعلا درجے کے رہن سہن کا عادی ہو گیا۔ موٹروں
میں گھومتا، نہایت قیمتی لباس پہنتا، دن میں دو بار
کپڑے بدلتا۔ کلب میں یار دوستوں کو لے کر جاتا اور
سیر و تفریح کرتا۔ اس کے دوستوں اور ملنے والوں
کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی اور دھیرے دھیرے
وہ بہت بڑا خراچ اور بے حد فضول خرچ بن گیا اور
باپ کی گاڑھے پسینے کی کمائی کو بے دردی سے اُڑانے
لگا۔

ماں کو اپنے پیارے بیٹے کی اس ہر دل عزیزی
اور ان اداؤں پر بڑی خوشی ہوتی مگر باپ اپنے بیٹے
کی اس روش اور اس طرزِ عمل پر سخت نگاہ رکھے
ہوئے تھا۔ آخر کار اس نے سوچ سمجھ کر یہ رائے
قائم کی کہ اگر اس لڑکے کی خبر نہ لی گئی، اس کو اسی
طرح آزاد چھوڑ دیا گیا تو یہ ایک دن میری تمام دولت
کو ختم اور میری تمام ساکھ اور عزت کو برباد کر دے گا۔

یہ سوچ کر اس نے ایک اسکیم بنائی اور اس
اسکیم کے تحت دوسرے دن صبح صبح اس نے ایک نوکر
کے ذریعے اپنے لڑکے کو اپنے سامنے طلب کیا اور جب
لڑکا سامنے آیا تو نہایت ترش روئی سے لڑکے سے
بات کی اور اس کو حکم دیا کہ جلدی سے ناشتہ کر لے
اور دوپہر کا کھانا باندھ کر گھر سے نکل جائے اور شام
کو گھر اس شرط پر واپس آئے کہ پانچ روپے کما کر
مجھ کو دے ورنہ گھر میں داخل نہ ہو۔

باپ کے اس اچانک اور نادر شاہی حکم پر سب
لوگ لرز گئے۔ ماں کا دل کانپ گیا۔ لڑکا سہم کر رہ گیا
مگر باپ کا حکم قطعی اور آخری تھا۔ یہ حکم دے کر اس
نے اپنی بیوی کو حکم دیا کہ اس کو ناشتہ کرا دے،
دوپہر کا کھانا باندھ دے اور فوراً رخصت کر دے۔
کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کے حکم کے خلاف جاتا، کیونکہ
باپ کا رعب گھر کے ہر شخص پر چھایا ہوا تھا۔

ماں دل ہی دل میں بہت کڑھی اور نہایت مجبوری
سے شوہر کے حکم پر عمل کیا مگر بڑی چابکدستی، چالاکی اور
چوری سے شوہر کی آنکھ بچا کر دوپہر کے کھانے میں روٹیوں
کے بیچ میں پانچ روپے کا نوٹ بھی چھپا کر رکھ دیا۔ اس
کا مطلب یہ تھا کہ لڑکا شام کو جب گھر واپس لوٹے
تو باپ کو یہ روپے یہ کہہ کر دے دے کہ میں نے یہ
روپے دن بھر مزدوری کر کے کمائے ہیں۔

لڑکا نہایت پریشانی کے عالم میں گھر سے نکل گیا
اور دور چلا گیا، گھوم پھر کر وقت گزارا۔ کام حاصل
کرنے کی کوئی فکر نہ کی۔ کیونکہ محنت کرنا اس نے
سیکھا ہی نہ تھا۔ خود کام کیا کرتا، اس کو تو نوکروں
سے کام لینے کی عادت تھی چنانچہ جب اس کو دوپہر
میں بھوک لگی تو ایک جگہ بیٹھ کر اس نے کھانا کھولا
تو روٹیوں کے درمیان اس کو پانچ روپے رکھے ملے
وہ بے انتہا خوش ہوا اور ماں کی مہربانی اور اس
عنایت کا دل ہی دل میں قائل بھی ہوا اور پورا مطلب
بھی سمجھ گیا۔ شام ہوئی تو خوشی خوشی گھر لوٹا اور باپ
کی خدمت میں حاضر ہو کر وہ پانچ روپے پیش کیے
اور کہا: ”لیجیے آپ کے حکم کے مطابق میں پانچ روپے
کما لایا ہوں۔“ باپ نے کہا ”مجھے ان روپوں کی ضرورت
نہیں جاؤ ان روپوں کو سامنے کے کنویں میں پھینک
دو اور جا کر کھانا کھاؤ۔“

لڑکے نے فوراً وہ روپے باپ کے حکم کے مطابق
کنویں میں پھینک دیے اور کھانا کھا کر اپنے مشاغل
میں لگ گیا۔

اب کیا تھا ماں کو اپنے بیٹے کو محنت مزدوری
کی مشقت سے بچانے کا ایک عمدہ طریقہ ہاتھ آگیا اور

لڑکے کو اپنے باپ کے عتاب سے بچنے کا۔ چنانچہ روزانہ صبح صبح ماں لڑکے کو ناشتہ کرا کے دوپہر کا کھانا باندھ دیتی اور چپکے سے پانچ روپے اسی میں چھپا دیتی۔ لڑکا شام کو واپس آتا اور وہی پانچ روپے باپ کو پیش کر دیتا اور باپ کے حکم سے وہ روپے کنویں میں پھینک بھی دیتا اور کھانا کھا کر سو رہتا۔ یہ سلسلہ مسلسل ایک مہینے چلتا رہا۔

آخر ایک دن لڑکے کے دل نے ملامت اور عمل کی رگ نے اس کے ضمیر کو جھنجھوڑا اور اس نے سوچا آخر کب تک میں باپ کو دھوکا دیتا رہوں گا اور دن بھر واہی تباہی گھومتا رہوں گا۔ گھر کی نعمتوں سے محروم اور زندگی کی ہماہمی سے دور رہوں گا۔ ان خیالات نے اس کو رات بھر سونے نہیں دیا۔ صبح ہوئی وہ خود ہی جلدی اُٹھا باورچی خانے میں گیا جو کچھ باسی روٹی رکھی پائی کچھ کھائی اور کچھ باندھ کر بغیر ماں سے ملے گھر سے روانہ ہو گیا جب کافی دور نکل گیا تو اس کو ایک عمارت بنتی ہوئی نظر آئی وہ وہاں گیا اور مالک مکان کو تلاش کر کے اس سے ملا اور کام کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مالک نے پوچھا کیا کام کر سکتے ہو؟ اس نے جواب دیا "اور تو کچھ کام جانتا نہیں ہاں گارا اینٹیں ڈھو سکتا ہوں" چنانچہ اس کو کام مل گیا اس نے تمام دن سخت دھوپ میں لمبی سیڑھی پر چڑھ چڑھ کر کاریگروں کو گارا اور اینٹیں پہنچائیں اور اس کو اس کام میں بے انتہا محنت کرنی پڑی اور جب شام کو کام بند ہوا تو اس کو اور مزدوروں کے ساتھ آٹھ روپے ملے۔ زندگی میں پہلی بار اس کو سچی خوشی حاصل ہوئی۔ اسے ایسا لگا، آج اس کو آٹھ نہیں آٹھ ہزار روپے ملے۔ وہ باپ کے گھر کا عیش و آرام بھول گیا اس کا چہرہ خوشی سے روشن ہو گیا۔ اس کا دل باغ باغ ہو گیا اس کا خون بڑھ گیا اس کے تمام قوا میں توانائی آگئی اس کے دل میں کام کرنے کی امنگ اور محنت کرنے کی ترنگ پیدا ہو گئی۔

آج وہ ہنستا ہوا مسکراتا ہوا باپ کے سامنے حاضر ہوا۔ اور ادب سے وہ آٹھ روپے پیش کیے۔ باپ نے بیٹے کے چہرے کی چمک اور ماتھے پر مسکراتی ہوئی خوشی کو بھانپ لیا مگر نگاہ سخت رکھتے ہوئے وہی روزانہ والا حکم دیا کہ جاؤ یہ روپے کنویں میں پھینک دو اور گھر جا کر کھانا کھاؤ۔

لڑکے کے قدم کنویں کی طرف نہیں بڑھ رہے تھے۔ وہ آج خلاف معمول باپ کا حکم ماننے سے اپنے آپ کو مجبور پا رہا تھا۔ باپ نے پھر وہی حکم دیا کہ یہ روپے کنویں میں پھینک دو۔ لڑکا خاموش کھڑا رہا باپ کے بار بار اصرار پر بھی لڑکا تعمیلِ حکم نہ کر سکا اور رونے لگا۔ باپ نے اس سے رونے کی وجہ دریافت کی۔ لڑکے نے کہا:

"ابا جان! میں نے دس گھنٹے سخت محنت کی ہے خون پسینہ ایک کر دیا ہے۔ میرا بدن چور چور ہو گیا ہے۔ اونچی سیڑھی پر چڑھتے چڑھتے میری ٹانگیں بیکار ہو گئی ہیں تب جا کر مجھے یہ آٹھ روپے ملے ہیں میں ان کو کس دل سے کنویں میں پھینک سکتا ہوں؟" باپ نے حیرت سے دریافت کیا "اس سے پہلے تم ایک مہینے سے برابر وہ پانچ روپے میرے ادنا اشارے پر کنویں میں کیوں پھینک دیا کرتے تھے؟"

لڑکا بولا: "ابا جان، وہ روپے میری محنت کی کمائی کے نہ تھے بلکہ امی جان اپنی محبت اور مامتا سے مجبور ہو کر چلتے وقت مجھے دے دیا کرتی تھیں اور میں شام کو وہی روپے آپ کو لا کر دے دیا کرتا تھا اور آپ کے حکم سے وہ روپے کنویں میں پھینک دیا کرتا تھا کیونکہ مجھے ان روپوں کا کوئی درد نہ تھا مگر آج تو بات ہی دوسری ہے۔"

یہ کہہ کر لڑکے نے پورا قصہ بیان کیا۔ مہربان اور بہی خواہ باپ نے لڑکے کو سینے سے لگایا اور دل کھول کر شاباشی دی۔ آج اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔

آج اس کو لڑکے کی شکل میں ایک جفاکش اور دیانتدار معاون و مددگار مل گیا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ لڑکے کو عمل، محنت، جدوجہد اور جفاکشی کا چسکا لگ گیا تھا۔ اسے نرم نرم گدّوں سے نفرت ہوگئی اسے میز کرسی پر لذیذ و مرغن کھانوں سے الجھن ہونے لگی۔ نیند اس کی تابعدار ہوگئی۔ آرام اس کا غلام ہوگیا اب وہ تھا اور مسلسل محنت۔ اب وہ تھا اور سعیِ پیہم۔ ہر شوق سے اس نے آنکھیں موڑ لیں، ہر آسایش سے اس نے رشتہ توڑ لیا۔

آخرکار باپ نے تمام کاروبار لڑکے کے سپرد کر دیا اور خود یادِ الٰہی میں مصروف ہوگیا۔ لڑکے نے اپنی اَن تھک کوششوں سے اپنے باپ کے کاروبار کو وہ فروغ دیا کہ چند ہی روز میں وہ شہر کا امیر ترین آدمی بن گیا۔ لوگ اس کی محنت کی مثال دینے لگے اور اس کے کردار کے ترانے گانے لگے۔

ان تمام باتوں کے باوجود تکبّر اور غرور اس کے قریب سے ہوکر نہ گزرا تھا۔ وہ سخاوت، غربا پروری، رحم دلی، اور ایمان داری کا مجسّمہ تھا۔ شہر کے تمام فلاحی ادارے اس کے مرہونِ منت تھے۔ وہ نیک کاموں اور عوام کی بہبودی کے پروگراموں میں دل کھول کر حصّہ لیتا تھا۔

سچ ہے انسان محنت سے جو پیسہ کماتا ہے اس کی قدر وہی خود کر سکتا ہے اور محنت اور ایمان داری سے کمائی ہوئی دولت کو کبھی زوال نہیں ہوتا۔ ●

ڈاکٹر معز اللہ فاروقی
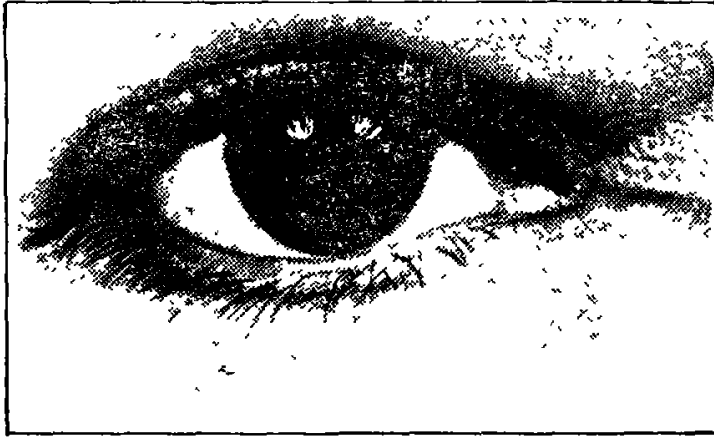
آنکھ کی حفاظت

ساتھیو! اسکول اور کالج کھل گئے ہیں۔ تعلیم بھی شروع ہوگئی ہے۔ اپنے اصل مقصد میں شروع سال سے لگ جانا ہی اچھے اور ہونہار طالب علم کی تعریف ہے۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ جس آنکھ سے ہم پڑھتے اور دیکھتے ہیں اس کی حفاظت کرنا بھی ہمارا ہی فرض ہے۔ اگر ہم اس کا غلط طریقے سے استعمال کریں گے تو اس کی روشنی زائل ہوسکتی ہے۔

اس لیے آنکھوں کی روشنی کو ٹھیک رکھنے کے لیے تین چیزوں کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ آج کل بہت سے طالب علم لیٹ کر پڑھنے کے عادی ہیں۔ اس طرح پڑھنے سے آنکھوں میں کھنچاو پیدا ہوتا ہے جس سے پانی آنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اس لیے ہمیشہ بیٹھ کر ہی پڑھنا چاہیے۔

۲۔ بہت سے طالب علموں میں گھور کر ایک ٹک دیکھنے کی عادت ہوتی ہے۔ یہ طریقہ غلط ہے۔ ہمیشہ پلک کو جھپکاتے ہوئے دیکھنا چاہیے۔ اگر تصویر یا کسی بھی چیز کو دیکھتے ہوئے آنکھوں میں بھاری پن محسوس ہو تو فوراً ہی آنکھ کے ماہر ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ آنکھوں میں "مائیو پیالہ" کا مرض شروع ہوگیا ہو۔

۳۔ جن کے گھروں میں ٹیلی وژن ہو۔ انھیں ٹیلی وژن دیکھتے وقت اس سے ۱۰ یا ۱۵ فٹ کے فاصلے پر بیٹھنا چاہیے۔

خوراک :- آنکھوں کی روشنی کو ٹھیک بنائے رکھنے کے لیے وٹامن 'اے' کا استعمال ضروری ہے۔ وٹامن اے ہری ترکاریوں میں جیسے ٹنڈا، پالک، ہرے پتے والی ترکاریوں، ٹماٹر، گاجر وغیرہ میں بھی وٹامن اے پایا جاتا ہے پھلوں میں پپیتا، آم، سنترہ، انگور، وغیرہ فائدہ مند ہوتے ہیں۔

احتیاط و پرہیز :- چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑنے، زیادہ رونے یا غصہ کرنے سے دماغ پر برا اثر پڑتا ہے۔ جس سے آنکھوں کی روشنی پر بھی اثر ہوتا ہے۔ زیادہ کھٹی چیزوں کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہیے۔ جہاں تک ممکن ہوسکے آنکھوں کو آرام دینا چاہیے۔ تیز روشنی اور لگاتار پڑھنے، لکھنے کا کام آنکھوں کو کمزور بنا دیتا ہے۔

نندورہ - لال گوپال گنج ضلع (الہ آباد)

> آدھی ملاقات اور بچوں کی کوششیں لکھنے والے پیامی قلم کار، اپنے خط اور مضامین صاف، خوش خط اور لائن چھوڑ کر لکھیں۔
> (اڈیٹر)

مدیرہ خاتون عثمانی

چھوٹی سی کہانی

ایک زمانے میں ایک چھوٹے سے مکان میں ایک چھوٹی سی عورت اکیلے رہتی تھی۔ ایک شام اس چھوٹی سی عورت نے اپنا چھوٹا سا ہیٹ پہنا اور سوچا کہ ایک چھوٹی سی سیر کر لی جائے۔ ابھی وہ چھوٹی سی عورت ایک چھوٹے سے راستے پر تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ اسے ایک چھوٹا سا پھاٹک دکھائی دیا۔ اس چھوٹے سے پھاٹک کے اندر ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو اسے اس چھوٹے سے میدان کے سرے پر ایک چھوٹی سی جھاڑی نظر آئی۔ وہ چھوٹی سی عورت اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے جھاڑی میں داخل ہوئی تو اسے ایک چھوٹی سی ہڈی پڑی نظر آئی۔ اس نے سوچا میرے چھوٹے سے وجود کے لیے یہ چھوٹی سی ہڈی ایک وقت کے کھانے کے لیے کافی ہوگی۔ یہ سوچتے ہوئے اس چھوٹی سی عورت نے وہ چھوٹی سی ہڈی اٹھالی اور اپنی چھوٹی سی سیر کو وہیں پر تمام کرتے ہوئے اس چھوٹے سے میدان سے نکل کر اپنے چھوٹے سے گھر کی طرف چل پڑی۔

سیر سے لوٹنے کے بعد اس چھوٹی سی عورت کو کچھ تکان محسوس ہوئی۔ اس لیے اس چھوٹی سی ہڈی کو پکانے کے بجائے اس نے اپنی چھوٹی سی الماری میں رکھ دیا اور خود اپنے چھوٹے سے بستر پر دراز ہوگئی۔

اپنے چھوٹے سے بستر پر لیٹے ہوئے اسے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہو

"میری ہڈی مجھے واپس کر دو"

اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو دھیرے سے کھول کر دیکھا لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے آواز الماری کی طرف سے آئی ہو۔ وہ چھوٹی سی عورت کچھ خوف زدہ ہوگئی۔ اس نے اپنا منہ اپنی چھوٹی سی چادر میں چھپالیا اور دوبارہ سو گئی، لیکن تھوڑی ہی دیر بعد پھر اسی چھوٹی سی آواز نے اسے جگادیا

"میری ہڈی مجھے واپس کر دو۔"

بے چاری چھوٹی سی عورت کچھ اور خوف زدہ ہوگئی۔ اس نے اپنی چھوٹی سی چادر اپنے سر کے چاروں طرف اور زیادہ لپیٹ لی۔ ابھی آنکھ لگے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس چھوٹی سی آواز نے اسے پھر چونکا دیا۔ اب کی وہ آواز کچھ زیادہ کرخت تھی۔

"میری ہڈی مجھے واپس کر دو۔"

اس چھوٹی سی عورت نے اپنے چھوٹے سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ چادر سے منہ باہر نکالا اور سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا: "لے جاؤ اپنی ہڈی" اور جلدی سے منہ چادر کے اندر لپیٹ لیا۔

اس چھوٹی سی عورت نے صبح اٹھ کر اپنی چھوٹی سی الماری کھولی تو وہ چھوٹی سی ہڈی اپنی جگہ پر موجود نہیں تھی۔

۱-۲۵ - بارہ دری بلیماران، دہلی

انگریزی سے ترجمہ

معین الدّین عثمانی (ایم۔اے)

فیروز اپنے کلاس کا ہونہار لڑکا تھا۔ پچھلے تین سالوں سے وہ اپنے کلاس میں اوّل آرہا تھا۔ اس لیے لاس کے تمام بچے اور مدرسہ کے اساتذہ اسے عزت کی گاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ کلاس ٹیچر صاحب تو اس سے تنے خوش تھے کہ انھوں نے اسے کلاس کا مانیٹر بنا یا تھا۔

فیروز کے گھر کی حالت بھی اچھی تھی۔ اس کے والد اکپڑے کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ اسے گھر میں کسی چیز کی ی نہیں محسوس ہوتی تھی۔ روزانہ اچھا اچھا کھانا پھر جیب رچ کے لیے پیسے، مدرسہ آنے جانے کے لیے رکشا کا تظام تھا۔ فیروز بہت ہی خوش رہتا تھا۔

ہمیشہ تعریف سنتے سنتے اس کے اندر غرور آگیا تھا۔ اُسے ہمیشہ اپنی مرضی کے مطابق بات سننے کی عادت پڑگئی تھی۔ کوئی بات بھی اپنے مزاج کے خلاف برداشت ہیں کرسکتا تھا۔

ان دنوں وہ آٹھویں جماعت میں داخل ہوا تھا۔ نئے سال کی کتابوں، کاپیوں، کی ابھی خریداری ہی ماری تھی۔ ایک دن ماسٹر صاحب نے کلاس میں ایک نئے لڑکے کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

"بچو! یہ سلیم ہے تمہارا نیا ساتھی۔ اگرچہ یہ ایک دیہات سے آیا ہے مگر اس کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا ہے ایسے بچوں کی وجہ سے ہی مدرسہ کی عزت میں اضافہ ہوا کرتا ہے۔"

فیروز کو پتا نہیں کیوں سلیم کی یہ تعریف اچھی نہیں اس نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے سلیم کی طرف تیز نظروں سے دیکھا۔ پھر سرگوشی کے انداز میں اپنے پڑوسی سے کہنے لگا: "امتحان میں دیکھیں گے۔ بچو کی ہوشیاری"

سلیم اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

دن گزرتے گئے۔ فیروز اگرچہ کافی ذہین تھا، اسے اپنی کامیابی کا پورا یقین ہوا کرتا تھا۔ مگر سلیم کی وجہ سے اب اس کے دل میں ایک خدشہ سار ہنے لگا تھا۔ وہ سوچنے لگتا اگر سلیم نے اوّل نمبر سے کامیابی حاصل کرلی تو میری عزّت مٹی میں مل جائے گی۔ میں اپنی بے عزّتی کیسے برداشت کرسکوں گا۔

پھر اس نے اپنا زیادہ وقت پڑھائی میں لگانا شروع کردیا۔ کچھ مضامین کے لیے گھر پر ٹیوشن کا انتظام کروالیا۔ تمام مضامین کے لیے رہبر و گائڈ بھی خرید لیے۔

سلیم بے چارہ غریب گھر کا لڑکا تھا۔ اس کے والد کسان تھے۔ ان کی کھیت کی آمدنی سے بہ مشکل

۲۶۴، شاہو نگر۔ جلگاؤں ۴۲۵۰۰۱

گھر کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ سلیم کے لیے ٹیوشن کا انتظام کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔ سلیم نے بھی کبھی اس بات کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے ششماہی امتحان سر پر آ گئے فیروز سے مقابلہ کرنے کے بارے میں سلیم نے کبھی خیال بھی نہ کیا تھا۔ مگر خدا کے کرم سے ایسا اتفاق ہوا کہ وہ کلاس میں اوّل نمبر سے کامیاب ہو گیا۔ فیروز کو دوسرے نمبر میں کامیابی ملی جس کی وجہ سے سلیم کو کلاس کا مانیٹر بنا دیا گیا۔ فیروز اس میں اپنی بے عزتی سمجھنے لگا۔ اسی کے دل میں سلیم کے خلاف نفرت کی آگ جلنے لگی۔ وہ اس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اب وہ ہمیشہ ایسے موقعوں کی تلاش میں رہنے لگا جب سلیم کی بے عزتی کی جا سکے یا اس کو بدنام کر دیا جائے۔

رفتہ رفتہ وقت گزرتا گیا۔ مگر اس کے دل میں لگی آگ کسی طرح سرد نہ ہو سکی اسے سلیم کی بے عزتی کا کوئی موقعہ نہ مل سکا۔

سالانہ امتحان کے شروع ہونے میں ابھی پورا ایک مہینا باقی تھا۔ ایک دن فیروز کے ذہن میں اچانک ایک ترکیب آئی۔ جسے سوچ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا۔

اس نے اپنے منصوبے میں دو تین اور لڑکوں کو شامل کر لیا۔ اب وہ روزانہ سلیم کے ساتھ رہنے لگا تھا ان دونوں کی دوستی دیکھ کر کلاس کے تمام لڑکوں کو تعجب ہو رہا تھا۔ روزانہ وہ لوگ اب سیر و تفریح کو جانے لگے تھے۔ سلیم کے دل میں فیروز کے تعلق سے برائی کا شائبہ تک نہ تھا۔ کیوں کہ وہ نہایت ہی نیک صفت لڑکا تھا۔

ایک دن انھوں نے ایک تفریحی مقام پر ایک ساتھ کھانا کھانے کا پروگرام بنایا۔ فیروز کو اب بدلہ لینے کا موقعہ ہاتھ آ گیا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ کیوں نہ کھانے میں کوئی زہریلی چیز ملا کر سلیم کو کھلا دی جائے۔ اس طرح سے ہمیشہ کے لیے اس کے راستے کا کانٹا نکل جائے گا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔

دوسرے دن فیروز کھانا لے کر تفریح گاہ پر رکشے کے ذریعہ نکل پڑا۔ تمام دوست اس سے پہلے پہنچ کر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اسے آتا دیکھ کر وہ پہاڑی پر سے ہاتھ ہلا ہلا کر اس کا خیر مقدم کرنے لگے۔ اچانک رکشے کا توازن بگڑ گیا اور عین اسی وقت سامنے سے ایک ٹرک آ گیا۔ رکشا ڈرائیور کود کر ایک طرف جا گرا۔ رکشا ٹرک کی زد میں آ گیا۔ اور فیروز کی ایک ٹانگ کا سرمہ بن گیا۔ وہ درد کی شدت سے بے ہوش ہو گیا۔

اُسے فوراً اسپتال میں داخل کروایا گیا۔ اس کے والدین کو خبر کر دی گئی۔

دوسرے دن صبح جب اسے ہوش آیا تو وہ بستر پر پڑا درد سے کراہ رہا تھا۔ اس کے سامنے اس کے ماں باپ اور ایک طرف سلیم کھڑا تھا۔ وہ اسے عجیب و غریب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"سلیم مجھے معاف کر دو" اچانک فیروز کی زبان سے یہ جملہ نکل گیا۔

"فیروز میرے دوست یہ کیا ہو گیا"۔ سلیم نے کہا۔

"سلیم میں تمھیں مارنا چاہتا تھا۔ مگر خدا کے پاس انصاف ہے۔ اس نے مجھے غرور کی یہ سزا دی ہے۔" اور وہ منہ چھپائے رونے لگا۔

ایک لڑکا اپنے باپ سے کہنے لگا "ڈیڈی! اسلم کے والد انگریزی کے ٹیچر ہیں اس لیے انگریزی میں بات چیت کرتے ہیں۔ مگر آپ حساب کے ٹیچر ہیں تو آپ حساب میں بات کیوں نہیں کرتے۔ باپ نے کہا "دیکھو بیٹے! تین پانچ مت کرو۔ یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ۔"

احمد کمال حشمی۔ کانکی نارہ

ایک آدمی بڑا کنجوس تھا۔ وہ کبھی کسی کی دعوت نہیں کرتا تھا۔ اُس کے ملازم سے ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ بھئی تمھارے مالک دعوت کب کر رہے ہیں۔ ملازم بولا جناب وہ حشر کا دن ہوگا جب وہ دعوت کریں گے۔

اس کنجوس آدمی کو کسی نے بتا دیا کہ تمھارے ملازم نے یہ کہا ہے تو اُس نے ملازم کو بلا کر پوچھا تم کو دعوت کا دن مقرر کرنے کو کس نے کہا تھا؟

زرین فاطمہ، بٹلا ہاؤس۔

(نوکر مالک سے) صاحب یہ ردّی کے ٹوکری میں دو بیس بیس کے نوٹ تھے لے لیجیے۔ مالک نے کہا جاؤ پھینک دو یہ نقلی نوٹ ہیں۔ نوکر نے برجستہ کہا مالک اسی لیے تو واپس کر رہا تھا۔

شاہین سلطانہ۔ کلٹی

جج: تم کو بار بار عدالت میں آتے ہوئے شرم نہیں آتی ہے۔
ملزم: یور آنر آپ بھی تو روز آنہ یہاں آتے ہیں۔

استاد: ابے الو کہاں رہتا ہے؟
شاگرد: جی لکھو نسلے میں۔
استاد: گدھا
شاگرد: دھوبی کے گھر میں۔
استاد: (طیش میں آکر) نالائق
شاگرد: جی اس کے گھونسلے کا نام مجھے نہیں معلوم۔

پرویز عالم۔ لکھمنیاں، بہار

باپ نے بیٹے سے کہا "بیٹا تم زیادہ شرارت نہ کیا کرو۔ شرارت کرنے والوں کے بال پک جاتے ہیں"۔ بیٹے نے کہا "لگتا ہے آپ بھی بہت شرارت کیا کرتے تھے۔ آپ کے بال بھی تو پک گئے ہیں۔"

کسی نے ایک شخص سے پوچھا "گھڑی میں کتنے بجے ہیں۔ اُس نے جواب دیا۔ "بج کر پانچ منٹ"، سوال کرنے والے کہا۔ "صحیح بتایے؟" اُس نے پھر جواب دیا" بج کر چھ منٹ۔ اُس نے کہا: "بھائی یہ کیا مذاق ہے؟ میں ٹائم پوچھ رہا ہوں"۔ اُس نے کہا: "میں صحیح بتا رہا ہوں میری گھڑی میں گھنٹے کی سوئی ٹوٹی ہوئی ہے، اس لیے میں وہی بتا رہا ہوں جو گھڑی مجھے بتا رہی ہے۔"

شاہنواز رضوی

ماسٹر صاحب: (اسلم سے) بتاؤ شیر شاہ تخت پر کیسے بیٹھا۔
اسلم: شیر شاہ نے پہلے اپنا جوتا اتارا اور پھر اُچک کر تخت پر بیٹھ گیا!

سہیل عارف۔ رحمت نگر، بردوان

استاد: شکر کہاں سے آتی ہے
شاگرد: پڑوسیوں کے گھر سے

عارف جامعہ نگر

● ستمبر کا "پیام تعلیم" نظر نواز ہوا۔ "پیام تعلیم" دن بدن نکھرتا ہی جارہا ہے امید کرتا ہوں آپ لوگ اور بھی نکھار لانے کی کوشش کریں گے۔

مرزا ادیب صاحب کی "ایک خرگوش اور ایک غار" شمس فرخ آبادی کی "عبرت" اور مختار عالم صدیقی کی "اپاہج کی کمائی" قابل تحسین ہیں۔

فخر واحدی اور پروفیسر دستگیر شہاب کی نظمیں قابل داد ہیں۔ اس کے لیے مبارک باد قبول فرمائیں۔

ایس، ایم، شاہد

شمیل گرام کوارٹر نمبر ۱۲ سی، کلٹی بردوان

● مجھ کو بچوں کی کوشش میں "غصہ کا انجام" پڑھ کر خوشی ہوئی۔ آپ کے اتنی چھوٹی عمر میں لکھنے پر مجھ کو بہت خوشی ہوئی۔ اللہ مجھ کو بھی کہانی لکھنے کی توفیق عطا فرمائے میں آپ کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔

ایس زیڈ، الماس فاطمہ

ایچ/۱۶، جمیل آباد، سیکنڈ اسٹریٹ مل ویشارم

● اگست کا "پیام تعلیم" موصول ہوا۔ میں دیکھ کر فرطِ مسرت سے جھوم اٹھا۔ اس ماہ کے تمام مضامین مجھے بے حد پسند آئے۔ آپ نے اس ماہ "عید مبارک" کے موقع پر پیام تعلیم کو رنگین شائع کرکے ہم بچوں کو آپ لوگوں نے خوش کر دیا۔ واقعی آپ لوگ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کہانی میں "جوتے کی فریاد" "رمضان المبارک" اور "عراق" اور نظم میں "اندھی لڑکی کی آواز" مجھے بے حد پسند آئی۔ لطیفہ بھی پسند آیا۔ "بچوں کی کوشش" میں "انوکھی شرارت" اور "آخری سوال" مجھے پسند آئی۔

سید قمر العارفین رضوی

رضوی روڈ، ہسپورہ اورنگ آباد (بہار)

● آپ کے خوبصورت پرچہ "پیام تعلیم" پر میری پہلی بار نظر پڑی۔ بچوں کا یہ پیارا پرچہ پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔ اگست کے اس شمارہ میں ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کا مضمون "میں کون ہوں" محمد غیاث الدین تاج کا مضمون "بہترین جہاد کون سا ہے" اور بچوں کی کوشش مجھے بے حد پسند آیا۔ میری جانب سے تمام پیام تعلیم کے قلم کاروں اور ننھے فنکاروں کو مبارک باد قبول ہو۔

سرفراز عالم

سلیگو سیلی گوڑی پٹنہ (بہار)

● اگست کے شمارے میں ظہیر خاں کی کہانی بہت پسند آئی اس کے علاوہ گلاب پری، آخری سوال اور ندامت کہانیاں مجھے بہت پسند آئی میری جانب سے ان کہانیوں کے لکھنے والوں کو سلام عرض ہو۔

اگست کے شمارے میں "سید محمد خالد صاحب نے جو تصویر بنائی بہت پسند آئی انھوں نے بہت صاف و ستھری بنائی ہے۔ میں ان کی فنکاری کی تہ دل سے داد دیتا ہوں۔

افسر اقبال

پولیس لائن، ڈاکرہ پینشن نگر، نہرو کالونی کوارٹر نمبر ۲، (ناگپور)

ننھے فنکار کا انعام

ستمبر ۸۲ کا ننھے فنکار کا انعام مجاز انور (ہزاری باغ) کو دیا گیا۔
مجاز انور اپنی تصویر اور پورا پتا فوراً لکھیں۔

قلمی دوستی

صہبا حیدر
مشغلہ: پیام تعلیم پڑھنا۔ گھر کے کام کرنا، نماز پڑھنا
پتا: سی ۵/۳۲۷ بٹلا ہاؤس جامعہ نگر اوکھلا نئی دہلی ۲۵

اشفاق احمد — عمر ۲۰ سال
مشغلہ: کہانیاں لکھنا۔ نماز پڑھنا
پتا: سوت گرنی کواٹر ۔ تاج آباد ناگپور ۹۔ ۴۴۰ مہاراشٹرا

محمد مختار — عمر ۱۸ سال
شوق: پیام تعلیم پڑھنا۔ قلمی دوستی کرنا
پتا: عابد حسین کمپونڈر ۔ ناگوری محلہ مہدپور ۴۵۶۴۴۳
ضلع اوجین ایم، پی

شکیل احمد ناگوری — عمر ۱۸ سال
شوق: بندوق چلانا،
پتا: پتا وہی ہے جو "محمد مختار" کا ہے۔

ایس زڈ۔ الماس فاطمہ — عمر ۱۱ سال
شوق: پیام تعلیم پڑھنا، کہانیوں کی کتابیں جمع کرنا۔
پتا: تسکین جمیل آباد، میل وشارم (تامل ناڈو)

قاضی امین الدین — عمر ۱۵ سال
مشغلہ: نماز پڑھنا، کرکٹ کھیلنا۔ پیام تعلیم کا بغور مطالعہ کرنا
پتا: ۷/۱۱ امام باڑہ روڈ بمبئی نمبر ۹

ادھر ادھر سے

اینگلو عربک اسکول میں مقابلہ نظم خوانی

دلی۔ منگل کے روز اینگلو عربک سینیر سکنڈری اسکول میں نظم خوانی کا سینیر اور جونیر مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے میں سینیر کے تیرہ اور جونیر کے سولہ طلبہ و طالبات نے حصہ لیا۔ مقابلہ کی صدارت مسز کور بخش نے کی۔ سینیر مقابلے میں مِس چترلیکھا (ماتا سندری اسکول) فرسٹ، ایس سعود احمد زیدی (مظہر الاسلام) سکینڈ اور شاہدہ بانو (سلیم پور اسکول) نے تیسرا مقام حاصل کیا۔ جبکہ جونیر کے مقابلے میں اینگلو عربک اسکول کے محمد قیوم کو فرسٹ، کوثر جہاں کو سکنڈ اور ندھی شرما گول مارکیٹ اسکول کو تھرڈ پوزیشن حاصل ہوئی۔

قومی سینیر سکنڈری اسکول کی طرف سے

فلسطینیوں کی امداد

نئی دہلی۔ یکم ستمبر: قومی سینیر سکنڈری اسکول شاہی عیدگاہ دہلی میں فلسطینیوں کی حمایت میں جلسہ ہوا جس میں نمایندہ فلسطین مسٹر عبدالکریم مصطفٰے اشریک ہوئے۔ اسکول کے پرنسپل مسٹر جعفر علی خاں صاحب نے نمایندہ فلسطین کو دس ہزار روپے کا نذرانہ پیش کیا جو اسکول کے طلبہ و اساتذہ نے جمع کیا تھا۔

معرفت مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بمبئی ۳

انجمن خیر الاسلام گرلز ہائی اسکول کا شاندار نتیجہ

انجمن خیر الاسلام گرلز ہائی اسکول (مدنپورہ بمبئی ۸) کا اس سال ایس ایس سی کا شاندار نتیجہ نکلا اسکول کا مجموعی نتیجہ ۷۳ فیصد رہا۔ چار طالبات امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوئیں۔ گیارہ فرسٹ کلاس آئیں۔ چالیس طالبات سیکنڈ کلاس اور دو طالبات فرسٹ کلاس میں کامیاب ہوئیں۔ اس شاندار نتیجہ کا سہرا پرنسپل محترمہ فاطمہ انیس اور ان کی رفقاء ٹیچرس کے سر ہے اور یہ کامیابی طالبات کی محنت کا نتیجہ ہے۔ ہم انھیں مبارک باد دیتے ہیں۔

نیشنل اردو ہائی اسکول کی کامیابی

ایس ایس سی بورڈ پونہ کا سالانہ امتحان مارچ ۸۲ء کو ہوا جس میں نیشنل اردو ہائی اسکول امبرناتھ سے ۲۲ طلبہ شریک امتحان رہے جس میں سے ۲۰ طالب علم کامیاب ہوئے رزلٹ ۸۷ فیصد رہا ہم عالی جناب ایاز فرزہ صاحب پرنسپل مدرسہ ہذا کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور تمام اساتذہ کو مبارک باد دیتے ہوئے استدعا کرتے ہیں کہ مدرسہ ترقی کی راہ پر گامزن رہے۔

مراٹھواڑہ ہائی اسکول میں یوم پریم چند

مراٹھواڑہ ہائی اسکول شواجی نگر پربھنی میں ۳۱ جولائی کو یوم پریم چند منا گیا۔ اس جلسہ کی صدارت پروفیسر میر تراب علی رکن مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈیمی نے فرمائی۔
مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر شیو ساگر نے شرکت کی۔ ہری ہر راؤ چودھری نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

بچوں کی کوشش

○ ماں کے قدموں تلے جنت

اکثر بچے اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ ماں کے پیروں کے نیچے جنت بسی ہے۔ اس غلط فہمی میں میں بھی مبتلا تھا لیکن پھر احادیث، قرآن اور بڑی کتابوں سے یہ معلوم ہوا کہ اس کا مطلب جو ہم سمجھتے ہیں وہ نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنا ماں کو خوش رکھو گے اور ماں کی دعائیں لو گے اتنا ہی تم سے اللہ تعالیٰ کو لگاؤ ہوگا تو آج میں آپ کو ایسی ہی ایک کہانی سناتا ہوں بھائیو کہانی سچی تو نہیں ہوتی لیکن آپ اس کہانی کو حقیقت مان کر اس پر عمل کیجیے گا۔ تو کہانی ملاحظہ فرمائیے۔

حمید اپنی ماں کے ساتھ ایک جھونپڑے میں رہتا تھا۔ ماں کے سہارے کے علاوہ دنیا میں اس کا کوئی اور سہارا نہ تھا لیکن اس کی ماں بیچاری بہت بیمار رہتی تھی اور حمید کے پاس اتنے پیسے نہ تھے جن سے وہ علاج کرواتا بس دن رات ماں کی خدمت میں لگا رہتا تھا۔ وہ نماز کا بہت پابند لڑکا تھا۔

اس کے محلے میں کچھ بڑے بڑے بزرگ رہتے تھے حمید ان کے ساتھ ہی نماز پڑھنے جایا کرتا تھا ان بزرگوں میں خاص طور سے حاجی انور سب سے بڑے بزرگ تھے کبھی کبھی حمید کی نماز نکل جاتی تو حاجی انور اسے بہت ڈانٹتے تھے۔

ساتھیو اب آپ نماز چھوٹنے کی وجہ جاننا چاہتے ہوں گے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی بیمار ماں کی خدمت میں لگا رہتا اور اس کی نماز چھوٹ جاتی لیکن وہ یہ بات کسی کو دکھانے کے لیے نہیں کرتا تھا بیمار ماں کی خدمت فرض سمجھ کر کرتا تھا۔

ایک دن تو حاجی جی نے اسے بہت ڈانٹا اور چلے گئے اس نے رو رو کر خدا سے ماں کے لیے دعا مانگی۔ حاجی انور صاحب رات کو بستر پر لیٹے تو رات میں انھوں نے خواب دیکھا کہ حشر کا میدان لگا ہے اس محلے کے تمام حاجی موجود ہیں۔ حمید بھی وہاں ہے۔ بہت سے لوگ جنت میں گئے۔ حمید کی باری آئی تو اللہ نے فرمایا اے لڑکے تو نے بہت نمازیں قضا کی ہیں اس لیے تو کچھ دن دوزخ میں جائے گا اچانک ایک عورت آئی اور بے تحاشا رونے لگی۔ اللہ نے اس کے آنسو مانگے اس میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ عورت حمید کی ماں تھی۔ اس نے سارا واقعہ سنا دیا جس کی وجہ سے اس کی نماز چھوٹی تھی۔ اللہ نے جب خدمت کی وجہ سے نماز چھوٹنے کا واقعہ سنا تو سب جنتیوں کا سردار بنا دیا۔ حاجی انور نے صبح اٹھ کر حمید کو گلے لگا لیا اور شرمندگی سے سر جھک گیا۔

● حبیب الوحیدی
جامعہ مڈل اسکول

○ چڑیا کی نصیحت

کسی شکاری نے جال میں ایک چڑیا پھنسایا جب جال سے نکال کر اس کے پر باندھنے لگا تو چڑیا بولی: "میاں شکاری تم میرے پیروں میں گرہ باندھ کر

کیا کرو گے۔ کھاؤ گے تو پیٹ نہیں بھرے گا۔ فروخت کرو گے تو ایک ٹکے سے زیادہ نہیں ملے گا"۔ شکاری نے کہا:

"بی چڑیا صاف صاف کہو کیا چاہتی ہو؟"

چڑیا نے کہا" میری مانو تو میرے پیروں پر گرہ لگانے کے بجائے میری تین نصیحتیں گرہ میں باندھ لو۔ ان پر عمل کرو گے تو بہت نفع اٹھاؤ گے"۔ شکاری بولا۔

"ٹھیک ہے نصیحت کرو، دل کو لگی تو تمھیں آزاد کردوں گا ورنہ بازار میں تمھارے ٹکے بناؤں گا"۔

چڑیا نے پہلی نصیحت کی۔

من لاکھ اگر کوئی منائے
کیجیو وہی جو سمجھ میں آئے

شکاری نے کہا" بی چڑیا! تم نے واقعی بڑے کام کی نصیحت کی۔ انسان کو بات ہر ایک کی سننی چاہیے لیکن کرنا وہی چاہیے جو اس کی عقل میں آئے۔ اچھا اب دوسری نصیحت کرو۔ چڑیا بولی۔

نہیں پہلے مجھے آزاد کرو۔ دم میں دم آئے گا تو دوسری نصیحت کروں گی۔ جو پہلی سے زیادہ قیمتی ہوگی شکاری نے چڑیا کے کہنے میں آکر مٹھی کھول دی اور چڑیا پھر سے اڑ کر قریب ہی ایک درخت کی شاخ پر جا بیٹھی اور بولی

"میاں شکاری دوسری نصیحت غور سے سنو!

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ جانے دیجیو
جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجیو

شکاری نے کہا" بے شک آتی ہوئی چیز سے ہاتھ دھونا اور جاتی ہوئی کے غم میں جان کھونا بڑی نادانی ہے۔ بی چڑیا میں تمھاری نصیحت کی طرح اسے بھی یاد رکھوں گا اور ہمیشہ اس پر عمل کروں گا"

چڑیا نے کہا۔ میاں شکاری! بس رہنے دو، تم نے میری پہلی نصیحت پر بہت عمل کیا ہے۔ جو اب دوسری پر عمل کرو گے۔ میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ "من لاکھ اگر کوئی منائے کیجیو وہی جو سمجھ میں آئے"۔ مگر تم نے میری چکنی چپڑی باتوں میں آکر مجھے آزاد کر دیا۔ حالانکہ میرے پیٹ میں ایک بیس تولے کا ہیرا تھا جو اگر تمھیں مل جاتا تو تمھاری سات پشتیں عیش کرتیں۔ شکاری کو چڑیا کی بات سن کر اپنی نادانی پر بڑا افسوس ہوا اور اس نے کچھ سوچ کر اس کی جانب ایک بار پھر جال پھینکا مگر چڑیا اس مرتبہ ہوشیار تھی اڑ کر ذرا اونچی شاخ پر جا بیٹھی۔

چڑیا نے کہا" میاں شکاری تم نے پہلی نصیحت کی طرح دوسری بھی ضائع کر دی بھلا سوچو میرا سارا وزن دس تولے سے زیادہ کا نہیں کہیں ۲۰ تولے کا ہیرا پیٹ میں ہو سکتا ہے اور پھر جب تم نے ایک بار مجھے کھو دیا ہے تو اب اس کا غم کرنے سے فائدہ؟ میں نے اپنی دوسری نصیحت میں نہیں کہا تھا کہ آتا ہو تو ہاتھ سے جانے نہ دو جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجیو۔ شکاری کو اپنی حماقت کا بڑا افسوس ہوا کچھ دیر ندامت سے خاموش رہا پھر بولا۔ اچھا بی چڑیا اس مرتبہ جو نصیحت کرو گی اس پر میں ضرور عمل کروں گا۔

چڑیا نے کہا: میری تیسری نصیحت یہ ہے کہ جب کوئی تمھیں نصیحت کرے تو اس پر عمل کرنے سے پہلے غور ضرور کر لیا کرو۔ چڑیا یہ کہہ کر اڑتی ہوئی درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئی۔

● محمد عمران خان
کراچی (پاکستان)

○ چار گپّی

کسی گاؤں میں چار آدمی رہا کرتے تھے۔ چاروں ایک نمبر کے گپّی تھے۔ ایک دن ان چاروں میں بحث چلی کہ کس کے والد سب سے بڑے شکاری ہیں؟ پہلے آدمی نے کہا میرے والد اتنے بڑے شکاری ہیں کہ ایک دفعہ انھوں نے مرچ کے پیڑ پر بیٹھ کر بندوق سے ایک چڑیا آسمان سے گرائی تھی۔ دوسرے نے کہا ارے بس! ایسے

والد تو اس سے بڑے شکاری ہیں۔ ایک دن انھوں نے جنگل میں ایک شیر دیکھا۔ پھر کیا تھا میرے والد نے شیر کا پیچھا کیا کبھی شیر آگے تو کبھی میرے والد آگے۔ اسی طرح بہت دیر تک آگے پیچھے ہوتے رہے۔ آخر میں میرے والد نے سینہ تان کر گولی چلائی۔ گولی بندوق سے نکل کر بہت تیز رفتار سے شیر کی طرف چلی۔ حالت یہ تھی کہ کبھی شیر آگے تو کبھی گولی آگے۔ جیسے ان دونوں میں دوڑ کا مقابلہ ہو رہا ہو اور ان میں سے ایک اوّل آنا چاہتا ہو۔ خیر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ آخر میں شیر نے ایک خالی مکان میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ گولی شیر کا پیچھا کرتی ہوئی دروازے پر آکر چپک گئی۔ بیس سال بعد جب شیر نے دروازہ کھولا تو بندوق کی گولی اسے لگی اور وہ مر گیا۔

تیسرا آدمی بولا۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میرے والد اس سے بھی بڑے شکاری ہیں۔ ایک بار میرے والد صاحب شکار پر گئے۔ وہاں وہ ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے اتنے میں ایک بھیڑیا آیا اور میرے والد پر حملہ کرنے لگا اس نے اپنے دانت میرے والد کے پیر میں چبھا دیے۔ جس سے پانو میں زہر پھیل گیا۔ ڈاکٹر کی صلاح سے انھیں پانو کٹوانا پڑا۔ اس کی جگہ ڈاکٹر نے گائے کی ٹانگ لگا دی۔ اب حالت یہ ہے کہ میرے والد صبح شام چار سیر دودھ آرام سے دیتے ہیں۔ بتاؤ ان سے بڑا شکاری کون ہوگا۔

چوتھے آدمی نے کہا میرے والد اس سے بھی بڑے شکاری ہیں۔ ایک دفعہ وہ ندی کے کنارے بیٹھے تھے کہ انھوں نے ایک بہت بڑی مچھلی دیکھی اور انھوں نے چھلانگ لگا دی۔ آج بیس سال گزر گئے۔ مگر میرے والد صاحب ابھی تک ندی سے مچھلی لے کر واپس نہیں لوٹے ہیں۔

راشد حیات ●
(نیو کریم گنج، گیا)

○ صبر کا پھل

کسی گانو میں ایک لڑکی رہتی تھی جس کا نام چندا تھا وہ بہت رحم دل، خوبصورت اور نیک لڑکی تھی۔ اس کا دنیا میں سوتیلی ماں اور سوتیلی بہن شبانہ کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ چندا جب ذرا بڑی ہوئی تو اس کی خوبصورتی بھی بڑھ گئی یہ دیکھ کر اس کی سوتیلی ماں اور سوتیلی بہن شبانہ اس سے جلنے لگیں اور اس پر طرح طرح کے ظلم کرنے لگیں۔ چندا تو تھی ہی بھولی بھالی اس لیے وہ یہ ظلم برداشت کر لیتی تھی لیکن جب وہ ذرا سمجھ دار ہوئی تو اس سے یہ ظلم برداشت نہ ہو سکے۔ ایک دن صبح سویرے وہ گھر سے نکل پڑی چلتے چلتے وہ ایک جنگل سے گزری، وہاں اسے ایک چھوٹی سی جھونپڑی نظر آئی چلتے چلتے وہ بہت تھک گئی تھی جس کی وجہ سے اسے شدت سے پیاس لگ رہی تھی جھونپڑی کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ وہ اس جھونپڑی میں داخل ہوئی تو اس نے ایک ضعیف بڑھیا کو دیکھا، چندا نے اس کو سلام کیا اور پانی مانگا چونکہ بڑھیا اٹھ نہیں سکتی تھی اس لیے بڑھیا نے اس کو مٹکا اور گلاس بتا دیا جس سے چندا نے پانی پی کر سکون کا سانس لیا اور جیسے ہی وہ واپس جانے کو ہوئی بڑھیا نے اسے بلا کر نہلانے کو کہا۔ چندہ نے بڑھیا کو نہلا کر اس کا سر صاف کیا جس سے بڑھیا بہت خوش ہوئی اور اس نے چندا کو دعائیں دیں پھر چندا بڑھیا کی جھونپڑی سے نکلی کافی دیر تک چلنے کے بعد اسے بھوک لگنے لگی، اس نے ایک درخت کے نیچے آرام کیا اور جنگلی پھل کھا کر اپنی بھوک مٹائی، اتفاق سے کسی ملک کا شہزادہ اسی جنگل میں شکار کرنے آیا تھا اچانک اس کی نظر چندا پر پڑی جو بہت خوبصورت تھی اس نے اتنی خوبصورت لڑکی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اس نے اسی وقت اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا چندا بھی راضی ہو گئی پھر شہزادہ چندا کو لے کر اپنے محل میں آیا جس نے بھی یہ خبر سنی وہ خوشی سے پھولا نہیں سمایا پھر بڑی دھوم دھام سے دونوں کی شادی ہوئی اور سب ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے اور چندا کو بھی

سوتیلی ماں اور سوتیلی بہن شبانہ کے ظلموں سے چھٹکارا ملا۔

روبینہ انجم
(بمبئی)

نو کاہل اور ایک پھرتیلا

کسی شہر میں نو کاہل آدمی رہتے تھے۔ وہ گاڑیاں بنا کر بازار میں بیچتے تھے۔ اسی شہر میں ایک پھرتیلا آدمی بھی رہتا تھا۔ وہ بھی گاڑیاں بناتا تھا اور وہ بھی ایک دن میں پوری نو گاڑیاں! جبکہ کاہل لوگ اگرچہ نو تھے لیکن مشکل سے دن بھر میں ایک گاڑی بناتے تھے اور بازار میں ان کی ایک گاڑی بھی بکنا مشکل ہو جاتی تھی۔ جب کہ پھرتیلے کی ساری گاڑیاں کھٹا کھٹ بک جاتی تھیں۔

پھرتیلے کی اتنی ترقی دیکھ کر کاہلوں نے سوچا کہ پھرتیلے کو اپنے ساتھ ملا لیا جائے مگر پھرتیلے نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو کاہل اس کی خوشامد کر کے کہنے لگے:

"ہمارے ساتھ مل کر کام کرو گے تو پیسے زیادہ ملیں گے۔"

آخرکار پھرتیلا تیار ہو گیا اور سب ایک ساتھ مل کر کام کرنے لگے۔ دن میں جب بھی گرمی پڑتی تو کاہل سائے میں بھاگ جاتے اور آرام سے سو جاتے لیکن پھرتیلا اپنے کام میں لگا رہتا۔

شام تک پھرتیلے نے اپنی نو گاڑیاں تیار کر لیں اور اس نے دیکھا کہ اس کی نو گاڑیاں بہت اچھی ہیں اور کاہلوں کی تیار کی ہوئی ایک گاڑی وہ بھی ٹیڑھی میڑھی ہے۔

پھرتیلے نے کاہلوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور اپنا کام اپنے آپ کرنے لگا۔ کاہل اس سے جلنے لگے اور سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔ وہ پھرتیلے کے صحن میں اس وقت پہنچے جب وہ گھر میں نہ تھا اور انھوں نے پھرتیلے کی گاڑیوں میں آگ لگا دی۔ جب پھرتیلا گھر لوٹا تو اس نے دیکھا کہ گاڑیاں جلی پڑی ہیں۔ کیا کرتا۔ وہ پھر سے کام میں جٹ گیا اور زیادہ تیزی سے کام کرنے لگا اور پہلے کی طرح گاتا بھی رہا۔

کاہل پھرتیلے کو دیکھ کر بڑے حیران ہوئے۔ وہ اس کے پاس آئے اور بولے:

"ہم نے سنا ہے کہ کسی نے تمھاری گاڑیاں جلا دیں۔" پھرتیلا بولا:

"کوئی بات نہیں میں نے تو اپنی گاڑیوں کی راکھ جمع کر کے بازار میں بیچ دی اور دیکھو کتنے سارے پیسے مجھ کو مل گئے۔"

کاہل فوراً اپنے گھر بھاگے اور اپنی ٹیڑھی میڑھی گاڑیوں کو جلدی سے جلا کر راکھ جمع کر کے بازار چل پڑے اور وہاں لگے زور زور سے ہانک لگانے۔

"گاڑیوں کی راکھ لے لو، راکھ لے لو، اچھی گاڑیوں کی راکھ۔"

ہنستے ہنستے لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ پہلے تو ان کی طرف اشارے کرتے رہے۔ پھر لکڑیاں لے کر کاہلوں کو بازار سے بھگا دیا۔

کاہل غصے میں آکر پھرتیلے کے یہاں دوڑے گئے۔ پھرتیلے نے جو دیکھا کہ کاہل پتھر اور ڈنڈے لیے چلے آ رہے ہیں تو وہ وہاں سے ایک میدان کی طرف بھاگ نکلا۔ کاہل اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ راستے میں پھرتیلے کو ایک امیر ملا جو گھوڑے پر سوار چلا جا رہا تھا۔ پھرتیلے نے اس سے کہا:

"جناب مجھے یہ لوگ پکڑ کر بادشاہ بنانا چاہتے ہیں اس لیے میں بھاگ کھڑا ہوا ہوں۔"

امیر کو بڑا غصہ آیا "دیکھو تو ان بیوقوفوں کو، کنگال کو بادشاہ بنا رہے ہیں! ارے مجھ کو بادشاہ بنانا چاہیے!" پھرتیلا بولا،

"تو آپ میرے کپڑے پہن لیجیے اور بھاگنے لگیے۔"

پھرتیلا امیر کے کپڑے پہن کر گھوڑے پر سوار ہو کر کاہلوں کی طرف لوٹا۔ کاہلوں نے اس کو نہیں پہچانا اور پوچھا: "تم نے پھرتیلے کو تو نہیں دیکھا"؟ پھرتیلا بولا

"ارے وہ تو ابھی ادھر بھاگ کر گیا ہے۔"

کابل امیر کے پیچھے بھاگ گئے اور پھر تیلا شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ شہر پہنچ کر اس نے گاڑیاں بنا کر بیچنے کا کام پھر سے شروع کر دیا اور آرام سے رہنے لگا۔

● فرخ ریحان خان

عرفان منزل، بدر باغ، علی گڑھ

○ غریب کی آہ

ایک بنارسی ذات کا راجپوت تھا۔ وہ بی۔اے کلاس میں پڑھتا تھا۔ کالج میں اس کا بول بالا تھا۔ وہ جدھر بھی جاتا، دس پانچ اسٹوڈنٹ اس کے ساتھ ہوتے۔ وہ اس قدر اپنے دوستوں پر حاوی تھا کہ تمام اس کی فطرت سے خائف رہتے۔ وہ بدترین بدمعاش تھا وہ نہ صرف استادوں بلکہ پرنسپل کی بھی بے عزتی کر چکا تھا۔ کوئی بھی اس کے ڈر سے کالج میں نہیں بولتا تھا۔ وہ جب بھی کالج آتا تو اس کے پاس چاقو یا ریوالور ضرور ہوتا۔ ایک دفعہ تو ایک دوست نے مذاق میں پوچھ لیا،

"یار ہر وقت ہتھیار لے کر کیوں چلتے ہو۔" اس پر اس نے بڑے میٹھے انداز میں جواب دیا۔

"دوست! جانتے ہو جب ہتھیار نہیں رہتا ہے تو خواہ مخواہ جھگڑا ہو جاتا ہے اور جب ہتھیار پاس رہتا ہے تو کوئی بغل میں بھی نہیں جھانکتا۔"

ایک دن وہ کالج آیا اور چپراسی سے پانی لانے کو کہا، مگر وہ چپراسی دوسرے کام سے کہیں چلا گیا۔ پھر اس نے ایک گھنٹی مارنے والے چپراسی کو حکم دیا۔ پانی لاؤ۔ چپراسی نے کہا، حاکم گھنٹی بجانے میں کچھ ہی منٹ باقی ہے۔ گھنٹی بجا کر پانی لا دیتا ہوں۔ اتنا کہنا تھا کہ اس نے چار پانچ تھپیڑ اس کو رسید کر دیے۔ وہ بیچارا منہ تکتا رہ گیا۔ اس چپراسی کو کالج میں رہتے ہوئے اکیس سال ہو گئے تھے۔ اس کے بنارسی جیسے کئی لڑکے تھے۔ اس نے کچھ جواب نہیں دیا اور خاموش ہو گیا۔

اس کے بعد ایک ساتھی نے ہوٹل میں پانی پینے کو کہا، ہوٹل کالج سے کچھ دوری پر تھا۔ وہ دونوں ہوٹل میں پانی پینے چلے۔ آدھا راستہ طے بھی نہ کر پائے تھے کہ ایک گاڑی بڑی تیزی سے دوڑتی ہوئی آئی۔ خدا کی شان۔ بنارسی سڑک کے دائیں طرف چل رہا تھا۔ گاڑی سے ٹکرا گیا اور وہیں مر گیا۔ پھر اس کا ساتھی دوڑتا ہوا کالج میں آیا۔ کچھ لوگوں کو اطلاع دی۔ شور غل مچ گیا۔ کچھ طالب علم کہہ رہے تھے۔ غریب چپراسی کی بددعا لگ گئی۔ کوئی کہتا غریب لڑکوں کی بددعا کا اثر ہے۔ اور پھر کالج میں چھٹی ہو گئی۔ لوگوں نے دیکھا بنارسی سڑک پر مرا پڑا ہے۔

● اظہر حسین انصاری

محلہ خدانگر۔ موتی ہاری ۸۴۵۴۰۱

○ رحمدل انسان

شا کا ایک بڑا رحم دل انسان تھا۔ اتنا دانشور ہونے پر بھی اس میں ذرا تکبر نہ تھا اس کی فطرت اتنی نازک تھی کہ اس کو غصہ کبھی نہیں آتا تھا۔ اس کے پاس ایک پیارا، چھوٹا شیر کا بچہ تھا۔ ایک دن شا کا کہیں باہر گیا تھا اور اس کے کمرے میں میز پر بتی جل رہی تھی اتنے میں نہ جانے شیر کے دل میں کیا آئی کہ بڑے زور سے میز پر کود پڑا اور جلتی ہوئی بتی گر پڑی اور وہ سب کاغذات جس کو تیار کرنے میں شا کا کو اٹھارہ سال لگے تھے جل کر خاک ہو گئے۔ جب شا کا گھر واپس آیا تو یہ حال دیکھ کر بڑا غمگین ہوا پھر بھی اس نے شیر کو کوئی سزا نہ دی۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا:

"اے شیر! تو نے جو میرا نقصان کیا ہے اس کی تجھے خبر نہیں۔"

● محمد نواب عتیق اظہر زاہدی۔ درجہ نہم

رانی گنج، اردو ہائی سکول

رانی گنج، بردوان

○ مغرور ہاتھی

ایک جنگل میں ایک ہاتھی رہتا تھا وہ مضبوط جسم والا اور بہت مغرور تھا، اپنے آپ کو جنگل کا راجا سمجھتا تھا۔ ایک دن کی بات ہے کہ اس کے گھر کے پاس ایک چڑیا نے ایک جھاڑی میں گھونسلا بنایا۔ وہ ہاتھی کی بڑی عزت کرتی تھی مگر ہاتھی اپنی طاقت کے نشے میں چور ہوکر اس کی پرواہ نہ کرتا تھا۔

ایک دن جب ہاتھی پانی پینے کے لیے اس جھاڑی کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس نے چڑیا کے ننھے ننھے بچوں کو گھونسلے میں دیکھا۔ اس وقت چڑیا دانہ چننے گئی تھی۔ ہاتھی نے سوچا: "ہمارے پڑوس میں ایک معمولی سی چڑیا۔" ہاتھی کو یہ سوچ کر بہت غصہ آیا اور اس نے چڑیا کے بچوں کو مار ڈالا اور پھر وہاں سے چلا گیا۔

چڑیا جب بچوں کو دانہ دینے آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کے بچے مرے پڑے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس کے دل کو بہت ٹھیس پہنچی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی۔ اس نے دل میں سوچا کہ ہو نہ ہو یہ سب ہاتھی نے کیا ہوگا مگر وہ اتنی چھوٹی ہے کہ ہاتھی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی پھر بھی وہ مغرور ہاتھی کے پاس گئی، اس کے سر پر بیٹھی اور بولی

"اے جنگل کے راجا تو نے یہ کیا ظلم کیا کہ میرے ننھے ننھے بچوں کو موت کی نیند سلا دیا کیا تجھے اپنے بڑے بے ڈول جسم پر اتنا غرور ہے کہ تو نے پڑوس کا بھی خیال نہیں کیا۔؟"

اس وقت ہاتھی غرور کے نشے میں چور تھا ایک دم بول پڑا:

"ہاں میں نے ایسا کیا ہے تو میرا کیا بگاڑ سکتی ہے" یہ سن کر چڑیا وہاں سے اڑ گئی اور پھر اس نے اپنی برادری کی چڑیوں کے پاس جاکر اپنے دکھ کا اظہار کیا اور ان سے مدد مانگی۔ وہ سب کی سب ایک ساتھ ہوا میں اُڑیں اور ہاتھی کے مغرور جسم پر موت کا سایہ بن کر منڈلانے لگیں۔ ان چڑیوں میں سے ایک چڑیا نے ہاتھی کی آنکھ کو پھوڑنا چاہا کہ دیکھتے ہی دیکھتے تمام چڑیاں ہاتھی پر تیروں کی طرح برسنے لگیں اور اس آنکھوں کو پھوڑ کر چلی گئیں۔

اب ہاتھی اندھا ہو چکا تھا بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر ایک دن مر گیا۔

تو دیکھا اپنے آپ پر غرور کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔

● خان پرویز احمد غلام نبی
بمبئی - ۱

○ عید مبارک

عید مبارک عید مبارک
چاند کی تم کو دید مبارک
روشن صبح عید مبارک
نکلا وہ خورشید عید مبارک
کپڑے اور خوش رنگ کھلونے
بر آئی اُمید مبارک
پہلے دیے بھیا نے پیسے
عید کی یہ تمہید مبارک
ماموں سے اب لیں گے پیسے
ان کو، کہہ کر عید مبارک
ہر خواہش ہر فرمایش پر
نانی کی تائید مبارک
کوثر نے خط میں لکھا ہے
بے بی تم کو عید مبارک
عارف نے گکو کو لکھا
سب بچوں کو عید مبارک
روٹھے دوست گلے ملے ہیں
الفت کی تجدید مبارک

سید شمس العارفین رضوی، ہائی سکول ہسپور (اورنگ آباد)

حجامت بنانے والے کی حجامت

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک گانو میں ایک لڑکا اپنے گھر کے میدان میں کھیل رہا تھا۔ اس لڑکے کے بال بہت بڑے تھے۔ اسے ہم اپنا بچہ بچن کہتے ہیں۔ اسی میدان میں ایک صاحب بچے کے پاس آئے۔ ان کے بھی بال ضرورت سے زیادہ بڑھ گئے تھے۔ ایسے بال ان کو پسند نہیں تھے۔ مگر بال تراشنے کے لیے بھی تو روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انھیں ایک ترکیب سوجھی ان صاحب نے لڑکے کے پاس جاکر اس کا نام پوچھا۔

لڑکا بہت ہوشیار تھا اس نے اپنا نام جاوید اقبال بتایا پھر لڑکے نے فوراً کہا: "جناب آپ کا اسم شریف کیا ہے" صاحب نے جواب دیا "میرا نام نور محمد ہے، آپ کے والد نے مجھ سے کہا کہ میرے بیٹے کے بال بہت بڑھ گئے ہیں اسے سیلون میں لے جاکر ذرا بال بنوا دیجیے۔ لڑکا بولا آپ میرے والد کو کیسے پہچانتے ہیں؟" صاحب نے کہا "میں آپ کے والد کا بہت پرانا دوست ہوں۔ انھوں نے کہا کہ میرے بیٹے کے بال جلدی بنا کر لے آؤ"۔

پھر ہمارے ناگپور میں "گولڈن سرکس" آیا ہے اسے دکھانے لے جانا" لڑکا سرکس کا نام سنتے ہی تیار ہو گیا۔ اب دونوں سیلون کی طرف روانہ ہوئے۔ سامنے ایک سیلون تھا۔ اس دکان میں صبح سے کوئی گاہک نہیں آیا تھا۔ دکان دار دونوں کو دیکھ کر ت خوش ہوا اور اپنے اوزار ٹھیک کرتے ہوئے بولا۔ "آئیے صاحب آئیے نا۔ صاحب نے اس دکان میں جاکر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "دونوں کی حجامت کا کیا لوگے" حجامت والا۔ "صاحب آرڈنری یا اسپیشل"؟ صاحب "اسپیشل کا کیا لوگے" حجامت والا۔ "صاحب آپ کے چار روپے، منا کے تین روپے" صاحب "اچھا تو بنا دو ذرا اچھا تراشنا۔ نائی: جناب بال ایسے تراش دوں گا کہ بستی بھر میں کوئی نائی ایسے بال نہیں تراشے گا میری دکان پر دور دور کے لوگ بال بنوانے آتے ہیں۔" نائی نے صاحب کے بال ایک گھنٹے میں تراش دیے اور اب منا کے بال بنانے کو کہا۔ منا کے بال بنانا شروع کیا۔ صاحب نے کہا "ذرا اچھے بنانا اور اگر پسند آئے تو انعام بھی ملے گا"۔ نائی "آپ فکر نہ کریں"۔ صاحب نے کہا "آپ بال بنائیے میں ذرا چاٹ کھا کر اور ہوٹل سے چائے پی کر آتا ہوں"۔ نائی نے لڑکے کے بال آدھے گھنٹے میں بنا دیے مگر صاحب کے آنے کا کوئی پتا نہیں تو نائی نے کہا: "منا آپ کے ڈیڈی نے بہت دیر لگا دی، کیا بات ہے؟" لڑکے نے کہا: "وہ میرے ڈیڈی نہیں ہیں"۔ "تو چچا ہوں گے؟" "وہ میرے چچا بھی نہیں ہیں"۔ "تو ماموں ہوں گے"۔ اب لڑکا فوراً بول پڑا۔ "ذرا منہ سنبھال کر بات کرو وہ میرے کوئی نہیں ہیں۔ مجھے میدان سے پکڑ لائے ہیں، کہتے تھے بیٹا تمھارے بال بہت بڑھ گئے ہیں۔ چلو میرے ساتھ بال کٹوا دوں یہ سنتے ہی نائی بے چارہ بہت پریشان ہو گیا وہ فوراً اس سڑک کے ہوٹل کی طرف لپکا۔ لڑکا بھی بہت چالاک تھا۔ وہ نائی کی چال سمجھ گیا۔ اس کے نکلتے ہی وہ بھی اس دکان سے بھاگ نکلا۔ ادھر بے چارے نائی نے تمام ہوٹلوں کو چھان ڈالا مگر جب صاحب کا کوئی پتا نہ چلا تو یہ سوچ کر وہ دکان کی طرف لپکا کہ چلوں لڑکے سے تو پیسے وصول کر لوں مگر جب نائی دکان پر پہنچا تو لڑکا بھی فرار ہو چکا تھا۔ نائی اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا اب تک تو میں لوگوں کی حجامت کرتا تھا مگر اب یہ دونوں باپ بیٹے میری ہی حجامت بنا گئے۔

● افسر اقبال
نہرو کالونی، کواٹر ۲۵ نمبر کے سامنے (ناگپور)

○ ایمان دار نوکر

کپڑے کے ایک تاجر نے اپنی دکان میں ایک نئے لڑکے کو نوکر رکھا۔ اس لڑکے کا باپ غریب تھا۔ باپ نے اپنے بیٹے کو اسکول کی تعلیم نہیں دلائی تھی۔

لیکن گھریلو تعلیم اسے دی گئی تھی۔ "ایمانداری کا برتاؤ کریں، کسی کو فریب نہ دیں، کسی کی ہنسی نہ اڑائیں، محنت سے کما کر کھائیں، چوری اور مکاری کر کے دولت کی بجائے ایمانداری اور سچائی کی راہ پر چل غریبی میں زندگی گزارنی پڑے تو بھی خوش رہنا چاہیے۔" ایسی باتیں لڑکے کا باپ اسے سکھاتا تھا۔ مختلف سبق آموز کہانیاں سنا کر اس نے اپنے بیٹے کے ذہن کو سچائی کی طرف موڑ دیا تھا۔

لڑکا چست و چالاک تو تھا ہی لیکن حق پرست، شیریں زبان اور دیانت دار بھی تھا۔ دکان میں سب اسے پسند کرتے تھے۔ اس کی طرف زیادہ گاہک آتے تھے اور دوسرے نوکروں کی طرف کم جاتے تھے۔ باتوں میں مٹھاس، چہرہ پر معصومیت اور دل میں پیار کی حلاوت، ایسے بچے گویا پھول ہوتے ہیں۔

ایک دن ایک امیر خاتون کچھ ریشمی کپڑا خریدنے آئی۔ اس نے ایک ریشمی ساڑی پسند کی۔ اسے کپڑا، رنگ اور ڈیزائن بھا گیا۔ لڑکا وہ ساڑی باندھ کر دے رہا تھا لیکن اسی اثنا میں ساڑی کے پھٹے ہوئے حصہ پر لڑکے کی نظر پڑ گئی۔ اس عورت نے یہ نہیں دیکھا۔ لیکن وہ لڑکا ایماندار تھا۔ اس نے عورت سے میٹھے لفظوں میں کہا: "آپا جان! آپ یہ ساڑی نہ لیجیے یہ ذرا سی پھٹی ہوئی ہے آپ دوسری ساڑی پسند کیجیے۔ یہاں اور بھی ساڑیاں موجود ہیں۔"

لیکن عورت کو ویسی ہی ساڑی چاہیے تھی ویسی دوسری ساڑی دکان میں نہ تھی۔ وہ عورت چلی گئی۔

دکان دار گدی پر بیٹھا ہوا تھا۔ نوکر کا یہ رویہ دیکھ کر اسے غصہ آ گیا۔ "ایسا نوکر کس کام کا؟ اس کی وجہ سے تو دیوالا نکالنا پڑے گا۔" وہ دل میں بڑبڑایا۔

دکان دار نے ایک خط نوکر کے والد کے نام لکھ کر اسی کے ہاتھوں روانہ کیا جس میں لکھا تھا: "آپ کا لڑکا دکان میں کام کرنے کا اہل نہیں ہے۔ ایسا نوکر رکھنے سے مالک کو فوراً ہائے ہائے کرنے کی باری آجائے گی۔ میں آپ کے لڑکے کو برطرف کرنا چاہتا ہوں۔"

باپ نے خط پڑھا اور لڑکے سے حقیقت دریافت کی۔ لڑکے نے جواب دیا: "مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔ آپ جا کر مالک سے تفصیل معلوم کر سکتے ہیں۔"

باپ اور بیٹا دونوں دکان میں پہنچے۔ باپ سیٹھ جی کے پاس جا کر پوچھ تاچھ کرنے لگا تب سیٹھ جی آگ بگولہ ہو کر کہنے لگے "ارے صاحب وہ عورت ساڑی خرید رہی تھی۔ ساڑی باندھ کر دینا اس کا کام ہے! دکان کے مال پر نکتہ چینی کرنا ضروری تھا؟ وہ ساڑی کہیں پر ذرا سی پھٹی ہوئی تھی اور پھر اس عورت کا دھیان بھی نہیں تھا۔ اس نے دیکھ لیا اور خود عورت سے کہنے لگا۔

"آپا جان! یہ ساڑی مت خریدیے یہ ذرا سی پھٹی ہوئی ہے۔" اس طرح کہیں دکان چلتی ہے۔ اب پچیس روپے کا مال رہ گیا ہے دکان میں!" یہ سب سن کر لڑکے کے باپ نے کہا "اس کا اور کوئی گناہ ہے کیا؟"

"نہیں ویسے وہ بہت اچھا ہے۔ میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے، لیکن صرف مٹھاس کو کیا چاٹیں گے؟ بیوپار سب سے مقدم ہے۔ بیوپار کے لیے مٹھاس، بیوپار کے لیے تلخی، بیوپار کے لیے سچائی اور بیوپاری کے لیے مکاری بھی ہونا چاہیے۔" سیٹھ جی نے کہا۔

"میرے لڑکے کا اگر صرف اتنا ہی گناہ ہے تو پھر میں اسے آپ کی دکان میں رکھنا نہیں چاہتا ہوں۔ آپ کا نقصان نہیں ہونا چاہیے اور اس کی بھی زندگی خراب نہیں ہونی چاہیے۔" اتنا کہہ کر باپ اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر چلا گیا۔

اس لڑکے کا یہ کارنامہ لوگوں میں گفتگو کا موضوع بن گیا۔ چاروں طرف اس کی ایمانداری کا چرچا ہو گیا اور ایک مشہور دکان دار نے اسے اپنی دکان میں کام کرنے کی پیش کش کی۔ وہ نئی دکان پر حاضر ہو گیا۔ لڑکا دکان میں کام کرنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے دکان کی فروخت

دس گنا ہو گئی۔ اس نئے مالک نے کچھ دنوں بعد اسے اپنی دکان کا شراکت دار بنالیا اور وہ لڑکا سکھی ہو گیا۔
وہ لڑکا اپنے ضعیف والدین کو پیار سے کہتا ہے "تم نے مجھے ایماندار بنایا اس کا یہ پھل ہے اور اگر یہ پھل نہ ملتا تو ہم غریب ہی رہتے تب بھی ہیں سکون اور چین سے رہتا کیونکہ دل کا سکون سب سے بڑی دولت ہے جس کا ضمیر اسے کوستا ہے اور دل اندر ہی اندر گھٹتا ہے وہ کتنا ہی دولت مند ہو دکھی اور غریب ہی ہوگا۔"

● غنی غازی
انجمن خیر الاسلام اردو ہائی سکول۔ بمبئی

٥ امتحان

علیم اور عزیز بہت گہرے دوست تھے یہ میرے ساتھ ہی تعلیم پا رہے تھے۔ عزیز اس وقت کے سب سے زیادہ امیر و رئیس عبدالسلام صاحب کا بیٹا تھا اور علیم ایک اوسط طبقے کا لڑکا تھا۔
عزیز نمبر ایک کا بدمعاش، آوارہ اور غنڈہ تھا۔ گھر تو گھر محلے کے بچے اور اسکول کے بچے اس کی شرارتوں سے عاجز تھے، تمام ٹیچر بھی اس کی شرارتوں سے پریشان تھے۔ سب ہی ٹیچروں نے اسے سمجھایا۔ پیار سے، محبت سے، مارپیٹ سے لیکن عزیز اپنی شرارتوں سے باز نہیں آیا۔
اسی طرح وقت گزرتا رہا آخر امتحان سر پر آ کھڑا ہوا۔ لیکن پھر بھی اس کی شرارتوں میں کمی نہیں آئی میں نے بھی اُسے بہت سمجھایا لیکن وہ تو ایک چکنے گھڑے کی مانند تھا جس پر پانی ڈالنے سے کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امتحان کی گھڑی بھی گزر گئی آج اس کا نتیجہ نکلنے والا تھا اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ گھبرایا ہوا ہے۔ آخر وہ گھڑی بھی آگئی۔ کلاس ٹیچر امتحان کا نتیجہ لیے کلاس میں داخل ہوئے اور نتیجہ سنانا شروع کیا پہلے نمبر پر میں تھا دوسرے نمبر پر ذوالفقار اور تیسرے نمبر پر علیم کا نام آیا اس طرح سب ہی لڑکے پاس ہو گئے تھے لیکن صرف عزیز ہی ناکام..... زندگی میں پہلی بار عزیز کو شرمندگی کا احساس ہوا۔ صبر و تحمل کے باوجود اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ آج اُسے احساس ہوا کہ دولت اور شرارت ہی سب کچھ نہیں ہے۔
اسے اپنے پیارے دوستوں کی جدائی کا احساس ہوا خاص کر علیم کا..... وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ہماری کلاس ٹیچر وسیم آرا جو کہ ایک اچھی ٹیچر ہیں انھوں نے سمجھایا۔
"عزیز یہ تو صرف اسکول کا امتحان ہے اس میں تو آج نہیں تو کل پاس ہو جاؤ گے۔ لیکن اس زندگی کے امتحان میں جو انسان ایک مرتبہ ناکام ہو جائے تو اس کو دوسرا موقع نہیں دیا جاتا تمھیں اپنے عزیز دوستوں کا غم ہے نا لیکن وہاں تو تمھارے ماں باپ بھی تم سے جدا ہوں گے تب نہ تمھاری دولت کام آئے گی اور نہ عزیز و اقارب اب جو وقت گزر گیا اُسے بھول جاؤ اور نئے امتحان کی تیاری کرو۔"
جانتے ہو میرے پیارے ساتھیو ان جملوں کا عزیز پر کیا اثر ہوا..... اس کے بعد ہی عزیز نے اپنی ساری شرارتیں ترک کر دیں محنت و لگن سے پڑھنے لگا اب وہ نہ کوئی شرارت کرتا ہے اور نہ کسی کو کوئی تکلیف دیتا ہے۔ اب تو وہ ایک اچھے طالب علم کی حیثیت سے تعلیم حاصل کر رہا ہے۔
اس طرح میرے عزیز بھائیو و بہنو آپ بھی ناکامی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ہمیشہ کامیابی کی منزلیں طے کرتے رہنا اسی میں ہماری بھلائی ہے۔

● محمد شمس الحسن برہانی
نیشنل ہائی اسکول، جونا بازار اورنگ آباد ۱۰۰۱ ۴۳۱

مضامین	صاف، خوشخط، کاغذ کے ایک طرف اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں۔ ورنہ مضامین واپس کر دیے جائیں گے۔ ایڈیٹر

فنکار
ایڈیٹر
پیام تعلیم
لکھیے کون سی تصویر پہلے انعام کی مستحق ہے
مرزا الیاس بیگ (نرمل)
بکرا
شمس الدین
کلکتہ
M.S.A.Q.

بچوں کی کتابیں
ریڈیو پیچر
(جگن ناتھ آزاد)
بچوں کی دل چسپی کے دو مزیدار ڈرامے۔ یہ دونوں ڈرامے ریڈیو سے نشر بھی ہو چکے ہیں۔
قیمت: ۲/۲۵
اُردو کیسے لکھیں
(رشید حسن خاں)
ہم سب اُردو لکھتے اور پڑھتے ہیں، لیکن صحیح اُردو کیا ہے اور کس طرح لکھنا چاہیے، یہ اسی کتاب سے معلوم ہو سکے گا۔
قیمت: ۴/۰۰
گاندھی بابا کی کہانی
(بیگم قدسیہ زیدی)
اس خوب صورت مصور کتاب میں مہاتما گاندھی کی زندگی نہایت آسان اور سبق آموز پیرایے میں لکھی گئی ہے۔
قیمت: ۴/-
پلک نہ مارو
(یوسف ناظم)
دل جسپ مزاحیہ کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ۔ مزیدار کہانیوں والی ایسی کتاب جس کے پڑھتے وقت بچوں میں چھینا جھپٹی کا اندیشہ رہتا ہے۔ آپ بھی پڑھیے اور لطف لیجیے۔
قیمت: ۲/۰۰
جب اور اب
بچوں کی دلچسپی والی ۵۰، ۶۰ سال باتیں جو اب پرانی ہو چکی ہیں۔
تین اناڑی
عصمت چغتائی
گگو، ببلو اور ٹیٹو۔ تین نٹ کھٹ لڑکوں کی شرارتوں پر مبنی ایک دلچسپ ناول جو آسان زبان میں لکھا گیا ہے۔
قیمت ۳/-
ترجمہ
قرۃ العین حیدر
جن حسن عبدالرحمن
الہ دین کے چراغ کی کہانی تو اب پرانی ہو گئی لیکن اب تو اس جن کا قصہ تمام بچوں کی زبان پر ہے جسے حال ہی میں ایک سکنڈری اسکول کے بچے نے صراحی کی قید سے آزادی دلائی ہے۔
حصہ اول ۲/۵۰، حصہ دوم ۲/۵۰
(سیفی پریمی)
کہاوت اور کہانی
روزمرہ بولی جانے والی کہاوتوں اور کہانیوں کا دلکش مجموعہ جن کی وجہ سے کہاوتیں وجود میں آئیں۔
قیمت: ۲/۵۰
سرکس
تزئین کار: ڈین گیسپر
سرکس دیکھنا اور تصویروں میں رنگ بھرنا بچوں کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ اس کتاب میں سرکس کی ڈھیر ساری تصویروں کے خاکے ہیں جن میں بچے شوق سے رنگ بھر سکتے ہیں۔
قیمت ۱/۵۰
دہلی
بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی

Regd No D SE)-043 November 1982

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

پیامِ تعلیم

پھر میں چگوں کیا خاک
نہایت آسان زبان میں
چھوٹے بچوں کے لیے
ایک کہانی
قیمت ۱/۵۰
پان کھاکر، طبلہ بجاکر رام ناچا
ایک مزے دار کہانی
جو خاص طور سے چھوٹے بچوں کے
لیے لکھی گئی ہے
قیمت ۱/۵۰
تاک دِنا دن تا کے سے
چھوٹے بچوں کے لیے
چھوٹے چھوٹے جملوں میں لکھی گئی
مزے دار کہانی
قیمت ۱/۵۰
پکڑ ڈم کٹے کو
ایک گدھے نے شیر کو بھگا دیا۔
بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ چھوٹے
بچوں کے لیے۔ قیمت ۱/۵۰
ہپّو جپّو
یہ کہانی بھی چھوٹے بچوں
کے لیے لکھی گئی ہے، انھیں
کی زبان میں۔ قیمت ۱/۵۰
پانچ بونے
پانچ کام چور بونوں
کی کہانی چھوٹے بچوں کے
لیے۔ قیمت: ۱/۵۰
روٹی کس نے پکائی
چھوٹے بچوں کے لیے انھی
کی زبان میں ایک دلچسپ
کہانی۔ قیمت ۲/۵۰
بچوں کے لیے عبدالواحد سندھی جامعی کی کتابیں
جادو کا گھر
چھوٹے بچوں کے لیے آسان زبان
میں لکھی گئی ایک مزے دار
کہانی۔ قیمت ۱/۵۰
چیونٹی رانی
کہانی کی کہانی اور معلومات
کی معلومات۔
قیمت ۱/۵۰
بچوں کی کہانیاں
قیمت ۱/۵۰
قیمت ۱/۵۰
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
دہلی
بمبئی ۳
علی گڑھ ۱
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
مدورانا پردیس چلے
مگر کیسے چلے؟ اور راستے میں کیا
کیا ہوا، یہ تو پڑھنے
سے ہی پتا چلے گا۔
قیمت: ۱/۵۰

دسمبر ۱۹۸۲ء جلد ۱۹ شمارہ ۱۲

اڈیٹر: ولی شاہجہاں پوری

قیمت فی پرچہ: ۱/۷۰

سالانہ ۱۶ روپے
غیر ممالک سے ۷۵ روپے

بچوں سے باتیں

۱۹۸۲ء کا آخری شمارہ حاضر ہے نومبر کا مہینا دلی میں بڑی سرگرمیوں کا مہینا گزرا۔ نویں ایشیائی کھیلوں کی وجہ سے کئی ملکوں کے ہزاروں کھلاڑیوں کے علاوہ ہزاروں شائقین ملک کے کونے کونے سے یہ کھیل دیکھنے کے لیے راجدھانی میں جمع ہوئے۔ روشنی اور مٹھائیوں کے تیوہار دیوالی نے بھی دلی کی رونق کو دوبالا کر دیا۔

۱۴ نومبر کو معمول کے مطابق یوم اطفال پنڈت نہرو کی ۹۳ ویں سالگرہ کے موقع پر دھوم دھام سے منایا گیا ہے۔ ۱۹ نومبر کو وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی ۶۵ ویں سالگرہ بھی سادگی کے ساتھ منائی گئی۔

اس مرتبہ یوسف ناظم صاحب آپ کے لیے اچھے اچھے میوے لائے ہیں۔ پڑھ کر اگر سچ مچ آپ کے منہ میں پانی بھر آئے تو تھوڑے سے بہت خرید کر چکھ بھی لیجیے گا۔ یقین ہے ان کے ادیب ہونے کے ساتھ آپ ان کی طبی معلومات کے بھی قائل ہو جائیں گے۔

عبدالمتین نیاز صاحب نے طویل خاموشی کے پیامِ تعلیم کو یاد کیا ہے اور عمدہ چیز پیش کی ہے۔

محبوب راہی صاحب کی نظم بھی پڑھیے۔

برما کی ایک کہانی کا دلچسپ ترجمہ محمود نقوی صاحب، عبدالخالق ناگپوری کی کہانی "انعامی کوپن اور موٹر کار" اے ڈبلو شاکرہ صاحبہ کی "رمضانی شعبانی" بھی پڑھنے اور لطف لینے کی چیزیں ہیں۔

کاغذ کے ساتھ طباعت کے دوسرے سامان کی قیمتیں اتنی بڑھ گئی ہیں اور بڑھتی جا رہی ہیں کہ موجودہ قیمت پر "پیامِ تعلیم" جاری رکھنا محال نظر آتا ہے۔ مجبوراً پیامِ تعلیم کا سالانہ چندہ سولہ روپے اور ایک پرچے کی قیمت ایک روپیا ستر پیسے کر دینا پڑی۔ جو حضرات دسمبر میں چندہ بھیجیں گے ان سے موجودہ قیمت ہی قبول کی جائے گی۔

پرنٹر، پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹوڈی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

ایک آدمی روزانہ مچھردانی لگا کر سویا کرتا تھا۔ دو ایک مچھر مچھردانی میں روزانہ ہی گھس جایا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے مچھردانی لگائی اور چارپائی کے نیچے لیٹ گئے۔ اس دن اندھیری رات تھی، اتفاق سے ایک جگنو مچھردانی پر آپہنچا۔ آدمی بڑی حیرت سے کہنے لگا: روز تو ویسے ہی آیا کرتے تھے آج تو ٹارچ لے کر ڈھونڈنے آئے ہیں۔

شکیل احمد سرائے رحمٰن علی گڑھ

بارش میں بھیگتا ہوا ڈاکیا آیا اور دروازے پر آواز دی "خط لے جاؤ" نوکر نے نکل کر کہا:
بھائی اتنی بارش میں کیوں آئے خط ڈاک سے بھجوا دیا ہوتا۔

عابد، جامعہ نگر۔ نئی دہلی

رمضان کے دنوں میں ایک فقیر سنّی کے گھر آیا۔
فقیر: "بابو فطرہ دو"
سنّی: "معصومیت سے، فطرہ نہیں پکا ہے۔

صداقت حسین، برہپور

استاد: (جغرافیہ پڑھاتے ہوئے) سونا کان سے نکالا جاتا ہے
شاگرد: اچھا! اب میں سمجھا کہ آپ کان کیوں پکڑتے ہیں۔

ارم واسع۔ بٹلا ہاؤس، دہلی

استاد (جاوید کو نقشہ دکھاتے ہوئے) یہ کون سا ملک ہے
جاوید: امریکہ
استاد: (عارف سے) امریکہ کا پتا کس نے لگایا؟
عارف: جاوید نے۔

محمد شمیم صدیقی، کلٹی

دو آدمی آپس میں لڑ رہے تھے
پہلا آدمی: میں تمہارے بتیس ۳۲ دانت گرا دوں گا۔
دوسرا آدمی: میں تمہارے چالیس دانت گرا دوں گا۔
چالیس دانت والی بات سن کر ایک تیسرا آدمی مخاطب ہوا اور کہنے لگا۔
بھائی بتیس ۳۲ دانت تو ٹھیک ہے۔ مگر یہ چالیس والا معاملہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔
اس پر دوسرا آدمی بولا تم خاموش رہو جی! مجھے معلوم تھا تم بیچ میں بولو گے میں تمہارے آٹھ دانت گرا دوں گا۔

زکریا احمد، نانڈیڑ

"آج کل ہم نے کبھی آپ کو گاتے نہیں سنا۔ خیر تو ہے۔
"ڈاکٹر صاحب نے گانے سے منع کر دیا ہے"
"اچھا! تو کیا ڈاکٹر صاحب آپ کے پڑوس میں رہتے ہیں؟"

نکہت فیضان، کلکتہ۔ ۱۶

قدیر: (وسیم سے) مرغی انڈے پر کیوں بیٹھتی ہے۔
وسیم: اس لیے کہ اس کے پاس کرسی نہیں ہوتی۔

صالح، اوکھلا۔ نئی دہلی

سالگرہ پر ایک دعائیہ نظم

عبدالمتین نیاز

(ننھے منّے پیامیوں کے لیے)

تو شگفتہ گلاب سی عُظمیٰ
میری پیاری سی بولتی گُڑیا
تیری معصوم بے ریا باتیں
زندگی بخشتی ہیں کتنوں کو
شوخیاں اور شرارتیں تیری
بانٹتی ہیں ہنسی کی سوغاتیں
قہقہوں کی حسین پھلجھڑیاں!
تو کسی گھر کا ہے چراغ مگر
میری آنکھوں میں صورتِ مہتاب
جگمگاتی ہے آج برسوں سے
گود میں لے کے بارہا تجھ کو
اپنے بچپن کے خواب دیکھے ہیں
تیری پیشانی چوم کر میں نے
غم سبھی دل سے نوچ پھینکے ہیں
تیری شادابیوں کے جھرمٹ میں
اپنے دل کی خزاں بھُلا دی ہے
تو ہوائے بہار کا جھونکا
تو چمن کی شگفتگی کا نصاب

کیا خبر تجھ کو اِس چمن سے پرے
زندگی کا اک اور روپ بھی ہے
گھُنج کا صحرا، گرم دھوپ بھی ہے
درد کی تیز و تند لہریں ہیں
کتنے طوفان ہیں سوالوں کے
دہشتیں خون میں سرایت ہیں
خوف لپٹا ہوا ہے روحوں سے
منتشر ہیں تمام فکر و خیال
سارے اعصاب میں تشنج ہے
منتظر ہیں ہلاکتیں اپنی!
خوفناک ایٹموں کی صورت میں
تو شگفتہ گلاب سی عُظمیٰ
اپنی معصومیت کی خوشبو سے
اپنی مسکانیں بانٹ دے ہم میں
تاکہ ہم ساری نفرتیں کھو کر
تیرے جیسے عظیم بن جائیں
اپنی سب قہرمانیاں تج کر
بس رحیم و کریم بن جائیں

بنتی ہیں، بسکٹ بھی بنتے ہیں لیکن ان میں بس اتنا ہی بادام ہوتا ہے جتنا کہ کھانے میں نمک ہوتا ہے۔ مزے کے لیے مٹھائی اور بسکٹ کھالو تو کھالو لیکن طاقت کے لیے تو بادام ہی کھانے پڑیں گے۔ اب بادام کا مزا آپ کو کیسے سمجھائیں یہ میٹھے تو نہیں ہوتے لیکن کہلاتے میٹھے ہی ہیں کیونکہ ان میں کچھ نہ کچھ تو مٹھاس ہوتی ہی ہے۔

اور اگر کوئی بادام کڑوا نکل گیا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوا کھالی۔ یہ دوا سے بھی زیادہ کڑوا ہوتا ہے۔ بادام کو سوکھے میووں میں وہی درجہ حاصل ہے جو جنگل میں شیر کو، پہاڑوں میں ہمالہ کو اور اسکول میں ہیڈ ماسٹر کو حاصل ہے اس لیے جب بھی۔ بادام کھائیے ان تینوں کو ذہن میں رکھیے۔

کشمش: کشمش اُسے کہتے ہیں جس میں فوراً چیونٹیاں لگ جاتی ہیں۔ وہ بھی لال چیونٹیاں جو کتنا ہی بھگاؤ جاتی ہی نہیں۔ کشمش سے چمٹ جاتی ہیں اور ویسے ہی چمٹے چمٹے جان دے دیتی ہیں۔ کشمش بہت میٹھی ہوتی ہے۔ بچے تو اسے شوق سے کھاتے ہیں لیکن جیسے ہی پیپرمنٹ یا لالی پاپ دیکھتے ہیں تڑپ اٹھتے ہیں۔ کشمش میں یہ کشمش نہیں ہوتی لیکن یہ ہوتی بہت اچھی چیز ہے۔ شیر خورمے میں تو گھل کر ایسا مزہ دیتی ہے کہ بس! ۔ (آیا نا منہ میں پانی) کشمش کے بغیر کوئی میٹھا تیار نہیں ہو سکتا بلکہ یہ لو سالنوں اور پلاؤ میں بھی پڑنے لگی ہے۔ بازار میں جو چڑوا ملتا ہے اس میں بھی کہیں کہیں کشمش ضرور موجود رہتی ہے جس طرح بادامی رنگ مشہور ہے اسی طرح کشمشی رنگ بھی مشہور ہے اور اکثر بچیوں کے بال کشمشی رنگ کے ہوتے ہیں۔ یہ پیدائشی ہوتے ہیں کہیں آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ کشمش کھانے سے کشمشی ہوجاتے ہیں۔

کشمش میں چیونٹیاں لگ جائیں تو انھیں دھوپ میں رکھنے سے چیونٹیاں کہیں اور چلی جاتی ہیں لیکن مشکل یہ ہوتی ہے کہ انھیں چڑیاں کھالیتی ہیں۔ چڑیاں تو بس تاک میں رہتی ہیں کہ کہیں کوئی چیز رکھی ملے اور یہ اسے کھائیں کھانے کے بعد گانا بھی گاتی ہیں۔ ان میں عقل کم ہوتی ہے۔ خاموشی سے سبھی کھاتی رہیں تو کسی کو پتا بھی نہ چلے کہ کیا کر رہی ہیں۔

کاجو: مزے میں یہ بھی بہت اچھے ہوتے ہیں بلکہ سچ پوچھیے تو کاجو ہی کھانے میں زیادہ مزا آتا ہے۔ کھائے چلے جاؤ جی ہی نہیں بھرتا لیکن ہوتے یہ بھی بہت مہنگے ہیں۔ یہ جتنے بڑے ہوں گے اتنا ہی ذائقہ دار ہوں گے بڑے کاجو دیکھنے میں بھی بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ پلیٹ میں کوئی چیز رکھی ہے۔ یہ مونگ پھلی کی طرح زمین کے اندر سے نہیں نکلتے۔ ان کے درخت ہوتے ہیں اور ان پر یہ کاجو صاف نظر آتے ہیں کہ کاجو ہیں۔ ان کا رنگ سفید ہوتا ہے اس لیے کوئی یہ نہیں کہتا کہ ہمیں کاجو کے رنگ کا نیکر کا کپڑا دو۔ لوگ سنیں گے تو ہنسیں گے اس لیے آپ بھی کبھی یہ نہ کہیے لیکن کاجو ملیں تو ضرور کھائیے کچے کاجو بھی ملتے ہیں۔ اچھے کاجو بھی ملتے ہیں اور نمکین کاجو بھی یہ سب کاجو ہوتے ہیں۔

پستہ: ہاں یہ اصلی سوکھا میوہ۔ کچھ لوگ تو کہتے ہیں یہ بادام سے بھی زیادہ شاندار ہوتا ہے۔ اس کا رنگ مشہور ہے۔ پستئی رنگ۔ یہ ہرے اور دھانی رنگ کے بیچ میں ہوتا ہے۔ پستہ ہوتا بہت اچھا ہے لیکن کم کھایا جاتا ہے بادام اور کاجو کی طرح زیادہ نہیں۔ یہ بہت چھوٹا ہوتا ہے اور یہ بھی ایک ڈبی میں ہوا کرتا ہے لیکن ڈبی چاروں طرف سے بند نہیں ہوتی۔ اس کا منہ کھلا رہتا ہے اس لیے اس میں دھوکا نہیں ہوتا۔ لیکن پستہ بھی زیادہ ذائقہ والا ہوتا ہے اس میں مشکل یہ ہوتی ہے کہ منہ میں ڈالو تو یہ فوراً ختم ہوجاتا ہے۔ یہ ہوتا ہی کتنا ہے لیکن آپ قیمت سنیں گے تو گر جائیں گے اس لیے ہم آپ کو کسی کی بھی قیمت نہیں بتائیں گے اور یوں بھی ہم کوئی ڈرائی

مرچنٹ تھوڑے ہی ہیں۔

خوبانی: یہ بھی خوب چیز ہوتی ہے۔ اس کا چھلکا خوب موٹا ہوتا ہے اور یہی چھلکا خوبانی ہوتا ہے۔ کوئی بھی ایک دو خوبانی سے زیادہ کھا نہیں سکتا۔ منہ دکھنے لگتا ہے لیکن خوبانی کا جب میٹھا بنتا ہے تو سب اس پر مکھیوں کی طرح گرتے ہیں۔ خوبانی میں کمال کی بات یہ ہے کہ اس چھلکے کے اندر ایک ڈبی ہوتی ہے بہت چھوٹی سی اور اس کے اندر سے بھی ایک چیز برآمد ہوتی ہے جو بالکل بادام کی طرح ہوتی ہے۔ اسے خوبانی کا بیج کہا جاتا ہے اور کچھ لوگ ان بیجوں کی بادام میں ملا کر بیچ دیتے ہیں۔ دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔

بادام، کاجو اور پستے کو باریک باریک کاٹا جائے تو یہ رہتا سوکھا میوہ ہی ہے لیکن اسے ہوائیاں کہتے ہیں کیوں کہتے ہیں ہمیں کیا معلوم؟ پھر بھی ہمارا خیال ہے کہ یہ ہوا کی طرح نرم و نازک چیز ہوتی ہے اسی لیے اسے ہوائیاں کہتے ہوں گے۔

اب ہم ایک چیز کا نام اور لیں گے اور وہ ہے کھجور اور یہ ہمیں اس لیے سب سے زیادہ پسند ہے کہ اس کے بغیر شیر خورمہ نہیں بن سکتا۔ یہ کھجور بھی شیر خورمے میں ہوائی بن جاتی ہے۔

محبوب راہی

نہ مکار ہوں میں، نہ غدار ہوں
میں مالک کا اپنے وفادار ہوں
بتاتا ہوں جو کچھ مرا کام ہے
میں کتا ہوں "ٹامی" مرا نام ہے
بڑی تندہی سے مگر رات بھر
نگہبانی کرتا ہوں میں جاگ کر
ہو آہٹ تو بس بھونک دیتا ہوں میں
مگر چور کو کاٹ لیتا ہوں میں
مکانوں میں کھیتوں میں کھلیان میں
سبھی لوگ بے فکر سوتے رہیں
مزے سے یہاں کھاتا پیتا ہوں میں
کہ مالک کا اپنے چہیتا ہوں میں
مگر میرے بھائی جو آوارہ ہیں
نکمے ہیں، کاہل ہیں، ناکارہ ہیں
کہ پیچھے سبھی کے ہلاتے ہیں دُم
جھڑک دے کوئی تو دباتے ہیں دم
جہاں جو بھی مل جائے کھا لیتے ہیں
جلن پیٹ کی وہ بجھا لیتے ہیں
نہ تو قدر اُن کی نہ عزت کوئی
کسی کو نہیں ان سے چاہت کوئی
نہیں اپنی عزت کا جن کو خیال
جہاں بھر میں رہتے ہیں وہ پائمال

متصل گزری مسجد، پارسی تاکلی، ۴۴۴۴۰۱

س: زمانہ ما قبل تاریخ سے کیا مراد ہے؟

نزاکت علی

ج: انسان نے تقریباً پانچ ہزار سال پہلے لکھنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ اس عہد کے انسان اپنی اہم باتیں پتھر، جانوروں کی کھال، ہڈیوں، مٹی کی تختیوں یا کاغذ پر لکھتے تھے۔ چوں کہ انسان کے لیے اہمیت رکھنے والی ہر چیز تاریخ کا حصہ ہوتی ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری تحریری تاریخ بھی پانچ ہزار سال پرانی ہے مگر اس دنیا میں اس مدت سے بھی پہلے انسان رہتا بستا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق ایسا یا اُس سے ملتا جلتا انسان پانچ لاکھ سال پہلے موجود تھا۔ اس عہد کا ہمارے پاس کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ اسی عہد کو ہم ما قبل تاریخ زمانہ کہتے ہیں۔ یعنی وہ زمانہ جب انسان لکھ نہیں سکتا تھا اور اُس نے اُس زمانے کی تاریخ بھی نہیں لکھی۔ البتہ بعد میں علم کی ترقی کی وجہ سے اُس زمانے کے متعلق معلومات حاصل کیں اور بہت سی باتیں قیاس سے معلوم کیں۔ اس زمانے کے متعلق جب ماہرین کوئی بات کہتے ہیں تو زمانہ 'ما قبل تاریخ' کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔

س: المونیم کے برتنوں میں زیادہ عرصے تک پانی رکھنے سے سفید اُبھار سے کیوں پیدا ہو جاتے ہیں؟

صبیح الشمس

ج: کیمیاوی عمل اور ردِّ عمل سے پانی جیسا کہ آپ جانتے ہیں دو گیسوں کا مرکب ہے۔ ہائیڈروجن اور آکسی جن۔ المونیم بھی دھاتی صفات رکھتا ہے اور کیمیائی ردِ عمل سے پاک نہیں۔ اسی عمل کی وجہ سے اُس پر چند دن بعد سفید بلبلے اُبھر آتے ہیں۔

س: پرندے دانتوں کے بغیر غذا کس طرح ہضم کر لیتے ہیں؟

محمد جاوید اقبال غوری

ج: پرندوں کے دانت نہیں ہوتے مگر ان کی چونچ مضبوط اور بعض کی آری جیسی ہوتی ہے۔ وہ اپنی چونچ سے غذا کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں توڑ لیتے ہیں۔ پھر ان کا معدہ ہم انسانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ قوی ہوتا ہے۔ اس لیے انھیں غذا چبانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دراصل عادت بہت بڑی قوت ہے۔ لاکھوں سال کی عادت نے چڑیوں کو دانتوں سے بے نیاز اور ہمیں دانتوں کا محتاج بنا دیا۔

س: کیا یہ صحیح ہے کہ روشنی نہ پیدا ہوتی ہے اور نہ فنا ہوتی ہے۔

عبدالرؤف اجمیری

ج: جی نہیں، یہ درست نہیں۔ روشنی پیدا بھی ہوتی ہے اور پھر ختم بھی ہو جاتی ہے۔ مثلاً چھوٹے پیمانے پر جب آپ دیا سلائی جلاتے ہیں، شمع روشن کرتے ہیں یا بجلی کا بٹن دباتے ہیں تو روشنی فوراً آجاتی ہے۔ بڑے پیمانے پر سورج، ستارے وغیرہ روشنی اور حرارت کے بہت بڑے قدرتی منبع ہیں۔ اُن سے روشنی آتی ہے اور جب وہ مرجاتے ہیں تو ان کی روشنی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ آپ انرجی یا توانائی کے متعلق تو نہیں پوچھ رہے ہیں کہ وہ نہ پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ختم کی جا سکتی ہے۔؟

●

اکتوبر ۸۲ کا ننھے فنکار کا انعام
ننھے فنکار شمس الدین (کلکتہ) کو دیا گیا۔
شمس الدین اپنی تصویر اور پورا پتا فوراً لکھیں۔

کا
انعام

سینیگال کی کہانی

مگرمچھ کے آنسو

سید کاظم رضا

مگرمچھ ڈایا سگ دن بھر کنکنی دھوپ میں غفلت کی نیند سونے کے بعد اب آہستہ آہستہ اپنے تھل تھل کرتے ہوئے پلپلے پیٹ کو ریت پر رگڑتے ہوئے کھاڑی کی طرف واپس جا رہا تھا کہ اسے عورتوں کی آواز سنائی دی۔ یہ عورتیں دن بھر کھاڑی کے کنارے کدو جمع کرتیں یا کپڑے دھوتی رہتی تھیں اور اب پانی کے برتن اپنے سروں پر اٹھائے بستی کی طرف لوٹ رہی تھیں انھوں نے دن بھر اپنے ہاتھوں سے زیادہ زبان سے کام لیا تھا اب بھی باتیں کرتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ بڑے غم ناک لہجے میں کہہ رہی تھیں کہ ان کی بادشاہ کی بیٹی پانی میں ڈوب کر مر گئی ہے اور ایک کنیز نے بتایا ہے کہ بادشاہ اپنی پیاری بیٹی کی لاش تلاش کرنے کے لیے کھاڑی کا سارا پانی نکلوا دے گا۔ ڈایا سگ نے بھی، جس کا بھٹ کھاڑی میں گانو کی سمت واقع تھا، یہ بات سنی اور الٹے قدموں اسی طرف لوٹ گیا۔ جدھر سے وہ آیا تھا۔

دوسرے دن دوپہر میں ایک لڑکے نے جو جلانے کے لیے لکڑیاں جمع کر رہا تھا، مگرمچھ ڈایا سگ کو دیکھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو ڈایا سگ؟" لڑکے نے پوچھا۔

"میں راستہ بھول گیا ہوں۔ گونی، کیا تم مجھے میرے گھر تک پہنچا دوگے؟" مگرمچھ نے جواب دیا۔

"اب کھاڑی میں پانی تو باقی نہیں رہا ہے۔" لڑکے نے اسے بتایا۔

"پھر مجھے دریا پر لے چلو۔" ڈایا سگ نے لڑکے سے فرمائش کی۔

لڑکا فوراً تیار ہو گیا۔ وہ ایک دری اور چند رسیاں لے کر آیا۔ اس نے مگرمچھ کو دری میں لپیٹا اور اسے رسیوں سے باندھ لیا اس کے بعد اس نے مگرمچھ کو اٹھا کر اپنے سر پر رکھا اور شام تک سفر کرتا رہا۔ تب کہیں جا کر دریا پر پہنچا۔ دریا کے کنارے پر لڑکے نے بنڈل کو زمین پر رکھ دیا، رسیاں کھولیں اور مگرمچھ کو دری میں سے باہر نکالا۔ اس وقت ڈایا سگ مگرمچھ نے لڑکے سے کہا۔

"گونی! دری میں بندھے بندھے میری ٹانگیں بری طرح اکڑ گئی ہیں۔ کیا تم مجھے پانی کے اندر نہیں چھوڑ سکتے۔"

"گونی مگرمچھ کو اٹھا کر پانی میں اتر گیا اور جب پانی اس کے گھٹنوں تک آنے لگا تو لڑکے نے چاہا کہ ڈایا سگ کو پانی میں چھوڑ دے مگر مگرمچھ نے کہا:

"جب تک پانی تمھاری کمر تک نہ آ جائے اس وقت تک آگے بڑھتے رہو، میرے لیے تیرنا بھی اس وقت دشوار ہے۔"

لڑکے نے ایسا ہی کیا، اب پانی اس کی کمر تک آنے لگا تھا۔

"بڑھتے رہو، جب تک پانی سینے تک نہ آنے لگے۔" مگرمچھ نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

دوسرے روز وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا، کھاڑی کا تمام پانی نکلوا دیا گیا۔ اس کے علاوہ اس کھاڑی میں جتنے مگرمچھ رہتے تھے سب کو جان سے مار دیا گیا۔ کھاڑی میں رہنے والے مگرمچھوں میں سے سب سے بوڑھے مگرمچھ کے بھٹ میں شہزادی کا مردہ جسم بھی مل گیا۔

(معرفت ماہنامہ نونہال کراچی (پاکستان))

لڑکا اور آگے بڑھ گیا اور پانی اس کے سینے تک آنے لگا۔

"بہتر ہے کہ تم کچھ اور آگے بڑھ جاؤ، ابھی پانی تمھارے کندھوں تک نہیں آیا ہے۔"

گونی اور آگے بڑھ گیا اور اس کے کندھے بھی پانی میں ڈوب گئے۔

اس وقت ڈایا سِگ نے کہا: "اب مجھے پانی میں چھوڑ دو۔"

گونی نے ایسا ہی کیا، وہ کنارے کی طرف جانے کے لیے مڑنے لگا تو مگرمچھ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"ارے میرے اللہ، یہ تم کیا کر رہے ہو؟ مجھے واپس جانے دو۔"

"میں تمھیں واپس نہیں جانے دوں گا، کیوں کہ میں بھوکا ہوں۔"

"مجھے جانے دو۔"

"میں تمھیں واپس نہیں جانے دوں گا، کیوں کہ میں بھوکا ہوں اور اب مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔"

"مجھے ایک بات بتاؤ ڈایا سِگ، تم نیکی کا بدلا نیکی سے دیتے ہو یا نیکی کا صلہ تمھارے نزدیک برائی ہے؟"

"نیکی کا بدلا برائی سے دیا جاتا ہے۔ نیکی کا اجر نیکی کب ہوتا ہے؟" ڈایا سِگ نے جواب دیا۔

"اس وقت تو میں تمھارے قبضے میں ہوں۔ کچھ نہیں کر سکتا، مگر تم جو کچھ کہہ رہے ہو صحیح نہیں ہے۔ میرے خیال میں ایسی بات کرنے والے ساری دنیا میں تم اکیلے ہو۔"

"اچھا تو تمھارا خیال یہ ہے!"

"اگر ایسا نہیں ہے، تو چلو ہم دو چار جانوروں سے پوچھ لیتے ہیں مجھے اور تمھیں دونوں کو ہی پتا چل جائے گا کہ حقیقت کیا ہے اور جانوروں کے خیالات کیا ہیں؟"

ڈایا سِگ اس تجویز سے متفق ہو گیا۔ "ٹھیک ہے! لیکن اگر تین جانوروں نے میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے میری تصدیق کر دی تو سمجھو کہ تمھارا ٹھکانا میرے پیٹ میں ہوگا۔"

ابھی مگرمچھ کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک بہت ہی بوڑھی گائے اس طرف آتی نظر آئی۔ گائے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کنارے تک آئی اور جب اس نے سیر ہو کر پانی پی لیا تو مگرمچھ نے پکار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور اس سے پوچھا:
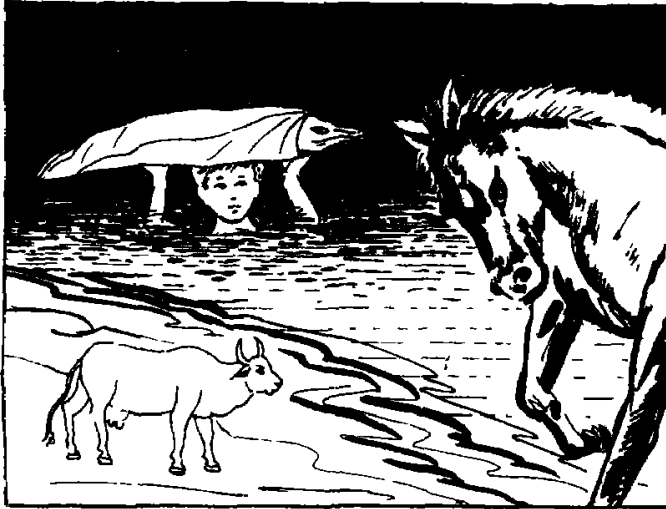
"ناگی! تم اتنی بوڑھی، عقل مند اور تجربہ کار ہو، کیا ہمیں اس بات کا جواب دے سکتی ہو کہ نیکی کا بدلہ برائی ہے یا نیکی کا اجر نیکی ہے؟"

گائے ناگی نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "نیکی کا بدلہ ہمیشہ برائی سے ملتا ہے۔ تمھیں میری بات پر یقین کر لینا چاہیے۔ میں بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ جب میں جوان، طاقت ور اور خوبصورت تھی، تو چراگاہ سے واپسی پر کھلی بھوسے اور نمک کے ڈھیلے سے میری تواضع کی جاتی تھی، مجھے نہلایا دھلایا جاتا تھا۔ میری مالش ہوتی تھی اور اگر ننھا چرواہا غفورا کبھی غلطی سے چھڑی مار بیٹھتا تھا تو مالک اس کے کان ضرور کھینچتا ہے اس زمانے میں میں ڈھیروں دودھ دیا کرتی تھی اور آج میرے مالک کے گھر میں جو بیل اور گائیں موجود ہیں وہ سب میری اولادیں ہیں اب میں بوڑھی ہو چکی ہوں میرا دودھ خشک ہو چکا ہے اور بچے ہونا بھی بند ہو گئے ہیں، اس لیے کوئی میری دیکھ بھال نہیں کرتا۔ حد تو یہ ہے کہ کوئی مجھے چراگاہ بھی نہیں لے جاتا۔ ہر روز صبح کے وقت چھڑی کی ایک زوردار ضرب میری پیٹھ پر پڑتی ہے اور مجھے حکم ملتا ہے کہ جہاں میرے سینگ سمائیں، چلی جاؤں یہی وجہ ہے کہ میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ نیکی کا بدلا ہمیشہ برائی سے ملتا ہے۔"

"گونی، کیا تم نے گائے ناگی کی بات سن لی؟" ڈایا سِگ مگرمچھ نے لڑکے سے کہا۔

"ہاں!" لڑکے نے جواب دیا۔ "میں نے پوری بات سن لی ہے۔"

اس کے بعد ناگی اپنے مریل جسم کو گھسیٹتی ہوئی چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد بوڑھا گھوڑا فاس پانی پینے کے لیے وہاں آیا

ابھی گھوڑا اپنے ہونٹوں سے پانی کی سطح کو صاف ہی کر رہا تھا کہ مگر مچھ نے اسے مخاطب کر لیا۔

"فاس، تم جو اتنے بوڑھے اور زمانہ دیکھے ہوئے ہو، کیا ہمیں بتاؤ گے کہ نیکی کا بدلا برائی ہوتا ہے یا نیکی؟"

"کیوں نہیں بتاؤں گا۔" گھوڑے فاس نے کہا، "نیکی کا بدلا ہمیشہ برائی سے دیا جاتا ہے۔ یہ میرے اپنے تجربے کی بات ہے۔ تم دونوں غور سے میری بات سنو۔ جس زمانے میں جوان تھا توانا اور صحت مند تھا تو صرف میری دیکھ بھال کرنے کے لیے تین سائیس تھے۔ میری ناند بہترین خوراک سے دن رات بھری رہتی تھی۔ میرے لیے لگام اور زین بھی خاص طور پر انتہائی خوبصورت بنوائی گئی تھی اور اسے نگینوں اور چاندی کے تاروں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ میں میدان جنگ میں جایا کرتا تھا اور جنگ میں تو پانچ سو سپاہی قیدی بنا کر میرے آگے ہانک کر لائے گئے تھے۔ نو سال تک میں اپنی پشت پر اپنے مالک اور مالِ غنیمت کو اٹھاتا رہا، مگر اب میرا کیا حال ہے، صبح ہوتے ہی وہ دھتکار کر مجھے اصطبل سے باہر نکال دیتے ہیں تاکہ روکھی سوکھی جو ملے اس سے اپنا پیٹ بھر لوں۔"

اپنی بات ختم کرنے کے بعد گھوڑے نے اپنے منہ سے پانی کی سطح کو صاف کیا، سیر ہو کر پانی پیا اور لڑکھڑاتا اور لنگڑاتا ہوا واپس ہو گیا۔

مگر مچھ نے کہا، "گونی، کیا تم نے گھوڑے کی بات سن لی؟ اب سچ تو یہ ہے کہ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے، کسی اور گواہی کا اب میں انتظار نہیں کر سکتا۔ اب میں تمھیں کھا جاؤں گا۔"

"نہیں، چچا ڈایا سنگ!" لڑکے نے مگر مچھ سے کہا، "تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تم تین جانوروں سے دریافت کرو گے۔ اب اگر تیسرے نے بھی وہی بات کی جو دوسرے دو کہہ چکے ہیں تو پھر تم مجھے کھا سکتے ہو اس سے پہلے نہیں!"

"چلو یوں ہی سہی!" مگر مچھ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا، "مگر میں تمھیں پہلے سے بتائے دیتا ہوں کہ اس کے بعد کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔"

اسی وقت خرگوش لیوک اچھلتا ہوا ان کی طرف آتا دکھائی دیا۔ ڈایا سنگ نے اسے پکار کر بلایا اور پوچھا،

"چچا لیوک، تم ہم سب میں عمر رسیدہ ہو۔ تم ایک فیصلہ کرو۔ بتاؤ کہ ہم میں سے کون صحیح ہے اور کون غلط؟ میں کہتا ہوں کہ بھلائی کا بدلا ہمیشہ برائی ہوتا ہے اور یہ لڑکا کہتا ہے کہ نیکی کا اجر نیکی ہوتی ہے۔"

لیوک نے اپنی تھوڑی رگڑی اپنے کان کو کھجایا اور پھر سوال کیا۔

"ڈایا سنگ! میرے دوست، کیا تم ایک اندھے آدمی سے یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ کپاس سفید ہوتی ہے یا سیاہ؟ یا یہ کہ کوا کیا واقعی کالے رنگ کا ہوتا ہے؟"

"نہیں، میرا یہ مقصد نہیں ہے۔" مگر مچھ نے کہا۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ بچہ جس کا کوئی گھر نہ ہو کہاں جا رہا ہوگا؟"
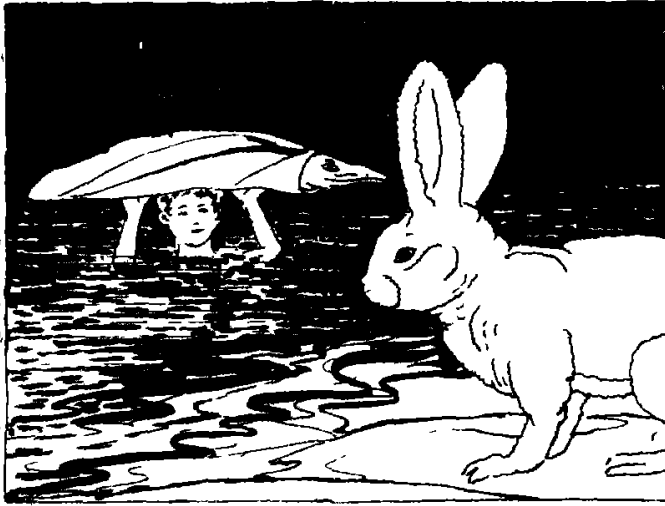
"ہرگز نہیں!"

"تو پھر مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟ آخر مجھے فیصلہ کرنا ہے اور میں یہ نہیں چاہتا کہ مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے۔"

"چچا لیوک صورتِ حال کچھ یوں ہے کہ اس لڑکے سے میری ملاقات یہاں سے دور گاؤں کے قریب جنگل میں ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دری میں لپیٹا اور اپنے سر پر اٹھا کر یہاں لے آیا۔ اب مجھے بھوک لگ رہی ہے اور ابھی میں بھوک سے مرنا نہیں چاہتا، اس لیے یہ میری حماقت ہوگی کہ میں اس لڑکے کو چھوڑ دوں اور کسی غیر یقینی شکار کی تلاش میں نکل کھڑا ہوں۔"

لیوک نے کہا، "بلاشبہ، اگر الفاظ بیمار ہوں تو کانوں کو صحت

مند ہونا چاہیے اور میرے کان ا میرے علم و یقین کی حد تک بالکل صحت مند ہیں۔ اللہ کا شکر ہے! مگر حقیقت یہ ہے برادر کہ تمہارے کچھ الفاظ مجھے درست معلوم نہیں ہوتے۔"

"وہ کون سے الفاظ ہیں؟" مگرمچھ نے پوچھا۔

"وہ الفاظ یہ ہیں کہ یہ چھوٹا سا لڑکا تمہیں دری میں لپیٹ کر اور اپنے سر پر رکھ کر تمہیں اتنی دور سے یہاں لے آیا۔ میں ان الفاظ کا یقین نہیں کر سکتا!"

"تاہم یہ بات بالکل درست ہے!" گونی نے کہا۔

"اپنے پورے خاندان والوں کی طرح تم بھی جھوٹے ہو" خرگوش بولا۔

"وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے"، مگرمچھ ڈاپا سِنگ نے کہا۔

"بہر حال جب تک میں اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لوں میں اعتبار نہیں کر سکتا۔" لبوک نے فیصلہ کن انداز میں کہا "تم دونوں پانی سے باہر نکل آؤ۔"

لڑکا اور مگرمچھ دونوں ہی پانی سے باہر نکل آئے۔

"لڑکے، تمہارا دعوا ہے کہ تم نے اس بڑے مگرمچھ کو دری میں لپیٹ کر اپنے سر پر اٹھا لیا تھا اور یہاں تک لے آئے تھے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم نے یہ کیسے کیا تھا؟"

"میں نے اسے دری میں لپیٹا تھا اور اوپر سے رسّی باندھ لی تھی۔"

"میں یہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

ڈاپا سِنگ دری پر لیٹ گیا اور لڑکے نے اسے دری میں لپیٹ دیا۔

"اور تمہارا کہنا ہے کہ تم نے اسے رسّی سے بھی باندھا تھا۔"

"ہاں۔"

"تو پھر باندھ کر دکھاؤ۔"

لڑکے نے دری میں لپٹے ہوئے مگرمچھ کو رسّی سے باندھ دیا۔

"اور پھر تم نے اسے اپنے سر پر اٹھا لیا تھا۔"

"ٹھیک ہے، تو پھر اسے اپنے سر پر اٹھاؤ تاکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ چلو اٹھاؤ!"

"گونی، کیا تمہارے گھر والے لوہار ہیں؟"

"نہیں!"

"تو پھر ڈاپا سِنگ تمہارا رشتے دار تو نہ ہوا۔ یہ تمہارا نشان بھی نہیں ہو سکتا۔"

"نہیں ہرگز نہیں۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔ اب اس بنڈل کو اپنے گھر لے جاؤ۔ تمہارے باپ تمہاری ماں، ان کے دوست اور رشتے دار سب تمہارے شکر گزار ہوں گے، کیوں کہ تم سب مل کر اس مگرمچھ کی دعوت اڑا سکتے ہو۔ ان لوگوں کو جو کسی کی نیکی کو فراموش کر دیتے ہیں ایسا ہی بدلا ملنا چاہیے۔"

(بہ شکریہ نونہال کراچی)

مولانا عبدالواحد سندھی

رسول پاکؐ کی زندگی اوّل سے آخر تک انوکھے حالات میں گزری۔ بچپن میں آپ یتیم ہو گئے۔ دادا اور چچا نے پرورش کی۔ جوان ہوئے تو کچھ دن غریبی کی حالت میں بسر کیے۔ پھر اللہ میاں نے آپؐ کو تجارت میں برکت دی۔ چالیس سال کی عمر میں آپؐ کو آخری رسولؐ بنایا گیا۔ اِس کی وجہ سے سارا مکہ آپؐ کا دشمن ہو گیا۔ پورے تیرہ سال آپؐ نے تکلیفوں اور پریشانیوں میں کاٹے، نہ دن کو آرام نہ رات کو چین۔ اس مخالفت کی وجہ سے اپنا وطن چھوڑ کر مدینے میں جا رہے۔

مدینے میں بھی شروع میں آپؐ کو بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر آخر میں اللہ میاں نے آپؐ کو اپنے کام میں کامیاب کر دیا۔ وہ یہ کہ سارے عرب نے آپؐ کی تعلیم کو مان لیا۔ اب آپؐ دین و دُنیا کے بادشاہ تھے۔ مگر ایک بات ایسی معلوم ہوتی ہے جو دُنیا کے کسی شہنشاہ میں نظر نہیں آتی وہ یہ کہ آپؐ نے ہمیشہ سادہ زندگی بسر کی۔

رسول پاکؐ ہمیشہ سادہ صاف کپڑے پہنتے تھے۔ آپؐ کُرتا، جُبّہ، تہمد اور پگڑی استعمال کرتے تھے۔ کپڑے سُوتی ہوتے تھے۔ ریشم کو آپؐ نے اپنے اور اپنی اُمت کے مردوں کے لیے حرام کر دیا۔ آپؐ کے کپڑوں میں ذرا بھڑک اور نمائش نہ ہوتی تھی۔ اگرچہ ان کپڑوں میں پیوند لگے ہوتے تھے پر صاف ستھرے اور سفید براق [illegible] کے ہوتے۔

گھر میں ایک موٹے سے بستر پر آپؐ رات کو کچھ آرام فرماتے پھر باقی رات نماز پڑھتے اور اسلام کی ترقی کے لیے اللہ میاں سے دُعائیں مانگتے رہتے۔ ایک رات آپؐ کی بیوی حضرت عائشہؓ نے آپؐ کے بستر کی چار تہیں کر دیں تاکہ آپؐ آرام سے سو سکیں۔ آپؐ نے صبح بستر کے بارے میں پوچھا تو حضرت عائشہؓ نے کہا: "وہی آپؐ کا بستر تھا مگر اُس کی چار تہیں کر دی تھیں تاکہ زیادہ آرام ملے۔" آپؐ نے فرمایا "اُسے تو پہلے ہی جیسا کر دو۔ اِس بستر نے رات مجھے نماز سے روکا۔"

آپؐ اپنا کام کاج اپنے ہاتھ سے کرتے، اپنے کپڑے خود ہی سی لیتے۔ اپنی جوتیوں کو خود ہی گانٹھ لیتے۔ مسجد اپنے ہاتھ سے صاف کر دیتے۔ مدینے میں جب مسلمان مسجد بنا رہے تھے تو آپؐ بھی اور مسلمانوں کی طرح اینٹیں اور گارا لاتے اسی طرح جب کسی لڑائی میں کوئی کام ہوتا تو اُسے بھی آپؐ سب مسلمانوں کے ساتھ مل جُل کر کرتے۔ آپؐ اپنے خادموں سے زیادہ کام نہ لیتے تھے۔ کبھی کبھی تو اُن کو آرام پہنچانے کی خاطر اُن کا کام خود کر دیتے تھے۔

کھانا ہمیشہ سادہ کھاتے۔ آپؐ کی روز کی غذا جَو کی روٹی تھی اور وہ بھی کبھی پیٹ بھر کر نہ کھائی۔ اِس لیے کہ آپؐ ہمیشہ بھوکوں کو کھلاتے اور خود بھوکے رہتے۔ آپؐ کے سامنے جو کھانا موجود ہوتا اُسے کبھی بھی بُرا نہ کہتے، اگر آپؐ کو پسند نہ ہوتا تو چھوڑ دیتے۔ کھجور اور شہد آپؐ کو بہت پسند تھا۔ آپؐ رہنے سہنے میں ہمیشہ صفائی

باقی صفحہ ۱۳ پر

میرا خواب

تسکین جہاں

چاند دنیا والوں کے لیے کوئی عجیب شے نہیں رہا تو انسان زہرہ اور مریخ پر جانے کی کوشش کرنے لگا۔ امریکہ اور روس نے کئی سیارے چھوڑے ہیں۔ بھارت نے بھی بھاسکر کو خلاء میں داغ کر اپنی کامیابی کا ثبوت دیا ہے۔ اور اس کے چرچے اخبار میں بڑے زور شور سے ہو رہے ہیں کہ اب وہ دن دور نہیں کہ ہم ہندستانی بھی ان سیاروں تک پہنچ جائیں گے۔ ان خبروں کو پڑھ کر میرے دماغ میں یہ بات آنے لگی کہ "آرم سٹرانگ" کی طرح جو چاند پر اترنے والا پہلا انسان تھا۔ میں بھی زہرہ پر اترنے والی پہلی عورت کہلاؤں۔ اسی سوچ میں پڑھائی میں میرا دل نہیں لگا۔ کھانا کھا کر جلد سو گئی۔

ہندستان کی طرف سے ایک سیارہ زہرہ کی طرف چھوڑا جا رہا ہے اور مجھے ہی اس جہاز میں جانے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ مجھے ہر طرح کی تربیت دی گئی ہے۔ جہاز خلا میں جانے کے لیے تیار ہے۔ میں خلائی کپڑے پہن کر پھولے نہیں سما رہی ہوں۔ لوگ مجھے وداع کرنے کے لیے چاروں طرف جمع ہوئے ہیں اور میرے کالج کے پرنسپل اور تمام سہیلیاں بھی ہیں۔ یہاں تک کہ میرے ملک کے وزیر اعظم اور صدر بھی مجھے خدا حافظ کہنے کے لیے آئے ہیں۔ ٹھیک وقت پر سائنس والوں نے جہاز کو خلاء میں داغا۔

میرا جہاز برق رفتاری سے اوپر اڑنے لگا۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا تو دنیا ایک چھوٹے گیند کی طرح نظر آ رہی تھی۔ چکر لگاتے لگاتے میرا جہاز ٹھیک وقت پر زہرہ کی سرزمین پر اترا۔

صبح کا وقت تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ پیڑوں پر رنگ برنگ کے پرندے چہک رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میری آمد پر استقبالیہ گیت گا رہے ہیں۔ چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی ہے جیسے سبز غالیچے بچھائے گئے ہوں۔ میں اپنے جہاز سے اتری تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک خوب صورت باغ ہے۔ باغ میں رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے ہیں ایسا لگ رہا تھا کہ اسکول کے بچے رنگین کپڑے پہن کر اپنے سروں کو رنگین فیتوں سے سجا کر اپنا سر ہلا ہلا کر میرا استقبال کر رہے ہیں اِن نظاروں کا لطف لیتے ہوئے آگے بڑھی۔ راستے بہت چوڑے اور صاف تھے۔ ایسے لگتے تھے جیسے چاندی پگھلا کر بچھائی گئی ہو۔

عمارتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ ہر گھر کے سامنے باغ ہے۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ ایک ٹڈی دل فوج تیر کمان لے کر میری طرف آ رہی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔ وہ لوگ میری انگلی کے برابر تھے، مگر ان کے

کلادگی اردو گورنمنٹ ٹی۔ٹی۔آئی۔کالج۔ بیجاپور

سر پڑے تھے فوجی کپڑے پہنے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں
الکٹرانک ہتھیار تھے۔ انھوں نے مجھے قید کرلیا میرے جہاز
کو ان کی سرزمین پہ اترتے ہی ٹیلی وژن میں دیکھ لیا گیا۔
کہ کوئی اجنبی ان کے ملک میں اترا ہے۔ مجھے اپنے بادشاہ کے
پاس لے گئے۔ بادشاہ کے محل میں الکٹرانک آلے تھے۔
جو بادشاہ کو ہر طرح کی خبریں پہنچاتے تھے یہاں تک کہ
انسانوں کے ارادوں کے متعلق بھی خبریں ان تک پہنچ
جاتی تھیں گویا وہ جاسوسی کا کام دیتے ہیں۔

بادشاہ میرے ساتھ دوستانہ طریقے سے پیش آیا
وہ سمجھا کہ میں زمین کی طرف سے ان کے ملک کی سفیر بن کر
آئی ہوں۔ میں نے ان کو اپنے ملک کے صدر اور وزیر اعظم
کے خط دیے جس کو انھوں نے ایک مشین میں ڈال دیا۔
مشین سے نکلا ہوا کاغذ ان کے ملک کی زبان میں ترجمہ تھا
میں نے اس ملک کا دورہ کر کے ہر ایک چیز کو دیکھا۔ ان کی
دکانوں میں تجارت مشینوں کے ذریعے ہی ہوتی تھی۔ ہر
کام مشین ہی کرتی نظر آرہی تھی۔ بڑے بڑے کارخانے تھے
جو ایٹم کی طاقت سے چل رہے تھے۔

میری واپسی کے دن قریب آرہے تھے۔ میں نے
سوچا کہ وہاں کی ہر عجیب چیز کو ساتھ لے لیا جائے۔ وہاں
کی مرغیاں کیڑوں کے مانند تھیں۔ گائیں بلیوں جیسی
تھیں۔ گھوڑے تو ایسے لگتے تھے جیسے کتے ہوں۔ خیر وہاں
کی ہر چیز دیکھی اور ان کو اپنے ساتھ لے لیا۔ یہاں تک
کہ وہاں کے بادشاہ نے مجھے تحفے دیے جن میں ایک
ایسا آلہ تھا جس کے ذریعے زمین پر اتر کر میں ٹیلی وژن
کی طرح ان کو دیکھ سکتی تھی۔

آج میرا واپسی کا دن تھا بادشاہ، شاہی خاندان کے
کئی لوگ اور دیگر دوست احباب بھی آئے تھے میرا جی
نہیں چاہتا تھا کہ واپس جاؤں۔ خیر ان سے وداع لے کر
واپس ہوئی۔ سوچنے لگی کہ میری سہیلیاں اور میرے
کالج کے پرنسپل میرا استقبال کرنے کے لیے موجود
ہوں گے۔

میرا جہاز نیچے اتر رہا تھا۔ میں بہت خوش تھی اتنے میں
میرے جہاز کی مشین میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی میں بہت
گھبرائی۔ میرا جہاز تیزی سے اترنے لگا اور اس میں آگ
لگ گئی اور میں چلانے لگی کہ بچاؤ بچاؤ۔ میری ماں میرے
پلنگ کے قریب کھڑی ہو کر میرا کندھا جھنجھوڑ رہی تھیں
اور پوچھ رہی تھیں کہ کیا ہوا؟

بقیہ صفحہ ۱۱

رکھتے تھے۔

آپؐ کو گدھے اور خچر کی سواری سے بھی عار نہ تھی۔ خیبر
کی فتح کے دن آپؐ خچر پر سوار تھے۔ آپؐ اونٹ اور گھوڑے
کے شہ سوار تھے۔ غرض کہ آپؐ کی زندگی بڑی سیدھی سادی
تھی۔ بناوٹ اور دکھاوا کا نام کو بھی نہ تھا۔

آپؐ اپنے ملنے والوں کو بھی سادہ زندگی بسر کرنے
کی ہدایت فرماتے رہتے تھے۔ آپؐ کی بیٹی حضرت فاطمہؓ
کو کام کاج کی وجہ سے بہت محنت کرنی پڑتی تھی۔ چکی بھی
خود پیستی تھیں پیستے پیستے ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے
تھے۔ حضرت فاطمہؓ نے ایک دن آپؐ سے عرض کیا۔ "مجھے
ایک لونڈی یا غلام دیا جائے۔" رسول پاکؐ نے اپنی
بیٹی سے فرمایا۔ "پہلے غریب اور محتاج مسلمانوں کا بندوبست
ہو جائے۔"

رسول پاکؐ کی یہ سادگی اس وجہ سے نہ تھی کہ آپؐ کے
پاس کچھ نہ تھا۔ نہیں، آپؐ کے پاس اللہ میاں کا دیا
سب کچھ تھا۔ آپؐ عرب میں دین و دنیا کے بادشاہ تھے۔
آپؐ کی آمدنی اتنی تھی کہ آرام سے امیروں اور بادشاہوں
کی طرح رہ سکتے تھے مگر آپؐ جو کچھ خرچ کرتے وہ دوسروں
کی بھلائی کے لیے اور اسلام کی ترقی کے لیے کرتے۔ آپؐ
اپنی سادہ زندگی سے مسلمانوں کے لیے عملی نمونہ قائم
کرنا چاہتے تھے۔

(بشکریہ نونہال کراچی)

امنۃ الواحد ثنا کمرہ

رمضانی شعبانی

حیدرآباد میں
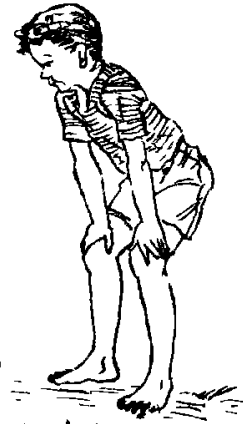
[دیکھیے کہانی "خواہش کیسے پوری ہوئی" پیام تعلیم اپریل ۱۹۸۲ء میں]

رمضانی، شعبانی اب دل لگاکر خالہ بی کے ساتھ کام کرتے تلاً۔ پھر بھی جی چاہتا تھا کہ کوئی نئی سی بات ہوجائے اور ایک دن وہ ہو ہی گئی——

اس دن شام بڑے گانو کے مکھیاجی ان کے گھر آپہنچے۔ ان کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ زمین دار کے گھر والوں جیسا۔ لمبی سی شیروانی سفید تنگ پائجامہ۔ کندھے پر لال رومال بڑی سی چھتری ہاتھ میں پیر میں ربر کا موزا۔

مکھیا کو اپنے گھر کی طرف آتے دیکھ کر رمضانی، شعبانی کی جان ہی تو نکل گئی اور دونوں بھاگ کر بھوسے کی کوٹھری میں جا چھپے۔ خالہ بی نے کہیں دور سے مکھیاجی کو دیکھ لیا اور دوڑی آئیں۔ تبا نہیں ان میں کیا بات چیت ہوئی کہ خالہ بی رمضانی، شعبانی کو بار بار پکارنے لگیں۔ اتنی بار کہ دونوں مجبور ہو کر ڈرتے ڈرتے باہر نکل آئے۔ خالہ نے بڑی محبت سے کہا۔ "دیکھو یہ تمہارے پھوپا حضت ہیں، تم سے ملنے آئے ہیں۔ ان کے پیر پڑو۔" مگر آنے والے نے خود ہی آگے بڑھ کر ان دونوں کو لپٹا لیا اور بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "جب سے زیارت سے لوٹ کر واپس ہوئے ہیں ان کی پھوپی کو انھیں دونوں کی رٹ لگی ہوئی ہے، ان کے ماں باپ کو یاد کرکر کے تڑپ رہی ہے۔ ہائے کیسے وہ دونوں اچانک وبا میں چٹ پٹ ہوگئے۔ میں تو اس کو ساتھ لے کر زیارات کو گیا ہوا تھا۔ سرہند شریف۔ اجمیر شریف، دلی۔ آگرہ، پانی پت گوالیار سبھی جگہ جی بھر کر رہ آئے مگر دیس پہنچ کر کیا سننا پڑا۔ بڑی مشکل سے معلوم ہوا کہ یہ بچے تمہارے پاس ہیں۔ اللہ ان مکھیاجی کا بھلا کرے جن کی وجہ سے بی بی تمہارا پتا آسانی سے مل گیا" خالہ بی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "میں کوئی غیر تھوڑی ہوں۔ تمہاری خالہ میری سگی ممانی تھیں۔ تم ہمیشہ بلدہ میں رہے۔ اس سے ملنا جلنا کم رہا۔ بھابی بیگم کو کیوں نہیں لائے؟"

اتنی دیر میں خالہ بی نے چٹائی بچھا کر سب کو بٹھا دیا۔ بچوں سے کہہ کر سلور کی نئی گلاسوں میں گرما گرم دودھ ان کے سامنے لگا دیا مکھیاجی تو دودھ پی کر چلتے بنے۔ خالہ بی اور پھوپا حضت بیٹھ کر بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ طے پایا کہ وہ بچوں کو کچھ دنوں کے لیے حیدرآباد لے جائیں گے۔ خالہ بی کو چھوڑ کر جانے کا ان دونوں کو ذرا دکھ تو ہوا مگر پھر ایک نئی دنیا کو دیکھنے کا خیال۔ دل میں ایک امنگ اور جوش پیدا ہو رہی تھی۔ واہ، وا! رمضان شریف کا چاند وہیں دیکھیں گے۔ سنتے ہیں وہاں رمضان شریف میں بڑی رونق رہتی ہے اور پھر عید—— شہر کی عید کا کیا کہنا۔

خالہ بی نے معلوم کرایا۔ زمین دار صاحب کی گھاچر دوسرے دن شادنگر تک جانے والی تھی۔ وہاں عمدہ نگر کے اسٹیشن سے ریل پہ چلے جائیں گے اور شام شام تک بلدہ پہنچ جائیں گے۔

سب سونے چلے گئے مگر رمضانی، شعبانی ساری رات سوتے جاگتے رہے اور سوتے میں شہر کی سیر کرتے رہے۔ بار بار نیند سے

A/2/5G5-2-11- آغا پورا حیدرآباد

اٹھتے اور سو جاتے۔ پھوپھا حضت بھی اسی وقت بیدار ہو گئے۔ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر نماز پڑھی۔ نہ جانے کتنی رات سے اٹھ کر خالہ بی نے پراٹھے تیار کر دیے تھے۔ ساتھ ہی انڈوں کے چیلے بھی تھے اور بہت سا آم کا تازہ اچار۔ سب کو اچھی طرح دسترخوان میں باندھ کر تیار رکھ دیا تھا۔

اتنے میں جگیا نے بھی آواز دی: "کھاچر تیار ہے۔"

کھاچر میں سوکھی گھاس پر موٹا کمبل بچھا دیا گیا تھا۔ خالہ بی کے آنکھوں میں آنسو امڈ رہے تھے۔ پھر بھی بچوں کو گلے لگایا اور نصیحتیں کیں کہ دیکھو پھوپھا، پھوپھی کی ہر بات سننا، کہنا ماننا اور کوئی شرارت نہ کرنا۔ بچے اچک کر کھاچر پر بیٹھ گئے۔ پھوپھا حضت بھی چڑھ گئے اور کھاچر چلنے لگی۔ چرخ چوں۔ چرخ چوں۔ دونوں رات کو مشکل سے ہی سوئے تھے۔ صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جو لگی تو کمبل پر لیٹ کر فوراً سو گئے اور بڑی دیر تک سوتے رہے اور اس وقت جاگے جب پھوپھا حضت انھیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھا رہے تھے کہ لو گاؤں آ گیا ریل کا اسٹیشن آ گیا۔ یہ سنتے ہی دونوں جھٹ سے اٹھ کر بیٹھ گئے اور کھاچر سے کود گئے۔

جگیا نے کھاچر کھول دی۔ بیلوں کے چارے کی فکر کرنے لگا۔ پھوپھا حضت بچوں سمیت ایک بڑ کے جھاڑ تلے بیٹھ گئے۔ پھر قریب کے کنوئیں پر جا کر موٹ کے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ واپس آ کر وہیں بیٹھ گئے۔ ساتھ لایا ہوا توشہ کھولا بسم اللہ کہہ کر تینوں نے شروع کیا اور جلد جلد ختم کر دیا۔ بچا ہوا جگیا کو بلا کر دے دیا۔ پھوپھا حضت نے بتایا: "اس گاؤں کا نام شاد نگر ہے۔ مگر اسٹیشن کا نام عمدہ نگر ہے۔ محبوب نگر سے بلدہ جانے والی ریل گاڑی یہاں ٹھہرتی ہے" کھانے کے بعد تینوں اسٹیشن پہنچے۔ سگنل کا ہاتھ گر چکا تھا۔ ریل اب بس آنے ہی والی تھی۔ پھوپھا حضت تیز تیز جا کر دو ٹکٹ لے آئے ایک سارا ٹکٹ تو خود انھیں کا دوسرے آدھا آدھا دونوں بچوں کا ٹکٹ۔ دونوں پھوپھا حضت نے بڑی حفاظت سے اندر کی جیب میں رکھ لیے۔ رمضانی، شعبانی کا دل بہت چاہا کہ ٹکٹ اپنے ہاتھ میں لے کر اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھیں مگر بڑے حضت سے پوچھیں کیسے؟ ریل میں بڑی بھیڑ تھی پھر بھی جیوں تیوں کر کے تینوں ڈبے میں چڑھ ہی تو گئے اور پھوپھا نے بیٹھے ہوئے لوگوں کی ٹھڈی کو ہاتھ لگا ذرا ذرا سرکایا اور بچوں کو کھڑکی کے پاس بٹھایا خود بھی ان کے بازو بیٹھ گئے۔

ریل کی چمکتی پٹڑیاں پاک صاف ریل۔ انگریزی لباس اور انگریزی ٹوپی پہنے ایک آدمی کے ہاتھ میں ہری اور لال جھنڈیاں لپٹی ہوئی تھیں یہ سب بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ ہر چیز کو رمضانی شعبانی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے اتنے میں اس جھنڈی والے آدمی نے زور کی سیٹی بجائی اور پھر ہاتھ میں کی ہری جھنڈی کھول کر ہلانے لگا بس ریل چلنے لگی اور وہ آدمی دوڑ کر چلتی ریل میں سوار ہو گیا۔ واہ بھئی واہ! کیسے جلدی چڑھ گئے۔ پھوپھا حضت نے پوچھا: "سنو ریل کیا کہتی ہے۔ ریل کہتی ہے ڈبل روٹی چھ چھ پیسے" دونوں بچے غور سے سننے لگے واقعی ریل کی چھک چھک میں سے ڈبل روٹی چھ چھ پیسے کی آواز آ رہی تھی۔ کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو جھاڑ پہاڑ تار کے کھمبے سبھی پیچھے ہی پیچھے بھاگے جا رہے تھے۔ بڑا مزا آنے لگا۔ بیچ بیچ میں ریل کسی اسٹیشن پر ٹھہر جاتی۔ کچھ لوگ اتر جاتے تو کچھ اور چڑھ جاتے جھنڈی والا آدمی بھی ہر اسٹیشن پر اترتا۔ کچھ دیر کے بعد سیٹی بجا کر پھر ہری جھنڈی دکھانے لگتا اور ریل چل پڑتی اور وہ دوڑ کر چلتی ریل میں چڑھ جاتا۔ بچے جب بار بار اس کے بارے میں بات کرنے لگے تو پھوپھا حضت نے بتایا کہ یہ ریلوے کے ملازم ہوتے ہیں۔ انھیں گارڈ کہتے ہیں یہ ریل پر کنٹرول رکھتا ہے اور رکنے چلنے کے لیے لال اور ہری جھنڈی سے اشارہ کرتا ہے۔ پھوپھا حضت کبھی بچوں سے باتیں کرتے کبھی دوسرے آدمیوں سے باتیں کرتے۔ بچوں کو بتایا کہ یہ نظام سرکار کی ریل ہے۔ سبھی ریلیں بالکل ٹھیک وقت پر چلتی ہیں۔ ایک سیکنڈ بھی آگے پیچھے ہو جائیں تو آپس میں ٹکرا جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ رمضانی شعبانی کی سمجھ میں یہ نہیں آیا تھا کہ بغیر بیل یا گھوڑے کے کیسے یہ لمبی ریل بھاگی جا رہی ہے۔ بس جی ہی جی میں سوچتے کہ بڑے ہو کر گارڈ بن جائیں جہاں چاہے ریل کو ٹھہرا لیں اور جہاں چاہیں چلا دیں۔ ابھی یہ سوچ رہے تھے کہ ریل چلنے کے بارے میں پھوپھا حضت سے پوچھیں پر ہمت نہیں ہو رہی تھی اتنے میں دور سے ایک پہاڑی پر بنا شاندار محل دکھائی دیا۔ زمین دار کی گڑھی سے بھی بہت بڑا۔ بہت شاندار پھوپھا حضت نے کہا: "دیکھو دیکھو فلک نما پیلس دکھائی دے رہا ہے۔ یہ اعلیٰ حضرت کا محل ہے۔ یہاں وائسرائے ٹھہرتا ہے۔ اتنی دیر میں رمضانی نے جو ذرا پھوپھا حضت سے بے تکلف ہو گئے تھے بڑی

مشکل سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "وائسرائے کیا ہوتا ہے؟" پھوپھا حضت خوش ہوگئے کہ چلو ایک بچہ تو ذرا بات کرنے لگا۔ فوراً جواب دیا "انگریزوں کا بڑا افسر ہوتا ہے۔ ولایت سے آکر دہلی میں رہتا ہے۔ جب بلدہ آتا ہے تو اس محل میں ٹھہرتا ہے۔ ان دنوں سارے شہر میں چراغاں ہوتا ہے۔ لوگ وائسرائے کو دیکھنے راستہ کے بازو بنے گھروں، دکانوں اور راستوں میں ٹھہر جاتے ہیں۔ مدرسوں اور دفتروں کی تعطیل ہو جاتی ہے۔"

اب دو تین اسٹیشن جلدی جلدی آئے۔ بالکل پٹریوں کے بازو سے شہر کی بنڈیاں، ٹینکر میں جھٹکے، تانگے گزرتے دکھائی دینے لگے۔ ایک عجیب رونق تھی۔ کتنے سارے لوگ۔ پھوپھا حضت نے کہا "دیکھو اب موسٹی ندی کے پل سے گزرتے ہی کاچی گوڑہ اسٹیشن آئے گا۔ وہیں اترنا ہوگا۔ اسی میں ریل دھڑ دھڑ کرتی ندی کے پل سے گزر گئی۔ دونوں طرف بڑی گہرائی میں پانی دیکھ کر رمضانی، شعبانی سہم سے گئے۔ ادھر لوگ جو ڈبے میں بیٹھے تھے اپنا اپنا سامان سنبھالنے لگے۔ اتنے میں ریل ٹھہر گئی۔ کاچی گوڑہ اسٹیشن آگیا تھا۔ بہت سے لوگ اتر گئے۔ پھوپا حضت نے دونوں بچوں کو ہاتھ پکڑ کر اتارا اور ہاتھ پکڑے پکڑے باہر نکلے۔ گیٹ پر ایک آدمی گارڈ جیسے کپڑے پہنے کھڑا تھا۔ پھوپھا حضت نے ٹکٹ اس کو دے دیے۔ یہ کتنی بڑی صاف ستھری عمارت تھی اور کتنے سارے لوگ یہاں تھے۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر ایک جھٹکا کرایہ کیا۔ یہ تو کھاچر سے بہت اچھا تھا۔ چڑھنے کے لیے چھوٹی سیڑھی۔ آمنے سامنے گدی لگی چوکیاں۔ بازو میں ریشمی پردے لگے۔ پکڑنے کے لیے ریشمی ڈور پھندنے والی ٹنک رہی ہے۔ پھوپھا حضت پھر بتانے لگے "یہ ریزیڈنسی کی دیوار ہے۔ پہلے یہاں ریزیڈنٹ۔ انگریزوں کا حاکم رہتا تھا۔ اس طرف موسٹی ندی ہے۔ ندی پر پل بنا ہوا ہے۔ نیچے دیکھو ندی میں چوڑی دیوار سی بنی ہوئی ہے۔ بارش میں جب ندی میں پانی چھوڑا جاتا ہے تو اس دیوار پر سے پانی ایک چادر کی طرح گرتا ہے اس لیے اس پل کو چادر گھاٹ کا پل کہتے ہیں۔ اسی کی سیدھ میں تین اور پل ہیں۔ نیا پل۔ مسلم جنگ کا پل اور پرانا پل۔ ادھر کا شہر نیا شہر ہے۔ ادھر کا شہر پرانا شہر ہے۔ یہ یکی باولی کا محلہ ہے۔ اس میدان میں سرکس والے ٹھہرتے ہیں۔" رمضانی شعبانی کے کچھ سرکس سمجھ میں نہ آیا۔ پھوپھا حضت ان کی ان جانی سمجھ گئے

اور کہنے لگے: "سرکس میں جانور اور انسان عجیب عجیب تماشے کرتے ہیں۔ اگر آج کل میں کوئی سرکس آجائے تو تمھیں ضرور لے چلیں گے یہ جام باغ ہے اور یہاں آگے ایک بڑا مارکٹ بنے گا، چھوٹے شہزادے کے نام پر۔ اسی کا نام معظم جاہی مارکٹ ہوگا۔ اب تو کچھ خریدنا ہو تو شہر تک جانا ہوتا ہے پتھر گٹی تک۔ اس نئی مارکٹ میں ہر چیز کی دکان ہوگی۔ تب تک سڑکیں بھی خوب چوڑی ہو جائیں گی۔" جھٹکا ٹخ ٹخ کرتے چلا جا رہا تھا۔ کہیں راستہ خراب آتا تو جھٹکے لگتے۔ پھر بھی گانو کی کھاچر منڈی سے تو اچھا تھا۔

اب جھٹکا ایک لمبی سی گلی میں مڑ گیا اور کچھ دور جانے کے بعد ایک چھوٹے سے دروازے کے سامنے ٹھہر گیا۔ اس دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ جھٹکے کا کرایہ دے کر سامان کی پوٹلی بغل میں دبائے اور دونوں ہاتھوں میں رمضانی، شعبانی کا ہاتھ پکڑے پھوپھا حضت اندر پہنچے۔ ایک بڑا سا آنگن پار کر کے وہ دالان میں پہنچے۔ پھوپھی جان دوڑ کر زینے تک آگئیں اور بچوں کو لپٹا کر بلک بلک کر رونے لگیں اور رمضانی شعبانی کے ماں باپ کا نام لے کر بین کرنے لگیں۔

رمضانی، شعبانی۔ حیران، پریشان۔ روئیں یا ہنسیں سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ پھوپھا حضت تھوڑی دیر تک صبر سے کھڑے دیکھتے رہے۔ آخر جب دیکھا کہ بیوی صاحبہ کا رونا بڑھتا ہی جارہا ہے اور بچے بھی بسورنے لگے ہیں تو لے کے بیوی کو کراری ڈانٹ بتائی کہ "بس اب چپ ہو جاؤ جی۔ معصوم بچے ہیں۔ ان کا دل پھٹ جائے گا۔ تھکے ماندے گانو سے آئے ہیں کچھ خاطر کرو اور دو ٹکو

پھوپھی اماں آہستہ آہستہ چپ ہوئیں۔ اب بچوں نے ان کو اور گھر کو غور سے دیکھا۔ پھوپھی اماں گھر کی رنگی ہوئی گلابی ساڑھی پہنے تھیں جس پر پھولوں والی کالی توڑکی ہوئی تھی۔ بند گلے کا لمبی آستینوں کا لمبا سا کرتا۔ ہاتھ میں نگوں والی چوڑیوں کا جوڑا کانوں میں بہت سے سوراخ۔ ہر ایک میں گول گول ننھی ننھی سونے کی میٹھیاں۔ گلے میں سونے کی ٹھسی۔ پانو میں چاندی کے پازیب، اور پیر کی انگلیوں میں چاندی کے چھلے۔ پانو میں کالے سلیپر جن پر کچھ پھول پھول سے بنے ہوئے تھے۔ پتلی سی چوٹی میں جو خوب کس کر باندھی گئی تھی۔ چوڑا گلابی موباف بندھا تھا۔ اس وقت ان سب

بزرگوں کے رمضانی شعبانی کو نام تک معلوم نہیں تھے۔ یہ پہناوا گانو کی غریب عورتوں کو کہاں ملتا تھا اور نہ خالہ بی کے پاس تھا۔ خالہ بی نور دمالوں والی ساڑھی بہت لمبی سی باندھا کرتی تھیں۔ کرتا تو کبھی کبھار شادی بیاہ میں پہن لیا ورنہ چھوٹی سی چولی ہی پہنا کرتی تھیں ویسے ہی کپڑے گانو کی سبھی عورتیں پہنا کرتی تھیں چاہے ہندو ہوں چاہے مسلمان۔

دالان میں نیچے ٹاٹ، اس پر موٹی دری اور اس پر سفید چاندنی بچھی ہوئی تھیں۔ دیوار کے ساتھ گاؤ تکیہ لگا تھا۔ سامنے پاندان رکھا تھا۔ ایک کنارے پر بڑا سا حقہ تھا جس میں سے تمباکو کی خوشبو آرہی تھی۔

پھوپھی اماں نے بچوں کو بازو بٹھا دیا۔ دالان کے کنارے لکڑی کی چوکی رکھی تھی۔ نیچے سلفچی اور پیتل کا چمکتا لوٹا رکھا ہوا تھا پھوپھی اماں نے آواز دی تجھو کا ناشن آکر لوٹے سے پانی ڈالنے کھڑی ہوگئی۔ بچوں کی سمجھ میں نہ آیا۔ پھوپھا حضت سمجھ گئے۔ پھوپھی اماں کو اشارہ کیا انھوں نے بچوں کا ہاتھ پکڑ کر لکڑی کی چوکیوں پر بٹھا دیا پانی سے ہاتھ پاؤں دھلوائے۔ صاف رومال دیا کہ اچھی طرح ہاتھ منہ اور پیر صاف کریں۔

پھر کچھ کھاری، میٹھی چیزیں ماما جی ایک کشتی میں رکھ کر لے آئیں اور کشتی سامنے رکھ دی۔ چیزیں الگ الگ طشتریوں میں رکھی تھیں ایک ایک خالی طشتری رمضانی، شعبانی کے سامنے رکھ دی۔ یہ سب تہذیب، سلیقہ گنوار رو رمضانی، شعبانی کو بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ پھوپھا پھوپھی ان کی گنوٹی حرکات پر انجان انجان ہو جاتے یا پھر ان کی حیرانی دیکھ کر ان کو سمجھا دیتے کہ بچو یوں کرو یوں نہ کرو۔

ناشتے سے فراغت ہوگئی تو پھوپھا حضت نے پوچھا "اجی آج شاید چاند ہو جائے۔ کیوں بیوی رمضان شریف کا سب سامان جمع کر لیا نا ہو جواب ملا "ہو۔" بنی گیہوں باریک چاول۔ گڑ کا تیل دالیں بیسن۔ شکر، میدہ، فالودہ کی کاٹریاں، بالسگا، پینڈے، کھجور، افطار اور سحر کی چیزیں تو آپ نے پہلی پر ہی جمع کر دیا تھا۔ اچار، پاپڑ، بڑیاں تو میں نے گھر ہی میں بنالیں۔ مٹی کی صراحیاں، پانی کے گھڑے، مٹی کی صحنکیں کونڈے گھر میں افطاری جوڑنے اور مسجدوں میں بھجوانے کے لیے گھر پر ہی خرید ے۔

پھوپھا حضت کو اطمینان ہوگیا۔ اپنے کمرے میں جاکر عصر کی نماز پڑھنے کھڑے ہوگئے۔

ماما جی شریفن آکر دالان میں دری کے کنارے بیٹھ گئیں۔ پھوپھی اماں نے اپنے پاندان سے پان بنا کر ان کو دیا۔ انھوں نے سلام کرکے لے لیا۔ بچوں کو بھی ایک ایک پتے کا پان بنا کر دیا۔ آہا جی کیسے ہونٹ لال ہوگئے۔ ماما جی نے پان چباتے چباتے کہا "بن کی۔ بی بی جنتری میں چاند کل ہے۔ کل ہی دکھے گا۔ تجھو کا ناشن نے بھی جو زینے کے نیچے کھڑی تھی کہا "اماوس تو آج ہے۔ چاند تو کل ہی دکھے گا۔"

آنگن کے ٹاٹ کے پیچھے سے دو چہرے جھانکے اور دالان میں سب کو جمع دیکھ کر وہیں ٹھٹھک گئے۔ پھوپھی اماں نے انھیں دیکھ لیا اور آواز دی آؤ بٹکٹی آؤ چاندبان۔ دیکھو ہمارے ہاں مہمان آئے ہیں انھیں اپنے ساتھ چاند دیکھنے لے جاؤ۔

بچے اندر آگئے۔ رمضانی، شعبانی کو ساتھ لے گئے۔ تھوڑی دیر میں سب بچے اداس صورت سے آگئے کہ آج چاند نہیں ہوا۔

سید محمود نقوی

قصہ گوئی کا مقابلہ

[برما کی ایک دلچسپ کہانی]

بات بہت پہلے کی ہے۔ برما کے ایک گاؤں میں چار نوجوان دوست رہتے تھے' ان کا مشغلہ تھا من گھڑت قصے بنانا اور سنانا۔ ان چاروں کے مزاج اور عادتیں ملتی جلتی تھیں اس لیے اکثر ساتھ گھومتے پھرتے۔ ایک دن چاروں دوست ٹہلتے ہوئے گاؤں کی سرائے میں پہنچے۔ وہاں انھوں نے ایک نو وارد خوش پوشاک شخص کو دیکھا۔ "یہ شخص کافی پیسے والا معلوم ہوتا ہے' کیوں نہ اس سے شرط لگا کر قصہ گوئی کا مقابلہ کیا جائے اور اس کے سارے کپڑے وغیرہ جیت لیے جائیں۔ چاروں دوستوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ "ٹھیک ہے چلو پہلے ادھر ادھر کی باتیں کرکے زمین ہموار کرلی جائے۔" چاروں نے فیصلہ کیا۔ ان میں سے ایک نے گاؤں کے تاریخی حالات بتائے' دوسرے نے گاؤں سے ملے ہوئے جنگل کے عجیب و غریب واقعات سنائے' تیسرے نے جنگل کے بیچ سے بہتی ہوئی ندی کے آثار چڑھاؤ کی داستانیں سنائیں اور چوتھے نے دور پر واقع پہاڑ کے سلسلے میں اپنی سیر و تفریح کی فرضی کہانیاں کہیں۔ اس طرح جب کچھ بے تکلفی ہوگئی تو ان میں سے ایک نے تجویز رکھی کیوں نہ ہم سب شرط لگا کر آپ بیتی کا دلچسپ واقعہ سنائیں اور جو کوئی بھی دوسرے کے قصے کی سچائی پر شک و شبہ کرے وہ قصہ سنانے والے کا غلام سمجھا جائے گا اور اسے قصہ گو کی ہر بات ماننا پڑے گی۔

مسافر نے جواب تک ان کی ساری باتیں پوری توجہ سے سن رہا تھا' بڑی سنجیدگی سے ان کی تجویز کو منظور کرلیا چاروں دوستوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے وہ کہہ رہے ہوں "اب تو بیٹا پھنس ہی گئے جال میں۔" انھوں نے سوچا اول تو یہ نو وارد شخص کوئی عجیب و غریب قصہ سنا نہیں پائے گا اور اگر کوئی ناممکن واقعہ سنایا بھی تو وہ لوگ اسے بے چون و چرا تسلیم کرلیں گے اور وہ خود ایسے بے سر و پا قصے سنائیں گے کہ مسافر کو مجبور ہوکر شک و شبہ کا اظہار کرنا پڑے' پھر وہ ایک زبان ہوکر کہیں گے اب تو آپ بازی ہار گئے اپنے سارے کپڑے وغیرہ ہمیں دے دیجیے اور ہمارے غلام بن جائیے انھیں اپنی قصہ گوئی پر بڑا اعتماد تھا چنانچہ وہ گاؤں کے پردھان کو بھی بلا لائے تاکہ وہ ان کی قصہ گوئی کے مقابلے میں جج کے فرائض ادا کرے پہلے نوجوان شخص نے اپنی آپ بیتی اس طرح سنانی شروع کی:

"جب میں پیدا ہونے والا تھا' میری ماں نے میرے باپ سے کہا' وہ سامنے جامن کا جو درخت ہے اس سے کچھ جامنیں توڑ کر لا دیجیے۔ میرے والد نے جواب دیا' درخت بہت اونچا ہے' اس پر چڑھنا میرے بس کی بات نہیں۔ پھر میری والدہ نے میرے بڑے بھائیوں سے اس خواہش کا اظہار کیا لیکن انھوں نے بھی ان کی خواہش کو پورا نہیں کیا۔ مجھ سے اپنی ماں کی بے چارگی دیکھی نہیں گئی' چپ چاپ باہر نکل آیا' درخت پر چڑھا' ڈھیر ساری جامنیں توڑ کر اپنی جیبوں میں بھر لیں اور سب کی نظریں بچا کر کھانے کی میز پر رکھ دیں۔ جب میری والدہ کی نظر جامنوں پر پڑی تو وہ خوش ہوگئیں' انھوں نے جی بھر کے کھائیں' دوسرے گھر والوں نے بھی خوب مزے لے کر جامنوں سے

۵۔ شام ناتھ مارگ ۔ دہلی ایڈمنسٹریشن ۔ دہلی ۵۴

پیٹ بھرا۔ پھر بھی بہت سی جامنیں بچ گئیں جو میری والدہ نے پڑوسیوں میں بانٹ دیں لیکن کسی کو یہ پتا نہ چل سکا کہ اتنی ڈھیر ساری جامنیں کیسے آئیں اور کون لایا۔"

قصے کے خاتمے پر چاروں نوجوان دوستوں نے مسافر کی طرف دیکھا کہ قصے کی سچائی پر وہ کچھ شک شبہ کا اظہار کرے لیکن اس نے کچھ تو بھی نہیں صرف اس طرح گردن ہلا دی جیسے اس نے واقعات کی سچائی کو تسلیم کر لیا ہو۔

اب دوسرے نوجوان کی باری تھی۔ اس نے اپنی سرگذشت اس طرح سنائی: "جب میں سات دن کا تھا تو میرا دل سیر کرنے کو چاہا اور جنگل کی طرف چل دیا۔ وہاں میں نے ایک بہت بڑا املی کا درخت دیکھا جس میں ادھ پکی املیاں لگی ہوئی تھیں۔ بھوک لگی تھی۔ میں درخت پر چڑھ گیا اور اتنی زیادہ املیاں کھا لیں کہ پھر درخت سے اُترا نہ گیا۔ مجبوراً مجھے سیڑھی لینے کے لیے گاؤں جانا پڑا جسے درخت سے لگا کر میں نیچے اتر سکا۔"

اس قصے کے خاتمے پر بھی نوجوانوں کی توقع کے خلاف مسافر نے سر ہلا دیا جیسے کچھ انہونی بات اسے محسوس ہی نہ ہوئی اور اس کے ساتھ تینوں نوجوانوں نے بھی سر ہلا کر متفق ہونے کا اظہار کیا۔

تیسرے نوجوان نے اپنا واقعہ کچھ جھجکتے ہوئے اس طرح پیش کیا "میری آپ بیتی میں قابلِ ذکر واقعہ خاصی دیر میں پیش آیا جب کہ میں تقریباً ایک سال کا ہو گیا تھا۔ ایک دن صبح کے وقت سیر کرتے ہوئے میں نے ایک خرگوش کا پیچھا کیا، وہ بھاگ کر ایک جھاڑی میں گھس گیا اور میں بھی اس کے پیچھے وہاں پہنچا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ خرگوش نہیں بلکہ درحقیقت چیتا تھا جس نے پلٹ کر مجھے کھانے کے لیے اپنا منہ کھولا۔ میں نے احتجاج کیا "مجھے کھانے کا ارادہ ہرگز نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ میں نے خرگوش سمجھ کر اس کا تعاقب کیا تھا" لیکن چیتے نے میری بات نہیں مانی اور جواب دیا کہ وہ موقع کا فائدہ ضرور اٹھائے گا، ناشتے کے لیے اسے صبح صبح اتنا اچھا شکار مل گیا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا منہ کچھ اور کھولا لیکن میں اچھل کر اس کے سر پر سوار ہو گیا اور اپنے بائیں ہاتھ سے اس کا اوپری جبڑا پکڑ کر ایک ایسا زوردار جھٹکا دیا کہ چیتے کے دو ٹکڑے ہو گئے اور وہیں پر ڈھیر ہو گیا، پھر میں اطمینان سے اپنے گھر لوٹ آیا۔"

اب کی بار پھر چاروں دوستوں نے اس امید کے ساتھ مسافر کے چہرے کی طرف دیکھا کہ وہ واقعات پر کچھ بے یقینی کا اظہار کیا لیکن اس کے برخلاف مسافر نے اعتبار کرتے ہوئے سر ہلا دیا اور کچھ جھنجھلاہٹ کے ساتھ دوسرے دوستوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

اب چوتھے نوجوان نے اپنا قصہ سنانا شروع کیا۔ "پچھلے سال کی بات ہے، ایک دن کشتی پر سوار ہو کر میں مچھلی کے شکار کو نکلا۔ سمندر میں کچھ اور لوگ بھی شکار میں مصروف تھے۔ پورا دن گزر گیا اور ہم میں سے کسی کے ہاتھ ایک مچھلی بھی نہ لگی۔ مجھے یہ عجیب سا لگا کہ اتنا بڑا سمندر اور اس میں مچھلی کا نام و نشان بھی نہیں۔ ایسا کیوں ہے یہ جاننے کے لیے میں نے کشتی سے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ میں سمندر کی تہ کی طرف بڑھتا رہا اور تین دن لگاتار تیرنے کے بعد جب میں تہ پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ پہاڑ جیسی ایک بہت بڑی سی مچھلی ہے جو دوسری ساری مچھلیوں کو نگلے جا رہی ہے۔ پہلے تو مجھے کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہوئی لیکن اس کے پہلے کہ وہ مچھلی مجھ کو دیکھ سکے میں نے ہمت کر کے ایک زوردار گھونسہ اس کے سر پر مارا جس سے مچھلی کا خاتمہ ہو گیا۔ مجھے شدید بھوک لگی تھی، میں نے وہیں آگ جلا کر مچھلی کو بھوننا شروع کیا اور ساری مچھلی کھا گیا پھر میں تیر کر سمندر کی سطح پر آیا اور جتنے لوگ مچھلی کے شکار میں اپنا وقت ضائع کر رہے تھے ان سے اپنی سرگذشت سنائی۔"

یہ انوکھی داستان بھی سن کر مسافر نے بڑے اطمینان سے اپنا سر ہلا دیا جیسے بے اعتباری کا کوئی سوال ہی نہیں اور پھر بے چارے تینوں دوستوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ اب مسافر کو اپنا قصہ سنانا تھا۔ اس نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا: "کچھ عرصے پہلے میں کپاس کا کاروبار کرتا تھا۔ کپاس کا ایک درخت غیر معمولی طور پر بڑا اور سرخ رنگ کا تھا۔ کافی عرصے کے بعد اس درخت میں شاخیں اور پتیاں کچھ نہ اگیں لیکن کچھ مدت کے بعد اس میں چار شاخیں نکلیں اور ہر ایک شاخ میں ایک کلی جس نے ایک بڑے سے پھل کی صورت اختیار کر لی۔ میں نے پھلوں کو توڑ کر کاٹا تو ہر پھل سے ایک نوجوان شخص کود کر باہر نکل آیا۔ چوں کہ نوجوان میرے ہی کھیت کے درخت کی پیداوار تھے اس لیے آپ لوگ بھی اس بات کو تسلیم کریں گے کہ انھیں اپنا غلام بنانے کا قانونی طور پر مجھے پورا اختیار حاصل تھا۔ یہ کہتے ہوئے مسافر نے

سوالیہ نگاہوں سے چاروں نوجوانوں کی طرف دیکھا جنھوں نے بالجواب اتفاق رائے کا اظہار کیا۔

"پھر میں نے ان چاروں نوجوانوں کو اپنی کاشت کاری میں کام پر لگا دیا لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ چاروں کاہل اور کام چور ہیں اور جب تک ان کی نگرانی نہ کی جائے ٹھیک کام نہیں کرتے۔ ایک دن مجھے اپنے کاروبار کے سلسلے میں جانا پڑا اور جب میں شام کو واپس آیا تو دیکھا کہ چاروں نوجوان بھاگ گئے ہیں تب سے میں چاروں کی تلاش میں ہوں اور بہر حال خدا کا شکر ہے کہ آج چاروں یہاں مل گئے" اب میرے ساتھ چلو اور اپنے کام پر لگ جاؤ کیوں کہ بہر حال تم لوگ میرے غلام ہو۔"

چاروں نوجوانوں نے بے چینی کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا، وہ بری طرح بازی ہار گئے تھے اگر وہ مسافر کے قصے کے سچ ہونے کا اعتراف کر لیتے تو انھیں اس کا غلام بننا پڑتا اور اگر وہ یہ کہتے کہ قصہ سچا نہیں ہے تو بھی شرط کے مطابق انھیں غلامی قبول کرنا پڑتی۔ ان کے منہ سے کچھ نہ اقرار کرتے بن پڑ رہا تھا اور نہ انکار۔

گاؤں کے پردھان نے جج کے فرائض انجام دیتے ہوئے فیصلہ سنایا کہ قصہ گوئی کے مقابلے میں مسافر بازی جیت گیا ہے اور چاروں نوجوان ہار گئے ہیں۔

پھر مسافر نے مسکراتے ہوئے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا "نوجوان دوستو! مجھے تمھاری ضرورت نہیں، بس تم اپنے ملبوسات مجھے دے دو پھر تم آزاد ہو۔"

چاروں نوجوانوں نے اسی میں اپنی عافیت سمجھی اپنے کپڑے اتار کر مسافر کے حوالے کیے اور سر جھکائے ہوئے سرائے سے باہر نکل آئے۔ مسافر نے بھی اپنا سامان سمیٹا اور اپنے سفر پر آگے روانہ ہو گیا۔

خط وکتابت کرتے وقت
اپنا پتا
صاف اور خوشخط تحریر فرمایئے
جواب کے لیے پتا لکھا ہوا لفافہ یا کارڈ ارسال فرمائیں۔

بقیہ بچوں کی کوششیں

"کیا تم پاگل ہو گئے ہو بیربل؟ تمہارے کھانے کا برتن درخت کے اوپر ہے اور چولھا زمین پر پھر تمہارے برتن کا پانی کیسے گرم ہوگا۔" بادشاہ نے کہا۔

وزیر: یہ ہو سکتا ہے جہاں پناہ! جب ایک برہمن ساری رات جھیل میں رہ کر آپ کے محل کے چراغ کی روشنی سے گرمی محسوس کر سکتا ہے تو یہ پانی بھی گرم ہو سکتا ہے۔ جو کہ میں نے درخت پر لٹکایا ہے۔

تب بادشاہ کو یاد آ گیا اور وہ بیربل کی باتوں کو خوب سمجھ گیا اور فوراً اپنے محل میں گیا اور برہمن کو بلوا کر اسے پچاس ہزار انعام دے دیا۔

عمران آرزو
پیلانا سیتارام پور، بردوان

(بشکریہ نونہال کراچی)

عبدالخالق ناگپوری

انعامی کوپن اور موٹر کار

اپنے ہاں جو اکبر بھائی ہیں نا۔ انھیں کوئی اور کام تو ہے نہیں۔ نہ جانے ان کو کہاں سے کوپن جمع کرنے کا شوق لگ گیا ہے۔ مذہب کے بعد اگر ان کا ایمان کہیں ہے تو کوپنوں میں۔ ابھی چند روز پہلے کا ذکر ہے، میں نے اکبر بھائی کے ناشتے میں پراٹھے کے ساتھ سگریٹ کی ڈبیا دیکھی۔ میں نے سوچا کہیں یہ کوپنوں کے شوق میں پراٹھوں کے ساتھ سگریٹ تو نہیں کھانے لگے۔ اس لیے ان سے فوراً ہی گھبرا کر پوچھا۔

"یہ کیا ماجرا ہے۔ ناشتے کی پلیٹ میں سگریٹ کی ڈبیا کیسی؟"

اکبر بھائی نے ڈبیا اٹھا لیتے ہوئے کہا۔

"یہ سگریٹ کی ڈبیا نہیں ہے۔ مکھن کی ڈبیا ہے۔"

میں نے اکبر بھائی سے پوچھا:۔

"آپ ناشتے کے وقت ہر روز ایک نئی ڈبیا لاتے ہیں۔"

اکبر بھائی بولے۔

"کوپنوں سے بہت سی اشیا مفت ملتی ہیں۔"

مفت! نہیں بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ "ہاں بالکل مفت۔"

"مثال کے طور پر اگر آپ کے پاس اس مکھن کی ڈبیا کے پانچ سو کوپن ہوں تو آپ ایک ہری کین (لالٹین) حاصل کر سکتے ہیں۔"

میں نے فوراً کہا: "لالٹین لے کر میں کیا کروں گا۔ آج کل تو بجلی کا زمانہ ہے۔" "اچھا لالٹین نہ سہی۔ کچھ اور سہی فہرست میں بہت سی اشیا کا نام ہے۔"

اکبر بھائی نے فہرست پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

"سگریٹ جلانے کا چاندی کا لائٹر، گدی کا جوتا، ریان کی جراب بھی ہے اور بھی سامان ہے۔"

"پھر بھی اکبر بھائی یہ تو فضول خرچی ہے۔ آخر پانچ سو کوپن جمع کرنے میں تو روپیا خرچ ہوتا ہی ہے نا۔"

اکبر بھائی بولے:

"آپ تو غضب کرتے ہیں۔ مکھن تو روزمرہ استعمال کرتے ہیں۔ آپ مکھن خریدتے ہیں۔ ساتھ میں کوپن مفت حاصل کرتے ہیں۔ پانچ سو کوپن اس طرح جب اکٹھا ہو جائیں۔ تو ایک ہری کین اگر ایک ہزار ہوں تو چاندی کی موٹھ والی چھتری اور دو ہزار ہوں تو پارکر فاؤنٹن پن۔ دس ہزار ہوں تو ریڈیو گرام۔" میں قائل ہو گیا۔ میں نے تنگ آکر پوچھا:

"مکھن کی ڈبیا جس میں کوپن ہوتا ہے، کتنے کی آتی ہے۔ بولے ساڑھے گیارہ آنے کی۔"

دوسرے روز سے میں نے بھی ڈبیا خریدنی شروع کی مجھ کو تو چاندی کی موٹھ والی چھتری کی دھن تھی۔ اس لیے

میں نے دن میں چار بار ڈبیا خریدنی شروع کی۔ مجھے مکھن پسند نہیں تھا۔ میں تو دراصل دہی پسند کرتا ہوں۔ مگر اب کیا کیا جائے۔ ایک دھن سوار ہو چکی تھی۔ کیوں کہ چاندی کی موٹھ والی چھتری ہی لینا تھا۔ روزانہ چار چھ ڈبیاں خریدتا اور مکھن کھانے کی کوشش کرتا۔ اکثر ناکام رہتا۔ اس لیے میں کوپن اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیتا اور مکھن اکبر بھائی کو دے دیتا۔ اس پر وہ بہت ناک پھلا کر کہنے لگے۔

"آپ مکھن رکھ لیجیے۔ کوپن ہمیں دے دیجیے۔"

میں نے کہا: "واہ مجھے تو چاندی کی موٹھ والی چھتری لینا ہے۔ اس لیے آپ کو میں مکھن کھلا رہا ہوں۔ آپ بھی کھائیے اور گھر میں زبردستی سب کو کھلانا شروع کر دیجیے۔" اور میں نے بھی کھانا شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں مکھن کی افراط سے پیچش ہو گئی اور شفا ہوتے ہوتے ڈیڑھ سو روپے اٹھ گئے۔ اب تک میرے پاس دو سو کوپن جمع ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ اتنے میں چاندی کی موٹھ والی چھتری کہاں آئے گی اور ایک دو سال لگے۔ چلو ان دو سو کوپنوں کا جو مل جائے گا لے لیں۔ میں دو سو کوپن لے کر گیا۔ انھوں نے کہا:

"ان اشیا میں سے کوئی چیز اپنے لیے پسند کر لیں"

فہرست دیکھی تو اس میں اتنی اشیا لکھی تھیں۔

۱۔ کاٹھ کا گھوڑا چھ سال کے بچے کی سواری کے لیے۔
۲۔ بالوں کے پنوں کے تین سٹ۔
۳۔ لپ اسٹک
۴۔ بالوں کو گھونگھریالے بنانے کا آلہ
۵۔ پھلوں کا رس نکالنے کی مشین
۶۔ آئس کریم کھانے کا خوش نما پلاسٹک کا چمچہ۔

پہلے تو سوچتا رہا۔ ان میں سے تو کوئی بھی اپنے کام کی نہیں۔ آخر آئس کریم کھانے کی سوچی۔ میں نے پلاسٹک کا چمچہ اٹھا لیا اور میں دین ساریستوران میں آئس کریم کھانے چلا گیا۔ وہاں میں نے اس خوبصورت چمچہ سے چھ پلیٹیں خوب ڈٹ کر کھائیں۔ لیکن جب بل ادا کیا۔ تو دیکھتا ہوں کہ پلیٹ میں بل کے ساتھ ایک کوپن بھی رکھا ہوا ہے۔ میں نے گھبرا کر ویٹر سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

ویٹر نے مسکراتے ہوئے کہا: "اپنے ہاں جو چھ پلیٹ آئس کریم کھاتا ہے اسے کوپن ملتا ہے۔"

"میں اس کوپن کو لے کر کیا کروں گا۔ نہ بابا نہ۔ میں باز آیا۔ یہ کوپن اٹھا لو۔" ویٹر نے مجھے اطمینان دلاتے ہوئے کہا:

"آپ اسے لے جائیے یہ بڑے کام کی چیز ہے۔ آپ کو تو مفت مل رہی ہے۔ آپ کسی دوست کو دے دیجیے وہ ہمیشہ آپ کا احسان مند رہے گا۔"

اجی صاحب، ویٹر نے ایک لمبی فہرست کھولتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ کے پاس ایک درجن کوپن ہوں تو ہم آپ کو گریٹا گاربو کی فریم کردہ خوبصورت تصویر دیں گے۔ اگر چوبیس کوپن ہوں تو بال اگانے کی کریم۔"

"مگر میں گنجا نہیں ہوں۔"

"پچاس کوپن ہوں تو بائیو کیمسٹری کے ایک چرمی بیگ میں مکمل دواخانہ۔"

"کاہے کے لیے بھائی۔"

"بدہضمی دور کرنے کے لیے، ہر قسم کی بیماری دور کرنے کے لیے۔ اگر پانچ سو کوپن ہوں تو ایک دو سیٹ کی چھوٹی موٹر گاڑی۔"

"باپ رے۔"

میں اچھل پڑا۔ "لاڈ لاڈ ادھر لاڈ یہ کوپن۔"

کوپن لے کر اس دن کے بعد سے میں نے وہاں جا کر آئس کریم کھانا شروع کیا۔ دو مہینے میں تین سو کوپن جمع کیے۔ اگلے ماہ پچاس اور بڑھ گئے۔ مگر اب آئس کریم کھانے سے طبیعت اکتا گئی تھی۔ اب کھائی نہیں جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا میں آئس کریم نہیں کوپن کھا رہا ہوں یا پھر آنے والی فیئٹ کار کے پرزے چبا رہا ہوں۔ پھر پچاس کوپن اور بڑھ گئے۔ اب یہ آئس کریم

بڑی مشکل سے کھائے گئے۔ روز رات میں کھٹی ڈکاریں آتیں زکام بھی ہو جاتا۔

دوسرے احباب بہت سمجھاتے۔ مگر مجھ پر تو ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی بھی طرح پانچ سو کوپن پورے ہو جائیں۔ اب تو صرف ایک سو کوپن باقی رہ گئے تھے۔ جب پانچ سو میں صرف پچیس کوپن باقی رہ گئے تو شام کے وقت مجھے کچھ حرارت سی ہو گئی۔ رات میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ صبح کو ملک عدم سدھار جاتا۔ اگر وقت پر طبی امداد نہ طلب کر لی جاتی تو مشکل تھا میرا بچنا۔ معلوم ہوا نہ یادہ آئس کریم کھانے سے میرے پھیپھڑوں کی جھلی میں ورم آگیا ہے۔ دو مہینے علاج ہوتا رہا۔ ڈیڑھ ہزار روپے خرچ ہو گئے۔ خیر جب اچھا ہوا تو کوپن اٹھا کر ریستوران پہنچا معلوم ہوا کہ انعام یا تو چار سو کوپن پر ملتا ہے یا پورے پانچ سو کوپن پر۔ میرے پاس تو چار سو پچھتر کوپن تھے۔ اس پر کچھ بھی نہیں ملتا۔

تو مجھ کو چار سو کوپن پر ہی دے دیجیے۔" "یہ دیکھیے فہرست"۔ میں نے دیکھی فہرست آپ بھی دیکھیے

۱۔ کوٹ ٹانگنے کی کھونٹیاں چوبیس۔
۲۔ سوٹ پریس کرنے کی مشین دو۔
۳۔ بجلی سے حجامت کرنے کی مشین دو
۴۔ ریان کی جرابیں چار عدد
۵۔ مغربی عورت کے سر پر پہننے والی ہیٹ۔
۶۔ اونچی ایڑی سینڈل دو

میں نے پوچھا۔ "چار سو پچھتر میں فیئٹ کار نہیں دو گے۔"
"نہیں، وہ تو پورے پانچ سو کوپنوں میں آتی ہے۔ آپ اور ۲۵ کوپن جمع کر لیجیے۔" اس میں ہے کیا۔
"ہے کیا" میں گرج کر بولا۔ "میرے پھیپھڑوں کی جھلی پر ورم آگیا ہے۔ آئس کریم کھاتے کھاتے اور تم پچیس کوپن کی رعایت نہ کر سکے۔" "نہیں بڑا افسوس ہے۔"
میں نے کہا۔ "تم ان پچیس کوپنوں کے عوض میں اس کار کا ہڈ اتار لو۔ اس کے آگے کی دو بتیاں غائب کر دو ایک ٹائر کو پنکچر کر دو۔ اس کا اسٹیرنگ وہیل توڑ دو۔ مگر للہ مجھ کو وہ کار ضرور دے دو۔ میں ویسے ہی چلاؤں گا۔ مجھے دے دو، ضرور دے دو۔

خان پرویز احمد — عمر ۱۶ سال
مشغلہ: رسائل کا مطالعہ کرنا، اچھی کتابیں پڑھنا۔
پتا: ۱۳۶ ڈاکرڈ۔ ڈی۔ این۔ روڈ امپیریل بلڈنگ، بمبئی۔ ۱ ۴

محمد فاروق احمد
مشغلہ: رسائل پڑھنا، کرکٹ کھیلنا، تفریح کرنا
پتا: مکان نمبر 176-3-6 دھنگر ٹیکڑی ناندیڑ 431601

رومی شاہین سلطانہ — عمر ۱۵ سال
مشغلے: خطوط کے جواب دینا، اسٹامپ جمع کرنا
پتا: معرفت مسلم اقبال، بتیانہ، کلٹی، بردوان

شکیل احمد — عمر ۱۴ سال
مشغلہ: قلمی دوستی کرنا، بڑوں کا کہنا ماننا
پتا: ناگوری محلہ، مہدپور، ضلع اجین۔ (ایم۔ پی)

محمد جاوید اختر — عمر ۱۵ سال
مشغلہ: کتابیں پڑھنا، خطوط کا جواب دینا۔
پتا: کیندوا ہائی سکول، کلاس VI 'B'، پوسٹ کلٹی، ضلع بردوان

ضیاء الہدیٰ — عمر ۱۶ سال
مشغلہ: اچھے رسائل کا مطالعہ کرنا، ڈاک ٹکٹ جمع کرنا،
پتا: جونا بازار مکان نمبر ۱۳-۱۲-۱ اورنگ آباد مہاراشٹر [illegible]

نکہت، فرحت، صبیحا و نیرہ بتول
مشغلہ: نماز پڑھنا، اچھے کھانے کھانا
پتا: معرفت ڈاکٹر معین الدین انصاری، [illegible]

درخت کی گواہی

سلطانہ واحدی

(یہ کتاب "کلیلہ دمنہ" نوشیرواں کے زمانے میں جو ساسانی دور کا بادشاہ تھا ہندستان سے ایران لائی گئی کہا جاتا ہے اس نے اپنے شاہی حکیم کو آب حیات لانے کے لیے ہندستان بھیجا وہ حکیم کئی سال تک دشت و صحرا میں تلاش کرتا رہا تب اس سے ایک پنڈت نے کہا جس کتاب کو تم آب حیات سمجھ رہے ہو وہ پنچ تنتر ہے اس حکیم نے سنسکرت سیکھی اور اس کتاب کو پہلوی زبان میں ترجمہ کیا جب ایران میں اسلامی حکومت آئی اس کتاب کا ترجمہ عربی میں ہوا۔ چھٹی ہجری میں ابوالمعالی منشی بہرام شاہ غزنوی نے اس کا ترجمہ فارسی میں کیا اس کے بعد جو بھی بادشاہ آیا اس کہانی کے مجموعے کو چھپواتا رہا اور آج بھی اس کتاب کی کہانیاں بچوں کے کورس میں رکھی جاتی ہیں یہ کہانی بھی "کلیلہ دمنہ" سے لی گئی ہے۔)

دو دوست تھے ایک چالاک اور دھوکہ باز، دوسرا اس کے برعکس ایماندار اور سیدھا تھا۔ ایک مرتبہ دونوں تجارت کے لیے جا رہے تھے راستے میں انھیں اشرفیوں سے بھرا ایک تھیلا ملا جب وہ شہر کے نزدیک پہنچے تو انھوں نے سوچا کہ اب تقسیم کر لینا چاہیے۔ چالاک دوست بولا ہم لوگ اس کو تقسیم ہی کیوں کریں؟ ہم لوگ ایسا کرتے ہیں کہ ہم کو جتنی ضرورت ہے اس میں سے نکال لیتے ہیں بقیہ کسی خفیہ جگہ چھپا دیتے ہیں۔ جب بھی ہم کو ضرورت ہوا کرے گی ہم آ کر نکال لیا کریں گے جب یہ بات طے ہو گئی تو دونوں نے ضرورت کے مطابق اشرفیاں نکال کر باقی کو ایک درخت کے نیچے گاڑ دیا اور شہر چلے گئے دوسرے دن وہ دوست جو اپنی چالاکی اور دھوکہ بازی کی وجہ سے مشہور تھا وہ اسی جگہ گیا اور دفن شدہ تھیلے کو چرا لے گیا۔

کچھ روز گزر گئے ایک دن ایماندار دوست کو پیسوں کی ضرورت پڑی وہ اپنے چالاک دوست کے پاس آیا اور بولا آؤ ذرا اس پیڑ کے پاس چلیں کیونکہ مجھے پیسوں کی سخت ضرورت پیش آ گئی ہے دونوں وہاں آئے لیکن وہاں سے تھیلا غائب تھا چالاک دوست نے جھٹ سیدھے دوست کا گریبان پکڑ لیا اور بولا یقیناً تم نے ہی اشرفیوں سے بھرا تھیلا چرایا ہے کیونکہ تمھارے علاوہ اور کوئی اس اشرفیوں سے بھرے تھیلے کے بارے میں نہیں جانتا تھا بیچارہ ایمان دار آدمی قسمیں کھانے لگا کہ میں نے ہرگز نہیں چرایا ہے لیکن چالاک دوست پر اس کی قسموں کا کچھ اثر نہیں ہوا اور وہ اسے زبردستی قاضی کے پاس لے گیا اور اول تا آخر ماجرا گوش گزار کر دیا قاضی نے پوچھا کہ تمھارا کوئی وکیل یا گواہ ہے چالاک دوست بولا ہاں۔۔۔! جس درخت کے نیچے ہم نے اشرفیوں سے بھرا تھیلا چھپایا تھا وہی درخت خود گواہی

دے گا۔ قاضی کو اس کی بات سن کر بہت تعجب ہوا کافی بحث و تکرار کے بعد یہ طے پایا کہ قاضی درخت کے پاس جائے اور درخت کو صحیح گواہی کا حکم دے۔

خیانت دار چالاک دوست اپنے گھر گیا اور اپنے باپ سے بولا کہ میں نے آپ کی شفقت و محبت پر بھروسا کرتے ہوئے یہ بات کہہ دی ہے کہ درخت گواہی دے گا۔ اب آپ کو درخت کے اندر چھپ کر بیٹھنا ہے اور اگر ہم کو اشرفیوں سے بھرا تھیلا مل گیا تو ہم عیش سے زندگی بسر کر سکیں گے باپ نے کہا لیکن یہ کام مجھ سے کیسے ہو سکتا ہے؟ چالاک دوست جو کہ رشتے میں بیٹا تھا بولا درخت کے اندر کھوہ ہے اور کھوہ میں اتنی گنجایش ہے کہ ایک دو آدمی اس میں بیٹھ سکتے ہیں اور انھیں کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ آج رات آپ اس درخت کے اندر بیٹھ جائیے کل قاضی آکر درخت سے گواہی لے گا۔

باپ نے کہا: اے لڑکے تم تو بہت دھوکہ بازی کا کام کروانا چاہتے ہو لڑکے نے کہا: اباجان ہمیں چاہیے کہ اس مسئلے پر بحث کم کریں کیونکہ اس میں ہم کو بہت منافع ہوگا اور آخر کار دولت کی لالچ میں آکر بوڑھا باپ بیٹے کی مدد کے لیے آمادہ ہو گیا۔ دوسرے دن قاضی درخت کے نیچے آیا اور اس کے ساتھ لوگوں کا ایک جم غفیر بھی تماشا دیکھنے آیا۔ قاضی نے اشرفیوں سے بھرے تھیلے کے بابت درخت سے دریافت کیا تو درخت سے آواز آئی کہ اشرفیوں کا تھیلا اسی ایماندار دوست نے چرایا ہے قاضی آواز سن کر متحیر رہ گیا اس نے درخت کے چاروں طرف چکر لگائے اور سمجھ گیا کہ ضرور کوئی اس کے اندر ہے تب اس نے حکم دیا کہ بہت سارا ایندھن لاکر پیڑ کے چاروں طرف جمع کر کے آگ لگا دی جائے ...... بوڑھا آدمی کچھ دیر صبر کرتا رہا لیکن جب اس نے سوچا کہ عنقریب جان خطرے میں ہے تو گھبرانے لگا۔ قاضی نے حکم دیا کہ اس آدمی کو باہر نکال لاؤ۔ لوگ اس بوڑھے کو گھسیٹ کر باہر نکال لائے۔ بوڑھا آدمی بے حد شرمندہ تھا۔ اور اب سچائی سامنے آگئی تھی۔ قاضی تمام باتیں سمجھ گیا تھا کہ امانت میں خیانت کس نے کی ہے۔ خیانت دار دھوکہ باز دوست کی سزا مقرر ہو گئی اور ایمان دار آدمی کی سچائی کی خیر و برکت سے اشرفیوں سے بھرا تھیلا اسے سونپ دیا گیا اور سب لوگ لوٹ گئے۔

ادھر ادھر سے

روتا ہوا مینار

نئی دلی۔ ۲۵ اکتوبر (بھارتی) ترکی کی ایک مسجد میں ایک ایسا مینار ہے جس کی چوٹی سے چوبیس گھنٹے پانی کے قطرے گرتے رہتے ہیں۔ وہاں کے لوگ اس مینار کا پانی تبرکاً اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ پانچ سو سال گزر چکے ہیں۔ پانی کے قطرے بدستور گرتے رہتے ہیں لیکن یہ راز کہ پانی کہاں سے گرتا ہے حل نہ ہو سکا ہے۔

جامع مسجد اردو میڈیم

دلی۔ ۲۴ اکتوبر گذشتہ سال کی طرح اس سال بھی گورنمنٹ سینیر سکنڈری اسکول (اردو میڈیم) جامع مسجد نے سائنس میلا میں شاندار کامیابی حاصل کی ہے۔ اس سال اس اسکول کے طلبہ نے ایک ایسا "انٹرکم سسٹم" بنایا ہے جس کی لاگت صرف سولہ روپیہ آتی ہے اور جو آسانی سے تیار کیا جا سکتا ہے۔

مظہر الاسلام اسکول کے ۲ طلبہ کو انعام

نئی دہلی۔ ۲ نومبر ۳۱ اکتوبر کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یوم تاسیس کی تقریبات کے سلسلہ میں تعلیمی میلا منعقد ہوا۔ اس میں تحریری و تقریری مقابلے بھی ہوئے۔ مقابلوں میں مظہر الاسلام ہائر سکنڈری اسکول فراش خانہ کے دو طلبہ نے کامیابی حاصل کی۔ عشرت کفیل نے کہانی نویسی میں درجہ اول اور تقریر میں درجہ دوئم اور سید سعود زیدی نے نظم کے مقابلے میں درجہ سوم میں کامیابی حاصل کی۔

ادارہ نور المعارف کا طالب علم کامیاب

امروہہ۔ ۵ نومبر انجمن سیرت النبیؐ امروہہ کے سالانہ تحریری و تقریری مقابلوں کا انعامی اجلاس زیر صدارت حضرت الحاج مولانا مفتی نسیم احمد صاحب فریدی بمقام جامع مسجد امروہہ منعقد ہوا انٹر گریڈ کے تحریری مقابلہ عصر حاضر میں مسلمانوں کی پستی کے اسباب میں حافظ محمد عظیم اختر صدیقی نے اول درجہ میں کامیابی حاصل کی۔

محمدیہ ہائی اسکول کے طالب علم کو پہلا انعام

پچھلے ہفتہ سی وارد کے اٹھائیس سکنڈری اسکول ممبا دیوی میں منعقد ہوا۔ اس مقابلہ میں محمدیہ ہائی اسکول کے نہم جماعت کے طالب علم محمد سلیم نے سینئر گروپ میں پہلے نمبر کا انعام پایا۔

اس طرح انٹرایکٹ کلب آف کرائسٹ چرچ اسکول کے زیر اہتمام ایک ڈرائینگ کا مقابلہ ثانوی اسکولوں کے طلبہ کے درمیان منعقد ہوا اور اس میں بھی محمدیہ ہائی اسکول کے سید زبیر باقر، جماعت ہشتم کے طالب علم نے تیسرے نمبر کا انعام حاصل کیا۔ (ہیڈ ماسٹر)

بالاپور میں خوش الحانی کا انعامی مقابلہ

بالاپور، ۱۸ ستمبر ۸۲ء کو بزم اردو ادب "گورنمنٹ اردو جونیر کالج آف ایجوکیشن بالاپور لڑکوں کی جانب سے علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے کلام کو خوش الحانی سے پڑھنے کا ایک انعامی مقابلہ منعقد کیا گیا۔

انعامی مقابلے کے فیصلے کے لیے کالج کے سینیر لیکچرر جناب محمد عبد اللہ صاحب قریشی کو جج مقرر کیا گیا تھا۔ ان کے فیصلے کے مطابق پہلے تین انعامات ذیل درج طلبہ نے حاصل کیے۔ ۱عبد الرؤف خان متعلم سال دوم (ترانہ اقبال) ۲امام حسین، محمد بشر ورؤف خان استقبالیہ گیت مل کر ۳، عبد السلیم متعلم سال دوم (لب پہ آتی ہے)

> آپ بھی اپنے اسکول کی تعلیمی، ثقافتی تقریبات کی رپورٹ پیام تعلیم کے لیے بھیج سکتے ہیں (اڈیٹر)

ماہنامہ "پیام تعلیم" کا "یوم تاسیس نمبر" پیش نظر ہے۔ یہ نمبر جہاں بہت سی خصوصیات اور انفرادیت کا حامل ہے وہاں سب سے اہم بات بلکہ باعث طمانیت قلب بات یہ ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے کے بعد یقین ہو گیا کہ اب ہندستان میں علم و حکمت، شعر و ادب، سائنس و فلسفہ، دین و مذہب اور قومی یکجہتی و سیکولرزم کے ماحول میں جس طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے اساتذہ اور ارباب حل و عقد اپنے خون جگر سے ایک جہان نو پیدا کرنے اور پر بہار گلستان کو حیات دائمی عطا کرنے میں مصروف ہیں وہ دوسرے اداروں کے لیے نمونا اور مثالی چیز ہے۔

● سردار احمد الکچرر

اسلامیہ کالج اٹاوہ یوپی

جشن تاسیس کی رنگارنگ تقاریب سے متعلق پڑھ کر دل مسرور ہوا۔

کسی بھی بھولی بسری روایات کو از سرِ نو زندہ و جاوید کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے آپ سب نے جس لگن، جستجو اور حسن و خوبی سے جشن تاسیس کو کامرانی سے ہمکنار کیا۔ اس کے لیے ادارہ کا ہر فرد مبارکباد کا مستحق ہے۔

● نوگل بھارتی

مانگاؤں۔ رائے گڈھ

اکتوبر ۸۲ء کا "پیام تعلیم" "یوم تاسیس" ملا پڑھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ خوش نصیب ہیں وہ بچے جو ایسے عظیم درس گاہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور قابل تعریف ہیں اس درس گاہ کے اساتذہ جو بچے کو اتنی اچھی تعلیم دیتے ہیں ہنر سکھاتے ہیں جو کبھی ہم لوگوں کی طرح در بدر کی ٹھوکر نہیں کھا سکتے بلکہ اپنا اپنے درس گاہ اپنے اساتذہ اپنے ملک و ملت کا نام دنیا میں روشن کریں گے۔

● سرور حسن

لکھمنیاں، بیگو سرائے، بہار

شدت سے انتظار کے بعد "پیام تعلیم" "یوم تاسیس" کی شکل میں موصول ہوا۔ پیام تعلیم میں چھپی ہوئی پروگراموں کی تصویریں اور پروگرام کی تفصیل پڑھا۔ اس کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں خود جشن تاسیس میں شریک تھا۔ دراصل تعلیم کا مقصد صرف لکھنے پڑھنے کی صلاحیت کو حاصل کر لینا ہی نہیں بلکہ انسان کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ سماج میں رہ کر زندگی کے حالات سے دوچار ہو سکے

● اشفاق احمد

سوت گرنی کوارٹر تاج آباد ناگپور ۹۔

ستمبر ۱۹۸۲ کا "پیام تعلیم" نظر نواز ہوا۔ اس شمارے میں وکیل نجیب کی کہانی "جنگل کی امانت" شمس فرخ آبادی کی کہانی "عبرت" مرزا ادیب کی کہانی "ایک خرگوش اور ایک غار" پروفیسر دستگیر شہاب کی نظم "کالو اور بھیڑیا" قابل تعریف ہے۔

● محمد اختر عادل عثمانی

محلہ، تیپانہ، کلٹی، بردوان

ستمبر ماہ کا "پیام تعلیم" باصرہ نواز ہوا۔ دیکھ کر میں فرط مسرت سے جھوم اٹھا۔ اس ماہ بھی ڈاکٹر قنبر رضوی کا معلوماتی مضمون "عراق" ہم تمام پیامیوں کو بے حد پسند آیا۔ کہانی میں "عبرت" "جنگل کی امانت" "زمین کے چہرے کی جھریاں" اور نظم میں "برسات" "کالو اور بھیڑیا" پڑھ کر میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔

● سید قمر العارفین رضوی

ہسپدرہ۔ اورنگ آباد (بہار)

بچوں کی کوشش

خواب

رات اپنے شباب پر تھی۔ موسم میں خنکی تھی۔ ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔ فضا خاموش تھی۔ کبھی کبھی گلی کے آوارہ کتّے فضا کے اس سکوت کو توڑ دیتے تھے۔ آصف ابھی تک جاگ رہا تھا۔ وہ خلا میں مسلسل تکے جارہا تھا۔ شاید آسمان پر جھلملاتے ہوئے ستاروں میں اپنا ستارہ تلاش کررہا تھا جو گردش میں تھا۔ آہستہ آہستہ نیند اس پر غالب آنے لگی۔

چاروں طرف آگ برس رہی تھی جنگ اپنے شباب پر تھی۔ آصف کی ڈیوٹی بھوا چھاونی میں تھی۔ ابھی ابھی اس کو ننگل پور چھاونی جانے کا حکم میجر ورما سے ملا تھا۔ آصف کو یہ سفر بحری جہاز سے کرنا تھا۔ آصف نے اپنے ماتحت فوجیوں کو ہدایتیں دیں اور کچھ فوجی ساتھ لے کر بحری جہاز "مالٹوا" کی جانب بڑھ گیا۔

مالٹوا سمندر کی لہروں سے کھیلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ آصف نے کپتان کو جہاز کی باہری بتیاں بجھا دینے کا حکم دیا اور جہاز کے عرشے پر چڑھ گیا۔ آصف کو بحریہ میں بھرتی ہوئے صرف پانچ سال ہی ہوئے تھے مگر اس نے اپنی شجاعت اور جواں مردی سے کافی ترقی کرلی تھی کہ اسی اثنا میں جنگ چھڑ گئی۔

دفعتاً جہاز کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ آصف کے ساتھ تمام فوجی حرکت میں آگئے۔ تبھی دوسرا جھٹکا لگا۔ آصف کی پیشانی پر فکر اور پریشانی کی لکیریں ابھر آئیں۔ اس نے محسوس کرلیا کہ دشمن کی پن ڈبی نے حملہ کردیا ہے۔ اس نے کپتان کو حکم دیا کہ وہ جہاز کو فوراً لنگر انداز کرے۔ آگے بڑھنے سے خطرہ اور بڑھ سکتا تھا۔ اچانک دشمن کی پن ڈبی سے نکلا ہوا تارپیڈو "مالٹوا" کی نچلی سطح میں لگا اور جہاز ہچکولے کھانے لگا۔ آصف نے جوابی حملہ کا حکم دے دیا۔ بس پھر کیا تھا چاروں طرف آگ ہی آگ دکھائی دینے لگی۔ تھوڑی دیر میں سمندر میں تلاطم بپا ہوگیا یکایک ۔۔۔ ایک اور تارپیڈو نکلا جس نے "مالٹوا" میں سوراخ کردیا۔ کپتان نے اطلاع دی کہ اب بچنا مشکل ہے۔ تھوڑی دیر میں جہاز پانی سے بھر جائے گا اور سب کی قبریں بھی نہ بن سکیں گی۔

آصف کو حضرت عزرائیل کی موجودگی کا احساس ہوگیا۔ اس نے حفاظتی کشتیاں اتارنے کا حکم دیا اور فوجیوں کو جلدی جلدی اتر جانے کا حکم دیا۔ ابھی چند جوان ہی اترے تھے کہ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور جہاز تیزی سے ڈوبنے لگا۔ آصف نے خود کو ڈوبتا ہوا محسوس کیا اس نے پھر بھی جان بچانے کے لیے تیرنا چاہا ویسے بھی وہ ایک ماہر تیراک تھا۔ اچانک سمندر کی ایک تیز لہر نے اسے ہوا میں اچھال دیا۔ آصف کے منہ سے دلخراش چیخ نکلی ۔۔۔۔۔۔

اچانک ایک نسوانی آواز آئی۔ یہ آواز اس نے پہچان بھی لی تھی، اس کی ماں کہہ رہی تھی "کیا ہوا بیٹا! کیا خواب دیکھا تھا جو ڈر گئے تھے"؟

شاہد سعید
کمرہ [illegible] دوسری منزل۔ [illegible] بی کے اسٹریٹ بمبئی ۳

حسد کا انجام

ایک ملک میں ایک بادشاہ تھا۔ اس کا نام رحیم تھا۔ وہ نیک اور رحم دل تھا۔ ساری رعایا اس سے خوش تھی۔
اس کی چھ بیویاں تھیں مگر ایک کے بھی اولاد نہ ہوئی وہ ہمیشہ خدا سے دعا کرتا تھا کہ اسے ایک اولاد نصیب ہو۔ اس نے وزیر سے پوچھا۔ "کیا کیا جائے"۔ وزیر نے کہا کہ "ایک اور شادی کر لیں"۔ بادشاہ نے ایک اور شادی کی۔ تو دو خوبصورت بچے پیدا ہوئے۔ بادشاہ نے خوشی کے مارے سارے ملک میں دعوت کا انتظام کیا۔

بادشاہ اب آخری بیوی کے پاس زیادہ رہنے لگا۔ اس نے ان چھ بیویوں کو گھر سے نکال دیا۔ چھوٹی بیوی بہت حاسد اور کنجوس ہو گئی۔ ایک دن ایک فقیر نے آکر کہا:

"اللہ کے نام پر خیرات کرو"۔

چھوٹی بیوی نے سپاہی کو بلا کر دھکّے مار کر فقیر کو بھگا دیا۔ فقیر بد دعا دے کر چلا گیا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ بادشاہ نے اپنی چھوٹی بیوی کو پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس کے دل میں حسد پیدا ہو گیا تھا۔ اس سے وہ بادشاہ کو قتل کر کے خود رانی بننا چاہتی تھی۔ وہ رات کے وقت تلوار لے کر اسے قتل کرنے گئی لیکن بدقسمتی سے بادشاہ جاگ گیا۔ بادشاہ نے اپنی چھ بیویوں کو پھر سے بلا لیا اور ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

افتخار احمد

زین الدین۔ ۱۱/۶ جمیل آباد۔ میل وشارم۔ ۶۳۲۵۰۹

سونے کی چھڑی

ایک تھا راجکمار۔ راجا کا اکلوتا بیٹا۔ راجکمار کو ایک دن شکار میں جانے کی دھن سوار ہوئی۔ راجا نے سمجھایا لیکن اس نے کسی کی ایک نہ سنی۔ ہار کر راجا نے ساتھ میں فوج بھیج دی۔ رانی نے ٹوکری بھر کر ہیرے موتی دیے۔
راجکمار نے نہ تو کوئی آدمی ساتھ لیا۔ نہ ہی ہیرا موتی۔ کمر میں ایک تلوار لٹکائی اور چل پڑا۔ چلتے چلتے ایک گھنے جنگل میں پہنچا۔ راجکمار اور آگے بڑھا۔ ایک شہر ملا۔ خوبصورت مکان قطار اور ترتیب سے بنے تھے۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ نہ کوئی آدمی نہ آدم زاد۔

راجکمار اور آگے بڑھا۔ فیل خانے میں ہاتھی، اصطبل میں گھوڑے لائن میں کھڑے سپاہی مگر سب بت کی طرح نہ ہونٹ ہلتے، نہ پلک جھپکتی۔ راجکمار اور آگے بڑھا۔ بھرا دربار تخت پر بیٹھا راجا مگر کسی میں زندگی کی کوئی جھلک نہیں۔

راجکمار کو پھولوں کا ایک خوبصورت باغ نظر آیا۔ اس باغ میں ایک سونے کی کھاٹ تھی جس پر ایک راجکماری سوئی ہوئی تھی۔ راجکمار دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے اسے کھاٹ پر دو چھڑیاں دکھائی دیں۔ ایک سونے کی ایک چاندی کی۔ سونے کی چھڑی پائینتی اور چاندی کی سرہانے رکھی تھی۔

راجکمار نے دونوں چھڑیاں اٹھا لیں۔ انھیں دیکھنے لگا۔ اسے دیکھتے میں جانے کب سونے کی چھڑی راجکماری سے چھو گئی۔ اسی وقت وہ جاگ گئی۔ چڑیاں چہچہانے لگیں۔ راج منتری سب جی گئے۔ راجکمار نے راجکماری سے پوچھا:

"یہ سب کیا بھید ہے"

راجکماری بولی: "یہ سب ایک دیونی کی کرامات ہے۔ اس نے چاندی کی چھڑی چھوا کر ہم سب کو سلا دیا ہے وہ سونے کی چھڑی سے جگاتی ہے۔ مگر تم کون ہو؟"

راجکمار بولا: "میں ایک راجکمار ہوں۔ میں تم لوگوں کو اس سے بچاؤں گا۔"

راجکماری اس سے بولی: "خدا کے لیے تم یہ مصیبت مول نہ لو۔ وہ بڑی ڈراونی ہے۔ وہ آ رہی ہوگی۔ تم چلے جاؤ۔"

راجکمار نے چاندی کی چھڑی سے سب کو سلا دیا پھر اور کہیں چھپ گیا۔ دیونی آئی۔ سونے کی چھڑی سے راجکماری کو جگایا۔ ناک سکوڑ کر بولی:

"کہیں سے آدمی کی بو آ رہی ہے۔"

راجکماری بولی: "یہاں تو صرف میں ہوں۔ مجھ ہی کو کھاؤ۔" دیونی بولی: "چھی! تم تو راجکماری ہو۔ تمھیں کیا کھاؤں۔" راجکماری بولی: "خیر نہ کھاؤ۔ مگر تم کبھی مرو گی

تو میرا کیا ہوگا؟" دیونی ہنسی۔ "پگلی! میں کبھی نہ مروں گی۔ مجھے کوئی مار نہیں سکتا۔"

راجکماری بولی: "گلا کاٹ دینے سے بھی نہیں؟"

دیونی بولی: "نہیں گلا جڑ جائے گا۔ دیکھو وہ تالاب ہے نہ اس میں پتھر کا کھمبہ ہے۔ اس کے اندر ایک بھونرا ہے کالی ڈبیا میں بند۔ اسی میں میری جان ہے۔ وہ مرے گا تب ہی میں مروں گی۔ اسے کوئی مار نہیں سکتا۔"

راجکماری نے دیونی سے کہا: "تم بہت تھک گئی ہو لاؤ پیر دبا دوں۔"

دیونی بولی: "نہیں۔ ابھی تو باہر جانا ہے لو تم سو جاؤ" اور چاندی کی چھڑی چھوا کر سلا دیا اور چلی گئی۔

راجکمار نے سب کچھ سن لیا اور فوراً تالاب میں چھلانگ لگا کر، کھمبے کو توڑ کر وہ ڈبیا نکال لی۔ جب ڈبیا کھولا تو فوراً دیونی دوڑ کر آئی اور چھیننے ہی والی تھی کہ راجکمار نے بھونرے کو مسل دیا۔ اسی وقت دیونی گر کر مر گئی۔

سونے کی چھڑی سے چھو کر راجکماری کو جگایا۔ اس کے جاگنے سے سب ہی جاگ گئے۔ راجا نے راجکمار کو عزت سے رکھا اور اپنی راجکماری سے شادی کر دی۔

وہ راجکماری کو لے کر اپنے ملک لوٹ آیا۔

فضل قدر

محلہ داتا مارکیٹ، پٹنہ - ۶

خدمت کا پھل

نسیم ایک غریب لڑکا تھا۔ وہ محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتا تھا۔ اس کا گانو چھوٹا تھا۔ اس کے گانو کے پاس ہی ایک کچی سڑک جاتی تھی۔ اس سڑک کے بیچ میں ایک بڑا پتھر پڑا ہوا تھا۔ اس پتھر سے آنے جانے والوں کو تکلیف ہوتی تھی لیکن کسی نے بھی اسے ہٹانے کی کوشش نہیں کی۔

ایک بار کوئی ساہوکار گھوڑے پر سوار گانو سے گزر رہا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ سوار کو سڑک کا پتھر دکھائی نہیں دیا۔ گھوڑے کو پتھر سے ٹھوکر لگی اور اس کا پیر ٹوٹ گیا۔ ساہوکار گر پڑا۔ اس کے بھی چوٹ لگی۔ وہ گانو والوں کو گالیاں دیتا ہوا چلا گیا۔

کچھ دن بعد ایک گھوڑ سوار کی بھی یہی حالت ہوئی۔ اس پتھر سے ٹھوکر لگی۔ سوار گر پڑا۔ گھوڑا بھی زخمی ہو گیا۔ روز ایک نہ ایک ٹھوکر کھاتا اور گرتا پھر بھی کوئی اس پتھر کو ہٹانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔

ایک دن نسیم اس سڑک سے جا رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر اسی پتھر پر پڑی۔ اس نے سوچا اگر میں اس پتھر کو ہٹا دوں تو راستہ چلنے والوں کی بھلائی ہوگی۔ اسے یاد آیا کہ پیارے نبیؐ نے راستے سے کانٹوں کو ہٹانے کا بڑا ثواب بتایا ہے۔ بس نسیم نے اس پتھر کو ہٹا دیا۔ جب پتھر ہٹ گیا تو نسیم کو بڑی خوشی ہوئی۔ اتنے میں اس کی نظر ایک ڈبے پر پڑی۔ تو وہ چونک گیا۔ اس نے ڈبہ کھولا۔ دیکھا تو اشرفیوں سے بھرا تھا اور اس پر لکھا تھا

"جو آدمی اس پتھر کو راستے سے ہٹائے گا، وہی ان اشرفیوں کا مالک ہوگا۔"

محمد رضوان انصاری

آزاد نگر کلٹی، ۷۱۳۳۴۳

بونے کی عقل

کروسز نام کا لائڈیا میں، ایک ڈھائی فٹ کا بونا تھا۔ اپنے شہر کا سب سے امیر آدمی تھا۔ سردیوں کے موسم میں وہ ہمیشہ الماری میں بستر بچھا کر سویا کرتا تھا۔

ایک رات اس کی آنکھ کھٹ پٹ سے کھل گئی۔ اس نے الماری کے سوراخ سے جھانکا تو چند چوروں کو قیمتی سامان سمیٹتے دیکھا۔ گھر میں کوئی نوکر بھی نہیں تھا کہ آواز دیتا۔ چوروں کے سامنے جانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا اسے اور کچھ نہ سوجھا وہیں سے پوری مردانہ آواز میں زور سے کہا:

"میں سب دیکھ رہا ہوں۔"

بند کمرے میں آواز گونج اٹھی۔ چوروں کے تو

ہوش اُڑ گئے۔ گھبرا کر چاروں طرف دیکھا، مگر بولنے والا دکھائی نہ دیا اتنے میں بالشتیئے نے پھر ڈپٹ کر کہا:

"میں سب دیکھ رہا ہوں۔ بھاگ جاؤ، ورنہ میں تم سب کو کچا چبا جاؤں گا۔"

کمرے میں کوئی نظر نہیں آرہا تھا، لیکن آواز کمرے ہی میں سے آرہی تھی۔ چوروں کو یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ یہ مکان اسی بالشتیئے کا ہے۔ وہ سمجھے کہ یہ مکان ضرور آسیب زدہ ہے۔ انھوں نے ڈر کے مارے سامان وہیں پھینک دیا اور سر پر پانوٗ رکھ کر بھاگے۔

اور اس طرح کر دوسنز کا ڈھائی فٹ کا قد اس کے کام آیا۔

طارق صدیقی

شعیب منزل، دربھنگا، (بہار)

اجنبی مسافر

جاڑے کے دن تھے اور موسم کی شاید سرد ترین رات تھی۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اسی اندھیرے میں ایک بگھی سڑک پر دوڑی چلی جارہی تھی۔ بگھی کے اندر بھی گہری تاریکی تھی۔ جب ایک سرائے پر بگھی رکی اور ایک مسافر اس میں سوار ہوا تو اس نے دیکھا کہ بگھی میں ایک سواری پہلے ہی سے موجود ہے۔ کچھ دیر تک وہ خاموش ہی بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سوچا کہ کیوں نہ وقت گزارنے کے لیے بات چیت کی جائے۔ وہ پہلے سے بیٹھی سواری سے مخاطب ہوا۔

"آج کی رات بہت زیادہ ٹھنڈی ہے۔"

"غرر...رر" دوسرے مسافر نے جواب دیا۔

"آپ کا اوور کوٹ بہت خوبصورت ہے، گرم بھی کافی معلوم ہوتا ہے۔"

"غرر...رر...ر" دوسرے مسافر نے پھر اسی طرح چھوٹا سا جواب دے کر خاموشی اختیار کر لی۔

"کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟" مسافر نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بات چیت جاری رکھنے کی کوشش کی۔

"غرر...رر...ر" دوسرے مسافر کی آواز آئی۔

"کوچوان... کوچوان۔ گاڑی میں ریچھ ہے۔ جلدی روکو..." روکو لیکن بگھی رکتے ہی ریچھ نما مسافر کو چیختا چھوڑ کر بگھی سے کود گیا اور اندھیرے میں لوگوں کی نگاہیں اس اجنبی مسافر کا زیادہ دور تک تعاقب نہ کر سکیں۔

عزیز نقوی

کریسنٹ اسکول۔ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

غرور کا سر نیچا

ایک جنگل میں ایک بارہ سنگھا رہتا ہے۔ اس کے سینگ نہایت خوش نما تھے۔ ایک بار چشمہ پر پانی پیتے وقت اس نے اپنے سراپے کو دیکھا۔ اپنے بدصورت پیروں کو دیکھ کر وہ ندامت محسوس کرنے لگا اور دل میں خیال کیا کہ خدا نے مجھے ایسے بدصورت پانوٗ کیوں دیے، یہ تو میرے وجود کے لیے ایک بدنما داغ ہے، البتہ میرے سینگ بہت خوبصورت ہیں۔ ان کی خوبصورتی پر جتنا بھی ناز کروں کم ہے۔ اچانک ایک شیر پر نظر پڑی وہ بدحواس ہو کر موت کے خوف سے دوڑ کر دور نکل گیا۔ شیر نے اس کا تعاقب کیا۔ اس کے بدنما ٹانگوں نے بھاگنے میں اس کی پوری مدد کی، لیکن اس کے خوبصورت سینگوں نے اسے ایک جھاڑی میں پھنسا دیا۔ ہزار کوششوں کے بعد بھی وہ جھاڑی سے اپنے سینگوں کو چھڑا نہ سکا۔ تھوڑی ہی دیر میں شیر نے آکر بارہ سنگھا کا کام تمام کر دیا۔

محمد انور عادل عثمانی

پتیانہ، کلی بردوان

اندھا اور لنگڑا

کسی ندی کے کنارے ایک گانوٗ تھا۔ اس گانوٗ کا نام رام پور تھا۔ وہ گانوٗ بہت بڑا تھا۔ وہاں کے رہنے والے بڑے خوش تھے اور بڑے مزے میں رہتے تھے۔

اسی گانو میں ایک اندھا اور ایک لنگڑا بھی رہتا تھا۔ ایک بار برسات بڑے زور کی ہوئی۔ ندی میں بڑے زور شور سے باڑھ آگئی۔ گانو والے بہت پریشان ہوئے۔ سب کے گھروں میں پانی گھسنے لگا آخر گھر چھوڑ کے سب کو بھاگنا پڑا۔ سب بھاگ گئے صرف اندھا اور لنگڑا رہ گیا۔ ان دونوں کو ایک ترکیب سوجھی۔ اندھے نے لنگڑے سے کہا۔ آؤ لنگڑے بھائی تم میرے کندھے پر چڑھ جاؤ۔ لنگڑا اسی کے کندھے پر چڑھ گیا ہے راستہ بتاتا گیا اور اس کے بتانے سے اندھا چلتا رہا۔ اس طرح وہ دونوں پانی سے نکل گئے اور ڈوبنے سے بچ گئے۔ اندھے اور لنگڑے کا مل جل کر کام کرنا ہی تھا کہ اُن کا اتنا کٹھن کام بن گیا۔ تو پیامی بہنو، بھائیو! ہم لوگ کو بھی چاہیے کہ مل جل کر کام کیا کریں۔

اسحاق خالد نرملی

معرفت: تاج احمد تاج نرملی، نرمل ۵۰۴۱۰۶

محنت کا پھل

بہت دنوں کی بات ہے کسی گانو میں ایک کسان رہتا تھا۔ وہ بہت ہی امیر تھا۔ اس کے کھیتوں میں طرح طرح کی فصلوں کے ہرے بھرے پودے ہمیشہ لہلہاتے رہتے تھے۔ کسان بڑا ہی نیک اور محنتی تھا۔ اس کا نام جاوید تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ بڑا لڑکا بچپن سے ہی لڑاکو مزاج کا تھا۔ اُسے تلوار، بھالا چلانے میں بڑا مزا آتا تھا۔ جوان ہونے پر وہ فوج میں بھرتی ہوگیا۔ بڑے لڑکے کا نام پرویز تھا۔ دوسرا لڑکا ہمایوں آرام پسند تھا۔ وہ بہت ہی اچھا باجا بجاتا تھا۔ اُس کو ناچنے، گانے کا بڑا شوق تھا۔ اُس کا سارا دن ناچنے گانے میں گزر جاتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد اس کا باپ جاوید اس دنیا سے چل بسا۔ اور اس کا بڑا بھائی لڑائی میں چلا گیا۔ اب گھر کا سارا کام کاج ہمایوں پر آپڑا تھا۔ لیکن اُس کا کھیتی باڑی میں جی نہ لگتا تھا۔ وہ دن بھر گھومتا پھرتا رہتا۔ اس لیے اس کی ساری فصل برباد ہوگئی۔

کچھ دنوں کے بعد ہمایوں کے دل میں آیا کہ بڑا بھائی لڑائی سے واپس آنے والا ہے۔ جب وہ کھیت کھلیان کو دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔ اور میں اسے کیا جواب دوں گا۔ یہ سب سوچ کر وہ گھبرا گیا۔ اب نہ تو اس کا کلب میں دل لگتا اور نہ باجا بجانے کو دل کرتا۔ یہ سب سوچ کر وہ اپنے ایک پڑوسی کے پاس گیا اور دُکھی آواز میں بولا: ”میرا بھائی آنے والا ہے۔ کھیتی باڑی بھی برباد ہو چکی ہے۔ اب میں کیا کروں؟“ پڑوسی نے ہنس کر کہا، ”جاؤ، جاؤ باجا بجاؤ اسی سے سب ٹھیک ہوجائے گا۔“ کئی جگہ جانے کے بعد اُسے یہی جواب ملا۔ گھر جانے والا تھا ہی کہ ایک چرواہے کی نظر اس پر پڑی ہمایوں کو اداس دیکھ کر بولا: ”لگتا ہے تم ڈر اور گھبراہٹ کی وجہ سے پاگل ہوجاؤ گے۔ لیکن پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم اس بڑھیا کے پاس جاؤ جو پاس ہی کے غار میں رہتی ہے۔ وہ جادوگرنی ہے۔“ ہمایوں پہاڑ کے اوپر جاکر دوسری طرف اُتر کر غار میں گھس گیا۔ وہاں جاکر ہمایوں نے بڑھیا کو اپنا سارا دُکھ کہہ سنایا۔ بڑھیا بولی ”تم یہیں بیٹھو، میں ابھی آتی ہوں۔ بڑھیا اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد بڑھیا چھوٹا سا بکس لیے آئی۔ بڑھیا نے ہمایوں کو بکس دیتے ہوئے کہا اس میں جادو کے بیج ہیں“ ہمایوں اس جادو کے بکس کو لے کر گھر آیا۔ دوسرے دن صبح ہونے سے پہلے اٹھا اور کھیت پر چلا گیا اور ان بیجوں کو کھیت میں بو آیا۔ ہر روز وہ سویرے سے اٹھ کر کھیت پر جاتا، کھیت کی صفائی کرتا اور دیکھ بھال کرتا۔ محنت اور سوجھ بوجھ سے کام لینے پر دن بدلتے دیر نہیں لگی۔ کچھ ہی دنوں کے اندر ہمایوں کے کھیت پہلے کی طرح لہلہا اُٹھے۔ اور پیداوار دُگنی ہونے لگی۔ ایک دن ہمایوں نے اکیلے میں اُس جادو کے بکس کو کھولا۔ اس میں ایک کاغذ کا ٹکڑا تھا۔ جس میں لکھا تھا ”دھیان رکھو۔ دوسرے پر بھروسا

کرکے بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اپنے کام کی دیکھ بھال خود کرنی چاہیے۔" کاغذ کو پڑھ کر اسی طرح بکس میں رکھ دیا اور محنت سے کام کرنے لگا۔ کچھ ہی دنوں میں اس کا بھائی بھی لڑائی سے واپس آگیا اور اپنا پہلے کی طرح کھیت دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ دونوں بھائی خوشی کی زندگی بسر کرنے لگے۔

افروز انور
پٹنہ مسلم ہائی اسکول سکشن بی۔ کلاس دہم پٹنہ ۶

بادشاہ اور وزیر

جاڑے کا موسم تھا۔ بادشاہ (اکبر) اور اس کے وزیر (بیربل) دونوں ایک ساتھ ٹہلنے گئے۔ وہ لوگ ٹہلتے ٹہلتے ایک جھیل کے کنارے پہنچے۔ اکبر بادشاہ نے جھیل کی طرف دیکھتے ہوئے وزیر سے کہا۔ کیا کوئی شخص رات بھر اس جھیل کے اندر ٹھہر سکتا ہے ؟۔ بیربل نے جواب دیا۔ کیوں نہیں! ایک برہمن ہے وہ رہ سکتا ہے۔ کہیے تو میں آج ہی دوپہر اسے آپ کے پاس لے آؤں۔

اکبر بادشاہ: مجھے تو یقین نہیں ہوتا کہ اتنی سردی میں کوئی بھی اس جھیل کے اندر رات بھر ٹھہر سکے۔

بیربل: جہاں پناہ آپ اجازت دیں تو میں اس برہمن کو آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

بادشاہ: ٹھیک ہے بیربل، تم اس برہمن کو میرے پاس لے آؤ۔ اگر وہ ساری رات جھیل کے اندر ٹھہرنے میں کامیاب رہا تو میں اسے پچاس ہزار روپے انعام دوں گا۔

بیربل نے دوپہر کے وقت ایک بوڑھے برہمن کو بادشاہ کے سامنے حاضر کیا۔ "آپ ساری رات جھیل میں ٹھہرنے کے بعد صبح سویرے میرے پاس آئیے۔" بادشاہ نے کہا۔ لیکن یاد رہے یہ برہمن پانی سے باہر نکلنے نہ پائے۔ اپنے سپاہیوں کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن صبح سویرے برہمن چار سپاہیوں کے ساتھ بادشاہ کے محل میں داخل ہوا اور بادشاہ سے کہنے لگا۔

"جہاں پناہ، میں ساری رات جھیل کے اندر ٹھہرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ مجھے میرا انعام دیجیے۔" سپاہیوں نے اس کی تصدیق بھی کردی۔

بادشاہ حیرت سے، لیکن کیا پانی ٹھنڈا نہیں تھا ؟

برہمن اپنے بازوؤں کو فخر سے موڑتے ہوئے بولا:

"جہاں پناہ، پانی تو بہت ٹھنڈا تھا۔ لیکن میں ٹھنڈا نہیں تھا۔" اس لیے کہ میں ساری رات آپ کے محل میں جلتے ہوئے چراغ کو دیکھتا رہا: جس کی وجہ سے مجھے کچھ محسوس ہی نہیں ہوا۔ بادشاہ نے برہمن کی بات کو سننے کے بعد کہا:

"تب تو تم انعام کے مستحق نہیں ہو۔ تمھیں تو ہمارے مکان میں لگے ہوئے چراغ کی روشنی سے گرمی مل رہی تھی۔ میں تمہیں کوئی انعام نہیں دوں گا۔ تم جا سکتے ہو۔"

برہمن بیربل کے پاس واپس آیا اور سب کچھ بتا دیا۔ دوسرے دن بیربل بادشاہ کے محل میں نہیں گیا۔ اس نے ایک برتن میں کچھ چاول اور پانی لے کر اسے ایک بہت اونچے درخت کی چوٹی پر لٹکا دیا اور درخت کے نیچے چولہا سلگا دیا۔ پھر خود بغل میں بیٹھ رہا۔ اتنے میں بیربل کے پاس ایک شخص پیغام لے کر آیا اور کہنے لگا:

"صاحب آپ کو جہاں پناہ نے یاد فرمایا ہے۔"

بیربل نے جواب دیا۔

"جاؤ اور بادشاہ سے کہہ دو کہ بیربل اپنا کھانا پکا رہا ہے۔"

کچھ دیر کے بعد بادشاہ خود بیربل کے پاس آیا۔

"تم کیا کر رہے ہو بیربل؟" بادشاہ نے پوچھا۔ تب بیربل نے جواب دیا۔

"جہاں پناہ میں اپنا کھانا پکا رہا ہوں۔"

بادشاہ چولھے کو درخت کے نیچے اور کھانے کے برتن کو درخت کے اوپر دیکھ کر زور سے ہنسنے لگا۔"

باقی صفحہ ۲۰ پر

پیام تعلیم شمسی کیلنڈر ۱۹۸۳ء

از عبدالمجید آنیکل (بنگلور)					مئی	اگست	فروری مارچ نومبر	جون	ستمبر دسمبر	اپریل جولائی	اکتوبر جنوری
۲۹	۲۲	۱۵	۸	۱	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
۳۰	۲۳	۱۶	۹	۲	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار
۳۱	۲۴	۱۷	۱۰	۳	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر
	۲۵	۱۸	۱۱	۴	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل
	۲۶	۱۹	۱۲	۵	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ
	۲۷	۲۰	۱۳	۶	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات
	۲۸	۲۱	۱۴	۷	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ

پیام تعلیم قمری کیلنڈر ۱۴۰۳ھ

از عبدالمجید آنیکل بنگلور					ربیع الثانی رمضان	محرم جمادی الاول شوال	صفر جمادی الثانی ذی قعدہ	رجب ذی الحجہ	شعبان ربیع الاول
۲۹	۲۲	۱۵	۸	۱	پیر	منگل	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
۳۰	۲۳	۱۶	۹	۲	منگل	بدھ	جمعہ	ہفتہ	اتوار
	۲۴	۱۷	۱۰	۳	بدھ	جمعرات	ہفتہ	اتوار	پیر
	۲۵	۱۸	۱۱	۴	جمعرات	جمعہ	اتوار	پیر	منگل
	۲۶	۱۹	۱۲	۵	جمعہ	ہفتہ	پیر	منگل	بدھ
	۲۷	۲۰	۱۳	۶	ہفتہ	اتوار	منگل	بدھ	جمعرات
	۲۸	۲۱	۱۴	۷	اتوار	پیر	بدھ	جمعہ	جمعہ

پیام تعلیم
ساحر
(رانی گنج)

بچوں کی
کتابیں
ریڈیو فیچر
(جگن ناتھ آزاد)
بچوں کی دلچسپی کے دو مزیدار ڈرامے
یہ دونوں ڈرامے ریڈیو سے نشر بھی
ہو چکے ہیں۔
قیمت : ۲/۲۵
گاندھی باباکی کہانی
(بیگم قدسیہ زیدی)
اس خوب صورت مصور کتاب میں مہاتما گاندھی
کی زندگی نہایت آسان اور سبق آموز
پیرایے میں لکھی گئی ہے۔
قیمت: ۴/..
اُردو کیسے لکھیں
(رشید حسن خاں)
ہم سب اُردو لکھتے اور پڑھتے ہیں، لیکن
صحیح اُردو کیا ہے اور کس طرح لکھنا چاہیے،
یہ اسی کتاب سے معلوم ہو سکے گا۔
قیمت ۴/۵۰
پلک نہ مارو
(یوسف ناظم)
دلچسپ مزاحیہ کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ۔ مزیدار
کہانیوں والی ایسی کتاب جس کے پڑھتے وقت
بچوں میں چھینا جھپٹی کا اندیشہ رہتا ہے۔ آپ
بھی پڑھیے اور لطف لیجیے۔
قیمت: ۲/..
جب اور اب (آصف مجیب)
بچوں کی دلچسپی والی ۵۰، ۶۰ سال پہلے
باتیں جو اب پرانی ہو چکی ہیں۔ قیمت
اناڑی عصمت چغتائی
ببلو اور ٹیٹو۔ تین نٹ کھٹ لڑکوں کی
ایک دلچسپ ناول جو آسان زبان
قیمت ۳/=
ترجمہ
قرۃ العین حیدر
جن حسن عبدالرحمٰن
الہ دین کے چراغ کی کہانی تو اب پرانی ہوگئی، لیکن اب تو
اس جن کا قصہ تمام بچوں کی زبان پر ہے جسے حال
ہی میں ایک سکنڈری اسکول کے بچے نے صراحی کی
قید سے آزادی دلائی ہے۔
حصہ اول ۲/۵۰، حصہ دوم ۲/۵۰
(صفی زبیری)
کہاوت اور کہانی
روزمرہ بولی جانے والی کہاوتوں اور
کہانیوں کا دلکش مجموعہ جن کی وجہ سے
کہاوتیں وجود میں آئیں۔
قیمت: ۲/۵۰
سرکس
تزئین کار: ڈین گیسپر
سرکس دیکھنا اور تصویروں میں رنگ بھرنا
بچوں کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ اس کتاب میں
سرکس کی ڈھیر ساری تصویروں کے خاکے
ملیں گے جن میں بچے شوق سے رنگ
بھر سکتے ہیں۔ قیمت ۱/۵۰
دہلی ۶
بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی

Regd No. D(SE)-043 December, 1982

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

برنی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ دلی ۲